جواہر عزیزی

اردو ترجمہ

تفسیر عزیزی

تصنیف لطیف:

حضرت شاہ عبد العزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

مترجم:

رئیس المتکلمین عالم باعمل پیر طریقت حضرت علامہ مولانا الحاج

صاحبزادہ پیر سید محمد محفوظ الحق شاہ چشتی صابری قادری

جواہرِ عزیزی

اُردو ترجمہ

تفسیرِ عزیزی

پارہ تیسواں

تصنیفِ لطیف:

حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ

مترجم:

[illegible]

صاحبزادہ پیر سید محمد محفوظ الحق شاہ چشتی صابری قادری

نوریہ رضویہ پبلی کیشنز

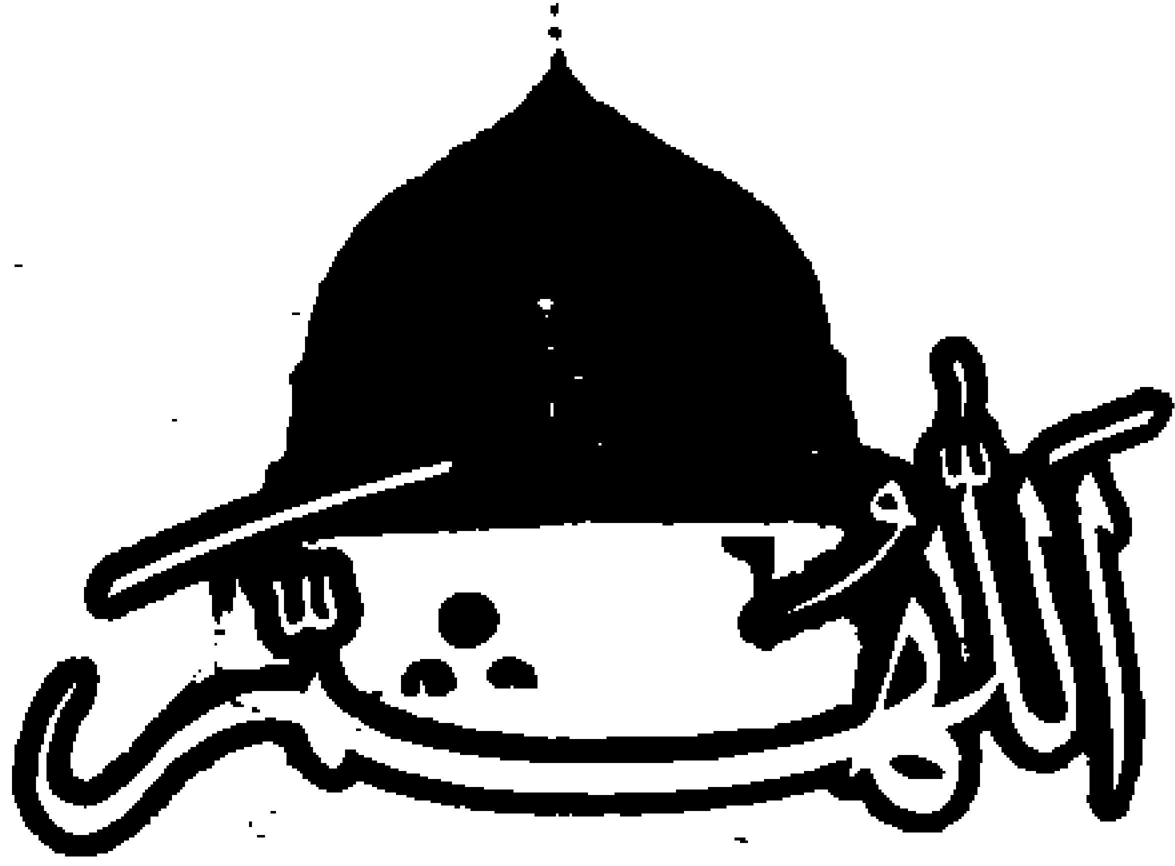
۱۱- داتا گنج بخش روڈ لاہور 042-7313885

نام کتاب	——	تفسیر عزیزی (تیسواں پارہ)
مصنف	——	شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی علیہ الرحمۃ
مترجم	——	صاحبزادہ سیّد محمد محفوظ الحق شاہ صاحب چشتی صابری قادری
زیر اہتمام	——	صاحبزادہ پیر سیّد محمد محمود الحق شاہ قادری
کمپوزنگ	——	ورڈز میکر
اشاعت	——	جمادی الاوّل ۱۴۲۹ھ جون ۲۰۰۸ء
ناشر	——	سیّد محمد شجاعت رسول شاہ قادری
مطبع	——	اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز لاہور
کمپیوٹر کوڈ	——	1N-131

ملنے کے پتے

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم



صَلِّ عَلٰی سَیِّدِنَا وَمَوْلَانَا مُحَمَّدٍ وَّعَلٰی اٰلِہٖ
وَصَحْبِہٖ وَبَارِكْ وَسَلِّمْ

مَوْلَایَ صَلِّ وَسَلِّمْ دَائِمًا اَبَدًا
عَلٰی حَبِیْبِكَ خَیْرِ الْخَلْقِ كُلِّھِمِ

مُحَمَّدٌ سَیِّدُ الْكَوْنَیْنِ وَالثَّقَلَیْنِ
وَالْفَرِیْقَیْنِ مِنْ عُرْبٍ وَّمِنْ عَجَمِ



نوریہ رضویہ پبلی کیشنز

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سورة التسآءل یا سورة النبأ

سورۃ تساء ل جسے سورۂ نباء بھی کہتے ہیں' مکی ہے۔اس کی چالیس (۴۰) آیات ہیں' ایک سوتہتر (۱۷۳) کلمات اور سات سوستر (۷۷۰) حروف ہیں۔

سورۃ والمرسلات کے ساتھ رابطے کی وجہ

اور اس کے سورۂ والمرسلات کے ساتھ مربوط ہونے کی وجہ یہ ہے کہ ان دونوں سورتوں میں جزا دینے کے عمل کو یوم الفصل آنے کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے اور یوم الفصل کے کچھ احوال بیان فرمائے اور قیامت کے آنے میں کافروں کا تعجب کرنا اسی مقدمے کے ساتھ دفع فرمایا گیا کہ جب قیامت کا آنا یوم الفصل کے بغیر نہیں ہوتا اور یوم الفصل اس جہان کی بربادی اور نوع انسانی کے ختم ہوئے بغیر صورت نہیں پکڑتا تو اس سے پہلے جزا دینے کا مطالبہ کرنا بمنزلہ اس کے ہے کہ گرمیوں میں سردیوں کے اور سردیوں میں گرمیوں کے پھل طلب کیے جائیں جو کہ نری بدگوئی اور قبیح کج بحثی ہے۔

اور اس کے علاوہ ان دونوں سورتوں کے مختلف مضامین میں پوری مشابہت واقع ہے وہاں وَاِذَا السَّمَآء فرجت واذا الجبال نسفت واقع ہے جبکہ یہاں وفتحت السمآء فکانت ابوابا وسیرت الجبال فکانت سرابا ہے وہاں الم نجعل الارض کفاتاوجعلنا فیھا رواسی شامخات واسقینا کم ماء فراتا واقع ہے جبکہ یہاں الم نجعل الارض مھادا والجبال اوتادا اوروانزلنا من المعصرات مآءً ثجاجا ہے وہاں دوزخ کی جلن اور اس کے چنگاروں کا شعلہ زن ہونا مذکور ہے جبکہ یہاں دوزخ میں ٹھنڈے پانی کا قحط' نہایت گرم پانی پینا مذکور ہے وہاں ھٰذا یوم لاینطقون ہے جبکہ

یہاں یوم یقوم الروح والملائکة صفا لایتکلمون ہے وہاں ان المتقین فی ظلال وعیون وفواکه ہے جبکہ یہاں حدائق داعنابا کا متقین کے لیے وعدہ کیا گیا ہے اور اس سورۃ میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اگر دنیا میں کفار کو کہا جائے کہ خدا تعالیٰ کے لیے ایک مرتبہ پشت خم کردو' نہیں کرتے جبکہ یہاں ارشاد ہوا کہ قیامت کے دن آرزو کریں گے کہ اے کاش ہم مٹی میں مل جائیں اور جہنم کے عذاب سے خلاصی پائیں اس تکبر و غرور کو اس خواری اور ذلت سے کیا تعلق؟

وجہ تسمیہ

اور اسے سورۃ تساءل کا نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ تساءل لغت عرب میں کسی چیز کے متعلق ایک دوسرے سے کثرت کے ساتھ سوال کرنا ہے اور اس سورۃ میں اس بات کا بیان پیش نظر ہے کہ آخرت کے امور کے حقائق' ذات و صفات کی بحثوں' مسئلہ قضاء و قدر' جبر و اختیار' توحید وجودی و توحید شہودی' صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کے اختلافات اور احکامِ شرعیہ کی حکمتوں کے بارے میں کثرت سے سوال کرنا جو کہ عوام کی سمجھ سے بالاتر ہیں اور ان کی عقل انہیں برداشت نہیں کر سکتی' بہت قبیح اور بُرا ہے اس لیے کہ غالب طور پر ان حقائق کے انکار تک بات جا پہنچتی ہے اور کم از کم اکثر ذہنوں میں شکوک و شبہات پیدا ہونے کا سبب ہوتا ہے حالانکہ ان چیزوں پر ایمان لانا اتنی بڑی تفتیش اور ان امور کی کیفیات اور کمیات کی تفصیلات پر آگاہ ہونے پر موقوف نہیں ہے۔

اور یہی ایک سخت مہلک بیماری ہے جو کہ اس اُمت میں عقائد کی خرابی اور گمراہ فرقوں کے پیدا ہونے کا موجب ہوئی اور اس نے ایک جہان کا ایمان ضائع کر دیا۔ حق تعالیٰ نے اس سورۃ میں اس امر کی قباحت بیان فرمائی تاکہ لوگ اس سے پرہیز کریں اور گمراہی کے بھنور میں نہ پڑیں۔

اور اسے سورۂ نبا کا نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ لغت عرب میں نباء بمعنی خبر ہے اور قیامت کی خبر اس قدر عظمت رکھتی ہے کہ گویا اس کے سوا کوئی خبر ہے ہی نہیں جس کے متعلق پوچھا جا سکے اسی لیے اس خبر کو نبا عظیم فرمایا گیا ہے کہ اپنی ذات میں بھی عظمت رکھتی ہے اور

اس کے واقع ہونے میں بھی عظمت ہے اور اسے سمجھنے میں بھی عظمت ہے اور ظاہر ہے کہ خبر کی عظمت یا باعتبار ذات ہوتی ہے کہ عمدہ آدمی اسے بیان کرتا ہے یا اس خبر کے مضمون کے واقع ہونے کے اعتبار سے ہے کہ کسی عظیم حادثے پر دلالت کرتی ہے یا اس خبر کے مفہوم کو سمجھنے اور فہم میں لانے کے اعتبار سے ہے کہ ہر کسی کی سمجھ میں نہیں آتا اور مشکل سے سمجھا جاتا ہے اور جب اس خبر میں تینوں صفات جمع ہوگئی ہیں یعنی خبر بھی موجودات میں عمدہ ترین ہے کہ حق تعالیٰ نے خبر دی ہے اور اس کے سوا کوئی یہ خبر نہیں دے سکتا اور عظیم حادثے کے واقع ہونے پر دلالت کرتی ہے جو کہ کسی کے فہم اور وہم میں نہیں سماتا اور اسے سمجھنا نہایت مشکل اور باریک ہے کہ انسان کی قوتِ عقلیہ نورِ غیبی کی مدد کے بغیر اسے دریافت نہیں کر سکتی اس وجہ سے اس خبر میں بہت عظمت پیدا ہوگئی تو ایسی خبر کے بارے میں دعویٰ کیا جا سکتا ہے کہ گویا خبر اسی خبر کا نام ہے اور جب بھی ایک دوسرے سے پوچھا کہ خبر کیا ہے' گو اسی خبر کے متعلق پوچھا جاتا ہے۔ پس جو سورۃ کہ اس خبر پر مشتمل ہے اسی کا نام خبر رکھنا چاہیے۔

نزولِ سورۃ کا سبب

اور اس سورۃ کے نزول کا سبب یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مبعوث ہوئے' آپ نے قیامت کا ذکر فرمایا' کفار نے سُن کر تعجب' مذاق اور اسے ناممکن جاننے کے طور پر ایک دوسرے سے اس خبر کی تفتیش کا آغاز کر دیا۔ بعض کہتے تھے کہ **کیف یحیی العظام وھی رمیم** یعنی بوسیدہ ہڈیاں کیونکر زندہ ہوں گی اور بعض کہتے تھے کہ **متی ھذا الوعد** یہ وعدہ کب پورا ہوگا اور بعض شک کرتے ہوئے کہتے تھے کہ **وما اظن الساعۃ قائمۃ** اور کچھ کہتے تھے کہ یہ کام بالکل ہونے والا ہی نہیں' **ان ھی الاحیوتنا الدنیا نموت ونحیا وما نحن بمبعوثین** اور ان کی تفتیش کے مقطع کا آخری حصہ یہی بات تھی کہ اگر اس قسم کے واقعہ کا رونما ہونا ممکن ہے تو ہمارے سامنے ایک دفعہ ہی واقع کیوں نہیں ہوتا اور نیکوں اور بُروں کو ان کے کردار کے مطابق جزا دینے میں اس دن کا انتظار کیوں ہے؟ دنیا میں جزا کیوں نہیں دی جاتی تاکہ لوگ عبرت پکڑ کر بُرے کام چھوڑ دیں اور نیک کاموں کو عمل میں لائیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس گفتگو کا رد فرمایا اور جزا دینے کو یوم الفصل کے ظاہر ہونے پر موقوف

ہونے کی وجہ بیان فرمائی۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

عَمَّ یَتَسَآءَلُوْنَ کس چیز کے متعلق ایک دوسرے سے سوال کرتے ہیں اور تفتیش کرتے ہیں' کیا کوئی ایسی چیز ہے جو کہ سوال و تفتیش کے قابل ہے اور وہ اسے سمجھنے کی استعداد رکھتے ہیں اور کثرت سے سوال کرنے کی وجہ سے ان کے ذہن میں بات صاف ہو جائے گی یا کوئی ایسی چیز ہے جو کہ سوال اور تفتیش کے قابل نہیں اور وہ اسے سمجھنے کی صلاحیت نہیں رکھتے اور وہ اس میں جتنی چھان پھٹک کریں گے' مقصد سے دور ہوتے جائیں گے اور اس طرح پوچھنے میں کہ کس چیز کے متعلق سوال کرتے ہیں اس بات کو جتلایا گیا ہے کہ عقل مند کو چاہیے کہ تفتیش اور سوال سوچ سمجھ کر کرنا چاہیے اور یوں نہ کریں کہ بے موقع سوال داغ دیں اور مقصد کو ختم کر دیں۔

اور لفظ عم اصل میں عما تھا اور ما کے الف کو تخفیف اور کثرت استعمال کی وجہ سے حذف کیا گیا ہے اور عربوں کا قاعدہ ہے کہ ما کے الف کو جر کے آٹھ حروف کے بعد حذف کر دیتے ہیں۔ عن' من' با' لام' فی' علیٰ' الی اور حتی کہ کثرت استعمال کا مقام ہے اور جب کلام کو سوال و جواب پر مبنی کیا گیا اور اس سوال کا جواب بالکل ظاہر اور معلوم تھا' خود ہی جواب عطا فرمایا گیا ہے کہ

عَنِ النَّبَاِ الْعَظِیْمِ آپس میں ایک بڑی خبر کے متعلق سوال کر رہے ہیں جو کہ اپنی ذات کے اعتبار سے عظمت رکھتی اور اپنے مضمون کے وقوع کے اعتبار سے بھی اور سمجھنے اور دریافت کرنے کے اعتبار سے بھی۔ پس وہ خبر

الَّذِیْ هُمْ فِیْهِ مُخْتَلِفُوْنَ ایسی ہے کہ وہ اس میں اختلاف کرتے رہتے ہیں اگرچہ آدم علیہ السلام کی تخلیق سے لے کر اس وقت تک انبیاء و مرسلین علیہم السلام کی زبان پر خداتعالیٰ کی طرف سے وہ خبر مسلسل پہنچ رہی ہے۔ انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیمات اسے دلائل کے ساتھ ثابت کرنے میں کوشش کرتے رہے ہیں اور اس خبر کے واقعات کو شرح وبسط اور تفصیل کے ساتھ واضح فرماتے رہے ہیں لیکن بنی آدم کا اختلاف ہرگز دور نہیں

ہوتا۔ بعض بالکل انکار کرتے ہیں' بعض کہتے ہیں کہ یہ جزا دینا عقلی ہوگا' بعض کہتے ہیں خیالی ہوگا اور بعض کہتے ہیں کہ حسی طور پر ہوگا اور بعض عقلی' خیالی اور حسی کے علاوہ کسی اور طریقے سے سمجھتے ہیں اور بعض آخرت کو تناسخ کے طریقے سے جانتے ہیں اور اسی عالم دنیا کو جزا دینے کی جگہ قرار دیتے ہیں اور عالم کبیر کی بربادی کو انبیاء ومرسلین علیہم السلام کی زبان سے سنتے ہیں اور اسے موت کے وقت انسانی جسم کے حالات میں خلل پڑنے پر محمول کرتے ہیں۔ بہرحال اس واضح بیان کے باوجود جو اختلاف کہ اس مسئلے میں ہے' کسی مسئلے میں بھی واقع نہیں ہے اور یہی انکار ذہنوں میں انکار اور شک ڈالنے کا موجب ہے۔

اور مومن کا راستہ یہ ہے کہ جب اس قسم کے مشکل حقائق جن کی تہ تک بشری عقل نہیں پہنچتی' یقین کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کی زبان سے سنے تو اجمالی ایمان کو ہاتھ سے نہ جانے دے جو کہ سعادت ابدی کا سرمایہ ہے اور کیفیات اور خصوصیات کی فالتو تفتیش نہ کرے ورنہ مقصد فوت ہو جائے گا۔

اور جب اس کلام میں بیان ہو چکا کہ لوگوں کے درمیان اس مسئلے میں بے حد تفتیش اور بے فائدہ سوال جاری ہیں اور یہ سب کچھ نقصان دہ ہے' نفع بخش نہیں اب اس تفتیش اور بے موقع تحقیق پر ڈانٹ پلائی جا رہی ہے۔

کَلَّا ایسا نہیں کرنا چاہیے اور ان چیزوں کی فضول تفتیش میں پڑنا نہیں چاہیے کہ اجمالی ایمان کو سخت نقصان پہنچتا ہے۔

سَیَعْلَمُوْنَ انہیں جلد پتہ چل جائے گا' آخرت میں جزا دینے کے بارے میں اس وضاحت کے ساتھ کہ کوئی اختلاف اور اشتباہ نہ رہے گا۔

ثُمَّ کَلَّا سَیَعْلَمُوْنَ پھر ہم کہتے ہیں کہ ایسا نہیں کرنا چاہیے' انہیں جلد معلوم ہو جائے گا' اور اس کلام کا تکرار صرف ڈانٹ ڈپٹ کی تاکید کے لیے ہے۔ گویا بار بار اس برے کام سے منع فرمایا جا رہا ہے اور اسے جاننے کا زمانہ قریب میں نشان دیا جا رہا ہے اس لیے کہ جو آنے والی شے ہے' قریب ہی ہے۔

اور بعض مفسروں نے پہلے سَیَعْلَمُوْنَ سے برزخ کا جاننا مراد لیا ہے کہ وہاں جزا دینا

خیالی طور پر واقع ہوگا جبکہ دوسری بار جاننا قیامت میں ہوگا کہ وہاں حقیقی طور پر جزا دی جائے گی اس لیے کہ روح کا بدن کے ساتھ تعلق ہو جائے گا اور تعلق کے باوجود مجرد ہونے کا اثر روح پر غالب رہے گا اور غلبۂ تجرد کے باوجود تعلق کی کیفیت اس روز واضح ہوگی اس لیے کہ دنیا میں تعلق تجرد کے مغلوب ہونے کا سبب ہے جبکہ برزخ میں تجرد غالب اور تعلق مغلوب۔ پس قیامت آنے سے پہلے تعلق اور غلبۂ تجرد کے جمع ہونے پر آگاہی ممکن نہیں۔

جواب طلب سوال

یہاں ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا اور وہ یہ ہے کہ سورۂ تکاثر میں كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ ثُمَّ كَلَّا سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ واقع ہوا جبکہ یہاں سَيَعْلَمُوْنَ ہے اور سوف تاخیر اور مہلت پر دلالت کرتا ہے جبکہ سین شتابی اور جلدی پر اور قیامت کا آنا اگر قریب اعتبار کریں تو وہاں سوف کا لفظ کیوں لایا گیا اور دُور اعتبار کریں تو یہاں حرف سین کیوں ذکر کیا گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سورۂ تکاثر میں مخاطب کفار ہیں اور ان کی نظر میں قیامت بہت دُور معلوم ہوتی تھی' ان کے گمان کے مطابق خطاب فرمایا گیا اور حرف سوف جو کہ دُوری اور فاصلے پر دلالت کرتا ہے' لایا گیا۔ جبکہ یہاں ایمان والے مخاطب ہیں جن کی نظر میں قیامت کا آنا بالکل سامنے اور قریب ہے۔ اِنَّهُمْ يَرَوْنَهٗ بَعِيْدًا وَّنَرٰىهُ قَرِيْبًا گویا ایمان والوں سے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ یہ کفار قیامت کا اپنی تمام تر کیفیات اور حالات کے ساتھ آنا عنقریب جان لیں گے۔

اور جب ان لایعنی سوالات کرنے پر ڈانٹنے سے فراغت ہوئی تو استفہام تقریری کے طور پر چند چیزوں کے متعلق پوچھا جا رہا ہے اور اقرار کرایا جا رہا ہے اور وہ سب کی سب نو چیزیں ہیں کہ دنیوی زندگی کا دارومدار عوام کے ذہنوں میں انہیں چیزوں پر ہے اگر کوئی ان چیزوں میں محروم رہے' گویا دنیا ہی میں نہیں ہے۔ پس جو شخص دنیا کی زندگی رکھتا ہے' لازمی طور پر ان نو چیزوں میں شریک ہوگا اور ان چیزوں میں مشترک ہونے کے باوجود لوگوں کے درمیان پورے طور پر فرق اور جدائی حاصل نہیں ہو سکتی۔ پس ان چیزوں میں مشترک رہتے ہوئے فرق اور جدائی کی درخواست کرنا ایسا ہی ہے کہ ایک گھر کے مکین کہیں کہ ہمارے

درمیان اس گھر میں سکونت اور اس گھر کے پانی' نمک' کھانے' پوشاک' صحن' چھت' فرش اور سامان سے نفع حاصل کرنے کے باوجود اس طرح مکمل فرق اور جدائی کر دی جائے کہ ہم کسی چیز میں بھی ایک دوسرے کے مشابہ نہ ہوں کہ یہ صریح بکواس' کج بحثی اور دو ضدوں کو جمع کرنے کی درخواست کرنا ہے۔

اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهٰدًا کیا ہم نے زمین کو تمہارا بچھونا نہ بنایا کہ اس میں رہتے ہو کھیتی باڑی اور تجارت کرتے ہو اور زندگی اور موت میں تمہاری جائے قرار اور ٹھکانا وہی ہے اور اس امر میں نیک و بد' مسلمان اور کافر شریک ہیں ایک دوسرے سے جدا نہیں ہیں جبکہ چاہیے کہ یوم الفصل کو نیکوں کا مقام جنت ہو اور بروں کا ٹھکانہ جہنم تاکہ پوری جدائی اور امتیاز محقق ہو جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا گیا ہے وَمَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِاَنْفُسِهِمْ يَمْهَدُوْنَ نیز فرمایا ہے کہ لَهُمْ مِّنْ جَهَنَّمَ مِهَادٌ

وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا کیا ہم نے پہاڑوں کو میخ کی طرح نہیں بنایا ہے جو کہ اپنے بوجھ اور سخت بھاری ہونے کی وجہ سے زمین کو تیز ہوائیں چلنے کے وقت ہلنے نہیں دیتے جس طرح کہ خیموں کی میخیں ہوتی ہیں اور اس نفع میں تمام آدمی شریک ہیں۔ آپس میں کوئی فرق اور جدائی نہیں رکھتے جبکہ يَوْمَ الْفَصْلِ کو چاہیے کہ جنتیوں کے جنت کے زریں مرصع محلات اور ایوانوں میں رہنے کا سبب ہو اور جہنمیوں کے جہنم اور آہنی زنجیروں اور طوقوں میں جکڑے جانے کا موجب ہو جو کہ گرم ہونے کی وجہ سے آگ کی طرح جلانے والے ہوں۔

وَخَلَقْنٰكُمْ اَزْوَاجًا اور ہم نے تمہیں جفت پیدا فرمایا' نر اور مادہ تاکہ نسل جاری ہو اور تمہارے درمیان نسبی اور سسرالی تعلقات محقق ہوں اور اس کی وجہ سے اُلفت' اجتماعیت اور باہمی تعاون اور امداد حاصل ہو اور دنیا کی زندگی پُر رونق ہو جبکہ یوم الفصل کو چاہیے کہ ان تعلقات میں سے کچھ بھی نہ رہے اس لیے کہ اپنے قریبیوں میں سے ایک آدمی کا دُکھ دوسروں کے دُکھی ہونے کا موجب ہوتا ہے تو اگر دنیا میں نیک لوگوں کے قریبیوں کو سزا دیں تو نیکوں کے عذاب کا موجب ہوگا اور اس سزا میں شراکت رونما ہو اور اگر بُروں کے قریبیوں کو نعمت عطا فرمائیں تو وہ قریبی ہونے کے تعلق کی وجہ سے بُروں کو اپنے ساتھ اس نعمت میں شریک

کرلیں ورنہ قریبیوں پر احسان کرنا ان سے فوت ہو جائے اور ان کی نیکی میں کمی واقع ہو جائے تو اس طرح بُروں پر انعام کرنا لازم آئے اور جزا کے مختلف ہونے کی صورت نہ بنے اور بخلاف یوم الفصل کے کہ اس میں یہ تعلقات دگرگوں ہو جائیں گے جیسا کہ دوسرے مقام پر ارشاد فرمایا گیا فَاِذَا نُفِخَ فِی الصُّوْرِ فَلَآ اَنْسَابَ بَیْنَهُمْ نیز فرمایا گیا ہے وَلَا یَسْئَلُ حَمِیْمٌ حَمِیْمًا۔

وَجَعَلْنَا نَوْمَكُمْ سُبَاتًا اور ہم نے دنیا میں تمہاری نیند کو راحت اور عمل سے فراغت کا سبب بنایا تا کہ تھکاوٹ اور مشقت دُور ہو اور راحت اور تازگی حاصل ہو جبکہ یوم الفصل کو چاہیے کہ اس میں نیند نہ ہو اس لیے کہ اگر آدمی نیک ہے تو اسے راحت اور تازگی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ چنانچہ جنتیوں کے بارے میں دوسری جگہ ارشاد فرمایا لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّلَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا لُغُوْبٌ پس نیند کی ضرورت بھی نہیں ہوگی جبکہ اگر وہاں نیند ہو تو عظیم فوائد پورے طور پر حاصل کرنے سے محرومی کا سبب ہو اور دائمی ثواب کے نقصان کا موجب ہو اور اگر آدمی بُرا ہے تو اسے دائمی دُکھ تکلیف اور چیخ و پکار لازمی ہے' اسے عذاب کی تکلیف اُٹھانے سے کب فرصت ملتی ہے کہ وہ راحت کے ساتھ وقت گزارے وہاں تو چیخ و پکار اور واویلا کے سوا کچھ نہیں ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر صراحت کے ساتھ یہ معنی بیان فرمایا گیا ہے۔

وَجَعَلْنَا الَّیْلَ لِبَاسًا اور ہم نے اہلِ دنیا کے لیے رات کو لباس اور پردہ بنایا کہ ہر چھپانے کی چیز اسی میں کی جاتی ہے جیسے عورتوں کی صحبت' خفیہ مشورے' دشمنوں سے فرار' چوری' خیانت' عیش' رقص و سرود' تہجد' مراقبہ اور دوسرے منافع جو کہ چھپنے سے تعلق رکھتے ہیں اور اسی لیے کہتے ہیں رات عاشقوں کا پردہ ہے۔ اے کاش اس کے اوقات ہمیشہ رہتے۔ نیز کہتے ہیں رات کے اندھیروں کے تیرے پاس کتنے احسان ہیں جو خبر دیتے ہیں کہ مانو یہ نے جھوٹ کہا جبکہ یوم الفصل کو چاہیے کہ اس کے واقعات خاص و عام ہر کسی پر ظاہر اور روشن ہوں نہ کہ مخفی اور چھپے ہوئے ورنہ نیکوں کی عظمت و شوکت اور بُروں کی ذلت و رسوائی ثابت نہ ہو۔

حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے ایک شخص نے پوچھا کہ عقد نکاح کی مجلس رات میں ہونی چاہیے یا دن میں؟ فرمایا کہ رات میں کیونکہ حق تعالیٰ نے رات کو لباس فرمایا ہے اور منکوحہ عورتوں کو بھی لباس فرمایا کہ هُنَّ لِبَاسٌ لَّكُمْ ایک لباس کو دوسرے لباس کے ساتھ پوری مناسبت ہے۔

وَجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا اور ہم نے دنیا والوں کے لیے دن روزی کی تلاش کا وقت بنایا جبکہ یوم الفصل میں بالکل تلاش نہ ہوگی اس لیے کہ نیکوں کو نعمتیں خود بخود تیار موجود ملیں گی اگر وہاں بھی انہیں روزی تلاش کرنے کی ضرورت پڑے تو یہ نرا عذاب ہے اور بُروں کو روزی تلاش کرنے کی طاقت نہیں کیونکہ پاؤں میں زنجیر' گلے میں طوق جہنم کے فرشتوں کے ہاتھوں گرفتار ہیں اور بھوک اور پیاس کے عذاب میں بے چین ہیں تا کہ دونوں گروہوں کی روزی کے درمیان پورا فرق ظاہر ہو اور دنیوی زندگی کی طرح اس فکر کی سر پھٹول اور گرفت میں نہ رہیں۔

وَبَنَيْنَا فَوْقَكُمْ سَبْعًا شِدَادًا اور ہم نے تمہارے اوپر سات سخت اور مضبوط طبقات بنائے جو کہ صدیاں اور زمانے گزارنے کے باوجود پرانے نہیں ہوتے اور ان میں سات سیارے مختلف حرکات میں مصروف ہیں اور نئے اطوار رونما کرتے ہیں اور ہر طور میں ان سے ایک خاص تاثیر ظہور پذیر ہوتی ہے اور اس تاثیر سے نقصان اور نفع پانے میں سب کے سب مومن و کافر' نیک بخت اور بد بخت شریک ہوتے ہیں بخلاف یوم الفصل کے کہ وہاں نیکوں کے لیے درجات جنت' چھت کی مانند ہیں اور انبیاء علیہم السلام اور پیشواؤں کی نورانی ارواح درجہ بدرجہ اپنے سے نچلے لوگوں کے بارے میں امداد فرماتی ہیں اور نچلی سطح کے لوگ اس امداد سے ترقی حاصل کرتے ہیں اور بُروں کو دوزخ کے طبقات نیچے سے محیط ہیں اور دجالوں اور کفر کے سرداروں کی خبیث ارواح اپنی ظلمانی کیفیات کے ساتھ اوپر والے لوگوں کے عذاب میں زیادتی کرتی ہیں۔

وَجَعَلْنَا سِرَاجًا وَّهَّاجًا اور ہم نے اہلِ دنیا کے نفع کے لیے ایک تیز شعاعوں والا چمکتا ہوا چراغ بنایا جو کہ سورج ہے اور حرارت اور روشنی کو جمع کرنے والا ہے اور نیک و بد میں

سے ہر ایک اس کی روشنی اور حرارت سے نفع و نقصان پاتا ہے بخلاف یوم الفصل کے کہ جمال الٰہی کا جلوہ جنت میں نیکوں پر نور افشانی فرماتا ہے جبکہ جلالِ الٰہی کا جلوہ جسے حدیث پاک میں قدم کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے جہنمیوں کو شدید حرارت کے ساتھ جلاتا ہے۔

وَاَنْزَلْنَا مِنَ الْمُعْصِرَاتِ اور ہم نے چھلکتے بادلوں سے اُتارا۔ مَآءً ثَجَّاجًا موسلا دھار پانی لِنُخْرِجَ بِهٖ حَبًّا تاکہ ہم اس کی وجہ سے غلہ پیدا کریں جو کہ تمہاری خوراک بنتا ہے۔ وَنَبَاتًا اور سبزیاں جن میں سے بعض سالن، بعض مصالح اور بعض تمہارے جانوروں کی خوراک اور چارہ بنتی ہیں تاکہ تم ان سے دودھ، دہی، گھی اور پنیر حاصل کرو اور کام میں لاؤ۔

وَجَنّٰتٍ اَلْفَافًا اور گھنے باغات تاکہ تمہارے پھل کھانے اور لذت حاصل کرنے کے کام آئیں اور تم ان باغات کے پھلوں کو مختلف اقسام میں ترتیب دے کر اچار، مربا، سرکہ، جوس اور شربت بنا کر استعمال کرو اور اس نفع لینے میں تم سب نیک و بد مومن و کافر شریک ہو، کوئی امتیاز نہیں کہ بارش کس مقام پر ہو، کھیتیاں کس مقام پر سرسبز ہوں اور باغ کہاں اُگیں اور کس مقام پر بارش نہ ہو اور سبزہ نہ اُگے اور پھل نہ پکے۔ بخلاف یوم الفصل کے وہاں نیکوں کے کسب کیے ہوئے اعمال، عقائد، احوال اور مقامات بادلوں کی طرح دودھ، شہد، خوشگوار شربت اور صاف پانی برسائیں اور نہریں جاری ہوں اور جنتی درخت اس بارش کی قوت اور نہروں کے اثر سے لذیذ پھل خود بخود لائیں اور جب بھی کہیں سے پھل توڑ کر کھائیں تو نشو و نما کے مواد کی لطافت کی وجہ سے اس پھل کی جگہ دوسرا پھل پیدا ہو جائے اور اس سے پھل اور لذت حاصل کرنا کبھی منقطع نہ ہو جبکہ بُروں کے بُرے اعمال، عقائد اور عادات دھوئیں کی طرح اُٹھیں اور چنگارے برسائیں اور ان کے جسموں کو جلائیں جیسا کہ فرمایا گیا ہے وَظِلٍّ مِّنْ يَّحْمُوْمٍ۔ اِنْطَلِقُوْٓا اِلٰى ظِلٍّ ذِيْ ثَلٰثِ شُعَبٍ اور تھوہر اور دوسرے خاردار بدذائقہ اور مکروہ صورت درختوں کے اُگنے کا سبب ہوں تاکہ دونوں گروہوں کی گزر بسر میں پورے طور پر فرق اور جدائی حاصل ہو۔ پس معلوم ہوا کہ یوم الفصل دنیا میں رونما نہیں ہو سکتا اس لیے کہ جدائی، اتفاق اور شرکت کے بالکل منافی ہے تو یوم الفصل کا ان

چیزوں کی موجودگی میں کہ ان میں شرکت اور اتفاق واقع ہے' تصور نہیں کیا جا سکتا بلکہ اس جہاں کی بربادی اور یہاں کے اتفاقات کے اصول و ارکان کو درہم برہم کرنے کے بعد اس کی توقع کرنا چاہیے اور اس کی آمد کے وقت کو اس جہان کی بربادی کی ابتدا سے سمجھا جا سکتا ہے۔ چنانچہ فرمایا

اِنَّ یَوْمَ الْفَصْلِ تحقیق نیکوں کو بُروں سے' نیکوں کے درجات کو ایک دوسرے سے اور بُروں کے مرتبوں کو ایک دوسرے سے علیحدہ' ممتاز اور جدا کرنے کا دن'

کَانَ مِیْقَاتًا ایک مقرر شدہ وقت ہے جو کہ آگے پیچھے نہیں ہو سکتا اور دنیا میں کفار کا اسے جلد طلب کرنا اسے پہلے نہیں کر سکتا۔

وقت قیامت کے لیے چند چیزیں لازم ہیں

اس لیے کہ اس وقت کے لیے چند ضروری ہیں۔ پہلی چیز یہ کہ جدائی کے بعد ارواح کا جسموں کے ساتھ تعلق بحال ہو اسی لیے برزخ کے اوقات میں بھی قیامت نہیں ہو سکتی اس لیے کہ برزخ میں روح کا بدن کے ساتھ تعلق بالکل نہیں ہے اور پہلے جسم کے ساتھ روح کے تعلق کے بغیر اس جسم میں کسب کیے ہوئے اعمال کی جزا دیکھنا ممکن نہیں اس لیے کہ جسم کے ساتھ تعلق کے بغیر روح کو صرف عالم خیال کی سیر ہے اور بس جیسے لکھنے والا جس کے ہاتھ کو کاٹ دیا گیا ہو وہ اپنے خیال میں اپنی انگلیوں کو حرکت دیتا ہے اور اپنے خیال میں لکھتا ہے' یہ لکھنا حقیقی نہیں ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ارواح اور اجسام سب کے سب تعلق میں جمع ہو جائیں اس لیے کہ اجتماع کے بغیر فرق اور امتیاز کا تصور نہیں ہوتا اگر ایک گروہ کے ساتھ ایک جگہ ایک انداز کے ساتھ معاملہ کریں تو اس گروہ کا امتیاز حاصل نہیں ہوتا جب تک کہ دوسرے گروہوں کے ساتھ اسی مقام پر اور اسی وقت دوسرے انداز میں معاملہ نہ کریں ورنہ احتمال ہوتا ہے کہ شاید یہ معاملہ اس وقت کے تقاضے کے مطابق یہاں رونما ہوا۔ ہواگر دوسرے لوگ بھی اسی وقت اور اسی جگہ ہوتے تو ان کے ساتھ بھی اس طرح سلوک کیا جاتا جیسا کہ اہلِ دنیا عزت و ذلت اور رزق کی وسعت و تنگی کو گردش کے تقاضے کی وجہ سے سمجھتے ہیں اور اپنے دل کو تسلی

دیتے ہیں کہ اگر گزشتہ لوگ اس وقت ہوتے تو اسی حالت میں گرفتار ہوتے اور اگر خوشحالی والے ملک کے لوگ قحط زدہ ملک میں ہوتے تو بھوک بھوک کی صدا لگاتے۔ پس لازم ہوا کہ یوم الفصل نوع انسانی کی تمام ارواح کے اپنے جسموں سے جدا ہونے کے بعد واقع ہوتا کہ ایک وقت اور ایک مقام میں ان ارواح کا تعلق جسموں کے ساتھ ایک ساتھ ہو۔

تیسری چیز یہ ہے کہ وہ مشترکہ نعمتیں جو کہ فقیر و غنی' مومن و کافر' نیک و بد' لائق و نالائق اور صحت مند و بیمار کے درمیان یکساں اور برابر ہیں' ان میں سے کچھ بھی باقی نہ رہے ورنہ برابری اور شرکت لازم آئے اور مقصود جو کہ فرق اور امتیاز کرنا ہے' حاصل نہ ہو۔

چوتھی چیز یہ ہے کہ اس آسمان اور زمین کے بدلے دوسری جگہ اور مسکن حاصل ہو اور جب اس جہان میں وہ جگہ اور مسکن آسمان کے اوپر اور زمین کے نیچے پوشیدہ ہے تو اسے ظاہر کرنے کے لیے آسمان اور زمین کو زائل کرنا ضروری ہے تاکہ نیکوں کے لیے جنت آسمان کے اوپر سے ظاہر ہو اور بُروں کے لیے جہنم زمین کے نیچے سے جوش مارے اسی لیے وہ وقت ثابت نہ ہوگا مگر

یَوْمَ یُنْفَخُ فِی الصُّوْرِ اس دن جبکہ صور پھونکا جائے۔ اور یہ دوسری مرتبہ پھونکنا مراد ہے کہ قیامت کے دن کا آغاز اسی سے ہے اور اس پھونکنے کی وجہ سے افراد انسانی کی تمام ارواح اپنے جسموں کے ساتھ متعلق ہو کر ہر دین اور مذہب والے جدا جدا اُٹھیں گے' فرشتے لوگوں کی اس انتظام کے ساتھ گروہ بندی کریں گے کہ مثلاً یہودیوں' نصرانیوں' مجوسیوں اور ہندوؤں وغیرہم کی صفیں جدا جدا ہوں گی اور اہلِ اسلام اور توحید پرستوں کی صفیں علیحدہ۔ پھر ہر نبی علیہ السلام کے پیروکار جدا اور ایک نبی علیہ السلام کے پیروکاروں میں سے مختلف مذاہب اور مختلف مشربوں والے جدا اور اسی طرح نیکی اور بُرائی کے ہر عمل والے جیسے نماز' روزہ' بدکاری' چوری' شراب نوشی' ہر عادت والے جیسے تکبر کرنے والے' بُرے اخلاق والے' رحم دل اور شفقت کرنے والے اور حمد کرنے والوں' صبر کرنے والوں' شکر کرنے والوں اور توکل کرنے والوں میں سے ہر مقام والے جدا جدا کھڑے کر دیئے جائیں گے جیسے بہت بڑے لشکر کے رسالے کہ ان کا پہلا امتیاز امیروں کے ساتھ کرتے ہیں اس کے بعد رسالہ دار

پھر جمعدار۔ پھر انہیں فرشتے میدانِ حشر کی طرف چلائیں گے۔

فَتَاْتُوْنَ اَفْوَاجًا پس تم سب کے سب فوج در فوج اور گروہ در گروہ آ ؤ گے کہ ایک گروہ کے آدمی دوسرے گروہ کے آدمیوں میں نہیں ملیں گے اور اس معنی کو بہت سی آیات اور بے شمار احادیث میں کھول کر بیان فرمایا گیا ہے۔

ان میں سے یہ ہے کہ فرمایا گیا ہے وَیَوْمَ یُحْشَرُ اَعْدَآءُ اللّٰهِ اِلَی النَّارِ فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ نیز فرمایا وَیَوْمَ نَحْشُرُ مِنْ كُلِّ اُمَّةٍ فَوْجًا مِّمَّنْ یُّكَذِّبُ بِاٰیٰتِنَا فَهُمْ یُوْزَعُوْنَ اس کے علاوہ اور بھی ہیں جنہیں تفصیل کے ساتھ ذکر کرنے سے بات طویل ہو جاتی ہے۔ اور بعض احادیث صحیحہ میں ہر فوج کی علامت اور نشانی بیان فرمائی گئی ہے۔ مثلاً دغا بازوں اور عہد شکنی کرنے والوں کی پشت پر جھنڈا گاڑ کر اٹھائیں گے اور اگر اس نے کسی مقدمے میں جان بوجھ کر غداری اور وعدہ خلافی کی تھی تو ایک بڑا جھنڈا اس کی مقعد پر اُگے گا۔ اور کسی مقدمہ میں جہالت کی تھی تو ایک چھوٹا جھنڈا مقام مخصوص پر اُگے گا۔ اور جنہوں نے مالِ غنیمت میں خیانت کی تھی تو وہ چوری کی ہوئی چیز اس کی گردن پر لاد کر لائیں گے۔ اور اگر اونٹ یا بکری یا گھوڑا یا گائے ہے تو وہ آواز کرے گی اور اگر تھان اور کپڑا ہے تو جھنڈے کے پردے کی طرح ہوا میں لہرائے گا۔ جبکہ شہیدوں کو خون آلود اٹھائیں گے کہ ان کے زخموں سے کستوری کی خوشبو آئے گی۔ اور بین کرنے والی عورت کا کرتہ گندھک کا ہوگا اور اس کا جسم خارش زدہ۔ اور مانگنے والے گداؤں کے چہرے جو کہ ضرورت شرعیہ کے بغیر لوگوں سے مانگتے ہیں زخمی اور خراش زدہ ہوں گے۔ علیٰ ہذا القیاس تلاش کے بعد اس باب میں کثیر تعداد میں صحیح احادیث پائی جاتی ہیں۔

قیامت کے دن چند گروہ کس کس شکل میں حاضر ہوں گے

ثعلبی اپنی تفسیر میں سند کے ساتھ لائے ہیں اگرچہ ان کی سند اتنی معتبر نہیں ہوتی اور ان کی مرویات پوری قوت نہیں رکھتیں کہ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس سورۃ میں مذکور افواج کے متعلق پوچھا تھا۔ آپ نے فرمایا کہ میری اُمت کے دس فرقے دس افواج ہو کر آئیں گے۔ ایک فرقہ بندروں کی شکل میں اور وہ چغل خور

ہوں گے' دوسرا فرقہ سوروں کی شکل میں اور وہ حرام کھانے اور رشوت لینے والے ہوں گے' تیسرا فرقہ اُلٹے ہوئے سر زمین پر اور پاؤں اوپر کی طرف اور انہیں فرشتے منہ کے بل کھینچ کر لائیں گے اور وہ سود کھانے والے ہوں گے۔ چوتھا فرقہ اندھے اور وہ جج اور مفتی ہوں گے جو کہ غلط فیصلے اور فتوے دیتے تھے۔ پانچواں فرقہ بہرے اور گونگے اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو اپنی عبادات اور نیکیوں پر غرور کرتے تھے اور خود بینی کرتے تھے' چھٹا فرقہ اپنی زبانیں چبائیں گے اور ان کی زبانیں منہ سے باہر ان کے سینوں پر لٹکتی ہوں گی اور ان کے منہ سے زرد پانی اور پیپ جاری کہ تمام اہلِ محشر انہیں دیکھ کر نفرت کریں گے اور یہ فرقہ وہ علماء اور مشائخ ہوں گے جن کے اعمال ان کے اقوال کے خلاف تھے۔

ساتواں فرقہ ہاتھ پاؤں کٹے ہوئے اور یہ وہ لوگ ہوں گے جو کہ جانوروں بے زبانوں کو بلاوجہ ایذاء دیتے تھے اور ہمسائے کو ستاتے تھے اور آٹھواں فرقہ آتشیں پھانسیوں پر لٹکائے ہوئے۔ اور یہ وہ ہوں گے جو کہ لوگوں کے بھید ظالم حکام کے سامنے ظاہر کرتے اور انہیں تکلیف پہنچاتے تھے۔ اور نواں فرقہ وہ لوگ ہوں گے جن کی بدبو مردار سے بھی بدتر ہوگی اور ان کی بدبو سے اہلِ محشر تنگ ہوں گے۔ اور وہ لوگ اپنی خواہشات اور لذتوں کے تابع تھے اور اپنے اموال سے اللہ تعالیٰ کا حق ادا نہیں کرتے تھے بلکہ اپنی خواہشات میں خرچ کرتے تھے۔ اور دسواں فرقہ گندھک کے لمبے کُرتے پہنے ہوئے اور وہ کُرتے ان کے جسموں پر چپکے ہوئے ہوں گے اور یہ فرقہ تکبر اور غرور والے ہوں گے اور یہ تمام مذکورہ حالات اس اُمت کے بدبختوں اور نافرمانوں کے ہیں۔

رہے ایمان والے اور نیک لوگ تو ان میں سے بعض چودھویں رات کے چاند کی طرح چمکیں گے اور بعض آسمان کے ستاروں کی طرح روشن ہوں گے اور بعض نور کے منبروں پر بیٹھے ہوں گے اور بعض زریں مرصع کرسیوں پر ہوں گے اور بعض مشک اور زعفران کے ٹیلوں پر ہوں گے۔ علیٰ ہذا القیاس

وَفُتِحَتِ السَّمَآءُ اور شگاف ڈال کر آسمان کشادہ کیے جائیں گے تاکہ فرشتے اعمال کے صحیفے لے کر نیچے آئیں اور اعمال کی صورتیں جو کہ ہر عمل کے اوپر آنے کے بعد آسمان

میں پیدا ہوئی ہوں گی' ظاہر ہوں اور بہشت جس کا خزانہ ساتویں آسمان کے اوپر ہے' نمودار ہو۔ گویا آسمان کو اس طرح اُٹھالیا گیا جیسے تھال کے اوپر سے سرپوش اُٹھالیا جائے۔

فَكَانَتْ اَبْوَابًا پس آسمان دروازے بن جائے گا کہ اس راستے سے جنت میں داخلہ ہو سکے اور جنتی نعمتیں نظر آسکیں۔

وَسُيِّرَتِ الْجِبَالُ اور پہاڑ جاری کر دیئے جائیں گے جو کہ زمین کی میخوں کی جگہ تھے۔

فَكَانَتْ سَرَابًا پس وہ جاری ریت کی طرح ہوں گے جو کہ دُور سے پانی معلوم ہوتی ہے اور حقیقت میں ریت ہے۔ اسی طرح پہاڑ جاری ہونے کی صورت میں دُور سے یوں معلوم ہوگا کہ پہاڑ ہیں لیکن حقیقت میں ریزہ ریزہ ہو کر ریت کی طرح ہو چکے ہوں گے جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا ہے:

وَكَانَتِ الْجِبَالُ كَثِيْبًا مَّهِيْلًا اور ایک اور مقام پر فرمایا وَكَانَتْ هَبَآءً مُّنْبَثًّا اور جب زمین کی میخوں کی یہ حالت ہوگئی' زمین بھی درہم برہم ہوگئی اور دوزخ کا مرکز جو کہ اس کے نیچے تھا' کھل گیا حتیٰ کہ آسمان کی جگہ جنت جائے قرار بن گئی اور زمین کے بجائے جہنم اور اطاعت کرنے والوں اور نافرمانوں نیز نیکوں اور بدوں کے مکان کے درمیان جدائی متحقق ہوگئی اور زمین و آسمان درمیان سے نکل گئے۔ سورج' بارش اور دوسری مشترکہ نعمتیں جن کا ذکر پہلے گزر چکا ہے' سب فنا ہوگئیں اور نیکوں اور بُروں کے درمیان کسی طرح بھی شرکت نہ رہی اس لیے کہ بُروں کے رہنے سہنے کی جگہ اور نیکوں کا مقام اور ہوگیا۔

اِنَّ جَهَنَّمَ كَانَتْ مِرْصَادًا تحقیق دوزخ گرفتار کرنے کی جگہ ہے جس کے کنارے پر فرشتے آتشیں گرزیں' زنجیریں اور طوق لیے کھڑے ہیں اور لوگوں کو قید کر کے لے جا رہے ہیں۔

لِّلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا سرکشوں کا ٹھکانہ ہے جبکہ ایمان والوں اور نیکوں کو یہاں سے گزرنے اور اس کی ہولناکیوں کو دیکھنے کے سوا اور کوئی تکلیف نہیں ہوگی' ان میں سے بعض کوندتی بجلی کی طرح پل صراط سے گزر کر جنت میں پہنچ جائیں گے اور بعض تیز ہوا اور بعض دوڑنے

والے گھوڑے کی طرح۔ علیٰ ہذاالقیاس یہاں تک کہ مسلمانوں میں سے سب سے زیادہ کمزور آدمی جو کہ گناہوں سے بہت زیادہ آلودہ تھا' گرتے اُٹھتے سات ہزار سال کی مدت میں پل صراط کو عبور کرے گا۔

اور حضرت فضیل بن عیاض رحمۃ اللہ علیہ سے مروی ہے کہ پل صراط کا فاصلہ تین ہزار سال کا ہے' بال سے زیادہ باریک اور تلوار سے زیادہ تیز' ہزار سال اوپر آنے کے لیے' ہزار سال ہموار چلنے اور ہزار سال اُترنے کے لیے اور یہ سب کچھ ایمان والوں کے بارے میں ہے جبکہ کفار دوزخ کے فرشتوں کے ہاتھوں گرفتار ہو کر اس کی تہ میں جا گریں گے۔

لَابِثِيْنَ فِيْهَآ اَحْقَابًا اس دوزخ میں کئی صدیاں ٹھہریں گے

حقبہ کا بیان

اور ہلال ہجری سے منقول ہے جنہوں نے حضرت امیرالمومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ سے احقاب کے معنی پوچھے تھے۔ آپ نے فرمایا کہ ہر حقبہ ستر ہزار سال کا ہے اور ہر سال بارہ مہینوں کا اور ہر مہینہ تیس دن کا اور ہر دن دنیا کے سال کے برابر۔

اور بعض نادان اس آیت کے بارے میں غلط فہمی کی وجہ سے کہتے ہیں کہ یہ عذاب کے دائمی اور ہمیشہ ہونے کے خلاف ہے جو کہ دوسری آیات سے معلوم ہوتا ہے حالانکہ اس آیت میں احقاب کا تعین نہیں فرمایا گیا تا کہ عذاب کا منقطع ہونا معلوم ہو بلکہ اس سے مدت کی کثرت کا پتہ چلتا ہے کیونکہ غیر متناہی احقاب مراد ہیں اور ان بے وقوفوں کو حقبہ کی مدت کی انتہا کا احقاب کی مدت کی انتہا کے ساتھ اشتباہ ہوتا ہے۔ نہیں سمجھتے کہ ایک حقبہ کی انتہا احقاب کے منتہی ہونے کا موجب نہیں ہو سکتی۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس آیت میں دوزخیوں کے دوزخ میں ٹھہرنے کی مدت کی مقدار بیان کرنا منظور نہیں بلکہ منظور یہ بیان کرنا ہے کہ دوزخ میں دوزخیوں کے ٹھہرنے کی مدت کو احقاب کے ساتھ مقدر مانیں نہ قرنوں' سالوں' مہینوں' دنوں اور گھنٹوں کی گنتی کے ساتھ اس لیے کہ اگر ٹھہرنے کی مدت کم ہوتی ہے تو اسے گھنٹوں کے ساتھ گنتے ہیں اور جب اس سے زیادہ ہو تو دنوں کے ساتھ اور جب اس سے بھی زیادہ ہو تو مہینوں کے

ساتھ اور جب اس سے بھی گزر جائے تو سالوں کے ساتھ گنتے ہیں' اس کے بعد قرنوں کے ساتھ اور جب بے انتہا ہو تو احقاب کے ساتھ۔ جس طرح کہ قلیل مال کو روپوں کے ساتھ گنتے ہیں اور جب اس سے زیادہ ہو تو سوؤں' ہزاروں کے ساتھ اور جب شمار میں نہ آئے تو لاکھوں کروڑوں کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں اور فراء نے کہا ہے کہ احقابا اس صفت کے ساتھ موصوف ہے جو کہ آگے آ رہی ہے یعنی

لَا يَذُوقُونَ فِيهَا بَرْدًا وَّلَا شَرَابًا اس مدت میں ٹھنڈک اور پینے کی چیز نہیں چکھیں گے کہ باہر سے ٹھنڈی ہوا پہنچے اور اندر سے ٹھنڈا پانی پینے سے جلنے کے عذاب میں کچھ تخفیف حاصل کریں جیسا کہ دنیا میں بخار والے کو ان چیزوں کی وجہ سے تخفیف ہوتی ہے تو گویا یوں ارشاد ہوا کہ اس مدت دراز میں ٹھنڈک کا نام تک نہ پائیں گے اور اس کے بعد انہیں زمہریر کے طبقے میں لے جائیں گے اور سردی کا عذاب دیں گے یہاں تک کہ سردی کی بے حد شدت کی وجہ سے ان کے رگ و پے جم جائیں اور انہیں پھر دوزخ کی آگ میں لائیں گے اور جلنے کا عذاب دیں گے اسی مدت تک۔ جس طرح کہ پہلے عذاب دیا گیا تھا اور اسی طریقے پر ابدالآباد تک عذاب میں رہیں گے کبھی گرمی کے ساتھ اور کبھی سردی کے ساتھ

جب یہاں ارشاد ہوا کہ یہ لوگ اس امدت تک دوزخ میں پینے کی کوئی چیز نہیں چکھیں گے حالانکہ دوسرے مقام پر فرمایا گیا ہے کہ لَهُمْ شَرَابٌ مِّنْ حَمِيمٍ (۷-۱۴) یہاں استثناء کے طریقے پر فرمایا جا رہا ہے۔

اِلَّا حَمِيمًا مگر نہایت گرم پانی جو کہ ان کی انتڑیوں کو کاٹ دے گا اور اندر کی گرمی کئی گنا بڑھا دے گا۔ چہ جائیکہ کوئی تخفیف بخشے۔ وَغَسَّاقًا اور میل کچیل اور ان کے اور دوسرے دوزخیوں کے جلے ہوئے اعضاء کی پیپ جو کہ گڑھوں میں جمع ہوگی اور وہ پیاس کی سخت مجبوری کی وجہ سے اس سے پئیں گے اور وہ ان کے اندرونی ماحول کو ردی زہریلی کیفیت کے ساتھ خراب کر دے گی۔

اور اگر دوزخیوں کے بے انتہا مدت تک آگ میں ٹھہرنے کا سُن کر کسی کے دل میں شبہ گزرے کہ دنیا میں ان کا کفر اور گناہ ایک محدود وقت میں تھے جو کہ ان کی عمر کی مدت ہے

اور اس کے بدلے نہ ختم ہونے والا عذاب دینا صریح ظلم ہے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ غلط فہمی ہے بلکہ یہ نہ ختم ہونے والا عذاب عین انصاف ہے اور اس عذاب میں جزا نہیں دی جائے گی مگر جَزَآءً وِّفَاقًا ایسی جزا جو کہ ان کے اعمال کے مطابق ہے اس سے زیادہ نہیں اس لیے کہ غور کرنے اور گہری نظر دیکھنے سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کا عمل بھی دائمی' ابدی اور نہ ختم ہونے والا ہے اس لیے کہ

اِنَّهُمْ كَانُوْا لَا يَرْجُوْنَ حِسَابًا تحقیق انہیں اپنے اعمال کے حساب کی امید نہ تھی اور جب حساب کی امید نہ تھی تو ان سے اعمال کا منقطع ہونا محض لاچاری اور عمل کے اسباب کے فقدان کی وجہ سے تھا نہ کہ عذاب کے خوف یا ثواب ضائع ہونے کے کھٹکے کی وجہ سے اس لیے یہ کہ دونوں صورتیں حساب کی توقع کی ہیں۔ پس ان کا بُرے اعمال سے باز رہنا اس قبیلے سے تھا کہ کہتے ہیں مصرع پارسائی بی بی از بے چادری ست اور گناہوں کی محبت ان کی روح کے جوہر میں رچی بسی تھی اور اس نے ملکہ کا حکم پیدا کر رکھا تھا اور روح ابدی ہے' غیر متناہی بقاء رکھتی ہے اور اس سے اس میں رچے بسے اوصاف کا جدا ہونا محال ہے۔ پس وہ اوصاف بھی روح کے دوام تک دائمی ہیں اور عذاب کا سبب ہیں اور جب سبب دائمی ہو تو مسبب کے دائمی ہونے سے کیا تعجب کیا جا سکتا ہے۔ نیز وہ بے حساب اعتماد کے ساتھ اعضاء کے اعمال پر ہی اکتفا نہیں کرتے تھے بلکہ وہ اعمال جن کا روح کی ذات سے تعلق ہے اور آلات و اعضاء کی ان میں بالکل کوئی شراکت نہیں' بھی ان سے صادر ہوتے تھے اور وہ اعمال روح کے دوام کے ساتھ دائمی ہیں اس لیے کہ وہ کفر کرتے تھے۔

وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا اور انہوں نے ہماری آیات کا جو کہ جزا اور حساب کے واقع ہونے پر دلالت کرتی تھیں' انکار کیا۔ كِذَّابًا زبردست انکار کہ ان آیات کے سچا ہونے کا احتمال بالکل ان کے خیال میں گزرتا ہی نہیں تھا اور یہ انکار روح کا کام ہے نہ کہ جسم کا۔ پس عالم برزخ میں روح کے بدن سے جدا ہونے اور پھر عالم حشر و نشر میں روح کے بدن کے ساتھ متعلق ہونے کے بعد ابدالآباد تک باقی ہے جیسے پختہ مزاج کی خرابی جو کہ ہر وقت تکلیف کا باعث ہوتی ہے اسی طرح یہ انکار ہر لحظہ عذاب زیادہ ہونے کا موجب ہوگا۔

اور اگر پھر کسی کے دل میں شبہ گزرے کہ گناہوں کی محبت' آیات کا انکار اور روح کے دوسرے قبیح اعمال ایسے نہیں ہیں کہ لوگوں پر ظاہر ہوں تو ان کے مقابلے میں عذاب دینا کس دلیل سے درست ہو سکتا ہے جب تک کہ کسی شخص کی خیانت محضر عام میں ظاہر نہ ہوا سے اس خیانت پر مواخذہ نہیں کیا جا سکتا اور ان کے وہ اعمال جو لوگوں پر ظاہر ہوتے تھے' یہی جسم کے اعمال تھے جو کہ جسم سے روح کے جدا ہونے کے بعد ختم ہو گئے۔ ہم کہتے ہیں کہ کسی شخص کی خیانت کا علم حاکم کو حاصل ہونا چاہیے' دوسرے لوگوں کو آگاہی ہو یا نہ ہو۔ اور ہم ان کے روحی اعمال کو جانتے ہیں بلکہ ہمارے خفیہ نویسوں نے بھی لکھ رکھے ہیں اور ان کے اقوال و افعال بھی ان پر دلالت کرتے ہیں۔

وَكُلَّ شَيْءٍ اور ہر چیز کو' جسم اور روح کے اعمال اور وہ افعال جو کہ اس پر دلالت کرتے تھے اَحْصَيْنَاهُ ہم نے شمار کر رکھا ہے اور صرف اپنی حفاظت پر ہی قناعت نہیں فرمائی بلکہ كِتَابًا لکھوا کر۔ تا کہ دارالبقاء کے اہل کاروں کو ہر وقت یاد رہے اور غیر متناہی عمل کے لیے جزا غیر متناہی چاہیے۔

فَذُوقُوا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا پس چکھو پس ہم تمہارے لیے زیادہ نہیں کریں گے مگر عذاب بخلاف مسلمان گناہ گاروں کے کہ ان کا عذاب صرف اعضاء کے اعمال پر ہو گا اور ختم ہو جائے گا اس لیے کہ صحیح ایمان کی وجہ سے ان کی روح میں بُرائی نہ تھی۔

اور تنبیہ الغافلین میں مذکور ہے کہ جب دوزخی بہت زیادہ پیاسے ہوں گے تو بارش طلب کریں گے' ایک سیاہ بادل رونما ہو گا اور اس سے سرخ اونٹوں کی گردنوں کی مثل سانپ اور اونٹوں کے برابر جسموں والے بچھو برسیں گے اور انہیں کاٹیں گے اور ان میں ان سانپوں اور بچھوؤں کے زہر کا اثر ہزار سال تک رہے گا اسی کے متعلق اس آیت کا مفہوم ہے کہ زِدْنٰهُمْ عَذَابًا فَوْقَ الْعَذَابِ (۱۴۔۱۸) اور یہی اس آیت میں ہے فَذُوقُوا فَلَنْ نَّزِيْدَكُمْ اِلَّا عَذَابًا۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اور یہاں ایک شبہ اکثر لوگوں کے ذہنوں میں آتا ہے کہ مزاج کے منافی اثر کرنے والا

جب ہمیشہ اور دائمی ہو تو اس کے اثر کا احساس نہیں رہتا اور اس کی تکلیف اور دُکھ نہیں ہوتا جیسا کہ دق والے کو گرمی سے تکلیف نہیں ہوتی۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ احساس کا نہ ہونا متفق مزاج کی خرابی کی صورت میں ہے نہ کہ مختلف مزاج کی خرابی کی صورت میں جہنمیوں کو کئی قسم کے عذاب دیئے جائیں گے اور انہیں عذاب کی ہر قسم کا احساس زبردست ہوگا جیسا کہ اس آیت سے معلوم ہوتا ہے۔ نیز آدمی کے بدن میں حس کا آلہ اس کی جلد ہے جبکہ جلنے کے بعد دوزخیوں کے بدن پر جلد ازسرنو تازہ ہو جائے گی اور تازگی کی وجہ سے اس کا احساس نسبتاً زیادہ ہوگا جیسا کہ اس تازہ جلد میں انتہائی احساس پائے جانے کا تجربہ اور مشاہدہ ہے جو کہ زخم میں انگور آنے کے بعد پیدا ہوتی ہے اور دوزخیوں کے عذاب میں زیادتی کے اسباب میں سے ایک بات یہ بھی ہوگی کہ ان کے مخالف اور دشمن قسم قسم کی نعمتوں سے نوازے جائیں گے جیسا کہ فرمایا جا رہا ہے۔

اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا تحقیق متقیوں کے لیے مقاصد کے حصول کا مقام ہے اور ان کا مقام سرکشوں کے مقام سے بہمہ وجوہ ممتاز اور جدا ہے۔

حَدَآئِقَ پُر میوہ باغ ہیں جن کے اردگرد دیوار کی گئی ہے اور لغت عرب میں حدیقہ اسی باغ کو کہتے ہیں جس کے چاروں طرف دیوار کی گئی ہو۔

وَاَعْنَابًا اور بے شمار انگور کے درخت ہیں گھنی بیلوں کے ساتھ اور باغ کی روشوں پر بمنزلہ دوسری دیوار ہوں گے اور چونکہ انگور کی بیل ایک اعتبار سے مکان کا حکم رکھتی ہے کہ اس کے سائے میں بیٹھتے ہیں اور اسے چھت کی شکل میں درست کرتے ہیں اور ایک اعتبار سے درخت کا حکم رکھتی ہے کہ اس سے مقصود پھل لینا ہے' اسے خصوصیت کے ساتھ ذکر فرمایا گیا ورنہ انگور بھی ان پھلوں میں سے ہی ہے جنہیں حدیقہ کا لفظ شامل ہے۔ گویا ارشاد ہوتا ہے کہ ان باغوں میں انگور کی بیلوں کے سائبان ہوں گے جو کہ بارہ دری اور بنگلے کے قائم مقام ہوں گے۔

وَكَوَاعِبَ اور کنواری عورتیں جن کے سینے اُبھرے ہوئے اور سخت' بلوغ کی حد کو پہنچی ہوئی اس لیے کہ باغ اور بوستان کی سیر دلکش لباس والے مصاحبوں کے بغیر بے مزہ ہے۔

اَتْرَابًا وہ خواتین متقیوں کی ہم عمر ہوں گی اس لیے کہ متقیوں اوران عورتوں کی روحیں لوٹانے کا وقت وہی ایک ہی ہے جس میں دوسری مرتبہ صور پھونکا جائے گا۔ پس ایک ہی ساعت میں ان کی ولادت ہوئی جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا گیا ہے کہ اِنَّآ اَنْشَاْنٰهُنَّ اِنْشَآءً فَجَعَلْنٰهُنَّ اَبْكَارًا عُرُبًا اَتْرَابًا لِّاَصْحٰبِ الْيَمِيْنِ (۲۷-۱۴) اور یہ عورتیں دنیا کی عورتیں ہوں گی تا کہ ان کی صحبت کے ساتھ جنسیت اورانس کی وجہ سے متقین کو پورے طور پر سرور حاصل ہواور ہم عمری اُلفت وانس کا نسبتاً زیادہ موجب ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ بوڑھے جوانوں کی اور جوان بوڑھوں کی صحبت سے نفرت کرتے ہیں۔

جنتیوں کی عمر کا بیان

اکثر تفسیروں میں لکھا ہے کہ جنتی مرد اور عورتیں تینتیس (۳۳) سالہ ہوں گے اور اس کلام کا یہاں یہی معنی ہے کہ ان کی ہر قوت اور فرحت اس عمر کے مشابہ ہوگی ورنہ ان کا پیدا ہونا دوسری مرتبہ صور پھونکنے کے وقت ہے اور اس وقت سے جنت میں داخل ہونے تک مدت دراز گزر جائے گی اور وہ جو بعض روایات میں جو کہ زاہدی اور واحدی میں مذکور ہے وارد ہوا کہ عورتیں سترہ اٹھارہ سالہ ہوں گی جبکہ مرد تینتیس (۳۳) سالہ ہوں گے تو اس کا معنی یہ ہے کہ یہاں عورتوں کے اعضاء کی شکل اس عمر کے اعضاء جیسی ہوگی اس لیے کہ عورت میں حسن صورت اسی عمر میں پورا ہوتا ہے اور اس کے بعد زوال کی طرف مائل ہو جاتا ہے اور بچوں کی ولادت اور انہیں دودھ پلانے کی وجہ سے پستان ڈھلک جاتے ہیں اور مؤنث ہونے کا مزاج جو کہ کافی مرطوب ہوتا ہے اس وقت عمر کی خشکی کی وجہ سے معتدل ہو جاتا ہے اور بدن کی ساخت کا تناسب' سادگی اور ناتجربہ کاری جو کہ محبوبوں اور معشوقوں میں مرغوب ہے اس عمر میں کافی حاصل ہوتی ہے۔ بخلاف مردوں کے ان میں کمال عقل و تجربہ قابلِ تحسین ہے اس پھل کی طرح جو کہ پکا ہوا کچے سے بہتر ہوتا ہے جبکہ عورتیں اس پھل کی طرح ہیں جو کہ کچا ذائقے میں پکے ہوئے سے نسبتاً زیادہ اچھا لگتا ہے۔

وَّكَاْسًا اور شراب کے پیالے ہوں گے۔ دِهَاقًا چھلکتے ہوئے پے در پے لائے گئے۔ اور عربوں کے استعمال کے مطابق لفظ دہاق سے دونوں چیزیں سمجھی جاتی ہیں' پُر ہونا

اور پے در پے ہونا۔ اور متقیوں کو شراب پلانا زیادہ نعمت ولذت حاصل کرنے کے لیے ہوگا اس لیے کہ شراب پینے سے انہیں جو فرحت وراحت حاصل ہوگی اس کی وجہ سے وہ عورتوں اور مذکورہ باغات کی دوسری نعمتوں سے پوری لذت حاصل کرنے میں بے باک ہو جائیں گے اور سنجیدگی اور وقار اس پورے طور پر محظوظ ہونے میں مانع نہ ہوگا جس طرح کہ انہوں نے دنیا میں خداتعالیٰ کی محبت کی شراب کی مستی کی وجہ سے احوال ومقامات کے باغات اور تازہ انوار وتجلیات اور واردات سے پوری برکتیں اور روحانی لذتیں حاصل کی تھیں لیکن وہاں کی شراب میں جو کہ محبتِ الٰہیہ کے معنوں کی صورت ہوگی' دنیوی شراب کی خرابیوں اور قباحتوں سے قطعاً مبرا ہوگی اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ جنت میں چیزوں کے نام دنیوی ناموں کی مانند ہیں جبکہ حقیقتیں جدا ہیں۔ اس لیے کہ دنیوی چیزوں کے خواص صورنوعیہ کے عنصری کثیف مادوں میں اثر کرنے سے صورت پکڑتے ہیں جبکہ جنتی چیزوں کے خواص اسمائے الٰہیہ کی تجلیات اور حقائقِ قدسیہ کی لطیف مثالی مادے میں تاثیر کرنے سے متحقق ہوں گے اور اگرچہ دنیا وآخرت میں اسمائے الٰہیہ کی سلطنت اور ان کی تاثیرات کے ظہور کے سوا کوئی سبب نہیں لیکن کمال ظہور' جوش کی پاکیزگی' مواد کی لطافت اور مکدر کرنے والی برائیوں سے دوری کے اعتبار سے دونوں میں آسمان وزمین کا فرق ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تجلی والی آگ کو انگیٹھی کے دھوئیں والی آگ سے جو کہ گائے اور گدھے کے گوبر سے جلائی گئی ہو' تولنا چاہیے۔ کیا ہی اچھا کہا گیا کہ وجود کے ہر مرتبے کا ایک حکم ہے اگر تو مرتبوں کا فرق نہ کرے تو زندیق ہوگا۔

پس وہاں کی شراب کی مجلس قباحتوں سے اس درجہ پاک ہوگی کہ

لَا يَسْمَعُوْنَ فِيْهَا لَغْوًا وَّ لَا كِذّٰبًا وہ شراب پینے سے بے ہودہ بات اور ایک دوسرے کی تکذیب وانکار نہیں سنیں گے چہ جائیکہ لڑائی' دشنام طرازی' بے مقصد گفتگو اور بات چیت میں گڑبڑ پیدا ہو اور جیسے دنیا میں ان کی محفلیں ان امور سے پاک ہوتی تھیں اور ان کی صحبت میں جھوٹ' فضول گوئی' مذاق اور خرمستی کو دخل نہ تھا اسی طرح جنت میں ہوگا۔

اور یہ نعمتیں اور لذتیں جو کہ اس وافر مقدار میں ان کے ہاتھ آئیں گی ایسی نہیں کہ اس

جہان کی آب و ہوا کے تقاضے کی وجہ سے حاصل ہوئیں جیسا کہ دنیا میں ملکوں کے اختلاف کی وجہ سے سردیوں اور گرمیوں' قحط سالی اور خوشحالی میں حاصل ہوتی ہیں بلکہ یہ چیزیں ان کے ہاتھ آئیں گی۔

جَزَآءً مِّنْ رَّبِّكَ تیرے پروردگار کی طرف سے جزا دینے کے طور پر جو کہ کامل ہے اور کامل جو چیز دے وہ بھی کامل ہوتی ہے۔

اور اگر کسی کے دل میں شبہ گزرے کہ جزا میں ان دونوں چیزوں کی رعایت کی جاتی ہے' جزا دینے والے کا مقام اور اس کام کی مقدار جس کی جزا دیتا ہے اگرچہ جزا دینے والا اوج کمال پر فائز ہے لیکن ان سب کے کام اتنے کامل نہ تھے تو ہم کہتے ہیں کہ یہ نعمتیں اور لذتیں حقیقت میں جزا نہیں ہیں بلکہ

عَطَآءً بخشش و انعام ہیں لیکن ابتدائی بخشش و انعام نہیں بلکہ حِسَابًا ان کے اعمال کے حساب سے ہے نہ کہ اعمال کی مقدار کے مطابق۔ مثلاً کسی بادشاہ کو منظور ہو کہ اپنے ملازموں کو انعام اور بخشش عطا فرمائے' وہ حکم دے کہ جو بھی میرے حضور حاضر ہے اسے اس قدر دیں اور جو فلاں قلعہ میں ہے' اسے اس قدر اور جو فلاں ڈیوٹی پر ہے' اسے اتنا دیں۔ پس ایسی صورت میں انعام میں فرق کرنے میں مقدار عمل کے موافق انعام دینا منظور نہیں ہوتا ہے بلکہ اعمال کا حساب صرف نشاندہی کے لیے ہے اور بس اور جب انعام اور بخشش اعمال پر مقرر فرمائے گئے ہیں تو جزا کے ساتھ پوری مشابہت ہو گئی اس وجہ سے اسے جزا کا نام دیا گیا۔ نیز چونکہ یہ جزا دینے والی وہ ذات ہے جس کی صفت ہے۔

رَّبِّ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَیْنَھُمَا آسمانوں' زمین اور جو کچھ ان کے درمیان ہے' کا پروردگار ہے اور اس نے آسمان' زمین اور ان کے مابین جو کچھ ہے' اس پر ابتدائی بخشش و انعام بے تکلف بغیر کسی گزشتہ وعدے کے اور بغیر مستحق ہونے کے کمال درجے پر فرمایا تو اپنے اس انعام اور بخشش کو ان لوگوں کے بارے میں جو کہ مستحق ہونے کی آمیزش بھی رکھتے ہیں' ان کے ساتھ وعدہ بھی کیا گیا اور وہ مکلف بھی تھے کس طرح کامل نہ فرمائے اور ان کے باوجود اس کا نام ہے۔

اَلرَّحْمَانِ مطلقاً انعام فرمانے والا اور جس کا نام یہ ہو اور وہ وعدہ کیے بغیر ہزاروں احسان فرماتا ہے' تو وعدہ کر کے پورا کیوں نہیں فرمائے گا لیکن اس رحمت کے باوجود وہ جو کہ اپنے اطاعت شعار بندوں پر ماں باپ سے بھی زیادہ شفیق ہے اس کی عظمت وجلال بھی اس قدر بلند ہے کہ

لَایَمْلِکُوْنَ مِنْہُ اس قدر رحمت وعنایت کی توجہ اور اس کی بارگاہ کے اتنے قرب و مرتبے کے باوجود ان میں طاقت نہیں ہوگی۔ خِطَابًا بلاواسطہ بات کرنے کی' اپنے بارے میں یا اپنے قریبیوں اور دوستوں میں سے کسی کی سفارش کرنے کی اور اس کی یہ عظمت وجلال اگرچہ اس کی ذات کو لازم ہے لیکن اس کا پورے طور پر ظہور نہیں ہوگا مگر

یَوْمَ یَقُوْمُ الرُّوْحُ جس دن کہ روح کھڑی ہو۔

کیفیت روح کا بیان

اور روح ایک خوب جاننے والے بیدار لطیف کا نام ہے جو کہ آسمان' زمین' پہاڑ' دریا' درخت اور پتھر کو عطا فرمایا گیا ہے اور اسے دوسرے مقام پر ملکوت کل شی کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے جیسا کہ سورۃ یسین کے آخر میں ہے اور ہر مخلوق کے اسی جاننے والے لطیفے کو اپنے پروردگار کی تسبیح وعبادت میسر ہے۔ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ (۱۵۔۵) کُلٌّ قَدْ عَلِمَ صَلَاتَہٗ وَتَسْبِیْحَہٗ (۱۳۔۱۸)

درحقیقت وہ لطیفہ ایک نورانی جوہر ہے جو کہ جواہر واعراض میں سے ہر ایک کے ساتھ متعلق ہے اور انہیں روحانی جواہر کی بدولت قرآن پاک کی سورتیں' نماز' روزہ جیسے اعمال صالحہ' اور کعبہ معظمہ' قیامت کے دن اور عالم برزخ میں شفاعت کریں گے اور گواہی دیں گے اور آسمان وزمین اور دن رات گواہ ہوں گے۔

اور صحیح حدیث پاک میں ہے کہ مؤذنوں کے لیے ان کی آواز پہنچنے کی حد تک ہر پتھر' درخت' مٹی کا ڈھیلہ اور لکڑی قیامت کے دن گواہ ہوں گے اور اس روز یہ جواہر نورانیہ مناسب شکلوں کا لباس بنا کر محشر میں کھڑے ہوں گے اور گواہی اور شفاعت کا کام سرانجام دیں گے اور بنی آدم اور حیوانات کی ارواح کے تعلق اور دوسرے مخلوقات کی ارواح کے تعلق

میں فرق یہ ہے کہ پہلا تعلق دائمی ہے اور سرایت کرنے والے حلول کی طرح کہ تمام طبعی' نباتی اور حیوانی قوتوں میں داخل ہو کر انہیں اپنے حکم کا پابند کر لیا جبکہ دوسرا تعلق دائمی نہیں ہے اور طاری ہونے والے حلول کی طرح ہے اور اسی لیے بعض اوقات دنیا میں بھی اس کا تعلق ظاہر ہوتا ہے اور پتھر اور درخت انبیاء علیہم السلام کے ساتھ باتیں کرتے ہیں اور ان کے حکم کے مطابق کام سرانجام دیتے ہیں اور انہیں سلام کہتے ہیں اور قیامت کے قریب ہونے کے وقت یہ تعلق بھی دائمی ہونے اور سرایت کرنے کے قریب ہو جائے گا۔

یہی وجہ ہے کہ قیامت کی اشراط والی احادیث میں ان چیزوں کی خبریں بہت زیادہ مذکور ہیں اور اس کا راز یہ ہے کہ اس تعلق کا ظہور اس وقت ہوتا ہے جب روحانی احکام غالب ہو جائیں۔ پس قربِ قیامت میں جو کہ روحی احکام کے غلبے کا وقت ہے' یہ زیادہ ظہور کرے گا اور انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کی ہمت کی وجہ سے ان کے حضور بھی احکام روحیہ غالب ہو جاتے ہیں۔

اور یہاں دوسرے مفسرین روح کی تفسیر میں مختلف اقوال لائے ہیں اور حق یہی ہے جو مذکور ہوا۔

وَالْمَلٰٓئِكَةُ صَفًّا اور زمین اور ساتوں آسمانوں کے فرشتے صف بصف کھڑے ہو جائیں گے تاکہ جزا دینے' اعمال تولنے' اعمال نامے دکھانے اور پل صراط سے گزارنے کا کام اور اس دن کے ساتھ متعلق دوسرے کام جاری کرنے کے لیے مستعد اور تیار رہیں۔

لَا يَتَكَلَّمُوْنَ اس حالت میں بالکل بات نہیں کریں گے اور دم نہ ماریں گے اگرچہ شفاعت اور شہادت کا مقام ہو۔ اِلَّا مَنْ اَذِنَ لَهُ الرَّحْمٰنُ مگر وہ جسے رحمٰن اجازت دے اور حکم ہوگا کہ فلاں کے بارے میں شفاعت کر یا اس کی گواہی دے اور یہ حکم اس شخص کے حق میں رحمت کے تقاضے کی وجہ سے ہوگا۔

وَقَالَ صَوَابًا اور وہ بالکل درست بات کہے گا اور خلاف قانون عرض نہیں کرے گا۔ مثلاً کافر اور بدعقیدہ کے متعلق شفاعت نہیں کرے گا اور جو شخص ایمان کی وجہ سے معافی کا مستحق ہے' اس کے گناہوں کی معافی طلب کرے گا اور اسی طرح گواہی میں بھی احتیاط

کرے گا اور کم و بیش بات نہیں کرے گا اس لیے کہ

ذَالِكَ الْيَوْمُ الْحَقُّ وہ دن حق کا دن ہے اس روز باطل اور غلط ہرگز نہیں چل سکے گا اور کامیاب نہیں ہوگا۔ بخلاف دنیا کے ایام کے کہ وہاں حق و باطل اور غلط و صحیح دونوں ملے جلے ہیں' کوئی تفریق نہیں کی گئی ہے اور احتمال ہے کہ معنی یوں ہو کہ وہ دن ایسا ہے کہ نیکوں اور بُروں کے درمیان جدائی اور فرق کرنا اور مومن و کافر کے درمیان امتیاز کرنا اس دن کا حق ہے اور وہی دن اس کام کے لائق ہے نہ کہ دنیا کے ایام کہ جن میں شک وشبہ اور منفعتوں میں نیک اور بد کی مساوات اور مطیع اور نافرمان کی باہمی شرکت واقع ہے۔

فَمَنْ شَآءَ اتَّخَذَ اِلٰى رَبِّهٖ مَاٰبًا تو جو چاہے اپنے پروردگار کی طرف رجوع اختیار کرے تا کہ اس دن اسے اپنے ہم نشینوں اور مصاحبوں میں پورا امتیاز حاصل ہو اور اس قسم قسم کے عذاب سے خلاصی پائے جو کہ اس دن اللہ تعالیٰ کے حضور سرکشی اور لاپرواہی کی بناء پر تیار ہے اور رجوع الی اللہ تعالیٰ کا فائدہ صرف اسی عذاب سے خلاصی میں منحصر نہیں ہے جو کہ یوم الفصل میں سرکشوں کے نصیب ہوگا بلکہ

اِنَّآ اَنْذَرْنٰكُمْ ہم نے تمہیں بارہا قرآن مجید میں اور نبی کریم علیہ السلام کی زبان پر ڈرایا ہے کہ تم رجوع الی اللہ میں کوتاہی کر رہے ہو اور اس کے حکم کی تعمیل سے سرکشی کر رہے ہو۔

عَذَابًا قَرِيْبًا قریبی عذاب سے جو کہ موت کے بعد عالم برزخ ہر شخص کو پیش آئے گا اور اس عذاب میں جہان کے اصول و ارکان کو برباد کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ انسان کے چھوٹے جہان کو برباد کرنا اور اس کی ساخت کے ارکان کو ڈھا دینا ہی کافی ہے اس لیے کہ اس عذاب کی حقیقت بُرے اعمال کی تاریک شکلوں کا جو کہ میت کے نفس پر غالب تھیں' خوفناک صورتوں میں اس کی قوت خیالیہ پر اس طرح ظاہر ہونا ہے کہ وہ قوت ان کے اثر سے مغلوب ہو جائے بغیر اس کے کہ اعمال کے صحیفے کھولے جائیں اور ہر معمولی سے معمولی کام پر آگاہ کریں اور گواہ حاضر ہوں اور حاکم مطلق تجلی فرمائے اور حقوق کے دعوے دار جمع ہوں اور اگلوں پچھلوں کو جمع کیا جائے اور جنت کا حکم نیکوں کے لیے اور دوزخ کا فیصلہ بُروں کے لیے جدا جدا مرتب ہو اور اسی لیے وہ عذاب قریب ہی واقع ہوگا۔

يَوْمَ يَنْظُرُ الْمَرْءُ مَاقَدَّمَتْ يَدَاهُ جس دن کہ ہر شخص ان اعمال کو دیکھے گا جو اس کے دونوں ہاتھوں نے آگے بھیجے تھے جو کہ اچھے اعمال کرنے والی قوت اور بُرے کام کرنے والی طاقت سے کنایہ ہے اور آگے بھیجنا اس بات کی دلیل ہے کہ ان اعمال کی نورانی شکلیں اور تاریک صورتیں اس کے نفس میں ظاہر ہوگئیں اس لیے کہ عمل کو آگے بھیجنا اور ترجیح دینا جو ہر نفس میں اس عمل کی محبت راسخ ہوئے بغیر ممکن نہیں اور وہ ہیئت عالم مثال میں ایسی صورت رکھتی ہے جو کہ اس کے مناسب ہے۔

جب نفس اس جہان کے احساسات اور تصرفات سے فارغ ہو کر پورے طور پر اس جہان کے احساسات کی طرف متوجہ ہوگا تو ان صورتوں کا مشاہدہ کرے گا اور یہ عذاب اس قسم کا ہے کہ حکماء اور فلاسفہ کی عقل نے بھی اسے دریافت کیا اور عالم خواب پر قیاس کر کے اسے واقع ہونے والا جانا۔ فرق یہ ہے کہ خواب والے عذاب سے نفس کے اس جہان کے احساسات پر بیداری متوجہ ہونے کی وجہ سے خلاصی پانا ممکن ہے جبکہ اس عذاب سے اس طرح خلاصی پانا ممکن نہیں ہے کہ اس خواب کے پیچھے بیداری نہیں ہے۔ بخلاف یوم الفصل کے اسے میدانِ عقل میں کوئی دریافت نہیں کر سکتا۔ پس یہ عذاب وقوع کے زمانے کے اعتبار سے بھی قریب ہے اور تصور وتصدیق کے اعتبار سے عقل کے بھی قریب ہے لیکن ایمان اور صحیح عقیدے کی وجہ سے اس قریبی عذاب سے نجات بھی حاصل ہوگی اس لیے کہ اگرچہ بُرے اعمال نے اس شخص کے نفس میں تاریک شکلیں پیدا کر دی تھیں لیکن اس کا ایمان اور عقیدہ صحیح ہے اس میں عظیم نورانی صورتیں ظاہر کر دیں۔ کھینچا تانی کے بعد گناہوں کی تاریکی پر غلبہ حاصل کریں گے اور وہ تاریکی شکلیں تہ درتہ بادل کی طرح سورج کی روشنی کی شدت کی وجہ سے دگرگوں ہو جائیں گی اور کافروں کے پاس تاریک شکلوں کے سوا اور کچھ نہ ہوگا جس کے نور سے ان تاریکیوں کو دُور کریں' ناچار حسرت اُٹھائیں گے۔

وَيَقُوْلُ الْكٰفِرُ اور کافر کہے گا اس کے بعد کہ اپنی کفر اور گناہوں کی مکروہ شکل کو دیکھے گا اور اس کے مقابلے میں ایمان کی نورانی صورت نہیں پائے گا۔

يٰلَيْتَنِيْ كُنْتُ تُرٰبًا اے کاش کہ میں مٹی ہوتا اور انسانی شکل میں پیدا نہ ہوتا تا کہ

مجھ سے یہ مکروہ شکلیں صادر نہ ہوتیں اور مٹی کو خاص کر کے اس لیے یاد کرے گا کہ جسم انسانی کے مواد کی انتہا مٹی ہے اگر نطفہ ہے غذاؤں سے پیدا ہوا' غذائیں نباتات' حیوانات سے اور نباتات اور حیوانات مٹی سے اور اگر گوشت پوست خون اور خلط ہے تو بھی غذاؤں' دواؤں اور پھلوں سے پیدائش ہے پھر مٹی تک بات جا پہنچی اور جب خاک کے بعد اور کوئی مادہ اس کے دل میں نہیں۔ ناچار انسانی صورت سے فرار کے وقت سب سے بعید مواد کی جو کہ خاک ہے' آرزو کرتا ہے جیسا کہ اگر کسی کو کسی سفر میں تکلیف پہنچتی ہے تو کہتا ہے کہ اے کاش میں گھر سے نہ نکلتا اور یہ نہیں کہتا کہ میں راہ سے پھر جاتا' راستے کے درمیان رہتا کیونکہ ایسا کہنے سے اس تکلیف سے پورے طور پر دُور ہونا معلوم نہیں ہوگا۔ نیز اسے معلوم ہو جائے گا کہ میری یہ سب گرفتاری میری روح کے باقی رہنے کی وجہ سے ہے اگر میں صرف بدن ہوتا اور خاک ہو جاتا تو اس عذاب میں گرفتار نہ ہوتا۔

اور حضرت ابن عباس اور ابن عمر رضی اللہ عنہما سے مرفوعاً اور موقوفاً روایت آئی ہے کہ فیصلے اور قضا کے دن اس کے بعد کے جانور ایک دوسرے سے بدلہ لے لیں گے' انہیں حکم فرمایا جائے گا کہ خاک ہو جاؤ۔ کافران جانوروں کے حال پر رشک کرے گا اور کہے گا کہ اے کاش مجھے خاک ہو جانے کا حکم فرمایا جاتا اور اس مفاسد انسانیت سے جو کہ اس سزا کا سبب ہے' بے زار ہو جائے گا۔

اور بعض صوفیاء نے فرمایا ہے کہ خاک ہونے سے مراد یہ ہے کہ میں خاک کی طرح عاجز اور مسکین ہوتا اور بڑائی' تکبر' سرکشی اور نافرمانی نہ کرتا۔

اور بعض واعظوں نے کہا ہے کہ کافر سے مراد ابلیس ہے جو کہ اس کا سب سے کامل فرد ہے۔ جب وہ حضرت آدم علیہ السلام اور آپ کی اولاد پر انواع واقسام کی نوازشات دیکھے گا تو آرزو کرے گا کہ میں بھی خاکی ہوتا اور خاک سے پیدا ہوتا نہ کہ آگ سے کہ میں اس پر فخر کرتا تھا اور کہتا تھا کہ خَلَقْتَنِیْ مِنْ نَّارٍ وَّخَلَقْتَهٗ مِنْ طِیْنٍ

سورۃ والنازعات

یہ سورۃ مکی ہے اس میں چھیالیس (۴۶) آیات ایک سو نواسی (۱۸۹) کلمے اور سات سو ترپن (۷۵۳) حروف ہیں۔

ربط کی وجہ

اور ظاہری نظر میں اس سورۃ کا سورۃ مرسلات کے ساتھ قوی ربط معلوم ہوتا ہے اس لیے کہ اس سورۃ کا ابتدائیہ اس سورۃ کے ابتدائیے کے ساتھ پوری مشابہت رکھتا ہے بلکہ تمام قرآن پاک میں اس قسم کے ابتدائیے پانچ سورتوں میں واقع ہوئے ہیں۔ صافات ذاریات مرسلات نازعات اور عادیات۔ صافات میں تین صفات مذکور ہیں ذاریات میں چار صفات اور باقی تین سورتوں میں پانچ پانچ صفتیں مذکور ہیں لیکن سورۃ عادیات دو طرح سے ان دونوں سورتوں کی مشابہت سے قاصر ہے۔ پہلی وجہ اس کا چھوٹا ہونا اور ان دونوں کا دراز ہونا اور دوسری وجہ یہ کہ وہاں دو صفتیں فعل کے صیغے کے ساتھ مذکور ہیں کہ فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا جبکہ ان دونوں صورتوں میں ساری پانچ صفات اسم فاعل کے صیغے کے ساتھ ذکر کی گئیں۔

پس ان دونوں سورتوں کے ابتدائیہ کی روش میں کمال مناسبت ظاہر ہے لیکن دُور بیں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے گہری نظر دوڑا کر معلوم کیا کہ سورۃ والمرسلات کا مدار یوم الفصل اور اس کے احکام کے تفصیلی بیان پر ہے اور سورۃ عم یتساءلون بھی یوم الفصل کے واقعات کی کیفیتوں کی شرح ہے تو گویا سورۃ تساءل سورۃ مرسلات کی شرح اور تتمہ ہے دونوں کو ایک ساتھ لکھ دیا اس کے بعد ابتدائیے کی مناسبت کی رعایت سے یہ سورۃ لائے۔

نیز گہری نظر دیکھنے سے پتہ چلتا ہے کہ اس سورۃ کے مضامین سورۃ تساءل کے مضامین کے ساتھ اس حد تک مناسبت رکھتے ہیں کہ اتحاد تک نوبت پہنچ گئی اس مناسبت کے ہوتے ہوئے ابتدائیے کی مناسبت کی رعایت اتنی اہم نہیں ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اس سورۃ میں قیامت کے حالات کے متعلق کفار کا ایک

دوسرے سے سوال کرنا مذکور ہے جبکہ یہاں ان کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کرنا مذکور ہے کہ يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ اَيَّانَ مُرْسَاهَا پھر اُس سورۃ میں اَلَمْ نَجْعَلِ الْاَرْضَ مِهَادًا واقع ہوا جبکہ یہاں وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحَاهَا اور اس سورۃ میں وَالْجِبَالَ اَوْتَادًا ہے اور یہاں وَالْجِبَالَ اَرْسَاهَا اور وہاں وَجَعَلْنَا الَّيْلَ لِبَاسًا وَّجَعَلْنَا النَّهَارَ مَعَاشًا جبکہ یہاں وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحَاهَا ہے اور وہاں سَبْعًا شِدَادًا جبکہ یہاں ءَ اَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا اَمِ السَّمَآءُ بَنَاهَا ہے اور وہاں بارش کے پانی کا ذکر ہے کہ آسمان سے آتا ہے اور سبزہ اُگاتا ہے جبکہ یہاں چشموں کے پانی کا ذکر ہے کہ زمین سے نکلتا ہے اور سبزیاں اُگانے میں مدد کرتا ہے' اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَ هَا وَمَرْعَاهَا اور اس سورۃ میں يَوْمَ يُنْفَخُ فِي الصُّوْرِ ہے جبکہ یہاں تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ اور اس سورۃ میں جہنم کے بارے میں فرمایا کہ لِلطَّاغِيْنَ مَاٰبًا جبکہ یہاں فرمایا کہ فَاَمَّا مَنْ طَغٰى وَاٰثَرَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا فَاِنَّ الْجَحِيْمَ هِيَ الْمَاْوٰى اور اس سورۃ میں دوزخیوں کے دوزخ میں ٹھہرنے کی مدت طویل ہونے کا بیان اس عبارت کے ساتھ فرمایا۔ لَابِثِيْنَ فِيْهَا اَحْقَابًا جبکہ یہاں دوزخیوں کا برزخ اور دنیا میں قلیل مدت تک ٹھہرنا اس عبارت کے ساتھ بیان فرمایا۔ لَمْ يَلْبَثُوْا اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحَاهَا اور اس سورۃ میں جنت اور اس کی نعمتوں کے بارے میں فرمایا ہے کہ اِنَّ لِلْمُتَّقِيْنَ مَفَازًا جبکہ یہاں فرمایا وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِيَ الْمَاْوٰى اور اس کے علاوہ اور بہی مناسبتیں ہیں جو کہ غور وفکر کے بعد ظاہر ہوتی ہیں۔

وجہ تسمیہ

اور اس سورۃ کو سورۃ نازعات کا نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ نازعات کی صفت ان پانچ صفات میں سے جو کہ اس کے ابتدائیہ میں مذکور ہیں' تمام کمالات کے حاصل کرنے کا وسیلہ ہے اور دوسری صفات اس کی فرع ہے۔ پس یہ صفت تمام علوم کے مقابلے میں ابجد کے قواعد کا حکم رکھتی ہے کہ ان کا حاصل کرنا اسے حاصل کیے بغیر ممکن نہیں ہے۔

نفس انسانی کی تکمیل کی ضروریات

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب نفس انسانی علم وعمل، صنعتوں، پیشوں، اچھے ہوں یا بُرے، نیک ہوں یا بد، نافع ہوں یا مضر، میں سے ہر کام میں اپنی تکمیل کی طرف متوجہ ہوتا ہے تو اسے ان پانچ مقامات کو عبور کیے بغیر چارہ نہیں تاکہ اپنے اس مطلوب کی انتہائی بلندی تک پہنچے اور اس فن میں تکمیل کا مرتبہ پیدا کرے۔ پہلے یہ ہے کہ خود کو ان چیزوں سے کھینچ لے جو کہ اس مطلوب کے منافی ہیں اور اس حالت میں اسے بہت عظیم مجاہدہ درپیش ہوتا ہے کہ اس کی طبیعت ان منافی چیزوں کو چاہتی ہے یا شریعت ان منافی چیزوں کا حکم دیتی ہے یا عقل ان منافی چیزوں کی طرف کھینچتی ہے اور یہ شخص طبیعت یا عقل یا شرع کے خلاف خود کو اس مطلب کے حاصل کرنے میں مشغول کرتا ہے اور اس حالت کے متعلق زور اور مضبوطی سے کھینچنے کے ساتھ تعبیر فرمائی گئی ہے جس پر والنازعات غرقا سے دلالت ہوگی اور جب یہ حالت نفسانی خواہشات کی نسبت واقع ہو تو اسے اہلِ سلوک کے عرف میں توبہ اور مجاہدے کا نام دیتے ہیں۔

دوسرا مرتبہ یہ ہے کہ اس شغل کی مشق اور اس کے ساتھ مانوس ہونے کی وجہ سے ایک راحت اور سرور پیدا ہو جائے اور اس کام میں اس کا دل رغبت کرے اور اگر کچھ مدت تک اس کام سے باز رہے تو اس کی طرف بے اختیار ہو کر مشتاق ہو اور اندیشوں اور محرکات کی کھینچا تانی باقی نہ رہے اور یکسوئی اور یکجہتی سے اس کام میں مصروف ہو جائے اور اس حالت کو نشاط کے ساتھ تعبیر کیا گیا ہے جسے اُردو میں اُمنگ کہتے ہیں۔ اور اہلِ سلوک کی اصطلاح میں اس حالت کو جو کہ راہِ خدا کی طلب میں پیش آتی ہے ارادہ، شوق اور ذوق کہتے ہیں۔ اور اس راہ کی اُلجھنوں کی عقدہ کشائی اسی صفت سے ہے لیکن پہلی صفت کے بغیر اس حقیقت کو حاصل کرنا ممکن نہیں ہے اس لیے کہ یہ حالت کافی کھینچا تانی کے بعد حاصل ہوتی ہے۔

تیسرا مرتبہ یہ ہے کہ اس شغل میں پوری مہارت پیدا کرے اور کسی تکلیف اور تھکاوٹ کے بغیر وہ کام اس سے سرزد ہو اور ورزش کی کثرت کی وجہ سے وہ کام ملکہ بن جائے اور اس حالت کو سیاحت سے تعبیر کیا گیا ہے جس کا معنی تیرنا ہے اس لیے کہ پانی میں تیرنے والا آدمی بغیر کسی مشقت کے سیر کرتا ہے اور اہلِ سلوک کے عرف میں اس حالت کو سیر احوال و

مقامات کہتے ہیں اور کمال کی ادنیٰ حد یہی حالت ہے کہ اس سے پہلے ایک طلب اور تلاش کے بغیر کچھ نہیں' مطلب کا حصول اس حالت سے شروع ہوا۔

چوتھا مرتبہ یہ ہے کہ اس کام میں اپنے مصاحبوں اور ہم نشینوں سے آگے بڑھ جائے اور اس صفت اور فن میں جو دوسروں سے نہ ہو سکا' اس سے سرزد ہو اور یہ حالت اعلیٰ کمال ہے جسے سبقت سے تعبیر کرتے ہیں اور اہلِ سلوک کے عرف میں اس حالت کو طیران اور عروج کہتے ہیں۔

پانچواں مرتبہ یہ ہے کہ کمال کی ساری حدوں کو عبور کر کے تکمیل کی حد تک پہنچ جائے اور اس کام میں مقتدا اور مشکل کشا بن جائے کہ دوسرے اس سے مشکلات کا حل چاہیں اور اس صنعت میں مشورہ اور تدبیر کے لیے اس کی طرف رجوع کریں اور اس حالت کی تعبیر اس عبارت کے ساتھ فرمائی گئی ہے فَالْمُدَبِّرَاتِ اَمْرًا اور اہلِ سلوک کی اصطلاح میں اس مرتبے کو رجوع ونزول' دعوت الخلق الی الحق کا مرتبہ اور تکمیل وارشاد کا مرتبہ کہتے ہیں۔

اور یہ پانچ مرتبے نفوس انسانی کو ہر اچھے بُرے مقصد اور ہر قابلِ تعریف اور قابل مذمت کیفیت میں پیش آتے ہیں البتہ بعض نفوس صلاحیت کی کمی اور رکاوٹوں کے حائل ہونے کی وجہ سے ان سب پانچوں مرتبوں کو عبور کرنے سے قاصر رہتے ہیں اور ایک یا دو یا تین یا چوتھے مرتبے پر قناعت کرتے ہیں اور بعض توفیق یا ذلت کی وجہ سے تمام مرتبوں کو طے کر جاتے ہیں اور نیکی بدی اور ہدایت وگمراہی میں ایک جہان کے مقتدا ہو جاتے ہیں۔

اور چونکہ سورۃ عم یتساءلون میں نفوسِ انسانی کے ان مراتب کی طرف اشارہ واقع ہوا تھا کہ فتاتون افواجا اس سورۃ میں ابتداء ہی سے ان مراتب کی تفصیل منظور ہوئی لیکن یہ تفصیل ان مرتبوں والوں کی قسم کی صورت میں لائی گئی تا کہ ان مراتب پر فائز لوگوں کی عظمت پر دلالت کرے۔ نیز ان مراتب کے اثرات ظاہر ہونے کے لیے قیامت قائم ہونے کے واجب ہونے کا پتہ دیا جائے کیونکہ دنیا میں ان کے اثرات کا ظاہر ہونا ممکن نہ تھا اس لیے کہ دنیا اس ظہور کی متحمل نہیں ہے۔

پھر قسم کو قیامت آنے کی طرف زمان کے ساتھ مقید فرمایا گیا تا کہ پتہ چلے کہ ان

مراتب اور ان مراتب والوں کی قسم اسی وقت ہے اور اسی قید کے ساتھ ہے اس لیے کہ وہ اس وقت سے پہلے اور اس قید کے اعتبار کے بغیر قسم کے قابل نہیں ہیں۔ پس یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ ظرف ہے جو کہ فعل قسم کے ساتھ متعلق ہے جس پر حرف قسم دلالت کرتا ہے اور یہ مجموعی ترکیب وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ وَاللَّيْلِ اِذَا يَغْشٰى وَالنَّهَارِ اِذَا تَجَلّٰى اور اس طرح کی ترکیبوں کی طرح ہوئی۔ گویا اس کلام کا معنی یوں ہوا کہ میں قسم فرماتا ہوں ان جماعتوں کی جو کہ ان صفات کے ساتھ موصوف ہیں جس دن کہ قیامت قائم ہوگی اور اس صفت کے اثرات ظاہر ہوں اور جو لوگ پہلی صفت کے ساتھ موصوف ہیں' جدا گروہ میں آئیں اور ان کے احکام ایک رنگ میں ظہور کریں اور جو لوگ دوسری صفت کے ساتھ موصوف ہیں' علیحدہ جماعت ہوں جن کا حکم علیحدہ ہو۔ علی ہذا القیاس جو لوگ دو یا تین یا چار یا پانچ صفات کے مجموعے کے ساتھ موصوف ہیں' مختلف گروہوں' مختلف احکام و اطوار کے ساتھ حاضر ہوں اور ہر ایک کا مرتبہ اہلِ محشر کے روبرو ہو جائے۔ اور امتیاز اور جدائی کا پروگرام صورت پکڑے اس شخص کی طرح جو ایک لشکر کی تعریف میں کہے کہ فلاں امیر کے لشکر کی قسم! جب جنگ زوروں پر ہو اور نقارے بجیں اور نقیب منادی کریں اور رسالہ دار جدا جدا گروہوں کی شکل میں سوار ہوں یا کسی دفتر کی تعریف میں کہے کہ مجھے فلاں وزیر کے دربار کی قسم جس دن کہ کچہری لگے' لوگ حاضر ہوں' قلم دان کھولے جائیں اور سرکاری اہل کار اور مختلف قسم کے ملازمین درجہ بدرجہ بیٹھ جائیں اور کام میں لگ جائیں۔

اور چونکہ ان پانچ مراتب کا عبور کرنا یا ان مراتب میں سے ایک مرتبہ اور دوسرے' تیسرے اور چوتھے مرتبے میں گرفتاری نفوس انسانی میں مختلف اور باہم جدا جدا ہیں۔ بعض کو راہِ خدا کے سلوک یا کمال علمی حاصل کرنے یا تقویٰ و طہارت کی تکمیل یا اللہ تعالیٰ کے دشمنوں کے خلاف جہاد اور اس قسم کی صفات و کمالات جیسے امور خیر میں حاصل ہوتے ہیں جبکہ بعض کو فسق و فجور' کفر و بدعت' گمراہی اور غلط سوچ اور اس قسم کی برائیوں میں ملتے ہیں' ناچار قیامت کے دن ہر نیک و بد اور کافر و مسلم کو ان مراتب والے لوگوں میں سے کسی ایک گروہ میں جمع اور ان میں شمار کیا جائے جیسا کہ صحیح احادیث اس پر دلالت کرتی ہیں۔ ایک جگہ فرمایا

گیا ہے کہ بعثہ اللہ فقیہا اور ایک مقام پر فی زمرۃ الشھداء فرمایا اور ان لوگوں کے بارے میں شہداء اور بستر پر فوت ہونے والوں کی باہمی کھینچا تانی مشہور و معروف ہے جو کہ طاعون سے فوت ہوئے ہیں اور شر اور گمراہی کی طرف بھی صراحت ہے۔

اور دونوں قسموں میں سے کسی سے بھی متعلق تمام مراتب والے یوم الفصل والامتیاز کے ارکان ہیں اور اس اعتبار سے کہ اللہ تعالیٰ کے عدل اور جزا دینے کا ظہور ان میں ہوگا اس قسم کی قسم کے لائق ہوگئے۔ اگرچہ اپنی حد تک ان اقسام میں سے بعض مردود، جہنمی اور بدبخت ہوں اس لیے کہ یہاں جزا دینے کے کام کے ان سے وابستہ ہونے پر نظر ہے نہ کہ ان کی اپنی ذات وصفات پر اس بات کو اچھی طرح سمجھ لینا چاہیے کہ بہت باریک ہے اور اس کی تصدیق میں تردد نہیں کرنا چاہیے۔ دوسرے مقام پر قرآن پاک کے الفاظ وَلَآ اُقْسِمُ بِالنَّفْسِ اللَّوَّامَةُ میں غور کرنا چاہیے تاکہ اسے امکان سے دُور سمجھنا دفع ہو اور جب یہ مقدمہ بیان ہوگیا تو تفسیر شروع ہوتی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالنّٰزِعٰتِ غَرْقًا اس جماعت کی قسم جو کہ خود کو کسی کام میں کھینچتے ہیں، سخت کھینچنا اور لفظ غرق کو یہاں اغراق کی جگہ قائم فرمایا گیا ہے۔ مصدر مجرد کو مزید فیہ کی مصدر کی جگہ قائم کرنے کے طریقے سے جیسا کہ فَاَنْبَتَهَ اللّٰهُ نَبَاتًا حَسَنًا اور لغت عرب میں اغراق سخت کھینچنے کو کہتے ہیں، اسے کمان کھینچنے سے لیا گیا ہے کہ جب اسے کھینچتے ہیں تو تیر کا پھل اس کے خانے میں غرق ہو جاتا ہے۔

وَالنّٰشِطٰتِ نَشْطًا قسم ہے اس جماعت کی جو کہ کسی کام میں نشاط اور شوق پیدا کرتے ہیں۔ وَالسّٰبِحٰتِ سَبْحًا اس جماعت کی قسم جو کہ کسی کام میں شناوری کرتے ہیں، شناوری کرنا اور کسی کلفت کے بغیر مصروف ہوتے ہیں۔

فَالسّٰبِقٰتِ سَبْقًا پس میں قسم اٹھاتا ہوں کسی کام میں سبقت کرنے والوں کی جو کہ اپنے مصاحبوں سے اس کام میں آگے نکل جاتے ہیں۔

فَالْمُدَبِّرٰتِ اَمْرًا پس میں قسم اٹھاتا ہوں ان کاموں میں سے کسی کام کی

تدبیر کرنے والوں کی جن کی تدبیر و مشورہ کے لیے مذکور الصدر جماعتیں ان کی طرف رجوع کرتی ہیں اور اس کام کی مشکلات کا حل ان سے ڈھونڈتی ہیں۔

اور ان آخری دو قسموں میں فالانے کی وجہ یہ ہے کہ ان دو جماعتوں کا مرتبہ پہلے تین زمروں سے بہت زیادہ بلند ہے اس لیے کہ انہوں نے کمال اور تکمیل کا رُتبہ پایا ہے جیسا کہ آخری فرقے کا مرتبہ چوتھے فرقے سے بھی زیادہ بلند ہے اور اعلیٰ کے ساتھ قسم اُٹھانے اور ادنیٰ کے ساتھ قسم اُٹھانے میں فرق ضروری ہے اس بناء پر تعقیب کی فا کو لایا گیا تا کہ پتہ دے کہ اعلیٰ کے ساتھ قسم اُٹھانا' ادنیٰ کے ساتھ قسم اُٹھانے کے بعد ہے اور ہم ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی کر رہے ہیں۔

یَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ اس جماعت کی قسم اس دن ہے کہ لرزنے والا لرزے یعنی پہلے نفخہ کی وجہ سے زمین' پہاڑ جنبش میں آ جائیں اور ارواح جسموں سے جدا ہو جائیں اور دنیا کا نظام درہم برہم ہو جائے۔

تَتْبَعُهَا الرَّادِفَةُ اور اس کے پیچھے آئے پیچھے آنے والا اور اس سے مراد دوسرا نفخہ ہے جس کی وجہ سے ارواح پھر جسموں کی طرف لوٹیں اور دنیا از سرنو دوسرے رنگ میں پیدا ہو اور اس قسم کا جواب ذکر نہیں فرمایا گیا اس لیے کہ خود قسم اس جواب پر دلالت کرتی ہے یعنی مراتب مذکورہ والوں کے دل اس دن مختلف ہوں گے تو جنہوں نے یہ مراتب رضائے الٰہی میں طے کیے تھے' اطمینان اور راحت میں ہوں گے اور خوش و خرم اور تازہ نورانی چہروں کے ساتھ اُٹھیں گے اور جنہوں نے یہ مرتبے اللہ تعالیٰ کی ناراضگی میں طے کیے' سراسیمہ اور حیران ہوں گے کہ ہماری کوشش رائیگاں گئی اور کرنے کا کام ہم نے نہ کیا۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے

قُلُوْبٌ یَّوْمَئِذٍ وَّاجِفَةٌ اس دن کئی دل بے چینی اور بے قراری میں ہوں گے اور ان کی بے چینی اور بے قراری اس حد تک غلبہ کرے گی کہ اسے ضبط نہیں کر سکیں گے بلکہ ان کے چہروں میں اس بے چینی کے آثار ظاہر ہوں گے۔

اَبْصَارُهَا خَاشِعَةٌ ان دِلوں والوں کی آنکھیں خیرہ اور حیران رہ جائیں گی اور اہلِ

اطمینان کے دلوں کا حال یہاں اس لیے ذکر نہیں کیا گیا کہ قیامت کے دن سے ڈرانا منظور ہے اور خوف دلانا ہی اس کی شان ہے اور جب معلوم ہو جائے کہ کئی دل اس روز اس بے قراری اور بے چینی کی حالت میں ہوں گے' اس سے ڈرنا چاہیے کہ کہیں ہمارے دل بھی ان میں سے نہ ہوں اور آرام اور اطمینان پانے والے دلوں کے حال پر نظر نہ ڈالی جائے کہ ہمارے دلوں کا ان میں سے ہونا مشکوک ہے اور مشکوک سے امید نہیں رکھنی چاہیے اس لیے خوف میں شک بھی کافی ہے جبکہ امید میں ظن غالب چاہیے۔

مفسرین کے اختلاف کا بیان

اور بعض مفسرین نے رَاجِفَۃ سے مراد زمین اور پہاڑ مراد لیے ہیں جیسا کہ ایک دوسری آیت مذکور ہے۔ یَوْمَ تَرْجُفُ الْاَرْضُ وَالْجِبَالُ اور رادفہ سے آسمان اور ستارے مراد لیے ہیں اس لیے کہ زلزلے کے بعد زمین پھٹ جائے گی اور منتشر ہو جائے گی۔

بعض کہتے ہیں کہ رَاجِفَہ پہلا زلزلہ ہے جس کی وجہ سے زمین جنبش کرے گی جبکہ رادفہ دوسرا زلزلہ ہے جو کہ زمین کے تمام اجزا کو ریزہ ریزہ کر دے گا۔

اور یہاں جاننا چاہیے کہ مفسرین کا اس کی سورت کی ابتدا میں مذکور پانچ صفات کے مصداق کے تعین میں بہت سا اختلاف ہے۔ بعض ایک ہی چیز پر محمول کرتے ہیں اور بعض دوسرے مفسرین مناسب چیزوں پر محمول کرتے ہیں جو کہ ایک دوسرے کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور ایک کام میں مصروف ہیں اور بعض متفرق چیزوں پر محمول کرتے جیسا کہ ہر سورۃ میں جس کا ابتدائیہ اس قسم کی صفات سے شروع ہوتا ہے' اسی طرح کا اختلاف کرتے ہیں۔

حضرات صوفیہ قدس اللہ اسرارہم کہتے ہیں کہ والنازعات غرقا سے مراد اہل سلوک کے دل ہیں جو کہ اپنے نفوسِ امارہ کو جو کہ خواہشات کی پیروی میں غرق ہو چکے ہیں' زور کے ساتھ کھینچتے ہیں اور ناشطات سے بھی حضرت الٰہی کے وصال کے مشتاق قلوب مراد ہیں جن کے نفوس کی رکاوٹیں اور اُلجھنیں زائل ہو چکیں اور عبادت سے روکنے والی چیزیں ختم ہو گئیں' پوری راحت کے ساتھ عبادات اور نوافل میں اپنے اوقات کو مصروف رکھتے ہیں اور سابحات

سے بھی دریائے معرفت میں تیرنے والے قلوب مراد ہیں کہ اس بحر بے کنار میں غوطہ لگانا مجاہدے کا نتیجہ ہے اور احوال و مقامات تک پہنچنا اس غوطہ زنی کا ثمرہ ہے اور سابقات سے واصلین کے قلوب مراد ہیں جو کہ سلوک کی منزلیں طے کرنے کے بعد قرب و وصال کے انتہائی مرتبوں تک پہنچ چکے ہیں اور وصال کے میدانوں اور قرب کے مقامات میں ایک دوسرے سے سبقت کرتے ہیں اور مدبرات امر سے کاملین مکملین کے قلوب مراد ہیں جو کہ واصل ہونے کے بعد مخلوق کو حق کی طرف دعوت دینے کے لیے نزول فرماتے ہیں اور صفاتِ الٰہیہ سے متصف ہو کر رجوع کرتے ہیں۔ (پتہ چلا کہ اہلِ اللہ صفاتِ الٰہیہ سے موصوف ہوتے ہیں جس کی برکت سے ان سے ایسے افعال کا صدور ہوتا ہے جو کہ انسانی وسعت سے باہر ہے جیسا کہ مشکل کشائی' حاجت روائی' شفاعت جیسا کہ مفسر علام نے اس سورۃ کے مقدمے میں اس کی تصریح فرمائی ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہٗ) اور اس صورت میں قسم کا جواب يَوْمَ تَرْجُفُ الرَّاجِفَةُ سے پہلے مقدر ہے یعنی لترجعن الی اللہ مرضیین ان اتصفتم بهذا الصفات او مطرو دین ان اتصفتم باضدادها یعنی اگر تم ان صفات کے ساتھ موصوف ہو جاؤ تو ضرور ضرور اللہ تعالیٰ کی طرف اس کے پسندیدہ بندے ہو کر لوٹو گے یا مردود ہو کر اگر تم نے ان کے ضدوں کو اپنایا۔

اور علمائے ظاہر کہتے ہیں قوتِ علمیہ کی تکمیل کے مراتب مراد ہیں اور نازعات غرقا سے ابتدائی طالب علم مراد ہیں جو کہ دقیق معنوں کو اپنے فکر کے زور سے متون' شروح اور حواشی کی عبارات سے کھینچتے ہیں اور ناشطات سے متوسط طالب علم مراد ہیں جو کہ عقدے حل کرتے ہیں اور مشکل مقامات کو آسان کرتے ہیں۔ پس نشط' نشط البعیر سے لیا گیا ہے یعنی اس نے اونٹ کی زنجیر کو کھول دیا اور سابحات سے فقہی طلباء علم مراد ہیں جنہوں نے ہر علم کے مسائل کو عبور کر لیا ہے اور وہ علم کے دریاؤں میں شناوری کرتے ہیں اور سابقات سے دقیقہ شناس فضلاء مراد ہیں جن کے ذہن مخفی دقائق کی طرف سبقت کرتے ہیں جبکہ مدبرات امر سے مراد کتابوں کے مصنف' قاعدے وضع کرنے والے' اصول کی شیرازہ بندی اور فروع کی تعمیر کرنے والے ہیں اور اس صورت میں بھی قسم کا جواب اسی مقام میں مقدر ہے یعنی لتبعثن

يوم ترجف الراجفه فيكشف لكم من حسن الاشياء و قبحها وتعرفون الحق عن الباطل والهدى عن الضلال کہ تم اس دن ضرور اُٹھائے جاؤ گے جس دن کانپنے والا کانپے۔ پس تمہارے لیے چیزوں کا حسن اور قباحت ظاہر ہو' حق اور باطل نیز ہدایت اور گمراہی کی پہچان ہو۔

اور جہاد اور قتال والے کہتے ہیں کہ ان صفات سے موصوف غازی' مجاہدین' ان کے گھوڑے اور اسلحہ مراد ہے۔ پس نازعات غرقا غازیوں کے ہاتھ ہیں جو کہ سخت کمانوں کو کھینچتے ہیں اور ناشطات وہی ہاتھ ہیں جو کہ تیر کو کفار کی طرف کھینچتے ہیں۔ یہ نشط الدلو سے ہے یعنی آسانی سے ڈول نکال لیا یا غازیوں کی جماعتیں ہیں جو کہ نشاط و ناز کے ساتھ میدانِ جنگ میں آتے ہیں اور سابحات غازیوں کے گھوڑے ہیں جو کہ دشمنوں کی صفوں میں شناوری کرتے ہیں اور سابقات ہراول دستوں کی صفیں یا ان کے گھوڑے اور مدبرات امر سے مراد وہ بادشاہ اور سردار ہیں جن کے حسن تدبیر و مشورہ سے جنگ کے پروگرام سرانجام دیئے جاتے ہیں اور کوچ' قیام' حرکت کرنا اور ٹھہرنا ان کے مطابق ہوتا ہے۔

اور اہلِ نجوم کہتے ہیں کہ مذکورہ صفات سے موصوف ان جماعتوں سے مراد گردش کرنے والے ستارے ہیں جو کہ پہلے تو کمان میں تیر کھینچنے کی طرح تیزی کے ساتھ فلک افلاک یعنی نویں آسمان کے تابع ہو کر حرکت کرتے ہیں پھر ایک برج سے دوسرے برج تک اپنی مخصوص حرکتوں کے ساتھ منتقل ہوتے ہیں اور اس حالت کو نشاط کے ساتھ تعبیر کیا گیا جیسا کہ کہتے ہیں ثور ناشط یعنی ایک شہر دوسرے شہر کی طرف نکلنے والا اور سباحت سے مراد ان کے مرکزوں کی حرکت ہے جو کہ مچھلی کی طرح اس حرکت میں شناوری کرتے معلوم ہوتے ہیں اور حرکات کے اجتماع اور باہم اختلاف کی وجہ سے ایک دوسرے سے سبقت کرتے ہیں اور ان اطوار کے اختلاف کی وجہ سے جو کہ ان حالات میں انہیں حاصل ہوتے ہیں' عالم کی تدبیر کرتے ہیں اور ہر ستارہ ان کاموں میں جو اس سے متعلق ہیں' دخل رکھتا ہے اور دو چیزوں کے ملنے اور پھرنے کے واقعات' فصلوں اور اوقات کی تبدیلیاں سفلی کائنات اور حادثوں کو پہچاننا انہیں سے ہوتا ہے۔

اور حضرت ابوالنصر حسن بصری رضی اللہ عنہ سے بھی اسی قسم کا قول منقول ہے اور واعظین اور نصیحت کرنے والے کہتے ہیں کہ فرشتے مراد ہیں جو کہ کفار کی ارواح کو پوری شدت کے ساتھ کھینچتے ہیں۔ پس نازعات غرقا ان پر صادق آتا ہے جبکہ ایمان والوں کی ارواح کو آسانی کے ساتھ نکالتے ہیں تو ناشطات نشطاً ہو جاتے ہیں اور ارواح کو قبض کرنے کے بعد انہیں لے کر عالم برزخ میں شناوری کرتے ہیں۔ پس سابحات سبحا ہو جاتے ہیں اور اس کام میں ایک دوسرے سے سبقت کرتے ہیں اور سوال جواب اور قبر کے عذاب و ثواب کی تدبیر کرتے ہیں اور ان دونوں صورتوں میں جواب قسم وہی محذوف ہے یعنی لتبعثن بدلیل انقلاب الحوادث بتدبیر الکواکب و شھادۃ الموت یعنی تم ستاروں کی تدبیر اور موت کی گواہی کی بنا پر حوادث کے انقلاب کی دلیل سے ضرور ضرور اُٹھائے جاؤ گے۔

اور ان میں سے بعض کہتے ہیں کہ نازعات اور ناشطات وہ فرشتے ہیں جو کہ کفار اور ایمان والوں کی ارواح قبض کرنے پر مقرر ہیں اور سابحات اور سابقات وہ فرشتے ہیں جو کہ پیغام پہنچانے اور مہمیں سر کرنے پر مامور ہیں جبکہ مدبرات امر عظمت والے فرشتے ہیں جیسے حضرت جبرئیل امین، حضرت میکائیل، حضرت اسرافیل اور حضرت عزرائیل اپنے مددگاروں اور لشکروں سمیت کہ ان میں سے ہر ایک کو کائنات کے امور میں سے ایک امر کی تدبیروں کے لیے مقرر فرمایا گیا ہے۔

چار مشہور فرشتوں سے متعلق ڈیوٹیوں کا بیان

حضرت جبرئیل علیہ السلام ہواؤں، جنگوں اور وحی نازل کرنے پر مقرر ہیں اور حضرت میکائیل علیہ السلام بارش، نباتات اور رزقوں پر متعین ہیں اور حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکنے، حیوانات اور آدمیوں میں روح پھونکنے، لوحِ محفوظ، رزق اور اجل کا اندازہ مقرر کرنے پر مامور ہیں جبکہ حضرت عزرائیل علیہ السلام فوت ہونے والوں کی ارواح قبض کرنے، امراض اور آفات پر ڈیوٹی دیتے ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ نازعات سے مراد غازیوں کی کمانیں ہیں جو کہ تیروں کو اپنی

طرف کھینچتی ہیں اور ناشطات سے مراد وہ اونٹ اور بیل ہیں جو کہ گہرے کنوؤں سے پانی کھینچتے ہیں اور سابحات سے مراد کشتیاں ہیں جو کہ دریاؤں میں تیرتی ہیں اور سابقات سے مراد دوڑنے والے گھوڑے جبکہ مدبرات امر سے عقل و حکمت والے لوگ مراد ہیں جو کہ ہر کام میں عقل کی قوت کے ساتھ کوئی تدبیر نکالتے ہیں اور مشکل کاموں کے لیے کئی حیلے پیدا کرتے ہیں اور قسم کا جواب وہی ہے جو کہ ذکر کیا گیا اور ان قسموں اور جن پر یہ قسمیں اُٹھائی گئی ہیں جو کہ قیامت میں اُٹھنا اور میدانِ محشر میں آنا ہے' میں مناسبت معمولی غور و فکر سے معلوم کی جا سکتی ہے جیسا کہ پوشیدہ نہیں ہے۔

اور چونکہ اس کلام میں بیان ہوا کہ ایسے یومِ قیامت میں دل انتہائی بے چین اور بے قرار ہوں گے اور ان کی آنکھیں خیرہ اور حیران ہوں گی اس بات کا گمان ہوا کہ سننے والے کے دل میں خیال گزرے کہ کفار نے اس خوف ناک اور پُر ہول امر کے متعلق سُن کر کیا کہا ہوگا۔ کیا اس متوقع واقعہ کی دہشت کی وجہ سے کوئی غور و فکر کرتے ہیں اور کوئی تدبیر سوچتے ہیں یا ابھی تک غافل اور بے خبر ہی وقت گزار رہے ہیں۔ جواب میں ارشاد ہوا کہ

یَقُوْلُوْنَ اَئِنَّا لَمَرْدُوْدُوْنَ فِی الْحَافِرَۃِ کفار کہتے ہیں کہ کیا ہم اپنی پہلی حالت میں لوٹائے جائیں گے؟ یعنی مرنے کے بعد ہم پھر زندہ ہوں گے؟ اور لغت میں حافرہ طے کی ہوئی راہ کو کہتے ہیں اس لیے کہ حافر اور حافرہ گھوڑے کے سم کا نام ہے اور طے کیے ہوئے راستے میں سم کے نقش رہ جاتے ہیں۔ گویا سم کے نقش کو سم کا نام دے دیا گیا پھر جس راہ میں سم کا نقش ہوتا ہے' مجاز در مجاز کے طور پر حافرہ کہہ دیا۔

کافروں کا قیامت کے دن اُٹھنے میں شبہ

اور غرض یہ ہے کہ کفار آخرت کی زندگی کا انکار اس مطلب کی وجہ سے کرتے ہیں کہ اگر ہم موت کے بعد پھر زندہ ہو جائیں تو اپنی چھوڑی ہوئی حالت کی طرف رجوع کریں اور چھوڑی ہوئی حالت کی طرف رجوع کرنا خلاف واقع ہے ورنہ وہم لازم آئے اور بوڑھے کا جوان ہونا' جوان کا بچہ ہونا اور ماں کے شکم میں آنا بچے کے لیے جائز ہو اور پھر شبہ کو تقویت دینے کے طریقے پر ایک اور استفہام انکاری اور تعجب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ

ءَ اِذَا كُنَّا عِظَامًا نَّخِرَةً کیا ہم زندہ ہوں گے جب کہ ہم کھوکھلی بے مغز ہڈیاں ہو چکے اور بوسیدہ کہ ان ہڈیوں میں ہوا داخل ہو کر آواز پیدا کرتی ہے اور لغت میں نخیر ہوا کی آواز کو کہتے ہیں جو کہ کھوکھلی ہڈی میں کرتی ہے اور یہ مقدمہ بڑھا کر شبہ کی تقویت کی وجہ یہ ہے کہ جب مرکب کھلنے والا ہوتا ہے اور اس کی ترکیبی صورت ضائع ہو جاتی ہے اگر چاہیں کہ مہلت کے بغیر فی الفور اسے پھر اسی صورت میں لوٹائیں تو ممکن ہے اس لیے کہ ابھی اس کے اجزا مادیہ متفرق نہیں ہوا اور ان اجزا میں اس صورت کو قبول کرنے کی استعداد گھٹی نہیں اور جب مدت دراز گزر جائے اور اس کے اجزا مادیہ متفرق ہو جائیں' باقی اجزا کلی طور پر ناقص بلکہ باطل ہو جاتے ہیں اور پھر اس مرکب کو اسی صورت میں لوٹانا ممتنع اور محال ہو جاتا ہے جیسا کہ صنعتی امور میں تجربہ اور مشاہدہ کیا گیا ہے تو اگر لوٹانے اور زندہ کرنے کی بات جو کہ مسلمان کہتے ہیں' موت کے بعد فی الفور بیان کرتے تو کوئی گنجائش تھی کہ اسے سنا جائے جب یہ وعدہ کئی قرنوں' زمانوں کے گزرے' ہڈیوں کے بوسیدہ ہونے اور رطوبتوں کے جو کہ زندگی قبول کرنے کی شرط ہیں' خشک ہونے کے بعد بتایا جاتا ہے تو اس پر کس طرح یقین کیا جا سکتا ہے۔

بعثت کے منکروں کے شبہ کا جواب

اگر کفار کے نزدیک واضح دلائل کے ساتھ ثابت کر دیا جاتا ہے تو اس استفہام کے جواب میں کہا جاتا ہے کہ ہاں حالت متروکہ کی طرف رجوع ہو گا مگر ان معنوں کے ساتھ کہ پہلی حالت کے مشابہہ ایک حالت حاصل ہو گی اس طریقے سے جیسے کہ ہم مثل چیزیں ایک دوسرے کے بعد آتی ہیں نہ کہ بعینہٖ پہلی حالت لوٹے گی اور ہم مثل چیزوں کے آگے پیچھے آنے میں تردد و انکار کی کوئی گنجائش نہیں ہے کہ نیند اور بے داری' دن رات' قمری شکلیں' شمسی فصلیں اور ہر روز' ہر مہینہ اور ہر سال میں موسموں کا آگے پیچھے آنا دیکھا اور محسوس کیا جاتا ہے اور ترکیب اور اس کے لوٹانے کے باطل ہونے میں مدت کی درازی اس وقت دشواری کا موجب ہوتی ہے جب فاعل کی قدرت کامل نہ ہو ورنہ اس کے نزدیک فی الفور لوٹانا اور صدیوں اور استعداد باطل ہونے کے بعد لوٹانا یکساں ہے۔

قَالُوْا وہ پھر مذاق اور تعجب کے طور پر کہتے ہیں تِلْكَ اِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ یعنی یہ زندگی جو کہ اجزا کے بکھرنے اور رطوبتوں کے فنا ہونے کے بعد ہوگی اس صورت میں لوٹنا سراسر نقصان ہے اس لیے کہ ہم اپنے بعض اجزا کو نہیں پائیں گے اور ہم سے بہت سی چیزیں گھٹ جائیں گی اور ہمارا مال اور کمائی ہوئی چیزیں ہم سے جدا ہو جائیں گی۔ پس ہمارا اس جہان میں لوٹنا اس مسافر کے لوٹنے کی مانند ہے جو کہ اپنے گھر سے مال' دولت' صحت اور سلامتی اعضاء کے ساتھ نکلا تھا اور سفر میں سب کچھ برباد ہو گیا اکیلا' سر برہنہ' زخمی جسم اور اعضاء کو ضائع کیے واپس آ جائے کہ اس کا یہ آنا سراسر نقصان ہے۔ اللہ تعالیٰ اس مذاق کے جواب میں ارشاد فرماتا ہے تمہارا یہ ناممکن سمجھنا اس بنیاد پر ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے فعل اور تاثیر کو اپنے فعل اور تاثیر پر قیاس کرتے ہو اور اسے اپنی طرف اسباب جمع کرنے کی قید اور آلات سے مدد لینے کی پابندی میں سمجھتے ہو حالانکہ ایسا نہیں ہے اس کا فعل اور تاثیر اسباب اور آلات پر موقوف نہیں بلکہ اسباب و آلات بھی اس کے فعل اور تاثیر کی وجہ سے جمع ہوتے ہیں اور ملتے ہیں۔

فَاِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَّاحِدَةٌ پس وہ زندگی تو ایک تند و تیز آواز کا اثر ہے اور وہ صور پھونکنے سے کنایہ ہے کہ صرف اسی کی وجہ سے ارواح جسموں کے ساتھ متعلق ہو جائیں گی اور روح کا جسم کے ساتھ متعلق ہونا زندگی کی تمام شرائط اور اسباب کو جمع کر لیتا ہے اور اس تعلق کی وجہ سے پوری زندگی حاصل ہو جائے گی نہ کہ ماں کے پیٹ والے بچے یا نوزائیدہ بچے کی طرح جو کہ کمزور حس رکھتا ہے اور دشواری سے حرکت کرتا ہے اس لیے کہ وہ اس تیز آواز کو سنتے ہی سریع اور قوی حرکت کریں گے اور ذہن کے اندر سے جنبش کریں گے۔

فَاِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ پس وہ اچانک زمین کے اوپر ہوں گے اور لغت میں ساہرہ سفید ہموار زمین کو کہتے ہیں اور یہ آخرت کی زمین کا نام ہے کہ اس دن زمین کی یہی حالت ہوگی۔

اور احتمال ہے کہ یہاں ساہرہ بے داری کے معنوں میں ہو جسے سہر سے لیا گیا جس کا معنی بے خوابی ہے جیسے کاذبہ اور خاطئہ

اور ان آیات کی تقریر اس احتمال پر ہے کہ جب کفار نے مسلمانوں کے الزام کے لیے کہا کہ موت سے قیامت قائم ہونے تک جو کہ زندگی کے وعدے کا وقت ہے' کافی زمانے کا فاصلہ ہے اور اس دوران ہڈیاں بوسیدہ' جسمانی رطوبتیں ختم اور اس کے اجزا منتشر اور لاشئی ہو چکے ہوں گے پھر ترکیبی صورت کا لوٹانا جس کے ساتھ زندگی کا فیضان مشروط ہے' کیسے ہوگا اور مسلمانوں نے کہا کہ اس سب کچھ کے باوجود ایسا ہوگا اس لیے کہ اصلی اجزا کا باقی رہنا لوٹانے کی شرط ہے نہ کہ تمام اجزا کا باقی رہنا جبکہ اللہ تعالیٰ اصلی اجزا کو محفوظ رکھے گا۔

دوسری دفعہ کفار نے کہا تِلْكَ إِذًا كَرَّةٌ خَاسِرَةٌ یعنی اس تقدیر پر کہ پورے اجزا باقی نہ رہیں' لوٹانا ناقص ہے اس لیے کہ اجزا پورے کے پورے نہ لوٹائے گئے تو جو زندگی دوبارہ عطا ہوگی' بھی ناقص ہوگی جیسے ماں کے پیٹ والے بچے اور نوزائیدہ بچے کی زندگی حالانکہ تم کہتے ہو کہ وہ زندگی اس متروکہ زندگی سے زیادہ کامل اور دائم ہوگی۔ پس تمہارے مذہب کے خلاف ثابت ہوا۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے جواب میں یہ ارشاد فرمایا فَإِنَّمَا هِيَ زَجْرَةٌ وَاحِدَةٌ فَإِذَا هُمْ بِالسَّاهِرَةِ یعنی یہ لوٹانا اور اعادہ کرنا تو صرف ایک تند و تیز آواز کا اثر ہے۔ پس وہ سب کے سب بے خوابی اور بے داری میں آ جائیں گے۔ حاصل کلام یہ کہ زندگی کا کمال اور اس کا نقصان اس کے روحانی قویٰ کے کمال اور ان کے نقصان کی وجہ سے ہے نہ کہ اجزا جسم کی کثرت اور ان کی قلت کی وجہ سے اور پیٹ کے بچے اور نومولود کی زندگی جو کہ ناقص ہے' ان کی روحانی قوتوں کے ناقص ہونے کی وجہ سے ہے جو کہ ابھی تک اپنے کمال کی حد کو نہیں پہنچی ہیں اور ترقی اور افزائش کے درپے ہیں۔ بخلاف مردوں کی ارواح کے جو کہ اپنے کمال کو پہنچ کر اس جہان سے فوت ہو گئیں ہیں اور ان کی ارواح کا ان کے جسموں سے منقطع ہونا جو کہ موت کے بعد رونما ہوا' روحانی قوتوں کے کمال کو ختم کرنے کا موجب نہیں ہوا تاکہ وہ لوٹائے جانے کے وقت ناقص اٹھیں بلکہ اس تعلق کے لوٹانے کو نیند کے بعد جاگنے کی صورت میں روح کے بدن کے ظاہر کے ساتھ متعلق ہونے پر قیاس کرنا چاہیے کہ نیند میں روح کا بدن کے ظاہر سے تعلق منقطع ہوتا ہے اور حس و حرکت باطل ہو جاتی ہے اور پھر ایک سخت آواز

کے ساتھ ہی وہ تعلق لوٹ آتا ہے اور روحانی قوتوں میں کوئی نقصان لاحق نہیں ہوتا اور پھر کامل اور پورا کرنے کا محتاج نہیں ہوتا تا کہ پیٹ والے بچے اور نومولود کی طرح بالغ ہونے کا محتاج ہو اور درجہ بدرجہ حد کمال کو پہنچے۔

نیز احتمال ہے کہ لفظ ساہرہ اسم فاعل ہو جو کہ سہر سے مشتق ہے جس کا معنی بے خوابی کا ہے یعنی فاذا ھم متلبسون بالابدان الساھرۃ اچانک ان کی روحیں ان کے بے دار جسموں میں آ جائیں جو کہ نفخ صور سے پہلے قوی ادراک والے نفوس سماویہ کا تعلق حاصل ہونے اور ان کی قوتوں کے سرایت کرنے کی وجہ سے اس حد تک انتہائی کامل زندگی کے مستعد رہے ہیں کہ خواب کے قابل بھی نہیں رہے ہیں اور اس طور پر وہاں کی زندگی دنیا کی زندگی سے زیادہ کامل ہے کہ دنیا کی زندگی میں پھر بھی کچھ موت کی آمیزش ہے کیونکہ نیند موت کا بھائی ہے اور وہاں کی زندگی میں نیند بھی نہیں ہے اس حد تک موت اور موت کی مشابہہ چیزوں سے دُور ہے اسی لیے دوزخیوں اور جنتیوں کے لیے نیند نہیں ہوگی جیسا کہ فرشتوں اور نفوس سماویہ کے لیے نہیں ہے۔

اور جب کفار اس وضاحت، صورت کشی اور مثالیں بیان کرنے کے باوجود اخروی زندگی کا یقین نہیں کرتے اور اپنے ناممکن جاننے پر مصر اور قائم رہتے ہیں اور کہتے ہیں کہ ان دلیلوں اور مثالوں سے ہمارے دل میں یہ بات جاگزیں نہیں ہوتی کہ خشک ہڈیاں اس کے باوجود کہ زندگی کی صلاحیت بالکل نہیں رکھتیں، ایک دن میں زندہ ہو جائیں اور ایک ہی جسم پر مدت دراز گزرنے کے بعد زندگی کا آگے پیچھے آنا ہمیں سمجھ نہیں آتا جب تک کہ اس کا گواہ ہم اپنی آنکھوں سے نہ دیکھ لیں اور مردے کے زندہ ہونے کا ہم ایک بار مشاہدہ نہ کر لیں۔ تنگ دل ہو کر مسلمانوں کے دل میں یہ بات آتی ہے کہ اے کاش حق تعالیٰ ایک مردے کو صدیاں اور زمانے گزرنے کے بعد ان کے سامنے زندہ فرما دے کہ ان کا انکار ٹوٹ جائے اور یہ ملزم بن جائیں اس بنیاد پر اللہ تعالیٰ ہر ایک مسلمان کو خطاب فرماتے ہوئے استفہام کے طور پر فرماتا ہے

هَلْ اَتٰىكَ حَدِيْثُ مُوْسٰى کیا تیرے پاس حضرت موسیٰ (علیہ السلام) کا واقعہ پہنچا

ہے جو کہ سرکش بادشاہ فرعون کے سامنے جس کے دربار میں ہزاروں آدمی حاضر ہوتے تھے' ہاتھ کا عصا زمین پر پھینکتے ہی زندہ کر دیتے تھے اور وہ بہت بڑا اژدہا ہو جاتا اور وہ دوڑتا اور منہ کھول کر پھنکارتا۔ پس ایک جسم میں جو کہ لکڑی تھی اس طرح کی زندگی کا تعاقب کئی بار واقع ہونے کے بعد حالانکہ وہ حیوانی زندگی قبول کرنے سے پورے طور پر دُور ہے اور اس میں رطوبت بالکل نہیں ہے' شک اور تردد کی کونسی گنجائش ہے اور صرف زمین پر پھینکنے سے ہی اس کامل زندگی کے حصول کو دیکھنے کے بعد فرعون روزِ جزا کا معتقد اور حق تعالیٰ کی قدرت کے عموم کا قائل نہ ہوا اور یہ کفار بھی ایک مردے کے زندہ ہونے کو دیکھ کر سیدھی راہ پر نہیں آئیں گے بلکہ دنیوی عذاب کے مستحق ہو جائیں گے کیونکہ معجزات دیکھنے کے بعد تکذیب اور انکار کرنا عادتِ الٰہیہ میں اس کا سبب ہوتا ہے اور اگر یہ واقعہ تفصیل کے ساتھ ہر مسلمان کے کانوں میں نہ پڑا ہو تو ہم اس کا اجمالی تذکرہ یہاں کر دیتے ہیں۔

اِذْ نَادَاهُ رَبُّهٗ بِالْوَادِ الْمُقَدَّسِ طُوًى یعنی اس واقعہ کی ابتدا اس وقت تھی جب اسے اس کے پروردگار نے طویٰ کے متبرک مقام پر ندا دی۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کا واقعہ

اور سورۂ طٰہٰ سورۂ قصص اور دوسری سورتوں کے مطابق اس واقعہ کی کیفیت یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے جائے ولادت اور مسکن شہر مصر سے ایک قبطی ظالم کے خون کی وجہ سے جو کہ آپ کے ہاتھوں ہوا تھا اور فرعون آپ کو قتل کرنے کے درپے ہو گیا تھا' بھاگ کر مدین کی طرف تشریف لے گئے اور حضرت شعیب علیہ السلام جو کہ اس شہر میں پیغمبر تھے اور ان کا واقعہ بھی قرآن مجید میں تکرار کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے' کے گھر سکونت پذیر ہو گئے اور حضرت شعیب علیہ السلام کی خدمت میں مصروف ہو گئے اور حضرت شعیب علیہ السلام نے اپنی دخترِ نیک اختر کا نکاح آپ کے ساتھ کر دیا۔

جب وہاں دو روایات کے اختلاف کے مطابق دس سال یا آٹھ سال تشریف فرما رہے تو حضرت شعیب علیہ السلام سے اجازت طلب کی کہ اگر آپ اجازت دیں تو میں اپنے وطن واپس چلا جاؤں اور اپنے اہلِ خانہ کو بھی ساتھ لے جاؤں اور اپنی والدہ محترمہ کی زیارت

کروں اور اپنے بڑے بھائی حضرت ہارون علیہ السلام سے بھی ملاقات کروں اس لیے کہ اس مدت تک فرعون اور فرعونی خون قبطی کا واقعہ بھول چکے ہوں گے۔

حضرت شعیب علیہ السلام نے آپ کو رضامندی کے ساتھ رخصت فرمایا اور آپ کے اہلِ خانہ کو بھی ساتھ روانہ کر دیا اور اپنے دو غلام بھی ہمراہ کر دیئے تا کہ مصر تک پہنچا کر واپس آ جائیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنے اہلِ خانہ کو لے کر روانہ ہوئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام بہت غیور تھے' اپنے اہلِ خانہ کو قافلے کے ہمراہ لے جانا گوارا نہ فرمایا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ سوار ہوتے یا سواری سے اُترتے وقت کسی نامحرم کی نگاہ ان پر پڑے' اکیلے روانہ ہوئے اور شام کا راستہ چھوڑ دیا کہ کہیں شام کے حکام جو کہ فرعون کے پیروکار تھے اس خون کی وجہ سے راستے میں مزاحم نہ ہوں' سمندر کے ساحل کا راستہ اختیار فرمایا اور آپ کے ہمراہ ایک اونٹ تھا جس پر آپ نے اپنے سامان کی بوریاں لاد رکھی تھیں اور ایک غلام کو اس پر مقرر فرما دیا تھا اور بکریاں بھی تھیں جن کی حفاظت اور انہیں ہانکنے کے لیے دوسرے غلام کو مقرر فرما دیا تھا اور خود زنانہ سواری کے ہمراہ چلتے تھے یہاں تک کہ ایک دن راستہ گم کر کے کوہِ طور کی طرف جا نکلے جتنا راستہ بھی طے کیا' کوئی منزل نظر نہ آئی اور شام کا وقت ہو گیا اور وہ ذوالقعدہ کی اٹھارہ اور جمعہ کی رات تھی' سردی کا موسم اور اس دوران آپ کی بھیڑ بکریاں وحشت کی وجہ سے منتشر ہو گئیں اور آپ رات کے سفر کی وجہ سے تھک گئے۔

غلام بھیڑ بکریوں کو جمع کرنے میں مصروف ہو گئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام اپنی اہلیہ کے ہمراہ ٹھہر گئے کہ اچانک آپ کے اہلِ خانہ کو سواری کی تھکاوٹ اور سفر کی کوفت کی وجہ سے ولادت کی تکلیف شروع ہو گئی اور ان کی مدت حمل پوری ہو چکی تھی' آپ کے اہلِ خانہ نے اس بات کا حضرت موسیٰ علیہ السلام کے سامنے اظہار کیا اور کہا کہ اگر کہیں سے آگ مل جائے تو بہت ضروری ہے کہ روشنی کے کام بھی آئے اور اس سردی میں اس سے گرمی حاصل کریں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے غلاموں کو حکم دیا کہ اس جنگل میں دیکھو کہ کہیں آگ کا نشان ملتا ہے۔ غلام دائیں بائیں دوڑے کسی آبادی اور آگ کا سراغ نہ ملا' حضرت موسیٰ علیہ السلام نے خود اُٹھ کر تلاش شروع فرمائی۔ آپ کو اپنی دائیں جانب پہاڑ کے اوپر آگ

کی روشنی معلوم ہوئی' آپ نے اپنے اہلِ خانہ اور غلاموں سے فرمایا کہ تم لوگ یہیں ٹھہرو' مجھے کچھ آگ معلوم ہوئی ہے۔ میں جاتا ہوں تاکہ اس سے کچھ آگ لاؤں اور جو کوئی آگ کے قریب ہوگا' اس سے راستے کا پتہ پوچھ لوں گا تاکہ ہم منزل تک پہنچ جائیں۔

جب حضرت موسیٰ علیہ السلام اس آگ کے قریب پہنچے تو دیکھا کہ یہ آگ نہیں ہے' قدرتِ الٰہی سے ایک عجیب شے ہے کہ دھوئیں کے بغیر آگ کے رنگ میں ایک عظیم نور نے عوسج کے درخت کو جو کہ عناب کے درخت کے مشابہ ہوتا ہے اور شام کے پہاڑوں میں بہت اُگتا ہے' گھیر رکھا ہے اور وہ درخت نیچے سے لے کر اوپر تک سرسبز وشاداب ہے اور آگ کی روشنی اس قدر چمک دار ہے کہ آنکھوں کو خیرہ کرتی ہے اور اس آگ کے اردگرد سے فرشتوں کی تسبیح کی آواز سنائی دیتی ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس سب کچھ کے باوجود اس میدان سے تنکے اکٹھے کر کے دستے کی طرح باندھ کر چاہا کہ اسے اس آگ سے روشن کریں جب زیادہ نزدیک ہوئے تو وہ آگ آپ کی طرف لپکی۔ گویا آپ تک پہنچنا چاہتی ہے' یہ حالت دیکھ کر آپ ہیبت زدہ ہو کر پیچھے ہٹ گئے' آگ بھی درخت کے اوپر پہنچ گئی۔ دوسری مرتبہ آپ پھر آگ کے نزدیک ہوئے' آگ پھر آپ کی طرف لپکی' آپ پھر پیچھے ہٹ گئے اسی طرح چند مرتبہ اتفاق ہوا۔ دریں اثناء حضرت موسیٰ علیہ السلام حیران کھڑے اس عجیب وغریب شے کا تماشا کر رہے تھے کہ اچانک اس آگ سے ایک عظیم نور اُٹھا اور اس سے زمین وآسمان کی فضا معمور ہوگئی اور اس نور کی روشنی اس حد تک غالب ہوگئی کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی آنکھیں چندھیا گئیں اور دیکھنے سے رہ گئیں اور آپ نے اپنے ہاتھ اپنی آنکھوں پر رکھ لیے اور فرشتوں کی تسبیح کی آواز نہایت بلند ہوگئی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس وقت آگ سے ایک آواز سُنی کہ

یٰمُوْسٰی اِنِّیْٓ اَنَا رَبُّكَ فَاخْلَعْ نَعْلَيْكَ اے موسیٰ! میں تیرا پروردگار ہوں کہ میں نے آگ کی صورت میں تجلی فرمائی ہے' اپنے دونوں جوتوں کو اپنے پاؤں سے اُتار دیں اس لیے کہ یہ جگہ تجلی الٰہی اور فرشتوں کی حاضری کی وجہ سے جو کہ اس تجلی کے خادم ہیں' کعبہ اور مسجد حرام کے حکم میں ہو چکی ہے۔

پھر گفتگو شروع ہوگئی اور آپ سے پوچھا گیا کہ آپ کے سیدھے ہاتھ میں کیا ہے؟ عرض کی میری ہاتھ کی چھڑی ہے۔ حکم ہوا کہ اسے زمین پر پھینک دیں' آپ نے پھینک دی۔ ایک بھاگتا ہوا اژدہا بن گیا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام اس اژدہا سے ڈر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ ارشاد ہوا کہ مت ڈریں اور اس اژدہے کو اپنے ہاتھ سے پکڑ لیں کہ پھر وہی ہاتھ کی چھڑی بن جائے گی۔ پھر حکم ہوا کہ اپنے ہاتھ اپنی بغل کے نیچے رکھیں پھر نکالیں۔ پس آپ نے ایسا ہی کیا' آپ کا ہاتھ سورج کی طرح چمک دار ہوگیا کہ آنکھوں کو اپنی روشنی سے خیرہ کر رہا تھا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے فرمایا کہ میں نے یہ آواز سنتے ہی جان لیا کہ یہ خدا تعالیٰ کی آواز ہے اس لیے میں اسے چھ سمتوں سے ہی سُن رہا تھا اور جسم کے سارے اعضاء کے ساتھ سُن رہا تھا یہاں تک کہ میرے جسم کا ہر ہر عضو کان تھا۔ بہرحال یہ کرشمہ دکھانے' حقائق توحید اور آداب عبادت تلقین کرنے' قیامت کی آمد اور دوسری ضروریات رسالت بیان کرنے کے بعد حکم ہوا کہ

اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ فرعون کی طرف جا تاکہ تو اس کی تدبیر و اصلاح کرے اور سابقین اور مقربین کے حاصل شدہ مقام سے ترقی کر کے مدبرات امر کے مقام تک پہنچ جائے اور میں تجھے فرعون کی تدبیر واصلاح کے لیے اس لیے بھیج رہا ہوں کہ

اِنَّهٗ طَغٰى تحقیق وہ فرعون فساد کرنے میں حد سے نکل گیا ہے یہاں تک کہ ربوبیت کا دعویٰ کرتا ہے اور جب تو فرعون کے پاس پہنچے

فَقُلْ تو پہلے اسے اسی قدر کہنا کہ هَلْ لَّكَ اِلٰۤى اَنْ تَزَكّٰى کیا تجھے اس بات کی طرف کوئی رغبت اور میلان ہے کہ تو نفس کی ردی صفات سے پاک ہو جائے جو کہ تیرے سرکش ہونے کی بنیاد ہے اور میں تیری خرابی کی اصلاح میں صرف یہیں تک قناعت نہیں کروں گا اس لیے کہ اتنا کام تو عام صلحاء اور دانایانِ حکمت بھی کر سکتے ہیں بلکہ میں تجھے عظیم ترقی دوں گا اور تجھے اولیائے کاملین اور صلحاء واصلین میں سے کر دوں گا۔

وَاَهْدِيَكَ اِلٰى رَبِّكَ اور تجھے تیرے پروردگار کی طرف رہنمائی کروں تا کہ تجھے اللہ تعالیٰ کی ذات' صفات اور افعال کی معرفت عین الیقین کے ساتھ حاصل ہو جائے۔

فَتَخۡشٰی پس تو ہیبت پائے اور تیرا نفس پاش پاش ہو جائے اور تجھے کلی فنا نصیب ہو اور اس کے بعد خوف نہ کرنا کہ تجھے سرکشی کی بیماری لگے کیونکہ فانی لوٹتا نہیں۔

اور یہاں اس واقعہ کا بقیہ محذوف ہے یعنی حضرت موسیٰ علیہ السلام فرعون کی طرف تشریف لے گئے اور اسے فرمانِ الٰہی پہنچایا اور فرعون نے پہلے تو ان کے جواب میں یوں کہا کہ کیا تو وہی شخص نہیں ہے کہ ہم نے بچپنے کی حالت میں تجھے پالا تھا اور تو نے ہمارے درمیان کافی وقت گزارا پھر تو وہ کام کر کے چلا گیا جو تجھے معلوم ہے اور تو ہماری نعمتوں کا ناشکر ہو گیا' تجھے یہ منصب کہاں سے مل گیا کہ خود کو میرا ہادی اور مرشد قرار دے کر آ گیا۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس کے جواب میں فرمایا کہ ہاں میں وہی شخص ہوں اور میں نے جو کام کیا تھا اس وقت مجھے معلوم نہ تھا کہ ایسا ہو جائے گا اور جب میں تم سے ڈر کر چلا گیا تو خداتعالیٰ نے مجھے علم و حکمت سے نوازا اور ہدایت اور ارشاد کا منصب عطا فرمایا اور مجھے پیغام دے کر تمہارے پاس بھیج دیا۔ دوسری مرتبہ فرعون نے کہا کہ اب تو یہ دعویٰ کرتا ہے کہ میں خداتعالیٰ کا رسول ہوں اگر تو سچا ہے تو اس دعوے پر کوئی دلیل پیش کر۔

فَاَرٰىهُ الۡاٰيَةَ الۡكُبۡرٰى پس حضرت موسیٰ نے فرعون کو بہت بڑی نشانی دِکھائی اور اگرچہ وہ دو نشانیاں تھیں' ایک یہ کہ عصا اژدہا ہو گیا اور دوسری یہ کہ آپ کا ہاتھ سورج کی طرح روشن ہو گیا لیکن چونکہ ایک ہی مجلس میں ایک ہی مقصد کو ثابت کرنے کے لیے تھیں' دونوں نشانیوں کو ایک ہی قرار دیا گیا۔ نیز ید بیضاء عصا پھینکنے کے تابع تھا پس گویا اصلی معجزہ وہی عصا ہوا اور اس میں راز یہ ہے کہ جب انبیاء علیہم السلام مبعوث ہوتے ہیں' پہلے وہ مخالفین اور منکرین کو مغلوب کرنے میں مصروف ہوتے ہیں اس کے بعد طالبوں اور ہدایت چاہنے والوں کی رہنمائی میں مشغول ہوتے ہیں۔ عصا مغلوب کرنے کی صورت تھی جبکہ ید بیضاء ہدایت وارشاد کا نمونہ۔ نیز عصا میں حیاتِ غیبی ہولناک صورت میں ظاہر ہوتی تھی جبکہ ید بیضاء میں نورِ غیبی پوری تابانی کے ساتھ جلوہ فرما ہوتا تھا اور قہر و سیاست کا تعلق نبوت کے ظاہر سے ہے اور نورِ تجلی کا تعلق نبوت کے باطن سے ہے جو کہ ولایت ہے اور فرعون کے لیے جو کہ کافر ازلی تھا' اصل مقصد الزامِ حجت اور صرف ڈرانا تھا تو اس کے حق میں آیۂ کبریٰ

عصاء ہوگا نہ کہ ید بیضاء

معجزات از بہر قہر دشمن است
بوئے جنسیت پئے دل بردن ست

نیز عصا میں اور معجزات بھی تھے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا کے دوسرے معجزات

پانی کھینچنے کے وقت کنوئیں کی گہرائی کے مطابق لمبا ہو جاتا تھا اور رسی کی طرح اس کی شاخیں ڈول کے ساتھ چپک جاتی تھیں اور تاریکی کے وقت اس کی دونوں شاخیں شمع کی طرح چمکتی تھیں جب حضرت موسیٰ علیہ السلام آرام فرماتے تو کھڑے ہو کر چوکیداری کرتا اور اگر آپ اسے بھیڑ بکریوں کے پاس چھوڑ کر کہیں تشریف لے جاتے تو بھیڑیئے اور چور کو روکتا تھا یہاں تک کہ کہتے ہیں کہ آپ کے عصا میں ایک ہزار معجزات تھے جن میں سے دو بڑے معجزات قرآن پاک میں بھی مذکور ہیں اسے مار کر دریا کو پھاڑنا' دوسرا اسے مار کر پتھر سے پانی کے چشمے جاری کرنا۔ پس آیت کبریٰ وہی ہوگا نہ کہ ید بیضاء۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ید بیضاء اس لیے زیادہ بڑا ہوا کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کمال ولایت کی صورت تھی۔ ولاية النبي افضل من نبوته نیز فرعون کے جادوگر ید بیضاء کی نقل نہ کر سکے جبکہ انہوں نے عصا کی نقل کی۔

اور حق یہ ہے کہ دونوں معجزات آیۂ کبریٰ میں داخل ہیں اور یہ دونوں ایک ہی نشان کا حکم رکھتے ہیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عطا فرماتے گئے دوسرے معجزات کی نسبت زیادہ بڑے ہیں۔

بہرحال فرعون ان دونوں معجزات کو دیکھ کر جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دعوے کے اثبات میں دو معتمد گواہ تھے اس لیے کہ آپ کے ہاتھوں ایسے جسم میں جو کہ حیات کے بالکل قابل نہیں جیسے لکڑی غیبی حیات کا جلوہ گر ہونا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ آپ کے ہاتھوں مردے بطریق اولیٰ زندہ ہوں گے اور نفس کو ردی حرکات اور خبائث سے پاک کرنا ان کے نزدیک آسان کام ہے اور آپ کے ہاتھ پر نور الٰہی کا چمکنا اس بات کی صریح دلیل

ہے کہ آپ کے ہاتھوں راہِ خدا کے سالکوں کو انوار و تجلیات تک پہنچانا رونما ہو سکے گا۔ بالکل مطیع نہ ہوا بلکہ اس نے نفرت کی۔

فَكَذَّبَ وَعَصٰى پس اس نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کا انکار کیا اور خداتعالیٰ کے پیغام کی نافرمانی کی جو کہ آپ کی زبان کے ذریعے اس تک پہنچا تھا اس نے اسی پر اکتفا نہ کیا بلکہ

ثُمَّ اَدْبَرَ یَسْعٰى پھر اس نے خداتعالیٰ کی راہ کو پشت کی۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی رسالت کو باطل کرنے میں کوشش شروع کی جب اس نے جان لیا کہ ان دو معجزات کو دیکھنے کی وجہ سے حاضرین کے دِلوں میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کی صداقت گھر کر جائے گی۔

فَحَشَرَ پس اس نے جادوگروں کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مقابلہ اور مخلوقِ خدا کو یہ مقابلہ دیکھنے کے لیے جمع کیا تا کہ وہ جان لیں کہ یہ کام حیلے اور تدبیر کے ساتھ بھی ہو سکتا ہے' خداتعالیٰ کا کام نہیں ہے۔

فَنَادٰى پس اس نے مقابلے سے پہلے لوگوں کو آواز دی تا کہ بالفرض اگر جادوگر مغلوب ہو جائیں تو حضرت موسیٰ علیہ السلام کا مقصد ثابت نہ ہو کہ ابھی اس پروردگار کی ربوبیت جس کی طرف سے حضرت موسیٰ علیہ السلام پیغام رسانی کا دعویٰ کرتے ہیں' میری ربوبیت کے بعد ہے اور اعلیٰ کے ہوتے ہوئے ادنیٰ کی پیروی کرنا رعایا کے لائق نہیں۔

فَقَالَ اَنَا رَبُّكُمُ الْاَعْلٰى پس فرعون نے کہا کہ میں تمہارا اعلیٰ پروردگار ہوں اور اگر دنیا میں کوئی اور پروردگار بھی ہو کہ جس نے موسیٰ کو پیغام رسانی کے طور پر بھیجا ہے تو وہ میرے بعد ہوگا تو اگر موسیٰ اپنی رسالت کو ثابت کرے پھر بھی اتباع کے قابل نہیں اور جیسا کہ سورۂ زخرف اور دوسری سورتوں میں مذکور ہے' اپنی ربوبیت کی بلندی حضرت حق جل شانہ کی ربوبیت پر اس طریقے سے ثابت کرتا تھا کہ اگر اللہ تعالیٰ کی ربوبیت ہے تو وہ عام مخلوقات کو عام ہے جبکہ میری ربوبیت اہلِ مصر پر خاص ہے اور پاسداری اور اس کے حق کی رعایت میں خاص عام سے پہلے ہوتا ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کی ربوبیت حس اور عقل کی نظر سے غائب ہے جبکہ میری ربوبیت محسوس' اور دیکھی جاتی ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کا رسول جو کہ حضرت

موسیٰ علیہ السلام ہیں' میرے ایلچیوں کی طرح رعب نہیں رکھتا نہ اس کے ہاتھ میں زریں دستانہ ہے اور نہ ہی اس کے ہمراہ فوج اور لشکر اور ایلچی کے حال سے اس بادشاہ کی بادشاہی کی کمزوری سمجھی جاسکتی ہے جس کی طرف سے وہ ایلچی آیا ہے۔

بہر حال فرعون بھی ان تدبیروں اور حیلوں سے پہلے گمراہی میں سبقت کرنے والوں سے تھا اور اس کے بعد مدبرات امر میں داخل ہوگیا۔ پس دونوں مقابلے کے حریف جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام ہیں اور فرعون ہدایت اور گمراہ کرنے کی جہت میں برابر ہوگئے لیکن عنایت الٰہی نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کی تدبیر کی امداد فرمائی اور اس ملعون کی تدبیر کو برباد کردیا۔

فَاَخَذَهُ اللّٰهُ نَكَالَ الْاٰخِرَةِ وَالْاُوْلٰى پس اسے اللہ تعالیٰ نے اس جہان اور اس جہان کے عذاب میں پکڑ لیا اس جہان میں اسے پانی کے عذاب کے ساتھ غرق فرمادیا اور اس جہان میں آگ کے عذاب میں گرفتار فرمایا جیسا کہ دوسرے مقام پر فرعون اور اس کی فوجوں کے متعلق فرمایا گیا ہے اُغْرِقُوْا فَاُدْخِلُوْا نَارًا۔ اور اگرچہ دنیوی سزا آخرت کے عذاب سے پہلے ہے لیکن ذکر میں عذاب آخرت کو اس وجہ سے پہلے لایا گیا ہے کہ مقصود یہی ہے اور دنیوی سزا اس کا وسیلہ۔ نیز وہ عذاب ہمیشہ کے لیے ہے اور دنیوی سزا سے ہزاروں مرتبہ زیادہ سخت ہے۔ پس وہ پہلے ذکر کیے جانے کے لائق ہے اگرچہ دنیا دارالجزا نہیں ہے لیکن اس طرح کے فرعونوں کو دنیا میں بھی الزام حجت کے بعد دوسروں کی عبرت کے لیے ان کے کردار کی سزا دیتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا جارہا ہے کہ

اِنَّ فِیْ ذٰلِكَ لَعِبْرَةً لِّمَنْ یَّخْشٰى بے شک اس گرفتاری میں چند وجوہ سے اس کے لیے ایک عبرت ہے جو کہ خدا تعالیٰ سے ڈر سکتا ہے۔

عبرت آموز ہونے کی چند وجوہ

پہلی وجہ یہ ہے کہ گمراہی کی اقتداء کرنے والوں کی تدبیر کامیاب نہیں ہوتی اور کسی وقت بھی برباد ہوجاتی ہے جیسے کہ فرعون کی تدبیر برباد ہوئی۔

دوسری وجہ یہ کہ اللہ تعالیٰ اگرچہ گمراہوں کو مہلت دیتا ہے مگر انہیں فضول نہیں چھوڑتا۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ معجزات دیکھنے سے وہی سیدھی راہ پر آتا ہے جس کے دل میں کفر نے گھر نہ کیا ہو اور اس کے جراثیم پھیلے نہ ہوں ورنہ وہ ہر معجزے کو حیلے اور مکر سے رد کر دیتا ہے اور ہر دلیل اور برہان کا مغالطوں کے ساتھ مقابلہ کرتا ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے اس طرح کے سرکش کافر کے ساتھ کہ جس نے ربوبیت کا دعویٰ کر رکھا تھا' پوری نرمی اور حوصلے سے باتیں کیں اور انجام کار کامیابی حاصل کی۔ پس پیغمبروں علیہم السلام اور ان کے پیروکاروں کو چاہیے کہ کفریہ کلمات اور بے ادبی کی باتیں سُن کر آپے سے باہر نہ ہوں' غم ناک نہ ہوں تاکہ انجام کے طور پر کامیاب ہوں۔

اور جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ میں ثابت ہو گیا کہ غیبی حیات کا فیضان جسم کی استعداد پر مشروط نہیں۔ نیز غیبی حیات بار بار آتی ہے اور جاتی ہے جیسا کہ عصا کے اژدہا ہونے میں واقع ہوا' کفار کے اس دلیل میں بات کرنے کی گنجائش تھی کہ حیوانی زندگی ناقص ہے اگر ایک پتھر یا لکڑی اسے قبول کرے تو کر سکتی ہے اور اسی طرح اس زندگی کا بار بار آنا بعید نہیں ہے اسی لیے کہ بہار اور برسات کے دنوں میں ہم دیکھتے ہیں کہ اس قسم کے جانور جیسے سانپ' بچھو اور مینڈک دستور توالد و تناسل کے بغیر پیدا ہوتے ہیں اور زمین اور تر مٹی ان حیوانات کی شکل قبول کر لیتی ہے پھر جب وہ موسم گزر جاتا ہے' وہ حیات چلی جاتی ہے' وہ شکل مادے سے جدائی اختیار کر لیتی ہے اور جب دوبارہ وہ موسم آتا ہے پھر وہی اجزا مادیہ جو کہ اسی جگہ پڑے رہ گئے تھے' وہی صورت اختیار کر لیتے ہیں لیکن آدمی کی پیدائش اس انداز سے بہت دُور ہے اس کا کوئی گواہ بیان کرنا چاہیے۔ جواب میں ارشاد ہوتا ہے

ءَاَنْتُمْ اَشَدُّ خَلْقًا کیا تم خلقت میں زیادہ سخت ہو اور تمہاری پیدائش زیادہ دشوار ہے۔

اَمِ السَّمَآءُ یا از روئے خلقت آسمان زیادہ سخت ہے اور اس کی پیدائش تمہاری نظر میں زیادہ دشوار ہے اور اس سوال کا جواب بالکل ظاہر ہے کہ آسمان مقدار میں بھی آدمی سے اس حد تک بڑا ہے کہ اسے اس کے ساتھ کوئی مناسبت نہیں ہے اور برجوں' ستاروں جو کہ مختلف

اثرات اور احکام رکھتے ہیں اور جدا جدا حدود کے اجزا کی تفصیل کے اعتبار سے بھی آدمی سے زیادہ ہے اور اس کی جسمانی قوت بھی آدمی کی جسمانی قوت سے بڑھی ہوئی ہے اس لیے کہ حق تعالیٰ نے بَنَاهَا اسے بنایا ہے۔

آسمان حرکت کرتا ہے

یہ قوی عمارت طویل زمانہ گزرنے اور ہمیشہ متحرک رہنے کے باوجود پرانی ہے نہ ٹوٹتی ہے اور اس کی روحانی قوت بھی آدمی سے زیادہ غالب ہے اس لیے کہ حق تعالیٰ نے

رَفَعَ سَمْكَهَا اس کی اونچائی کو ستونوں اور دیواروں پر اعتماد کے بغیر بلند فرمایا ہے۔ لغت میں سمک درازی کو کہتے ہیں کہ اس درازی کو طول وعرض پر قائم اعتبار کرتے ہیں اگر نیچے سے اوپر کو دیکھیں تو اس درازی کو سمک کہتے ہیں اور ارتفاع بھی کہتے ہیں جیسا کہ عرف میں مشہور ہے کہ اس دیوار کا ارتفاع اس قدر ہے اور اگر اوپر سے نیچے کی طرف دیکھیں تو اس درازی کو عمق یعنی گہرائی کہتے ہیں جیسا کہ کہتے ہیں کہ دریا اور کنوئیں کی عمق یعنی گہرائی اس قدر ہے۔

آسمان کی بلندی کا بیان

اور اہلِ تفسیر اور محدثین نے یوں روایت کی ہے کہ دنیا کے آسمان کی سطح زمین سے بلندی پانچ سو سال کی راہ ہے اور اسی طرح سات آسمانوں میں سے ہر دو آسمانوں کے درمیان یہی مقدار ہے اور ہر آسمان کا حجم بھی اس قدر ہے اور یہاں سے ساتویں آسمان کی بلندی اور اس کی وسعت کو قیاس کرنا چاہیے اور علم ہیئت والوں کا عالم ابعاد (طول وعرض و عمق) واجرام (ستارے) میں آسمان کے حجم کی مقدار بیان کرنے میں جداگانہ طریقہ کار ہے جس پر انہوں نے علم ہندسہ کے دلائل قائم کیے ہیں اور جب پانچ سو سالہ راہ جو کہ روایات میں وارد ہے، متعین نہیں کہ کس متحرک کی کس حرکت کی راہ مراد ہے۔ نیز اوپر چڑھنے کا سفر ہموار سفر طے کرنے کی نسبت زیادہ دشوار ہوتا ہے اور پہلے سفر کو طے کرنے کا وقت دوسرے کے وقت کے مقابلے میں کئی گنا زیادہ ہو جاتا ہے جیسا کہ ہموار زمین پر چلنے اور پہاڑ پر چڑھنے میں یہ بات مجرب ہے اور علم ہیئت والوں نے دوریوں کا اندازہ فرسنگوں

اور میلوں کے ساتھ کیا ہے اور اس صورت میں احتمال ہے کہ روایاتِ شرعیہ اور براہین ہندسیہ دونوں مطابق ہو جائیں لیکن علم ہیئت والوں کے نزدیک افلاک کی سطحیں آپس میں چپکی ہوئی ہیں اور ان کے درمیان خالی جگہ نہیں ہے جبکہ شرعی روایات کے مطابق خالی جگہ بھی ثابت ہوتی ہے لیکن افلاک کی سطحوں کا ملی ہوئی ہونا علم ہیئت کے نزدیک اس قاعدہ کی بناء پر ہے کہ لافصل فی الفلکیات کہ فلکیات میں کوئی فاصلہ نہیں ہے اور وہ قاعدہ ظنی ہے، قطعی دلیل نہیں رکھتا اور اس کے باوجود اہلِ ہیئت کی نظر میں دو آسمانوں کے درمیان خلا کی ضرورت ثابت نہیں ہوئی اس وجہ سے انہوں نے خلا ثابت نہیں کیا جبکہ شریعت والوں کو ہر دو آسمانوں کے درمیان ملائکہ کی سیر اور گردش معلوم ہے، انہوں نے خلا ثابت کیا۔

پس یہی مجموعی مخالفت باقی رہ گئی وہ جو فلکیات کے فاصلوں کے بیان میں ہندسی دلائل سے ثابت ہوتا ہے کہ انہوں نے خلا کے بغیر دریافت کیا ہے یا وہ جو شرعی روایات کے ساتھ ثابت ہے مگر یہ مخالفت لفظی ہے اس لیے کہ جس مقدار کو اہلِ ہیئت نے آسمان کے جحم میں داخل رکھا ہے شاید اس کے بعد حصے کو اربابِ شرع کی نظر میں خلا سمجھا گیا ہو اور باقی کو جحم پس اس طرح نزاع ختم ہوتا ہے۔

بہرحال آسمان کی جسمانی اور روحانی قوت کا آدمی کی جسمانی اور روحانی قوت سے زیادہ ہونا اظہر من الشمس ہے اور اگر آدمی کو اس بات سے فخر حاصل ہوا کہ میرا مزاج کمال اعتدال میں واقع ہوا کہ نفس ناطقہ مجردہ کے تعلق کے قابل ہوا ہوں تو اس کا جواب یہ ہے کہ آسمان بھی اعتدال و لطافت کے کمال میں واقع ہے۔ چنانچہ فرمایا جارہا ہے

فَسَوّٰاهَا پس اس آسمان کو معتدل المزاج بنایا ہے اور نفوسِ کاملہ کو اس کے اجرام کے ساتھ متعلق فرمایا جو کہ لطیف اور مجرد ہونے میں نفوس انسانیہ سے زیادہ باکمال ہے، اس کے باوجود آسمانوں کو قوی تاثیر بخشی ہے کہ آفتاب اور ستاروں کی شعاعوں کے ظہور کی وجہ سے جہان میں قوی گرمی نمودار کرتے ہیں اور ان شعاعوں کو چھپانے کی وجہ سے جہان میں خوب ٹھنڈک پیدا کرتے ہیں اور یہ تاثیر دن رات کی آمد کے ہر دورے میں محسوس ہوتی ہے۔

وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا اور اس آسمان کی رات کو تاریک کر دیا تاکہ سورج کی گرمی پیدا

کرنے والی شعاعیں جہان والوں پر گرمی نہ کریں اور ٹھنڈک پیدا ہو اور اگرچہ رات زمین کے گاؤدم کی شکل والے سائے کا نام ہے لیکن جب وہ سایہ آفتاب کی شعاع کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے اور ایک اُفق میں آفتاب کا غروب ہونا اس اُفق والوں پر اس مخروط سائے کے طلوع ہونے کا موجب ہوتا ہے اور آفتاب کا طلوع ہونا اس مخروط سائے کے غروب ہونے کا سبب ہوتا ہے اور سورج کی حرکت آسمان کی حرکت کے تابع ہے' ناچار رات کی نسبت آسمان کی طرف کی گئی ہے اور بعض ارباب ہیئت نے آسمان کے تسویہ کو اس کے گیند نما ہونے پر محمول کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ گیند نما شکل آفات قبول کرنے سے زیادہ دُور ہوتی ہے۔ بخلاف دوسری شکلوں کے پس اس وجہ سے بھی آسمان کی خلقت آدمی کی خلقت سے زیادہ مضبوط ہوتی ہے اور بعض نے تسویہ کو آسمان میں درزیں اور شگاف نہ ہونے پر محمول کیا ہے۔ بخلاف آدمی کے کہ اس میں بہت سے مسام اور شگاف ہیں اور اس جہت سے آفات کی زد میں ہے۔ مناسب اور غیر مناسب ہوا آدمی کے جسم میں داخل ہو جاتی ہے' غذائیں' مشروبات' زہریں' خوشبوئیں اور موذی جانور اس کے جسم کے سوراخوں سے اندر داخل ہو سکتے ہیں۔ بخلاف آسمان کے کہ ان آفات سے بالکل محفوظ ہیں۔

وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا اور آسمان کی روشنی نکالی جس سے کہ آفتاب مراد ہے اور چاشت کے وقت کا ذکر اس لیے فرمایا کہ وہ وقت دن کے اجزا میں سے نور اور روشنی میں سب سے زیادہ کامل ہے اور آفتاب کی شعاع میں جہان کو گرم کرنے کے لیے انتہائی محسوس ہونے والی تاثیر ہوتی ہے اور تمام عناصر اس کی شعاع سے گرم ہوتے ہیں۔ خصوصاً زمین جو کہ کثافت اور خشکی کی وجہ سے تادیر اس قبول کی گئی کیفیت کو محفوظ رکھتی ہے اور جب شب وروز میں آسمان کو سردی اور گرمی پہنچی اور آسمان ان کیفیتوں کے قابل نہ تھا' ناچار ان دونوں کو زمین نے قبول کر لیا اور وہ مستعد ہو گئی اور چشموں اور نہروں کو جاری کرنے کا ذریعہ ہوئی۔

وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا اور روز وشب کی تدبیر کے بعد زمین کو ہموار اور درست کیا اس لیے کہ زمین میں حرارت اور ٹھنڈک کے جمع ہونے سے اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا اس زمین سے اس کا پانی نکالا تا کہ زمین میں محبوس مادے جو کہ ٹھنڈک کی وجہ سے پانی کی صورت

قبول کرنے کے لائق ہو چکے تھے' آفتاب کی شعاع کی گرمی پہنچانے کی وجہ سے بھاؤ اختیار کر کے زمین سے باہر آئیں اور جب پانی اور مٹی ایک دوسرے سے مل گئے اور موسم بہار اور موسم گرما کی حرارت نے ان میں اثر کیا پس سبزہ باہر نکل آیا جیسا کہ فرمایا

وَمَرْعٰهَا اور اس زمین کا چراگاہ نکالا گویا اس تدبیر سے پہلے زمین خرابہ پڑی تھی اب اسے ایک باغ کی شکل میں ترتیب دی گئی کہ جہاں پانی بھی جاری ہوا اور قسم قسم کا سبزہ بھی نمودار ہوا اور اس لیے کہ پانی کا مادہ زمین میں محفوظ ہوتا ہے۔ ایک اور تدبیر فرمائی گئی کہ

وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا اور پہاڑوں کی زمین پر بطورِ لنگر رکھا' تاکہ جو بخارات زمین کے اندر رکے ہوئے ہونے کی وجہ سے باہر آیا چاہتے ہیں' پہاڑ کی جسمانی کثافت کی وجہ سے باہر نہ آسکیں' ناچار وہ منعکس ہو کر پانی ہو جاتے ہیں اور ان سوراخوں میں سے جو کہ ان پہاڑوں میں ہوتے ہیں' چشمے اور نہر کی شکل میں جاری ہوتے ہیں۔ نیز وہ پانی جو کہ آسمان کی طرف سے نازل ہوتا ہے' پہاڑ کی سختی کی وجہ سے زمین اسے جذب نہ کرے اور پہاڑ کے قلعوں میں جمع رہے اور آہستہ آہستہ نشیبی علاقوں کی طرف جاری ہو اسی لیے نہریں اور چشمے پہاڑوں سے جاری ہوتے ہیں اور قرآن مجید میں جگہ جگہ چشمے اور نہر کے ذکر کے ساتھ پہاڑ کا بھی ذکر آیا ہے اور یہ ساری تدابیر اس لیے فرمائیں کہ

مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ تاکہ تمہیں اور تمہارے چارپایوں کو فائدہ ہو۔ پس تمہاری بقاء اور روزی سب کی سب آسمان کے ساتھ مربوط ہے اور تمہاری حیات سے وابستہ ہے' تم خود کو خلقت میں اس سے زیادہ کیسے گمان کر سکتے ہو۔

زمین اور آسمان میں سے کس کی پیدائش پہلے ہے؟

یہاں جاننا چاہیے کہ دوسری روایات میں جو کہ سورۃ بقرہ اور سورۃ فصلت میں واقع ہوئی ہیں' زمین کی خلقت کو آسمان کی خلقت سے پہلے بیان فرمایا گیا ہے بلکہ زمین کے اوپر پہاڑوں کا کھڑا کرنا اور زمین میں رزق اُگا کر برکت ڈالنا بھی سورۂ فصلت میں آسمان کی خلقت پر مقدم ہے اور وہ جو صاحب کشاف اور دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ زمین کے جسم کی خلقت آسمان کی خلقت سے پہلے ہے اور زمین کو پھیلانا اور وسیع کرنا آسمان کی خلقت

کے بعد ہے تو یہ درست نہیں ہے اس لیے کہ سورۂ فصلت میں زمین اور اس میں جو کچھ ہے سب کی خلقت کو آسمان کی خلقت سے پہلے رکھا گیا ہے اور سورۂ بقرہ میں بھی خَلَقَ لَكُمْ مَافِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ کے الفاظ زمین کی ساری مخلوقات کے آسمان کو درست کرنے سے پہلے ہونے پر دلالت کرتے ہیں اسی لیے علماء کی ایک جماعت اس طرف گئی ہے کہ آسمان کی خلقت زمین پر مقدم ہے لیکن آسمان کو درست کرنا زمین کے بعد ہے لیکن اس جماعت سے اس سورۃ میں غفلت واقع ہوئی ہے اس لیے کہ یہاں فَسَوّٰهَا وَاَغْطَشَ لَيْلَهَا وَاَخْرَجَ ضُحٰهَا فرمایا گیا ہے اس کے بعد ارشاد ہوا کہ وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا

پس تحقیق یہ ہے کہ زمین کے دحو سے مراد جو کہ آسمان درست کرنے کے بعد ہے مافی الارض کی قضاء وایجاد ہے اور زمین کو باغ کی صورت میں ترتیب دیا گیا جبکہ زمین کے اندر کی چیزوں پہاڑ' سبزیوں اور رزق کی خلقت سے مراد جو کہ سورۂ فصلت اور سورۂ بقرہ میں آسمان کو درست کرنے سے پہلے ہے' ان کی تقدیر اور اندازے کا مرتبہ ہے نہ کہ بالفعل ایجاد ورنہ بالکل ظاہر ہے کہ معدنیات اور نباتات بلکہ فضا کی ساری کائنات کا ہونا آسمانی شعاعوں اور ان شعاعوں کے مختلف اطوار پر موقوف ہے جو کہ آسمان کی حرکت کے ساتھ مربوط ہے۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ان آیات میں ثُمَّ بَعْدَ ذٰلِكَ ترتیب کے لیے نہیں ہے بلکہ نعمتوں کے شمار کی بنیاد پر ہے کہ بے پناہ عنایت کی بناء پر ذکر میں پہلی کی رعایت نہیں کرتے اس شخص کی طرح جو اپنے غلام سے کہے کیا میں نے تجھے یہ یہ چیزیں نہ دیں؟ پھر میں نے تجھے پرورش نہ کیا؟ پھر میں نے تجھے پہلے مالک کے ہاتھ سے نجات نہ دلائی جو کہ تجھ پر ظلم کرتا تھا؟

بلکہ ان میں سے بعض مفسرین نے کہا ہے کہ لفظ بعد یہاں مرتبے میں بعد کے لیے ہے جیسے ثُمَّ كَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا کہ گردن چھڑانے اور دوسری مالی عبادات کے بعد فرمایا گیا ہے اور زمین کا پھیلانا آدمیوں کے حق میں تمام آسمانی نعمتوں سے بالاتر ہے اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ بعد ذالک یہاں مع ذالک کے معنوں میں

ہے جیسا کہ آیۂ عُتُلٍ بَعْدَ ذَالِكَ زَنِيْمٍ میں ہے۔ اور حضرت حسن بصری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ پہلے پہل حق تعالیٰ نے زمین کو بہت چھوٹا سا پیدا فرمایا اور اس میں پہاڑوں کی رگیں پیدا فرمائیں اور ان رگوں میں ایسی برکت دی جس کی وجہ سے وہ پانی کو اپنی طرف کھینچتی ہیں اور چشمے جاری ہوتے ہیں اور روزیوں کا اندازہ مقرر کر کے پھر آسمان کی طرف توجہ فرمائی اور آسمان دھوئیں کی مانند تھا اور اسے سات آسمان بنایا پھر زمین کو پھیلایا اور جس مقدار میں کہ ہے بنایا اور زمین کی خلقت کی ابتدا کعبہ معظمہ میں تھی' وہیں سے فراخ ہوئی اور اسی لیے اس معزز مقام کے لیے دوسری جگہ ارشاد فرمایا ہے کہ اِنَّ اَوَّلَ بَيْتٍ وُّضِعَ لِلنَّاسِ اور شہر مکہ کو اسی وجہ سے ام القری کہتے ہیں۔ واللہ تعالیٰ اعلم

نیز جاننا چاہیے کہ ان نعمتوں کے شمار میں بعض مقامات پر حرف عطف لایا گیا ہے اور بعض مقامات پر حذف کیا گیا ہے اور اس کے نکتے کو دریافت کرنے کا قاعدہ یہ ہے کہ جہاں گزشتہ نعمت اجمالی طور پر بیان کی گئی ہے اور اس کی تفصیل بیان کرنا مقصود ہے تو وہاں سے حرف عطف کو حذف کر دیا گیا ہے اس لیے کہ مجمل اور مفصل دونوں باہم متحد ہیں' ان کے درمیان حرف عطف کی گنجائش ممکن نہیں ہے جیسے وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذَالِكَ دَحَاهَا اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَ هَا وَمَرْعَاهَا اور جیسے رَفَعَ سَمْكَهَا فَسَوّٰهَا اور جہاں گزشتہ نعمت کے بیان سے فارغ ہو کر دوسری نعمت کا بیان مقصود ہو' حرف عطف لایا گیا ہے جیسا کہ باقی آیات میں مذکور ہے۔

اور جب کفار کے ان شبہات کو دُور کرنے سے فراغت ہوئی جو کہ وہ اخروی زندگی کے بارے میں بیان کرتے تھے اور جو بات کہ نیکوں اور بُروں کے حالات کی وضاحت اور دونوں گروہوں کے امتیاز کے متعلق مقصود تھی' اس کا بیان بجائے خود ادھورا رہ گیا تھا پھر اس مقصد کو پورا کرنے کی طرف رجوع فرمایا جا رہا ہے کہ اس روز کئی دل جو کہ دوبارہ زندگی اور نفخۂ صور سننے کی وجہ سے بے چین اور بے قرار ہو جائیں گے' ان کی بے چینی کا نتیجہ بھی ظاہر ہوگا اور جس مصیبت سے وہ ڈرتے تھے' واقع ہونے کی صورت اختیار کرے گی۔

فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى تو رادفہ کے آنے کی وجہ سے لوگ بے قرار اور بے

چین ہو جائیں گے اور ہر کسی پر اپنے حال کا اندیشہ غالب ہوگا کہ آیا ہمارے ساتھ آج کے دن یہاں اور اس زندگی میں کس طرح پیش آئیں گے اور کیا سلوک کیا جائے گا تو جب دوسرا حادثہ آئے جو کہ ہر حادثے سے بڑا اور غالب ہے اور وہ جزا دینے' اعمال ناموں' گواہوں' ارواح اور فرشتوں کے حاضر ہونے' اس موقف کے قریب دوزخ کو لانے اور مجرموں کی پوچھ گچھ اور ڈانٹ ڈپٹ کے لیے قہر الٰہی کی تجلی سے کنایہ ہے۔

اور لفظ طامہ طم سے لیا گیا ہے جس کا معنی غلبہ اور بلندی ہے۔ مثال بیان کرتے ہوئے کہا جاتا ہے کہ جری الوادی فطم علی القری یعنی جب ندی جاری ہوتی ہے پس چھوٹے پانی پر غالب آ جاتی ہے اور کبریٰ اس حادثے کے غلبہ اور بلندی کی تاکید در تاکید ہے اور اس شرط کی جزا جو کہ حرف اذا کا مدول ہے فَاَمَّا مَنْ طَغٰی کے الفاظ اپنے معطوف سمیت ہیں اور چونکہ اصل میں یہ حادثہ نوع انسان کو جزا دینے کے لیے واقع ہوگا اور آسمانوں کو پھاڑنا' زمین کا ہلنا اور دوسرے حادثے تو صرف اس کی تمہید و آغاز کے طور پر ہیں' ناچار اس حادثہ کا وقوع نہیں ہوگا مگر

یَوْمَ یَتَذَکَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰی اس دن کہ آدمی وہ سب کچھ یاد کرے گا جو اس نے دنیا میں کوشش اور تلاش کے ساتھ کیا ہوگا۔ گویا اس نے وہ کام کر کے بھلا دیا تھا جس کی جزا نہ دیکھی اور اس کا پھل نہ چکھا اب جبکہ اس کی جزا کا مشاہدہ کرے گا تو ان تمام کاموں کو یاد کرے گا۔ نیز اپنے اعمال کو اعمال ناموں میں جمع کیا ہوا اور لکھا ہوا دیکھے گا اور جو کچھ اس کی توجہ سے نکل گیا تھا پھر اس کے احساس میں موجود ہوگا اور اس کے احساس و خیال میں فلکی قوتوں کے سرایت کرنے کی وجہ سے ان اعمال کو شکلوں میں دیکھے گا اور آسمان کے زائل اور زمین کے برابر ہونے کی وجہ سے اوپر نیچے کے عالم مثال کو دیکھے گا۔

وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ اور جہنم آشکارا اور ظاہر کر دی جائے گی۔ لِمَنْ یَّرٰی ہر دیکھنے کے لیے یعنی جہنم کو دیکھنے میں اس وقت سب لوگ برابر ہوں گے اور جیسا کہ دنیا میں انبیاء' اولیاء اور عارفین دوزخ کو دیکھتے ہیں اور عوام نہیں دیکھتے اس جہان میں یہ فرق نہیں ہوگا۔ پس لمن یریٰ کے الفاظ زیادہ لانا ظہور کے عام ہونے کو بیان کرنے کے لیے ہے جس طرح

کہ کہا جاتا ہے قد بین الصبح لذی عینین یعنی صبح ہر اس شخص کے لیے آشکارا ہوگئی جو دو آنکھیں رکھتا ہے۔

اور اگرچہ یہ حادثہ تمام اہلِ محشر کو بے حواس کر دے گا اور قہر الٰہی کے آثار دیکھنے کی وجہ سے جو کہ دوزخ کی صورت میں ظاہر ہوگا' سب شریک ہوں گے لیکن اس غضب کا اثر ہر کسی کو نہیں ہوگا بلکہ اس وقت لوگوں کے دو گروہ ہو جائیں گے۔

فَاَمَّا مَنْ طَغٰى تو جس نے دنیا میں سرکشی کی تھی اور خدا تعالیٰ کی مقرر کردہ حد کو توڑا تھا اور اس سرکشی اور حد سے گزرنے کی زیادہ تر وجہ دنیا کی محبت ہے اور اسی لیے حدیث شریف میں وارد ہوا حب الدنیا راس کل خطیئه اور یہ سرکش دنیا کی محبت کے مرتبے سے بھی آگے نکل گیا تھا۔

وَاٰثَرَ الْحَیٰوةَ الدُّنْیَا اور اس نے دنیوی زندگی اور اس کی لذت کو رضائے خداوندی اور ثواب پر ترجیح دے رکھی تھی۔

فَاِنَّ الْجَحِیْمَ هِیَ الْمَاْوٰى پس جہنم وہی اس کے لائق جگہ ہے اس لیے کہ وہ قہر الٰہی کا مظہر ہے اور اس کے دربار سے دُوری اور بے تعلق ہونے کی شکل ہے اور اس شخص نے چونکہ غیر خدا کو جو کہ دنیا تھی' خدا تعالیٰ پر ترجیح دی۔ خدا تعالیٰ کے دربار سے بہت دُور ہو گیا اور اس کا جہنم کو دیکھنا ایسا ہے جیسے چور کا جلاد یا پھانسی کو دیکھنا۔

وَاَمَّا مَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ اور دنیا میں جس نے خدا تعالیٰ کے دربار میں کھڑے ہونے سے خوف محسوس کیا اور جان لیا کہ مجھے اس کے دربار میں کھڑے ہونا ہے' اس کی مقرر کردہ حدوں سے آگے نہیں گزرنا چاہیے اور سرکشی اختیار نہیں کرنا چاہیے ورنہ وہاں روسیاہی نصیب ہوگی اور دنیوی زندگی کو جو کہ ایک سفر سے زیادہ نہیں ہے' اللہ تعالیٰ کی پسندیدہ اداؤں اور آخرت کے ثواب پر ترجیح نہیں دینا چاہیے کہ آخر واسطہ اسی سے پڑے گا۔

وَنَهَى النَّفْسَ عَنِ الْهَوٰى اور اپنے نفس کو ناجائز خواہشات سے باز رکھا کہ دنیا کو ترجیح دینے کا زیادہ تر باعث یہی خواہشات ہوتی ہیں۔

فَاِنَّ الْجَنَّةَ هِیَ الْمَاْوٰى تو بے شک جنت ہی اس کے لائق مقام ہے۔

اور شیخ ابوبکر وراق رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دنیا و آخرت میں ناجائز خواہش سے زیادہ نقصان دہ کوئی چیز پیدا نہیں فرمائی اور اسی لیے اہلِ طریقت کے نزدیک آدمی اس وقت بالغ ہوتا ہے جب نفس کی خواہش سے چھٹکارا پائے جیسا کہ عرف عام میں اس وقت بالغ ہوتا ہے جب کھیل کود سے خلاصی پائے۔ بیت

اللہ تعالیٰ کے متوالے کے بغیر لوگ بچے ہیں

خواہش سے خلاصی پانے والے کے بغیر کوئی بالغ نہیں ہے۔

پس اس کا جہنم کو دیکھنا ایسے ہے جیسے تماشائی جلاد اور پھانسی کو دیکھتے ہیں کہ فرحت و مسرت کا باعث ہوگا۔

دو بھائیوں مصعب اور عامر کا واقعہ

اور اگرچہ یہاں قیامت میں آدمیوں کے دو گروہوں کا حال بیان کرنا مقصود ہے کہ ان میں سے ہر ایک کا انجام علیحدہ اور جدا ہے لیکن مفسرین نے کہا ہے کہ ان دونوں اوصاف میں قریش کے دو حقیقی بھائیوں کے حال کی طرف اشارہ کیا گیا ہے کہ دونوں نے اپنے باپ کی طرف سے بہت سا مال پایا تھا اور ان کی ماں ان سے بہت محبت کرتی تھی اور انہیں اچھا کھلانے اور اچھا پہنانے میں بہت کوشش کرتی تھی' ان میں ایک جس کا نام مصعب بن عمیر تھا' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت میں حاضر ہوتا تھا اور خوفِ خدا کی وجہ سے دنیوی لذتوں سے پرہیز کرتا تھا اور راتوں کو تہجد میں بیدار رہتا اور دن کو روزہ رکھتا اور مرغن کھانا نہ کھاتا تاکہ شہوت غلبہ نہ کرے۔ آخرکار حضرت مصعب رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان پر سب مال' اسباب' دولت و ثروت چھوڑ کر اپنے گھربار سے جدائی اختیار کر کے غربت و تکلیف کے ساتھ مدینہ منورہ کو ہجرت کی اور مدینہ عالیہ کے لوگوں کو تعلیم قرآن دینے میں مصروف ہوگئے اور جنگِ احد کے دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا جھنڈا تھامے پوری ثابت قدمی اور پامردی کے ساتھ دنیا سے رخصت ہوئے اور شہادت پائی یہاں تک کہ ان کے کفن کے لیے ایک لنگی کے سوا کچھ میسر نہ آیا اور وہ بھی ان کے قد سے چھوٹی تھی اگر آپ کا سر ڈھانپتے تھے تو سر کھل جاتا اور اگر سر کو چھپاتے تو پاؤں ننگے ہو جاتے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم

نے فرمایا کہ اس کپڑے کے ساتھ ان کا سر ڈھانپ دو اور پاؤں پر خوشبودار اذخر نامی بوٹی ڈال دو اسی طرح کیا گیا۔

دوسرا جس کا نام عامر بن عمیر تھا' عیش پرستی کرتا تھا' وہ تمام حرام چیزوں کا ارتکاب کرتا تھا اور ترکِ دنیا کے متعلق اپنے بھائی کے ساتھ ہمیشہ جھگڑا کرتا تھا اور محبت دنیا کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دربار میں بھی نہیں جاتا تھا اور ایمان اور ایمان کے احکام کو بھی نہیں مانتا تھا یہاں تک کہ غزوۂ بدر کے دن کافروں کے ہمراہ مارا گیا اور جہنم کا ایندھن بنا' اللہ تعالیٰ ہمیں بُرے خاتمے سے بچائے۔ آمین!

اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کافروں کے سامنے قیامت کے حالات بیان فرمائے اور فرمایا کہ جہنم نافرمانوں' سرکشوں اور دنیا طلب کرنے والوں کا ٹھکانہ ہے اور جنت خوفِ خدا رکھنے والوں اور پرہیزگاروں کا مقام' کفار نے پوچھنا شروع کر دیا کہ یہ سب کچھ قیامت کے بعد ہوگا۔ آپ ہمیں بتائیں کہ قیامت کب ہوگی؟ اس کے آنے کا وقت کون سا ہے؟ اللہ تعالیٰ نے انہیں اس بے مقصد سوال پر ڈانٹ پلائی اور ارشاد فرمایا کہ

يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ السَّاعَةِ آپ سے قیامت آنے کے وقت کے متعلق سوال کرتے ہیں کہ

اَيَّانَ مُرْسٰهَا اس کے برپا کرنے کا وقت کب ہوگا اور کب متحقق ہوگی حالانکہ ان کا یہ سوال بالکل بے جا ہے اس لیے کہ آپ کا کام آنے والے حوادث کے اوقات بیان کرنا نہیں تاکہ وہ آپ سے اس قسم کے سوالات کریں۔ یہ کام نجومیوں' رمالوں' جفریوں' فال دیکھنے والوں اور کاہنوں کا ہے' آپ کا کام تو احکامِ الٰہی کی تبلیغ اور وقت مقرر کیے بغیر اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ڈرانا ہے۔

فِيْمَ اَنْتَ مِنْ ذِكْرٰىهَا آپ کو اس کا وقت بیان کرنے سے کیا کام؟ اس لیے کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کبھی مستقبل کے واقعات کے اوقات بیان کرتے ہیں' وہ صرف اس لیے بیان کرتے ہیں کہ جب وہ واقعات ان اوقات کے مطابق واقع ہوں تو لوگوں کو ان کی نبوت اور ولایت کا اعتقاد نصیب ہو جائے اور وہ ان سے راہِ خدا سیکھیں اور ہدایت

پائیں۔ جیسا کہ ظاہر کے طبیب حضرات کہ بعض اوقات تشخیص کے مقدمے کے طور پر مستقبل میں مریض کے مزاج کی تبدیلی کا پتہ دیتے ہیں اس لیے پتہ دیتے ہیں کہ واقع ہونے والی چیز کے وقوع کے بعد ان کی طب کے بارے لوگوں کا عقیدہ پختہ ہو جائے اور لوگ ان کے علاج سے فائدہ حاصل کریں ورنہ مستقبل کے واقعات کے اوقات کو بیان کرنا نبوت اور ولایت کی شرطوں میں سے نہیں ہے جیسا کہ معرفت احوال مریض کو پیشگی بیان کرنا طب کا کام کرنے کی شرائط میں سے نہیں۔

اور قیامت کے وقت کو بیان کرنے کا فائدہ بھی نہیں ہے اس لیے کہ قیامت واقع ہونے کے بعد اگر کسی کو انبیاء علیہم السلام کی نبوت کا اعتقاد حاصل ہو جائے تو کیا فائدہ؟ کہ ایمان لانے کا وقت تو ضائع ہو گیا اور قیامت واقع ہونے سے پہلے اس بیان کردہ وقت کی مطابقت کو معلوم نہیں کیا جا سکتا۔ پس قیامت کے وقت کا ذکر نبوت کی ذمہ داری سے بالکل مناسبت نہیں رکھتا۔

اور اس کے باوجود یہ علم خصوصیت کے ساتھ ایسا نہیں کہ انسانی حس اس کا احاطہ کر سکے اس لیے کہ تمام حوادث جو کہ دنیا میں واقع ہوتے ہیں' ان کے اسباب بھی دنیا میں موجود ہیں۔ پس کسی وقت ان حوادث کے اسباب کے جمع ہونے اور ان حوادث کی رکاوٹیں دُور ہونے سے دلیل لے کر ان کے اوقات کو معین کیا جا سکتا ہے۔ بخلاف اس عام حادثے کے جو کہ اس جہان کے تمام ارکان پر اثر ڈالے گا اور مسببات کی طرح اسباب درہم برہم ہو جائیں گے۔ پس اس کا ایک ایسا سبب ہے جو کہ اس جہان کے اسباب سے جداگانہ ہے۔ انسان کی سوچ کی حد وہاں تک نہیں اسی لیے اس جہان کے متعلق جس سے بھی سوال کیا جاتا ہے' اسے بالواسطہ یا بلاواسطہ علم الٰہی کے حوالے کر دیتا ہے اسی لیے فرمایا گیا

اِلٰی رَبِّكَ مُنْتَهٰهَا آپ کے پروردگار کی طرف قیامت کی انتہا ہے کہ اس کا سبب بھی اللہ تعالیٰ کا ارادۂ قہری ہے جو کہ نافرمان بنی آدم سے بدلہ لینے کے لیے متوجہ ہوگا اور اس ارادے کے وقت اور بنی آدم کی بُرائیوں کے جمع ہونے کی حد جو کہ اس کی حکمت میں انتقام کا موجب ہوں' کو جاننا بھی اسی کا خاصہ ہے' کسی اور کا نہیں کہ اس علم کو جان سکیں مگر اس

وقت جب کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے یہ علم عنایت ہوا اور وہ واقع نہیں ہے۔ (حضرت مفسر علام نے یہ بعض کا قول ذکر فرمایا ہے جبکہ اکابر اہلِ سنت اس طرف گئے ہیں کہ حضور علیہ السلام کو قیامت کے وقت کا علم عطا فرمایا گیا۔ دیکھئے تفسیر صاوی یہی آیت۔ اور اس کی بہترین تحقیق کے لیے دیکھیں الدولۃ المکیہ از شیخ العرب مرشد العجم اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمۃ اللہ علیہ اور جاء الحق حصہ اوّل از حکیم الامت مولانا مفتی احمد یار خاں صاحب گجراتی رحمۃ اللہ علیہ)

اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشَاهَا آپ تو قیامت سے ڈرنے والے کو ڈرانے والے ہیں۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اور یہاں ایک شبہ ذکر کرتے ہیں کہ ڈرنے والے کو ڈرانے کا کیا معنی؟ اس کا جواب یہ ہے کہ علم اجمالی کی وجہ سے جو کہ ہر ذی عقل کو جزا دینے کے متعلق حاصل ہے' وہ جانتا ہے کہ دنیا میں جزا دینا واقع نہیں ہوتا تو اس کے لیے کوئی اور جہان چاہیے۔ پس قیامت سے خوف پیدا ہو جاتا ہے جبکہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کا ڈرانا اس جہان میں جزا دینے اور وہاں نقصان اور نفع دینے والی چیزوں کا تفصیلی بیان ہے تو جو جزا دینے کا اجمالی علم نہیں رکھتا' اسے انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے ڈرانے سے کوئی فائدہ نہیں۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مَنْ يَّخْشٰى سے مراد وہ شخص ہے جس میں خوف آخرت کی استعداد کی قوت موجود ہے نہ یہ کہ وہ بالفعل ڈرتا ہے اور جب انبیاء علیہم السلام کے ڈرانے سے خوف کی استعداد رکھنے والوں کے سوا کوئی فائدہ حاصل نہیں کرتا تو گویا انبیاء علیہم السلام کے لیے دوسروں کو ڈرانے کا منصب ہے ہی نہیں۔ بہرحال ڈرنے والے کو اور ڈرانے والے کو اس چیز کے وقت کے متعلق سوال کرنا جس سے ڈرنا چاہیے یا اس چیز کا وقت بیان کرنا بالکل درکار نہیں۔ جیسا کہ کسی مسافر کو ڈاکوؤں کا خطرہ ہوتا ہے یا کوئی دوسرا اسے ڈاکوؤں سے ڈرائے اور وہ پوچھے کہ وہ مجھ پر کب حملہ کریں گے جب تک تو وہ وقت بیان نہ کرے' میں یقین نہیں کروں گا۔

اور ظاہر ہے کہ اگر قیامت کے وقت کے متعلق کافروں کا سوال اس بناء پر تھا کہ وقت بیان کر دیں گے تو ہم ایمان لے آئیں گے تو صریحاً بے جا ہے اس لیے کہ وقت کا بیان اس صورت میں ایمان کا موجب ہوتا ہے کہ وہ واقعہ ایسی وقت کے مطابق رونما ہو اور اس سے پہلے وقت کو بیان کرنا اور نہ کرنا برابر ہے اور قیامت کے وقوع کے بعد ایمان لانے کا کوئی اعتبار نہیں ہے۔

اور اگر اس بناء پر ہے کہ اس کے دُور اور قریب ہونے کو معلوم کریں اور دُور ہونے کی صورت میں مطمئن رہیں اور قریب ہونے کی صورت میں اس کی فکر کریں تو یہ بھی بے فائدہ ہے اس لیے کہ قیامت کے وقت انہیں یہ طویل گزری ہوئی مدت بہت تھوڑی معلوم ہوگی۔

كَاَنَّهُمْ يَوْمَ يَرَوْنَهَا گویا کہ وہ جس دن قیامت کے آثار دیکھیں گے تو جان لیں گے کہ دنیا میں ان کے ٹھہرنے کی مدت بہت کم تھی اور پورا ایک دن بھی نہیں ہوا تھا بلکہ یوں گمان کریں گے کہ وہ

لَمْ يَلْبَثُوْا دنیا اور برزخ میں نہیں ٹھہرے ہیں۔ اِلَّا عَشِيَّةً مگر پچھلے پہر کی مقدار جو کہ سورج کے ڈھلنے سے لے کر اس کے غروب تک ہوتا ہے۔

اَوْ ضُحٰهَا یا اس کی چاشت کے وقت تک جو کہ طلوع آفتاب سے لے کر زوال کے قریب تک ہوتا ہے اور پچھلے پہر اور چاشت کے وقت میں انہیں تردد اس وجہ سے ہوگا کہ ان کی عمر مشقت اور تکلیف میں گزری تھی اور برزخ میں بھی عذاب میں رہے اس لیے اپنے باقی رہنے کی مدت کو پچھلے پہر کی مقدار تک سمجھیں گے کہ وہ وقت تھکاوٹ اور شکستگی کا وقت ہے اور اگر ان کی عمر راحت میں گزری تھی اور برزخ میں بھی انہیں اتنا عذاب نہ ہوا تو اپنے باقی رہنے کا اندازہ چاشت تک سمجھیں گے۔

اور بعض علماء نے کہا ہے کہ دن اور رات کی گردش اکثر لوگوں جیسے ہنود اور یونانیوں وغیرہم کے نزدیک دوپہر سے ہے اور شریعت میں فجر کی ابتدا سے ہے اور جب اہلِ محشر کو منظور ہوگا کہ اپنے باقی رہنے کی مدت کو آدھے دن سے کم بیان کریں تو کہیں گے کہ اگر دن کی ابتدا دوپہر سے ہے تو ہم نہیں ٹھہرے مگر پچھلے پہر کی مقدار اور اگر اس کی ابتدا فجر کے

شروع سے ہے تو ہم نہیں ٹھہرے مگر ایک چاشت کے وقت تک اور پچھلے پہر کو چاشت سے پہلے ذکر کرنے کا راز یہی ہے لیکن چاشت کو پچھلے پہر کی طرف منسوب کرنا اس لیے ہے کہ پتہ چلے کہ دنیا کی مجموعی مدت ان کے گمان میں ایک دن کے مثل ہوگی جیسا کہ دوسرے مقام پر ان کی زبان میں ارشاد فرمایا ہے کہ اِنْ لَّبِثْتُمْ اِلَّا یَوْمًا اور وہ دنیا میں اپنی نوع کے باقی رہنے کا زمانہ اسی دن کی ایک ساعت کی طرح سمجھیں گے نہ یہ کہ پچھلا پہر ایک دن کا ہو اور چاشت دوسرے دن کی اور اگر عشیۃ وضحیٰ فرمایا جاتا اور ضحیٰ کی اضافت عشیہ کی طرف نہ کی جاتی تو ایک دن کا متحد ہونا سمجھ نہیں آتا۔ احتمال ہے کہ آیت کے معنی یوں ہو اِلَّا عَشِيَّةً اَوْ ضُحٰهَا اَيْضًا مع العشية حاصل معنی یہ ہے کہ وہ دنیا میں اپنے ٹھہرنے کی مدت میں تردد کریں گے کہ کیا آدھا دن تھا یا پورا دن جیسا کہ ان کی زبان سے دوسرے مقام پر نقل فرمایا گیا ہے کہ لَبِثْنَا يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ فَاسْئَلِ الْعَادِّيْنَ واللہ تعالیٰ اعلم

سورۂ عبس

مکی ہے' اس کی بیالیس (۴۲) آیات ہیں' ایک سوتیس (۱۳۰) کلمات اور پانسو پینتیس (۵۳۵) حروف ہیں۔

سورۂ النازعات کے ساتھ رابطے کی وجہ

اور اس سورۃ کا سورۂ النازعات کے ساتھ مربوط ہونا چند وجوہ سے ظاہر ہوتا ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ سورۂ والنازعات کے آخر میں اِنَّمَآ اَنْتَ مُنْذِرُ مَنْ يَّخْشٰهَا فرمایا گیا ہے جبکہ اس سورۃ میں اس منصب کے تقاضے میں بے توجہی پر عتاب وخطاب ہے کہ وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى دوسری وجہ یہ ہے کہ اس سورۃ کا واقعہ اس سورۃ کے واقعہ کے ساتھ تقابل رکھتا ہے وہاں عظیم المرتبت رسول حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ایک صاحبِ اقتدار بادشاہ کے پاس بھیجا گیا اور اس کی چاپلوسی کی گئی کہ فَقُلْ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى جبکہ یہاں ایک نابینا گدا کو خاتم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے حضور لایا گیا اور اس کی دلجوئی کا حکم دیا گیا اور اغنیاء اور دولت مندوں کی طرف متوجہ ہونے سے منع فرمایا گیا۔

وہاں حضرت موسیٰ علیہ السلام آرزو کے طریقے سے فرماتے تھے کہ هَلْ لَّكَ اِلٰٓى اَنْ تَزَكّٰى جبکہ یہاں اللہ تعالیٰ امید عطا فرماتا ہے کہ لعلہ یزکی اس بادشاہ کو سرکشی کی وصف کے ساتھ ذکر کیا جبکہ اس گدا کو خوف وخشیت کے ساتھ موصوف فرمایا۔ وہ ظالم بادشاہ اپنے مقام پر بیٹھا رہا اور رسول علیہ السلام کو وہاں جانے کا حکم ہوا کہ اِذْهَبْ اِلٰى فِرْعَوْنَ جبکہ یہاں وہ گدا خود دوڑا آتا ہے کہ فَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى تاکہ معلوم ہو کہ انبیاء علیہم السلام کا کاروبار سب کا سب حکم وقضائے خداوندی کے تحت جاری ہونے پر مبنی ہے جو حکم ہوتا ہے عمل کرتے ہیں اگر اغنیاء اور سرکشوں کے پاس جانے اور ان کی چاپلوسی کرنے کا حکم ملتا ہے تو بسر وچشم قبول کرتے ہیں اور اگر گداؤں اور عاجزوں کی تعظیم وتوقیر کا حکم ملے تو خوش دِلی سے تعمیل کرتے ہیں۔ یہ گداؤں کے اطاعت کرنے اور تعمیل حکم کرنے سے خوش ہوتے ہیں نہ ظالموں کے تکبر اور سرکشی کی وجہ سے دل تنگ ہوتے ہیں۔ فرعون کی حالت دیکھیں کہ اسے کس صفت سے موصوف کیا گیا کہ ثُمَّ اَدْبَرَ يَسْعٰى یعنی پشت دے کر راہِ حق سے بھاگتا تھا اور اس نابینا گدا کو دیکھیں کہ کیسے آ رہا ہے کہ جَآءَكَ يَسْعٰى یعنی حق کی طرف منہ کیے دوڑا آ رہا ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ان دونوں سورتوں میں قیامت کی ہولناکیاں اور سختیاں ایک ہی انداز میں مذکور ہوئیں وہاں فَاِذَا جَآءَتِ الطَّآمَّةُ الْكُبْرٰى يَوْمَ يَتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ مَا سَعٰى الخ فرمایا گیا ہے جبکہ یہاں وَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ الخ فرمایا گیا ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ معاش کی اصلاح، آدمی کی خلقت اور اس کے اصول میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی گنتی بھی ان دونوں سورتوں میں قریبی مناسبت رکھتی ہے اس سورۃ میں اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ مذکور ہے جبکہ یہاں نطفہ ہونے کے وقت سے لے کر مرتے دم تک انسان کی خلقت کو بیان فرمایا گیا۔

ایک مقدمہ کی تمہید اور محبوبانِ خدا اور عام لوگوں کے درمیان فرق

اس سے پہلے کہ اس سورۃ کا سبب نزول ذکر کیا جائے، ایک مقدمے کی تمہید ضروری

ہے۔ پہلے تو یہ جاننا چاہیے کہ محبوبانِ خدا کہ جنہیں ارشاد ہدایت کے کام کے لیے چنا گیا ہے اور عام لوگوں کے درمیان اوصاف بشریت اور صفات نفس میں بظاہر فرق نہیں ہوتا بلکہ فرق اس جہت سے ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے محبوبوں کی تربیت خود فرماتا ہے اور جہاں بھی جبلت نوعی کے تقاضے کی وجہ سے نفس کی صفات میں سے کوئی صفت ظاہر ہوتی ہے اور کوئی حرکت سرزد ہوتی ہے جو کہ نورحق کے لیے حجاب کا موجب ہو تو جلد تادیب وعتاب کے ساتھ آگاہ کر دیا جاتا ہے اور اس کا تدارک کر دیا جاتا ہے جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس معنی کی طرف اشارہ فرمایا ہے کہ ادبني ربي فاحسن تاديبي و علمني ربي فاحسن تعليمي تا کہ پہلے تو انہیں اخلاقِ الٰہیہ سے تخلق حاصل ہو جو کہ واصل ہونے اور نفس کے فنا ہونے کے مرتبے کو لازم ہے۔ اس کے بعد ان اخلاق کے ساتھ تحقق میسر ہو جو کہ مرتبہ بقاء کے تابع ہے اور اسے استقامت اور تمکین کی حالت کہتے ہیں۔ پس اس قسم کے اعمال کا حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے صادر ہونا آپ کے منصب اور مرتبے کے منافی نہیں بلکہ ان اعمال پر اللہ تعالیٰ کی تادیب وعتاب اس عظیم منصب اور مرتبے کی عین دلیل ہے۔

جب یہ مقدمہ بیان ہو گیا تو جاننا چاہیے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم مسجد حرام میں تشریف فرما تھے' آپ کے نزدیک قریش کے سردار اور رئیس جیسے شیبہ کے بیٹے عتبہ اور ربعہ' ابوجہل بن ہشام' حضرت عباس بن عبدالمطلب اور دوسرے عمائدین بیٹھے تھے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم انہیں دینِ اسلام کی خوبیاں اور بت پرستی کی بُرائیاں سمجھا رہے تھے اور پوری توجہ اور اہتمام کے ساتھ ان سے خطاب اور ہم کلامی میں مصروف تھے اسی اثناء میں ایک نابینا جو کہ عبداللہ بن شریح بن مالک بن ربیعہ زہری تھے اور انہیں ابن اُم مکتوم بھی کہتے تھے' اس بناء پر کہ مکتوم نابینے کو کہتے ہیں' ان کی ماں کو اُم مکتوم کا لقب دیا گیا تھا' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ ان کے ایسے وقت میں آنے سے ناخوش ہوئے اور معلوم کیا کہ یہ شخص نابینا ہے' محفل کا رنگ معلوم نہیں کرے گا' بے وقت اور بے موقع باتیں کرے گا اور یوں قطع کلامی ہوگی اور ہماری گفتگو جو کہ ان سرداروں کے ساتھ ہو رہی ہے اور انہیں اسلام کی دعوت دی جا رہی ہے' ناتمام رہ جائے گی۔ یہاں تک کہ وہ نابینا محفل

کے پس و پیش کو دیکھے بغیر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے قریب آ کر بیٹھ گئے اور عرض کی کہ مجھے قرآن پاک کی فلاں فلاں سورۃ سکھا دیجیئے اور میرے حال پر توجہ فرمائیں کہ میں کسی ہاتھ پکڑنے والے کے بغیر پوچھ پوچھ کر آپ کی محفل تک پہنچا ہوں۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ان سرداروں کی وجہ سے قدرے سکوت فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ ٹھہرو! وہ نابینا صحابی ایک دو گھڑی رُک کر اپنے مقصد کی پھر تکرار کرنے لگے اور وہ جلدی کر رہے تھے' ان کی ان ناموافق حرکات کی وجہ سے جو کہ ان سرداروں کے نفرت کرنے اور تنگ دل ہونے کا موجب تھیں' چہرۂ مبارک پر کراہت کے آثار ظاہر ہوئے۔ آپ اس کی طرف سے توجہ پھیر کر ان سرداروں کی طرف متوجہ ہوئے' اسی دوران یہ سورۃ نازل ہوئی اور اس معاملہ پر عتاب نازل ہوا۔ مروی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم جبرئیل علیہ السلام کی زبان سے یہ آیات سُن رہے تھے' چہرۂ مبارک کا رنگ متغیر ہو رہا تھا اور کافی خوف محسوس فرما رہے تھے۔ یہاں تک کہ کلا انہا تذکرہ کے الفاظ جبرئیل علیہ السلام کی زبان سے سنے' خوش ہوئے اور چہرۂ مبارک کا رنگ بحال ہو گیا۔ معلوم ہوا کہ نصیحت کی بناء پر یہ سب کچھ ایک عتاب سے زیادہ نہیں اور یہ لطف و مہربانی کے آثار سے ہے نہ کہ قہر اور ناراضگی سے اس کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ان نابینا صحابی رضی اللہ عنہ کے گھر جو کہ مایوس ہو کر جا چکے تھے' تشریف لے گئے اور معذرت فرمائی اور انہیں پھر اپنے دولت خانہ پر لائے اور ان کے لیے چادر مبارک بچھائی اور انہیں اس پر بٹھایا اور جب بھی وہ آپ کی محفل میں حاضر ہوتے' آپ ان کی تعظیم اور قدر افزائی فرماتے اور ارشاد فرماتے مرحبا بمن عاتبني فيه ربي میں اسے خوش آمدید کہتا ہوں جس کے بارے میں رب کریم نے مجھے عتاب فرمایا اور جہاں بھی اس نابینا صحابی کو دیکھتے' فرماتے کہ اگر تمہیں کوئی ضرورت یا کام ہو تو کہو اور دو سفروں کے موقع پر آپ اسے اپنی جگہ مدینہ عالیہ میں امام نماز کے طور پر چھوڑ کر تشریف لے گئے۔

اور حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے اس نابینا صحابی رضی اللہ عنہ کے بارے میں ایک عجیب خبر روایت کی ہے کہ جنگ قادسیہ کے دن میں نے انہیں دیکھا کہ زرہ پہنے' عربی گھوڑے پر سوار ہیں' ان کے آگے سیاہ جھنڈا' اپنی اسی نابینائی کے باوجود کافروں کی

صف پر حملہ کر رہے تھے۔ نیز مروی ہے کہ اس واقعہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کسی فقیر کو دیکھ کر منقبض نہ ہوتے اور نہ ہی کسی دولت مند کی دل جوئی فرماتے۔

مفسرین کا اشکال

یہاں اس عتاب کی وجہ میں مفسرین کو سخت اشکال ہے اس لیے کہ اس معاملے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے کوئی ایسا کام نہیں کیا جو کہ قواعد شرعیہ کے خلاف ہو۔ آپ پر اس قدر عتاب کیوں فرمایا گیا اس لیے کہ قاعدہ شرعی یہ ہے کہ عام نفع' خاص نفع سے پہلے ہے تو حضور علیہ السلام نے سرداروں اور رئیسوں کو اسلام کی طرف دعوت دینے کو اس نابینے صحابی کی تعلیم قرآن پر اس وجہ سے مقدم فرمایا کہ ان لوگوں کے اسلام قبول کرنے میں پورے شہر مکہ کے مسلمان ہونے کی توقع تھی کیونکہ الناس علی دین ملوکھم جبکہ ایک نابینے کو قرآن پاک کی چند سورتوں کی تعلیم دینے سے خاص اسی نابینے کو فائدہ ہوتا اور بس۔ نیز اسلام کی دعوت تعلیم قرآن سے مقدم اور زیادہ اہم ہے اس لیے کہ وہ اصل ہے اور یہ فرع اور فقہاء کے نزدیک طے شدہ بات ہے کہ اگر ایک شخص ایک موقع پر آئے اور کہے کہ مجھے اسلام کی تلقین کیجیے اور دوسرا آدمی اس وقت تعلیم قرآن کی طلب کرے یا وعظ و نصیحت چاہے تو اسلام کی تلقین کو پہلے رکھا جائے کیونکہ اس کی تاخیر میں دوسرے امور میں تاخیر کی نسبت زیادہ بڑا نقصان ہے۔ کافر کی حالت اپنی روحانی مرض میں جو کہ کفر ہے' مبتلا ہونے میں سرسام کے مریض کی حالت کی طرح ہے کہ تھوڑی سی بے توجہی اور تاخیر کی وجہ سے اس کے علاج کا مسئلہ ہاتھ سے نکل جاتا ہے۔ جبکہ مسائل شرعیہ سے ناواقف یا وہ شخص جو قرآن نہیں پڑھ سکتا' کی حالت اس مریض کی طرح ہے جس کا مرض اتنا خطرناک نہیں ہے' سہولت اور آہستگی کے ساتھ اس کا تدارک کیا جا سکتا ہے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چہرۂ پاک کا اس نابینے کی ناموافق حرکات کی وجہ سے متغیر ہونا دو جہتوں سے قابلِ عتاب نہیں ہے۔ پہلی جہت تو یہ ہے کہ یہ جبلی تغیر ہے جو کہ وسعت سے باہر ہے اس قسم کے کاموں کی تعمیل کی ذمہ داری سونپنا تکلیف مالا یطاق ہے۔ دوسری جہت یہ ہے کہ نابینے کے سامنے ترش روئی' روگردانی اور جس کبھی اور پوری توجہ برابر ہے کہ وہ کچھ بھی نہیں دیکھتا تا کہ اسے کوئی اذیت اور

دُکھ پہنچے۔ نیز ابھی اس فعل کا ناپسندیدہ ہونا واضح بھی نہیں تھا کیونکہ ابھی اس فعل سے نہی وارد نہیں ہوئی تھی تو نہی کی ابتدا میں اس قدر عتاب کی گنجائش کیونکر ہو سکتی ہے۔

اور اس اشکال کا جواب یہ ہے کہ

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
گرچہ باشد در نوشتن شیر و شیر

اگرچہ وہ نابینا چہرۂ مبارک کا بدلنا دیکھ نہیں رہا تھا لیکن دوسرے لوگ تو دیکھ رہے تھے اور انہوں نے اسے اغنیاء کی دل جوئی اور فقراء کی طرف توجہ نہ کرنے پر محمول کیا۔ حق تعالیٰ نے اپنے محبوب علیہ السلام کے بارے میں یہ گمان بھی پسند نہ فرمایا اور چاہا کہ میرے محبوب علیہ السلام کا ظاہر و باطن اخلاص اور رضا جوئی حق میں معروف ہو اور میرے محبوب علیہ السلام کی طرف ریا کا گمان بھی بالکل نہ رہے۔ نیز نفوسِ قدسیہ کو چاہیے کہ مسترشدین کی استعداد کے مطابق فیض اور فائدہ دینا پیش نظر رکھیں۔ اور کام کے انجام میں نظر رکھیں۔ کئی فقیر عاجز ایسے ہوتے ہیں کہ اپنی بلند استعداد کے باعث ایک کائنات کی شمع اور چراغ ہوتے ہیں۔ پس عام نفع کی توقع مسترشد کی قوت استعداد سے کرنی چاہیے۔ اغنیاء کے پیچھے چلنے والوں کی کثرت سے متاثر ہونا ظاہر بینوں اور نفوس کی استعداد سے ناواقفوں کا کام ہے۔

نیز حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے فیضِ صحبت سے اس نابینا کا نفع حاصل کرنا ایک یقینی امر تھا جبکہ دعوتِ اسلام سے ان سرداروں کا نفع پانا' پھر ان کی پیروی سے شہر والوں کا نفع پانا ایک امر موہوم تھا' موہوم کو معلوم پر ترجیح دینا مناسب نہیں۔

حقیقت واقعہ متعلقہ

اور اس بات کی حقیقت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے اس کام میں اگرچہ ناجائز اور نادرست ہونے کا شائبہ تک نہ تھا لیکن محبوبوں سے صرف گناہ سے معصوم رہنے پر ہی اکتفاء نہیں کرتے بلکہ ان سے تخلق باخلاق الٰہی چاہتے ہیں جس طرح کہ مشفق باپ جس چیز میں اپنے بیٹوں سے اپنے انداز اور آئین کے خلاف دیکھتا ہے اگرچہ جائز اور صحیح ہو' عتاب فرماتا ہے۔ بادشاہ اپنے بیٹوں سے یہ پسند نہیں کرتے کہ مشائخ اور صلحاء کی طرح مسجدوں

میں معتکف اور خلوتوں سے مانوس ہوں اور مشائخ اور صلحاء اپنے بیٹوں کے لیے پسند نہیں کرتے کہ سپاہیوں اور نوکری پیشہ لوگوں کی طرح روزی کی تلاش میں اگرچہ حلال طریقے سے ہو مشغول ہوں۔ علیٰ ہذا القیاس

پس یہ عتاب و خطاب نافرمانی سے ڈانٹ ڈپٹ کے طور پر نہیں تاکہ بے گناہی کی صورت میں اس کی توجیہ مشکل ہو بلکہ باپوں کے اپنی اولادوں کی تربیت کرنے کے طریقے سے ہے جس کی وجہ ظاہر ہے۔

وجہ تسمیہ

اس سورۂ عبس کی وجہ تسمیہ یہ ہے کہ اس عظیم الشان رسول علیہ السلام پر اللہ تعالیٰ کا عتاب اس بات پر کہ آپ نے طالبان رشد و ہدایت میں سے ایک خادم سے بے توجہی فرمائی اور قوم کے سرداروں کی طرف توجہ فرمائی' قرآن مجید کی سورتوں میں سے ایک سورۃ کے نام کے ساتھ ہو تاکہ طالبان رشد و ہدایت اور طلبہ علم کے حال پر اللہ تعالیٰ کی عنایت ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ہر مسلمان خصوصاً مرشدوں اور معلموں کے سامنے رہے کہ اس سورۃ کا نام سنتے ہی انہیں وہ واقعہ یاد آجائے اور وہ عبرت حاصل کریں۔ نیز اس رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محبوبیت کا دربار خداوندی میں کمال ثابت ہو کہ ان کے چہرۂ پاک کا اتنا سا تغیر شاق جانا کہ قاریوں اور تلاوت کرنے والوں کی زبان پر بار بار یاد فرماتا ہے اور اس سے خبر دیتا ہے اور جس کلام میں یہ واقعہ مذکور ہے اسے اسی عنوان کے ساتھ مخصوص کر دیا گیا ہے جس طرح کہ ایک عاشق شیفتہ اپنے محبوب کے کسی غیر مانوس معاملہ کو شان سمجھ کر اس معاملے کے وقت اور مکان کے لیے اس معاملے کو پہچان بنا دیتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

عَبَسَ رسول علیہ السلام نے ترش روئی فرمائی اور صرف اسی قدر نہیں بلکہ وَتَوَلّٰى چہرۂ مبارک پھیر لیا۔

اَنْ جَآءَهُ الْاَعْمٰى اس سے کہ آپ کے پاس نابینا آیا۔

مفسرین کا اس بات میں اختلاف ہے کہ یہاں نابینے کی آمد کو کیوں ذکر فرمایا گیا۔

بعض کہتے ہیں صرف بیان واقع ہے اور بعض کہتے ہیں کہ عتاب کے لیے ہے کہ اس رسول علیہ السلام کو ہم نے رحمۃ للعالمین بنایا ہے اور جہان والوں کو ہدایت دینے کے لیے بھیجا اور رحمت کے زیادہ مستحق ضعیف' گدا اور نابینے ہیں اور نابینے طالبان رشد و ہدایت' رہنمائی کے زیادہ محتاج ہیں۔ پس اس قسم کے لوگوں سے بے توجہی مقامِ رسالت کے شایاں نہیں۔

اور محققین نے کہا ہے کہ یہ واقعہ لانا حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے اس معاملے میں جو کہ اس نابینے کے بارے میں رونما ہوا' عذر کی تمہید کے لیے ہے اور یہ رحمت و محبت کے کمال کا تقاضا ہے کہ عین عتاب کے دوران آپ کا عذر بھی بیان فرمایا جا رہا ہے' مشفق باپ کی طرح جو کہ اپنے بیٹے کی شکایت لوگوں کے سامنے کرتا ہے اور عین شکایت کے دوران اس بیٹے کا عذر بھی بیان کرتا جاتا ہے تا کہ لوگ جان لیں کہ یہ بیٹا عتاب کا مستحق نہیں ہے اور ان اعمال میں وہ معذور ہے لیکن شفقت پدری کا کمال ہے کہ اس کے حق میں اتنی سی بات بھی پسند نہیں۔ چاہتے ہیں کہ اس کی تربیت کو حد کمال تک پہنچا دیں اور عذر کی وجہ یہ ہے کہ گویا ارشاد ہو رہا ہے کہ اس رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام کا حسن خلق اس بات کا بالکل تقاضا نہیں کرتا تھا کہ گداؤں اور بینواؤں کے ساتھ جو کہ حق کی طلب اور دین کی راہ تلاش کرتے ہیں اس طرح پیش آئیں لیکن اس رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام نے معلوم فرمایا کہ یہ شخص نابینا ہے' بے توجہی اور توجہ کرنے' نیز ترش روئی اور خندہ پیشانی میں امتیاز نہیں کر سکتا۔ پس آپ نے اس کی حرکات کو غیر معیاری سمجھتے ہوئے ترش روئی فرمائی اور اپنے آپ کو تکلف کے ساتھ اس سے باز نہ رکھا۔

اور رحمت و عنایت کے کمال کے پیش نظر یہاں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر حذف کر کے فعل غائب کو فاعل سے خالی لایا گیا تا کہ اس فعل کی صریح نسبت اس محبوب صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ نہ کی جائے۔ گویا یوں ارشاد ہو رہا ہے کہ کسی اعراض کرنے والے اور ترش روئی کرنے والے نے اعراض اور ترش روئی کی اگر صیغہ خطاب فرمایا جاتا تو اس فعل کی نسبت اس محبوب علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ساتھ صراحتاً سمجھ میں آتی اور کمال رحمت و شفقت کے تقاضے کے خلاف ہے۔ پس عین شکایت و عتاب کے دوران مہربانی اور محبت کے مرتبوں

کی رعایت کی جا رہی ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ نابینے کو تعلیم دینا دشوار ہے اس لیے کہ وہ صرف حفظ کرنے پر اکتفاء کرتا ہے اس کے لیے لکھے ہوئے کی طرف لوٹنا ممکن نہیں ہے۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا عذر یوں بیان ہوا کہ آپ نے اس نابینے کو قاصر الاستعداد جان کر اس کی تعلیم سے بے توجہی فرمائی حالانکہ نابینا ہونا اس بے توجہی کا موجب نہیں بلکہ دل کا اندھا اس بے توجہی کا موجب ہے اور وہ رئیس اور سردار سب کے سب اندھے دلوں والے تھے' آپ کو ان سے بے توجہی کرنا چاہیے تھی نہ کہ اس نابینے سے اس لیے کہ یہ نابینا دل کا بینا ہے۔

وَمَا يُدْرِيكَ لَعَلَّهُ يَزَّكّٰى اور تمھیں کیا معلوم کہ شاید وہ پاک ہو جائے اور اس کا آئینہ دل یہاں تک صیقل ہو جائے کہ ظاہری بینائی والے جن امورِ غیبیہ کشفیہ کو دریافت نہ کر سکیں' یہ دریافت کر لے اور ایک جہان کا مقتدا بن جائے اور وہ ایک نابینا ہزاروں بینائی والوں سے بہتر ہے اور کیا ہی اچھا کہا ہے کہنے والے نے۔

فدائے کوری خفاش چشم بینائی

کہ بے خبر ز رخ آفتاب نیم شبی ست

یعنی چمگادڑ کے اندھے پن پر وہ بینائی والی آنکھ قربان جو کہ آدھی رات کے آفتاب کے چہرے سے بے خبر یعنی جسے شب بیداری نصیب نہیں۔

اَوْيَذَّكَّرُ یا وہ نابینا نصیحت قبول کرے اور اگرچہ دل کے صیقل ہونے کے مرتبے کو نہ پہنچے لیکن قرآن پاک کا مفہوم اور اس کے امر اور نہی اس کے ذہن میں اس حد تک پختہ ہو جائیں کہ ان میں وہم و خیال کی آمیزش نہ ہو۔

فَتَنْفَعَهُ الذِّكْرٰى پس اسے یہ نصیحت مان لینا نفع دے کہ اس کی وجہ سے دین کی عمدہ منفعتیں حاصل کرے اور دین کی عظیم نقصان دہ چیزوں کو دور کرے اور اس کا لطیفۂ عقل روشن ہو جائے۔ اور وہ روشن آنکھوں والے ہزاروں سے بہتر ہو جائے اور عالم ربانی بن جائے جیسا کہ پہلی شق میں اس کا لطیفۂ دل صیقل ہو کر اسے صاف کشف و عرفان ولی کا مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے اور چونکہ ایک شق کا حاصل ہونا خصوصاً اس نابینے کے بارے میں اس کے

حالات دیکھنے والوں کو یقین کے ساتھ معلوم نہ تھا اس لیے اس مضمون کو کلمۂ او کے ساتھ لایا گیا جو کہ شک اور منع خلو پر دلالت کرتا ہے یعنی دونوں صورتوں میں سے ایک سے خالی نہیں ہوسکتا ہاں اس نابینے کے شوق کی شدت' رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی صحبت کی وجہ سے حاصل ہونے والے فیوضِ خداوندی پر اس کی حرص کی کثرت' قرآن پاک کی تلاوت سے اس کے انس اور اس کے معنوں میں اس کے غور و خوض سے اس قدر تو بات یقینی تھی کہ آخر کوئی چیز تو حاصل ہوگی اور وہ ان دونوں مرتبوں سے بالکل محروم نہیں رہے گا۔

صاحبِ کشاف نے بھی کلمہ او پر متنبہ ہو کر اپنی تفسیر میں بطورِ سوال ذکر کیا ہے کہ پاک ہونے کے بعد نصیحت کا اور کون سا نفع ہے جس کی توقع ہے اور جواب یہ لکھا کہ پاک ہونا گناہ سے بچنے اور پرہیزگاری اختیار کرنے سے کنایہ ہے اور نصیحت کا نفع دینا نیک اعمال کرنے سے عبارت ہے جس کی وجہ سے حصولِ ثواب کی توقع ہے اور ثواب دائمی نفع ہے لیکن اس کی اس بات پر اعتراض وارد کیا گیا ہے کہ علم حاصل ہونے سے دونوں چیزیں حاصل ہو جاتی ہیں' گناہ سے پرہیز بھی اور نیک عمل کرنا بھی۔ پس یہ مقام واؤ کا ہے نہ کہ حرف او کا۔ اس اعتراض کے جواب میں کہا گیا ہے کہ طالب علم کو یقین کے ساتھ معلوم نہیں کہ کیا سنے گا اگر نہی سنے' گناہ سے باز رہے اور اگر امر سنے تو نیکیوں میں زیادتی کرے اور اگر دونوں سنے تو دونوں کام کرے۔ پس حرف او کے استعمال کی جو کہ منع خلو کے لیے ہے' نہ کہ منع جمع کے لیے' مؤثر وجہ پیدا ہوگئی اور حق وہی ہے جو مذکور ہوا۔

اَمَّا مَنِ اسْتَغْنٰی لیکن جو آپ کے ارشاد بلکہ آپ کی راہ سے لاپرواہی کرتا ہے اور اپنے مال اور مرتبے کے ساتھ خوش ہے۔

فَاَنْتَ لَہٗ تَصَدّٰی تو آپ اس کی ہدایت کے درپے ہوتے ہیں اور شوق رکھنے والے طالبانِ ہدایت سے بے توجہی فرماتے ہیں۔ اس خیال سے کہ لاپرواہی کرنے والے کو اس راہ کا طالب اور شوقین بنانا چاہیے اور اس کے حال پر توجہ کرنا چاہیے جبکہ طالب اور شوقین کے لیے اس راہ کا شوق ہی کافی ہے آخر مطلب تک پہنچ جائے گا۔

وَمَا عَلَیْکَ اَلَّا یَزَّکّٰی اور آپ پر اس کا کوئی ضرر نہیں کہ وہ لاپرواہ آدمی پاک نہ ہو

اس لیے کہ آپ کا کام فرمانِ الٰہی کی تبلیغ اور ذی استعداد شوقینوں کی تربیت ہے اور وہ آپ کو مستعدین کے قبول کرنے کے وقت حاصل ہے۔

وَاَمَّا مَنْ جَآءَكَ يَسْعٰى لیکن جو آپ کی خدمت میں دوڑتا ہوا اور تکلیفیں برداشت کرتا ہوا آتا ہے جیسے ایک نابینا جس کا ہاتھ پکڑنے والا بھی کوئی نہ تھا اور وہ جگہ جگہ لڑکھڑاتا ہوا حضرت کی محفل میں پہنچا۔

وَهُوَ يَخْشٰى اور وہ پہلے تو خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہے کہ کہیں اس کے پسندیدہ اعمال سے دُور اور بُرائیوں کے قریب نہ ہو جائے اور یہ خوف اسے علم کی طلب اور آپ کی صحبت میں حاضری کے شوق کا باعث ہوتا ہے اور پھر راستے میں کفار کے تکلیف دینے سے بھی ڈرتا ہے کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ انہیں اس کے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں حاضر ہونے کا پتہ چل جائے اور وہ ستانے لگیں' پھر گرنے اور ٹھوکریں کھانے سے ڈرتا ہے پھر جب آپ کے دربار میں پہنچتا ہے تو اپنے سبق کا وقت ضائع ہونے سے ڈرتا ہے کہ کہیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو مصروفیت ہو جائے اور میں محروم رہ جاؤں۔

فَاَنْتَ عَنْهُ تَلَهّٰى پس آپ اس سے روگردانی کر کے دوسروں میں توجہ فرماتے ہیں اور اس کی طرف التفات نہیں فرماتے۔ گویا آپ پورا فائدہ اسی صورت میں دیکھتے ہیں کہ لاپرواہی کرنے والوں اور بھاگے ہوؤں کو رام کریں اور راستہ پر لائیں اور سچا شوق اور طلب رکھنے والوں کو تاخیر اور روکے رکھنے سے کمال شوق میں بے چین رکھیں۔

كَلَّآ ایسا نہ کریں اس لیے کہ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ تحقیق یہ آیاتِ قرآنی مجھے اللہ تعالیٰ' اس کے اسماء' اس کی صفات' اس کے افعال اور اس کے احکام کو یاد کرنے کے لیے ہیں تاکہ لوگوں کے لیے معرفت' عبادت' محبت' خوف اور رجا کی راہ کشادہ ہو جائے اور وہ اللہ تعالیٰ کی راہ کا سلوک اختیار کریں اور اس مقصد کے لیے چاپلوسی اور دلجوئی مفید نہیں بلکہ دِلی اختیار اور طبعی رغبت درکار ہے۔

فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ تو جو بھی خواہش رکھے' وہ اس قرآن پاک کو یاد کرے کہ یہ درحقیقت اللہ تعالیٰ کا ذکر ہے اور ذکرِ الٰہی دِلی رغبت اور صحیح ارادے کے بغیر مفید نہیں ہے۔

اور انہا میں ضمیر کو مؤنث لانے اور ذکرہ میں مذکر لانے کی وجہ باوجودیکہ دونوں کا مرجع ایک ہے یعنی قرآن پاک۔ یہ ہے کہ قرآن پاک کا تذکرہ ہونا اس کی آیات اور سورتوں کے اعتبار سے ہے کہ ہر ایک کا مضمون علیحدہ ہے۔ بعض میں اسماء وصفات کا بیان' بعض میں احکام وشرائع کا ذکر اور بعض میں ثواب وعذاب کے وعدوں کا تذکرہ ہے جبکہ قرآن پاک کا ذکر ہونا اس کی مجموعی صورت کے اعتبار سے ہے۔ کہ تمام قرآن پاک اس میں برابر ہے اور مضامین کے اختلاف کا اس کے ذکر ہونے میں کوئی اثر نہیں اس لیے کہ جو مضمون بھی ہو' کلامِ الٰہی ہے اور کلام کا متکلم کے ساتھ اتصال نام کے نام والے کے ساتھ متصل ہونے سے زیادہ قوی اور شدید ہے اور جو توجہ کسی شخص کا نام لینے کے وقت اسے حاصل ہوتی ہے اس توجہ سے کمتر ہے جو کہ اس کا کلام پڑھنے کے وقت حاصل ہوتی ہے جیسا کہ تجربہ کار پر یہ بات پوشیدہ نہیں۔

نیز کسی شخص کا کلام اس کی ذات کے شیون میں سے ایک عمدہ شان ہے کہ اس کلام کی تلاوت کے وقت تلاوت کرنے والے کے دل پر جلوہ گر ہوتی ہے اسی لیے بزرگوں کا کلام دل میں ان کے نام سے زیادہ اثر کرتا ہے اسی لیے حدیث شریف میں وارد ہے کہ قرآن پاک کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ **ھو حبل اللّٰہ المتین** اور حضرت امام جعفر الصادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ **تجلی اللّٰہ لعبادہ فی کلامہ ولکنھم لایبصرون** اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے لیے اپنے کلام میں جلوہ گر ہے مگر وہ دیکھتے نہیں۔

اور اگر کسی کے دل میں یہ کھٹکے کہ اگر سر برآوردہ' اغنیاء اور دولت مند کسی کتاب یا کلام یا شعر کا شوق کریں تو اس کتاب اور اس کلام کی قدر اور عزت بڑھ جاتی ہے اور وہ اسے زریں رقم خوش نویسوں کے ہاتھ سے ریشمی طلائی کاغذوں پر لکھواتے ہیں اور اس پر سونے کا پانی چڑھاتے ہیں اور چاندی کے کام والے غلافوں میں رکھتے ہیں اور نقش ونگار اور زیب و زینت والی رحلوں پر رکھتے ہیں اور پُرتکلف صندوقوں میں محفوظ کرتے ہیں اور اس وجہ سے کلام کی عزت اور مرتبہ بڑھ جاتا ہے اور لوگوں کے ذہنوں میں اس کی عظمت وجلال کا رنگ جم جاتا ہے جس طرح کہ کوئی دلکش شعر اچھی آواز کے ساتھ پڑھا جائے کہ اس کا اثر اس شعر

سے زیادہ ہوتا ہے جو سرسری طور پر پڑھا جائے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے رئیسوں اور سرداروں کی دعوت میں مصروف ہو کر اور اس وقت فقراء اور گداؤں سے بے توجہی کرنے میں اسی مقصد کا لحاظ کیا ہوگا۔ ہم کہتے ہیں کہ یہ قرآن پاک ایسا نہیں کہ ان چیزوں سے اس کی عزت اور قدر بڑھے بلکہ اس کی قدر اور عزت اس جہان میں کہ جہاں سے زمین والوں پر اُترتا ہے' دیکھنی چاہیے۔

فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ آیاتِ قرآنی عظیم المرتبت صحائف میں لکھی گئی ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے خود عظمت دی ہے۔ مَّرْفُوْعَةٍ وہ صحائف بیت العزت میں اونچے رکھے گئے ہیں جو کہ آسمانِ دنیا میں ایک عمدہ مقام ہے اور قرآن مجید کو پہلے لوحِ محفوظ سے منتقل کر کے اس مقام پر پہنچایا گیا اور وہاں سے تھوڑا تھوڑا نازل ہوتا رہا۔

مُّطَهَّرَةٍ وہ صحائف تمام نجاستوں اور پلیدیوں سے پاک رکھے گئے ہیں اور اگر دنیا کے رئیس اور سردار اس قرآن پاک کی آیات کو ریشمی طلائی کاغذوں میں لکھوائیں تب بھی اس کرامت اور بزرگی تک نہیں پہنچے گا اور اگر رحلوں اور صندوقوں میں رکھیں تب بھی ان بلندیوں تک نہیں پہنچے گا اور اگر خوشبو لگا کر اور نجاستوں سے احتیاط کے ساتھ دُور رکھ کر ان آیات کو پاک رکھیں تو بھی اس تقدس تک نہ پہنچے گا' کسی گناہ گار کا ہاتھ ان تک نہیں پہنچا بلکہ وہ صحائف

بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ ایسے لکھنے والوں کے ہاتھوں میں دیئے گئے ہیں جو کہ كِرَامٍ بَرَرَةٍ عظیم المرتبت اور نیکوکار ہیں' بزرگی اور نیکی کے بغیر ان سے کبھی کوئی کام صادر نہیں ہوتا جبکہ دنیا میں لکھنے والے گناہوں سے ملوث اور طبعی خباثتوں میں آلودہ ہیں اس سے کیا کشائش ہوگی کہ اپنے ظاہر کو سجائیں۔ پس قرآن پاک کے بارے میں دنیاداروں اور دولت مندوں سے عزت افزائی کی توقع رکھنا بالکل بے جا ہے۔ بلکہ اگر اہل دنیا اس نعمت کی قدر کو پہچان لیں تو غنیمت ہے۔ اس لیے کہ آدمی جبلی طور پر نعمت کی ناشکری کرتا ہے۔

قُتِلَ الْاِنْسَانُ مَآ اَكْفَرَهٗ انسان ہلاک ہو نعمتوں کی کتنی ناشکری کرتا ہے اور جس ذات نے اسے اس عظیم القدر کلام سے نوازا ہے اور اس میں قسم قسم کے رشد و ہدایت کا ذکر

فرمایا ہے' نہیں پہچانتا اور اس کے حقوق ادا نہیں کرتا اور اپنے مال اور مرتبے کی وجہ سے لاپرواہی اور غیر ذمہ داری کا ارتکاب کرتا ہے بلکہ وہ اپنی اصل کی خبر نہیں رکھتا کہ کیا ذلیل چیز تھا۔

مِنْ اَيِّ شَيْءٍ خَلَقَهٗ اسے کون سی حقیر چیز سے پیدا کیا گیا ہے۔ اور اگر انسان شرم کی وجہ سے اس سوال کا جواب نہ دے تو ہم کہتے ہیں

مِنْ نُّطْفَةٍ خَلَقَهٗ نطفے کے پانی سے اسے پیدا کیا ہے' پیشاب کی راہ سے نکلا اور پیشاب کی راہ میں داخل ہوا اور خون اور آلائشوں سے مل کر گوشت کا ایک ٹکڑا بنا۔

فَقَدَّرَهٗ پس اس کا اندازہ کیا' مناسب اعضاء' کان' آنکھ' ہاتھ' پاؤں' زبان اور لب کا بھی۔ اور اس کے قد کا بھی کہ کم اور زیادہ ہونے میں معین فرمایا۔ اس کے رزق' اجل اور عمل کو بھی مقرر فرمایا۔ اور ماں کے پیٹ میں اس کے ٹھہرنے کی مدت بھی نو ماہ یا اس سے کم و بیش مقرر فرمائی۔

ثُمَّ السَّبِيْلَ يَسَّرَهٗ پھر اس کے لیے باہر آنے کی راہ آسان فرمائی اس لیے ماں کے شکم میں بچے کا سر ماں کے سر کی طرف اور اس کے پاؤں ماں کے پاؤں کی طرف ہوتے ہیں اور جب ولادت کا وقت آتا ہے تو الہام ہوتا ہے تو وہ بچہ خود بخود بدل کر سر نیچے کی طرف اور پاؤں اوپر کی طرف کر لیتا ہے تاکہ اس کا باہر آنا آسان ہو جائے اور جب شکم سے باہر آ جائے تو اس کی روزی کی تلاش کی راہ آسان فرماتا ہے۔ اگر بھوک کے وقت پستان اس کے ہاتھوں لگ جائے تو ایک ہاتھ سے پستان کو مضبوطی سے پکڑ کر چوسنا شروع کر دیتا ہے۔ ورنہ رونے کی آواز کے ساتھ بھوک کا اظہار کرتا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس سال بسال اس کے لیے مختلف راہیں آسان فرماتا ہے حتیٰ کہ کمال کی حد کو پہنچ جاتا ہے اور خیر و شر اور حق و باطل کی راہ انبیاء علیہم السلام کی تشریف آوری' کتابوں کے نزول' مشفق مرشدوں کی صحبت اور محقق علمائے کرام کی شاگردی کی وجہ سے آسان ہو جاتی ہے۔ پھر بعض کے لیے جنت اور نجات کی راہ آسان ہو جاتی ہے اور وہ اس راہ پر چلنے کی توفیق پا لیتے ہیں۔ اور بعض کی نظر میں ہلاکت اور جہنم کی راہ آسان معلوم ہوتی ہے اور وہ اس میں گر پڑتے ہیں۔ بہرحال عمر کے آخر تک

کمالی حاصل کرنے کی راہ آسان ہوتی چلی جاتی ہے۔

موت ایک عظیم نعمت ہے

ثُمَّ اَمَاتَهٗ پھر اسے موت عطا فرماتا ہے تاکہ وہ اس مشقت کا پھل چکھے جو اس نے اپنا کمال حاصل کرنے کے لیے دنیا میں اُٹھائی تھی۔ اور عالم برزخ میں اپنے اعمال کے آثار دیکھے۔ پس موت بھی ایک عظیم المرتبت نعمت ہے کہ تجارت کے نفع کی وصولی اسی سفر میں حاصل ہوتی ہے اگر موت نہ ہوتی' آدمی ہمیشہ مشقت طلب، اعمال کی کھینچا تانی میں وقت گزارتا اور ان سب مشقتوں کا پھل ہرگز نہ پاتا اور یہی وجہ ہے کہ موت دینے کو بھی نعمتوں کے شمار کے مقام پر ذکر فرمایا گیا ہے اور بزرگوں سے منقول ہے، کہ الموت جسر یوصل الحبیب الی الحبیب موت ایک پل ہے جو محبّ کو محبوب سے ملاتا ہے۔

اور بعض ظاہر بین مفسرین موت کے نعمت ہونے سے بے خبر ہو کر یہاں بطورِ سوال یہ بات لائے کہ موت کو نعمتوں میں کیوں شمار کیا گیا ہے اور اس سوال کا جواب اس انداز سے دیا ہے کہ بلغاء کے نزدیک کلام کا مدار اور فائدے کی منزل اس کے آخر پر ہوتی ہے۔

قبر بھی ایک عظیم نعمت ہے

اور موت کے بعد جو قبر میں دفن کرنے کا حکم دیا گیا ہے' یہ بھی ایک عظیم نعمت ہے جس کے ساتھ آدمی کو عزت دی گئی ہے گو صرف موت نعمت نہ ہو جس طرح کہ شفیق باپ بیٹے پر اپنی نعمتیں شمار کرتے ہوئے کہے کہ میں نے تیرے لیے یوں یوں کیا پھر جب، تو بیمار ہوا تو میں نے تیرا علاج کیا تو حقیقت میں نعمت مقصودہ تو علاج ہے لیکن چونکہ علاج کا نعمت ہونا مرض لاحق ہونے پر موقوف ہے تو گفتگو کے دوران مرض کا ذکر بھی ضروری ہے اور اسی مقصد کا اشارہ کرنے کے لیے موت دینے اور قبر میں داخل کرنے کے درمیان لفظ ثم نہیں لایا گیا بلکہ حرف فا لایا گیا۔

فَاَقْبَرَهٗ پس اسے قبر میں دفن کرنے کا حکم دیا تو گویا ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ موت دینا اور قبر میں داخل کرنے کا حکم دینا مجموعی طور پر نعمتوں میں داخل ہیں نہ کہ جدا جدا۔

اور یہاں جاننا چاہیے کہ قبر میں دفن کرنے کا حکم دینے کو اقبار کہتے ہیں اور قبر میں دفن

کرنے کو قبر۔ اقبرالرجل عبدہ اس وقت کہا جاتا ہے جب اس نے غلام کو دفن کرنے کا حکم دیا۔ اور قبرالرجل عبدہ اس وقت جب اسے خود قبر میں داخل کیا ہو۔

سب سے پہلے قبر میں دفن کرنے کی صورت کا بیان

اور مرنے والوں کو قبر میں دفن کرنے کے حکم خداوندی کی سب سے پہلے تو یوں صورت ہوئی کہ جب قابیل نے ہابیل کو قتل کیا اور آدم زاد کے مرنے کا پہلا واقعہ یہی تھا۔ قابیل کو کچھ سمجھ نہ آئی کہ اس میت کو کیا کیا جائے۔ ناچار ہابیل کی لاش کو ایک بڑی سی چادر میں لپیٹ کر اپنے ہمراہ لیے پھرتا چونکہ اس نقل وحمل میں بہت مشقت ہوئی اور وہ تھک گیا۔ ایک دن ایک جنگل میں حیران ہو کر مغموم بیٹھا تھا کہ اچانک ایک کوا ظاہر ہوا اور اس نے دوسرے کوے سے لڑائی کر کے اسے مار دیا۔ پھر اپنی چونچ اور پنجوں سے زمین کو کھود کر مردہ کوے کو ایک گڑھے میں ڈال دیا اور اس کے اوپر اپنی چونچ کے ساتھ بہت سی مٹی ڈال کر ٹیلہ بنا دیا۔ قابیل نے کوے کی اس حرکت سے سراغ لگایا کہ مردے کو یوں دفن کرنا چاہیے۔ اپنے بھائی کی لاش کو بھی دفن کر کے قبر درست کر دی پھر جب حضرت آدم علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کا وصال ہوا تو فرشتوں نے آسمان سے اُتر کر آپ کی اولاد کے سامنے غسل، کفن، تجہیز اور قبر کھودنے کا کام کیا اس کے بعد یہی معمول ہو گیا اور یہ تعلیم الٰہی جو پہلے تو استعداد کی کمی کی وجہ سے قابیل کو کوے کے ذریعے واقع ہوئی اور دوسری دفعہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد کو فرشتوں کے ذریعے تعلیم دی گئی، ایک عظیم نعمت اور قابلِ تحسین اعزاز ہے اگر آدمی کی لاش کو دوسرے حیوانات کی طرح سطح زمین پر ہی چھوڑ دیتے تو متعفن ہو کر بدبو پھیلاتی اور لوگوں کے مشام کو پریشان کرتی اور اس میت سے لوگ متنفر ہوتے اور بدگوئیاں کرتے۔ نیز درندے اور پرندے اس کے اعضاء کو ٹکڑے ٹکڑے کر کے لے جاتے اور ناپاک مردار خود جانور اسے اپنا لقمہ بنا لیتے اور اسے بہت بڑی حقارت لاحق ہوتی اور اس کے عیب بے پردہ ہو کر عام خاص میں مشہور ہو جاتے اور اس کی قدر لوگوں کی نظر میں کم ہو جاتی۔ ناچار اسے عزت دینے کے لیے اس طریقہ کی غیب سے تعلیم دی گئی۔

ہندوؤں کا مردوں کو جلانا معیوب ہے نیز جلانے کے مقابلہ میں دفن کی خوبیاں

ہم یہاں پہنچے کہ ہندو اپنے مردوں کو جلاتے ہیں' قبر میں دفن نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ آگ ہر ناپاک کو پاک کرنے والی اور ہر بدبو کو دور کرنے والی ہے اور جسے تعفن اور بدبودار کرنا منظور ہو' زمین میں دفن کرتے ہیں۔ پس آگ سے جلانا زیادہ بہتر ہوگا۔

اس کا جواب یہ ہے کہ آگ خائن ہے' اسے جو کچھ دیں' کھا جاتی ہے اور زمین امانت دار ہے اس میں جو دفن کرتے ہیں' رہ جاتا ہے اور مردے کو زمین کے پاس چھوڑنا اس سے بہتر ہے کہ خائن کے حوالے کریں۔ اسی لیے آدمی بلکہ دوسرے حیوانات کی بھی جبلت ہے کہ جب اموال اور خزانوں میں سے کسی چیز کو محفوظ رکھنا چاہیں' زمین میں دفن کرتے ہیں اور جب چاہیں کہ اسے نیست و نابود کردیں تو آگ میں جلاتے ہیں۔ اور آدمی کو قیامت میں اُٹھنے اور ارواح کا حشر و کہ جسموں کے ساتھ متعلق ہونے کا انتظار ہے اور مردے کو جلانا اس انتظار کے خلاف ہے۔ نیز مردے کی بہت بے قدری ہے کہ اسے آگ میں جلا کر ہوا میں اُڑا دیں اس لیے کہ یہ معاملہ تو ردی اور ناپاک چیزوں کے ساتھ کیا جاتا ہے اور قیمتی چیزوں کو کہ جنہیں باقی رکھنا مطلوب ہے' زمین میں دفن کرنے کے بغیر کوئی معمول نہیں۔

اور یہ جو انہوں نے کہا ہے کہ آگ بدبو کو دور کرتی ہے جبکہ اس کے برعکس زمین متعفن اور بدبودار کرتی ہے تو یہ اس وقت ہے جب اس چیز کو زمین سے نکالنا منظور ہو جب اسے زیر زمین رکھنا مقصود ہو تو تعفن سے کیا ڈر؟ کہ زمین والوں کو اس کا کوئی اثر محسوس نہیں ہوتا اور اس کے باوجود دفن کرنے کی صورت میں بدن کی کئی رطوبتیں متعفن ہو کر خشک ہو جاتی ہیں اور جسم کے اعضاء و اجزا سب کے سب اپنی شکل اور مقدار پر رہتے ہیں۔ گویا ایک شخص جس طرح زندگی کی حالت میں سوتا ہے اسی طرح اس حالت میں سوتا ہے۔ بخلاف آگ کے ساتھ جلانے کے کہ اعضاء کو جلا کر شکل' مقدار' رنگ اور صورت کا کوئی اثر باقی نہیں چھوڑتی۔ نیز آدمی کی خلقت خاک سے ہے اور کل شئی یرجع الی اصلہ کے حکم کے مطابق اسے اپنی اصل کی طرف لوٹانا چاہیے۔ بخلاف آگ کے کہ شیطانوں اور جنوں کا مادۂ تخلیق ہے۔ پس جب موت کے بعد آدمی کے جسم کو اس سے جلاتے ہیں تو اس کی ارواح لطیفہ آگ کے

دھوئیں کے ساتھ مل کر شیطانوں اور جنوں کے ساتھ پوری مشابہت پیدا کر لیتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ آگ کے ساتھ جلائے جانے والوں کی اکثر روحیں موت کے بعد شیطانوں کا حکم حاصل کر لیتی ہیں اور آدمیوں کو چمٹ جاتی ہیں اور انہیں تکلیف دیتی ہیں۔ پس دفن کرنے میں چیز کو اپنی حقیقت کی طرف لوٹانا ہے جبکہ جلانے میں حقیقت کو بدلنا ہے۔

ہندوؤں کے ایک عقل مند کا واقعہ

کہتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں ایک اسلامی لشکر سیستان کی حدود میں وارد ہوا۔ ہندو داناؤں میں سے ایک دانا مسلمانوں کے لشکر کا طور طریقہ جو کہ اس وقت ایک نیا مذہب تھا' دیکھنے کے لیے وہاں پہنچ گیا۔ اہلِ اسلام کے حالات کی تفتیش اور ان کے طور طریقوں پر مطلع ہونے کے بعد اس نے اعتراض کیا کہ تمہاری تمام چیزیں خوب ہیں مگر یہ کہ تم اپنے مرنے والے کو قبر میں دفن کرتے ہو اور آگ میں نہیں جلاتے ہو حالانکہ قبر میں دفن کرنا ناپاکی اور بدبو کا موجب ہوتا ہے جبکہ جلانا پاکیزگی اور زوال تعفن کا باعث ہوتا ہے۔ وہاں فقہائے اسلام میں سے ایک فقیہ موجود تھے' انہوں نے فرمایا کہ کہو اگر ایک شخص کسی ملک میں وارد ہو اور ایک عورت کے ساتھ نکاح کر لے اور دوسری عورت کھانا پکانے کے لیے رکھ لے اور اس منکوحہ عورت سے اس کا بیٹا پیدا ہو پھر اس شخص کو سفر کی ضرورت پیش آئے اور وہ چاہے کہ اپنے بیٹے کو چھوڑ جاؤں تا کہ جب واپس آؤں تو اس بچے کو پالوں' کس عورت کے پاس چھوڑے؟ اس عورت کے پاس جو اس کی ماں ہے یا اس کے پاس جو باورچی ہے۔ ہندو نے کہا کہ ظاہر ہے کہ ماں کے ہوتے ہوئے بچہ باورچی کے سپرد نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ بیٹا ماں کا ہے' باورچی کا نہیں۔ فقیہ نے فرمایا اب اپنے اعتراض کا جواب سنو۔ روح آسمانی جب زمین میں آئی تو زمین سے ایک جسم پیدا کر کے اسے عطا کیا گیا اور ہمیشہ اسے غذا' دوا' لباس' سکونت اور دوسرے منفعتیں زمین سے ہی پہنچائی گئیں جبکہ آگ آدمی کے حق میں باورچی گری کے سوا کوئی کام نہیں رکھتی اور آگ کا انتہائی فائدہ یہی ہے کہ وہ کچی چیزیں جو زمین سے اُگتی ہیں' انہیں پکائے۔ پس آدمی کی ماں زمین ہے اور اس کا باورچی آگ۔ جب روح نے جو کہ جسم کے لیے بمنزلہ باپ ہے' چاہا کہ عالم برزخ کو جائے' ناچار اپنے بیٹے کو جو کہ

بدن ہے' اس کی ماں کے سپرد کرے گا نہ کہ دوسری عورت کے جو کہ باورچی ہے۔ یہ گفتگو سن کر ہندو نے داد انصاف دی اور قائل ہو گیا۔

مزارات سے زائرین کو اور قبروں والوں کو ایصالِ ثواب

نیز آگ میں جلانے سے میت کے جسم کے اجزا کو بکھیرنا ہے کہ اس کی وجہ سے روح کا بدن سے تعلق بالکل منقطع ہو جاتا ہے اور اس جہاں کے آثار اس روح کو کمتر پہنچتے ہیں اور اس روح کی کیفیات اس جہان میں کم سرایت کرتی ہے جبکہ دفن کرنے میں چونکہ سارے جسم کے اجزا یکجا ہوتے ہیں' روح کا جسم سے تعلق نگہبانی کے طور پر بحال رہتا ہے اور انس و فائدہ لینے والے زائرین پر روح کی توجہ آسانی سے ہوتی ہے کہ بدن کے مکان کے معین ہونے کی وجہ سے گویا روح کا مکان بھی معین ہے۔ پس اس جہان کے اثرات جیسے صدقات' فاتحہ خوانی اور تلاوتِ قرآن مجید جب اس جسم کے مدفن پر واقع ہوتے ہیں تو آسانی سے نفع دیتے ہیں۔ پس جلانا گویا روح کو بے گھر کرنا ہے جبکہ دفن کرنا روح کے لیے مسکن بنانا ہے اسی بنیاد پر دفن شدہ اولیاء اللہ اور دوسرے نیک مسلمانوں سے نفع اور فائدہ لینے کا سلسلہ جاری ہے اور ان کی طرف سے فائدہ دینے اور مدد دینے کا تصور قائم ہے۔ بخلاف جلائے گئے مردوں کے کہ یہ چیزیں ان کے لیے ان کے مذہب والوں میں واقع نہیں ہیں۔

بہر حال قبر اور دفن کا طریقہ آدمی کے بارے میں ایک عظیم نعمت ہے تو اگر ان کے بعض افراد اس نعمت کی بھی ناشکری کریں جیسا کہ دوسری نعمتوں کے متعلق کرتے ہیں تو کوئی گلہ نہیں کہ آدمی کی جبلت میں کفرانِ نعمت داخل ہے اور اس کے حق میں اسی نعمت پر اکتفا نہیں بلکہ ثُمَّ اِذَا شَآءَ اَنْشَرَهٗ پھر جب چاہے گا' اسے قبر سے زندہ نکالے گا تاکہ وہ اپنے کسب کیے ہوئے اعمال کی جزا دار آخرت میں ابدالآباد تک چکھے اور ہمیشہ کی زندگی پائے اور اگرچہ یہ نعمت ابھی تک واقع نہیں ہوئی کہ اسے ان معلومہ نعمتوں میں شمار کیا جائے جن کی ناشکری کی گئی لیکن عقل مند کو معمولی غور و فکر سے معلوم ہو جاتا ہے کہ جب ان حالات میں اللہ تعالیٰ کی مشیت سے کوئی چیز پیچھے نہیں رہی تو اس حالت میں بھی زندہ کر کے اٹھانا اس کی مشیت سے پیچھے نہیں رہے گا۔ اسی لیے اس نعمت کو مشیت کے وقت کے ساتھ متعلق فرمایا گیا ہے اور

آدمی کے شروع کی خلقت اس کی لوٹائی گئی خلقت پر مضبوط اور واضح دلیل ہے اور اگر وہ اس نعمت کا بھی نادانی اور جہالت کی وجہ سے انکار کرے تو اس کی کوئی پرواہ نہیں۔

اور جب یہاں ایک شبہ کا گمان تھا کہ کہیں آدمی کے دل میں یہ خیال گزرے کہ چونکہ ہمیں ابتدائے خلقت سے ہی بزرگی اور عزت کے ساتھ نوازا گیا ہے اور زندگی اور موت میں مجھے دوسری مخلوق پر معزز و محترم کیا گیا ہے تو آخرت میں بھی میرے ساتھ اسی اچھے معاملے کے ساتھ پیش آئیں گے کہ جسے نوازا گیا ہوٗا سے گرانا نہیں چاہیے اور اپنی طرف سے عزت دیئے گئے کو ذلیل نہیں کرنا چاہیے۔ نیز میں جسم میں روح لوٹانے کے بعد بھی انسان ہی ہوں گا جبکہ انسانیت لازماً اکرام واعزاز کا موجب ہے اس بناء پر اس گمان کو دُور کرنے کے لیے فرمایا گیا ہے:

كَلَّا نہیں! نہیں، ایسا گمان نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ سابقہ اعزاز اس جہت سے تھا کہ ابھی وہ کسی معصیت کے صادر ہونے کا مقام نہیں بنا تھا لیکن معصیت کے بعد اگرچہ لوٹانے کے وقت اسے انسان ہی لوٹایا جائے گا لیکن نافرمان انسان جس سے گناہ صادر ہوئے۔ پس لوٹانے کی حالت کو ابتدا کی حالت پر قیاس نہیں کرنا چاہیے اور سابقہ کرم پانے کی وجہ سے لاحق ہونے والے کرم کا امیدوار نہیں ہونا چاہیے۔ اور آدمی کرم لاحق کی امید کے ساتھ اپنا دل کیسے وابستہ کرے اور کرم سابق سے دھوکا کھائے حالانکہ

لَمَّا يَقْضِ مَآ اَمَرَهٗ اس نے ابھی تک وہ کام پورے طور پر سرانجام نہیں دیا جس کا اس کے پیدا کرنے والے اور عزت دینے والے نے حکم دیا ہے۔ اگر اس کے حکم کو پورا کرتا اور بندگی کی ذمہ داری پوری کرتا۔ البتہ عزت واکرام کی توقع بجا تھی اور اب تو کوتاہی اور نافرمانی کی صورت میں خائف اور ہراساں ہونا چاہیے اور ذلیل وحقیر کیے جانے کی توقع کرنی چاہیے اور وہ جو کہتا ہے کہ نوازے ہوئے کو گرانا نہیں چاہیے اور معزز کو ذلیل نہیں کرنا چاہیے، یہ خلاف واقع ہے بلکہ کئی چیزیں ہیں جو کہ عزت کے بعد ذلیل وحقیر کیے جانے کی مستحق ہو جاتی ہیں اور اس مسئلے میں کوئی شک ہو۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ اِلٰى طَعَامِهٖ تو چاہیے کہ آدمی اپنی خوراک کو دیکھے کہ کس طرح

ناپاک فضلہ ہو جاتی ہے اس کے بعد کہ اسے پورے طور پر پاکیزگی اور احتیاط سے پالا جاتا ہے اور اس کی پیدائش کے بارے میں حق سبحانہ وتعالیٰ کی عنایات مصروف ہوتی ہیں جس طرح کہ آدمی کی پیدائش کے متعلق مصروف ہوئی تھیں۔ چنانچہ اس مسئلے کو پورے طور پر سوچے کہ

اَنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا تحقیق ہم نے آسمان سے پانی اس طرح گرایا کہ انسان کے نطفہ گرانے سے کہیں فزوں تر اور زیادہ ہے۔

ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا پھر ہم نے زمین کو اس طرح پھاڑا کہ آدمی کے پیدا ہونے کے لیے رحم کھلنے سے کہیں زیادہ ہے اور یہ سب عنایات ایک کمزور گھاس کے بارے میں تھیں جو کہ زمین سے باہر نکلنے کی طاقت نہیں رکھتی تھی۔

فَاَنْبَتْنَا فِیْهَا حَبًّا پس ہم نے اس زمین میں دانہ اُگایا جو کہ خوراک کے قابل ہے جیسے گندم اور چنے

وَّعِنَبًا اور دانہ انگور جو کہ خوراک بھی ہے اور میوہ بھی' دوا بھی اور شربت بھی۔ وَّقَضْبًا اور کھانے کے قابل جڑیں جیسے شلجم' گاجر' چقندر اور شکر کندی کہ خوراک کا کام دیتی ہیں اور جب انہیں کچا کھائیں تو حرارت اور پیاس دُور کرتی ہیں اور اگر پکا کر کھائیں تو معقول قسم کا سالن بنتا ہے اور اگر مربا یا اچار بنائیں تو میوے کا حکم حاصل کرتی ہیں۔

وَّزَیْتُوْنًا اور زیتون جو کہ تیل کی جگہ کام آتا ہے اور سالن بھی بن سکتا ہے۔

وَّنَخْلًا اور کھجوریں جو کہ خوراک بھی ہو سکتی ہیں اور میوہ اور سالن بھی اور اس سے شربت اور رس بنا کر شراب کی جگہ کام میں لاتے ہیں۔ نیز سرکہ بناتے ہیں۔

وَّحَدَآئِقَ اور دیواروں والے باغات جن میں پھلوں اور دواؤں کے قسم قسم کے درخت لگاتے ہیں اور اُگتے ہیں۔

غُلْبًا گھنے درختوں والے۔ جن کی شاخیں پھیلی ہوئی ہوتی ہیں اور لغت عرب میں اس اونٹنی کو جس کی گردن پر بال بہت زیادہ ہوں' غلب کہتے ہیں اور وہ شیر جس کی گردن پر اون بہت زیادہ ہو' اسے بھی اسد غلب کہتے ہیں یہاں اس باغ کو جس میں بہت زیادہ درخت ہیں

اوران درختوں کی شاخیں پھیلی ہوئی ہوں' استعارے کے طور پر غلباً فرمایا گیا ہے۔

وَّفَاكِهَةً اور دوسرے میوے جو کہ باغات میں نہیں ہوتے بلکہ صحراؤں اور بیابانوں میں ہوتے ہیں۔

وَّاَبًّا اور قسم قسم کی گھاس جو کہ خودرو ہوتی ہے اور اسے کوئی کاشت نہیں کرتا۔

مَّتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ تاکہ تمہیں اور تمہارے چار پایوں کو ان خوردنی اجناس سے بہرہ ور فرمائے۔ اس لیے ان مذکورہ اقسام میں سے بعض خاص طور پر جانوروں کے لیے ہیں جیسے گھاس کی اقسام اور بعض آدمی اور جانوروں میں مشترک ہیں جیسے غلے اور بعض وہ اقسام ہیں جن کا نچوڑ آدمی استعمال کرتا ہے اور ان کے چھلکے' بیج' گٹھلیاں اور پتے جانور کھاتے ہیں۔ اور اس کے باوجود کھانے کے بعد یہ چیزیں کس قدر ذلیل اور حقیر ہو جاتی ہیں اور فضلہ اور گوبر بن جاتی ہیں اور اسے گھروں سے دُور پھینکا جاتا ہے' ان کی بدبو سے سخت نفرت کرتے ہیں اس سابقہ عزت عطا کرنے کو اس لاحق شدہ ذلت پر قیاس کرنا چاہیے اور دھوکا نہیں کھانا چاہیے۔ بہت فرق ہے کہ آدمی کی خوراک عزت دینے کے بعد عنقریب ذلیل کر دیا جاتا ہے اور آدمی اس پر مطلع ہوتا ہے اور آدمی کا اعزاز ایک مدت کے بعد ذلت میں بدل جائے گا اور اس مدت کا وقت معین ہے جس کا بیان یہ ہے:

فَاِذَا جَآءَتِ الصَّآخَّةُ تو جب ایسی سخت آواز آئے جو کہ جہان والوں کے کان بہرے کر دے اور وہ صور پھونکنے سے عبارت ہے۔

يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ جس دن آدمی اپنے بھائی سے بھاگے باوجودیکہ اسے تمام اجنبیوں سے زیادہ درست رکھتا ہے اور عمر کی ابتدا ہی سے اس کے ساتھ مانوس تھا اور ان میں باہمی ہمدردی' تعاون اور مشورہ کا سلسلہ قائم تھا۔ وَاُمِّهٖ اور اپنی ماں سے کہ اس سے بھائی سے بھی زیادہ محبت کرتا ہے اور اس کے بہت سے حقوق اس کے ذمہ ہیں۔ وَاَبِيْهِ اور اپنے باپ سے جس کی تعظیم ماں سے بھی زیادہ ہے اور اس کا حق بھی بڑا ہے بلکہ گویا بیٹا اس کی ملک ہے۔

وَصَاحِبَتِهٖ اور اپنی بیوی سے کہ آدمی کا اس کے ساتھ ماں باپ سے زیادہ تعلق ہے

اس لیے کہ مرتے دَم تک اس کے ساتھ رہنا منظور کرتا ہے اور ماں باپ کے حق کو سمجھتا ہے کہ ایک خواب تھا اور ختم ہو گیا اور ان کے ساتھ کوئی کام نہ رہا۔

وَبَنِيهِ اور اپنے بیٹوں سے جو کہ ان کے نزدیک بیوی سے بھی زیادہ پسندیدہ ہیں اس جہت سے کہ انہیں اپنے مرنے کے بعد اپنا قائم مقام سمجھتا ہے اور ان رشتہ داریوں کے ذکر میں ادنیٰ سے اعلیٰ کی طرف ترقی ہے جیسا کہ پوشیدہ نہیں ہے اور جب ان قرابتوں کے باوجود آدمی اپنے قریبیوں سے بھاگے گا تو اجنبیوں سے تو بطریقِ اولیٰ نفرت کرے گا۔

کہتے ہیں کہ سب سے پہلے جو اپنے بھائی سے بھاگے گا' قابیل ہوگا جو کہ ہابیل سے بھاگے گا تا کہ خون کے بارے اس کے پیچھے نہ پڑ جائے۔ اور سب سے پہلے جو اپنی بیوی سے متنفر اور بے زار ہوگا' حضرت نوح اور حضرت لوط علیٰ نبینا وعلیہما السلام والتحیۃ ہوں گے' ان دونوں کی عورتیں منافق تھیں اور منافقین کے بارے میں شفاعت قبول نہیں ہے اور سب سے پہلے جو اپنے بیٹے سے بے زار ہوگا' حضرت نوح علیہ السلام ہوں گے کہ آپ کا بیٹا کنعان کافر مرا۔

قیامت کے دن کے قریبیوں سے بھاگنے کی وجہ

اور علمائے کرام نے قریبیوں سے دوڑنے کی وجہ میں اختلاف کیا ہے کہ کیا ہوگی؟ بعض کہتے ہیں کہ حقوق کے مطالبے کے ڈر سے بھاگے گا تا کہ اس کا جو حق ضائع کیا تھا اس وقت اسے دیکھ کر اور پہچان کر مطالبہ نہ کر دے جیسا کہ مفلس آدمی قرض دار سے بھاگتا ہے۔

حدیث پاک میں وارد ہے کہ قیامت کے دن آدمی اجنبیوں کی نسبت اپنے آشناؤں اور دوستوں سے زیادہ کنارہ کشی کرے گا اس لیے کہ دنیا میں اجنبیوں کے ساتھ کوئی معاملہ ہی نہ تھا جس کے مطالبے کا خوف ہو۔

اور بعض کہتے ہیں کہ امداد اور شفاعت کے ڈر سے بھاگے گا کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان قریبیوں کو دوزخ میں لے جائیں اور مجھے انہیں چھڑانے کے لیے اپنی کچھ نیکیاں دینا لازم آئیں یا ان کے کچھ گناہ اُٹھانا پڑیں جیسا کہ قحط کے زمانے میں اسی قسم کے خوف کی وجہ سے اپنے قریبیوں سے کم ملتا ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ اس وجہ سے بھاگے گا ان کی تکلیف اور عذاب دیکھنا اس پر دشوار ہوگا اور اپنے اندر شفاعت اور نیکیاں دینے کی ہمت نہیں پائے گا' ناچار ان کی نظروں سے چھپ جائے گا۔

اور صحیح یہ ہے کہ ان تمام وجوہات کی بناء پر بھاگے گا۔ بعض ایک وجہ سے' بعض دو وجہ سے اور بعض تینوں وجوہ کی بناء پر بلکہ اس دن ہر شخص اپنے حالات میں گرفتار ہوگا اور کسی اور کی طرف متوجہ نہیں ہوگا جیسا کہ فرمایا جا رہا ہے۔

اقول وباللہ التوفیق یہ عام مسلمانوں کے متعلق ہے' مقربین بارگاہِ خداوندی کے متعلق نہیں۔ چنانچہ یہ بات تو مفسر علام نے خود بھی دورانِ تفسیر لکھی ہے کہ اہلِ اللہ شفاعت سے بھاگیں گے نہیں بلکہ شفاعت کریں گے جیسا کہ سورۃ الجن کی آیت فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا لکھا ہے کہ ایمان والے گناہ گاروں کی انبیاء علیہم السلام' شہداء اور اولیائے اللہ شفاعت فرمائیں گے۔ پتہ چلا کہ حضرت کے نزدیک مندرجہ بالا وجوہ کا تعلق ان اہلِ اللہ سے نہیں ہے۔ نیز امام اصفہانی نے اپنی سند سے حضرت ابوامامہ باہلی رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ (قیامت کے دن) عالم اور عابد کو لایا جائے گا' عابد کو حکم ہوگا کہ جنت میں داخل ہو جاؤ جبکہ عالم سے فرمایا جائے گا قف حتی تشفع للناس یعنی یہاں ٹھہرو تا کہ لوگوں کی شفاعت کرو۔ (محمد محفوظ الحق غفرلہ ولوالدیہ)

(ناقلاعن الحديقة الندية في شرح الطريقة المحمديه)

لِكُلِّ امْرِئٍ مِّنْهُمْ يَوْمَئِذٍ شَاْنٌ يُّغْنِيْهِ ان قریبیوں میں سے کہ جن کا ذکر ہوا ہر کسی کی ایسی حالت ہوگی کہ اسے غم اور تشویش اٹھانے کے لیے ہی کافی ہوگی اور وہ یہ فرصت ہی نہیں پائے گا کہ اپنے علاوہ کسی اور کی طرف متوجہ ہو اور اس کی خبرگیری کرے اور جب حادثہ ایسا ہوگا تو لوگ عزت و ذلت میں مختلف ہوں گے۔

وُجُوْهٌ يَّوْمَئِذٍ چند چہرے اس روز مُّسْفِرَةٌ روشن اور چمک دار ہوں گے اس وجہ سے کہ نورِ ایمان ان کے باطن سے ان کے ظاہر پر جلوہ گر ہوا اور ان کے چہروں کو روشن کر دیا۔

ضَاحِكَةٌ ہنستے ہوں گے انعام و اکرام کی توقع کی بدولت جس کے آثار اپنے اوپر

دیکھ رہے ہیں۔

مُّسْتَبْشِرَةٌ شاداں اور خوش ہوں گے اس وجہ سے کہ دَم بدم انعام واکرام میں ترقی پا رہے ہیں اور خوشی کی تازگی کے اسباب روز بروز بڑھ رہے ہیں۔

وَوُجُوهٌ يَّوْمَئِذٍ اور اس روز کئی چہروں عَلَيْهَا غَبَرَةٌ پر سیاہی اور غبار ہوگا' گناہوں کی تاریکی ظاہر ہونے کی وجہ سے جو ان کے باطن میں پیوست تھی اور اب وہ باہر آ گئی۔

تَرْهَقُهَا قَتَرَةٌ اس تاریکی کے اوپر سیاہی ہوگی اور یہ سیاہی اگرچہ کفر کا اثر ہے اور کفر تہ دل میں جگہ رکھتا ہے کیونکہ گناہوں کی تاریکی سے بھی زیادہ مخفی ہے لیکن کفر کے غلبے کی وجہ سے غالب ہو کر ظاہر ہونے میں گناہوں کی تاریکی سے بالاتر آئے گی جیسے سیاہ تیل کہ اسے جتنا بھی پانی کے نیچے رکھیں' اوپر آتا ہے۔

أُولَٰئِكَ هُمُ الْكَفَرَةُ الْفَجَرَةُ یہ تاریک اور سیاہ چہروں والے لوگ وہی ہیں کافر بدکار کہ کفر بھی کرتے تھے اور گناہ بھی اور انتہائی ذلت وحقارت کے مستحق ہوئے اور ان کی انسانیت کسی طور موجب اکرام نہ ہوئی۔ باوجودیکہ دنیا میں ابتدائے پیدائش میں وہ بھی مکرم و معظم تھے اور عنایاتِ خداوندی انہیں پرورش کرنے میں مصروف رہیں اور ایسے دو رنگوں کو جمع کرنا ان لوگوں کا خاصہ ہے جنہوں نے کفر بھی کیا اور فجور بھی اور جو صرف کفر یا محض فجور میں مبتلا تھے' ان کے حق میں ایک رنگ ہی کافی ہوگا' فجور کا رنگ تاریک اور گدلا ہے جبکہ کفر کا رنگ خالص سیاہ۔

جواب طلب سوال

یہاں ایک سوال باقی رہ گیا اور وہ یہ ہے کہ اس سورۃ کی ابتدا میں دربارِ خداوندی سے اسے رسولِ عظیم صلی اللہ علیہ وسلم پر عتاب مذکور ہے تو اس واقعہ کو قرآن مجید میں اُتارنے کی کیا حکمت ہے' ظاہری عقل میں یوں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس عتاب وخطاب کو زبان جبرئیل علیہ السلام کے ذریعے خفیہ طور پر ارشاد فرمایا جاتا جو کہ رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کہہ دیتے حالانکہ یہ قرآن پاک میں نازل ہوا اور صدیوں سے قاریوں اور تلاوت کرنے والوں کی زبان پر اس کا ذکر ہو رہا ہے اور یہ واقعہ بار بار لوگوں کی یاد میں آتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہ واقعہ اور یہ عتاب بے شمار فوائد پر مشتمل ہے جیسے آدابِ تعلیم، بیان قوانین اور حسن اخلاق تو چاہا کہ اس واقعہ کو اس کے تمام فوائد سمیت قرآن پاک کا جزو بنا دیا جائے تا کہ لوگ ہر لحہ اس سے بہرہ ور ہوں اور محروم نہ رہیں۔

اس واقعہ کے فوائد

اس واقعہ کے فوائد میں سے چند ایک کا ہم یہاں ذکر کرتے ہیں اور باقی سننے والے کی روشن فراست اور صحیح سمجھ کے حوالے کرتے ہیں۔

پہلا فائدہ یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام بھی کبھی اجتہاد کرتے ہیں اور اپنی قوتِ عقلی کے ساتھ قواعد شریعت سے کوئی حکم نکالتے ہیں اور اس حکم میں انہیں عنایتِ خداوندی سے منشا قدرت کی طرف رہنمائی کی جاتی ہے جیسا کہ اس واقعہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے یوں سمجھا کہ نفع عام کو نفع خاص پر مقدم رکھنا چاہیے اور دعوتِ اسلام کو تعلیم قرآن پاک پر ترجیح دی جانی چاہیے اور اس راہ سے بھٹکے ہوئے لوگوں کو مائل کرنا چاہیے اور یہ کہ جو خود بخود طالب اور شوقین ہے اس کے حال پر فی الفور اتنی توجہ کی ضرورت نہیں کہ اس کی طلب آخر اسے منزل آشنا کر دے گی اور یہاں یوں رہنمائی فرمائی گئی کہ اس صورت میں نفع عام کا گمان تھا جبکہ نفع خاص معلوم تھا۔ نفع عام اس وقت نفع خاص پر مقدم ہے جب دونوں معلوم ہوں یا دونوں موہوم۔ موہوم کو معلوم پر ترجیح نہیں ہے اور دعوت اسلام کو بھی تعلیم قرآن پر اس وقت ترجیح دی جائے۔ دعوت کی قبولیت متحقق ہو اور جب قبولیت کا گمان نہ ہو تو حجت ایک مرتبہ ہی قائم کرنا کافی ہے۔ مبالغہ، اصرار اور دوسرے ضروری امور سے مشغول ہونے کی ضرورت نہیں ہے اور اسی طرح بھٹکے ہوؤں کو رام کرنا اس وقت ضروری ہے کہ ان کے رام ہونے کی توقع ہو اور توقع نہ ہونے کی صورت میں کوئی ضرورت نہیں اور اس کے علاوہ جب اچھا مقصد بظاہر مقصد فاسد کے ساتھ مشتبہ ہو جائے تو وہ اچھا مقصد بھی حکم شرع کے ساتھ چھوڑ دینا چاہیے۔

یہاں اغنیاء کے دلوں کو مائل کرنا اور کمزوروں، بے نواؤں اور نابینا گداؤں سے بے توجہی ریا اور دنیاداروں کی پاس خاطر کی تہمت کا مقام ہوتا۔ اس وقت اچھے مقصد کو بھی نظر انداز کر دینا چاہیے۔ اتقوا مواضع التھم یعنی تہمت کے مقام سے بچو۔

دوسرا فائدہ یہ ہے کہ جس کی تعظیم ضروری ہو اس کی تعظیم کی رعایت لازماً کی جائے اگر چہ وہ اس تعظیم پر مطلع نہ ہو۔ اس لیے کہ وہ نابینا صحابی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چہرۂ انور کی کیفیت سے کہ منقبض ہے یا خنداں۔ میری طرف متوجہ ہیں یا غیر متوجہ' مطلع نہیں تھے کہ انہیں تکلیف ہوتی لیکن چونکہ صاحبِ ایمان اور طالب راہِ خدا تھے' ان کا احترام ضروری ہوا۔ اسی لیے حدیث شریف میں وارد ہے کہ ترك السلام علی الضرير خيانة یعنی نابینے کو سلام نہ کہنا حق اسلام کی خیانت ہے اس لیے کہ اگر وہ سلام نہ کہنے کی وجہ سے رنجیدہ نہیں ہوا' خود اسلام کا حق تلف ہوا۔

چوتھا فائدہ یہ ہے کہ کفار کی طرف مائل ہونے کی اگر چہ اچھے مقصد کے اعتبار سے شرعی طور پر رخصت ہے لیکن نقصان سے خالی نہیں۔

پانچواں فائدہ: مسلمان سے بے توجہی اگر چہ بلا قصد ہو' درست نہیں۔

چھٹا فائدہ: دوستوں پر عتاب اور ان کی کوتاہیوں پر تنبیہ ضرور کرنا چاہیے کہ دوستی کے باقی رہنے کی علامت ہے۔ ويبقى الودما بقي العتاب یعنی جب تک عتاب و شکایت باقی ہے' دوستی بھی باقی ہے عتاب اس وقت ترک کیا جاتا ہے جب دوستی ختم کرنا مقصود ہو۔

ساتواں فائدہ اگر کسی کو کسی عہدہ پر مقرر کریں اگر چہ مقرب دربار اور عالی مقام ہو' اس کے احوال کی باز پرس اور اعمال کے تجسس سے غفلت نہ کی جائے کہ یہ خبر گیری بادشاہی کی شرط اور جہانبانی کے لیے لازم ہے۔ عہدہ داروں اور کارکنوں کو مطلق العنان کرنے سے مملکت کے کام میں رخنہ پڑتا ہے۔

آٹھواں فائدہ کوئی فقیر بھی ہو اسے حقیر نہ سمجھا جائے' کیا پتہ اس کا خدا تعالیٰ کے حضور کیا مرتبہ ہے۔

خاکسارانِ جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی کہ دریں گرد سوارے باشد

نواں فائدہ: طالبِ علم کو رکاوٹوں کے باوجود طلب علم سے باز نہیں رہنا چاہیے۔ اس لیے کہ وہ نابینا' فقیر بھی تھا اس کا ہاتھ پکڑنے والا بھی کوئی نہ تھا پھر بھی طلب علم کی خاطر دربار

سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم میں آتا تھا اور اگر لوگ علم کی طلب اور خدا تعالیٰ کی راہ کی تلاش میں رکاوٹوں کا بہانہ کریں تو یہ کام ہرگز میسر نہ ہوگا۔ اس لیے کہ اپنی آمدنی کے اندازے پر کوئی شخص بھی رکاوٹوں سے خالی نہیں ہوتا۔

دسواں فائدہ: یہ ہے کہ استاد اور مرشد کو چاہیے کہ طالب علم اور راہِ حق کے طالب پر جیسا بھی ہو شفقت اور توجہ فرمائے اور جو چاہتا ہے' اسے فائدہ پہنچائے۔

گیارہواں فائدہ: یہ ہے کہ معلم اور مرشد کو چاہیے کہ طالب علموں اور رشد و ہدایت حاصل کرنے کے لیے آنے والوں میں دنیوی بڑائی' مال اور مرتبہ کا فرق نہ کرے بلکہ شوق اور حرص کی کثرت اور قوتِ استعداد کی بناء پر امتیاز عطا کرے۔

بارہواں فائدہ یہ ہے کہ اگر کسی ضعیف کو کسی بزرگ کی طرف سے کسی وجہ سے کوئی رنج پہنچے تو اس بزرگ کو چاہیے کہ فوراً اس کا تدارک کرے اور یہ اس بزرگ کے مرتبے کے منافی نہیں بلکہ اس مرتبے کی بلندی میں زیادتی کا باعث ہے اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ان آیات کے نازل ہوتے ہی اس نابینے کے پیچھے خود جلدی جلدی تشریف لے گئے اور ان رئیسوں اور سرداروں کی کوئی پرواہ نہ فرمائی جو کہ آپ کی محفل میں بیٹھے تھے اور کیا ہی اچھا کہا گیا ہے

تواضع ز گردن فرازاں نکوست
گدا گر تواضع کند خوئے اوست

یعنی بلند مرتبے والے تواضع کریں تو بہت ہی اچھا کام ہے اگر منگتا تواضع کرے تو یہ تو اس کی عادت ہے۔

تیرہواں فائدہ یہ ہے کہ جب رنجیدہ کو راضی کریں تو چاہیے کہ اس کی اس قدر افزائی کی جائے اور گزشتہ معمول سے زیادہ اس کا اعزاز و اکرام کیا جائے تا کہ اس کے زخم کی مرہم ہو سکے۔ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نابینے کو واپس لا کر اپنی چادر مبارک پر بٹھایا اور فرمایا انت فی عیال محمد بابقیت یعنی جب تک تو زندہ ہے' میرے کنبے کے حکم میں ہے' تیرے اخراجات میں برداشت کروں گا۔

چودھواں فائدہ یہ ہے کہ قرآن مجید میں ان آیات کے باقی رہنے کا پتہ چلا کہ وحی الٰہی پہنچانے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم انتہائی امانت دار تھے ورنہ یہ عتاب وشکایت جو کہ آپ کی ذات پاک پر بہت گراں تھی' لوگوں تک نہ پہنچاتے جس طرح کہ حضرت اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ آپ نے ایسے مقام کے متعلق فرمایا ہے کہ اگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم وحی میں سے کچھ چھپاتے تو حضرت زینب رضی اللہ عنہا کا واقعہ چھپاتے کہ کمال حیا موجب تھا۔

پندرہواں فائدہ یہ ہے کہ طالب علم کو چاہیے کہ خدا کا خوف رکھنے والا ہو اس لیے کہ اللہ تعالیٰ نے اس طالب علم کے بارے میں بطورِ تعریف فرمایا ہے کہ اَمَّا مَنْ جَآءَ كَ يَسْعٰى وَهُوَ يَخْشٰى

سولھواں فائدہ یہ ہے کہ اس محفل میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے چچا عباس بن عبدالمطلب اور دوسرے رشتے دار حاضر تھے' ان کے ساتھ مل بیٹھنے پر عتاب ہوا۔ معلوم ہوا کہ اگر کسی شخص کے رشتے دار خدا تعالیٰ سے روگردانی کریں تو ان کے ساتھ نشست و برخاست نہیں ہونی چاہیے اور جو اجنبی طالب حق ہو' اس کے ساتھ مل بیٹھنا اور مصاحبت کرنا چاہیے کہ دوست کے دشمنوں کو دوست بنانا صحیح نہیں اور دوست کے دوستوں سے روگردانی محل عتاب ہے اسی لیے قرآن مجید میں دوسرے مقام پر فرمایا گیا ہے کہ لَا تَجِدُ قَوْمًا يُّؤْمِنُوْنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ يُوَآدُّوْنَ مَنْ حَآدَّ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَلَوْ كَانُوْٓا اٰبَآءَهُمْ اَوْ اَبْنَآءَهُمْ اَوْ اِخْوَانَهُمْ اَوْ عَشِيْرَتَهُمْ (۲۸۔۳)

اور یہاں سے معلوم ہوا کہ تعلیم وارشاد کے دوران بھی ذی استعداد اور شوق والوں کو رشتے داروں پر مقدم رکھا جائے۔

ستارھواں فائدہ یہ ہے کہ جس شخص کی وجہ سے ایک عمدہ مقصد جو کہ ادب ہے' حاصل ہوا اسے برا نہ سمجھیں جیسا کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس نابینا سے محبت فرمائی کہ اس کا احترام فرماتے اور مرحبا فرماتے اور اس کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ اللہ تعالیٰ توفیق دینے والا اور مدد کرنے والا ہے اور ہم اسی سے مدد چاہتے ہیں۔

سورۂ اذا الشمس کورت

مکی ہے' اس میں انتیس (۲۹) آیات' ایک سو چار (۱۰۴) کلمات اور پانسو تینتیس (۵۳۳) حروف ہیں اور صحیح حدیث پاک میں حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کی روایت کے ساتھ وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو چاہے کہ قیامت کے دن کو دنیا میں سر کی آنکھوں سے دیکھے' اسے چاہیے کہ سورۂ اذا الشمس کورت پڑھے۔ نیز حدیث پاک میں ہے کہ ایک دن حضرت امیر المومنین ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بارگاہِ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم میں عرض کی کہ یارسول اللہ! آپ کو بڑھاپا جلد آ گیا یعنی آپ کے مزاج شریف کی قوت سے مجھے یہ توقع تھی کہ اس عمر میں جو کہ ساٹھ (۶۰) سال کے لگ بھگ ہے' آپ پر بڑھاپے کے آثار ظاہر نہیں ہوں گے اس توقع کے خلاف ہوا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے ان پانچ سورتوں نے بوڑھا کر دیا ہے۔ سورۃ ہود' سورۃ واقعہ' سورۃ والمرسلات' سورۃ عم یتساءلون اور سورۃ اذا الشمس کورت۔ پس ان سورتوں میں اللہ تعالیٰ کے وہ عذاب مذکور ہیں جو کہ دنیا و آخرت میں انبیاء علیہم السلام کی مخالفت کی وجہ سے اُمتوں پر گزرے یا گزریں گے۔ مجھے ان عذابوں کا سنتے ہی میرا اُمت کا غم غلبہ کرتا ہے اور غم کا خاصہ یہ ہے کہ آدمی کو بوڑھا کر دیتا ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ

سألت الاطباء ذات يوم اخبرني
ماشيبني قال بلغم
فقلت له على غير اختتام
لقد اخطات فيما مكت بل غم

یعنی میں نے طبیبوں سے پوچھا کہ مجھے کس چیز نے بوڑھا کر دیا؟ اس نے کہا بلغم! میں نے بات کاٹتے ہوئے کہا کہ تو نے غلط کہا بلکہ غم نے۔

لیکن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے بڑھاپے سے مراد جسم کی ظاہری کمزوری ہے نہ کہ بالوں کی سفیدی اس لیے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے بال مبارک اتنے سفید نہیں ہوئے تھے کہ زیارت کرنے والے پر ظاہر ہوں۔ چنانچہ حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ جو کہ

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے خادم خاص ہیں' فرماتے تھے کہ آپ کے وصال پاک کے وقت سر مبارک اور ریش مبارک میں سفید بالوں کی تعداد بیس (۲۰) تک نہیں پہنچی تھی اور ظاہر ہے کہ یہ مقدار صرف دیکھنے والے کو معلوم نہیں ہوسکتی اور نہ ہی اتنے بالوں کو عرف میں بڑھاپا کہتے ہیں۔

سورۂ عبس کے ساتھ ربط کی وجہ

اور اس سورۃ کے سورۂ عبس کے ساتھ ربط کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ابتدا میں قرآن مجید کے اوصاف کا اس انداز میں ذکر فرمایا گیا ہے کہ كَلَّآ اِنَّهَا تَذْكِرَةٌ فَمَنْ شَآءَ ذَكَرَهٗ فِيْ صُحُفٍ مُّكَرَّمَةٍ مَّرْفُوْعَةٍ مُّطَهَّرَةٍ بِاَيْدِيْ سَفَرَةٍ كِرَامٍ بَرَرَةٍ جبکہ اس سورۃ کے آخر میں یہی مضمون معکوس ترتیب کے ساتھ مذکور ہے کہ انہ لقول رسول کریم ان ہوالا ذکر للعالمین نیز وہاں آخر میں قیامت' اس کے اوصاف اور سختیوں اور ہولناکیوں کا ذکر ہے کہ يَوْمَ يَفِرُّ الْمَرْءُ مِنْ اَخِيْهِ وَاُمِّهٖ وَاَبِيْهِ وَصَاحِبَتِهٖ وَبَنِيْهِ جبکہ یہاں وہی مضمون شرح وبسط کے ساتھ بیان ہوا ہے۔

وجہ تسمیہ

اس سورۃ کو سورۃ تکویر کا نام دینے کی وجہ یہ ہے کہ اس سورۃ کی ابتدا میں یہی حادثہ ذکر کیا گیا ہے کہ چاند کی روشنی زائل ہو جائے گی اور قیامت کے حادثوں میں سے کہ ان میں سے یہاں بارہ (۱۲) حادثے ذکر فرمائے گئے ہیں' یہ حادثہ سب سے سخت اور مشکل ہے۔

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب حادثہ کسی مقصود بالذات پر رونما ہوتا ہے تو وہ اس حادثے سے زیادہ سخت ہوتا جو کہ غیر مقصود بالذات پر رونما ہو مثلاً جان کا ضائع ہونا جو کہ آدمی کی مقصود بالذات ہے' مال کے ضائع ہونے سے زیادہ سخت ہے اس لیے کہ مال جان کو نفع پہنچانے کے لیے مطلوب ہے نہ کہ بالذات۔

نیز جب اس حادثے کے کوئی دوسرا حادثہ مقابل نہ ہو تو وہ اس حادثے سے زیادہ سخت ہو جاتا ہے جس کے کوئی حادثہ مقابل آ جائے کیونکہ مقابلہ کی صورت میں حادثہ کی شدت ہلکی ہو جاتی ہے۔ مثلاً ایک طرف سے ایک شخص کو جان کا خطرہ لاحق ہو اور دوسری طرف سے

اسے مرتبے اور مال کی زیادتی کی توقع دامن گیر ہو تو اس صورت میں جان والے حادثے کو شدید شمار نہیں کرتا اور پہلوتہی نہیں کرتا اور قیامت کے بارہ (۱۲) حادثوں میں سے کہ جنہیں اس سورۃ میں ذکر کیا گیا ہے' ہر حادثے نے یا غیر مقصود بالذات کو نقصان پہنچایا ہے۔ مثلاً کشط آسمان یعنی آسمان کو اپنی جگہ سے کھینچ لینا' آسمان کو خراب کر دے گا جبکہ دنیا والوں کی نسبت سے آسمان مطلوب بالذات نہیں ہے اس لیے کہ ان کا نفع یاب ہونا صرف ستاروں سے ہے' آسمان ایک صندوق سے زیادہ نہیں ہے کہ جس میں جواہر نفسیہ اور بلند قیمت سامان رکھا گیا ہے اگر صندوق ٹوٹ گیا اور جواہرات اور ساز و سامان باقی رہا تو اتنا گراں نہیں ہے۔

یا دوسرے حادثے کے مقابل ہے جو کہ مسرت اور فرحت کا موجب ہے مثلاً جہنم کو بھڑکانا کہ اس کے مقابلے میں جنت کو قریب کرنا بھی ہوگا۔ سوائے اس حادثہ کے (یعنی سورج کی روشنی ضائع ہونا) کہ مطلوب بالذات پر جو کہ سورج کی شعاعیں ہیں' صدمہ بھی پہنچائے گا اور اس کے مقابلے میں کوئی مسرت افزا اور حادثہ بھی موجود نہیں ہوگا۔

نیز سورج کو بے نور کرنا حالات کے انکشاف اور نفس انسانی کی جدائی کے اسباب میں سب سے عمدہ ہے کہ سورج کی شعاعوں کی چمک کی وجہ سے بصری محسوسات منکشف ہو جاتی ہیں اور معقولات اور وجدانیات کے ادراک سے رکاوٹ بن جاتی ہیں اور یہی وجہ ہے کہ معقولات میں غور و فکر کا وقت رات کو مقرر کیا گیا ہے اور خواب دیکھنے کا بھی یہی وقت ہے اور نفسانی کیفیات کی زیادتی کا وقت جو کہ عاشقوں اور فریفتہ لوگوں کو یا بیماروں اور دردمندوں کو یا مصیبت زدہ اور تکلیف میں مبتلا لوگوں کو پیش آتی ہیں' بھی وہی ہے اور اہلِ مراقبہ و توجہ بھی اسی وقت اپنی باطنی نسبتوں کو ترقی دیتے ہیں اور جادوگر اور نفسانی تاثیرات والے بھی اسی وقت مصروف کار ہوتے ہیں اور سمندر کو بھڑکانے اور پہاڑوں کے متحرک ہونے سے ستاروں کا تاریک ہونا بھی اس حادثے کے پہلو میں کوئی مرتبہ نہیں رکھتا کہ ستارے اکثر تاریک اور بے نور ہو جاتے ہیں اور سمندر بنی آدم کی ضرورتوں میں اتنا نفع بخش نہیں ہے کہ اسے مطلوب بالذات شمار کیا جا سکے۔ علیٰ ہذا القیاس پہاڑ اور دوسرے حوادث کی سختی خود ظاہر ہے۔

ہم یہاں پہنچے کہ ان بارہ (۱۲) حادثوں کو یہاں خصوصیت کے ساتھ کیوں بیان فرمایا گیا ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں نفسِ انسانی کا پسندیدہ اور نقصان دہ چیزوں پر توجہ کرنے سے منقطع ہونے اور اس کے شعور وفہم کے آسمانی ارواح کی مدد سے کشادہ ہونے واعمال کی مثالی صورتوں کے ظاہر ہونے اور اچھے بُرے کاموں میں سے ہر ایک کی جزا کی مقدار کے کھلنے جو کہ علمت نفس ما احضرت کا مضمون ہے' کا بیان کرنا منظور ہے اور ان بارہ (۱۲) حادثوں میں سے ہر ایک اس کام میں کچھ دخل رکھتا ہے۔ پس سورج کو لپیٹنے اور ستاروں کے تاریک ہونے کی وجہ سے نفسِ انسانی کا تعلق آسمان کے ساتھ جو کہ اپنی ضروریات میں تھا' منقطع ہو جائے گا اس لیے کہ اس کا دیکھنے کی حس' فصلوں اور موسموں کے اختلاف' مہینوں اور چاندوں کے بدلنے اور مستقبل کے حادثوں کو قبل وقت پہچاننے میں نفع لینا صرف انہی جرموں کی شعاعوں اور حرکات کی وجہ سے تھا اور اس کے مانوس جہان کی چھت اس انقلاب سے خراب ہو جائے گی اور پہاڑوں کے چلانے اور زمین کے ہلنے کی وجہ سے زمین میں رہنے' معدنیات نکالنے' کھیتیاں اور پھل اُگانے' چشمے جاری کرنے اور نہریں جاری کرنے سے اس کی امید ٹوٹ جائے گی اور اس کے گھر کا صحن بربادی کی طرف چلا جائے گا اور اونٹنیوں کو بے کار چھوڑنے کی وجہ سے اس کی توجہ گھریلو حیوانات حاصل کرنے' دودھ' گھی' پشم' اون' نسل اور اولاد حاصل کرنے کی طرف سے سست ہو جائے گی اور اس انقلاب سے گویا اس کا باورچی خانہ اور اس کے گھر کا خزانہ خراب ہو جائے گا اور وحشی جانوروں کے جمع ہونے کی وجہ سے خشکی کے جانوروں کا شکار کرنے اور انہیں مسخر کرنے اور ان نفعوں سے جو کہ کھال' پشم' مشک نافہ اور ان کے دوسرے اجزا سے لیتا تھا' سے اس کی ہمت منقطع ہو جائے گی اور دریاؤں کے بھڑک اُٹھنے کی وجہ سے کشتی کے سفر' بحری تجارتوں' حیوانات کے شکار اور موتی مونگا' عنبر اور عقیق نکالنے سے مایوس ہو جائے گی اور یہ چھ (۶) حادثے عالمِ دنیا اور جسمِ انسانی کے امور کے ساتھ وابستہ ہیں۔

اور اس کے بعد اچھے نفوس کے اپنے ہم جنسوں اور شریر نفوس کے اپنے ہم جنسوں کے ساتھ ملنے اور ایک کی کیفیاتِ نفسانیہ ۔ کے دوسرے کے دل پر منعکس ہونے کی وجہ سے اپنی

وجدانیات ہر کسی کے سامنے زیادہ واضح طور پر جلوہ گر ہوں گی اور وہ اپنے آپ کو اجمالی طور پر اہلِ خیر اور اہلِ شر سے پہچان لے گا اور زندہ درگور کی گئی لڑکی کو پوچھنے کی وجہ سے کہ جس کی جان اس جہان سے بہت سادہ گئی ہے' معلوم کر لے گا کہ اس جہان انسانی شعور وفہم میں بہت کشادگی آ گئی ہے کہ اس طرح کی بے نقش تختیوں پر بھی سوال و جواب کے نقوش ظاہر ہو گئے ہیں۔ نیز وہ دریافت کر لے گا کہ یہاں اگرچہ حقوق ضائع کرنے کے لیے پدری مادری شدید تعلقات درمیان میں ہوں' ہر چھوٹے بڑے کے حقوق کو پورے طور پر حاصل کرنے کا معاملہ بے کار اور فضول نہیں چھوڑا جائے گا اور اعمال ناموں کے کھلنے کی وجہ سے اپنے افعال واقوال کی تفصیل دریافت کر لے گا۔

اور آسمان کو کھینچنے کی وجہ سے جو کہ عالم مثال کی تجلی سے کنایہ ہے کہ اس قوتِ خیالیہ کا خزانہ اور اصل افلاک ہیں' اپنے اعمال کی مثالی صورتیں دیکھے گا اور اسے حقیقت حال کا سراغ مل جائے گا کہ میں نے اندھیری رات میں کیا گل کھلائے۔

اور دوزخ کی آگ بھڑکانے اور جنت کو آرائش وزیبائش کے ساتھ قریب لانے کی وجہ سے ان اعمال کی جزا کی مقدار جو کہ ان کی مثالی صورتوں کا تقاضا ہے' پورے طور پر روشن ہو جائے گی اور اس وقت علمت نفس ما احضرت کا مضمون جلوہ گر ہو جائے گا اور ان چھ (٦) انقلابات کا تعلق عالم آخرت اور انسان کی عقلی اور خیالی قوتوں کے ساتھ ہے اور اس تقریر سے اس ترتیب کی رعایت کی وجہ بھی واضح ہو گئی۔ نیز ثابت ہو گیا کہ عالم برزخ میں نفسِ انسانی کو جسم سے جدا ہونے کے باوجود اپنے اعمال کے حالات کی اطلاع ممکن نہیں ہے اس لیے کہ ابھی آسمان اور زمین قائم ہیں اور اس کا اپنے مساکن اور مانوس چیزوں سے تعلق' اپنے اقارب اور بنی نوع کے حالات سے توجہ اور اپنے گزشتہ حالات کو یاد کرنا منقطع نہیں ہوا اور اسے خلوص وکمال کے ساتھ جہانِ غیب کے ساتھ ملنا حاصل نہیں ہوا اسی لیے اسے عالم برزخ کہتے ہیں کہ ایک وجہ سے دنیا کے احکام رکھتا ہے اور ایک وجہ سے آخرت کے احکام جیسا کہ ایک شخص کسی شہر یا ملک میں ایک مدت تک سکونت اختیار کر کے کسی دوسرے شہر یا ملک کی طرف منتقل ہو گیا اور ابھی اس کا گھر پہلے شہر میں موجود ہے اور اس کے

عزیز وا قارب وہاں رہتے ہیں اور وہاں خط وکتابت اور آمد ورفت رکھتا ہے اس حالت میں اس کی اس شہر سے پورے طور پر منقطع ہونے کی صورت نہیں بنتی۔

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ جب کہ سورج لپیٹ دیا جائے اور لغتِ عرب میں تکویر کا معنی کسی چیز کے اردگرد لپیٹنا ہے جیسے دستار یا رسی کہ اسے گول دائرہ کی صورت میں لپیٹتے ہیں اور کور العمامہ بمعنی دستار کا پیچ اسی لفظ سے ہے اور چونکہ سورج کی شعاعیں وسیع ہیں اور انہیں دور کرنے کو ذہن میں دستار لپیٹنے کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے اور اس لفظ کو بطورِ استعارہ استعمال فرمایا گیا ہے۔ گویا جب تک اس کی شعاعیں وسیع تھیں' کپڑے کے تھان کی طرح تھیں کہ اسے کھول کر ڈال دیا گیا ہے اور جب اس کی شعاعیں زائل ہو گئیں اور اس کا جسم پنیر کی چکی کی طرح بے نور رہ گیا گویا کہ اس تھان کو لپیٹ دیا گیا۔

اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ الشمس القمر نوران ومکوراں یوم القیامۃ یعنی سورج اور چاند قیامت کے دین پنیر کی دو چکیوں کی طرح بے نور ہو جائیں گے اور بعض روایات میں ثوران عقیران واقع ہوا یعنی دو از کار رفتہ بیلوں کی طرح گر پڑیں گے اور ان کی سیر اور گردش ختم ہو جائے گی اور لغتِ عرب میں ثور بیل کو بھی کہتے ہیں اور پنیر کے چکتے کو بھی اور جب ستاروں کی ارواح کا ان کے اجسام سے تعلق منقطع ہو جائے گا تو شعاع اور روشنی بھی زائل ہو جائے گی اور سیر اور گردش بھی ختم ہو جائے گی۔ شعاع زائل ہونے پر نظر کرتے ہوئے پنیر کے چکتہ کی طرف نسبت کر دی گئی اور کبھی حرکت ختم ہونے پر نظر کرتے ہوئے از کار رفتہ بیل کے ساتھ تشبیہ دے دی گئی اور اگرچہ حدیث شریف کے مطابق سورج اور چاند اس حادثے میں شریک ہوں گے لیکن یہاں صرف تکویر آفتاب کے ذکر پر اکتفاء کیا گیا اس لیے کہ سورج کی شعاع ہے جو کہ چاند کے تاریک جسم کو نور اور روشنی بخشتی ہے تو تکویر آفتاب تکویر ماہتاب کو لازم کرتی ہے' علیحدہ بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔

وَاِذَا النُّجُوْمُ انْكَدَرَتْ اور جب ستارے تاریک ہو جائیں اور ان کا نور زائل ہو جائے۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا ہے کہ

ستارے نور کی زنجیروں کے ساتھ لٹکنے والی قندیلوں میں ہیں اور ان قندیلوں کی زنجیریں فرشتوں کے ہاتھوں میں ہیں جب فرشتے فوت ہوں گے تو وہ قندیلیں ان کے ہاتھوں سے چھوٹ جائیں گی اور ستارے بکھر کر گر پڑیں گے اور ان کا نور زائل ہو جائے گا۔ پس اس سورۃ میں اس انقلاب کی انتہا بیان کی گئی ہے جو کہ ستاروں پر رونما ہوگا جبکہ اگلی سورۃ میں انقلاب کی ابتدا کا بیان ہے اور لفظ نجوم اور کواکب کا اختلاف اسلوب کلام کے تعین کے لیے ہے اور اس لیے بھی کہ لفظ نجم میں چمک ظاہر ہونے کا پتہ سمجھ میں آتا ہے۔ پس اس کے مناسب انکدار یعنی تاریک ہونا ہے جبکہ کوکب کے لفظ میں قائم اور راسخ رہنے کا پتہ لگتا ہے پس اس کے لائق انتشار یعنی منتشر ہونا ہے۔

وَاِذَا الْجِبَالُ سُیِّرَتْ اور جب پہاڑ چلا دیے جائیں اور وہ بادلوں کی طرح ہوا میں اُڑا دیے جائیں جبکہ پہاڑ فرش کے پتھر اور زمین کے لنگر کی طرح تھے جب ان کی حالت یہ ہوگئی تو قیاس کر لیا جائے کہ زمین کی حالت کیا ہوگی۔

وَاِذَا الْعِشَارُ عُطِّلَتْ اور جب دس ماہا باردار اونٹنیوں کو بے کار چھوڑ دیا جائے اور ان کے مالک ان پر توجہ نہ کریں اور ایسی اونٹنی کا خصوصیت سے ذکر کرنے کی وجہ یہ ہے کہ نفسِ انسانی کے تعلق کا اپنے اموال سے منقطع ہونے کا بیان مقصود ہے اور جن اموال کی نگہداشت اور خبرگیری کی زیادہ تر ضرورت ہے' وہ جانور ہیں اس لیے کہ نقدی' جواہرات اور سامان کی ہر وقت نگہبانی اور خبر گیری کی ضرورت نہیں ہوتی اور کھیتی باڑی' درخت' عمارات اور گھروں کی حفاظت بھی چاہیے مگر ہر لحظہ اور ہر گھڑی نہیں۔ بخلاف جانور کہ ہر وقت باندھنے' کھولنے' سائے سے دھوپ میں اور دھوپ سے سائے میں لانے اور چارہ' پانی اور دوسری ضرورتوں کے محتاج ہوتے ہیں۔ اسی بناء پر تجربہ کاروں نے کہا ہے کہ اگر تجھے کوئی غم نہیں ہے تو بکری خرید لے اور جانوروں میں سے ایسی اونٹنی عربوں کے نزدیک سب سے زیادہ قیمتی ہے کہ انہیں اس وقت اس سے بچے اور دودھ کی توقع ہوتی ہے۔ جثہ بڑا ہونے کی وجہ اس کا دودھ دوسرے جانوروں کے دودھ سے کہیں زیادہ ہو جاتا ہے اور جب اس مبنی بر ہدایت کلام کے پہلے مخاطب عرب ہیں ناچار اس چیز کی رعایت ضروری ہوئی جو کہ ان کے

ذہنوں میں جاگزیں ہے اور ان کے خیال کے خزانے میں غالب طور پر اس کی صورت حاضر رہتی ہے کیونکہ بلاغت کا تقاضا یہی ہے۔

ایک اُلجھن اور اس کا حل

یہاں ایک اُلجھن ہے جسے بعض ذہین لوگ مشکل اور سخت جانتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ اس کے بعد کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام صور پھونکیں' جانور مر جائیں گے تو اونٹنیاں کہاں ہوں گی کہ بے کار چھوڑی جائیں اور صور پھونکنے سے پہلے قیامت کا دن نہیں ہے کہ اونٹنیاں بے کار چھوڑی جائیں۔ پس یہ کس وقت کی حکایت ہے اکثر دانش وروں نے کہا ہے کہ یہ کلام فرض اور خیال کے طور پر ہے یعنی اگر بالفرض اس وقت ایسی اونٹنیاں موجود ہوں تو اس دن کی ہولناک صورت کے پیش نظر ان کے حال پر کوئی توجہ نہ کرے جیسا کہ یَوْمَ یَجْعَلُ الْوِلْدَانَ شِیْبًا میں اسی طرح کہا گیا ہے لیکن غور وفکر کے بعد معلوم ہوتا ہے کہ یہاں اس تکلف کی ضرورت نہیں ہے اس لیے کہ جب حضرت اسرافیل علیہ السلام پہلا صور پھونکیں گے' آدمی باردار اونٹنیوں سمیت ایک جگہ مر جائیں گے اور جب دوسری مرتبہ پھونکیں گے سب ایک جگہ زندہ ہو جائیں گے جو اونٹنیاں کہ دس ماہ سے باردار ہوں گی' وہ بھی اسی صورت میں زندہ ہوں گی جیسا کہ حدیث صحیح میں ہے کہ یُحْشَرُ النَّاسُ یَوْمَ الْقِیَامَةُ عَلٰی مَا مَاتُوْا عَلَیْہِ اور اس وقت ان اونٹنیوں کے مالک ان پر کوئی توجہ نہیں دیں گے اور بے کار چھوڑ دیں گے۔

اور بعض اہلِ تفسیر نے کہا ہے کہ عشار سے مراد بادل ہیں اس لیے کہ عرب لوگ بادل کو باردار جانور کے ساتھ منسوب کرتے ہیں اور ان کے خیال میں بادل کو مادہ کی شکل اور ہوا کو نر کی صورت حاصل ہے جس طرح نر مادہ کے ساتھ ملنے سے اسے باردار کرتا ہے اسی طرح ہوا بادل کو باردار کرتی ہے۔ پس معنی یہ ہوا کہ اس وقت بادل پانی سے خالی ہو جائیں اور کسی کام نہ آئیں اور اس تفسیر میں حقیقت سے جو دُوری ہے' ظاہر ہے اور عشار' عشراء کی جمع ہے جیسا کہ نفاس نفساء کی جمع ہے اور عشراء اس اونٹنی کو کہتے ہیں جو دس ماہ سے باردار ہو' سال پورا ہونے تک جو کہ اونٹنی کی پوری مدت حمل ہے' اسے اسی نام کے ساتھ ذکر کیا جاتا ہے۔

وَاِذَا الْوُحُوْشُ حُشِرَتْ اور جب پہاڑی اور جنگلی وحشی جانور جمع کیے جائیں اور انہیں جمع کرنے کی وجہ یہ ہے کہ ان کا ٹھکانہ پہاڑ اور جنگل تھے' وہ برباد ہو جائیں گے اور ہر طرف سے آگ اور دُھواں ان کا تعاقب کرے گا۔ ناچار لوگوں کے مجمع میں امن کی جگہ سمجھ کر بھاگ آئیں گے جس طرح کہ سرد ملکوں میں بارش اور برف باری کے موقعوں پر اس قسم کے جانور اپنی طبع اصلی کو جو کہ نفرت اور وحشت ہے' چھوڑ کر آبادیوں کا رُخ کرتے ہیں اور اس واقعہ سے صریح دلیل ملتی ہے کہ اس دن کا خوف اس قدر ہوگا کہ وحشی جانوروں کو انسان سے نفرت نہیں رہے گی اور بعض کو بعض کے ساتھ جو طبعی عداوت تھی' وہ بھی پرہیز اور ضرر دینے کا باعث نہ ہوگی۔

قتادہ اور دوسرے مفسرین نے کہا ہے کہ وحشی جانوروں کو جمع کرنے سے مراد مرنے کے بعد انہیں زندہ کرنا ہے کہ قصاص کے لیے انہیں زندہ کیا جائے گا اور حدیث شریف میں ہے کہ جانوروں کے درمیان بھی قصاص جاری ہوگا یہاں تک کہ بے سینگ بکری کو سینگ والی بکری سے قصاص دِلایا جائے گا لیکن قصاص جاری کرنے کے بعد سب کو خاک کر دیا جائے گا اور وہ جو خدا تعالیٰ کے نام پر ذبح ہوئے ہیں' جنت کی خاک بنیں گے۔

چند قسم کے جانور جنت میں اور چند قسم کے جہنم میں ہوں گے

مگر جو جانور جنتیوں کے سرور اور لذت کا باعث ہوں گے' جنت میں باقی رہیں گے جیسے مور' گھوڑا اور دوسرے بھلے معلوم ہونے والے اور اچھی آواز والے جانور یا وہ جانور جن کا گوشت جنتیوں کو مرغوب ہوگا' ان کی غذا کے لیے جنت میں رکھے جائیں گے۔ چنانچہ قرآن مجید کی سورۂ واقعہ میں مذکور ہے وَلَحْمِ طَيْرٍ مِّمَّا يَشْتَهُوْنَ اور جو جانور جہنمیوں کے عذاب میں زیادتی کا باعث ہوں گے جہنم میں جائیں گے جیسے سانپ' بچھو اور مکھی جو کہ جلے ہوئے اعضاء پر بیٹھے گی اور تکلیف دے گی۔ جبکہ ان جانوروں کو جہنم کی آگ سے کوئی تکلیف نہیں ہوگی اسی لیے حدیث شریف میں وارد ہے کہ الذباب کلہ فی النار سب کی سب مکھیاں جہنم میں ہیں۔ نیز حدیث صحیح میں ہے کہ ان فی الجنة طیرا انا عمة واکلها انعم منها جنت میں نرم و نازک جانور ہوں گے اور ان کا ذائقہ ان سے بھی زیادہ فرحت

افزا ہوگا۔

وَاِذَا الْبِحَارُ سُجِّرَتْ اور جبکہ دریا بھڑکائے جائیں گے اور ان کا پانی، دھواں اور آگ ہو جائے گی اور اس آگ اور دھوئیں کے ملنے کی وجہ سے ہوا، گرمی اور حرارت پیدا کرے گی اور اہلِ محشر کی تکلیف کا باعث ہوگا لیکن ایمان والے اس دھوئیں کے شر سے محفوظ رہیں جیسا کہ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ ایمان والوں کو وہ دھواں اسی قدر پہنچے گا جو کہ بیان ہوگا۔

وَاِذَا النُّفُوْسُ زُوِّجَتْ اور جبکہ نفوس انسانی آسمانی اور زمینی نفوس کے ساتھ باہم ملائے جائیں تا کہ خیر وشر کے ادراک کی قوت میں اضافہ ہو اور وہ ہر عمل کی پوری جزا مکمل طور پر چکھیں اور بعض نے کہا ہے کہ نفوس کو ملانے سے مراد روحوں کا جسموں کے ساتھ ملنا ہے اور بعض نے کہا ہے کہ مراد یہ ہے کہ لوگوں کو تین قسموں میں تقسیم کیا جائے جس کی تفصیل سورۂ واقعہ کی آیت کُنْتُمْ اَزْوَاجًا ثَلٰثَۃً میں مذکور ہے اور بعض نے کہا ہے کہ ہر کسی کو اپنے ہم مشرب اور ہم مذہب لوگوں کے ساتھ جمع کر کے جدا جدا گروہ بنا دیا جائے گا اور اس ترتیب میں اچھے برے طبقات کی رعایت کی جائے گی۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ایک شخص کو نیکوں اور بروں میں سے جس کے ساتھ دنیا میں زیادہ میل جول ہوگا، جمع کیا جائے گا جیسے پیر، استاذ، بادشاہ اور امیر۔ حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ ایمان والوں کو حورعین کے ساتھ اکٹھا کریں گے جبکہ کفار کو شیطانوں کے ساتھ ملائیں گے اور زجاج نے کہا ہے کہ ہر نفس کو اس کے اچھے برے اعمال کی مثالی صورتوں کے ساتھ ملائیں گے۔

وَاِذَا الْمَوْءٗدَۃُ سُئِلَتْ اور جبکہ موءودۃ سے پوچھا جائے اور لغتِ عرب میں موءودۃ اس لڑکی کو کہتے ہیں جسے درگور کر دیں۔ وءد ئید سے مشتق ہے اور عرب میں دستور تھا کہ لڑکیوں کو پیدا ہوتے ہی درگور کر دیتے تھے۔ بعض غربت، بھوک اور اخراجات کی کثرت کی وجہ سے جو کہ لڑکی کی شادی اور جہیز کی وجہ سے لازم آتے ہیں، ایسا کرتے تھے اور بعض عار لاحق ہونے اور اپنے سے کم مرتبہ لوگوں سے رشتہ داری اور دامادی کا تعلق حاصل ہونے کے

خوف اوران کی جفا کی برداشت گراں سمجھنے کی وجہ سے یہ کام کرتے تھے۔ اوراس وقت اُن علاقوں میں یہ خبیث کام یہاں تک رائج ہو چکا تھا کہ اسے فخر اور غیرت شمار کرتے تھے اور اس پر عذاب کا بالکل خوف نہیں رکھتے تھے اس گمان سے کہ ہماری اولاد بمنزلہ ملکیت مال ہے جیسے ہم چاہیں' ان میں تصرف کریں۔ حق تعالیٰ نے قرآن مجید میں جگہ جگہ اس انتہائی بُرے کام کی مذمت فرمائی ہے اوراس کی قباحت کی وجوہ کی وضاحت فرمائی کہ اس فعل کے ضمن میں سب سے قریبی رشتے دار جو کہ اولاد ہے' کی قطع رحمی کے علاوہ بے شمار قباحتیں موجود ہیں' ان میں سے بے گناہ پر ظلم وستم کرنا ہے جس کا وبال معلوم ہے اوران میں سے اللہ تعالیٰ کے پیدا کرنے کو بلاوجہ بُرا سمجھنا ہے اوران میں سے اللہ تعالیٰ کے فیصلے سے ناراضگی ہے اوراس کے فعل کا اس ضد کے ساتھ مقابلہ ہے کہ اس نے نو ماہ کی مدت میں اس کی تربیت فرمائی جبکہ اس شخص نے اس پر قابو پاتے ہی اس کی جان ضائع کرنے کا ارادہ کرلیا ہے اوران میں سے اللہ تعالیٰ کی رزاقی اور کارسازی پر بے اعتمادی ہے اوران میں سے شدید بخل ہے کہ اپنے بیٹے پر مال خرچ کرنے کو روا نہیں رکھتا۔ وغیر ذالک

اسی لیے عرب کے سمجھدار لوگ بھی اس قباحت پر مطلع ہو کر اس کام سے ہاتھ کھینچ لیتے تھے لیکن قوم کے رواج کی وجہ سے مجبوراً قبول کرتے تھے یہاں تک کہ حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے چچازاد زید بن عمرو بن نفیل مکہ شریف میں پیدا ہوئے' آپ جہاں بھی سنتے کہ لڑکی پیدا ہوئی ہے اور لوگ اسے زندہ درگور کرنا چاہتے ہیں وہاں دوڑتے ہوئے اور جاتے کہتے کہ میں اس لڑکی کو اپنی کفالت میں لیتا ہوں اس کی پرورش' شادی اور جہیز میں جو کچھ خرچ ہوگا' میرے ذمے رہا اور آپ نے اس طریقے سے بے شمار بچیوں کو چھڑایا اسی لیے لوگ انہیں محی الاموات یعنی مردوں کو زندہ کرنے والا کہتے تھے اوران کی اس اچھی رسم کی عربوں نے بھی ہر قبیلہ میں پیروی کی۔ چنانچہ فرزدق شاعر کا دادا جس کا نام صعصعہ تھا' بھی یہی کام کرتا تھا اسی بناء پر فرزدق کے شعروں میں اپنے دادا کے اس عمل پر فخر کرنے کا ذکر ہے۔

اور ہماری اُمت میں یہ ناپاک عمل ایک اور صورت میں نمودار ہوا ہے اور شیطان کا

طریقہ یہی ہے کہ لوگ جب کسی بُرے کام کو شرعی ڈانٹ ڈپٹ اور عقلی دلائل کی وجہ سے ترک کر دیتے ہیں' وہ ملعون اسی معنی کو دوسرے رنگ میں ان کی نظر میں اچھا کر دِکھاتا ہے تاکہ اس کا اصل مطلب فوت نہ ہو اور وہ صورت جو کہ اس اُمت میں رواج پا چکی ہے' یہ ہے کہ لونڈیوں اور کم اصلوں کے حمل کو لڑکی بلکہ لڑکا بھی پیدا ہونے سے عار لاحق ہونے کے لیے روح ڈالے جانے کے بعد جس کی مدت غالباً چار ماہ گزرنے کے بعد ہے' گرا دیتے ہیں اور اس نہایت ہی بُرے عمل کو شرافت اور غیرت کے تقاضے کا نام دیتے ہیں اور اسے فخر کے مقام پر بیان کرتے ہیں حالانکہ ناحق خون کرتے ہیں اور اس بُرے عمل میں جو دوسری خرابیاں واقع ہوتی ہیں' سر مو فرق نہیں ہے۔

لیکن روح ڈالے جانے سے پہلے جائز عذر کی وجہ سے جیسے ولادت کی تنگی یا عیال کی کثرت اور مال کی قلت یا سفر میں ہونا یا کنیز سے خدمت کا نفع فوت ہونا۔ اسقاط کے جواز میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں اختلاف پڑ گیا تھا اور حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے سامنے اس بحث میں کافی گفتگو ہوئی یہاں تک کہ حضرت امیر المومنین مرتضٰی علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا واللہ لاتکون موء ودۃ حتی تاتی علیھا التارات السبع اس گفتگو کو حضرت امیر المومنین عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے پسند فرمایا اور یہی قول مقرر ہوا اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے بعض اسے بھی احتیاط کی بناء پر حرام سمجھتے تھے اور اسے موء ودۃ صغریٰ کہتے کہ اگرچہ اس عمل میں قتل نفس تو نہیں ہے لیکن خدا تعالیٰ کی رزاقیت پر عدم اعتماد اور بلا وجہ اللہ تعالیٰ کے فعل کا اس کی ضد کے ساتھ مقابلہ اور دوسری خرابیاں ہیں لیکن صحیح یہ ہے کہ عزل پر قیاس کرتے ہوئے جائز ہے اور وہ جو حدیث پاک میں عزل کے بارے میں وارد ہے کہ ذالك الوأد الخفي کہ یہ خفیہ درگور کرنا ہے تو یہ عزل کی حرمت پر دلالت نہیں کرتا بلکہ مکروہ اور ترک اولیٰ پر۔ اس لئے کہ ہر امر کا خفی اس کے جلی کا حکم نہیں رکھتا جیسا کہ ریاء جو کہ شرک خفی ہے' شرک جلی کا حکم نہیں رکھتی اور عزل کا جائز ہونا صحیح مشہور روایات سے ثابت ہے اس میں کوئی شبہ نہیں اور قبل از جماع یا بعد ازاں مانع دوا کا استعمال بھی عزل کی طرح جائز ہے۔ (مسئلہ مذکورہ مشروط بالشرائط ہے جن کا پایا جانا نادر ہے' مغربی ممالک اور

عیاش اقوام کے برتھ کنٹرول کا اس سے کوئی تعلق نہیں کیونکہ وہاں یہ کام صرف عیاشی کے لیے ہوتا ہے جس معاشرہ میں کھلے بندوں' ہر مقام پر مردوں اور عورتوں کا بے تکلف میل جول ہو وہاں اس عمل کے رواج پانے کے مقاصد اور مفاسد کو معلوم کرنا مشکل نہیں۔ یہ بہر طور ناجائز اور بے حیائی اور بے شرمی کو عام کرنے کا باعث ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

ایک شبہ اور اس کا جواب

یہاں ایک شبہ ہے جو کہ اکثر دل میں گزرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ موءودۃ بے چاری مظلوم ماری گئی ہے اس سے پوچھنے کی کوئی وجہ نہیں' چاہیے تھا کہ سوال اس کے قاتل سے ہوتا تا کہ اس کی علامت ہوتی اور اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ موءودۃ سے سوال اس طرح نہیں ہوگا کہ تجھے کیوں مارا گیا تا کہ بعید از حقیقت ہو بلکہ یوں سوال ہوگا کہ

بِاَیِّ ذَنْبٍ قُتِلَتْ اسے کسی جرم کی پاداش میں مارا گیا ہے اور یہ سوال مظلوم کے لائق ہے نہ کہ ظالم کے۔ اس لیے کہ اس سوال کا مقصد دعویٰ کی تلقین اور ظلم کی وجہ ظاہر کرنے کی طلب ہوتی ہے تا کہ مظلوم کہے کہ فلاں نے مجھ پر بے وجہ یوں ظلم کیا ہے۔

اور مَوْءُ وْدَۃُ سے اس طرح سوال کرنے میں راز یہ ہے کہ ننھی سی جان میں اگرچہ اس جہان میں ایک شعور' سمجھ اور ادراک پیدا ہو جائے گا اور ابھی اس کا ادراک کچہریوں کا شوق رکھنے والوں کے ادراک سے کہ انہوں نے دنیا میں ان کاموں میں ایک عمر گزاری ہے' کمتر ہوگا۔ نیز جو تکلیف اسے قرار نہ پانے والی زندگی کے زائل ہونے سے لاحق ہوئی اس کے نفس میں اس کا اتنا اعتبار نہیں ہوگا کہ اس کی زندگی ایک خواب کی طرح تھی کہ دیکھا اور ختم ہوا۔ نیز ماں باپ پر دعویٰ کی ابتدا میں حیا کی وجہ سے اسے ایک رکاوٹ سی ہوگی' ناچار اسے اپنی طرف سے اس طرح دعویٰ کی تلقین اور یاددہانی کرائی جائے گی جس طرح کہ سادہ لوح مظلوم کہ جنہیں اپنی دلیل بیان کرنے اور دعویٰ مکمل کرنے میں قدرے کوتاہی درپیش ہوتی ہے تو انصاف پسند حکام انہیں اس طرح کی تلقین اور یاددہانی کراتے ہیں تا کہ ان کے حقوق ضائع نہ ہو جائیں اور اسی طرح وہ مظلوم جو کہ ظالم کے ساتھ ایک تعلق کی خاطر شکایت اور فریاد کرنے سے حیا کرتا ہے یا ڈرتا ہے اس کے بارے میں بھی عدل و انصاف والوں کا یہی

وتیرہ ہے اور فقہاء نے بھی لکھا ہے کہ ایسی صورت میں قاضی کے لیے مدعی اور گواہ کو تلقین کرنا درست ہے کہ اس کے بغیر مظلوم کا حق پورے طور پر نہیں لیا جا سکتا۔

اور اس کے علاوہ اس سوال میں والدین کے ساتھ اس کے ادب سے پیش آنے کی حد درجہ رعایت کی گئی ہے اس لیے کہ پہلے اس کے قاتل کا ذکر نہیں فرمایا۔ گویا یہاں قاتل سے سوال کرنا پیش نظر نہیں تا کہ رسوائی نہ ہو اسی لیے مجہول صیغے کے ساتھ ذکر کیا گیا۔ یا اس گناہ کے متعلق سوال فرمایا گیا جو کہ اس کے قتل کا موجب ہوا۔ گویا اشارہ فرمایا جا رہا ہے کہ والدین کو اولاد کے حال پر اس قدر شفقت ہے کہ بہت بڑے جرم کے بغیر انہوں نے تیرے ساتھ یہ سلوک نہیں کیا ہوگا۔ میں سوال کرتا ہوں کہ وہ گناہ کیا ہے؟ لیکن موءودۃ کی نسبت سے والدین کے حق میں ادب کی یہ رعایت والدین کی انتہائی ذلت اور رسوائی کا باعث ہوگی خصوصاً موءودۃ سے گناہ کے متعلق پوچھنے میں کہ وہ تو گناہ صادر ہونے کی جگہ بالکل ہو ہی نہیں سکتی' یہ انہیں صریح الزام کی تعریض ہوگی اور اگر شروع سے ہی والدین سے پوچھا جاتا کہ تم نے بلاوجہ اپنی لڑکی کو کیوں قتل کیا تو یہ ذلت' رسوائی اور خوف و دہشت کا غلبہ حاصل نہ ہوتا۔

نیز ان سے نہ پوچھنے اور سوال و خطاب کا رُخ مَوْءُ دَةٌ کی طرف پھرنے میں ان کی انتہائی شقاوت اور بد بختی کا پتہ دیتا ہے کہ ان کی اس بے ہودہ حرکت پر سخت ناراضگی کی وجہ سے ان سے جھڑکی آمیز سوال اور عتاب بھی نہیں فرمایا جا رہا کہ کہیں عذاب اور عتاب کی تکلیف کو کلام اور خطاب کی لذت کی وجہ سے ہلکا محسوس کریں۔ اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّآ اِلَيْهِ رٰجِعُوْنَ اور کیا اچھا کہا گیا ہے (بیت)

اگر بیمار پُرسی نہیں ہے تو نالائق ہی کہہ دو کہ تمہارے منہ سے مجھے ایک بات سننے کی تمنا ہے۔

یہاں جاننا چاہیے کہ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ الوائدۃ والموء ودۃ فی النار یعنی اپنی لڑکی کو زندہ درگور کرنے والی عورت اور وہ لڑکی دونوں دوزخ میں جائیں گی اس حدیث کو سنتے ہی معتزلہ ہاتھ پاؤں مارتے ہیں اور اس حدیث صحیح کے مقابلے میں اس آیت کے

ساتھ دلیل لیتے ہیں اور کہتے ہیں کہ جب اللہ تعالیٰ موء ودۃ کی وجہ سے کافروں کو ذلیل اور شرم سار فرمائے گا۔ موء ودۃ کو عذاب دینے کا کیا مقصد؟ اور اس استدلال میں انتہائی جہالت اور بے وقوفی کا ارتکاب ہے اس لیے کہ والدین کو عذاب دینا اس وجہ سے ہے کہ انہوں نے ناحق خون کیا ہے جبکہ موء ودۃ کو عذاب دینا اس وجہ سے ہوگا کہ وہ کفر میں والدین کے تابع ہے جیسے ایک ظالم اور مظلوم جو دونوں کافر مرے ہوں' ایک کو دوسرے کے لیے عذاب دیں گے اور اصل میں دونوں عذاب پانے میں اپنے کفر کی بناء پر ایک دوسرے کے شریک ہوں گے۔

کفار کے اطفال کے عذاب کی وجہ

اسی لیے اہلِ سنت کے نزدیک کفار کے اطفال کو عذاب دینا قواعد شریعت کے تقاضوں پر نظر کرتے ہوئے جائز ہے اس لیے کہ طفل کی جان خصوصاً وہ طفل جو اتنی سی چھوٹی عمر میں اس جہان سے گیا' گویا والدین کے نفس کا ایک شعبہ ہے جو ابھی مستقل اور پورا نہیں ہوا جب نفس والدین کو دُکھ ہوگا' وہ سادہ نفس بھی ان کے تابع ہونے کے ناطے تکلیف پائے گا۔ جیسے دو جڑواں بچے کہ ایک وقت میں ہنستے اور روتے ہیں اور ایک ہی وقت میں انہیں بھوک پیاس لگتی ہے جب تک کہ پنگھوڑے میں رہیں اور ان کا نفسانی اتصال مستقل ہونے کی جدائی میں نہ بدلے۔ واللہ تعالیٰ اعلم

ایک قابلِ بیان نکتہ

یہاں ایک نکتہ ہے جو کہ بیان کرنا ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ قتلت کو صیغۂ غائب کے ساتھ کیوں لایا گیا۔ خطاب کا تقاضا یہ تھا کہ قتلتِ کو مخاطب مؤنث مجہول کے صیغہ کے ساتھ لایا جاتا اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں قیامت کے واقعات بیان کرنا مقصود ہے اور موء ودۃ کی حالت کو غیب کے صیغے کے ساتھ بیان فرمایا جا رہا ہے۔ پس مقصد موء ودۃ کے پوچھے جانے کی خبر دینا ہے جو کہ واقع ہوگا نہ کہ خطاب کی حکایت جو کہ اس کے ساتھ درمیان میں آئے گی۔

مسئلہ فقہی

فقہی حکم یہ ہے کہ اگر کسی شخص کے ہاتھوں غلطی سے اپنی اولاد ضائع ہو جائے جیسے چار ماہ کا حمل گرانا یا حد سے زیادہ افیون کھلانا یا نگہبانی میں سستی کرنا کہ مثلاً کسی چھت کے کنارے اسے پکڑ کر کھیل رہا تھا اور بچہ اس کے ہاتھ سے نکل کر گر پڑا اور فوت ہو گیا۔ علیٰ ہذا القیاس اس پر کفارہ واجب ہو جاتا ہے۔ حضرت قتادہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ قیس بن عاصم تیمی رضی اللہ عنہ نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مجھ سے سخت گناہ کا ارتکاب ہوا ہے کہ حالتِ کفر میں میں نے آٹھ بچیوں کو زندہ درگور کیا ہے۔ آپ نے فرمایا کہ ہر بچی کے عوض ایک ایک غلام آزاد کرو۔ عرض کی میں تو اونٹوں کا مالک ہوں' غلام نہیں رکھتا۔ فرمایا کہ ہر بچی کے بدلے ایک ایک اونٹ خدا کی راہ میں دے دو۔

وَاِذَا الصُّحُفُ نُشِرَتْ اور جبکہ اعمال نامے کھولے جائیں جو کہ لپیٹ کر سجین اور علیین کے دفتر میں رکھے ہوئے تھے اور ہر شخص اپنے اعمال نامے کا مطالعہ کرے اور قتادہ سے مروی ہے کہ ہر شخص کے مرنے کے بعد اس کے اعمال نامے کو لپیٹ کر دفتر میں محفوظ رکھتے ہیں۔

اور بعض مفسرین نے نشر کا معنی منتشر کرنا لیا ہے یعنی اعمال ناموں کو منتشر کر دیں اور اس دفتر سے جہاں جمع تھے' نکال کر تقسیم کر دیں اور بعض کو پشت کی طرف سے بائیں ہاتھ میں اور بعض کو سامنے سے دائیں ہاتھ میں سپرد کریں گے اور مرشد بن وداعہ سے مروی ہے کہ قیامت کے دن اعمال ناموں کو عرش کے نیچے سے اُڑائیں گے تو صاحبِ ایمان کے ہاتھوں میں جو اعمال نامہ آئے اس میں یہ لفظ لکھا ہوگا کہ فی جنۃ عالیہ جبکہ کافر کے ہاتھ میں آنے والے صحیفے پر لکھا ہوگا فی سموم وحمیم اور یہ صحیفے فال کے قرعوں کے طور پر ہوں گے نہ کہ صحائف اعمال' کشاف میں ایسا ہی ذکر کیا۔

وَاِذَا السَّمَآءُ كُشِطَتْ اور جبکہ آسمان کی کھال اُدھیڑ دی جائے جیسا کہ ذبح کیے ہوئے جانور کی کہ کھال اُدھیڑنے کے بعد اس کے اجزا اور اعضاء نمودار ہو جاتے ہیں اور اس

کے رگ و ریشے ظاہر ہو جاتے ہیں اور افلاک کے چھپے ہوئے حالات جو کہ چیزوں کی مثالی صورتیں ہیں' روشن اور ظاہر ہوں گی۔ اعمال نامے اُٹھانے والے ملائکہ اور ملائکہ کی دوسری قسمیں نازل ہوں۔

وَاِذَا الۡجَحِیۡمُ سُعِّرَتۡ اور جبکہ جہنم کو بھڑکایا جائے اور اس کی جلن کی شدت میں اضافہ ہو جائے۔

وَاِذَا الۡجَنَّةُ اُزۡلِفَتۡ اور جبکہ جنت کو میدانِ حشر کے قریب لایا جائے۔ پس ایمان والوں کی خوشیوں پر خوشیاں بڑھیں جبکہ کافروں کو حسرت پر حسرت نصیب ہو اور جب یہ بارہ (۱۲) حادثے ثابت ہو جائیں جن میں سے چھ (۶) حادثے صور پھونکنے سے پہلے دنیا میں ہیں اور ان میں سے چھ (۶) صور پھونکنے کے بعد آخرت میں ہوں گے۔

عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّاۤ اَحۡضَرَتۡ ہر نفس اس چیز کو جان لے جو نیکی اور بدی سے اس نے حاضر کی ہے اور بعض تاویل کرنے والوں نے کہا ہے کہ ان بارہ (۱۲) حالات کو مرتے وقت جو کہ قیامت کا نمونہ ہیں' پالیں گے اسی لیے اسے قیامتِ صغریٰ کہتے ہیں اور حدیث پاک میں بھی وارد ہے کہ من مات فقد قامت قیامتہ اس کا اعتبار کیا جا سکتا ہے۔ پس سورج آدمی کی روح کی طرح ہے جس کی شعاع سے جسم زندہ ہوتا ہے اور جب اس کا تعلق بدن کی تدبیر سے منقطع ہوتا ہے گویا جسم انسانی کے جہان کا سورج مکدر اور بے نور ہو گیا۔ اور ستاروں کا تاریک ہونا انسانی حواس اور قوتوں کے بے کار ہونے کا نمونہ ہے جو کہ موت کے وقت رونما ہوتا ہے۔ اور پہاڑوں کی حرکت اس کے جسم کے اعضاء رئیسہ اور ہڈیوں کے افعال کا باطل ہونا ہے کہ اپنے کاموں سے معزول ہو کر ضائع ہو جاتے ہیں۔ اور تعطیل عشار دودھ اور چربی کے خشک ہونے اور طبعی افعال کے باطل ہونے کا نمونہ ہے جو کہ جگر اور غذا کے دوسرے آلات سے صادر ہوتے ہیں۔ اور وحشیوں کا جمع کرنا افعالِ بہیمیہ اور سبعیہ کے نتائج کا ظاہر ہونا ہے۔ اور دریاؤں کا بھڑکانا جسم کے خون اور دوسری رطوبتوں کا خشک ہونا یا اوہام' خیالات' امیدوں اور آرزوؤں کا باطل ہونا ہے کہ ان میں ہر ایک بحر ناپیدا کنار ہے اور اختیاری یا اضطراری موت کے بغیر ان کے منقطع ہونے کا تصور ہی نہیں ہے۔ اور نفوس کا

جوڑنا کسب کی ہوئی صلاحیتوں کا باہم اجتماع ہے' ظلمانی صلاحیتوں کا ظلمانی اور نورانی صلاحیتوں کا نورانی کے ساتھ جبکہ موء ودۃ وہ قوت ہے جسے آدمی نے اس کے لیے مقرر کیے ہوئے مصرف کے بغیر کہیں اور صرف کر کے ضائع کر دیا۔

اور بعض دانش مندوں سے منقول ہے کہ ہر نفیس نکتہ جو کہ علمی مقدمات میں ذہین لوگوں کے ذہن میں آئے اور اسے لکھ کر قابو نہ کریں یہاں تک حافظے سے نکل جائے' موء ودۃ ہے اور کشط آسمان احکامِ روح کے ظہور سے کنایہ ہے اور تسعیر جہنم ان سختیوں اور ہولناکیوں کو دیکھنا ہے جو کہ موت کے بعد رونما ہوں گی اور جنت کو قریب لانا اس تازگی اور راحت سے عبارت ہے جو کہ اس وقت نیکوں کی ارواح کو پہچانتے ہیں جبکہ بُروں کو ان سے محروم رکھتے ہیں۔

اور بعض اہلِ تصوف نے ان سب حالات کو فنا کی حد تک سلوک کے مدارج طے کرنے پر منطبق کیا ہے جو کہ ان کے نزدیک واصل ہونے کی پہلی منزل ہے اور اس مطابقت دینے کی تفصیل ایسی طوالت چاہتی ہے جو کہ اس تفسیر کے انداز سے باہر ہے۔

بہرحال نفسِ انسانی پر خیر وشر کی حقیقت کھلنے کے اسباب بیان کیے جا چکے اور ان اسباب کی تحقیق مخبر صادق جو کہ سب سے بڑا سچا ہے یعنی ذات حق تعالیٰ کے خبر دینے سے یقینی ہوگئی تو قسم اُٹھانے کی ضرورت نہ رہی اسی لیے یوں فرمایا گیا کہ:

فَلَآ اُقْسِمُ پس میں قسم نہیں اُٹھاتا اس لیے کہ میرے خبر دینے کے بعد قسم کی ضرورت نہیں ہے اور اگر اس سب کچھ کے باوجود تم قسم کے محتاج ہو تو میری قسم!

بِالْخُنَّسِ الْجَوَارِ الْكُنَّسِ چند ستاروں کے ساتھ ہے جو کہ اپنی حرکت میں پیچھے ہٹنے والے' اپنی حرکت میں سیدھے جانے والے' اپنی حرکت میں کھڑے رہنے والے ہیں اور حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ اور اکثر مفسر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے کہ وہ ستارے خمسہ متحیرہ ہیں یعنی زحل' مشتری' مریخ' زہرہ اور عطارد کہ انہیں اپنی حرکت میں ایک حیرت نمودار ہوتی ہے۔ پہلے تو مغرب سے مشرق کو برجوں کی ترتیب سے حمل سے ثور اور ثور سے جوزا تک جاتے ہیں اس کے بعد کچھ وقت ان کی حرکت نمودار نہیں ہوتی اور

ایک جگہ کھڑے رہتے ہیں پھر پچھلے پاؤں لوٹتے ہیں۔ اور مشرق سے مغرب کو آتے ہیں۔ علم ہیئت کی اصطلاح میں پہلی حالت کو استقامت کہتے ہیں اور دوسری حالت کو وقوف اور اقامت کہتے ہیں جبکہ تیسری حالت کو رجعت اور رجوع کا نام دیتے ہیں۔ یہ تین حالات ستاروں میں سے ہر ایک کے لیے نہیں ہیں' چاند میں وقوف ہے' رجعت نہیں ہے اور دوسرے ستاروں میں وقوف ہے نہ رجعت۔ پس ان سب پانچ ستاروں کی حیرت اس بات کی صریح دلیل ہے کہ آسمانی چیزوں کا ایک حالت سے دوسری حالت میں بدلنا ممکن اور واقع ہے۔ پس آسمان کے تمام اجزا کے انقلاب اور ستاروں کا نور زائل ہونے کے جواز میں کوئی امر محال نہ رہا۔

اور ان پانچوں ستاروں کو رجعت' استقامت اور وقوف کے ساتھ خاص کرنے کا اگرچہ آسمانی ہیئتوں کی تفتیش کرنے والوں کے نزدیک ایک سبب ہے کہ وہ ان کے حامل کی حرکت اور تداویر کی حرکت کا اختلاف ہے اس لیے کہ انہیں اُٹھانے والے مغرب سے مشرق کو جاتے ہیں اور ان کے تداویر چونکہ زمین میں شامل نہیں ہیں' ان کے اوپر کی سطح کے مغرب سے مشرق کو جاتے ہیں اور نچلے مشرق سے مغرب کو اور جب یہ ستارے تداویر میں گڑے ہوئے ہیں اور وہ تداویر حامل کے جسم میں مرکوز ہیں' ناچار ان ستاروں کو ان کی مطابقت میں دونوں حرکتیں ہوتی ہیں جب تک کہ حامل کی حرکت اور تداویر کی حرکت موافق ہوتی ہے' استقامت کے ساتھ جلدی چلنے والے معلوم پاتے ہیں اور جب دونوں حرکتوں کا اختلاف ہو جاتا ہے تو آہستہ چلنے لگتے ہیں اور جب دونوں حرکتیں مقابلے کی حد تک مختلف ہو جاتی ہیں کہ ستارہ ایک حرکت کے ساتھ جتنا آگے گیا اسی قدر دوسری حرکت سے پیچھے گر پڑا' واقف اور ساکن معلوم ہوتا ہے۔ گویا بالکل حرکت نہیں کرتا اور جب دوسری حرکت غلبہ کرتی ہے تو اُلٹی حرکت ظاہر ہوتی ہے اور ستارہ لوٹتا معلوم ہوتا ہے۔

اور اس سبب کو جاننے کی صورت میں مدعا زیادہ تر واضح اور روشن ہو جاتا ہے اس لیے کہ جب آسمانی ستارے تغیر و انقلاب کا محل ہو گئے اور ان کی حرکت اور اطوار کے اسباب مختلف اور متصادم اور ان میں طبائع کا باہم کھینچنا اور ارادہ کرنا متحقق ہو گیا تو صدمے قبول

کرنے پر آمادہ ہو گئے جو چیز اختلاف اور تغیر سے بچی ہوئی ہو اس میں صدمہ قبول کرنے کو بعید سمجھا جا سکتا ہے۔

آسمانی ستاروں کی دو اقسام

اور یہاں ان پانچ ستاروں کا ذکر لانا اس لیے ہے کہ آسمانی ستاروں کی دو قسمیں ہیں۔ سیار یعنی سیر کرنے والے اور ثابت یعنی وہ ستارے جو حرکت نہیں کرتے۔ سیاروں کی حرکت افلاک کے متعدد ہونے سے مختلف ہوتی ہے جبکہ ثوابت کی حرکات مختلف نہیں ہیں بلکہ ان کے فلک کی حرکت بھی نہایت کمزور اور کم معلوم ہوتی ہے اور ثوابت کو رجوع' استقامت' وقوف اور سرعت سے آہستگی کی طرف منتقل ہونا اور اس کا عکس لاحق نہیں ہوتا جبکہ سیارات کو سب کچھ لاحق ہوتا ہے اور سیاروں میں سے شمس وقمر کو بارہا قرآن مجید میں مغیر و انقلاب کے مقام میں ذکر فرمایا گیا ہے اور ان دونوں کے یہ زیادہ تر تغیرات عوام و خواص کے نزدیک مشہور و معروف ہیں۔ خصوصاً قمر کے کہ ہر مہینے میں اس کے گھٹنے اور بڑھنے کا مشاہدہ کرتے ہیں اور دونوں کا گرہن دیکھتے ہیں تو یہاں اجرام آسمانی کے تغیر پذیر ہونے کا بیان مقصود تھا' ان پانچ ستاروں کا ذکر جو کہ تغیرات اور اختلافات رکھتے ہیں' ضروری ہوا۔ غور و فکر کرنے پر یوں معلوم ہوتا ہے کہ ثوابت کا آپس میں امتزاج نہیں ہے اسی لیے ہر ایک کی ایک ہی حالت ہوگی جبکہ ان پانچ ستاروں کے شمس وقمر کے ساتھ اور آپس میں مختلف اور متعدد امتزاج ہیں اور مختلف قوتوں کے صادر ہونے کا مقام بنتے ہیں اور سورج کے ساتھ ان کے عجیب رابطے ہیں اور ہر رابطے کی تاثیر جداگانہ ہے۔ پس یہ پانچ سیارے عالم آسمانی میں بمنزلہ عنصری مرکبات یعنی معدنیات' نباتات' حیوانات' انسان اور ان کے برزخ کے ہیں جبکہ شمس وقمر مرکبات ناقصہ کے مشابہہ یعنی بخار' غبار اور دھواں اور ثوابت بمنزلہ عنصری بسائط کے اور ان پانچ ستاروں کی تاثیرات اور افعال ارادہ اور اختیار والی چیزوں کے افعال کے ساتھ زیادہ مشابہہ ہیں اور ان کی حرکات گویا چڑھنے' اُترنے' جانے آنے' بھاگنے اور طلب کرنے سے مرکب حرکت اختیاری ہے۔ پس ان پانچ سیاروں کے انقلاب اور تغیر کا ذکر مقصد کے زیادہ قریب ہے کیونکہ ان کا انقلاب ارادی ہے' طبعی نہیں۔

بہرحال ان پانچ ستاروں کے حالات اجرام آسمانی کے حالات کے اختلاف پر بہت بڑی دلیل ہیں۔ اور جب اجرام آسمانی تغیرات اور انقلاب کے قابل ہوئے تو زمینی اجسام کے انقلاب میں کیا دشواری ہے کہ ان کا انقلاب و تغیر تو ہر وقت مشاہدے میں رہتا ہے اور اس قسم کے انقلاب میں جو کہ بڑے تغیر کا موجب ہو' کسی کو کوئی شک ہو تو دوسری قسم اُٹھائی جاتی ہے۔

وَالَّيْلِ إِذَا عَسْعَسَ اور رات کی قسم جب کہ آتی ہے اور جہان کو تاریک کر دیتی ہے اور انقلاب عظیم رونما ہوتا ہے' بازار بے رونق ہو جاتے ہیں' گھروں کے دروازے بند' چوروں اور درندوں کا خطرہ غالب ہو جاتا ہے' راستے رُک جاتے ہیں' تلاشِ معاش ایک ختم' لوگ مردوں کی طرح ہو جاتے ہیں کہ ان کی حس و حرکت باطل' مردوں کی طرح پڑے ہیں اور جن اور شیاطین پھیلے ہوئے ہیں اور یہ ایسا انقلاب ہے جو کہ دن رات کی ہر گردش میں ایک مرتبہ زمین اور زمین والوں کو درہم برہم کر دیتا ہے اگر بالفرض کوئی دن کے وقت ہوش میں آئے اور اس نے رات نہ دیکھی ہو اور اس کے پاس اس انقلاب کا ذکر کیا جائے تو وہ اسے اس قدر محال جانے گا کہ کفار قیامت کے حالات سننے سے اس کا دسواں حصہ بھی نہیں جانتے اور رات کے عجائبات میں سے یہ ہے کہ جو چیز دُور ہے جیسے آسمانی ستارے اور چاند وہ اس میں ظاہر ہو جاتے ہیں اور جو چیز نزدیک ہے جیسے فضا اور سطح زمین کی چیزیں وہ مخفی اور پوشیدہ ہو جاتی ہیں جیسا کہ دن کے وقت اس کے برعکس مشاہدہ ہوتا ہے اور دنیا اور آخرت کا مخفی چیزوں کے ظاہر ہونے اور ظاہر چیزوں کے مخفی ہونے میں فرق اسی نمونے سے واضح ہو جاتا ہے اسی لیے اس بات کو پورا کرنے کے طور پر فرمایا گیا ہے۔

وَالصُّبْحِ إِذَا تَنَفَّسَ مجھے صبح کی قسم ہے جس وقت کہ سانس لے۔ کہ اس وقت بھی ایک عظیم انقلاب رونما ہوتا ہے اور لوگ خواب سے بے دار ہوتے ہیں' محفلیں اور بازار آباد ہو جاتے ہیں' مسافر راستوں میں چلنے لگتے ہیں اور روزی کی تلاش ہر مخلوق کا مقصود ہو جاتی ہے اور حیوانی قوتوں میں ایک عظیم چستی پیدا ہو جاتی ہے' ہر چیز روشن اور ظاہر ہو جاتی ہے' چمکتے ستارے بے نور ہو جاتے ہیں اور لشکر اور قافلے پہاڑوں کی طرح سیر کرتے ہیں۔

صبح کا دَم لینا اس کے ظاہر ہونے سے کنایہ ہے۔ سورج کو کہ جس کی علامت صبح ہے' دریا میں تیرنے والی مچھلی سے تشبیہ دی گئی ہے اور طلوع سے پہلے اس کے نور کے پھیلنے کو مچھلی کے سانس کے ساتھ منسوب کیا گیا ہے جس طرح کہ مچھلی دریا میں نگاہ سے اوجھل گزرتی ہے اور اس کے سانس لینے سے پانی اُبلتا اور منتشر ہوتا ہے یہی طلوع سے اور روشنی پھیلنے سے پہلے سورج کی حالت ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ دَم صبح اس بادِ نسیم سے کنایہ ہے جو کہ بہار کے دِنوں میں صبح کے طلوع کے ساتھ چلتی ہے اس نسیم صبح کو سانس کے ساتھ تشبیہ دی گئی ہے کہ جہان والوں کی راحت اور فرحت کا موجب ہوتی ہے۔ گویا صبح بمنزلہ ایک دُکھیا یا مریض کے تھی کہ جس نے ابھی سانس لینے کی فرصت پائی اور کچھ راحت حاصل کی بہر حال صبح کے لئے سانس ثابت کرنا فارسی اور عربی دونوں کے شعروں میں رائج اور مشہور ہے۔

اور عسعس کا لفظ دو ضدوں میں مشترک ہے' آمد و رفت دونوں کو کہتے ہیں اگر مقابلے اور صبح کے دَم لینے کی رعایت کی جائے تو اسے آنے پر محمول کرنا چاہیے اور اگر اس کی مناسبت اور باہم لازم ہونا مقصود ہو تو جانے پر محمول کرنا چاہیے اور یہ اعجاز قرآنی کا کمال ہے کہ یہاں دو وجہوں والے مقام پر دو ضدوں میں مشترک لفظ ارشاد فرمایا گیا لیکن دوسری تقدیر پر صرف ایک انقلاب مذکور ہوگا اس لیے کہ رات کا جانا اس انقلاب کی ابتدا ہے اور صبح کا سانس لینا اس کی انتہا ہے اور جب یہ انقلاب آخرت کے انقلاب کے ساتھ پوری مشابہت رکھتا ہے کہ حیات بعد الموت کا نمونہ ہے اور اس میں مخفی چیزوں کا ظہور زیادہ ہوتا ہے اور اس پر اکتفاء کرنا نہایت موزوں ہے۔

بہر حال یہاں مقصد یہ ہے کہ بارہ (۱۲) انقلابات کے بعد کہ جن کی مانند دنیا میں بھی انقلابات واقع ہوتے ہیں' نفسِ انسانی پر خیر اور شر کی حقیقت واضح ہونے میں قسم اُٹھانے اور کلام کو پکا کرنے کی ضرورت نہیں رہی اس لیے کہ ان انقلابات کا ممکن ہونا عقل کی دلیل سے ثابت ہے اور ان انقلابات کا نفسِ انسانی پر خیر اور شر کی حقیقت واضح ہونے کا سبب ہونا بھی غور کرنے کے بعد عقل کی نظر میں ظاہر ہے اور جب مخبر صادق کسی ممکنہ چیز کے واقع ہونے

کی خبر دے جو کہ ایک خبر کی وجہ سے ہو تو اس کے واقع ہونے کا یقین حاصل ہو جاتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ نفی کے لیے قسم کی ضرورت نہیں' علت بیان کرنے کے طور پر فرمایا جا رہا ہے۔

اِنَّهٗ تحقیق یہ قرآن جو کہ قیامت کی خبروں کو ضمن میں لیے ہوئے ہے۔ لَقَوْلُ رَسُوْلٍ البتہ اللہ تعالیٰ کے قاصد کی لائی ہوئی گفتگو ہے جو کہ خدا تعالیٰ کی طرف سے پہنچائی گئی ہے تو اس میں جھوٹ اور من گھڑت کے احتمال کی کوئی گنجائش نہیں ہے اس لیے کہ کلامِ الٰہی کا سچا ہونا قطعی ہے۔

اور اگر کسی کے دل میں کھٹکے کہ یہ کلام حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ نے ہم سے بلاواسطہ نہیں کی ہے تاکہ ہمیں اس کے مضمون کا یقین حاصل ہو بلکہ ہمارے اور اللہ تعالیٰ کے درمیان واسطے واقع ہیں اور سند محقق ہے۔ ہم کہتے ہیں کہ تم جو اپنے پیغمبر سے بے واسطہ یہ کلام سنتے ہو' تمہارے درمیان دو واسطوں سے زیادہ نہیں ہے۔ ایک وہ شخصیت جو پیغام رسانی کے طور پر خدا تعالیٰ کی طرف سے پیغمبر علیہ السلام کے پاس یہ کلام لاتی ہے۔ دوسرا واسطہ رسول علیہ السلام۔ اب ان دونوں واسطوں کی چھان پھٹک میں خود غور کرو۔ پہلا واسطہ جو کہ قاصد ہے' ان صفات سے موصوف ہے۔

كَرِيْمٍ بزرگ اور عالی مقام ہے جس کا عدالت اور تقویٰ اعلیٰ درجے کا ہے اس لیے کہ اس کے مرتبے کی بزرگی تقوے کے بغیر صورت نہیں پکڑتی۔ چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ الکرم التقویٰ والحسب المال یعنی کرم تقویٰ ہے اور حسب مال ہے اور قرآن مجید میں بھی اس مضمون کی خبر دی گئی ہے۔ اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَاللّٰهِ اَتْقٰكُمْ پس اس راوی میں عدالت اور تقویٰ ثابت ہو گیا اب اس کے حافظہ کی قوت کی تحقیق کرنا چاہیے' اس کی دوسری صفت یہ ہے کہ

ذِىْ قُوَّةٍ عظیم قوت والا ہے کہ اس کے حافظے میں بالکل کوئی خلل نہیں پڑتا جو کچھ سنتا ہے' اسے کمی بیشی کے بغیر یاد رکھتا ہے اور اس کی ہر قوت کے کمال کی وجہ سے اس یاد کی ہوئی بات کو کمی بیشی کے بغیر پہنچا دیتا ہے اور اگرچہ یہاں اس قاصد کے حافظہ کی قوت اور تعبیر کرنے کی قوت کو بیان کرنا مقصود ہے لیکن ان دونوں قوتوں کا کمال علی الاطلاق حاصل نہیں

آ تا اس بناء پر اسے مطلق قوت کے ساتھ موصوف فرمایا گیا ہے۔

اور حدیث پاک میں وارد ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت جبرئیل علیہ السلام سے فرمایا کہ ان صفات سے موصوف انہیں کی ذات عالی صفات ہے کہ حق تعالیٰ نے تمہیں قوت اور امانت کے ساتھ موصوف فرمایا ہے اور تمہاری تعریف فرمائی ہے' ہمارے سامنے اپنی قوت اور امانت کی کوئی حکایت بیان کریں۔

حضرت جبرئیل علیہ السلام کی قوت وامانت کا بیان

آپ نے کہا کہ میری قوت یہاں تک ہے کہ مجھے حضرت لوط علیہ السلام کی قوم کے شہروں کو جو کہ چار تھے' برباد کرنے کے لیے بھیجا گیا' ان شہروں میں سے ایک شہر سدوم میں چار لاکھ مسلح مرد تھے' عورتوں اور بچوں کے علاوہ۔ میں نے ان تمام شہروں کو ساتویں زمین کے نیچے سے اپنے ایک پر سے اُٹھا کر اتنا بلند اُٹھایا کہ آسمان کے رہنے والے ان شہروں کے مرغوں اور کتوں کی آوازیں سُن رہے تھے پھر ان تمام شہروں کو میں نے اُلٹ کر پھینک دیا اور مجھے کوئی تھکن اور مشقت محسوس نہ ہوئی اور رہی امانت تو وہ اس مرتبہ کی ہے کہ مجھے کبھی کسی چیز کا حکم نہیں دیا گیا مگر میں نے کمی بیشی اور کسی تغیر وتبدل کے بغیر سرانجام دیا اور مجھ پر کوئی راز نہیں کھولا گیا مگر میں نے اس راز کو اپنے سینے میں دفن رکھا اور کسی غیر کے سامنے بیان نہ کیا۔

اور ان دونوں صفات کے ذکر کرنے سے روایت کی دو شرطیں عدالت اور قوت حفظ ثابت ہوگئیں اب ان کے علاوہ چند اور صفات کا ذکر بھی فرمایا جارہا ہے کہ سند و روایت کے علم کے ناقدین ترجیح اور کمال تصحیح کے مقام میں ان صفات کا اعتبار کرتے ہیں' ان میں سے ایک یہ ہے کہ:

عِنْدَ ذِی الْعَرْشِ مَكِیْنٍ وہ قاصد صاحبِ عرش کے نزدیک معزز اور عالی مرتبت ہے اور ظاہر ہے کہ جب درباری واقفیت رکھنے والوں کو جو کہ ہمیشہ دربار میں حاضر ہوں' اسے پیغام رسانی کے لیے بھیجیں تو ہر چیز کا اعتماد بہ نسبت اس پیغام کے زیادہ ہوتا ہے جسے ہرکارے یا کسی غلام کی زبان سے بھیجیں۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ وہ معزز آدمی بادشاہ کے کلام کو بلاواسطہ سنتا

ہے اور یہ احتمال کہ کسی کے درمیان اس کلام کو کم وبیش کر دیا ہو' نہیں رہتا اور دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ عالی مقام معزز آدمی اپنے منصب اور مرتبے کی حفاظت کی خاطر درباری پیغام کو نقل کرنے میں پوری احتیاط کرتا ہے اسی لیے امام بخاری اور مسلم حضرت امام مالک اور دوسرے ائمہ حدیث کے شاگردوں میں سے ان لوگوں کو روایت میں ترجیح دیتے ہیں اور مقدم رکھتے ہیں جو کہ اپنے استاد کے زیادہ قریب بیٹھتے تھے اور اس استاد کی دائمی صحبت کی وجہ سے مشہور و معروف ہو گئے تھے اور اس استاد کے نزدیک انہوں نے مقام حاصل کر لیا تھا اور روایت کے اضطراب اور اختلاف کے وقت ان کی مرویات سے دلیل دیتے ہیں۔

اور دنیاداروں کے عرف میں بھی وہ پیغام جو کہ شاہی دربار سے کسی سردار یا وزیر کے واسطے سے پہنچے اس مقام کی نسبت زیادہ معتبر ہوتا ہے جو کسی خدمت گار' دربان اور ملازم کے واسطے سے پہنچے اور ان میں سے یہ ہے کہ:

مُّطَاعٍ ثَمَّ اَمِيْنٍ اس قاصد کی اس جہان میں فرماں برداری کی جاتی ہے کہ مملکتِ الٰہی کے دربار کی کسوٹی ہے اور اس دربار کے ارکان میں امین جانا گیا ہے کہ کسی غور اور تفتیش کے بغیر صرف اس کے کہنے پر عمل کرتے ہیں اور اس دربار کے لوگوں اور اس سرکار کے متوسلین کے ذہنوں میں اس کا پیغام اس قدر راسخ اور پختہ ہو گیا ہے کہ اسی کے حکم کو تفتیش اور تحقیق کے بغیر حکم الٰہی سمجھتے ہوئے اس کی تعمیل میں جلدی کرتے ہیں۔ چنانچہ جب جبرئیل علیہ السلام حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو شبِ معراج ہمراہ لے گئے تو آسمانوں کے دربانوں اور جنت وجہنم کے خازنوں نے ان کے حکم سے دروازے کھول دیئے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جہاں چاہا' سیر فرمائی جیسا کہ حدیث معراج میں تفصیل سے مذکور ہے۔

(یہاں سے یوں مترشح ہوتا ہے کہ شبِ معراج کارکنانِ قدرت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے نہیں بلکہ جبرئیل علیہ السلام کے لیے مصروفِ عمل تھے حالانکہ یہ تمام انتظامات تو شبِ اسریٰ کے دولہا سید الکونین صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے تھے۔ جبرئیل امین علیہ السلام تو بطورِ خادم ہمراہ تھے۔ چنانچہ علامہ بدرالدین محمود عینی حنفی رحمۃ اللہ علیہ شرح بخاری میں فرماتے ہیں والحكمة فيه ان السماء لم تفتح الا لاجله بخلاف مالو وجده

مفتوحا (عمدۃ القاری ج ۲ ص ۲۰۰) نیز نسیم الریاض شرح شفاء از علامہ شہاب الدین خا جی رحمۃ اللہ علیہ ج ۲ ص ۲۳۶ میں ہے۔ قال ابن المنیر استفتاحه لان ابوابها مغلقة ولم تفتح الا لاجله صلی اللہ علیه وسلم تنویها بقدره یعنی آسمان کے دروازے آج صرف حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے کھلے اگر پہلے کھلے ہوتے تو یہ مسئلہ معلوم نہ ہو سکتا اور اس سفر میں جبرئیل علیہ السلام کی حیثیت کے لیے یہی تصریح کافی ہے جو کہ علامہ ابوالفضل شہاب الدین سید محمود آلوسی بغدادی نے روح المعانی ج ۱۵ ص ۱۰ میں فرمائی ہے۔ فکان جبریل هو الآخذ برکابه ومیکائیل الآخذ بزمام دابته الی ان وصل الی ماوصل ثم تولی امره سبحانه بماشاء شبِ معراج براق کی رکاب حضرت جبرئیل علیہ السلام کے ہاتھ میں تھی جبکہ اس کی لگام حضرت میکائیل علیہ السلام کے ہاتھ میں' ان کی حد ختم ہونے کے بعد پھر سب کچھ ذاتِ حق سبحانہ وتعالیٰ کے تصرف سے تھا جہاں چاہا سیر فرمائی اس لیے کہ آپ کو بلایا ہی اس لیے گیا تھا بلکہ جہاں تک آپ نے سیر فرمائی' جبرئیل علیہ السلام کی تو سوچ کی بھی وہاں تک رسائی نہیں۔ علمائے ربانی اور فضلائے حقانی نے اپنے اپنے مقام پر کیا خوب ترجمانی فرمائی ؎

غنچے ما ادمی کے جو چٹکے دنیٰ کے باغ میں
بلبل سدرہ تو اس کی بو سے بھی محرم نہیں

ایک مقام پر فرمایا ؎

شان خدانہ ساتھ دے ان کے خرام کا وہ باز سدرہ سے تا ز میں جسے نرم سی ایک اُڑان ہے۔

از امام اہلِ سنت اعلیٰ حضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ) حکیم الامت حضرت مولانا مفتی احمد یار خاں صاحب گجراتی فرماتے ہیں۔

معراج کی شب ہمراہ ہیں سب سدرہ آیا کوئی نہ رہا
سدرہ سے بڑھے جبرئیل رُکے تنہا ہیں جو عرشِ خدا پایا

نیز شیخ سعدی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں ؎

چناں گرم در تیہ قربت براند کہ در سدرہ جبرئیل از و باز ماند

(محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اور ساتوں آسمانوں کے رہنے والوں تک احکامِ الٰہیہ کا پہنچانا انہیں کا کام ہے۔ گویا تمام فرشتوں سے حضرت جبرئیل علیہ السلام اس صفت میں کہ آپ خدائی احکام پہنچانے والے ہیں' ممتاز گردانے گئے ہیں۔ فرشتوں کی تمام اقسام میں آپ کا آنا اللہ تعالیٰ کی طرف سے کوئی پیغام لانے کی علامت ہے اور جب راوی اس درجے کا معتمد ہو کہ تمام عمائدین اس کے پیغامات کو قبول کریں اور اس کی سند نہ پوچھیں تو پھر بھی اس کی خبر میں جھوٹ اور بہتان کے احتمال کو جگہ دینا مالیخولیا سے زیادہ نہیں ہے۔

اور دوسرا واسطہ جو کہ تمہارے رسول علیہ السلام ہیں' ایک ایسی شخصیت ہیں جو چالیس (۴۰) سال سے زیادہ تمہارے پاس جلوہ گر ہیں اور خلوت وجلوت اور مقصد اور بے مقصد کسی طور پر تمہیں ان کے جھوٹ بولنے کی اطلاع نہیں ہے اور ایسی معتمد شخصیت کو خبر دینے میں معتبر نہ سمجھنا معقول نہیں ہے۔ مگر خیال میں کوئی خلل ہو کہ اندرونی حواس کے دگرگوں ہونے کی وجہ سے بے اصل عجیب شکلیں اس کے خیال میں آئیں اور عجیب وغریب آوازیں سنے اور اس کے خیال میں جو کچھ بھی آئے' اسے واقعی خیال کرے۔

وَمَا صَاحِبُكُمْ بِمَجْنُوْنٍ اور تمہارے پاس موجود اس شخصیت میں سودایا خیال نہیں کہ ان کی خبر کے بارے میں اس احتمال کو راہ دو۔ اس لیے کہ اس طویل صحبت میں ہر لحہ ان کی عقل اور دانائی کے کمال کا تم نے تجربہ کیا ہے۔ اور ان کے خیال اور قوت ذہنی کی درستی کو تم نے دریافت کیا ہے کہ تمام عقل مندوں سے بالاتر ہے۔ اور اس سب کچھ کے باوجود تمہارے دل میں شبہ گزرے کہ یہ پیغمبر علیہ السلام جس صورت کو دیکھتے ہیں اور اس کی زبان سے کلامِ الٰہی کو سنتے ہیں' ہمیں کہاں سے پتہ چلے کہ وہ جبرئیل کی صورت ہے' کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی جن یا شیطان نے اس صورت میں تمثل ہو کر فریب دیا ہو اور آواز دی ہو کہ جسے پیغمبر علیہ السلام نے آوازِ جبرئیل سمجھ لیا ہو۔ ہم کہتے ہیں کہ تمہارے یہ سب شبہات اس وقت کامیاب ہوتے ہیں کہ اس پیغمبر علیہ السلام نے جبرئیل علیہ السلام کو کبھی بھی ان کی اصلی شکل میں نہ دیکھا ہو۔

وَلَقَدْ رَاٰهُ بِالْاُفُقِ الْمُبِیْنِ تحقیق اس پیغمبر علیہ السلام نے اس قاصد کو اس کی شکل میں آسمان کے روشن کنارے میں دیکھا ہے یعنی مشرقی اُفق میں کہ اس سمت میں سورج کی وجہ سے کسی شبہ کا گمان تک نہ رہا تھا۔ اور جب ایک مرتبہ چیز کی حقیقت کو دیکھ لیا گیا تو ہر صورت اور ہر لباس میں اس حقیقت کی شناخت سہل اور آسان ہوگئی۔ مثلاً جب بچہ دریا میں پانی کو دیکھ لے۔ اگر وہ پانی کوزے یا لوٹے میں اس کے نزدیک لائیں تو بلاتوقف پہچان لے گا کہ یہ وہی پانی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصلی صورت پر دیکھ لینا حقیقت جبرئیلی منکشف ہونے کا موجب ہو گیا تھا کہ اس کے بعد آپ انہیں ہر صورت اور ہر لباس میں پہچان لیتے تھے۔ بیت

تو خواہی جامہ و خواہی قبا پوش

من انداز قدت رامی شناسم

مگر ایک دفعہ کہ چند مسائلِ دینیہ کی بابت سوال کرنے کے لیے آئے تھے اور اس ایک بار میں نہ پہچاننے میں راز یہ ہے کہ اس وقت جبرئیل علیہ السلام اپنی حقیقت سے جو کہ رسالت خدا کے لیے لازم ہے' تنزل کر کے سائلوں کی شکل میں آئے تھے اور وحی یا احکامِ الٰہی کا پروگرام نہیں تھا تا کہ جبرئیل علیہ السلام کو پہچاننا ضروری ہو۔

اور حدیث پاک میں وارد ہے کہ میں نے جبرئیل کو ان کی اصلی شکل میں کبھی نہیں دیکھا سوائے دوبار کے۔ ایک دفعہ تو وحی کے منقطع ہونے کے زمانے میں جبکہ انتہائی بے تابی کی وجہ سے میں نے چاہا پہاڑ کے اوپر سے چھلانگ لگا دوں اس ارادے سے مکہ معظمہ کے مقام جیاد سے میرا گزر ہوا اس وقت میں نے جبرئیل علیہ السلام کو دیکھا کہ مشرق کی سمت زمین و آسمان کے درمیان ایک چمک دار زریں کرسی پر بیٹھے ہیں اور ان کے جسم نے آسمان کے پورے کناروں کو گھیر رکھا ہے' ان کے چھ سو پر ہیں۔ جن میں یاقوت اور مروارید جڑے ہوئے ہیں۔ میں نے ایک عجیب نورانی شکل کا مشاہدہ کیا۔ دوسری دفعہ معراج کی رات سدرۃ المنتہیٰ کے پاس میں نے انہیں اسی صورت میں دیکھا اور قرآن مجید میں سورۂ والنجم کے اوائل میں ان دونوں مرتبہ دیکھنے کا ذکر فرمایا گیا ہے مگر اتنا فرق ہے کہ وہاں بار اول کے

دیکھنے کے بارے میں بالافق الاعلیٰ ذکر فرمایا گیا ہے جبکہ یہاں بالافق المبین کے ساتھ تعبیر فرمایا گیا ہے اور اندازِ بیان میں تبدیلی میں نکتہ یہ ہے کہ اس سورۃ میں پیغمبر علیہ السلام کی خبر کی صداقت اور اس کے مضمون کے بالکل واضح ہونے کو بیان کرنا مقصود ہے اس لیے لفظ مبین زیادہ مناسب ٹھہرا جبکہ وہاں پیغمبر علیہ السلام کے مرتبے کی رفعت اور ان کے آسمانوں پر چڑھنے کو بیان کرنا منظور ہے تو لفظ اعلیٰ موزوں ہوا۔

نیز آپ کے استواء (جو کہ ذُوْمِرَّةٍ فَاسْتَوٰى وَهُوَ بِالْاُفُقِ الْاَعْلٰى میں مذکور ہے) کی ابتدا جو کہ حقیقت جبرئیل کی تجلی سے کنایہ ہے' ایسی صورت میں ہے کہ اس حقیقت کا مقتضیٰ اُفق اعلیٰ میں تھا اور اس صورت کی نزدیکی اور قرب کی انتہا اُفق مبین میں تھی۔

(اقول وباللہ التوفیق یہاں مفسر علام نے ایک قول کے مطابق تفسیر فرمائی ہے جبکہ یہاں دوسرا قول بھی ہے۔ چنانچہ حکیم الامت حضرت مولانا مفتی احمد یار خاں صاحب گجراتی شان حبیب الرحمٰن من آیات القرآن میں فرماتے ہیں کہ ''اس آیت کے مقصد میں مفسرین کا بڑا اختلاف ہے ولقد راہ میں ہ سے کیا مراد ہے یعنی محبوب نے اس کو دیکھا۔ بعض نے کہا کہ جبرئیل کو دیکھا یعنی کسی پیغمبر نے حضرت جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصلی شکل میں نہ دیکھا' صرف ہمارے حضور علیہ السلام نے دو بار ان کو اصلی شکل میں دیکھا اس کے سوا انسانی شکل میں آتے تھے اس کا یہاں ذکر ہے۔ بعض نے فرمایا کہ اپنے رب کو دیکھا جنہوں نے رب کو دیکھنے کا قول کیا ہے وہ دو جماعتیں ہیں۔ بعض تو کہتے ہیں کہ دل سے دیکھا۔ یہ حضرت ابن عباس مانتے ہیں (مسلم) اور سر کی آنکھ سے دیکھا یہ حضرت انس بن مالک' حسن اور عکرمہ مانتے ہیں (تفسیر خزائن العرفان) صاحبِ روح البیان نے فرمایا کہ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں' رب تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کو اپنے کلام سے اور ہمیں اپنے دیدار سے مشرف فرمایا' مذہب اہلِ سنت یہ ہے کہ حضور علیہ السلام نے رب کو بچشم سر دیکھا۔ حسن بصری قسم کھا کر فرماتے ہیں کہ معراج میں حضور علیہ السلام نے رب کو دیکھا۔ امام احمد بن حنبل فرماتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے رب کو دیکھا' رب کو دیکھا' رب کو دیکھا یہاں تک فرمایا کہ آپ کی سانس بند ہو گئی۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اور اربابِ شہود میں سے بعض نے کہا ہے کہ عالم مثال کے دو اُفق ہیں اس کا اوپر کا اُفق عالم تجرد و تقدس کے متصل ہے۔ جبکہ اس کا نچلا اُفق عالم شہادت سے ملا ہوا ہے جب حقیقت جبرئیلی نے چاہا کہ خود کو اس حقیقت کے کمال کے مناسب شکل میں جلوہ گر کرے تو پہلے اُفق اعلیٰ میں مثال کی شکل اور جسم کا پردہ پہنا اور آہستہ آہستہ نزدیک ہوئی یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مکمل اتصال ہوا اور اُفق مبین سے مراد جو کہ اس حقیقت اور معنی کو ظاہر کرنے والا تھا' وہی عالم مثال کی نچلی سمت ہے نہ کہ اُفق آسمان' تشبیہ کی بناء پر اسے اُفق سے تعبیر کیا گیا ہے اس لیے کہ غیبی جہان غالب طور پر اہلِ کشف و شہود کی نظر میں دائروں کی صورت میں نمودار ہوتے ہیں اور سورۂ نجم میں قرآنی عبارت بھی اسی تقریر کی تائید کرنے والی ہے۔

اور جب نزولِ قرآن پاک میں اشتباہ کی وجوہ کلی طور پر زائل ہو گئیں تو اس کی خبروں کی تکذیب کا احتمال نہ رہا سوائے اس کے کہ بعض کفار شبہ کے طور پر اس کلام کو کاہنوں کی مقفیٰ کلام کی قسم سے جانتے تھے اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کاہن کہتے۔

کاہن کی حقیقت

اور کاہن کی حقیقت یہ ہے کہ بعض انسانی نفوس کو بعض شیطانی نفوس کے ساتھ مناسبت حاصل ہو جاتی ہے اور وہ شیطانی نفوس فرشتوں کی محفلوں سے جن میں آئندہ کے واقعات کی تدابیر کا ذکر ہوتا ہے' چوری چھپے کوئی چیز سُن کر اپنے اس دوست کے پاس پہنچا دیتے ہیں اور وہ شخص لوگوں کے پاس کہہ دیتا ہے اور کبھی واقع کے مطابق بھی ہو جاتا ہے اور افرادِ انسانی کے ساتھ یہ شیطانی معاملہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت شریفہ سے پہلے بہت مروج اور مشہور تھا اس سلسلے میں چند مشہور لوگ ہو گزرے ہیں جیسے شق اور سطیح اور غیب کی خبریں دینے میں ان کے عجیب و غریب واقعات مشہور و مذکور ہیں اور دیگر دو اور آیات میں اس شبہ کا بھی ازالہ فرمایا جا رہا ہے۔

کہانت کے شبہ کا ازالہ

اور اس شبہ کے ازالہ کا بیان یہ ہے کہ کسی کاہن کا علمِ غیب کی اقسام کو پورے طور پر

گھیرنے والا نہیں ہوتا یہاں تک کہ اگر اس سے باری تعالیٰ کے اسماء وصفات یا احکامِ شرعیہ کے متعلق جو کہ عالم غیب میں مقرر ہیں یا مذاہب کے حق و باطل ہونے کے متعلق یا جنت اور دوزخ کے حالات کے متعلق یا موت کے بعد ارواح کے ساتھ جو سلوک ہوتا ہے' اس کے متعلق اور اس قسم کے علوم کی بات پوچھیں تو توتلے اور لاجواب رہ جائیں گے۔ بلکہ گزشتہ بادشاہوں اور اُمتوں کی تاریخ کو بھی بیان نہیں کر سکتے۔ اس لیے کہ اس کے علم کا ماخذ ملائکہ کے کلام کو چوری چھپے سننا ہے جو کہ آئندہ کے واقعات کی تدبیریں کرتے ہیں اور بس تو اس کا علم تو آئندہ عنقریب واقع ہونے والے واقعات تک محدود ہے کہ جن پر ملائکہ کو آگاہ کیا گیا ہے اور انہیں ان کی تدبیر کرنے اور جاری کرنے کا حکم دیا گیا ہے اور جب اس علم کا حاصل کرنا چوری کرنے کے ساتھ وابستہ ہے تو ان واقعات کی تمام سمتوں کا احاطہ کرنے والا بھی نہیں ہوتا بلکہ رمز واشارہ کے طور پر ایک دو کلمے جو کہ ان واقعات کی اصل پر اجمالی طور پر دلالت کریں' ان کے ہاتھ لگتے ہیں اور وہ اپنی طرف سے اس واقعہ کے حواشی اور تتمے عقلی قیاس اور تجربوں کے طریقے بڑھا دیتے ہیں۔ وہ واقعہ کبھی تو ظاہر میں اس قیاس کے مطابق ہوتا ہے اور کبھی دوسرے رنگ میں ظاہر ہوتا ہے۔ پس امورِ غیبیہ کے بارے میں کاہن کا علم رمز واشارہ سے زیادہ کچھ نہیں ہے اور وہ بھی جہان کی جزئیات کے حالات کے ساتھ مخصوص ہے جو کہ عنقریب واقع ہونے والے ہوتے ہیں جبکہ یہ قرآن علم غیب کی تمام اقسام کو گھیرنے والا ہے اور اس کا بیان بھی وسیع ہے جو کہ ہدایت وارشاد کے لیے کافی ہے۔

(اقول وباللہ التوفیق حضرت مفسر علام کی وضاحت کے مطابق قرآن تمام اقسام غیب پر حاوی ہے۔ الرحمٰن علم القرآن کے مطابق حضرت رحمٰن جل شانہ نے پورا قرآن پاک حضور علیہ السلام کو خود پڑھایا تو معلوم ہوا کہ مشمولات قرآن کا علم حضور علیہ السلام کو حاصل ہے۔ یاد رہے ماکان وما یکون بھی غیب کی اقسام میں سے ہے اس لیے غیب کا یہ علم بھی حضور علیہ السلام کو حاصل ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِيْنٍ اور یہ قرآن علم غیب کے بیان میں بخل کرنے والا اور کوتاہی کرنے والا نہیں ہے' آدمی کو دنیا و آخرت میں جو علم و عمل چاہیے اس میں کوئی کوتاہی

نہیں رکھتا۔ پس اس مکمل ہدایت والے کلام کے بارے میں کہانت کا گمان کرنا وہی زربفت بنانے والے اور بوریا بنانے والی کی حکایت ہے۔ نیز کاہن کی زبان پر جو کچھ آتا ہے' شیطان کی بات ہوتی ہے جو کہ وہ فرشتوں کی محافل سے چرا کر لایا ہے۔

وَمَاهُوَ بِقَوْلِ شَيْطَانٍ رَّجِيْمٍ اور یہ قرآن دھتکارے ہوئے شیطان کی بات نہیں ہے اس لیے کہ جب شیطان حضرت آدم علیہ السلام کی تعظیم نہ کرنے کی وجہ سے رندۂ درگاہ ہوا' اسے حضرت آدم علیہ السلام کے ساتھ انتہائی دشمنی ہوگئی اور بارگاہِ خداوندی کے ساتھ بھی سخت بغض و عداوت پیدا ہوگئی۔ پس اس کی ہر بات میں آدمیوں کی بدخواہی پھیلی ہوتی ہے' اسے انہیں ہدایت دینے اور ان کے امرونہی سے کیا واسطہ؟ اس کا کام گمراہ کرنا اور ضلالت میں ڈالنا ہے۔ نیز اسے توحید' اللہ تعالیٰ کے اسماء وصفات کے ذکر' جنت اور جہنم کے ذکر' عالم آخرت کے اثبات' بتوں اور کفار کی مذمت' شہوت اور غضب کے افعال کی بُرائی بیان کرنے' ریاضت ومشقت کے اعمال کے حسن کو بیان کرنے' انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کی شان کی خوبیاں بیان کرنے اور فرعونوں اور بدکاروں کے مال کی خباثت بیان کرنے سے کیا غرض؟ کہ یہ امور تو اس ملعون کے جگر کا کانٹا اور آنکھ کا تنکا ہیں اور اس کی مارکیٹ کو ایک دَم برباد کر دیتے ہیں خصوصاً شیطان کے مکر سے دھوکا کھانے سے ڈرانا آدمیوں کے ساتھ اس کی دشمنی کو بیان کرنا' اس کی پیروی کی مذمت کرنا اور ان کاموں کی خباثت کو بیان کرنا جو کہ اسے پسند ہیں' کیا امکان ہے کہ اس کی زبان سے نکلے بلکہ شیطان تو یہ کلام سنتے ہی بھاگ جاتا ہے اور کان میں انگلیاں ڈال لیتا ہے کہ سنے نہیں۔

ع   دیو بگریز داز اں قوم کہ قرآن خوانند

یعنی شیطان تو اس قوم سے بھاگتا ہے جو قرآن پڑھے۔ اس ہدایت بھرے کلام کو شیطان کی بات سمجھنا انتہائی حماقت اور بے وقوفی ہے۔ چنانچہ کفار کو ان کے اس گمان فاسد میں ڈانٹنے کے انداز میں فرمایا جا رہا ہے۔

فَاَيْنَ تَذْهَبُوْنَ پس تم کدھر جا رہے ہو اور کن خیالوں میں سرگرداں ہو' امر واقع کو چھوڑ کر صریح طور پر محال اور ممنوع احتمالات کے ساتھ کہ جن پر تمیز والے بچے بھی ہنسی کرتے

ہیں' دھوکہ کھا رہے ہو۔ گویا گھر کا راستہ گم کر کے کنویں میں جا رہے ہو۔

یہاں جاننا چاہیے کہ اکثر معتبر قراء نے وَمَا هُوَ عَلَى الْغَيْبِ بِضَنِينٍ کو جو کہ صاد کے ہم شکل نقطے والے ضاد کے ساتھ ہے' طا کے ہم شکل نقطے والے ظا کے ساتھ پڑھا ہے اور ظاہر کے ساتھ ظنین کا معنی متہم ہے اور اس صورت میں ہو کی ضمیر صاحب کی طرف راجع ہو گی جو کہ ذات رسول علیہ الصلوٰۃ والسلام سے عبارت ہے۔ یعنی تمہارے رسول علیہ السلام امر غیب پر متہم نہیں ہیں کہ نہ دیکھی ہوئی چیز کے متعلق کہیں کہ میں نے دیکھی ہے اس لیے جزوی آسان امور میں تم ان پر جھوٹ کی تہمت نہیں رکھتے ہو تو اس امر عظیم پر تم ان کی طرف جھوٹ کی نسبت کیسے کرو گے اور تہمت لگاؤ گے؟ پس یہ شبہ بھی زائل ہو گیا کہ شاید اس پیغمبر نے جبرئیل علیہ السلام کو ان کی اصلی شکل میں دیکھنے کے دعویٰ میں (معاذ اللہ) درست نہ کہا ہو۔

اور ضاد اور ظا کے مخرج میں فرق بہت مشکل ہے' ان علاقوں کے اکثر پڑھنے والے دونوں کو یکساں نکالتے ہیں' نہ ضاد ضاد کے مقام پر ہوتا ہے اور نہ ظا ظا کے مقام پر۔ قاری قرآن کے لیے ان دو حرفوں کے مخرج کو جدا جدا پہچاننا ضروری ہے۔

ض اور ظ کے مخرج کا بیان

پس ض کا مخرج زبان کے کنارے کی جڑ ان دانتوں کی مدد کے ساتھ ہے جنہیں اضراس کہتے ہیں خواہ دائیں طرف سے لے لیں یا بائیں طرف سے اور اس حرف کو بائیں طرف سے نکالنا اکثر لوگوں پر آسان ہوتا ہے لہٰذا زیادہ تر اسی طرف سے نکالتے ہیں۔

اور ظا کا مخرج زبان کا کنارہ اوپر کے دانتوں جنہیں ثنایا علیا کہتے ہیں' کی جڑ کی مدد سے ہے جیسے دال اور تا۔ نیز جاننا چاہیے کہ اکثر مفسرین نے ان قسموں کو انہ لقول رسول کریم کے مضمون پر وارد کیا ہے اور مقسم علیہ اسی مضمون کو قرار دیا ہے لیکن ان قسموں کو اس کے ماسبق کے عقب میں جو کہ فلا اقسم میں حرف فا کا مدلول ہے' لانے میں ایک خفیہ نکتہ ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ جب قیامت کے دن اعمال کی جزاء کا منکشف ہونا بارہ (۱۲) قسم کے اسباب پر معلق کر دیا گیا تو معلوم ہوا کہ واقعہ رونما ہونے سے پہلے اس کی تدبیر کرنا چاہیے اور یہ تدبیر حضرت حق سبحانہ و تعالیٰ [illegible]

قرآن پاک بھیجنے کے بغیر ممکن نہیں۔ پس قرآن کے مضامین کے صحیح ہونے پر قسم اُٹھانا ضروری ہے تاکہ مکلفین اس کے مطابق عمل کریں اور قیامت کے دن ندامت اور حسرت نہ اُٹھائیں۔

قسموں کی ان مضامین کے ساتھ مناسبت کا بیان

ہم یہاں پہنچے کہ ان قسموں کی اس مضمون سے کیا مناسبت اور کونسی دلالت ہے؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ پانچوں ستاروں کا رجوع' استقامت اور اقامت گزشتہ انبیاء علیہم السلام پر بار بار وحی آئے' ان کے اُمتیوں میں مدت دراز تک اس وحی کے اثرات باقی رہنے اس مدت کے بعد ان اثرات کے ختم ہونے اور اس علم کے گوشہ خفا میں لوٹنے کا نمونہ ہے اور رات کا آنا اس زمانہ فترت کا نمونہ ہے جو کہ وجود باجود خاتم المرسلین علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پہلے دنیا میں تھا کہ کسی کو حق و باطل کی تمیز نہ رہی تھی اور وحی کے اثرات بالکل زائل ہو چکے تھے اور صبح کا سانس لینا قرآن پاک کے نزول اور اس رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت کی مثال ہے کہ ہر چیز کو دن کی طرح یوں روشن کر دیا کہ کوئی شبہ نہ رہا۔ گویا گزشتہ انبیاء علیہم السلام کا نور ستاروں کے نور کی مانند تھا جبکہ یہ نور چمکتا ہوا آفتاب اور کیا ہی اچھا کہا گیا ہے۔

فَاِنَّهٗ شَمْسُ فَضْلٍ هُمْ كَوَاكِبُهَا
يظهرن انوارها للناس في الظلم
حتي اذا طلعت في الكون عم هدي
هدي للعالمين واحيت سائر الامم

یعنی حضور صلی اللہ علیہ وسلم فضیلت کا آفتاب ہیں اور باقی انبیاء علیہم السلام اس کے ستارے ہیں جن کے انوار تاریکیوں میں لوگوں کے لیے ظاہر ہوتے ہیں حتیٰ کہ جب کائنات میں طلوع ہوا تو جہان والوں کے لیے ہدایت عام ہو گئی اور سب اُمتوں کو زندہ کر دیا۔

جب اس صاحبِ اعجاز کلام کی صداقت کو بیان کرنے اور اس کی مخالف باتوں کو باطل کرنے سے فراغت ہوئی تو اب حصر کے طریقے سے اس کلام کی کچھ صفات بیان فرمائی جا رہی ہیں کہ اس کے حق میں اس قسم کے احتمالات کی کوئی گنجائش نہیں۔

اِنْ هُوَ اِلَّا ذِكْرٌ قرآن نہیں مگر ایک عظیم نصیحت جو کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء اور صفات کو شامل ہونے کی وجہ سے ذکر کے حکم میں داخل ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کے حضور قرب اور واصل ہونے کا وسیلہ ہوسکتا ہے۔

لِلْعٰلَمِيْنَ جہان والوں کے لیے اور اس سے مراد انسان' جن اور فرشتے ہیں اس لیے کہ نصیحت اور ذکر کو ان تین گروہوں کے سوا کوئی نہیں پہچانتا۔ آدمی اور جن اس کلام سے نصیحت بھی حاصل کرتے ہیں اور گناہوں سے بھی محفوظ رہتے ہیں اور نیکیوں کی طرف رغبت کرتے ہیں اور اس کی تلاوت سے خداوند حقیقی کے حضور قرب معنوی بھی حاصل کرتے ہیں جبکہ فرشتے اس کی تلاوت کے ساتھ اُنس رکھتے ہیں اور دُور دُور سے اسے سننے کے لیے آتے ہیں اور اس کے حروف اور کلمات کی خدمت کرتے ہیں اور آسمان پر لے جاتے ہیں اور قبولیت کے مقام تک پہنچاتے ہیں اور یہ سب کچھ ان کے لیے عنداللہ قرب حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتا ہے لیکن قرآن پاک کے ان منافع سے بہرہ ور ہونا خاص ہے۔

لِمَنْ شَآءَ مِنْكُمْ اَنْ يَّسْتَقِيْمَ اس کے لیے جو کہ تم میں سے سیدھا چلنا چاہے۔ اس لیے کہ قرآن پاک کے معنوں کو سمجھنے میں کج روی زیادہ تر سنگ دلی' نصیحت سے دُوری اور دربارِ خدا [illegible] سے بعد اور حجاب کا موجب ہوتی ہے۔ پس قرآن پاک کی مثال اچھی غذا کی طرح ہے کہ صحت مند جسم میں قوت کی زیادتی اور صحت کے کمال کا موجب ہوتی ہے جبکہ فاسد اخلاط والے جسم میں مرض کی زیادتی اور کمزوری بڑھانے کا سبب ہوتی ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا گیا ہے فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَهُمُ اللّٰهُ مَرَضًا (۱-۲) نیز فرمایا گیا ہے وَاَمَّا الَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ فَزَادَتْهُمْ رِجْسًا اِلٰى رِجْسِهِمْ۔ (۱۱-۵)

اور اسی لیے محققین نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید رسولِ کریم علیہ السلام کا نور صحبت اولیاء۔ اور علمائے کرام کی وعظ و نصیحت۔ سب کا سب مذاہب کی حفاظت اور ان کی تکمیل کے لیے غذا کی مانند ہے اور جو چیز جہالت اور گمراہی کی بیماری کا علاج ہے' وہ ان چیزوں کے علاوہ اور چیز ہے۔ اور اگر یہ چیزیں ایک دوا کی طرح ہوتیں تو جہان میں کوئی شخص بھی گمراہی کی بیماری میں گرفتار نہ رہتا اور سب کو روبصحت کر دیتیں اب اس چیز کی طرف اشارہ

فرمایا جا رہا ہے کہ وہ چیز خدا تعالیٰ کے قبضے میں ہے اس میں کسی کا دخل نہیں۔

وَمَا تَشَآءُوْنَ اور تم علم و عمل میں راست روی نہیں چاہتے ہو۔ اِلَّآ اَنْ یَّشَآءَ اللّٰهُ مگر جب کہ خدا تعالیٰ چاہے۔ اس لیے کہ تم اس کے اقتدار کے قبضے میں مجبور ہو اور تمہارا ارادہ اس کے ارادے کے تابع ہے جیسا کہ پتلیاں نچانے والے کے ہاتھ میں پتلیاں۔ فرق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے ارادے سے تم میں ارادہ اور اختیار پیدا کرتا ہے اور تم اس ارادہ اور اختیار کے مطابق اچھے بُرے کام کرتے ہو اور ثواب اور عذاب کے مستحق بنتے ہو اور پتلیوں والے کے لیے پتلیوں میں ارادہ اور اختیار پیدا کرنے کی قدرت کا تصور نہیں ہے' وہ صرف حرکت دیتا ہے اس لیے پتلیوں کا فعل پتلیوں والے کی طرف منسوب ہو جاتا ہے اور حرکتوں کی اچھائی بُرائی پتلیوں کی طرف نہیں لوٹتی بلکہ حرکت دینے والے کی طرف۔ بخلاف آدمیوں کے کہ جب وہ اپنے ارادے اور اختیار کے ساتھ کام کرتے ہیں تو تعریف و مذمت اور ثواب و عذاب کا مورد بنتے ہیں۔

اسی لیے عقلاء نے کہا ہے کہ فعل اور اس کے سبب کے درمیان صاحبِ اختیار کا واسطہ ہونا فعل کے تعلق کو اس سبب سے قطع کر دیتا ہے جس طرح کہ دنیوی تدابیر میں غلط اور صحیح کو مشورہ اور صلاح دینے والوں کی طرف منسوب نہیں کرتے بلکہ غلط یا صحیح کرنے والے کو بُرا یا اچھا کہتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس تمام امور میں اسی قاعدے کا لحاظ کیا جاتا ہے۔ اور بعض افراد کے ساتھ ہدایت چاہنے کو خاص کرنے کے باوجود اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا عموم تمام جہان والوں کے ساتھ بحال اور برقرار ہے۔ اس لیے کہ اس کی صفت رَبُّ الْعٰلَمِيْنَ ہے یعنی جہانوں کو پالنے والا ہے۔ پس اس کی رضا اس کی اطاعت میں ہے۔ اور اس کی ناراضگی اس کی نافرمانی میں۔ تاکہ جہانوں کا باہمی رابطہ برہم نہ ہو اور اس میں خلل نہ پڑے۔ اور اگر وہ اہلِ معصیت سے بھی اطاعت کرنے والوں کی طرح راضی ہو۔ یا اور ان پر ناراضگی نہ فرماتا تو اس کے قہر' سیاست' حکمت اور عدالت کا جہان جس کے آثار جہنم اور اس کے طبقات ہیں' بے کار رہتا اور اگر اطاعت کرنے والوں کو نوازنے کے ساتھ خاص نہ فرماتا اور انہیں جنت کی نعمتیں عطا نہ فرماتا تو اس کی مہربانی اور قدر شناسی کا جہان جس کے آثار جنت' اس کے

درجات' حوریں اور خدام ہیں' بے مقصد ہو جاتا ہے۔

سورۃ الانفطار

مکی ہے' اس کی انیس (۱۹) آیات اور تین سو انتیس (۳۲۹) حروف ہیں۔

سورۂ تکویر سے رابطے کی وجہ

اور اس سورۃ کا سورۂ اِذَا الشَّمْسُ كُوِّرَتْ کے ساتھ رابطہ اس قدر ظاہر اور واضح ہے کہ بیان کی ضرورت نہیں۔ بلاتشبیہ اس سورۃ کو اس سورۃ کا دوسرا مصرع کہا جا سکتا ہے بلکہ اگر بیان کی ضرورت ہے تو یہ کہ ان دونوں سورتوں کو جدا جدا کیوں نازل فرمایا گیا اور فرق کی وجہ یہ ہے کہ یہاں اس سورۃ میں قیامت کی ابتدا کے حادثوں کو بیان کرنا منظور ہے کہ یہ جہان کس طرح برباد ہو کر دوسرے جہان کی بنیاد پائے گا۔ اور اس جہان میں انسان کی علمی قوت اپنے اوج کمال کو پہنچ جائے گی اور اس کی قوتِ عملی قوتِ خیالیہ کی طاقت اور مواد اور اسباب پانے کی وجہ سے رب العالمین جل جلالہ کی قدرت کا حکم پالے گی اور کن فیکون کے طریقے سے مرادیں حاصل ہوں گی اور اس دن انسانی خلافت کا معنی مکمل طور پر ظاہر ہو کر جلوہ گر ہو گا لیکن اس سورۃ میں جہان کے اصول کی خرابی کی کیفیت پر اکتفاء فرمایا گیا ہے جبکہ وہاں اس جہان کے اصولی و فروع کی خرابی کی کیفیت اور اس جہان کے دونوں مقامات جنت اور جہنم کو آباد کرنے کی کیفیت کو تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا گیا ہے۔

اور اس سورۃ میں انسانی علم کے ان تمام چیزوں پر محیط ہونے کے بیان پر اکتفاء فرمایا گیا ہے جو دنیا میں کرنے یا نہ کرنے کی صورت میں اس سے صادر ہوئیں جبکہ وہاں اس کے علم کا اس چیز پر محیط ہونا بیان کرنا مقصود ہے جو کہ فعل اور ترک فعل کی کثرت سے ملنے والی وجدانی زندگی سے جو کہ اس کے جوہر نفس کو لازم ہو گی' نقد حاصل ہو گی۔

نیز اس سورۃ میں اس بیان سے جزا دینے کے اثبات اور اس کے منکروں کے عقیدہ کی تردید کی طرف انتقال فرمایا گیا ہے جبکہ اس سورۃ میں اسی بیان سے اثبات رسالت' نزول قرآن اور اس کے منکروں کی تردید کی طرف انتقال فرمایا گیا' ان اختلافات کی بناء پر ان

دونوں سورتوں کو جدا جدا نازل فرمایا گیا ہے۔

اجمال کی تفصیل

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب چاہتے ہیں کہ ایک جہان کو خراب کر دیں اور اسی مواد اور انہیں صورتوں سے دوسرا جہان ترتیب دیں تو ناچار پہلے اس جہان کے اصول اور ارکان کو ڈھانے پر توجہ کرتے ہیں اور اس کے مواد میں کم و بیش تبدیلی کو کام میں لاتے ہیں اور صورتوں میں بھی تصرف کرتے ہیں تاکہ مواد کا کچھ حصہ جو کہ کسی صورت میں مصور تھا' کسی دوسرے حصے کے ساتھ جمع ہو کر جہانِ نو کے مناسب کی کوئی اور صورت اختیار کرے اور جو کام اس جہان میں مقصود ہیں اس صورت سے سرانجام پائیں۔ چنانچہ جس وقت کسی حویلی کو باغ یا باغ کو قبرستان یا بے کار پڑی ہوئی زمین کو حویلی یا خراب زمینوں کو قابلِ کاشت بناتے ہیں تو اسی طرح کرتے ہیں۔

آدمی کو مرتبہ خلافت کی تکمیل کے لیے یہاں لایا گیا

اور عالم دنیا حقیقت میں نوعِ انسانی کے لیے ٹھہرنے اور ہمیشہ رہنے کا جہان نہیں ہے بلکہ اسے یہاں صرف کمال حاصل کرنے کے لیے لایا گیا ہے تاکہ اپنی تکمیل کے بعد خلافتِ الٰہیہ کا مرتبہ پیدا کرے اور دوسرے جہان کو علم و عمل کی وسعت کے کمال کے ساتھ آباد کرے اور اس جہان میں دائمی سکونت اختیار کرے۔ تو دنیا میں پہلے اسے دو چیزوں سے مرکب پیدا کیا گیا ہے' ایک آسمانی اور دوسری زمینی۔ آسمانی چیز روح ہے اور زمینی چیز اس کا جسم۔ لہٰذا اس کے جسم کی غذا لحہ بہ لحہ زمین سے پہنچتی ہے اور روح کی غذا آسمان سے نازل ہوتی ہے اور خلافت اور تصرف کی ورزش کی بناء پر اسے زمین اور آسمان کی چیزوں میں دونوں تصرف عطا کیے گئے ہیں تاکہ جمع کرنے اور جوڑنے کا سلیقہ پیدا کرے اور خلافتِ کبریٰ کے لائق ہو جائے اور یہی وجہ ہے کہ وہ زمین کی تمام مخلوقات معدنیات اور پتھروں کو نباتات اور درختوں کو' چشموں اور نہروں اور چلنے اور اُڑنے والے جانوروں کو اپنے کام مصروف کر دیتا ہے اور دائمی جمع و تالیف میں مصروف ہوتا ہے۔ اور غذا' مسکن' سواری اور لباس وغیرہ ہر جنس سے عجیب و غریب مصنوعات بروئے کار لاتا ہے۔ اور مواد پر صورتوں کا فیض دینے اور مختلف

خواص اور احکام والی عجیب صورتوں کو گھڑنے میں اصول و فروع کے خالق کے ساتھ مشابہت پیدا کرتا ہے اور اسی طرح آسمانی مخلوق میں سے ثوابت اور سیارگان اور عالی مرتبت ملائکہ میں سے بہت سی مخلوق کو اپنی ضرورتوں میں کام میں لیتا ہے اور اس جہان کو مسخر کرنے کا طریقہ اپنے قبضے میں سمجھتا ہے۔

لیکن بعض کو اس کام میں زبردست نقصان لاحق ہوتا ہے کہ بے جا تصرفات کی وجہ سے رُتبہٗ خلافت کیا مرتبہٗ بندگی سے دُور جا گرتے ہیں اور جو کچھ کرنا چاہیے تھا' نہیں کرتے اور جو کچھ نہیں کرنا چاہیے تھا' کرتے ہیں اور وبال اور عذاب کے مستحق ہو جاتے ہیں۔ اس لیے دارآخرت کو دونوں گروہوں کے درمیان امتیاز قائم کرنے کے لیے مقرر فرمایا گیا ہے تاکہ خلافتِ کبریٰ کی صلاحیت جو کہ نیکوں کے ہاتھ آئی ہے' وہاں وسعت اور ہمیشگی کے ساتھ ظہور فرمائے اور اپنے مالک کی پسندیدہ اداؤں سے بغاوت' عداوت اور دُوری کی خصلت جو کہ بُروں کو نصیب ہوئی' وہ بھی اس جہان میں اوج کمال کو پہنچ کر قبیح دائمی نتائج کا پھل دے اور اس کام کے لیے اس جہان میں تمام جسموں اور روحوں کو اس مخلوق کا خادم بنانا ضروری ہوا اس لیے کہ نہ تو اس ضعیف مخلوق کا جسم ہمیشہ رہنے کی طاقت رکھتا ہے اور نہ ہی اس کی روح عظیم دائمی کام کرنے پر قادر ہے لہٰذا یوں طے پایا کہ سب آسمانی روحیں اس کی روح کی مدد کرنے والی ہوں اور ان کی عقلی اور خیالی قوتیں اس مخلوق کی عقلی اور خیالی قوتوں میں لپیٹ دی جائیں اور زمین کے سب مادے اس مخلوق اور اس مخلوق کے متعلقات جو کہ اس کی صنعتوں کا موضوع ہیں جیسے لباس' کھانے کی چیزیں' رہائش گاہیں اور تفریحات بلکہ زنجیریں' طوق' سانپ' بچھو' آگ اور جلانے والے شعلے کے جسم میں مدد کریں اور اس کے کام میں لگ جائیں تاکہ نیکوں کے خلافت اور بُروں کی سرکشی اور بغاوت کا معنی اچھی صورت میں جلوہ گر ہو۔

چار انقلابات کا بیان

پس اس صورت میں چار انقلابات کا ذکر فرمایا گیا ہے جو کہ اس جہان کے اصول سے متعلق ہیں۔ پہلا انقلاب آسمان کا پھٹنا جس کی وجہ آسمانی عقول و نفوس کا رابطہ ان اجرام سے باطل ہو جائے گا اور ان عقول و نفوس کا تعلق نفوس انسانیہ کے ساتھ قائم ہو جائے گا اور

شرع میں اس مقصد کی تعبیر یوں فرمائی گئی ہے کہ اس روز ساتوں آسمانوں کے فرشتے اُتریں گے اور لوگوں کے اردگرد ہو جائیں گے اور بنی آدم کی ارواح کے ساتھ ہمراہی اختیار کریں گے اور جب وہ نفوسِ انسانی نفوس کے ساتھ متعلق ہو گئے تو افرادِ انسانی کے ادراک اور تخیل میں عظیم کشادگی پیدا ہو جائے گی اور ان کے اچھے بُرے اعمال جو کو دنیا میں ان سے سرزد ہوئے تھے، کے معنوں کی کلیات اور جزئیات پورے طور پر روشن اور واضح ہو جائیں گی۔

دوسرا انقلاب آسمانی ستارے بے نور ہو کر گر پڑیں گے اور نورانی ارواح جو کہ ان ستاروں کے ساتھ تعلق رکھتی تھیں، انسان کے جسم کے ساتھ متعلق ہو جائیں گی تو ان حالات کی مناسبت کے مطابق جو کہ ارواحِ انسانی نے دنیا میں کمائے یا عطا ہوئے ارواح کو کبیہ کے مل جانے کی وجہ سے عظیم قوت پالیں گے اور اس مطلب کو قرآن مجید میں اس جہان میں نزول روح اور قیام روح کے ساتھ تعبیر فرمایا گیا ہے اور یہ دو آسمانی انقلاب ہیں جو کہ انسان کے روحانی جُہان کی کشادگی کا موجب ہوں گے۔

تیسرا انقلاب دریائے شور اپنی تمام شاخوں سمیت دُھواں اور بخارات ہو کر اس کا کچھ حصہ زمین میں جذب اور خشک ہو جائے گا تا کہ زمین میں کچھ نمی اور نرمی پیدا کرے اور اس پر صورتوں اور شکلوں کا نقش ہونا آسان ہو اور اس کا کچھ حصہ مشتعل ہو کر جلانے والی آگ بن جائے گا تا کہ جہنم بھڑکانے کا مادہ ہو جائے اور اس انقلاب سے کبھی دریا جاری کرنے اور دریا بھڑکانے کے ساتھ تعبیر فرمائی گئی ہے اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم دریائے شور کے بارے میں فرماتے تھے کہ ان تحتہ نارًا یعنی اس کے نیچے آگ ہے اور مروی ہے کہ جب حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ دریائے شور یعنی سمندر کو دیکھتے تو فرمایا کرتے تھے کہ یابحرمتی تعوذ نارًا اے دریا تو کب آگ ہوگا۔

چوتھا انقلاب زمین کا زلزلہ ہے جس کے متعلق قرآن مجید میں جگہ جگہ زلزلة الساعة کے ساتھ تعبیر فرمائی گئی ہے اور اس کے آثار میں سے بہت سی چیزیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ ان میں سے بعثرة القبور ہے یعنی مردوں کے مواد اور ان کے جسمانی اجزا کا جمع ہونا اور ان ... کا زمین کے باطن سے اس کے ظاہر پر موجود ہونا جو کہ اس سورۃ میں بھی مذکور ہے۔ اور

ان میں سے پہاڑوں کا چلانا ہے۔ اور ان میں سے بوجھ نکالنا ہے۔ اور ان میں سے زمین کا ہموار ہونا اس میں کسی علامت اور عمارت کا باقی نہ رہنا۔ اور اس کی نشوونما کی قوت کا ختم ہونا ہے۔ اور ان میں سے وہ ہے جو کہ صحیح حدیث شریف میں وارد ہے کہ زمین سفید میدے کی روٹی کی طرح ہو جائے گی جو کہ اس میدان میں اہلِ محشر کی غذا ہوگی اور اس کے علاوہ اور بھی علامات ہیں جنہیں تفصیلاً بیان کرنے سے بات طویل ہو جائے گی۔

اور یہ دو انقلاب زمینی انقلاب ہیں جن کی وجہ سے انسان کے جسمانی مواد کی وسعت حاصل ہوگی تاکہ اس نفس وسیعہ اور روحِ کاملہ کا موضوع الصناعہ ہو سکے۔ ان چار انقلابات کے بعد جہانِ نو جس کا نام آخرت ہے' کی بنیاد رکھی جائے گی اور اس بنیاد کی اصل الاصول اچھے بُرے اعمال کی حقیقت کا منکشف ہونا ہے جو کہ نفسِ انسانی پر کھولیں گے۔ اسی لیے اس سورۃ میں ان چار انقلابات کے ذکر کے بعد اسی مقصد کا ذکر کیا گیا ہے۔ اور انہیں چار انقلابات پر اکتفاء کرنے کی وجہ یہ ہے کہ تحقیق کے مطابق جہان کی اصول یہی چار

چیزیں ہیں: آسمان' ستارہ' پانی اور زمین اور دوسری سب چیزیں ان چاروں چیزوں کے آثار اور اجزا کے جمع ہونے سے بنی ہیں: معدنیات' نباتات' جمادات' حیوانات اور فضا کی کائنات خود تمام عقلاء کے نزدیک انہیں چیزوں سے پیدا ہوتی ہیں البتہ کارخانہ عقل کے ظاہر بینوں نے ہوا اور آگ کو مستقل ارکان گمان کیا ہے لیکن تحقیق یہ ہے کہ ہوا ایک جسم ہے جو کہ پانی کی لطافت یا بعض ستاروں کی تاثیر کی وجہ سے کم و بیش ہوتا ہے' خود اس کا کوئی خزانہ اور جائے قرار نہیں ہے اور اس کی کوئی صورت نہیں ہے اس کا کام سیر اور گردش ہے اور مخلوقاتِ عالم کی کیفیات کو ایک دوسرے تک پہنچاتا ہے جیسے بو کو سونگھنے کی قوت تک اور آواز کو سننے کی قوت تک اور نمی' ٹھنڈک' حرارت اور خشکی کو ٹٹولنے کی قوت تک پہنچاتا۔ علی ہذا القیاس۔

اور آگ وہی ہوا ہے جس نے انتہائی تیز حرکت یا آفتاب کے اثر کرنے سے بھڑک کر یہ صورت اختیار کر لی ہے اور اس کا کام کچی چیزوں کو پکانا اور اس چیز کو جلانا ہے جو بے کار ہو چکی ہے' غذا کی اصلاح کرنے والی چیز کے مرتبے میں ہے کہ فی نفسہ درکار نہیں ہے۔

اسی لیے جدا خزانہ نہیں رکھتی۔ چنانچہ فیلسوف خیال کرتے ہیں کہ کرۂ ہوا اور کرۂ نار پانی اور زمین کے دونوں کروں کے اوپر محیط ہے۔ یہ ایک بے دلیل بات ہے جیسا کہ آسمان اور ستاروں پر پھٹنا اور مل جانے کا ممنوع ہونا بھی اسی وادی سے ہے۔

اور اس سورۃ کا نام سورۃ الانفطار اس لیے رکھا گیا ہے کہ آسمان کا پھٹنا آسمانی عقول و نفوس کے نفسِ انسانی کے ساتھ متعلق ہونے کا سب سے عمدہ سبب ہے اور یہ تعلق درحقیقت وہی ہے جو کہ ماقدمت واخرت کے علم کے حصول کا سبب ہے کہ جسے یہاں بیان کرنا مقصود ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا السَّمَآءُ انْفَطَرَتْ جبکہ آسمان پھٹ جائے اور اس کے پھٹنے کی کیفیت کو دوسرے مقام پر یوں ذکر فرمایا گیا ہے کہ بادل سے مشابہہ ایک جسم عرشِ الٰہی کے نیچے سے نزول کرے اور اس کے صدمے سے آسمانوں کے جسم پاش پاش ہو جائیں۔ درحقیقت وہ بادل اللہ تعالیٰ کی تجلی قہری کی صورت ہے جو کہ اس جہان کو برباد کرنے کے لیے متوجہ ہوگی۔

ایک جواب طلب سوال

یہاں بعض ذہین لوگ ایک جواب طلب سوال کرتے ہیں' کہتے ہیں کہ اس جہان کی ابتدا میں زمین سے آغاز فرمایا گیا ہے کہ خَلَقَ لَكُمْ مَا فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ثُمَّ اسْتَوٰى اِلَى السَّمَآءِ اور اس کی خرابی میں آغاز آسمان سے کیوں فرمایا گیا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب کسی عمارت کی تعمیر منظور ہو تو پہلے بنیاد رکھتے ہیں اور جب کسی عمارت کو گرانا مقصود ہوتا ہے تو پہلے اسے اوپر سے شروع کیا جاتا ہے۔

وَاِذَا الْكَوَاكِبُ انْتَثَرَتْ اور جبکہ ستارے بکھر کر گر پڑیں اور ان مذکورہ دو انقلابوں کی وجہ سے نفوس سماویہ کا تعلق ان ستاروں اور ان آسمانوں سے ختم ہو جائے اور اس کے ضمن میں نفوسِ سماویہ کے ساتھ عقول کا تعلق بھی ختم ہو جائے اور نفوس کے تابع ہو کر افلاک کی خیالی قوتیں بھی ان کے اجرام سے جدا ہو جائیں اور وہ نفوس انسانی نفوس کے ساتھ امتزاج اور اتحاد پیدا کریں اور فلک کی عقول کا فیضان اور خیال کی کارکشائی سب انسانی نفس کے

ساتھ تعلق قائم کرے اور اسے عظیم وسعت نصیب ہو اور اسے ماقدمت واخرت کے معنوں پر کلی، جزوی، عقلی اور مناسب شکلوں کے ساتھ خیالی طور پر اطلاع حاصل ہو۔

وَاِذَا الْبِحَارُ فُجِّرَتْ اور جبکہ سمندر جاری کیے جائیں اور رُکنے اور ٹھہرنے کی موجودہ حالت بدل جائے۔ اور شیخ ابو منصور ماتریدی رحمۃ اللہ علیہ سے فرمایا ہے کہ پہلے سمندروں کو ایک جگہ جمع کیا جائے گا اس کے بعد اُبلنے کی وجہ سے بھڑک اُٹھیں گے اور انہیں جلا کر ایک حصے کو دُھواں بنا دیں گے جو کہ میدانِ قیامت کی فضا کو پُر کر دے اور اس سے ایک حصہ جہنم کی آگ بن جائے۔

پس اس سورۃ میں سمندروں کے انقلاب کی ابتدا کا ذکر ہے کہ وہ رُکنے اور ٹھہرنے سے بدل کر جاری ہو جائیں اور تمام سمندر مل کر ایک سمندر بن جائیں جبکہ سورۃ تکویر میں اس انقلاب کا آخری حصہ ذکر کیا گیا ہے جو کہ جلانا اور بھڑکانا ہے اور اس سورۃ میں بعثرۃ القبور کی مناسبت کے لیے تفجیر یعنی جاری کرنے کو اختیار فرمایا گیا ہے اس لیے کہ پانی بنیادوں کے نیچے آنے کی وجہ سے عمارتوں کو زیروزبر کرنے کا موجب ہوتا ہے اور اس سورۃ میں جہنم کو بھڑکانے کی مناسبت سے تسجیر اور بھڑکانے کو اختیار فرمایا گیا۔

لفظ بحر اور نہر کے معنوں کی تحقیق اور قطعات بحر کا بیان

اور لغتِ عرب میں بحر خاص دریائے شور کا نام ہے اور میٹھے پانی کی نہریں اگرچہ وہ وسیع اور گہری ہوں، انہیں انہار کہتے ہیں۔ پس جمع کا لفظ بحار لانا باوجودیکہ دریائے شور ایک چیز ہے اس کی شاخوں کے متعدد ہونے کے پیشِ نظر ہے۔ چنانچہ راستوں اور ملکوں والوں نے لکھا ہے کہ بحر محیط کے ایک حصے کا نام بحر چین ہے اور ایک حصے کا نام بحر ہند۔ ایک حصے کا نام بحر فارس، ایک حصے کا نام بحر قلزم ہے۔ علیٰ ہذا القیاس

اور بحار کے جاری کرنے سے انسانی اجسام کا مادہ اور ان اجسام کو عذاب اور سزا دینے کے اسباب زیادہ ہو جائیں گے اور نفوسِ سماویہ کا ان جسموں سے تعلق صحیح ہو جائے گا۔

وَاِذَا الْقُبُوْرُ بُعْثِرَتْ اور جبکہ قبریں زیروزبر کر دی جائیں گی اور جو کچھ زمین کے نیچے تھا زمین پر آ جائے۔ اور جسموں کے اجزا ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں۔ اس

کے بعد وہ بارش جسے زندگی کی قوت سپرد کی گئی ہے' عرش کے نیچے سے برسے اور اس بارش کا پانی مرد کے مادۂ تولید کا حکم رکھتا ہے۔ اور اس کے بعد حضرت اسرافیل علیہ السلام کے صور پھونکنے کی وجہ سے انسانی روحیں اپنے جسموں کے ساتھ متعلق ہو جائیں اور آسمانی روحیں ان روحوں کی خدمت گزار اور مدد کرنے والی ہو جائیں اور حشر قائم ہو جائے اس وقت

عَلِمَتْ نَفْسٌ مَّا قَدَّمَتْ نفس کی ایک قسم جو کہ نفسِ انسانی ہے اس چیز کو جان لے جو اس نے اچھائی برائی سے اللہ تعالیٰ کی طرف آگے بھیجی ہے اور آگے بھیجنے سے مراد کوئی کام کرنا ہے اس لیے کہ جو کام کیا گیا' اعمال کے دفتر میں نقش ہو گیا اور وہ دفتر اعمال لکھنے والوں کے ذریعے دربار معلیٰ میں پہنچ گیا۔

وَاَخَّرَتْ اور جو اس نے نیکی بدی سے پیچھے کیا ہے اور پیچھے کرنے کا معنی ترک کرنا ہے اس لیے کہ جو کام نہیں کیا گیا' اعمال کے دفتر میں نقش نہ ہوا اور دربارِ خداوندی میں نہ پہنچا۔

اور بعض مفسرین نے تقدیم سے مال اور صدقات آگے بھیجنا مراد لیا ہے کہ یہ سب کچھ آخرت کا ذخیرہ بن جاتا ہے۔ اور تاخیر سے وارثوں کے لیے مال چھوڑنا مراد لیا ہے اور بعض نے ماقدمت سے آگے پہنچے ہوئے بیٹے مراد لیے ہیں اور ما اخرت سے پیچھے رہنے والے۔ اور بعض نے تقدیم سے اوائل عمر میں نیکی بدی کے اعمال کو مقدم کرنا اور تاخیر سے انہیں آخری عمر میں مؤخر کرنا مراد لیا ہے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ اچھا اور برا کام خواہ فعل ہو یا ترک سب ماقدمت میں داخل ہیں اور اچھی اور بری رسم' مذہب اور طریقہ جو کسی شخص کے بعد معمول بنتا ہے' مااخرت میں داخل ہیں۔ اور حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت سے حدیث شریف میں ہے کہ ماقدمت من خیر او شر وما اخرت من سنة حسنة استن بها بعده فله اجره واجر من اتبعه من غیر ان ینقص من اجورهم شیء او سنة سیئة عمل بها بعده فعلیه وزره و وزر من عمل بها بعده لاینقص من اوزارهم شیء یعنی جو اچھائی برائی آگے بھیجی اور جو اچھا طریقہ پیچھے چھوڑا جس پر اس کے بعد عمل کیا جاتا رہا تو اسے اس کا اجر ہے اور اس کی پیروی کرنے والے کا بھی

اجر ہے جبکہ پیروی کرنے والوں کا اجر بھی کم نہیں کیا جائے گا۔ یا بُرا طریقہ چھوڑا جس پر بعد میں عمل ہوتا رہا تو اس پر اس کا اور اس پر عمل کرنے والوں کا بوجھ ہے جبکہ عمل کرنے والوں کا بوجھ بھی کم نہیں ہوگا۔

نیز حدیث پاک میں ہے کہ ایک سائل نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہ میں آ کر سوال کیا' حاضرین خاموش رہے' پوری محفل میں سے ایک صاحب اُٹھے اور اسے کوئی چیز دے دی۔ دوسروں نے بھی ان کی پیروی کرتے ہوئے اسے دینا شروع کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ جو شخص نیک رسم شروع کرے اور لوگ اس رسم پر عمل کریں اس کے لیے اپنا اجر بھی ہے اور دوسرے عمل کرنے والوں کا اجر بھی۔ جبکہ ان کے اجر میں بھی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ اور اسی طرح جس نے بُری رسم شروع کی اور دوسروں نے اس پر عمل کیا تو اس پر اپنا وبال بھی ہے اور دوسرے عمل کرنے والوں کا بھی جبکہ ان کے وبال میں بھی کوئی کمی نہیں ہوگی۔ راوی فرماتے ہیں کہ اس واقعہ کو نقل کرنے کے بعد حضرت حذیفہ بن ایمان رضی اللہ عنہ نے یہ آیت تلاوت فرمائی کہ عَلِمَتۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ وَمَاۤ اَخَّرَتۡ

(معلوم ہوا کہ اگرچہ ذکر حبیب پاک صلی اللہ علیہ وسلم اور نفسِ ایصالِ ثواب کتاب و سنت سے ثابت ہے مگر شرعی حدود و آداب کا لحاظ کرتے ہوئے ہئیت کذائیہ کے ساتھ عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم تیجا' ساتواں' چہلم اور عرس شریف یہ سب اچھی رسمیں ہیں کیونکہ ان کا لب لباب کتاب وسنت سے ثابت ہے بلکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے مندرجہ بالا ارشادِ عالی کی روشنی میں یہ سب امور مستحب اور مستحسن ہیں' ان پر عمل کرنے والے اجر وثواب کے مستحق ہیں' ان سے روکنا کارِ خیر سے روکنا ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

بہر حال مراد یہ ہے کہ نفسِ انسانی کو اپنی نیکیوں اور بُرائیوں پر اطلاع تفصیل کے ساتھ میسر آئے گی اور جب وہ دیکھے گا کہ میں نے جو کچھ آگے بھیجا تھا' سب بُرا تھا اور جو کچھ ترک کر آیا ہوں' سب اچھا تھا اور یہاں نیکی کا پھل یہ ہے اور بُرائی کا نتیجہ یہ تو اسے اپنی غلط فہمی پر عظیم ندامت اور سوزشِ جگر حاصل ہوگی اس وقت اسے کہا جائے گا۔

یٰۤاَیُّهَا الۡاِنۡسَانُ اے انسان! کہ تیرا تو نام ہی انس سے مشتق ہے تو نے یادِ حق کے

ساتھ انس کیوں پیدا نہ کیا اور نیکیاں نہ کیں اور تو یادِ حق کے غیر کے ساتھ جو کہ موتیوں اور زریں نگینوں کی صورت میں ظاہر ہونے والے سب سانپ اور بچھو تھے کیوں مانوس ہوا۔

مَاغَرَّكَ تجھے کس چیز نے فریب دیا' نفس نے یا شیطان نے یا خلق نے یا دنیا نے۔

بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ تیرے پروردگار کے ساتھ جس نے تجھے قسم قسم کی تربیتوں کے ساتھ پالا۔

اس نے اپنی صفت کرم کے ساتھ تیرے ساتھ معاملہ فرمایا کہ تو نے اپنے اوپر اس کی نافرمانی اور مخالفت کا داغ لگا لیا اور اپنی اس فضیلت اور بزرگی کو ضائع کر دیا جو اس نے تجھے ساری مخلوقات پر عطا فرمائی تھی۔

کریم کے معنوں کا بیان

اور کریم کے معنوں میں بہت سے اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ کریم وہ ہے جس کا ہر فعل انعام اور احسان ہو اور اس کی حرکت اور سکون میں کوئی خیر پنہاں ہو۔

بعض کہتے ہیں کہ جس نے انعام اور احسان کرنے میں اپنی ذات کو نفع پہنچانے یا اپنی ذات سے نقصان دُور کرنے کو پیش نظر نہ رکھا ہو' وہ کریم ہے اور بعض کہتے ہیں کہ کریم وہ ہے کہ اس کے ذمے جو کچھ واجب ہو یا نہ ہو' دوسروں کو دے دے اور اپنا جو کچھ دوسروں کے ذمے واجب ہے' طلب نہ کرے اور بعض کہتے ہیں کہ کریم وہ ہے کہ ہر تھوڑی سی چیز کو قبول کرے اور اس پر بے شمار مزدوری عطا فرمائے۔

اور اللہ تعالیٰ کے کرم کا تقاضا ہے کہ جرائم سے صرف معافی دینے پر ہی اکتفاء نہیں فرماتا بلکہ ان سب گناہوں اور خطاؤں کے باوجود گناہ گاروں پر احسان' تربیت اور پردہ پوشی کے دروازے ہر وقت کھلے رکھتا ہے۔

ایک جواب طلب سوال

یہاں ایک جواب طلب سوال ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ مغرور ہونے اور اس غرور پر ڈانٹنے کے مقام میں صفت قہر کو ذکر کرنا زیادہ مناسب تھا اس لیے کہ قہار سے مغرور ہونا انکار اور ڈانٹنے کی جگہ ہے۔ بخلاف کریم کے کرم سے مغرور ہونے کے کہ ڈانٹنے اور انکار کرنے کا محل نہیں ہے اس لیے کہ کریم کا کرم غرور کا موجب ہوتا ہے [illegible]

ایک دن نوشیرواں کی مجلس میں خدمت گار اور خواص ہنسنے لگے۔ ایک دانش مند حاضر تھا اس نے عرض کی کہ یہ خدمت گار آپ سے نہیں ڈرتے کہ آپ کے ہوتے ہوئے اس طرح ہنستے ہیں' نوشیرواں نے کہا کہ ہمیں چاہیے کہ ہم اپنے دشمنوں کو ڈرائیں نہ کہ خدمت گاروں کو۔

نیز حضرت امیرالمومنین مرتضٰی علی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ ایک دن آپ نے ایک کام کے لیے اپنے غلام کو تین بار آواز دی' وہ نہ بولا۔ آپ حجرے سے باہر تشریف لائے کہ شاید غلام کہیں گیا ہوا ہو' دیکھا کہ حجرے کے دروازے پر کھڑا ہے۔ فرمایا تجھے کیا ہوگیا کہ تو نے مجھے جواب نہیں دیا؟ غلام نے کہا کہ مجھے آپ کے کرم پر اعتماد تھا اور آپ کی طرف سے کسی سزا ملنے سے بے خوف تھا۔ امیرالمومنین نے اس کا جواب پسند فرمایا اور اسے آزاد فرمادیا۔ پس اس چیز کا ذکر غرور کا باعث ہو' انکار غرور کے مقام پر مناسب نہیں ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ یہاں صفت کرم کا ذکر غرور کی وجہ کے لیے ہے یعنی تجھے غرور اس وجہ سے پیدا ہوا کہ وہ کریم ہے۔ چنانچہ حضرت امیرالمومنین عمر رضی اللہ تعالٰی عنہ سے منقول ہے کہ آپ کہتے تھے کہ الٰھی غرنی حلمك لواخذتنی بالاولٰی ماجرء تك علی الثانیۃ الٰہی مجھے تیرے حلم نے مغرور کردیا اگر تو مجھے پہلے گناہ کی وجہ سے پکڑ لیتا' میں دوسرے گناہ پر جرأت ہی نہ کرتا۔

اور حضرت فضیل بن عیاض رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ ان سے پوچھا گیا کہ اگر قیامت کے دن اللہ تعالٰی آپ کو اپنے دربار میں کھڑا کر کے پوچھے کہ ماغرك بربك الکریم تو آپ کیا کہیں گے؟ آپ نے فرمایا کہ میں کہوں گا کہ غرنی ستورک الرخاۃ مجھے تیرے لٹکائے ہوئے پردوں نے فریب دیا کہ میں نے جتنے گناہ کیے تو نے رسوا نہ کیا' میں سمجھا کہ تو کبھی بھی رسوا نہیں فرمائے گا۔ یہی بات حضرت امیرالمومنین مرتضٰی علی کرم اللہ وجہہ سے بھی منقول ہے کہ کم من مغرور بالستر علیه وکم من مستدرج بالاحسان الیه پردہ پوشی سے کتنے فریب کھا گئے اور احسان کرنے سے کتنے درجہ بدرجہ گمراہ ہوگئے۔

اور جب استفہام انکاری مجموعی کلام پر وارد ہوا تو اس کا مقصد اس غرور پر ڈانٹ ڈپٹ کرنا ہوا جو کہ کرم کریم دیکھنے سے پیدا ہوتا ہے۔ اور جب کرم پر جو کہ غرور کا عمدہ سبب ہے'

انکار متوجہ ہوا تو غرور کی نفی میں زیادہ مؤثر ہوا۔ اس لیے کہ جب کرم کا ملاحظہ کرتے ہوئے غرور نہیں چاہیے تو اس کے قہر کو دیکھ کر کیسے چاہیے اور اللہ تعالیٰ جیسے کریم ہے اسی طرح قہار ہے اور اسی طرح منتقم یعنی انتقام لینے والا ہے اور اس کے باوجود حکیم ہے اور جب حکمت قہر اور انتقام کے آثار کی متقاضی ہو تو آثار کرم ظاہر نہیں ہوں گے اس لیے کہ بدکاروں کے حق میں کرم اور احسان تقاضائے حکمت کے خلاف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس آیت کی تلاوت فرماتے تو ارشاد فرماتے کہ غرہ باللہ جھلہ یعنی آدمی کو اس کی نادانی نے دھوکہ دیا ہے کہ اس نے اپنے پروردگار کی ایک صفت کو جو کہ کرم ہے ملاحظہ کیا اور دوسری صفت کو جو کہ حکمت وعدالت ہے، نظر میں نہ رکھا۔

دوسرا جواب۔ کسی کام پر ڈانٹ وہاں پلائی جاتی ہے جہاں انکار واقع ہونے کا گمان ہے جبکہ کریم کے کرم کی وجہ سے غرور کا فعل واقع ہونے کا گمان لازمی ہے۔ کئی دفعہ ایسا ہوتا ہے کہ ایک شخص کسی کے کرم پر مغرور ہو جاتا ہے جبکہ قہر اور انتقام پر مغرور ہونا ہرگز واقع ہونے والا نہیں ہے اس پر انکار اور ڈانٹ پلانا کیا مناسبت رکھتا ہے۔ مثلاً عرف میں کہتے ہیں کہ فلاں کے حلم پر اعتماد نہ کرنا اس لیے کہ حلم محل اعتماد ہو سکتا ہے اور یوں ہرگز نہیں کہتے کہ فلاں کے غصے پر مغرور نہ ہونا اور اعتماد نہ کرنا اس لیے کہ غضب اور غصہ محل اعتماد اور مقام غرور نہیں ہے بلکہ پرہیز کا مقام اور بچنے کی جگہ ہے۔

اور بعض بزرگوں نے کہا ہے کہ اس صفت کو لانا تلقین جواب کے لیے ہے تا کہ بندہ کہہ دے کہ غرنی کرمك مجھے تیرے کرم نے مغرور کر دیا لیکن یہ جواب درست قرار نہیں پاتا اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کا کرم حکمت کے تقاضے کے مطابق صادر ہوتا ہے اور اس کی حکمت اس بات کا تقاضہ ہرگز نہیں کرتی کہ بندوں کی جزا کو بے کار چھوڑ دے یا مظلوم کا بدلہ ظالم سے نہ لے اور مخلوق کے حقوق ضائع کر دے اور نیک کو بد سے اور پرہیزگار کو فاجر سے ممتاز نہ کرے۔ پس اس جواب میں فوراً یہ الزام لینا ہے کہ تو نے کرم ثابت کر کے میری حکمت کا انکار کر دیا۔ نیز اللہ تعالیٰ کا کرم آدمی کی خواہش سے پہلے ہے، اسے کسی عوض اور غرض کے بغیر پیدا فرما کر قسم قسم کی نعمتوں سے اس کی تربیت فرمائی۔ اور کرم سابق، کرم لاحق کا موجب نہیں

ہوتا کہ اس کے گناہوں سے بالکل درگزر کریں اور برائیوں پر اسے تنبیہ نہ کی جائے بلکہ اس کا کرم سابق خوف و ہراس کا زیادہ موجب ہے اس لیے کہ اگر کسی کا کسی پر حق نعمت نہ ہو تو وہ اس کے اوامر اور نواہی کی مخالفت کرے تو اس کی گنجائش ہے لیکن اپنے منعم کی نافرمانی اور ولی نعمت کی ناشکری انتہائی خطرناک اور بری ہے۔ اور اس منعم کا کرم سابق ان ناشکریوں سے صرف نظر کرنے کا تقاضا نہیں کرتا بلکہ عرف میں اس قسم کی چشم پوشی کو ذلت' کمزوری اور رسوائی سمجھتے ہیں خصوصاً جب منعم کو پہچاننے میں کوتاہی کرے اور اس کی نعمتوں کو اس کے غیر کی طرف منسوب کرے یا اس کی مرضی کے خلاف مقام میں صرف کرے' اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے بچائے۔

غرور' تمنا اور رجا کے درمیان فرق کا بیان

اب جاننا چاہیے کہ یہاں تین چیزیں ہیں: غرور' تمنی اور رجا۔ قرآن مجید میں جگہ جگہ غرور اور تمنا کی مذمت فرمائی گئی ہے جیسا کہ اس آیت میں اور ایک اور آیت میں وَلَا يَغُرَّنَّكُمْ بِاللّٰهِ الْغَرُوْرِ اور اس آیت میں لَيْسَ بِاَمَانِيِّكُمْ وَلَا اَمَانِيِّ اَهْلِ الْكِتَابِ اور آیت تِلْكَ اَمَانِيُّهُمْ میں وغیر ذالك جبکہ رجا جو کہ امید کے معنوں میں ہے' قرآن حدیث میں اس کی تعریف کی گئی ہے اور اسے پسند کیا گیا ہے۔ چنانچہ ایمان والوں اور نیکوں کی تعریف کے مقام میں جگہ جگہ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَةَ اللّٰهِ وارد ہے۔ پس ان تینوں چیزوں کے درمیان واضح طور پر فرق بیان کرنا چاہیے تاکہ قابلِ تحسین اور قابلِ مذمت کاموں میں آپس میں اشتباہ نہ رہے۔

جاننا چاہیے کہ امید یہ ہے کہ آدمی مرغوب چیز کے انتظار میں خوش رہے اور ہر مرغوب چیز کو حاصل کرنے کا کوئی سبب درکار ہے ورنہ انتظار نہیں پائی جاتی۔ پس اگر اس چیز کے اکثر اسباب جمع ہو چکے ہوں تو اس کا انتظار کریں اور خوشی میں وقت گزاریں۔ یہ رجا اور امید کی حالت ہے اس کاشت کار کی طرح جس نے اچھی زمین میں اچھا بیج بویا ہے اور وہ وقت پر پانی دیتا ہے اور غلہ اٹھانے کا انتظار کرتا ہے۔

اور اگر اس چیز کے اکثر اسباب ضائع ہو جائیں اور اس چیز کا انتظار کیا جائے' یہ حالت

غرور اور حماقت ہے اس کسان کی طرح جو غیر معیاری زمین میں بیج ڈال کر پانی لگانے سے پہلوتہی کرتے ہوئے غلہ کی پیداوار اُٹھانے کے انتظار میں بیٹھا رہا۔

اور اگر اکثر اسباب حاصل کرنے میں شک واقع ہو اور اس چیز کا انتظار دل میں ہو تو یہ حالت تمنا اور آرزو کی حالت ہے اس کھیتی باڑی کرنے والے کی طرح کہ جس نے اچھی زمین میں بیج ڈالا ہے مگر پانی نہیں لگاتا یا بنجر زمین میں بیج ڈال کر اور پانی دینے میں مشغول رہ کر غلہ کی پیداوار اُٹھانے کا آرزومند ہے۔

پس بندے کو چاہیے کہ نجات اور کامیابی کے اسباب کو مقدور بھر اپنے اندر جمع کرے اور اس کے بعد رحمتِ الٰہی کے انتظار میں خوشی اور شادابی میں وقت گزارے اور جو فلاح و نجات کے اکثر اسباب کو ضائع کر دیتا ہے اور فلاح و نجات کے حاصل ہونے کا منتظر ہے' وہ مغرور ہے اور حصولِ اسباب کے مشکوک ہونے کی صورت ایک آرزو کے سوا کچھ نہیں اور یہ دونوں مرتبے اللہ تعالیٰ کے حضور قابلِ مذمت اور قبیح ہیں۔

سلیمان بن عبدالملک اور حضرت ابوحازم رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حکایت بیان کرتے ہیں کہ سلیمان بن عبدالملک شام سے حج بیت اللہ شریف کے لیے جا رہا تھا' مدینہ عالیہ کے راستے میں اس کی ملاقات حضرت ابوحازم کے ساتھ ہوگئی اس نے ابوحازم سے پوچھا کہ کل قیامت میں بندوں کی اپنے پروردگار کے ساتھ ملاقات کس طرح ہوگی؟ ابوحازم نے فرمایا کہ اگر بندہ دنیا میں نیک عمل کر کے گیا ہے تو اس شخص کی طرح ہوگا جو کہ دُور دراز کے سفر سے بے پناہ مال و دولت کما کر اپنے گھر لوٹے' دیکھو لو کہ اس کے گھر والے اس کے ساتھ کس سلوک سے پیش آئیں گے اور اگر بندہ بدکار ہے تو اس غلام کی طرح ہوگا جو کہ اپنے مالک سے چوری اور کسی گناہ سے شرمسار ہو کر بھاگا ہو اس کے مالک نے اس کے پیچھے سخت اور تیز مزاج نوکر دوڑائے اور وہ ان کے ہاتھوں گرفتار ہو کر بیڑیاں اور طوق پہنے اور لعنت و نفرت کا مستحق ہو کر اپنے مالک کے دربار میں پہنچے۔ یہ کلام سنتے ہی سلیمان پر گریہ طاری ہوگئی اس نے کہا کہ اے کاش! ہمیں معلوم ہو کہ ان دونوں طریقوں میں سے ہمیں کس طریقے کے ساتھ اپنے مالک کے دربار میں لے جائیں گے۔ ابوحازم بولے کہ یہ

پہچاننا تو بہت آسان ہے اور قرآن پاک میں واضح فرما دیا گیا ہے۔

سلیمانؑ نے کہا کہ کس آیت میں؟ ابوحازم نے فرمایا کہ اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِیْ جَحِیْمٍ اب اپنے موجودہ اعمال کو دیکھ لو کہ تم ابرار میں ہو یا فجار میں۔ سلیمان نے کہا کہ اگر نجات کا کام ہمارے عمل پر ہے تو رحمتِ الٰہی کدھر گئی؟ ابوحازم نے فرمایا کہ رحمتِ الٰہی کے مقام کا پتہ بھی قرآن مجید میں دیا گیا ہے۔ سلیمان نے کہا کہ کونسی آیت میں؟ ابوحازم نے فرمایا اِنَّ رَحْمَتَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ مِّنَ الْمُحْسِنِیْنَ۔ خوف اور گریہ کی وجہ سے سلیمان کی حالت خراب ہوگئی اور وہ وہاں سے چلا گیا اور کہنے لگا کہ میں آپ کی گفتگو سننے کی تاب نہیں رکھتا کہ میرا جگر پھٹتا ہے۔

اور جب اس آیت میں آدمی کو ڈانٹ ڈپٹ کی گئی کہ اللہ تعالیٰ کے کرم پر مغرور نہیں ہونا چاہیے تو اب چند ایک اور نعمتوں کا شمار ہو رہا ہے کہ وہ نعمتیں غرور و فریب کو روکنے والی تھیں۔ ان میں سے یہ ہے کہ فرمایا جا رہا ہے اَلَّذِیْ خَلَقَكَ وہ کریم جس نے اپنے کرم کے تقاضے سے تجھے پیدا فرمایا اور اس حالت میں تجھ سے سوال اور دعا کی خواہش کا تصور بھی نہ تھا اور تجھ سے کسی نفع کی کوئی توقع نہ تھی۔

فَسَوّٰكَ پس تجھے درست اعضاء والا بنایا اور تیرے اعضاء مقدار میں برابر بنائے' ہاتھ کو ہاتھ کے ساتھ' پاؤں کو پاؤں کے ساتھ' کان کو کان کے ساتھ اور آنکھ کو آنکھ کے ساتھ۔ مثلاً اگر ایک پاؤں چھوٹا ہوتا اور دوسرا بڑا تو تجھے تکلیف بھی ہوتی اور تو معیوب اور ناقص بھی ہوتا اس کا کرم ہے کہ اس نے تجھے گندے قطرے سے اس پسندیدہ اور متناسب صورت میں پیدا فرمایا۔

فَعَدَلَكَ پس اس نے تجھے مزاج کا معتدل بنایا۔ تیرے بدن کا مزاج حرارت و برودت اور رطوبت و یبوست کی طبیعت میں ارکان و اخلاط کے ساتھ معتدل ہوگیا تاکہ اعتدال سے باہر ہونے والی کیفیتوں کو پہچانے اور جانے کہ ظاہری اعتدال سے نکلنا کس قدر تکلیف دہ اور پریشان کن ہوتا ہے اور معنوی اعتدال سے نکلنے کو اس پر قیاس کرے۔

فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ اور جس صورت میں چاہا' تیرے پروردگار نے تجھے

ترکیب دی اور تو اس وقت حاضر نہ تھا کہ عرض کرتا کہ فلاں صورت اچھی ہے اور فلاں بُری' مجھے یہ شے دی جائے اور وہ نہ دی جائے۔ اس کا محض کرم ہے کہ اس نے تجھے بہترین صورت میں مرکب فرمایا۔ اور وہ ہاتھ عطا فرمایا جو کہ تکبیر کے وقت اُٹھانے' قرآن پاک' آلاتِ جہاد اور دوسری نیکیوں میں جو کہ جسم کے متعلق ہیں' پکڑنے کے لائق ہے اور وہ زبان دی جو کہ ثناء' تسبیح' ذکر' تلاوت' امر بالمعروف' نہی عن المنکر اور ذات وصفات کے حقائق بیان کرنے کے قابل ہے اور وہ پاؤں دیا جو کہ نماز میں کھڑے ہونے' جہاد' طوافِ کعبہ' بیماروں کی عیادت' اولیائے اللہ کی زیارت اور دوسری نیکیوں میں جو کہ پاؤں سے متعلق میں دوڑنے کے لائق ہے۔ علیٰ ہذا القیاس ہر عضو کسی نہ کسی نیکی اور طاعت کے لیے عطا فرمایا اور تو نے ان نعمتوں کو نافرمانی کا آلہ اور مخالفت کرنے کا ہتھیار بنا لیا ہے ایسا شخص صفتِ کریمی کے لائق نہیں ہوتا' اسے اللہ تعالیٰ کے کرم سے غرور اور فریب کھانا زیب نہیں دیتا۔

اور آدمی کی تخلیق کو اس مقام پر کہ جہاں کریم کی نعمتوں کا شمار کرنا مقصود ہے اسی لیے خاص فرمایا گیا ہے کہ اس نعمت میں کوئی سوال یا خواہش بندے کی طرف سے بالکل نہ تھی اور نفع اور دفع ضرر کی توقع بلکہ تصور اللہ تعالیٰ کی طرف بالکل نہ تھا۔ بخلاف دوسری نعمتوں کے جو کہ پیدائش اور جان [illegible] پر مانگنے کے بعد عطا ہوتی ہیں کہ وہ اس قدر کرم پر دلالت نہیں کرتیں۔

نیز تخلیق انسانی کی نعمت کہ طبیعت کے اعتدال اور اعضاء کے مناسبت کے کمال کے ساتھ واقع ہوئی اس بات پر صریح دلیل ہے کہ اس قسم کی مخلوق کو بے مقصد پیدا نہیں فرمایا گیا ہے بلکہ اعتقاد و عمل میں غیر معتدل راستہ سے معتدل راستے کو پہچاننے کے لیے پیدا فرمایا اس لیے کہ غیر معتدل کو معتدل کے بغیر کوئی نہیں پہچان سکتا اسی لیے طب کی کتابوں میں طے شدہ بات ہے کہ غیر معتدل حد اعتدال سے نکلی ہوئی کیفیت سے جو کہ اس غیر معتدل کی جنس سے نہ ہو' اتنا متاثر نہیں ہوتا اور ہم جنس سے زیادہ اور جلدی متاثر ہوتا ہے اور تھوڑے کو زیادہ سمجھتا ہے تو جب انہوں نے اس کام میں کوتاہی اختیار کی تو عتاب اور غضب کا زیادہ مقام ہوا۔ سابقہ کرم سے فریب کھانے کا کیا معنیٰ؟

ایک جواب طلب سوال

اور یہاں ایک جواب طلب سوال ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ ان نعمتوں میں حرفِ عطف جو کہ فا ہے' ہر جگہ ذکر فرمایا گیا ہے سوائے فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ کے کہ یہاں حرفِ عطف کو حذف فرمادیا گیا ہے اس کی کیا وجہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ تخلیق' اعضاء کو برابر برابر بنانا اور معتدل بنانا تین ترتیب وار فعل ہیں' ان افعال میں کلمۂ فا کے مدلول کی جو کہ تعقیب ہے' گنجائش ہے اور ان تین افعال کے بعد صورت کی ترکیب لازم ہے۔ بالکل یہی کہ تسویہ اور تعدیل سے فراغت ہوئی تصویر حاصل ہوگئی بلکہ تسویہ اور تعدیل یہی تصویر ہے۔ پس حرفِ فا کی گنجائش نہ تھی اور چونکہ یہ نعمت تسویہ اور تعدیل کے مجموعے سے رونما ہوئی اس لیے اس نعمت کو نعمت آنے کا بیان کرنے کے طور پر وارد فرمادیا گیا۔

بچے کا والدین کا ہم شکل ہونا ضروری نہیں

اور مفسرین کے ایک گروہ نے فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ کی تفسیر میں فرمایا ہے کہ کبھی بچہ باپ کی صورت پر' کبھی ماں کی شکل پر' کبھی چچا کی شکل پر' کبھی ماموں کی شکل پر اور کبھی اپنے قریبیوں کے سوا کسی اور شکل پر پیدا ہوتا ہے۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے منقول ہے کہ آپ نے ایک شخص سے پوچھا تیری کیا اولاد ہے؟ اس نے عرض کی یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم شاید میرے ہاں لڑکا پیدا ہو یا لڑکی پھر آپ نے پوچھا کہ کس کے مشابہہ؟ اس نے کہا کہ اپنی ماں کے مشابہہ یا اپنے باپ کے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ایسا مت کہو بے شک جب رحم میں نطفہ قرار پاتا ہے' اللہ تعالیٰ اس کے اور آدم علیہ السلام کے درمیان سارا نسب اس کے پاس حاضر فرمادیتا ہے' کیا تو نے یہ آیت نہیں پڑھی؟ فِیْٓ اَیِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ

اور بعض نے کہا ہے کہ مراد اچھی اور بُری صورتیں ہیں جن میں انسانی افراد مختلف ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ انسانی صورتوں کی کثرت کو بیان کرنا مراد ہے کہ یہ قدرتِ الٰہی کے عجائب سے ہے اور فی الواقع آدمی کے اتنے سے چہرے میں اعضاء' آنکھ' کان' ناک' نوعی

ترتیب کی حفاظت اور صورت کے ہم شکل اور مخلوط ہونے میں مشترک ہونے کے باوجود ہر شخص دوسرے شخص سے جدا ہے اور یہیں سے خزائنِ الٰہیہ کی وسعت کو دریافت کیا جا سکتا ہے کہ اس میں کتنے غیر متناہی نقشے ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ نر اور مادہ کی صورت کا اختلاف مراد ہے اور اس تفسیر کے مطابق ماقبل کے ساتھ اس آیت کا رابطہ یہ ہے کہ نر کا تسویہ اور تعدیل مادہ کے تسویہ و تعدیل سے مختلف ہے لیکن یہ اختلاف صنف کا ہے اس لیے طب والے مؤنث کا مزاج زیادہ تر سمجھتے ہیں جبکہ مذکر کا مزاج زیادہ خشک جانتے ہیں اور مذکر کی جسمانی صحت مؤنث کی جسمانی صحت سے جدا جانتے ہیں لیکن اصل تسویہ اور تعدیل میں جو کہ نوعِ انسانی کا تقاضا ہے' باہم شریک ہیں۔

اور بعض نے انسان کے مختلف رنگوں پر محمول فرمایا ہے اور کہتے ہیں کہ پہلی اور دوسری اقلیم میں رہنے والوں کا رنگ سیاہ ہوتا ہے اس لیے کہ سورج ہمیشہ ان کے سمت الراس میں ہوتا ہے (اُفق کے اوپر کرۂ سماویہ کے ایک نقطے کا نام ہے) یا اس کے قریب اور سوج کا ہمیشہ گرمی دینا رنگ سیاہ کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ چنانچہ دھوبیوں اور دوسرے کسانوں کے رنگوں میں جو کہ ہمیشہ دھوپ میں کھلے جسم رہتے ہیں' دیکھا اور محسوس کیا جاتا ہے اور تیسری اقلیم کے رہنے والے اکثر گندمی رنگ والے' چوتھی اقلیم کے رہنے والے سرخی مائل سفید رنگ والے' پانچویں اقلیم کے باسی سرخ رنگ اور چھٹی اور ساتویں اقلیم کے رہنے والے ہلکے زرد رنگ والے ہوتے ہیں۔

اور حضرت حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ بعض کو ایسی صورت پر پیدا کیا گیا ہے کہ انہیں اپنی پسندیدہ اداؤں کے لیے چُن لیں۔ چنانچہ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ وصطنعتك لنفسي۔ نیز آپ کے اور دوسرے انبیاء علیہم السلام کے حق میں فرمایا ہے کہ اِنَّهٗ كَانَ مُخْلَصًا۔ وَاِنَّهٗ مِنْ عِبَادِنَا الْمُخْلَصِيْنَ اور یہ مبارک جماعت دربارِ شاہی کے خاص مقربین کی طرح ہیں جو کہ دربار کی ڈیوٹیوں پر مامور ہوتے ہیں۔ جبکہ بعض کو ایسی صورت پر پیدا کیا گیا ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے

تعمیر میں مشغول ہوں۔ بعض اموال کی تجارت، بعض کاشت کاری اور بعض کاری گری میں لگ جائیں تا کہ جہان کے کاروبار منتظم ہوں اور جب اس بات کا گمان تھا کہ صفتِ کرم کا سُن کر جو کہ اس ڈانٹ اور سوال میں مذکور ہے، کفار کہنے لگیں کہ ہمارا غرور اور اعتماد سب اس کے کرم پر ہے، ایک اور تنبیہہ اور زیادہ سخت جھڑکی فرمائی۔

کَلَّا بات یوں نہیں ہے کہ تم اللہ تعالیٰ کے کرم پر اعتماد کرتے ہوئے گناہ کرتے ہو اس لیے کہ یہ اعتماد جزا اور آخرت کے عقیدے اور اقرار پر موقوف ہے جبکہ روزِ جزا پر تمہارا اقرار اور اعتقاد ہی نہیں۔

بَلْ تُكَذِّبُونَ بِالدِّيْنِ بلکہ تم جزا کا انکار کرتے ہو۔ حالانکہ جزا کا وعدہ بھی کرم ہی کا تقاضا ہے تا کہ اچھی جزا کی امید پر تم نیکی اور بندگی بجالاؤ اور تمہارے دارین کے کام اصلاح پائیں اور سزا کے ڈر سے نافرمانی سے بچو تا کہ تمہارے دارین کے امور خراب نہ ہوں اور تم سے انکار ہو کیسے سکتا ہے۔

وَاِنَّ عَلَيْكُمْ حالانکہ تم پر خدا تعالیٰ کی طرف سے لَحٰفِظِيْنَ نگہبان مقرر ہیں تا کہ وہ تمہارے اچھے بُرے اعمال پر مطلع ہوں اور تمہارا کوئی اچھا عمل ضائع نہ ہو اور کوئی بُرا کام رائیگاں نہ جائے۔

كِرَامًا یعنی وہ نگہبان بھی خلقِ الٰہی سے متخلق ہو کر تمہارے ساتھ کرم کا معاملہ کرتے ہیں۔

كِرَامًا كَاتِبِيْنَ کی کارگزاری

اور ان کے کرم سے ایک بات یہ ہے کہ وہ خود کو تمہاری نظر میں ظاہر نہیں کرتے تا کہ تم ان کے سامنے ازدواجی زندگی، بول و براز کی حاجت پوری کرنے اور لذتوں اور خواہشات کے حصول میں رکاوٹ محسوس نہ کرو۔ اور یہ بھی ہے کہ تمہارے اعمال پر مکمل آگاہی کے باوجود تمہیں رسوا نہیں کرتے اور لوگوں کے سامنے تمہارے بھید ظاہر نہیں کرتے۔ اور یہ بھی ہے کہ جب بھی تم سے نیکی صادر ہوتی ہے اس نیکی کو دس گنا لکھتے ہیں۔ مثلاً اگر تم نے ایک روپیہ راہِ خدا میں دیا ہے تو دس روپے لکھتے ہیں۔ یعنی جزا اچھی۔ اور اگر تم نے نیکی کا

قصد کیا اور کسی رکاوٹ کی وجہ سے وہ نیکی تم سے واقع نہیں ہوئی' اسے بھی وہ نیکی کے حساب میں رکھتے ہیں۔ اور ایک نیکی لکھتے ہیں۔ اور اگر تم نے گناہ کا قصد کیا اور اس گناہ کو چھوڑ دیا اس ترک کرنے کو بھی نیکی کے حساب میں لیتے ہیں اور ایک نیکی لکھتے ہیں۔ اور اگر تم سے کوئی گناہ سرزد ہو جائے تو چھ گھڑی تک مہلت دیتے ہیں اور اس گناہ کو نہیں لکھتے کہ شاید اس دوران تم سے استغفار یا توبہ یا کوئی ندامت یا ایسی نیکی جو کہ اس گناہ کا اثر زائل کر سکے' صادر ہو۔ اور اگر اتنی مدت تک بھی تم نے اس گناہ کا تدارک نہ کیا تو ایک گناہ لکھ لیتے ہیں۔ اور پھر جب تم توبہ اور استغفار کرو یا دوسری نیکیاں بجالاؤ تو اس لکھے ہوئے کو مٹا دیتے ہیں۔ اور وہ نگہبان تمہارے اعمال کو یاد رکھنے میں کمال کی احتیاط کرتے ہیں کہ فرشتہ ہونے کے باوجود کہ بھولنے اور فراموش کرنے سے مانع ہے' اپنے حافظے پر اعتماد نہیں کرتے۔

کَاتِبِیْنَ لکھنے والے ہیں جو کہ اس کام کے لیے ترتیب دیئے گئے دفتر رکھتے ہیں اور صحیح روایات کے مطابق یہ لکھنے والے ہر شخص کے لیے چار ہیں۔ دو رات کو آتے ہیں اور دو دن کے وقت' دن اور رات کے دونوں دفتروں کو جدا جدا سنبھالتے ہیں اور بعض روایات کے مطابق ان کی نشست گاہ آدمی کے کندھوں پر ہے اور بعض نے کہا ہے کہ آدمی کے منہ کے اوپر والے دو بڑے دانت ان کی نشست گاہ ہیں اور آدمی کی زبان ان کی قلم ہے اور آدمی کا لعاب دہن ان کی سیاہی کے قائم مقام ہے اور جب وہ دن رات کے دفتر کو حق تعالیٰ کے دربار میں پیش کرتے ہیں۔ باوجودیکہ اللہ تعالیٰ اپنے بندے سے رگ جان سے بھی زیادہ قریب ہے۔ احتیاط کے طور پر فرماتا ہے کہ اس دفتر کا لوح محفوظ کے ساتھ مقابلہ کرو اور اس میں بندہ جو کچھ کرے گا' کم و بیش سب کچھ لکھا ہوا ہے۔ مقابلے کے بعد حکم ہوتا ہے کہ نیکی اور گناہ کے سوا جو کچھ ہے' مٹا دو اور جو نیکی اور گناہ ہو' اسے رہنے دو تا کہ اس پر ثواب اور عذاب مرتب ہو اور ان نگہبانوں کے لیے کوئی پردہ اور حجاب تمہارے حالات پر مطلع ہونے سے رکاوٹ نہیں بنتا۔ یہ گمان بھی نہ کرنا کہ جس طرح ہم دنیا میں خفیہ نویسوں اور رپورٹروں سے اپنے اعمال چھپا سکتے ہیں' کسی حیلے بہانے سے ان سے بھی چھپا لیں گے اس لیے کہ وہ نگہبان

يَعْلَمُوْنَ مَاتَفْعَلُوْنَ جو کچھ تم کرتے ہو' جانتے ہیں اگرچہ تم ہزار ہا پردوں میں ہو۔

یہاں جاننا چاہیے کہ اعمال لکھنے والوں کے لیے آدمی کے افعال پر اطلاع اس آیت سے ثابت ہوتی ہے جبکہ اس کے اقوال پر مطلع ہونا سورۂ ق کی ایک اور آیت سے واضح ہوتا ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کا یہ ارشاد ہے۔ مَايَلْفِظُ مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَيْهِ رَقِيْبٌ عَتِيْدٌ اور ترک کی صورت والے اعمال پر جیسے روزہ' اعتکاف اور احرام کی ممنوعہ چیزوں سے پرہیز کرنا اور اس کی مانند دوسرے اعمال پر اطلاع عقلی دلیل کے ساتھ ظاہر ہے اس لیے کہ جب کوئی شخص کسی کام کی ضرورت کے وقت کسی رکاوٹ اور عذر کے بغیر وہ کام نہیں کرتا تو صریحاً پتہ چل جاتا ہے کہ اس کام کا تارک ہے البتہ دِلی نیتوں اور دل میں چھپے ہوئے ارادوں پر مطلع ہونے کے مسئلے میں اختلاف ہے۔ اکثر علماء نے اس کا انکار کیا ہے اور وہ جو صحیح حدیث میں وارد ہے کہ یہ لکھنے والے نیکی کے قصد کو نیکی لکھتے ہیں اور بدی کے قصد کو جو ترک کرنے سے وابستہ ہو جائے بھی نیکی میں لکھتے ہیں' ان کے احوالِ قلب پر مطلع ہونے پر دلالت کرتا ہے جبکہ انکار کرنے والے کہتے ہیں کہ یہ اطلاع حق تعالیٰ کی طرف سے بطورِ الہام ہوئی ہے کہ فلاں شخص نے اس وقت فلاں نیکی کا مقصد کیا ہے یا فلاں نے بُرائی کا ارادہ کر کے اسے چھوڑ دیا ہے اور یہی ظاہر ہے اور جب بات جزا ثابت کرنے تک پہنچ گئی تو یہاں نیکوں اور بُروں کی جزا کی تفصیل میں سے کچھ بیان کرنا ضروری ہوا اس بناء پر ارشاد ہوتا ہے:

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ تحقیق نیک لوگ عظیم نعمت میں ہوں گے۔ وَاِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ اور بے شک بدکار جہنم میں ہوں گے۔

يَصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ اس جہنم میں جزا کے دن داخل ہوں گے۔

وَمَاهُمْ عَنْهَا بِغَآئِبِيْنَ اور وہ جہنم سے غائب ہونے والے نہیں ہوں گے۔ خلاصہ یہ ہے کہ جس طرح اس جہان کی ہلاکتوں اور سزاؤں سے راہِ فرار اختیار کر کے غائب ہو کر رہائی پاتے ہیں اور اس دن اس حیلے سے ہرگز رہائی ممکن نہیں ہوگی اس لیے کہ اس آگ کے شعلے دُور دُور سے بدکاروں کو اپنی طرف کھینچ لیں گے اور فرشتے جو کہ جہنم کے دروازے پر مقرر ہیں' زنجیروں اور طوقوں میں مقید کر کے پھینک دیں گے نہ بھاگنے کی جگہ ہوگی نہ اُلجھنے کا

مقام۔

اور بعض مفسرین نے غائب ہونے کو جہنم سے باہر آنے پر محمول کیا ہے اور اس صورت میں فجار کو کفار کے ساتھ خاص کرنے کی ضرورت ہوگی اس لیے کہ ایمان والے فاسق جہنم سے لازماً باہر آ جائیں گے اور بہشت میں داخل ہوں گے۔ اور علم بدیع کے علماء نے کہا ہے کہ اس کلام میں جمع اور تقسیم کی صنعت ہے کہ پہلے اِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِيْنَ میں انہیں اچھوں اور بُروں کو ایک حکم میں جمع کیا گیا ہے اور اس کے بعد جزا کے بیان میں دونوں کو جدا جدا لایا گیا۔ نیز اس کلام میں صنعت ترصیع ہے اور علم بدیع کی اصطلاح میں اس کلام کو مرصع کہتے ہیں کہ دونوں فقروں کے الفاظ سجع میں یعنی آخری حرف میں اور وزن میں برابر ہوں جیسا کہ کسی شاعر نے کہا

اے منور بتو نجوم جلال   دی مقرر بتو رسوم کمال

منور مقرر کے ساتھ نجوم رسوم کے ساتھ اور جلال کمال کے ساتھ وزن اور حرف آخر میں برابر ہیں اور یہاں بھی ابرار فجار کے ساتھ اور نعیم جحیم کے برابر ہے۔ نیز اس کلام میں صنعت تضاد بھی ہے کہ اسے اطباق اور تطبیق بھی کہتے ہیں اس کا خلاصہ یہ ہے کہ ضدوں کو ایک کلام میں جمع کر دیں۔ چنانچہ مشہور مصرع میں ہے

ع ہشیار دروں رفت بروں آمد مست

یہاں نعیم جحیم کی اور ابرار فجار کی ضد ہے

جب بدکاروں کی سزا کے بیان میں روز جزا کا ذکر ہوا اور ابھی اس دن کی ہولناکیوں اور سختیوں کو خاطر خواہ بیان نہیں کیا تو سننے والو اس دن کی سختی سے خبردار کرنے کی بناء پر استفہام تہویلی کے طور پر اس کا کچھ اجمالی بیان فرمایا جا رہا ہے کہ:

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ اور تو کیا جانتا ہے کہ روزِ جزا کیا ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ آدمی اپنی عقل کے ساتھ اس دن کی شدت اور خوف کو دریافت نہیں کر سکتا اس لیے کہ دنیا کے سیاہ دنوں کی شدتیں اور سختیاں جو اپنے اوپر دیکھیں یا لوگوں سے سنیں' وہ اس دن کی شدتوں اور سختیوں کے ساتھ کوئی نسبت نہیں رکھتیں تا کہ انہیں ان پر قیاس کرے اور عقل کا

کام اسی قدر ہے کہ ان دیکھی چیز کو دیکھی ہوئی پر' اَن سُنی کو سُنی ہوئی پر قیاس کرتی ہے۔

ثُمَّ مَا اَدْرَاكَ مَا يَوْمُ الدِّيْنِ پھر طویل مہلت کے بعد ہم فرماتے ہیں کہ تو کیا جانتا ہے کہ روزِ جزا کیا ہے اور یہاں کلمہ ثُمَّ کا حاصل یہ ہے کہ کئی چیزیں ایسی ہیں جنہیں آدمی پہلی ہی سوچ میں دریافت نہیں کرسکتا' انتہائی غور وفکر اور کافی مدت کے بعد اس کی تحقیق کا سراغ لگاتا ہے اور جب وہ چیز اس جنس سے ہو کہ کسی کے وہم وخیال میں بالکل نہ سمائے تو مدتوں غور وفکر میں گزارنا اور پہلی دفعہ ہی مایوس ہو جانا برابر ہے اور یہی وجہ ہے کہ فرمایا گیا ہے کہ طویل مدت اور فرصت کے بعد بھی تو اس کی حقیقت کو پا نہیں سکے گا مگر اس دن کی شدت اور سختی میں سے ایک جھلک تیرے سامنے بیان کی جاتی ہے کہ وہ دن

يَوْمَ لَا تَمْلِكُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَيْئًا ایسا دن ہے کہ کوئی نفس کسی نفس کے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوگا۔ اور یہیں سے اس دن کی شدت دریافت کی جاسکتی ہے۔ اس لیے کہ دنیا میں جب کوئی شخص کسی مصیبت میں گرفتار ہوتا ہے پہلے تو وہ اس تکلیف کو عام لوگوں کے سامنے رکھتا ہے اور چارۂ کار تلاش کرتا ہے۔ اور جب عوام سے اس کا کام نہیں ہو پاتا تو خاص لوگوں کے پاس التجا کرتا ہے جو کہ اس تکلیف کو دُور کرنے کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں جیسے ماہر طبیب بیماریاں دُور کرنے میں' ہشیار جراح زخموں اور پھنسیوں کے بارے میں' تیز نظر ماہرین امراضِ چشم آنکھ کی بیماریوں میں' انصاف کرنے والے حکام ظلم وستم کے مقدمات میں اور تجربہ کار لوگ دوسرے امور میں کام آتے ہیں اور جب یہ لوگ اس کے حال پر توجہ نہیں کرتے تو ناچار ان کے ہم نشینوں اور دوستوں کی سفارش سے مدد طلب کرتا ہے اور اس کی گرہ کشائی کرتا ہے اور اس دن تمام تعلقات ختم ہو جائیں گے' کسی کے کسی تعلق کا پاس نہیں ہوگا۔ اور وہاں کے واقعات میں سے کسی چیز میں کسی کا دخل نہیں ہوگا۔ وہاں خواص' عوام کی طرح حیران اور سردار' رعایا کی طرح پریشان ہوں گے۔ مالک مطلق کے حکم کے بغیر وہاں شفاعت محال ہوگی' رونے دھونے سے کچھ نہیں ہوگا اور اس آیت میں تین عموم بیان کیے گئے ہیں: پہلا عموم نفس مالکہ میں' دوسرا النفس المملوکہ میں اور تیسرا شئ مملوک میں اور ان تینوں تعمیموں سے اس دن کی چارہ جوئی سے مکمل ناامیدی معلوم ہوتی ہے جیسا کہ پوشیدہ

نہیں ہے۔

(اقول وباللہ التوفیق کوئی کافر کسی کی شفاعت نہ کر سکے گا۔ (خازن) یا کوئی مومن کسی کافر کی حاجت روائی نہ کر سکے گا لہٰذا اس آیت سے شفاعت کی نفی نہیں ہوتی۔ شفاعت باذن اللہ ہوگی۔ یہ بھی کہا جا سکتا ہے کہ قیامت میں مالک احکام یعنی حاکم صرف اللہ تعالیٰ ہے' انبیاء مرسلین علیہم السلام حاکم نہیں' حاکم کی بارگاہ میں شفیع ہیں' وکیل و گواہ فیصلہ کے مالک نہیں ہوتے اس آیت میں ملک کی نفی ہے۔ (تفسیر نورالعرفان از مفتی احمد یار خاں صاحب گجراتی)

حضرت مفسر علام نے ایک قول کے مطابق تفسیر کی ہے جبکہ یہاں دوسرا قول بھی جیسا کہ تفسیر نورالعرفان میں بحوالۂ خازن منقول ہے کہ نفس میں عموم نہیں بلکہ یہ حکم نفس کافرہ کے متعلق ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ

وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ اور اس دن حکم اور فرمان صرف خدا تعالیٰ کے لیے ہے۔ اور جس طرح دنیا میں بادشاہ کا حکم رعایا پر' والدین کا حکم اولاد پر' آقا کا حکم نوکر پر' خاوند کا حکم بیوی پر اور مالک کا حکم مملوک پر جاری تھا اس روز منقطع ہو جائے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کے حکم کے سوا کسی کو حکم دینے کی مجال نہ ہوگی۔ جسے اللہ تعالیٰ نے بہمہ وجوہ پسند فرما لیا' نجات پا گیا اور جسے بہمہ وجوہ ناپسند فرمایا اسے ہلاکت ابدی نصیب ہوگئی۔ اور جسے بعض وجوہ کی بناء پر پسند فرمایا اور بعض وجوہ کی بنا پر ناپسند تو شفاعت کرنے والوں کو جو کہ انبیاء علیہم السلام' اولیائے اللہ' علمائے کرام' حفاظ' شہداء اور فرشتے ہوں گے' حکم ہوگا کہ فلاں کی شفاعت کریں تاکہ تمہیں عزت اور مرتبہ حاصل ہو اور اس تقریر سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں جیسا کہ معتزلہ سمجھتے ہیں' ان اکابرین کی شفاعت کی نفی مذکور نہیں ہے بلکہ شفاعت کو حاکم مطلق کے حکم پر موقوف رکھنا ہے اور یہی مذہب اہلِ سنت و جماعت ہے۔

سورۃ المطففین

اس سورۃ میں اختلاف ہے' مکی ہے یا مدنی۔ اکثر معتبر تفاسیر میں مروی ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم مدینہ عالیہ تشریف لائے تو وہاں کے لوگ ماپ اور تول میں بہت خیانت کرتے تھے' یہ سورۃ نازل ہوئی اور مدینہ عالیہ میں سب سے پہلے جو سورۃ نازل ہوئی یہی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ عالیہ کے لوگوں کو اس سورۃ کی تعلیم دی اور وہ لوگ قرآن پاک اور رسول کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی ہدایت سے درست ہو گئے۔ چنانچہ اس وقت سے لے کر آج تک دنیا میں ماپ اور تول کے معاملے میں اہلِ مدینہ سے زیادہ کوئی صحیح نہیں۔ (یہ ان لوگوں کے متعلق فرمایا جو آج بھی مدینہ عالیہ میں ان مہاجرین و انصار علیہم الرضوان کی اولاد میں سے موجود ہیں اور کاروبار کرتے ہیں۔ نجدیوں یا غیر ملکی تاجروں کے متعلق نہیں جیسا کہ زائرین مدینہ عالیہ پر مخفی نہیں ہے)

اور جنہوں نے اس سورۃ کو مکی کہا ہے' وہ کہتے ہیں کہ دراصل اس سورۃ کا نزول تو مکہ معظمہ میں ہوا جب آپ مدینہ عالیہ تشریف فرما ہوئے اور وہاں کے لوگوں کو اس مرض میں مبتلا دیکھا تو اس سورۃ کی ان کے سامنے تلاوت فرمائی۔ لوگ سمجھے کہ اس سورۃ کا نزول اس وقت ہوا تھا۔ اور عطاء مکی نے کہا ہے کہ اس سورۃ کا نزول سفر ہجرت میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ کے درمیان ہوا ہے۔

سورۃ الانفطار کے ساتھ رابطہ کی وجہ

اور سورۃ انفطار کے ساتھ اس سورۃ کے رابطے کی وجہ یہ ہے کہ اس سورۃ میں بُروں اور نیکوں کے اعمال ناموں کی ابتدا کا ذکر ہے کہ دنیا میں لکھے جاتے ہیں جبکہ اس سورۃ میں ان اعمال ناموں کے درمیانی حاصل کا بیان ہے کہ بُروں اور نیکوں میں سے ہر ایک کو ان دو دفتروں جن کا نام سجین اور علیین ہے' کے اہل کاروں کے حوالے کر دیا جائے گا جس طرح کہ سورۃ انشقت میں ان اعمال ناموں کی انتہا کا بیان ہے کہ حشر کے دن ہر کسی کے ہاتھ میں پہنچا دیئے جائیں گے۔

وجہ تسمیہ

اور اس سورۃ کو سورۃ المطففین کا نام اس لیے دیا گیا ہے کہ اس کی ابتدا میں مطففین کے بُرے انجام کا ذکر ہے اور وہ اس بات پر دلالت ہے کہ جو مخلوق کے اتنے سے تھوڑے حق کو ضائع کر دے اس کا انجام اتنا بُرا ہے تو جو حق تعالیٰ کے بہت بڑے حق کو جو کہ اس کی آیات اور رسل علیہم السلام پر ایمان لانا ہے' ضائع کر دے اس کا انجام کیا ہوگا اور ان دونوں سورتوں میں عبارت اور اندازِ کلام کے اعتبار سے مناسبت بھی بالکل ظاہر ہے اس سورۃ میں كَلَّا بَلْ تُكَذِّبُوْنَ بِالدِّيْنِ وَاِنَّ عَلَيْكُمْ لَحَافِظِيْنَ مذکور ہے جبکہ اس سورۃ میں وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ الَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ وَمَا اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حَافِظِيْنَ واقع ہے اور اس سورۃ میں اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِيْ نَعِيْمٍ ہے جبکہ یہاں بعینہٖ یہی الفاظ مذکور ہے اور اس سورۃ میں اِنَّ الْفُجَّارَ لَفِيْ جَحِيْمٍ يَّصْلَوْنَهَا يَوْمَ الدِّيْنِ ہے جبکہ یہاں ثُمَّ اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ ہے اور اس سورۃ کا اختتام اس کلمے پر ہے کہ وَالْاَمْرُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ جبکہ اس سورۃ کے اوائل میں يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ مذکور ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ ماپ تول میں مخلوق کے حقوق کو کم کرنے والوں کے حال پر افسوس ہے۔

تطفیف کی مختلف صورتیں

اگرچہ لغتِ عرب میں لفظ تطفیف ماپ اور تول میں خیانت کرنے کو کہتے ہیں لیکن شیخ ابوالقاسم قشیری قدس سرہ العزیز اور دیگر بزرگوں نے فرمایا ہے کہ لوگوں کے عیب ظاہر کرنا اور اپنے میں ان عیبوں کو چھپانا' لوگوں سے انصاف چاہنا اور خود انصاف پر راضی نہ ہونا' لوگوں کے عیب دیکھنا اور اپنے عیبوں سے چشم پوشی کرنا' لوگوں سے اپنی تعظیم طلب کرنا اور مستحق لوگوں کی تعظیم میں کوتاہی کرنا' اپنے لیے جو کچھ پسند کرتے ہیں دوسروں کے لیے ناپسند کرنا' مزدوروں اور نوکروں سے کام پورا چاہنا اور مزدوریاں اور تنخواہیں دیتے وقت ان کے حق میں کمی کرنا اور تقدیر شدہ رزق اللہ تعالیٰ کے دربار سے پورا چاہنا اور اس کی اطاعتوں میں کمی کرنا سب تطفیف میں داخل ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ الصلوۃ

مکیال فمن دفی دفی له ومن طفف فقد علمتم فیه ما قال الله تعالیٰ یعنی نماز پیمانہ ہے جس نے پورا ماپا' اسے پورا اجر ملے گا اور جس نے کمی کی تو اس کے بارے میں اللہ تعالیٰ نے جو کچھ فرمایا ہے' تم جانتے ہو۔

نیز حدیث قدسی میں ہے اوف یا بن آدم کما تحب ان یوفی لك واعدل کما تحب ان لیعدل لك اے ابن آدم پورا حق ادا کر جیسا کہ تو اپنا حق پورا چاہتا ہے اور عدل کر جیسا کہ تو اپنے لیے عدل چاہتا ہے۔

پانچ چیزوں کے عوض پانچ چیزیں ملتی ہیں

نیز حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مدینہ منورہ کے لوگوں کے سامنے یہ سورۃ تلاوت کرنے کے بعد ارشاد فرمایا کہ خمس بخمس یعنی پانچ چیزیں پانچ چیزوں کے عوض ہوتی ہیں' کوئی فرقہ اجتماعی طور پر عہد شکنی نہیں کرتا مگر ان پر ان کے دشمنوں کو مسلط کر دیا جاتا ہے اور کوئی فرقہ خلاف شریعت فیصلہ نہیں کرتا اور رشوت کے ساتھ حکم شرعی کو نہیں بدلتا مگر ان میں غربت و افلاس سرایت کر جاتے ہیں اور کسی فرقے میں اعلانیہ بدکاری اور لواطت رائج نہیں ہوتی مگر ان کی ذات پر موت کو مسلط کر دیا جاتا ہے اور کوئی فرقہ ماپ اور تول میں کمی نہیں کرتا مگر ان کی کھیتیاں تلف ہو جاتی ہیں اور وہ قحط میں مبتلا ہو جاتے ہیں اور کوئی فرقہ زکوٰۃ کو نہیں روکتا مگر ان سے بارشِ رحمت روک لی جاتی ہے۔

بہرحال ماپ تول کا مقدمہ بہت معتبر ہے۔ اس لیے کہ حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم پر جو عذاب آیا اسی گناہ کی نحوست کی وجہ سے تھا اور اس کے گناہِ کبیرہ ہونے میں علماء کا اختلاف ہے۔ بعض نے مبالغہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ اس فعل شنیع کا قصد کرنا بھی کبیرہ گناہوں سے ہے اور بعض نے تھوڑے اور بہت میں فرق کیا ہے۔

چوری کے نصاب کی حد

وہ کہتے ہیں کہ اگر ماپ اور تول کا نقصان چوری کے نصاب کی حد کو پہنچ جائے جو کہ ان علاقوں میں رائج تین روپے ہیں تو کبیرہ ہو جاتا ہے ورنہ صغیرہ ہے۔ اور اکثر ظاہر بین یہاں تردد کرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ لوگوں کے حق سے معمولی شے کا غصب کرنا اتنا وبال نہیں

رکھتا' یہ اجماعی طور پر صغیرہ گناہ ہے تو تطفیف کو کبائر میں سے کیوں شمار کیا گیا ہے اور اس پر شدید وعید کیوں مرتب کرتے ہیں؟

اس کا جواب یہ ہے کہ غصب ایک ایسا گناہ ہے جس کے ضمن میں موضوع شریعت کو بدلنا لازم نہیں آتا جبکہ یہ تطفیف عدل کی شکل میں ایک ظلم ہے۔

ماپ تول میں کمی کے ظلم ہونے کی تفصیل

اس کی تفصیل یہ ہے کہ ماپ اور تول کے پیمانوں کو رب العزت نے انصاف اور عدل قائم کرنے کے لیے نصب فرمایا ہے۔ اور مخلوق کے معاملات کا دارومدار ان دونوں چیزوں پر چھوڑا ہے تو ان دونوں چیزوں کو ظلم کا وسیلہ بنانا ایسا ہے کہ کسی نیکی کو گناہ کا وسیلہ بنالیں۔ نیز ماپ تول میں کمی کرنے میں خیانت' دھوکہ اور فریب ہے۔ جو کہ نفس کے خائن ہونے پر دلالت ہے۔ بخلاف غصب کے۔ نیز وہاں طبعی کمینہ پن ہے کہ ایک مٹھی بھر جو کی خاطر اپنے دین کو فروخت کر رہا ہے اور عدل الٰہی کو ظلم کی صورت میں نمودار کرتا ہے' ان وجوہ اور ان جیسی اور وجوہ کی بنا پر یہ گناہ اتنا بڑا ہے کہ دوسرے صغیرہ گناہوں میں یہ صورت نہیں پائی جاتی۔

اگرچہ بعض بزرگوں سے منقول ہے کہ انہوں نے بادشاہ وقت کو وعظ و نصیحت کے مقام میں فرمایا ہے: کہ تو اس عذاب کو جانتا ہے جو مطفف کے حق میں وارد ہے اور تو مسلمانوں کے اموال ماپ اور تول کے بغیر لے رہا ہے' تیرا حال کیا ہوگا لیکن ان بزرگوں کی مراد یہ ہے کہ بادشاہ کا ظلم بھی تطفیف کی طرح شریعت کے موضوع کو بدلنا ہے اس لیے کہ اسے سلطنت کی قدرت اس لیے دی گئی ہے کہ عدل قائم کرنے اور ظلم دُور کرنے کی صورت بنے جب اس قدرت کو عدل اُٹھانے اور ظلم قائم کرنے کے لیے خرچ کریں تو قلب موضوع لازم آئے گا۔

بہرحال اس قسم کے گناہوں میں مخلوقِ خدا کی حق تلفی کے علاوہ دغا' فریب' حکمتِ خداوندی میں رخنہ اندازی اور ظلم کو عدل کی صورت میں ظاہر کرنا ہے جس طرح کہ قرآن پاک کو درمیان میں دے کر دغا کرے۔ پس ان خباثتوں کے جمع ہونے کی وجہ سے کبیرہ گناہ ہوگیا اور یہی وجہ ہے کہ مسجد کو نجاستوں کی جگہ بنانا حرام ہے جبکہ غیر مسجد کو اور دین کے عمل کو

دنیا کی غرض سے کرنا اور اپنے آپ کو نیکوں کے روپ میں ظاہر کر کے داد ابلیسی دینا' صریح طور پر دنیا طلب کرنے اور بے پردہ بدکاری کرنے سے کہیں زیادہ سخت اور بُرا ہے۔

اور چونکہ تطفیف یعنی ماپ اور تول میں کمی کرنا کبھی لاپرواہی کے طریقے سے بھی ہوتا ہے کہ ایک شخص بنیادی طور پر اپنی طبیعت میں معتدل مزاج واقع ہوا ہے۔ اور حقوق پورے طور پر دینے اور لینے میں اتنی غور وفکر نہیں کرتا اور یہ تطفیف اپنا حق لینے میں تو کوئی مضائقہ نہیں رکھتی۔ دوسرے کا حق دینے میں حرام اور ممنوع ہے لیکن انجام میں اتنی شدت اور سزا نہیں رکھتی کہ اس کے مرتکب کے حال پر وائے کہا جائے اس تطفیف سے بچنے کے لیے مطففین کی ایک صفت اور علامت بیان فرمائی گئی ہے تا کہ اس بات کا پتہ چلے کہ ماپ اور تول میں ان کی کمی لاپرواہی کی بناء پر نہیں بلکہ پوری ذہانت اور ہشیاری کے ساتھ قصداً اور عمداً یہ کام کرتے ہیں اور وافر مقدار میں حرص رکھتے ہیں اس لیے کہ ان کی صفت یہ ہے کہ:

اَلَّذِيْنَ اِذَا اكْتَالُوْا عَلَى النَّاسِ وہ لوگ کہ جب لوگوں سے اپنا حق ماپ کر لیں۔

يَسْتَوْفُوْنَ تو پورا لینے کا قصد کرتے ہیں اور چاہتے ہیں کہ ہمارے حق میں سے ایک دانہ بھی کم نہ ہو بلکہ پورا لینے کے بہانے اپنے حق سے بھی زیادہ لیتے ہیں اور یوں بات کرتے ہیں کہ ہم اپنا حق پورا لینا یقینی طور پر معلوم نہیں کر سکتے مگر جبکہ کچھ زائد لے لیں اور جب وہ ماپ میں یہ حیلہ کرتے ہیں اور اپنے حق سے زیادہ چاہتے ہیں تو تول میں پورا لینے کے بہانے سے وہ بطریقِ اولیٰ زیادہ کی طلب کرتے ہیں اس لیے کہ ماپ میں چشم پوشی کرنا اور سستی کرنا رائج ہے جبکہ تول میں تنگی اور سختی۔

اور اس کا راز یہ ہے کہ ماپنا چیزوں کے طول وعرض کے ساتھ متعلق ہے جبکہ تولنا بوجھ کے ساتھ متعلق ہے اور جو چیزیں پہننے اور سکونت اختیار کرنے کی حیثیت سے جیسے آدمی کے طول وعرض کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں' ان میں پیمائش رائج ہے اور ان چیزوں میں جو کہ غذا اور دوا ہونے کی حیثیت سے آدمی کی باطنی قوتوں کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں یا مالیت کے ساتھ تعلق رکھتی ہیں جیسے سات معدنیات جو کہ جدا جدا ہیں کہ ثقل کی وجہ سے اجزا کو جمع رکھتی ہیں اور اجزا کے جمع ہونے کی وجہ سے طویل مدت تک باقی رہتی ہیں اور طوالت بقاء کی وجہ سے ان کی

مالیت زیادہ ہوگئی' وزن رائج ہے۔ پس جو چیزیں پیمائش آتی ہیں غالباً ان چیزوں کی نسبت کم قیمت ہوتی ہیں جو کہ وزن میں آتی ہیں اور وزن کی جانے والی چیزیں ان سے زیادہ قیمتی ہوتی ہیں مگر نادر طور پر کم قیمت چیزوں میں وزن اور قیمتی چیزوں میں پیمائش کا رواج ہوگیا جیسے شلغم اور کدو کی انہیں تولا جاتا ہے اور کناری اور کم خواب جو کہ ماپے جاتے ہیں بہرحال یہاں اس بات میں کہ پیمائش کے ذکر پر اکتفاء فرمایا گیا اور وزن کا ذکر نہیں کیا گیا' یہی نکتہ کارفرما ہے۔

اور بعض ذہین لوگوں نے کہا ہے کہ تولی جانے والی چیزوں میں سے اپنا حق لینے کے وقت ترازو بیچنے والے کے ہاتھ میں ہوتی ہے' خریدار کے لیے کوئی زیادہ قابلِ اعتبار تصرف ممکن نہیں ہے اس لیے کہ ترازو کا پلہ معمولی سے بوجھ کی وجہ سے جھک جاتا ہے اور زیادتی ظاہر ہو جاتی ہے اور ماپی ہوئی چیز میں حق لینے میں کچھ نہ کچھ خریدار کے لیے تصرف ممکن ہے' کسی حیلے سے پیمانے اور گز کو ہلا دے یا ماپے گئے کپڑے کو طاقت کے ساتھ کھینچ لے اور زیادہ حاصل کر لے بخلاف اس وقت کے جب حق دیا جائے کہ پیمانہ بھی اس کے ہاتھ میں ہے اور ترازو بھی اسی کے ہاتھ میں لہٰذا وہاں پیمائش اور وزن دونوں کو ذکر فرمایا گیا ہے جیسا کہ انشاءاللہ العزیز آئے گا۔

اور یہاں لفظ علیٰ اس لیے لایا گیا ہے کہ ان کا لوگوں سے ماپ کر لینا ان لوگوں کو نقصان دینے کے ارادے سے ہے نہ کہ اپنا حق ان سے لینے کے ارادے سے۔ ورنہ اصل لغت میں اکتیال من سے متعدی ہوتا ہے۔ کہتے ہیں اکتلت منك یعنی میں نے تجھ سے ماپ کر لیا۔

وَإِذَا كَالُوهُمْ أَوْ وَّزَنُوهُمْ اور جب لوگوں کو ان کا حق ماپ کر دیں یا تول کر۔ اور کیل اور وزن کے الفاظ لغتِ عرب میں جس طرح ماپنے اور تولنے کے معنوں میں آتے ہیں اسی طرح ماپ کر دینے اور تول کر دینے کے معنوں میں بھی آتے ہیں۔ پس یہاں لام کو چھپا ہوا ماننے کی ضرورت نہیں ہے جیسا کہ اکثر مفسرین نے کہا ہے کہ مراد كالوا لهم اور وزنوا لهم ہے اس لیے کہ ماپی اور تولی گئی چیزیں لوگوں کے اموال ہیں نہ کہ ان کی ذوات البتہ یہاں

لام کو لفظ سے حذف کر دیا گیا ہے اس لیے کہ زیادہ لام نفع کے لیے آتا ہے جبکہ یہاں نفع کا گمان کلام میں تناقض کے گمان کا موجب ہو جاتا ہے اس لیے کہ مقصد یہ ہے کہ وہ حق دینے کے وقت بھی لوگوں کو نقصان پہنچانے کا قصد کرتے ہیں اور پیمائش اور وزن دونوں امور میں یُخۡسِرُوۡنَ لوگوں کو نقصان پہنچاتے ہیں اور ایک چیز کے بعد دوسری چیز نکال کر ان کا حق کم کرتے ہیں۔

حق دینے اور لینے کی چار صورتیں

یہاں جاننا چاہیے کہ حق دینے اور لینے میں پورا کرنے اور کم کرنے کے اعتبار سے چار صورتیں ذہن میں آتی ہیں۔ پہلی صورت یہ کہ دونوں صورتوں میں پورا کریں' دوسری صورت یہ کہ دونوں صورتوں میں کم کریں' تیسری صورت یہ کہ دینے میں کم کریں اور لینے میں پورا لیں اور یہی صورت اس آیت میں مذکور ہے' چوتھی صورت یہ کہ دینے میں پورا دیں اور لینے میں نقصان قبول کریں' یہ اعلیٰ مرتبہ ہے اور جواں مردوں اور عالی ہمت والوں کا کام ہے اور پہلی دو صورتوں کو یہاں ذکر نہیں فرمایا گیا کہ ان دونوں صورتوں میں بھی اگرچہ قباحت اور حرمت موجود ہے لیکن اتنی مکمل خباثت نہیں کہ ان کے مرتکب کے حال پر افسوس کیا جائے اس لیے کہ نقصان دینا نقصان لینے کو کھینچنے والا ہے اور اسی طرح پورا دینا پورا لینے کا معاوضہ ہو جاتا ہے۔ پس من وجہ نیکی اور من وجہ بُرائی ہوتی ہے۔

قرض کے معاملے میں لوگوں کی چار قسموں کا بیان

اور یہ اس قیاس پر ہے کہ حدیث پاک میں وارد ہوا کہ قرض کے مسئلے میں لوگوں کی چار قسمیں ہیں۔ پہلی قسم وہ شخص جو دوسروں کا قرض بخوبی ادا کرے اور دوسرے سے اپنے قرض کا تقاضا بھی اچھے طریقے سے کرے اور یہ شخص سب سے بہتر ہے۔ دوسرا وہ جو دوسروں کا قرض بھی انتہائی تکلیف اور دُکھ کے ساتھ ادا کرے اور اپنا قرض بھی نہایت سختی اور بے مروتی سے طلب کرے اور یہ سب سے بُری قسم ہے۔ تیسرا وہ جو دوسروں کا قرض بخوبی ادا کرے اور دوسروں سے اپنے قرض کے تقاضے کے وقت شدت اور بے مروتی کرے۔ چوتھا وہ قرض خرابی کے ساتھ ادا کرے اور دوسروں سے قرض کے تقاضے میں اچھا سلوک اور

نرمی عمل میں لائے اور یہ دونوں قسمیں درمیانی ہیں کہ ایک طرف کی خوبی دوسری طرف کی بُرائی کے مقابل ہو کر نری بدی سے صورت بہتر کر دیتی ہے۔

غصے کے معاملے میں لوگوں کی چار قسمیں ہیں

اور اسی طرح غصے کے معاملے میں بھی لوگوں کی چار قسمیں ہیں: ایک وہ جو جلد غصے میں آ جائے اور جلد راضی ہو جائے' دوسرا وہ جو دیر سے غصے میں آئے اور دیر سے راضی ہو اور یہ دونوں قسمیں درمیانی ہیں' تیسرا وہ جو جلد غصے میں آئے اور دیر سے راضی ہو اور یہ سب سے بُری قسم ہے' چوتھا وہ جو دیر سے غصے میں آئے اور جلد راضی ہو جائے اور یہ قسم سب سے بہتر ہے۔

اور جب مطففین کو ان کے حال پر افسوس کہہ کر جھڑکا گیا اب ارشاد ہو رہا ہے کہ یہ لوگ اس کام کے ارتکاب کی وجہ سے گویا قیامت کے منکر ہیں اس لیے کہ جو اس دن کا اعتقاد رکھے' وہ مخلوق کے حقوق کو خصوصاً مکروفریب اور دھوکہ دہی کے ساتھ ضائع کرنے میں اس قدر جرأت نہیں کرتا اس لیے استفہام انکاری کے طریقے سے فرمایا گیا۔

اَلَا یَظُنُّ اُولٰٓئِكَ کیا یہ عقل وشعور سے دُور افتادہ لوگ گمان نہیں کرتے اور ظن کے لفظ میں جو کہ گمان کے معنوں میں ہے اس بات کا پتہ دیا گیا ہے کہ اس عقیدے کو عقل مند آدمی تو پختہ یقین کے ساتھ جانتا ہے بلکہ اسے ہر لمحہ اپنی نگاہوں کے سامنے رکھتا ہے جبکہ یہ لوگ اس کا گمان بھی نہیں کرتے' اعتقاد کی کیا گنجائش۔ نیز ایک یہ بھی اشارہ ہے کہ اگر کسی کو اس دن کے متعلق پختہ عقیدہ نہ ہو تو نرا گمان ہی اس قسم کی بُرائیوں سے بچنے کے لیے کفایت کرتا ہے جس طرح کہ سفر کرنے والے راستے کے خطرے کے گمان بلکہ صرف وہم کی وجہ سے ہی دانہ پانی ہمراہ رکھتے ہیں اور کوئی محافظ طلب کرتے ہیں اور یہ بے وقوف اس مضمون کا بھی گمان نہیں رکھتے۔

اِنَّهُمْ مَّبْعُوْثُوْنَ لِیَوْمٍ عَظِیْمٍ کہ تحقیق وہ ایک بہت بڑے دن میں زندہ کیے جائیں گے اور اس دن کی بزرگی اس وجہ سے ہے کہ وہ دن عدل قائم کرنے کا دن ہے اور اس روز لوگوں سے حقوق اللہ اور حقوق العباد کا مطالبہ کیا جائے گا اور حقوق کو ضائع کرنے

والوں پر انتہائی سختی ہوگی اور اس دن کی بزرگی کے اسباب میں سے یہ ہے کہ وہ دن رسوائی کا دن ہے اس لیے کہ اس کی صفت یہ ہے۔

یَوْمَ یَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ کہ جس دن اگلے پچھلے سب لوگ رب العالمین کے دربار میں کھڑے ہوں اور یہاں لفظ رب العالمین اسم ذات کی جگہ لایا گیا ہے تا کہ اس بات کا اشارہ ہو کہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کا عموم اپنے زیر تربیت لوگوں کے حقوق کو پورا کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔ پس مخلوق کے حقوق ضائع کرنے والوں کے لیے اس کے حضور کھڑا ہونا انتہائی ذلت اور رسوائی ہوگی۔

اور اس اُٹھنے کو بعض مفسرین نے مردوں کو زندہ ہونے پر محمول کیا ہے جیسا کہ کہتے ہیں کہ فلاں خواب سے اُٹھا یعنی بے دار ہوا اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ حقیقی اُٹھنا مراد ہے۔ چنانچہ ابن عباس رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن لوگ دنیا کے تین سو سال کی مدت تک کھڑے رہیں گے اور ان کے بارے میں کوئی فیصلہ اور حکم نہیں ہوگا لیکن یہ ساری مدت دراز ایمان والوں کو نظر میں اتنی قلیل معلوم ہوگی کہ گویا نماز سے فارغ ہوئے۔

اور صحیح مسلم میں حضرت مقداد بن الاسود رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے اس آیت کی تفسیر میں وارد ہے کہ یقوم الناس فی رشحھم الی انصاف اذانھم یعنی لوگ پسینے میں کھڑے رہیں گے اور ان کا پسینہ ان کے کانوں کی لُو تک پہنچ جائے گا۔ نیز صحیح مسلم اور دوسری صحاح میں مروی ہے کہ قیامت کے دن سورج کو لوگوں کے قریب لائیں گے یہاں تک کہ سورج ایک میل یا دس میل کے اندازے پر کھڑا رہے گا اور انہیں سورج کی گرمی پگھلا دے گی اور ان کا پسینہ بہے گا البتہ ان کے بُرے اعمال کی مقدار کے مطابق بعض کا پسینہ گردن تک پہنچے گا اور بعض کے کانوں کی لُو تک پہنچ کر لگام کی طرح ان کے منہ میں داخل ہوگا، بعض کی گردن کی ابتدا تک، سینہ تک، کمر تک، زانو تک اور ٹخنوں تک۔ علیٰ ہذا القیاس

منقول ہے کہ ایک دن حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ نے یہ سورۃ نماز میں شروع

کر دی جب اس آیت تک پہنچے آپ پر خوف اور گریہ کا غلبہ ہو گیا اور تاب نہ لاتے ہوئے زمین پر گر پڑے اور اس وقت کی نماز ادا نہ کر سکے۔

كَلَّآ پیمائش اور وزن کم کرنے والوں کو چاہیے کہ یہ کام نہ کریں اور قیامت کے دن اور عدل کرنے والے قوی کے حضور کھڑا ہونے سے بے خبر اور غافل نہ ہوں۔ اس لیے کہ ان کا ہر اچھا برا کام اعمال ناموں میں نقش ہو کر اس کے دربار کے اہل کاروں کے سپرد ہو چکا ہے۔ انہوں نے مخلوق کے جو حقوق بھی ضائع کیے ہیں اس دفتر کے مطابق اس روز ان سے باز پرس ہو گی اور اگر وہ پوچھیں کہ ہمارے اعمال نامے موت کے بعد کس نشانی سے معلوم ہوں گے اور کہاں محفوظ رہیں گے تو انہیں جواب دینا چاہیے کہ:

اِنَّ كِتَابَ الْفُجَّارِ لَفِيْ سِجِّيْنٍ تحقیق بدکاروں کے اعمال نامے اور ان کے ناموں کے اندراجات سجین کے دفتر میں ہے۔ سجین سجن سے جس کا معنی قید خانہ ہے' مبالغے کا صیغہ ہے اور چونکہ وہ جگہ کہ اس دفتر والے وہاں ہوتے ہیں ایسی تنگ و تاریک اور جہنمیوں کی ارواح کے جمع ہونے کی جگہ ہے اس بناء پر اس دفتر کا نام بھی رکھ دیا گیا۔ چنانچہ اسے بیان فرمایا جا رہا ہے:

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا سِجِّيْنٌ اور تو کیا جانے کہ سجین کیا ہے۔ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ایک مہر لگی ہوئی اور علامت زدہ کتاب ہے۔ خلاصہ یہ ہے کہ وہ ایک ایسا دفتر ہے کہ جس میں جہنمیوں میں سے ہر ایک کا نام لکھا ہوا ہے اس کے نام پر اس کے برے اعمال لکھے ہوئے ہیں' بندوں کے اعمال لکھنے والوں کی فردوں کے مطابق جو کہ اس دفتر میں باقی رکھ جاتی ہیں' بدکاروں کی موت اور ان کے اعمال منقطع ہونے کے بعد اس دفتر کے اوپر یا جہنمیوں میں سے ہر ایک کے نام کے اوپر ایک علامت اور مہر لگا رکھی ہے جسے دیکھنے سے ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ شخص جہنمی ہے۔ اور اصل لغت میں رقم اس علامت کے معنوں میں ہے جو کہ تاجر کپڑوں اور تھانوں پر فروخت کے وقت قیمت کی پہچان کے لیے لگاتے ہیں اور اسے ہندی میں آنک کہتے ہیں۔ اور ضعیف احادیث اور کعب احبار کی روایت کے مطابق سجین کا بیان یوں آیا کہ وہ دفتر ساتوں زمینوں کے نیچے ہے' اور وہاں ایک سیاہ پتھر پڑا ہے جس سے بدبو اور دھواں

نکلتا ہے اور ابلیس اور دوسرے شیطان جب راہِ فرار اختیار کرتے ہیں تو وہیں جا ٹھہرتے ہیں۔ بدکار کی روح کو پہلے تو قبض کرنے کے بعد آسمان پر لے جاتے ہیں' آسمان کے دربان اس کے لیے دروازہ نہیں کھولتے اور داخل ہونے نہیں دیتے پھر زمین پر لاتے ہیں اور اسے کوئی جگہ قبول نہیں کرتی جہاں اسے رکھا جائے۔ آخر ساتویں زمین کے نیچے اس پتھر کے نیچے لے جاتے ہیں اور جو فرشتے اس دفتر کے اہل کار ہیں' اس کے نام کو اپنے دفتر میں لکھ لیتے ہیں کہ فلاں بن فلاں اس تاریخ کو دنیا سے برزخ میں پہنچا اور یہ عمل لایا اور اس کے اعمال کے روزنامچے کی فردیں کراماً کاتبین سے لے کر اس دفتر میں محفوظ کر لیتے ہیں تاکہ قیامت کے دن اس سب کو اس کے بائیں ہاتھ میں تھما دیں اور بدکاروں کی روحیں بھی اسی مقام پر ٹھہری رہتی ہیں اور انہیں قسم قسم کا عذاب دیا جاتا ہے۔

علم معانی کے مطابق دو جواب طلب سوالات

اور یہاں علم معانی کے مطابق دو سوال وارد کیے گئے ہیں جو کہ جواب طلب ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ فجار کے دفتر کا ذکر ایک ایسی ابتدائی خبر ہے کہ سننے والے اس خبر کے مفہوم سے خالی الذہن تھے اور اسے کبھی نہیں سن تھا حالانکہ علم معانی کا قاعدہ یہ ہے کہ ابتدائی کلام میں کہ جس سے سامع بے خبر ہو تاکید نہیں لاتے یہاں دو تاکیدیں کیوں لائی گئیں' ایک ان اور دوسری لام؟

اس کا جواب یہ ہے کہ اگرچہ سننے والے فجار کے اعمال کے دفتر کے سجین میں ہونے سے متعلق بے خبر تھے لیکن اسے ثابت کرنے سے اعمال کے اصل دفتر کو ثابت کرنا لازم آتا ہے اور کفار جو کہ قیامت اور جزا دینے کے منکر ہیں اس دفتر کے متعلق سخت انکار کرتے ہیں اس لیے ان کے انکار کے اندازے کے مطابق قوی تاکید لائی گئی جیسا کہ زید کے وجود کے منکر کے سامنے یوں کہیں کہ ان زیداً لغنی دار فلاں اگرچہ سامع اس فلاں کا گھر نہ جانتا ہو اور اس نے اس کا نام نہ سنا ہو۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ جب سجین کا ذکر پہلے ہو چکا تو مقامِ عہد ہو گیا۔ پس چاہیے تھا کہ یوں کہا جاتا ہے کہ وَمَا اَدْرٰىكَ مَا السِّجِّيْنُ جیسا کہ كَمَآ اَرْسَلْنَآ اِلٰى فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا

فعصیٰ فرعون الرسول میں فرمایا گیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جب سننے والے سجین کے معنوں سے بے خبر تھے تو اس کا ذکر گویا ہوا ہی نہیں۔ پس لوٹانے کے مقام بھی اسے نکرہ لانا ہی مناسب ہوا۔ گویا یوں فرمایا گیا ہے کہ وہ مجہول سجین کیا ہے جس کے معنوں کا انہیں ابھی تک پتہ نہیں چلا۔ بخلاف لفظ رسول کے لغت عرب سے واقف لوگوں پر اسے سنتے ہی معنی واضح ہو جاتا ہے۔ پس لوٹانے کے وقت اسے معرفہ لانا مناسب ہوا۔

ایک اور شبہ اور اس کا جواب

نیز اہلِ نظر یہاں ایک شبہ وارد کرتے ہیں کہ ہر مقام پر نیکوں کا ذکر بُروں کے ذکر سے پہلے ہے اور نیکوں کی شرافت اور بزرگی کے مناسب بھی یہی ہے کہ ان کا ذکر پہلے لایا جائے جبکہ یہاں بُروں کے دفتر کا ذکر پہلے فرمایا گیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ سورۃ کی ابتدا سے کلام کی روانی مطففین کے حال کے لیے ہے جو کہ بدکاروں کی ایک قسم ہے۔ پس مناسب یہی ہے کہ کسی فاصلے کے بغیر انہیں ڈرانے کے لیے پہلے بدکاروں کے دفتر کا ذکر کیا جائے ورنہ یہ مقصد بخوبی حاصل نہ ہو۔ اور یہاں غیر اجنبی کلام کے ساتھ جدائی لازم آئے اور مقام کے تقاضے کی رعایت شرافت کی رعایت سے زیادہ ضروری اور زیادہ موزوں ہے۔

اور جب اس آیت میں بدکاروں کے بُرے انجام پر مبنی حال کو مطلقاً بیان کیا گیا اور پہلے گزر چکا ہے کہ مخلوق کے حقوق کو کم کرنے والے قیامت کے دن کا گمان نہیں رکھتے اب بصورِ ترقی ان لوگوں کے حال کا ذکر ہو رہا ہے جو کہ آخرت کے عقیدے میں کوتاہی کرتے ہیں اور اس سے بالکل انکار کرتے ہیں تا کہ مطففین کے اس گروہ کی خصوصیت کے ساتھ ملامت ہو۔

وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ اس دن افسوس کہ جس دن وہ دفتر کھول کر ہر کسی کو اس کے بُرے اعمال پر مطلع کیا جائے۔

لِلْمُكَذِّبِيْنَ منکروں کے حال پر جو کہ اس دن کا عقیدہ ہرگز نہیں رکھتے اور گمان کرتے

ہیں کہ مخلوق کے حقوق ان سے واپس نہیں لیے جائیں گے اس لیے کہ ان کی حالت یہ ہے:

اَلَّذِيْنَ يُكَذِّبُوْنَ بِيَوْمِ الدِّيْنِ جو کہ روزِ جزا کا انکار کرتے ہیں۔ خلاصۃ المرام یہ ہے کہ وہ اپنی طرف سے مخلوق کے حقوق لوٹانے کے ہی منکر نہیں ہیں بلکہ جزا کے سارے پروگرام کے ہی منکر ہیں اور روزِ جزا کا انکار بے شمار قباحتوں کی علامت ہے اس لیے کہ روزِ جزا کا عقیدہ ایمان کے تمام امور' عبادات اور معاملات میں دخل رکھتا ہے۔

وَمَا يُكَذِّبُ بِهٖ اور اس دن کا انکار نہیں کرتا۔ اِلَّا كُلُّ مُعْتَدٍ اَثِيْمٍ مگر وہ جو کفر میں حد سے گزر گیا ہو اور فسق میں حد سے بڑھ گیا ہو۔

کفر میں حد سے گزرنے کی صورت

رہا کفر میں حد سے گزرنا تو وہ اس طرح ہے کہ جو اس دن کا منکر ہے گویا وہ ربوبیتِ الٰہی اور اپنے اوپر اللہ تعالیٰ کی قدرت کے دائمی ہونے کا منکر ہے اور وہ گمان کرتا ہے کہ دنیا کے مالکوں کی طرح صرف مرنے سے ہی میں اس کی بندگی سے باہر آ جاتا ہوں اور وہ میرا مالک ہونے سے معزول ہو جاتا ہے۔ نیز وہ مرنے کے بعد اُٹھانے پر رب تعالیٰ کے قادر ہونے کا منکر ہے۔ نیز اللہ تعالیٰ کے عُدل کا منکر ہے اس لیے کہ وہ دنیا میں تو ظالم سے مظلوم کا حق نہیں لیتا اگر اس روز بھی نہ لے تو ظلم پر راضی ہو تو اس عقیدے کی وجہ سے کفر کے درجے تہ بہ تہ ہو جاتے ہیں اور بات کفر کی حد سے بھی آگے نکل جاتی ہے۔

فسق میں حد سے گزرنے کی صورت

اور فسق میں حد سے گزرنا اس طرح ہے کہ جب اس دن کا خوف نہ ہوا تو گناہ پر جرأت حاصل ہوگئی اور اس نے سمجھا کہ حاضر لذتوں اور خواہشات کو جزائے موہوم کے خطرے سے چھوڑ دینا کمال بے وقوفی ہے۔ پس وہ نفسِ امارہ کے تقاضے کے مطابق فسق و فجور خوب کرے گا۔ چنانچہ لفظ اثیم جو کہ آثم کا مبالغہ ہے' اس کی خبر دیتا ہے۔

اور مفسرین کے ایک گروہ نے معتد کو ظالم' غاصب اور مخلوقِ خدا کے حقوق ضائع کرنے والے پر محمول کیا ہے جبکہ اثیم سے فاسق اور ان گناہوں کے مرتکب مراد لیے ہیں جن کا تعلق حقوق اللہ کے ساتھ ہے جیسے زنا' لواطت' شراب نوشی' نماز اور روزہ ترک کرنا اس لیے کہ پہلی

قسم کا شر متعدی ہے جبکہ دوسری قسم کے گناہ صرف اس کی جان کا وبال ہیں۔ بہر حال مقصد یہ ہے کہ جزا کی تکذیب اور انکار ایسے شخص کا کام ہے جو کہ کسی مذہب اور مشرب کا پابند نہیں ہوتا۔ اور وہ کرنے نہ کرنے کے بارے میں کسی ملت اور دین کا حساب نہیں رکھتا اور اس مقصد پر جو عقلی دلائل قائم ہیں' انہیں گناہوں کی محبت میں حد درجہ مصروف ہونے اور آزادی و لادینیت کو پسند کرنے کی وجہ سے نگاہ میں نہیں لاتا بلکہ آیاتِ قرآنی اور انبیائے علیہم السلام کی خبروں سے بھی جن کی معجزاتِ قطعیہ سے تائید اور پختگی ہوتی ہے اس کے ذہن میں کوئی بے داری اور عبرت پیدا نہیں ہوتی اس لیے کہ

اِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيٰتُنَا جب اس کے سامنے ہماری آیات تلاوت کی جاتی ہیں جو کہ اس دن جزا واقع ہونے اور بندوں کے حقوق کی بازپرس ہونے پر دلالت کرتی ہیں' عناد کے طور پر

قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ کہتا ہے کہ یہ سب پہلے لوگوں کے فسانے ہیں جو کہ لوگوں کو خوف دِلانے اور انہیں بُرے کاموں سے ڈرانے کے لیے وہ گھڑ گئے ہیں تاکہ ایک دوسرے پر ظلم کرنے اور ایک دوسرے کی چیزیں غصب کرنے کی وجہ سے ملک خراب نہ ہو اور فتنہ و فساد ظاہر نہ ہو' ان کی کوئی بنیاد نہیں ہے کہ اس پر اعتماد کیا جا سکے۔

كَلَّا ایسا نہیں سمجھنا چاہیے اور یوں نہیں کہنا چاہیے اس لیے کہ جزا کا وقوع اور مخلوق کے حقوق کو لوٹانا روشن عقلی دلائل اور سچے متواتر نقلی شواہد سے ثابت ہے اور اگر وہ دلائل و شواہد منکروں کے دل کی تسلی نہیں کرتے اور ان کے دِلوں پر اثر نہیں کرتے تو یہ ان دلائل اور شواہد کا قصور نہیں۔

بَلْ رَانَ عَلٰى قُلُوْبِهِمْ بلکہ ان کے دِلوں پر زنگ بٹھا دیا ہے یہاں تک کہ دل کا چہرہ مکمل طور پر سیاہ ہو چکا ہے۔ مَا كَانُوْا يَكْسِبُوْنَ اس کمائی نے جو انہوں نے دنیا میں کی۔

اور دل پر یہ زنگ پیدا ہونے کی کیفیت جو حضرت عبداللہ بن مسعود اور دوسرے صحابہ کرام رضی اللہ علیہم کی روایات کے مطابق حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہوئی' یہ ہے کہ جب بندہ کسی گناہ کا مرتکب ہوتا ہے' ایک سیاہ تل اس کے دل پر پیدا ہو جاتا ہے اگر اس نے

توبہ کر لی تو اس سے دل کا آئینہ صیقل اور روشن ہو گیا ورنہ وہ سیاہ تل اس میں موجود رہتا ہے پھر جب اور گناہ کیا' ایک اور تل پیدا ہو گیا اور اسی دستور کے مطابق ہر گناہ سیاہی پیدا ہونے کا سبب ہوتا ہے یہاں تک کہ دل کی سطح پوری کی پوری تاریک اور سیاہ ہو جاتی ہے اور بمنزلہ آئینہ کے ہے' اس کی صفائی کے مطابق اس میں صورتیں نقش ہوتی ہیں اور جب یہ زنگ آلود ہو جائے تو کوئی صورت اس میں نقش پذیر نہیں ہوتی۔ پس اس زنگ کا دل پر پیدا ہونا دلیل اور کشف کے ساتھ حق کو سمجھنے کی صلاحیت کے باطل ہونے کا موجب ہوتا ہے اور دلائل کا بیان کرنا اور انبیائے علیہم السلام کی صحبت اس میں اثر نہیں کرتی اور وہ حق کو باطل اور باطل کو حق سمجھتا ہے اور اچھے کو برا اور برے کو اچھا خیال کرتا ہے۔

اور حدیث پاک میں وارد سیاہ تل کے پیدا ہونے کا معنی یہ ہے کہ ہر برا کام لطیفۂ قلب میں ایک تاریک کیفیت پیدا کر دیتا ہے نہ یہ کہ اس صنوبری ٹکڑے پر کوئی محسوس ہونے والا زنگ نمودار ہو جاتا ہے اس لیے کہ یہ صنوبری ٹکڑا قلب حقیقی نہیں ہے کہ اس میں اچھے برے کاموں کا کوئی اثر ہو۔ قلبِ حقیقی ایک اور لطیفہ ہے جو کہ اس گوشت کے ٹکڑے سے تعلق رکھتا ہے جس طرح کہ بینائی اور سننے کی قوت ایک اور چیز ہے جو کہ ظاہری آنکھ اور کان سے تعلق رکھتی ہے۔

یہاں جاننا چاہیے کہ امام حفص اور دوسرے معتبر قاری حضرات بل کے لام پر سکتہ کرتے ہیں' اور لام کا یرملون کے قاعدے کے مطابق حرف را میں صاف طور پر ادغام نہیں کرتے اور ظاہر ہے کہ یہ طریقہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی اور منقول ہوگا اور وحی کا نزول اسی کے مطابق ہوا۔ پس یہ امر ایک نکتہ چاہتا ہے اور وہ نکتہ بہت باریک ہے۔ ایک مقدمے کی تمہید کے بغیر ذہن میں نہیں بیٹھتا۔

پہلے تو یہ جاننا چاہیے کہ ہر لغت کے بلغاء کا قاعدہ ہے کہ بل یا بلکہ یا اختلاف لغات کے مطابق دوسرے اضراب کے کلمات کے بعد اگر کسی ایسی چیز کا ذکر کریں جس کا ذکر کرنا منظور ہے تو وقفہ یا سکتہ نہیں کرتے بلکہ اس کے مابعد کو ساتھ ہی لے آتے ہیں اور اگر کراہت یا حقارت یا کسی اور مصلحت کی بناء پر جو منظور تھا' ذکر میں نہ لائیں اور کوئی دوسری چیز جو کہ اس

سے کمتر ہو مگر مدعا کا پتہ دینے میں کفایت کرے اس کے عوض لائیں تو بل اور اس کے مابعد کے درمیان قلیل سا وقفہ ضروری سمجھتے ہیں اور اس وقفہ کی رعایت انتہائی بلاغت ہے جیسا کہ اپنی لغت میں اہلِ بلاغت میں سے ہر کسی پر تجربہ اور قیاس کے بعد یہ مسئلہ روشن ہو جاتا ہے۔

جب یہ مقدمہ بیان ہو چکا تو جاننا چاہیے کہ جب یہاں بل کے کلمہ پر معمولی سا ٹھہرنا ہوا جو کہ سکتہ سے عبارت ہے تو اس بات کا انکشاف ہوا کہ ان کافروں کے دِلوں کی حالت جو کہ آیاتِ الٰہیہ کے بارے میں پہلوں کے افسانوں کا گمان کریں اس قدر خراب ہے کہ کما حقہ اس حالت کا ذکر بندوں کی سمجھ میں نہیں آئے گا جو اپنے دِلوں کی خبر نہیں رکھتے' دوسروں کے دِلوں تک کیا پہنچیں لیکن یہاں زنگ پیدا ہونے کا ذکر جو کہ نظر صحیح اور کشف صریح کو روکنے والا ہے' ہی کافی ہے اور مخاطبین کی سمجھ کے بھی قریب ہے اس لیے کہ ظاہری آئینے میں زنگ پیدا ہونا دیکھتے ہیں اور اس زنگ کے آئینے میں صورتوں کے نقش ہونے کو روکنے کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

الغرض اس آیت میں اس شخص کو انتہائی خوف دِلایا گیا ہے جو گناہ پر گناہ کرتا چلا جاتا ہے اور توبہ' ندامت اور استغفار کے ساتھ جلدی تدارک نہیں کرتا۔ جس طرح کہ مریض طبیعت کی تھوڑی سی خرابی کو خاطر میں نہ لائے اور غذا میں ملاوٹ کرے۔ اور علاج پر متوجہ نہ ہو یہاں تک کہ طبیعت کی خرابی جڑ پکڑ جائے' اور قابلِ علاج نہ رہے۔ ہاں یہ بیماری ایک ایسا دُکھ ہے کہ اسے روحانی طبیبوں جو کہ انبیائے علیہم السلام اور اولیائے اللہ ہیں' کے سوا کوئی پہچان نہیں سکتا اور علاج نہیں کر سکتا اور اس سے زیادہ مشکل یہ ہے کہ یہ بیماری جس طرح روح کے مزاج کی خرابی کا موجب اور نظر و کشف کے لیے رکاوٹ بن جاتی ہے اسی طرح انبیاء علیہم السلام اور اولیائے اللہ سے دُور کر دیتی ہے اور روحانی طبیبوں کی شناخت سے روکنے والا ایک کثیف پردا پیدا کر دیتی ہے اور جب اس نے طبیب کو نہ پہچانا اور دجال کو مسیح خیال کیا تو علاج محال ہو گیا اور نوبت ناامیدی اور محرومی تک جا پہنچی' اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے پناہ دے۔

اور اگر زنگ آلود دِلوں والے کہیں کہ ہمیں دنیا میں کثرت ذکر اور گناہ چھوڑنے کے ساتھ دِلوں کو صاف اور صیقل کرنے کی کیا ضرورت ہے کیونکہ قیامت کے دن نورِ تجلّی کے چمکنے سے یہ زنگ خود بخود دُور ہو جائے گا اور چہرہ پورے طور پر صاف ہو جائے گا جیسا کہ اس دن کا عقیدہ رکھنے والوں کا گمان ہے' ان کے جواب میں کہنا چاہیے:

کَلَّآ ایسا گمان مت کرو کہ ان کے دِلوں کے زنگ نے صرف دنیا میں اثر کر کے انہیں حق سمجھنے' آیاتِ الٰہیہ کو پہچاننے اور روزِ جزا کا عقیدہ رکھنے سے باز رکھا بلکہ اس زنگ کا اثر قیامت کے دن زیادہ قوی ہوگا اس لیے کہ:

اِنَّهُمْ عَنْ رَّبِّهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّمَحْجُوْبُوْنَ تحقیق وہ لوگ اس دن اپنے پروردگار سے حجاب میں ہوں گے' نورِ تجلّی کے چمکنے سے نفع نہیں پائیں گے اور اس کے دیدار سے مشرف نہیں ہوں گے اس لیے کہ عقلی قانون ہے کہ نور کو نور کے بغیر دیکھا نہیں جا سکتا جس طرح ان کی بصیرت کی آنکھ دنیا میں تہ درتہ زنگ چڑھنے کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی روشن اور تلاوت کی گئی آیات کو دیکھنے سے اندھی ہو گئی تھی اسی طرح ان کی بصیرت کی آنکھ آخرت میں ذاتی اور عارضی ظلمتوں کے اجتماع کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کے دیدار اور اس کی تجلّی کے مشاہدہ سے اندھی ہوں گی۔ بیت

ہر کہ امروز نہ بیند اثر قدرتِ دوست
غالب آنست کہ فرداش نہ بیند دیدار

یعنی جسے آج دوست کی قدرت کا اثر نظر نہیں آیا' کل کو وہ محروم زیارت ہوگا۔

قیامت کے دن دیدارِ الٰہی کا ثبوت

اور جب قیامت کے دن کفار اور منکروں کی بدبختی کے مقام پر دیدارِ خداوندی سے محجوب و محروم رہنے کا ذکر فرمایا گیا ہے تو یہ اس امر کی صریح دلیل ہوئی کہ ایمان والے اس روز اپنے پروردگار کی زیارت سے محجوب نہیں ہوں گے اور اس کی لذت سے تروتازہ اور مسرور و محظوظ ہوں گے اور اگر ایمان والوں کو بھی یہ دولت نصیب نہ ہو تو کفار اور ان کے درمیان اس امر میں کوئی فرق نہ ہو اور اس بات کا کافروں کے بارے میں بیان کرنا نہایت

نامناسب اور آئین بلاغت سے دور ہے۔ اللہ تعالیٰ کی پناہ کہ کلامِ الٰہی کو کوئی اس طرح سمجھے۔

اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کہ جنہوں نے زیارت کی درخواست کی تھی، جواب میں لن ترانی ارشاد ہوا تو مقصد یہ تھا کہ آپ دنیا میں ان جسمانی آلات کے ساتھ زیارت کی قابلیت نہیں رکھتے نہ یہ کہ قیامت میں بھی نہیں دیکھیں گے اس لیے کہ کلام کا اگلا حصہ یعنی فَاِنِ اسۡتَقَرَّ مَکَانَهٗ فَسَوۡفَ تَرَانِیۡ زیارت کو استقرار یعنی قائم رہنے پر معلق کرتا ہے اور سورۂ فرقان میں جنت کے بارے میں وارد ہے کہ حَسُنَتۡ مُسۡتَقَرًّا وَّمُقَامًا اور شرط حاصل ہونے پر مشروط کا حصول واجب ہے۔

اور متواتر المعنی احادیث میں ثابت ہوا ہے کہ تمام ایمان والوں کو یہ دولت نصیب ہوگی لیکن اپنے اعمال کے اندازے کے مطابق اس نعمت میں بھی ان کے درجات مختلف ہوں گے۔ عام ایمان والوں کو جمعۃ المبارک کے دن جسے آخرت میں یوم المزید کہیں گے اس دولت سے نوازا جائے گا جبکہ خاصان بارگاہِ خداوندی کو ہر روز دو بار یعنی صبح کے وقت اور عصر کے وقت زیارت ہوگی اور اخص الخواص کو جو کہ جنت عدن کے رہائشی ہیں، اللہ تعالیٰ کا قرب اور تجلیات کا انکشاف دائمی ہوگا۔ چنانچہ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ ما بین القوم و بین ان ینظروا الی ربھم الا رداء الکبریاء علی وجھه فی جنة عدن یعنی جنت عدن میں بندگانِ خدا اور حسن ذات کے درمیان رداء کبریائی ہی ہوگی۔

اور وہ جو بزرگوں سے منقول ہے کہ اللہ تعالیٰ کا دیدار بے کیف اور آمنے سامنے ہونے کے بغیر ہوگا، ان احادیثِ صحیحہ کے منافی نہیں جن میں صورتوں کی زیارت بیان فرمائی گئی ہے اس لیے کہ موقف میں صورت کے ساتھ زیارت ہوگی اور جنت میں داخل ہونے کے بعد بلاصورت یا یہ کہ بعض اوقات کیفیت اور مشابہت کے ساتھ ہوگی اور بعض اوقات کیفیت اور آمنا سامنا ہوئے بغیر۔

کیفیت رؤیت کی تحقیق

اور تحقیق یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی زیارت کے وقت ماسوا اللہ نظر سے محو ہو جائے گا جبکہ ہم

دنیا میں کوئی چیز دیکھتے ہیں تو اس کے ہمراہ اور چیزیں بھی دیکھتے ہیں اس وجہ سے آمنے سامنے ہونا' جہت اور دوسری خصوصیتیں عقل میں ملحوظِ نظر ہوتی ہیں اور جب اللہ تعالیٰ کے ساتھ کوئی اور چیز قطعاً نظر میں نہ ہوگی تو سمت' آمنے سامنے ہونے اور دوسری خصوصیات کا لحاظ عقل کی نظر سے گر جائے گا بلکہ جب بھی ہم نظر میں آنے والی دنیوی چیزوں کو دیکھتے ہیں تو دیکھنے کا آلہ دیکھنے کے کام میں مصروف ہو جاتا ہے اور دوسرے آلات اور قوتیں اپنے کاموں میں مشغول رہتے ہیں اور عقل اپنے کام میں لگ جاتی ہے اس طرح صورت' شکل' رنگ' اعضاء کے متناسب ہونے' طویل ہونے' پست قد ہونے اور دوسری خصوصیات کی تشخیص ہوسکتی ہے اور جہاں تمام آلات اور اعضاء کے ساتھ کلی طور پر زیارت میں مصروف ہوں اور بہمہ وجوہ استغراق حاصل ہو' ان امور کی تشخیص بالکل ممکن نہ ہوگی جیسا کہ دنیا میں کبھی بعض محبوب چیزوں کو دیکھنے میں دوسرے حواس کی شرکت حاصل ہو تو اس حالت کا نمونہ ظاہر ہوتا ہے حالانکہ ابھی اس استغراق اور اس استغراق میں بہت زیادہ فرق اور تفاوت ہے۔

اور قیامت کے دن دل کے زنگ کی تاثیر کو بیان فرمایا گیا کہ سب سے عظیم لذت یعنی دولتِ دیدار سے محروم کر دے گا اس بات کا گمان ہوا کہ زنگ آلود دلوں والے اس محرومی اور بے نصیبی سے کوئی عبرت حاصل نہ کریں اور عذاب کی اس قسم کو آسان سمجھیں کیونکہ جسمانی لذتوں کے دلدادہ اور نفسانی لذتوں کی حرص کے گرفتار ہیں اس بناء پر فرمایا جا رہا ہے کہ ان مردودوں کے بارے اسی محرومی اور بے نصیبی پر ہی اکتفاء نہ ہوگا بلکہ

ثُمَّ إِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيمِ اس کے بعد تحقیق وہ جلانے والی آگ میں داخل ہوں گے اور ان کا اس آگ میں جلنا لذتِ دیدار سے محرومی کی وجہ سے دوہرا اثر کرے گا اس لیے کہ اگر دیدار کی لذت پاتے تو جہنم کی تکالیف کا عوض وہ لذت ہو جاتی اور وہ سختیاں آسان معلوم ہوتیں جبکہ ان کی سزا کو شدید کرنا مقصود ہے لہٰذا ان کے بارے میں جہنم میں داخل ہونے پر بھی اکتفاء نہ ہوگا بلکہ

ثُمَّ يُقَالُ هٰذَا الَّذِي كُنْتُمْ بِهٖ تُكَذِّبُوْنَ پھر کہا جائے گا کہ آج وہی دن ہے جس

کا تم انکار کرتے تھے اور اسے جھوٹ خیال کرتے تھے تا کہ عقلی اور حسی دونوں عذاب جمع ہو جائیں اور جس طرح کہ ان کا جسم جہنم کی آگ سے جلتا ہے ان کی جان بھی اس ملامت اور شرمندگی دِلانے سے کباب ہوتی ہے۔

اور جب فاجروں کے بُرے انجام کے بیان سے فراغت ہوئی اس بات کا گمان تھا کہ شاید آخرت کی جزا کے واقع ہونے کے لیے یہی کفار کا ایک دفتر کافی ہوگا اور بدکاروں اور نیکوں کے درمیان صرف اسی قدر امتیاز ہوگا کہ بدکاروں کے اعمال ان پر ظاہر کر کے ان سے مخلوق کے حقوق طلب کیے جائیں اور نیکوں کے بارے میں کوئی ذکر تک نہ ہو اور انہوں نے جو دنیا میں مخلوق اور خالق کے حقوق کو پورا کرنے کا شرف حاصل کیا وہ ظاہر ہی نہ ہو اس لیے کہ مستحق کو اس کا حق پہنچانے میں کوئی احسان نہیں ہوتا جس کے عوض کسی جزا کی توقع کریں اس کی جزا یہی کافی ہے کہ ملامت اور عتاب نیز دُکھ اور عذاب سے محفوظ رہیں اس قسم کے گمان فاسد کو سوال و جواب مقدر کے طریقے سے دُور کیا جا رہا ہے اور حقیقتِ حال کو بیان کیا جا رہا ہے۔

كَلَّا ایسا نہیں سمجھنا چاہیے کہ اس دن صرف بدکاروں کو جزا اور بدلہ دینے پر ہی کفایت ہوگی اور ان کے مخالفین یعنی نیکوکاروں کو بدکاروں کے جلانے کے لیے قسم قسم کی نعمتیں اور دائمی سرخروئی سے نوازا نہیں جائے گا بلکہ ان کے مخالفین کو ان کے سامنے انواع و اقسام کی عنایات سے نوازا جائے گا اور انہیں ان کی نظر میں انگوکہ بنایا جائے گا تا کہ اس تمسخر اور مذاق کا بدلہ ہو جو کہ وہ دنیا میں ان کے ساتھ کرتے تھے اس لیے کہ:

إِنَّ كِتَابَ الْأَبْرَارِ لَفِي عِلِّيِّينَ تحقیق نیکوکاروں کے اعمال نامے اور ان کے ناموں کا اندراج علیین کے دفتر میں ہے اور علیین جمع ہے علی کی جو کہ فعیل کے وزن پر علو سے مشتق کیا گیا ہے اور سجین کا ہم وزن ہے اور اس جمع کے صیغے کو نیکوں کی ارواح کے مقام کا نام قرار دیا گیا ہے تا کہ اس مقام کی وسعت اور کشادگی پر دلالت کرے لیکن اس کا اعراب جمع کی طرح ہے اس لیے کہ جمع کی صورت پر ہے اگرچہ اس کا معنی مفرد کا ہے۔

سجین کے مفرد اور علیین کے بصیغۂ جمع لانے میں نکتہ

اور سجین کو مفرد اور علیین کو جمع لانے میں یہی نکتہ ہے کہ جیسے سجین کے معنوں میں تنگی

اور ہجوم واقع ہے' اس کے لفظ میں بھی مفرد کو اختیار فرمایا گیا اس لیے کہ اس ایک مکان کثیر اجتماع کی وجہ نہایت تنگ ہو جاتا ہے جبکہ علیین کے معنوں میں فراخی اور وسعت واقع ہے اس کے لفظ میں بھی جمع کو اختیار کیا گیا۔ گویا اشارہ ہو رہا ہے کہ نیکوں کی ارواح میں سے ہر روح کی جائے قرار ایک بلند اور وسیع مکان ہے اور اس وجہ سے کہ مکان کی بلندی کو فراخی اور وسعت بھی لازم ہے' لغوی معنوں کے اعتبار سے بھی علیین کا سجین کے ساتھ مقابلہ صحیح ہوا اس لیے کہ دونوں میں تقابل بالعرض متحقق ہو گیا۔

مقام علیین کا بیان

اور مقامِ علیین ساتوں آسمانوں کے اوپر ہے اور اس کا نچلا حصہ سدرۃ المنتہٰی سے متصل ہے جبکہ اس کا اوپر کا حصہ عرش مجید کے دائیں پائے کے ساتھ ملا ہوا ہے اور قبض ہونے کے بعد نیکوں کی ارواح وہاں پہنچتی ہیں اور مقربین یعنی انبیاء علیہم السلام اور اولیائے اللہ وہاں ٹھہرتے ہیں اور عام نیک لوگوں کو نام لکھوانے اور اعمال نامے پہنچانے کے بعد مرتبوں کے مطابق آسمانِ دنیا میں یا آسمان و زمین کے درمیان یا زمزم شریف کے کنویں میں ٹھہراتے ہیں۔

ارواح کا قبروں سے رابطہ اور زائرین کے متعلق آگاہ ہونا

اور ان ارواح کو قبر کے ساتھ بھی ایک تعلق ہوتا ہے کہ قبر پر زائرین رشتے داروں اور دوسرے دوستوں کے حاضر ہونے پر مطلع ہوتی ہیں اور اُنس محسوس کرتی ہیں اس لیے کہ روح کے لیے مکان کا قریب یا دُور ہونا اس اطلاع میں رکاوٹ نہیں بنتا اور اس کی مثال انسانی وجود میں روحِ بصری ہے جو کہ ساتوں آسمانوں کے ستاروں کو کنویں کے اندر بھی دیکھ سکتی ہے اور جب وہ مقام بھی انسان معلوم نہیں کر سکتا مگر جبکہ دربارِ خداوندی سے اسے اطلاع دی جائے تو سوال و جواب کے طریقے سے علیین کی تفسیر میں ارشاد فرمایا جا رہا ہے:

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا عِلِّيُّوْنَ تجھے کیا معلوم کہ علیین کیا ہے۔ كِتٰبٌ مَّرْقُوْمٌ ایک مہر زدہ دفتر ہے اور اس پر علامت لگائی گئی ہے کہ اسے جو دیکھے جان لے کہ اس دفتر والے جنتی ہیں۔ حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ وہ دفتر سبز زمرد کی ایک تختی پر کندہ کر کے

عرش کے دائیں پایہ کے ساتھ لٹکایا ہوا ہے اور اس کا نچلا حصہ سدرۃ المنتہیٰ تک پہنچا ہوا ہے اور وہ دفتر خدا تعالیٰ کے خاص بندوں کے حوالے کیا گیا ہے جیسا کہ فرمایا جا رہا ہے:

یَشْهَدُهُ الْمُقَرَّبُوْنَ اس دفتر پر اللہ تعالیٰ کے مقرب فرشتے حاضر ہوتے ہیں اور گواہ بنتے ہیں جو کہ عرش کے حامل اور کرسی کے خازن ہیں۔

ور احتمال ہے کہ یوں مراد ہو کہ اس عالی شان مقام میں کامل قرب رکھنے والوں کی ارواح جو کہ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کبار ہیں' حاضر ہوتی ہیں اور ابرار کے حق میں یہی فخر کافی ہے کہ ان کا نام اس مقام میں لکھا جائے اور ان کے اچھے اعمال اس دفتر والوں کو قبول اور پسند ہوں۔

ابرار و مقربین اور اصحابِ یمین اور سابقین کا بیان

یہاں جاننا چاہیے کہ نجات اور فلاح پانے والوں کو قرآن پاک کی چند سورتوں میں دو طرح بیان فرمایا گیا ہے' کبھی ان دونوں قسموں کو ابرار اور مقربین کا نام دیا گیا اور کبھی انہیں اصحابِ یمین اور سابقین فرمایا گیا اور محققین کا ان دونوں قسموں کی تحقیق میں اختلاف ہے۔

بعض کہتے ہیں کہ سابقین اور مقربین محبتِ ذاتیہ والے ہیں جن کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت صرف اس کی ذات پاک کے لیے ہو۔ جبکہ ابرار اور اصحابِ یمین وہ لوگ ہیں جنہوں نے اللہ تعالیٰ سے انعام کی توقع کرتے ہوئے اس سے محبت کی ہے اور اس قول کے قریب ہی وہ بات ہے جو بعض نے کہی ہے کہ مقربین اور سابقین فَنَافِي اللّٰهِ اور بَقَا بِاللّٰهِ والے ہیں اور ابرار اور اصحابِ یمین وہ لوگ ہیں جو کہ نیکیوں اور اذکار کے انوار کے ساتھ منور ہوئے اور انہیں شرح صدر حاصل ہوئی اور ابھی انہیں فنا و بقاء کا مرتبہ حاصل نہیں ہوا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ہر نیک عمل کی نیت کی سچائی اور اخلاص' آداب' سنتوں اور شرائط کی رعایات اور اس عمل کے نتیجے کو اجر کے باطل ضائع اور اور ناقص ہونے سے حفاظت کے کمال کے اعتبار سے ایک نچلی حد ہے اور ایک اوپر کی حد ہے۔ پس جو شخص نیک عمل میں اوپر کی حد تک پہنچ گیا' وہ مقرب ہے اور جو اس سے کم رہے' وہ ابرار کا درجہ ہے اور اس تقریر سے ایک شخص میں بعض اعمال کے اعتبار سے ابرار اور مقربین کا اجتماع ہو سکتا ہے۔

اور جو کچھ ابرار' مقربین' اصحابِ یمین اور سابقین کے الفاظ سے اور کلامِ الٰہی کی روش سے جس میں ان دونوں گروہوں کے اوصاف بیان ہوئے' معلوم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ ابرار اور اصحابِ یمین ایک گروہ ہوں جنہوں نے مخلوق اور خالق کے حقوق کی ادائیگی' لوگوں کے ساتھ احسان کرنے اور نیک اور پسندیدہ اعمال میں کوشش کر کے اپنی قوتِ ملکیہ کو بہیمیہ اور سبعیہ قوت پر غالب کر دیا ہے اور مقربین اور سابقین وہ گروہ ہوں جن کے ان صفات اور اعمال کے ساتھ جذبِ الٰہی کے طریقے سے تمام اندرونی حجاب اُٹھ گئے اور شہودِ اتم نصیب ہوا اور ان کا سلوک جذب تک جا پہنچا اور انہیں اپنے محبوب کا قرب حقیقی نصیب ہوا۔ واللہ اعلم

بعض عارفین کے مطابق مقام سجین اور علیین کی حقیقت

اور جس طرح کہ بعض عرفاء نے مقامِ سجین و علیین کی تحقیق کی ہے' یہ ہے کہ معرفت کی وسعت اور تنگی کے اعتبار سے اور لطائف کو سنوارنے' انوارِ ملکیہ حاصل کرنے اور لطائف کے مکدر ہونے اور بہیمیہ اور سبعیہ ظلمتوں کے لاحق ہونے کے اعتبار سے نوعِ انسانی کے کمال کا میدان اتنا وسیع ہے کہ کسی نوع میں اتنی وسعت ظاہر نہیں ہے۔

پس انسانی کمال کی شکل ایک وسیع دائرے کی طرح خیال میں لانی چاہیے۔ جس کا مرکز انسانی درجات میں سب سے کم درجہ ہے اور ان کا سب سے اوپر کا مرتبہ عرشِ محیط کی وسعت کے برابر اور جب غیب کے عالم میں اس خیالی شکل نے حقیقی مثال حاصل کی تو اس دائرے کے محیط کا نام علیین ہوا اور سجین اس کے مرکز کا نام اور یہ بات طے شدہ ہے کہ مرکز کے قریبی دائرے ان دائروں کی نسبت زیادہ تنگ اور چھوٹے ہوتے ہیں جو کہ محیط کے قریب ہیں۔ فاجروں کی انسانیت کے درجات مرکز کے درجہ بدرجہ قریب ہیں اور تنگی اور چھوٹے ہونے میں ترقی پذیر جبکہ ابرار کی انسانیت کے درجات درجہ بدرجہ محیط کے قریب ہیں اور وسعت اور فراخی میں کہیں بڑھے ہوئے حتیٰ کہ اعلیٰ علیین تک نوبت جا پہنچے جو کہ مقربین اور سابقین کا مقام ہے اور مقربین کی پیروں میں ابرار کو بھی اس مقام میں روحانی عبور میسر آ جاتا ہے لیکن وہ مقام ان کی حاضری کا مقام نہیں ہے۔ یہ روحانی عبور جسم سے روح کے جدا ہونے کے بعد کچھ اثر کرے گا کہ ان کی ارواح کو وہاں لے جائیں گے اور اس

مقام والوں کے پیروکاروں میں سے لکھیں گے' اللہ تعالیٰ جنہیں کسی نیک بخت کے تابع کر دے تو وہ بھی نیک بخت ہیں اور جب ابرار کی ارواح کا حال بیان کرنے سے کہ قبض کرنے کے بعد کیا ہوگا' فراغت ہوئی اب قیامت کے دن ان کے انجام کو بیان فرمایا جارہا ہے۔

اِنَّ الْاَبْرَارَ لَفِیْ نَعِیْمٍ تحقیق نیکوکار نعمتوں میں ہوں گے اور نعیم کا لفظ ان سب لذتوں کو شامل ہے جن کا جنت میں وعدہ کیا گیا ہے جیسے حور و قصور' کھانا پینا' لباس' سواری' خوش وضع خدام' اچھی رہائش گاہیں اور وہ سب کچھ جو وہاں مہیا ہے اور ان نعمتوں کے علاوہ یہ ہے کہ انہیں بادشاہوں کی طرح مروارید اور یاقوت جڑے ہوئے زریں تختوں پر بٹھایا جائے گا اور ان تختوں پر مروارید کے گنبد کھڑے کیے جائیں گے جن کے اندر سے وہ سب چیزوں کو دیکھیں اور انہیں کوئی نہ دیکھے جیسا کہ فرمایا جارہا ہے:

عَلَی الْاَرَآئِکِ یَنْظُرُوْنَ نیک لوگ سایہ دار تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہوں گے اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ مومن کو جنت میں وہاں کی تمام نعمتوں سے بہرہ ور کیا جائے گا۔ بخلاف دنیا کے کہ اللہ تعالیٰ یہاں لوگوں کو نعمتیں عطا فرماتا ہے جبکہ ان نعمتوں سے بہرہ ور ہونا نصیب نہیں ہوتا جیسے بیمار بادشاہ یا جس کی مردمی قوت کمزور ہو کہ نفیس کھانوں کی لذت یا دوشیزہ منکوحہ سے مقاربت کی لذت نہیں لے سکتا۔ نیز صحیح حدیث پاک میں وارد ہے کہ اہلِ جنت میں سب سے کم درجے والا وہ ہوگا جس کے سامنے پوری دنیا کی وسعت کے برابر اس کی مملوکہ نعمتیں پیش کی جائیں گی۔

اور یَنْظُرُوْنَ کا مفعول تعمیم کے ارادے سے حذف فرمایا گیا ہے تاکہ اپنی مملوکہ نعمتوں حور و قصور' نہروں اور درختوں کو' دوسرے جنتیوں کی نعمتوں کو اور دوزخیوں کے عذاب اور سزا کو دیکھنے کو شامل ہو۔ مقصد یہ ہے کہ ان کے سایہ دار تخت انہیں جنت اور جہنم کی کائنات کا تماشا کرنے سے رکاوٹ اور مانع نہیں ہوں گے۔ بخلاف دنیوی تختوں کے کہ ان میں بیٹھنا نظر اور تماشا کے لیے رکاوٹ بنتا ہے۔

لغت میں اریکہ اس تخت کو کہتے ہیں جس کے اوپر گنبد کی طرح ایک سائبان بنایا گیا ہو اور اسے منقش پردوں اور پُرتکلف ابریشم زریں سے سجایا گیا ہو۔ ہندی زبان میں اسے

چھپر کھٹ سے تعبیر کرتے ہیں اور عارفین فرماتے ہیں کہ جنتی تخت جو کہ نیکوں کو نصیب ہوں گے اور قرآن مجید میں جگہ جگہ پوری تعریف کے ساتھ ان کا ذکر ہوتا ہے اسمائے الٰہیہ سے نیکوں کے مقامات کے نمونے ہیں کیونکہ نیکوں کا ان مقامات میں ہونا دنیا میں لوگوں کی آنکھ اور عقل سے پوشیدہ تھا اور وہ اس مقام میں متمکن ہو کر وجود کے تمام مرتبے وہاں سے سر کرتے ہیں۔

تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ اے دیکھنے والے! تو ان کے چہروں میں نعمت کی تر و تازگی دیکھتا ہے۔ حاصل یہ کہ جہنمیوں کا حال دیکھنے کی وجہ سے انہیں کوئی ملال' غبار خاطر اور چہرے کے رنگ کی تبدیلی رونما نہیں ہوگی۔ اس لیے کہ اپنے دشمنوں کو اپنے سامنے سزا دینا بھی فرحت اور مسرت بڑھانے کا موجب ہے اسی لیے ان کے چہروں میں تازگی اور خوشی کے آثار ہمیشہ دیکھے اور محسوس کیے جائیں گے۔

يُسْقَوْنَ مِنْ رَّحِيْقٍ انہیں خالص شراب پلائی جائے گی جو کہ اس محبتِ الٰہی کا نمونہ ہے جسے انہوں نے دنیا میں اپنے باطن میں جگہ دی تھی اور وہ شراب کی طرح ان کے قویٰ اور ارواح میں سرایت کیے ہوئے تھی اور وہ محبت خالص محبت تھی جس میں گناہوں اور خواہشات کی محبت کی چاشنی قطعاً نہ تھی۔

اور چونکہ زیادہ تیز جنتی شراب اسی طرح نہروں اور چشموں میں جاری ہوگی جیسا کہ دوسری سورتوں میں اس کا ذکر ہے اس عام شراب سے احتراز کے لیے جو کہ جنت کے عام لوگوں کی دسترس میں ہوگی' ایک اور قید بڑھا کر فرمایا جا رہا ہے:

مَّخْتُوْمٍ یعنی وہ شراب خالص مہر کے نیچے رکھی گئی ہے اور عام شراب سے علیحدہ اور جدا ہے اور اس شراب خالص کے جو کہ محبتِ الٰہی کا نمونہ ہے' مہر زدہ ہونے کا راز یہ ہے کہ وہ محبت کمال غلو اور جوش کے باوجود کہ مرتبۂ عشق سے بھی کئی منزلیں دور نکل گئی تھی' شریعت کی مہر کی پابند تھی اور احکامِ الٰہیہ کی مہر کے نیچے محفوظ تھی اس میں وہمی' حرام محبتوں' ناجائز نفسانی خواہشات اور شیطانی نجاستوں کی آمیزش قطعاً نہ تھی۔

اور اس مہر زدہ شراب کی عجیب کیفیتوں میں سے یہ ہے کہ شراب دنیا کے شیشوں کو بھی

جبکہ ان کی احتیاط پیش نظر ہو' مہر لگاتے ہیں لیکن جس چیز پر مہر لگاتے ہیں' مٹی' موم یا اس قسم کی کوئی چیز ہوتی ہے جبکہ جنت میں نیکوں کی مہر زدہ شراب کی صفت یہ ہے کہ:

خِتٰمُهٗ مِسْكٌ جس چیز پر مہر لگائی گئی ہے' کستوری ہے تاکہ اس شراب سے اُٹھنے والی کستوری کی اچھی مہک نیکوں کے مشام کو فرحت بخشنے والی ہو اور وہ کستوری جس پر مہر لگائی جائے گی' ان جائز چیزوں کے متعلق شریعت کے حکم کا نمونہ ہے جو کہ دنیا میں نیکوں کے دِلوں کو تقویت دینے والا' شرح صدر کا باعث اور ان کے ذوق و شوق کے جوش کا مددگار تھا۔

وَفِیْ ذٰلِكَ فَلْیَتَنَافَسِ الْمُتَنَافِسُوْنَ اور اس طرح کی خالص شراب میں جو کہ اس قسم کی نفیس چیز کا نمونہ اور مثال ہے' چاہیے کہ رغبت کرنے والے رغبت کریں نہ کہ مٹھی بھر جو اور گندم میں جسے وہ لوگوں کے حق سے پیمائش اور وزن میں کمی کر کے حاصل کریں کہ اسے اس کے ساتھ کوئی نسبت نہیں ہے۔

اور بعض مفسرین نے ختام کو ختم اور انتہاء کے معنوں میں لیا ہے اور ابودرداء رضی اللہ عنہ سے مرفوعاً ثابت ہونے والی حدیث شریف اس کے مطابق وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جنتیوں کی آخری شراب مشک یعنی کستوری ہے اور مشک چاندی کی طرح سفید ایک شراب کا نام ہے کہ اگر دنیا والوں میں سے کوئی شخص اپنا ہاتھ اس میں ڈال کر نکالے تو دنیا میں کوئی ذی روح ایسا نہ رہے جو کہ اس کی اچھی مہک سے مست نہ ہو۔

ظاہری طور پر اس خالص شراب کو جو کہ اہلِ جنت کا آخری پیالہ ہوگا اس وجہ سے مشک کا نام دیا گیا ہے کہ مشک گرم دواؤں میں سے ہے جو کہ شراب اور غذا کو ہضم کرنے میں مدد کرتا ہے' منہ کی بو کو اچھا کرتا ہے اور دوبارہ اشتہاء جلد پیدا کرتا ہے اور وہ شراب بھی جس پر شراب کی مجلس ختم ہوگی' یہی کام کرے گی۔ اور جب بعض اوقات اہلِ طرب و سرور کو اس قسم کی شراب بھی منظور ہوتی ہے' بنابراں فرمایا جا رہا ہے کہ اس شراب خالص کو جب بھی چاہیں کہ کسی دوسری چیز کے ساتھ ملا کر پئیں تو یہ بھی ان کے لیے ممکن ہوگا۔

وَمِزَاجُهٗ مِنْ تَسْنِیْمٍ اور اس شراب میں تسنیم کی آمیزش ہوگی اور لغت میں تسنیم اس چیز کو کہتے ہیں جو خوشبو اور ذائقہ اچھا کرنے کے لیے شربت کے اوپر ڈالتے ہیں جیسے گلاب

اور بید مشک وغیرہ۔ سنام سے لیا گیا ہے جو کہ اونٹ کی کوہان کے معنوں میں ہے اس لیے کہ ان چیزوں کو شراب کے برتن میں ڈالنے سے بلبلے اُٹھتے ہیں جو کہ اونٹ کی کوہان کی طرح نمودار ہوتے ہیں یہاں تسنیم سے مراد جنت کا ایک چشمہ ہے جو کہ جنس شراب میں سب سے زیادہ نفیس اور لذیذ ہے اور مقربین و سابقین کو اس خالص چشمے سے پلائیں گے جبکہ ابرار اور اصحابِ یمین کو گلاب اور بید مشک کی طرح ملا کردیں گے۔

اور بعض روایات میں مروی ہے کہ دوسرے چشموں کے برخلاف تسنیم ہوا میں جاری ہوگا' جنت کی زمین پر نہیں اور اس میں راز یہ ہے کہ وہ چشمہ ذاتِ الٰہی کی محبت کا نمونہ ہے کہ جس نے محل وصورت کے تعین کے بغیر بلکہ حال اور صفت کی تشخیص کے بغیر مقربین کی ارواح کو فریفتہ کیا ہے۔ کہتے ہیں کہ وہ چشمہ عرش کے نیچے سے اُبلتا ہے اور مقربین کی رہائش گاہوں کی فضاؤں پر سے گزرتا ہے۔ چنانچہ ان کے حال کے بارے میں ارشاد ہوتا ہے کہ:

عَيْنًا يَّشْرَبُ بِهَا الْمُقَرَّبُوْنَ تسنیم سے مراد ایک چشمہ ہے جس سے مقربین پیتے ہیں۔ حاصل یہ کہ اس چشمے کی شراب صرف مقربین پیتے ہیں جبکہ ابرار کو دوسری شراب کے ساتھ ملا کر دیتے ہیں اس لیے کہ مقربین ماسوی اللہ میں مشغول نہیں ہوئے ہیں اور انہوں نے محبت حق کو محبت غیر میں نہیں ملایا ہے۔ بخلاف ابرار کے کہ ان کی محبت افعال اور صفات کے آثار کے ساتھ ملی ہوئی تھی۔

اور چونکہ ابرار کے نعمتوں سے مستفید ہونے کے ضمن میں ان کی شراب نوشی کا ذکر ہوا تو اس کے نکتے کو بھی بیان فرمایا جا رہا ہے اور اس نکتے کی تفصیل یہ ہے کہ اس دن بندگانِ خاص کو تمسخر اور مذاق کرنے کی وجہ سے کفار کو سزا دینا ذاتِ حق کو منظور ہوگا جبکہ اللہ تعالیٰ کے خاص بندے کمال تمکین اور وقار کی وجہ سے یہ انتقام لینے میں توقف کریں گے۔ ناچار انہیں ایسی شراب سے بھرپور جام پلا کر چستی عطا کی جائے گی تاکہ اس جوش کی وجہ سے ان کی تمکین و وقار میں کچھ مستی واقع ہو اور تمسخر و مذاق کا انتقام لیں۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے:

اِنَّ الَّذِيْنَ اَجْرَمُوْا تحقیق وہ لوگ جو کہ دنیا میں آیاتِ الٰہی کا انکار اور پیمائش اور وزن میں مخلوق کے حقوق میں کمی کرنے جیسے گناہ کرتے تھے۔ كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا

يَضْحَكُوْنَ ان لوگوں سے ہنسی اور مذاق کرتے تھے جو کہ ایمان لائے ہیں اور کہتے کہ ان لوگوں کو کس فاسد خیال نے جکڑ لیا ہے کہ حسی لذتوں کو ایک موہوم اور خیالی امر کی توقع کی بناء پر چھوڑے ہوئے ہیں اور اس ہنسی پر ہی اکتفاء نہیں کرتے بلکہ

وَاِذَا مَرُّوْا بِهِمْ يَتَغَامَزُوْنَ اور جب وہ ایمان والوں کے پاس سے گزرتے تو آنکھ ابرو اور لب سے اشارہ کرتے کہ یہ وہی بے عقل اور سادہ لوح لوگ ہیں جنھوں نے خود کو موہوم جنت کے گمان پر نقد لذتوں سے محروم کر رکھا ہے۔

وَاِذَا انْقَلَبُوْٓا اِلٰٓى اَهْلِهِمُ اور جب یہ کفار اپنے گھر والوں کی طرف مڑتے اور وہاں خوب صورت عورتوں' پسندیدہ بیٹوں' پیاری بیٹیوں' نفیس بستروں' پُر تکلف برتنوں' لذیز کھانوں اور ٹھنڈے اور خوش ذائقہ مشروبات جیسی دنیوی لذیز چیزوں کا اجتماع دیکھتے اور سمجھتے کہ یہ سب چیزیں ہمیں اسی عقیدے کی بناء پر حاصل ہیں کہ ہم روزِ جزا کے معتقد اور اس دن سے خائف اور ڈرنے والے نہیں ہیں جبکہ نیک کام کرنے والے مسلمان ان لذتوں سے اسی وجہ سے محروم ہیں کہ وہ موہوم جنت کی نعمتوں کی توقع اور خیالی جہنم کے عذاب کے خوف کی وجہ سے ان نقد لذتوں کو ہاتھ نہیں لگاتے اس پاگل کی طرح جو کہ خیالِ فاسد کی وجہ سے نفع بخش لذیز غذاؤں سے ڈرتا اور پرہیز کرتا ہے۔

اِنْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ تو لطیفے کہتے اور خوش طبعی کرتے ہوئے لوٹتے۔

وَاِذَا رَاَوْهُمْ اور جب وہ مسلمانوں کو دیکھتے کہ اپنے آپ کو طاعت اور عبادت کی مشقت میں پگھلاتے ہیں' موٹا لباس پہنتے ہیں' خشک اور بے مزہ کھانا کھاتے ہیں اور گرم دنوں میں روزے رکھتے ہیں۔

قَالُوْٓا اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ لَضَآلُّوْنَ تو کہتے کہ تحقیق یہ لوگ راستہ گم کیے ہوئے ہیں کہ انہوں نے موہوم لذتوں کو حاضر لذتوں پر ترجیح دے کر بے فائدہ مشقتوں کو حقیقی کمالات کا نام دے رکھا ہے۔

وَمَآ اُرْسِلُوْا عَلَيْهِمْ حٰفِظِيْنَ حالانکہ یہ کفار مسلمانوں پر نگہبان بنا کر نہیں بھیجے گئے ہیں تا کہ انہیں جادۂ حق سے پھسلنے نہ دیں اور ہر محفل میں اور مجمع میں ان کا تعاقب کریں اور

طعن و تشنیع کریں اور اس کام میں اس حد تک اہتمام کریں کہ پہلے ہنسی کے ساتھ اس کے بعد آنکھ اور ابرو کے اشارے سے اور اس کے بعد ان کے بارے میں غائبانہ لطیفہ بازی کریں اس کے بعد انہیں آمنے سامنے ہو کر گمراہ کریں۔

اور ان چار حالتوں کو اس ترتیب کے ساتھ شمار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ جب کوئی شخص کسی شخص کی حرکت سے نفرت کرتا ہے تو پہلے حقیر جانتے ہوئے ہنسی کرتا ہے اور جب نفرت اور بڑھے تو اپنے ہم مشربوں کو بھی اس حرکت پر آنکھ اور ابرو کے اشارے سے اطلاع دیتا ہے تاکہ وہ اس حرکت والے کو حقیر و ذلیل کرنے میں شریک ہوں اور جب نفرت اونچے درجے تک جا پہنچے تو غائبانہ طور پر بھی اس حرکت والے کے بارے میں لطیفے کہتا ہے اور خوش طبعیاں کرتا ہے تاکہ حقیر اور رسوا کرنے کا حق پورا کر دے اور جب بات نفرت کی حد سے اونچی نکل گئی تو روبرو بے وقوف اور جاہل کہنا اور گمراہی کی طرف منسوب کرنا شروع کر دیتا ہے اس لیے ان آیات میں اسی ترتیب کی رعایت کی گئی ہے۔

اور مسلمانوں پر کفار کے اس ظلم کو بیان کرنے کے بعد ارشاد ہوتا ہے کہ ان کا یہ ظلم بھی رائیگاں نہیں جائے گا بلکہ جزا کے دن اس قسم کے ظلم کا بدلہ بھی لیا جائے گا۔

فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا تو آج کے دن جو کہ جزا کا دن ہے جو ایمان لائے اور انہوں نے ایمانی قوت کی وجہ سے حقیقی کمالات کو نفسانی لذتوں پر ترجیح دے کر اختیار کیا۔ مِنَ الْكُفَّارِ کافروں سے جو کہ کمالات کے منکر تھے اور کمال کو حسی فانی لذتوں کو پورے طور پر حاصل کرنے میں منحصر کرتے تھے۔

يَضْحَكُوْنَ ہنسی کرتے ہیں کہ یہ لوگ کس قدر ناعاقبت اندیش اور بے وقوف تھے کہ انہوں نے کس ردی فانی چیز کو کس نفیس باقی چیز پر ترجیح دی ہے اور جہنم میں کس قسم کے عذاب اور زنجیروں اور طوقوں میں کس طرح جکڑے ہوئے ہیں۔

اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ کفار کے سامنے جہنم کے اندر جنت کی طرف دروازہ کھولا جائے گا اور جہنم کے دربان کہیں گے کہ ہاں جنت میں جلدی آؤ۔ وہ گرتے اٹھتے زنجیروں اور طوقوں میں جکڑے ہوئے اس دروازے کی طرف چلیں گے جب قریب پہنچیں

گے تو دربان وہ دروازہ بند کر دیں گے اور دوسری طرف ایک اور دروازہ کھول دیں گے اور کہیں گے کہ اس دروازے میں سے چلے جاؤ اس دروازے کا قصد کریں گے اور آتشیں پہاڑوں پر سے نہایت زبوں حالی سے گرتے اُٹھتے گزریں گے اور جب اس دروازے کے قریب پہنچیں گے تو اسے بھی بند کر دیا جائے گا۔ علیٰ ہذا القیاس انہیں دوزخ میں اس حیلے کے ساتھ سرگرداں کیا جائے گا' ایمان والے جنت میں اسی حالت کا مشاہدہ کریں گے اور اس پر ہنسیں گے لیکن مذاق کے اس قدر سبب کے باوجود انہیں تمکین اور وقار مانع ہوگا اور وہ ہنسنے کی حد سے آگے نہیں گزریں گے اور کافروں کا دستور کہ دنیا میں آنکھ اور ابرو کے اشارے کرتے تھے اور غائبانہ لطیفے کہتے تھے اور سامنے گمراہ کہتے تھے' ان سے ظاہر نہیں ہوگا بلکہ اس حالت کے مشاہدے کے باوجود جو کہ حرکت کرنے کا بہت موجب ہوتی ہے اور لوگ اس قسم کے تماشے دیکھنے کے لیے دوڑتے ہیں اور دُور دُور تک جاتے ہیں' وہ اپنے مکانات سے جنبش نہیں کریں گے بلکہ

عَلَى الْاَرَآئِكِ يَنْظُرُوْنَ وہ اپنے سایہ دار تختوں پر بیٹھے دیکھتے ہیں اور پورے تمکین و وقار کے ساتھ ایک دوسرے سے پوچھتے ہیں کہ:

هَلْ ثُوِّبَ الْكُفَّارُ مَا كَانُوْا يَفْعَلُوْنَ کیا ان کفار نے اپنے کیے کے مطابق سزا پائی جو کہ وہ دنیا میں ہنسی' اشارے' لطیفہ گوئی اور گمراہ کہنے کا عمل کرتے تھے۔

سورۂ انشقت

سورۃ انشقت مکی ہے' اس کی پچیس (۲۵) آیات' ایک سو نو (۱۰۹) کلمات اور چار سو تیس (۴۳۰) حروف ہیں۔

سورۃ مطففین کے ساتھ ربط کی وجہ

اور اس سورۃ کا سورۂ مطففین کے ساتھ رابطہ شروع سے لے کر آخر تک بالکل ظاہر ہے اور دونوں سورتوں کے معانی اور مضامین ایک دوسرے سے متحد اور ملتے جلتے ہیں۔ اس سورۃ میں وَيْلٌ لِّلْمُطَفِّفِيْنَ اور وَيْلٌ يَّوْمَئِذٍ لِّلْمُكَذِّبِيْنَ واقع ہے جبکہ اس سورۃ میں

یدعو ثبورا ہے وہاں الا یظن اولئك انهم مبعوثون ہے جبکہ یہاں انه ظن ان لن یحور ہے وہاں يَوْمَ يَقُوْمُ النَّاسُ لِرَبِّ الْعَالَمِيْنَ ہے جبکہ یہاں فملاقیه ہے وہاں نیکوں اور بروں کے اعمال ناموں کا ذکر ہے کہ ان کی موت کے بعد وہ علیین اور سجین کے دفتر میں داخل ہوں گے جبکہ یہاں نیکوں اور بروں کے اعمال ناموں کا ذکر ہے کہ حشر کے بعد سیدھے اور الٹے ہاتھوں میں دیئے جائیں گے وہاں قرآن پاک کی تکذیب جو کہ کفار کرتے تھے اس عبارت کے ساتھ مذکور ہے۔ وَاِذَا تُتْلٰى عَلَيْهِ اٰيَاتُنَا قَالَ اَسَاطِيْرُ الْاَوَّلِيْنَ جبکہ یہاں اس عبارت کے ساتھ ہے کہ اِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْآنُ لَا يَسْجُدُوْنَ وہاں اِنَّهُمْ لَصَالُوا الْجَحِيْمِ واقع ہوا جبکہ یہاں يَصْلٰى سَعِيْرًا ہے وہاں اہل نجات کے بارے میں تَعْرِفُ فِيْ وُجُوْهِهِمْ نَضْرَةَ النَّعِيْمِ واقع ہے۔ نیز فَالْيَوْمَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا مِنَ الْكُفَّارِ يَضْحَكُوْنَ ہے جبکہ یہاں وَيَنْقَلِبُ اِلٰى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ہے وہاں مسلمانوں کی نسبت کفار کے بارے میں مذکور ہے کہ كَانُوْا مِنَ الَّذِيْنَ آمَنُوْا يَضْحَكُوْنَ وَاِذَا انْقَلَبُوْا اِلٰى اَهْلِهِمُ انْقَلَبُوْا فَكِهِيْنَ جبکہ یہاں اِنَّهٗ كَانَ فِيْ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا ہے۔ علٰی ہذا القیاس غور وفکر کے بعد پوری مناسبت ظاہر ہوتی ہے۔

وجہ تسمیہ

اور اس سورۃ کو سورۂ انشقت اور انشقاق کا نام اس وجہ سے دیا گیا ہے کہ اس کے آغاز میں قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کے حکم سے آسمان پھاڑے جانے کا ذکر ہے اور یہ واقعہ آدمی پر ایک عظیم حجت ہے اس لیے کہ جب آسمان اپنی بزرگی اور بلندی کے باوجود اپنے پروردگار کے حکم سے کسی ثواب کی توقع اور کسی عذاب کے خوف کے بغیر یہ مشکل کام بجالایا تو آدمی جو کہ نہایت ذلت اور پستی میں واقع ہے اللہ تعالیٰ کے آسان امر کو جو کہ اتنا سخت اور دشوار نہیں ہے ثواب کی توقع اور عذاب کے خوف کے باوجود کیوں قبول نہ کرے اور بجانہ لائے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِذَا السَّمَآءُ انْشَقَّتْ جب آسمان پھٹ جائے اور حضرت امیر المومنین مرتضٰی کرم اللہ وجہہ سے مروی ہے کہ آسمان کہکشاں کے مقام سے پھٹے گا اور اس روز اس کے پھٹنے کی وجہ

یہ ہے کہ آسمان کے دروازوں پر متعین فرشتے جو کہ بندوں کا رزق نیچے لانے اور ان کے اعمال کو اوپر لے جانے پر مقرر ہیں' اپنے کام سے فارغ ہو کر نازل ہوں گے اور دوسرے فرشتے بھی جو کہ آسمانوں میں سکونت پذیر ہیں' محشر کے اردگرد صفیں باندھے کھڑے ہوں اور اللہ تعالیٰ کی تجلی قہری عرش پر غلبہ کر کے اُسے نیچے کی سمت میں حرکت دے اور اس تجلی کے صدمے اور عرش کے عظیم حجم کی وجہ سے آسمان کے اجزا پاش پاش ہو جائیں۔ نیز اس وقت اس جہان کی بربادی اور ایک دوسرے جہان کی آبادی منظور ہے اور نیا مکان پرانے مکان کی توڑ پھوڑ کے بغیر تعمیر نہیں ہو سکتا۔

یہاں جاننا چاہیے کہ آدمی روح اور جسم دو چیزوں سے مرکب ہے اس کی روحانیت کا منشا آسمان ہے اس لیے کہ اس کا نفس ناطقہ نفوس ساوی سے لیا گیا ہے اور ان سے پوری مشابہت رکھتا ہے جبکہ روح ہوائی جو کہ نفس کا مرکب ہے اور گوشت والے جسم میں جاری و ساری ہے' کا جوہر بھی آسمان کے جواہر کے ساتھ پوری مشابہت رکھتا ہے کہ خرق والسیام اور توڑ پھوڑ کے قابل نہیں اور اگرچہ اسے بیماریوں کی وجہ سے بڑے صدمے اُٹھانے پڑتے ہیں لیکن اس میں مکمل خلل واقع نہیں ہوتا' اس کی فنا کی حد یہ ہے کہ بدن سے جدا ہو جائے۔ ازاں بعد بھی ارواح کے موکلوں کے ہاتھوں میں محفوظ و مصون ہے۔

اور روح کی سعادت اور شقاوت جسے عرف میں بخت کہتے ہیں اور طالع کی طرف منسوب کرتے ہیں' کا سبب بھی آسمان اور اس کے ستاروں کی حرکات کے اطوار سے لیا گیا ہے اور روح کی غذا اور اس کی بیماریوں کی دوا جو کہ شریعت اور طریقت ہے' بھی آسمان سے نازل ہونے والی ہے۔ پس آسمان کا پھٹنا اس بات کی قوی دلیل اور واضح برہان ہے کہ آدمی کی روحانیت کے لیے بھی اپنے پروردگار کے حکم کی اطاعت کے بغیر چارہ نہیں کیونکہ اس کا معدن اور خزانہ جو کہ آسمان ہے اس عظمت اور بلندی کے باوجود اللہ تعالیٰ کے حکم کے تابع ہے اور اس دن آسمان کا پھٹنا اپنی بنیادوں کی صنعت کی بناء پر نہیں ہوگا جیسا کہ دنیوی عمارات کا ٹوٹنا اور اس جہان کی مصنوعات کا پھوٹنا ہوتا ہے بلکہ اسے اس کی کمال قوت' مضبوطی اور عظمت کے باوجود پھٹنے کے لیے حکم خداوندی پہنچا۔

وَاَذِنَتۡ لِرَبِّهَا اور آسمان نے کان رکھا اور اپنے پروردگار کے حکم کے لیے جھک گیا اور اس حکم کو اگرچہ بہت دشوار تھا' قبول کرنے سے سر نہیں پھیرا اور یہ فرماں برداری جو اس سے صادر ہوئی ایسی نہیں کہ اس کی عظمت اور بلندی کے منافی ہو بلکہ یہ عاجزی اس کی عظمت کے لائق تھی۔

وَحُقَّتۡ اور وہ آسمان اسی اطاعت اور فرماں برداری کے لائق تھا۔ وَاِذَا الۡاَرۡضُ مُدَّتۡ اور جبکہ زمین کھینچی جائے تاکہ دراز اور وسیع ہو جائے اور اتنے بڑے مجمع کے لیے جہاں اس وقت کہ ساتوں آسمانوں کے فرشتے' حاملینِ عرش اور جنوں۔ انسانوں اور جانوروں پر مبنی قسم قسم کی مخلوق اور اگلے پچھلے سب جمع ہوں گے اور زمین پر کھڑے ہوں گے' گنجائش ہو سکے۔ نیز زمین کو اس وجہ سے بھی کھینچا جائے گا کہ اس کی بلندی اور پستی برابر ہو جائے اور عمارتیں اور پہاڑ سب برابر ہو جائیں تاکہ مخلوق کے کھڑے ہونے میں کوئی نشیب و فراز نہ ہو اور کوئی شے حائل نہ رہے اور ایک کی حالت دوسرے پر ظاہر ہو جیسا کہ چٹائی اور بستر میں اس کا پتہ چلتا ہے کہ اسے کھینچنے سے یہ دونوں فائدے ایک ساتھ حاصل ہوتے ہیں' وسعت بھی اور ہمواری بھی۔

اور جب زمین جسم انسانی کا منشا ہے اور اس کا غالب جزو ہے اور اسے غذا اور دوسرے نفع بھی زمین سے حاصل ہوتے ہیں۔ پس اس کا حکم خداوندی کی تعمیل کرنا اس بات کی قوی دلیل ہے کہ آدمی اپنے تمام اعضاء' آلاتِ جسمانی کے ساتھ حکمِ الٰہی کا مطیع اور فرماں بردار ہوگا۔

وَاَلۡقَتۡ مَا فِيۡهَا اور وہ اسے کھینچنے کی وجہ سے سب کچھ ڈال دے جو کچھ اس میں مرنے والوں کے اجزا' خزانوں' دفینوں اور کانوں میں سے ہے تاکہ لوگوں کا اپنے تمام اجزا سمیت حشر متحقق ہو اور زمین کی منفعتیں جس پر کہ انہوں نے لڑائی فساد کیے ہیں اور ایک دوسرے کے حقوق ضائع کیے ہیں' کمال بے قدری کے ساتھ ان کے سامنے ظاہر ہو جائیں۔

وَتَخَلَّتۡ اور تکلفاً خالی ہو جائے' ان تمام چیزوں سے جو کہ لوگوں کے آثار میں

سے اس سے متعلق ہیں تا کہ اس پر جزا دینا متحقق ہو اور زمین کو اس کھینچنے اور خالی کرنے میں کوئی بدلہ یا کسی کو کوئی نقصان یا نفع پہنچانا مقصود نہیں بلکہ اس کے پاس اس کام کے لیے حکمِ خداوندی پہنچا۔

وَاَذِنَتْ لِرَبِّهَا وَحُقَّتْ اور زمین نے اپنے پروردگار کے حکم پر کان رکھا اور وہ مطیع ہوئی اور وہ اس اطاعت کے لائق تھی۔ یہاں جاننا چاہیے کہ اکثر عوام گمان کرتے ہیں کہ یہ آیت مکرر ہے حالانکہ ایسا نہیں ہے۔ پہلی آیت آسمان کے حق میں اور دوسری زمین کے بارے میں ہے۔ پس تکرار اصلاً نہیں ہے۔

اور شرط کی جزا محذوف ہے یعنی جب آسمان یوں ہو جائے اور زمین یوں کرے تو اے انسان! تجھ پر صریح الزام لاحق ہو اور تجھ پر حجت قائم ہو کہ تو نے اپنے پروردگار کے فرمان کو روح اور جسم کے ساتھ کیوں قبول نہ کیا اور اس کے اوامر و نواہی کی مخالفت میں اپنی عمر گزار دی جیسا کہ الزام حجت کو بیان کرنے کے لیے واشگاف لفظوں میں فرمایا جا رہا ہے۔

یٰۤاَیُّهَا الْاِنْسَانُ اے انسان! تو آسمان سے بڑا اور اس سے اونچا نہیں ہے اور نہ ہی زمین سے زیادہ سخت ہے تا کہ تو اپنے پروردگار کا فرمان قبول نہ کرے اور اس کے حکم کی اطاعت نہ کرے حالانکہ تیرے بارے میں حکمِ الٰہی بہت آسان اور نرم ہے جبکہ ان کے بارے میں نہایت دشوار اور بھاری۔ انہوں نے گرانی اور سختی کے باوجود اطاعت کی اور سرکشی نہ کی اور اس کے ساتھ ساتھ آسمان اور زمین کو جو حکم ہوگا اس کے پیچھے کوئی ثواب اور عذاب نہیں جبکہ جو حکم تیرے بارے میں آیا ہے اس کے پیچھے ثواب اور عذاب ہے بلکہ تجھے ثواب اور عذاب سے بالاتر ایک ایسی منفعت کی توقع ہے جس کی آسمان اور زمین کو قطعاً توقع نہیں اس لیے کہ۔

اِنَّكَ كَادِحٌ اِلٰى رَبِّكَ تحقیق تو کوشش کرنے والا ہے کہ اپنے پروردگار کا وصال حاصل کرے۔ كَدْحًا پوری مشقت کے ساتھ اس لیے کہ تجھے وصال کی استعداد دی گئی ہے اور اس کا خیال تیرے سر میں رکھا گیا ہے۔ بخلاف آسمان اور زمین کے کہ نہ ان میں وصالِ خداوندی کی استعداد ہے نہ اسے حاصل کرنے کا خیال اور یہ وعدہ شدہ وصال اور بے

پردہ مشاہدہ جسے تو حاصل کرنے کی فکر میں ہے' صرف ایک خیال نہیں کہ تو دنیا میں اس پر خوش تھا بلکہ واقع میں محقق ہے۔ چنانچہ فرمایا جارہا ہے:

فَمُلٰقِیْهِ پس تو اپنے پروردگار سے ملاقات کرنے والا ہے' خیال وادراک کے پردے کے بغیر اور نمونہ ومثال کے حجاب کے بغیر۔ پس تجھے اللہ تعالیٰ کے حکم کی اطاعت اس قدر ضروری ہے کہ کسی مخلوق کو اتنی ضروری نہیں تاکہ اس روز عین مشاہدہ اور ملاقات کے وقت تو شرم سار اور نادم نہ ہو کیونکہ اس دن وصال کی کوشش میں تیری قوت اور ضعف ظاہر ہو جائے گا اس طرح کہ

فَاَمَّا مَنْ اُوْتِیَ كِتٰبَهٗ تو جسے اس کا نامۂ اعمال اپنے پروردگار کی ملاقات کے وقت دیا جائے گا جس میں اس کی اچھی کاوشیں اور اللہ تعالیٰ کے احکام کی اطاعت اور فرماں برداری لکھی ہوئی ہے تاکہ وہ اس شوق میں جو کچھ بجالایا تھا' وہ سب کا سب اس کے سرور اور لذت کا موجب ہو اور اسے پتہ چل جائے کہ میری کوشش ٹھکانے لگی اور قبول ہوئی۔

بِیَمِیْنِهٖ اس کے سیدھے ہاتھ میں جو کہ نجات اور رضامندی کی علامت ہے اس لیے کہ دایاں ہاتھ غالب طور پر بائیں ہاتھ کی نسبت زیادہ قوی ہوتا ہے اور یہ شخص جس نے فرمانِ الٰہی کی اطاعت کی' اپنے نفس کی خواہش پر غالب آیا اور اسے عظیم قوت نصیب ہوئی اور اس کی نیکیاں اس کی بُرائیوں پر غالب ہوئیں۔

فَسَوْفَ یُحَاسَبُ تو دائیں ہاتھ میں نیک اعمال نامہ دینے کے بعد بُرے کاموں کا حساب کیا جائے گا جو کہ مغلوب اور قلیل رہ گئے تھے۔ حِسَابًا یَّسِیْرًا آسان حساب۔

اور حدیث شریف میں ہے کہ حضرت اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے پوچھا کہ یارسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم حساب یسیر کیا ہے؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ حساب یسیر یہ ہے کہ بندے کا نامۂ اعمال اسے دِکھائیں گے اور ندا آئے گی کہ اے بندۂ مومن! تو نے جو نیکیاں کیں' ہم نے قبول فرمائیں اور جو خطائیں کیں' ہم نے معاف فرما دیں۔ کسی چیز کے متعلق نہیں کہا جائے گا کہ کرنے کی تھی' تو نے کیوں نہ کی اور نہ کرنے کی تھی تو نے کیوں کی۔ فَاَمامن نوقش فی الحساب عذب یعنی جس کے حساب میں بحث اور

تجس ہوا' عذاب میں ضرور گرفتار ہوگا کیونکہ اس وقت گناہ کا کوئی عذر ہاتھ نہیں لگے گا اور وہ گناہ سے خالی نہیں ہے۔

نیز حدیث صحیح میں وارد ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرمارہے تھے کہ قیامت کے دن جس کا حساب ہوا' عذاب بھی ہوگا۔ حضرت اُم المومنین رضی اللہ عنہا نے عرض کی کہ خداتعالیٰ فرماتا ہے فَسَوْفَ يُحَاسَبُ حِسَابًا يَّسِيْرًا اور اس آیت سے یوں معلوم ہوتا ہے کہ بعض لوگ حساب کے بعد نجات پالیں گے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ حساب نہیں ہے' صرف عمل دِکھانا ہے کہ تو نے یوں کیا اور ہم نے معاف فرمادیا اور تو نے یوں نہ کیا اور ہم نے درگزر فرمایا لیکن میری مراد یہ ہے کہ جس کے حساب میں چھان پھٹک کی گئی البتہ ہلاک ہوگا۔

وَّيَنْقَلِبُ اِلٰٓى اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا اور وہ اپنے گھر والوں کی طرف خوش ہوتا ہوا لوٹے گا نہ اسے کسی عذاب کا خوف باقی رہا نہ اسے ملامت اور عتاب سے شرمندہ ہونا پڑا بلکہ اس کی نجات کی مسرت اپنے اہل وعیال سے ملاقات کی مسرت سے مل کر خوشی کی ایسی کیفیت پیدا کرے گی کہ کوئی کیفیت بھی اس کی برابری نہیں کرسکتی اور گھر والوں سے مراد جنتی حوریں اس کی منکوحہ عورتیں جو کہ بنی آدم میں سے جنت میں پہنچتی ہیں اور اس کے دوسرے عزیز و اقارب ہیں جو کہ حشر میں اس کے حساب کی صورتِ حال کی اطلاع کے منتظر کھڑے ہیں۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ بندے پر دوغم جمع نہیں فرماتا جس نے دنیا میں دین کا غم کھایا اس روز شادماں اور خوش باش ہوگا اور سوف کا لفظ جو کہ دیر اور تاخیر پر دلالت کرتا ہے اس بات کے اشارے کے لیے ہے کہ پہلے اسے نامۂ اعمال دِکھا کر نیکیوں کے ساتھ خوش کریں گے اور مہلت دراز کے بعد اسے معاف شدہ بُرائیوں پر اطلاع دی جائے گی تاکہ پہلی دفعہ ہی بُرائیوں پر مطلع ہونے کی وجہ سے شرمسار اور نادم نہ ہو۔

وَاَمَّا مَنْ اُوْتِيَ كِتٰبَهٗ اور جسے اس کا نامۂ اعمال بائیں ہاتھ میں دیا جائے گا اور یہ ہلاکت اور عذاب کی علامت ہے۔ اس لیے کہ بایاں ہاتھ دائیں ہاتھ سے کمزور ہے اور اس شخص نے اپنی کمزور سمت کو جو کہ نفس کی خواہش تھی' قوی سمت پر جو کہ فرمانِ الٰہی ہے' مقدم

رکھا اس نے قوی کو ضعیف اور ضعیف کو قوی کر دیا تھا اور صورت معاملہ کو اُلٹ دیا تھا اسی لیے اس کا اعمال نامہ اس کے بائیں ہاتھ میں اگلی طرف سے نہیں دیں گے بلکہ اس کے بائیں ہاتھ کو اس کی پشت پر باندھ دیں گے اور اس کا اعمال نامہ اس ہاتھ میں رکھیں گے کہ

وَرَآءَ ظَهْرِهٖ یعنی اس کی پشت کی طرف سے فَسَوْفَ يَدْعُوْ ثُبُوْرًا پس آخر کار اپنی ہلاکت کو پکارے گا یعنی آرزو کرے گا کہ کاش موت آ جائے اور مجھے ہلاک کر دے تا کہ اپنی اس بُری کوشش کے انجام سے جلد خلاصی پاؤں۔ اور سوف کا لفظ جو کہ تاخیر پر دلالت کرتا ہے یہاں اس وجہ سے وارد فرمایا گیا کہ اپنی ہلاکت' اپنی عمر اور اعمال کے جمع اور خرچ کے پورے مطالعہ کے بعد واضح ہو گی۔ پہلی بار اپنے اچھے اور بُرے اعمال کو دیکھ کر وہ گمان کرے گا کہ شاید میری نیکیاں بُرائیوں پر غالب آ جائیں اور میں نجات پاؤں اور یہ مطالعہ اور حساب برابر کرنا کچھ وقت چاہتا ہے۔

اور وہ جو سورۃ الحاقۃ اور دوسری سورتوں میں مذکور ہے کہ بعض کو اعمال نامے دائیں ہاتھ میں اور بعض کو بائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے یہاں مذکور صورت کہ پچھلی سمت دیے جائیں گے' کے خلاف نہیں اس لیے کہ بائیں ہاتھ میں اعمال نامہ اسی طرح دیا جائے گا کہ پسِ پشت سے دیں گے اور وہ جو بعض علماء نے تفسیر میں ذکر کیا ہے کہ اس روز لوگوں کی تین قسمیں ہوں گی' اہلِ نجات کے اعمال نامے دائیں ہاتھ میں دیے جائیں گے اور ابدی ہلاکت والوں کو بائیں ہاتھ میں اور عذاب والوں کو جو کہ عذاب کے بعد پھر نجات پائیں گے' دائیں ہاتھ میں پچھلی سمت سے دیں گے یا ہلاکتِ ابدی والوں کو بائیں ہاتھ میں پچھلی سمت سے اور عذاب کے بعد نجات پانے والوں کو بائیں ہاتھ میں اگلی سمت سے دیں گے تو یہ قرآن و حدیث کے بیان کے مطابق نہیں۔ نرا احتمال ہے اس لیے کہ بائیں ہاتھ والوں اور پچھلی سمت والوں دونوں کے بارے میں جو وعید آئی ہے' ایک دوسرے کے قریب ہے۔ خلاصی اور نجات پر دلالت نہیں رکھتی اور اس کے باوجود بعض احادیث میں اسی روش پر اعمال نامہ دینے کی کیفیت پر تصریح ہے جو کہ ذکر کی گئی۔ واللہ تعالیٰ اعلم

اور جب اس شخص کا حال بیان فرما دیا گیا جو کہ اپنا اعمال نامہ پچھلی سمت سے دیے

جانے کی وجہ سے جہنمی ہونے کی علامت پا کر چیخ و پکار کرتے ہوئے موت اور ہلاکت کو پکارنا شروع کر دے گا۔ اب ارشاد ہوتا ہے کہ اس قدر گھبراہٹ' بے قراری اور بے چینی اسے کافی نہیں ہوگی بلکہ جس چیز سے وہ ڈرتا ہے' واقع ہو کر رہے گی۔

وَيَصْلٰى سَعِيْرًا اور بھڑکتی آگ میں داخل ہوگا اس لیے کہ اِنَّهٗ كَانَ فِيْۤ اَهْلِهٖ مَسْرُوْرًا تحقیق وہ دنیا میں اپنے اہلِ خانہ میں خوش اور بے غم تھا' اسے دین اور آخرت کا غم نہیں تھا اور وہ کفر اور گناہوں سے نہیں ڈرتا تھا اور اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کی سمت کا احترام بالکل نہیں کرتا تھا اور یہاں سے بھی معلوم ہوا کہ دنیا کی خوشی اپنے پیچھے آخرت کا غم رکھتی ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا گیا ہے کہ فَلْيَضْحَكُوْا قَلِيْلًا وَّلْيَبْكُوْا كَثِيْرًا جو شخص دنیا میں آخرت کے غم اور فکر میں زندگی بسر کرے اس کا حال آخرت میں اس کے برعکس ہے۔

دنیا میں خوشی اور غم کی تفصیل

لیکن یہاں جاننا چاہیے کہ دنیوی سرور وہی بُرا ہے جو کہ غفلت' بے فکری اور عیش پرستی سے پیدا ہوا اور جو سرور قضائے الٰہی پر راضی ہونے کی وجہ سے یا دینی اعتبار سے قرب اور بلند مرتبوں کے حصول کی بدولت لذت اور فرحت پانے کی وجہ سے ہو' بالکل قابلِ تحسین اور سراسر نفع بخش ہے۔ چنانچہ سورۂ یونس میں فرمایا گیا ہے کہ قُلْ بِفَضْلِ اللّٰهِ وَبِرَحْمَتِهٖ فَبِذٰلِكَ فَلْيَفْرَحُوْا اور یہاں اسی سرور اور نازونعمت کا ذکر ہے جو کہ غفلت کی زیادتی کی وجہ سے دنیا میں حاصل تھا۔ چنانچہ صراحتاً فرمایا جارہا ہے۔

اِنَّهٗ ظَنَّ اَنْ لَّنْ يَّحُوْرَ اور اس کافر کو یہ سب خوشی اس لیے تھی کہ وہ گمان کرتا تھا کہ وہ عالمِ ارواح کو ہرگز نہیں لوٹے گا اور اعمال کا حساب نہیں دیکھے گا اس لیے کہ دنیوی خوشی جب آخرت کے غم' عالم ارواح کو اپنے لوٹنے کے اعتقاد اور اس جہان میں اعمال کی جزا پانے کے ساتھ ملتی ہے تو کالعدم ہو جاتی ہے اور کیا ہی اچھا کہا گیا ہے۔

بیت

مرا در منزل جاناں چہ امن و عیش چوں ہر دم
جرس فریاد بردارد کہ بر بندید محملہا

یعنی مجھے محبوب کے گھر میں کیا امن اور چین حاصل ہو جبکہ ہر وقت گھنٹی آواز دیتی ہے کہ سامان باندھ لو۔ نیز یہ کہ

عشرت امروز بے اندیشۂ فردا خوش ست
فکر شنبہ تلخ دارد جمعۂ اطفال را

یعنی آج کی عیش و عشرت کل کی فکر کے بغیر خوش کن ہے کیونکہ ہفتے کے دن کی فکر بچوں کے جمعہ کی چھٹی کے ذوق کو تلخ کر دیتی ہے لہٰذا حشر و نشر اور جزا و حساب کو ثابت کرنے اور اس کافر کے گمان کو رد کرنے کے لیے فرمایا جا رہا ہے۔

بَلٰی یعنی یوں نہیں جیسا کہ اس نے گمان کیا ہے بلکہ اس کا عالمِ ارواح پھر عالم حشر و نشر پھر حساب اور وزنِ اعمال کے مقام اور پھر جزا دینے کی جگہ جو کہ جنت اور دوزخ ہے' میں لوٹنا ایک طے شدہ حقیقت ہے اور اس کی دلیل یہ ہے کہ

اِنَّ رَبَّهٗ كَانَ بِهٖ بَصِيْرًا تحقیق اس کا پروردگار اس کے حال کو پیدائش کی ابتدا سے موت کی انتہا تک دیکھنے والا تھا کہ اس کی روح کہاں سے آئی اور اس کا جسم کن کن چیزوں سے پیدا ہوا پھر اس نے کیا عقیدہ اور کیا عمل اختیار کیا اور اس کے دل میں کون سی چیز جاگزیں ہوئی اور اس کی زبان سے کیا نکلا اور اس کے ہاتھ سے کیا صادر ہوا اور موت کے بعد اس کی روح کہاں گئی اور اس کا جسم کس کس جگہ بکھرا اور جو ذات کسی شخص کے حالات کی اس قدر نگہبان ہو' اسے بے مقصد نہیں چھوڑا جاتا اور اسے اس کے اعمال کے بدلے تک پہنچایا جاتا ہے اور روح کو اس کے جسم کے اجزا کے ساتھ جمع کیا جا سکتا ہے تو اس کا یہ گمان بالکل بے جا ہے اسے باطل کرنے میں قسم اٹھانے کی ضرورت ہی نہیں اور اگر کسی کو موت کے بعد رونما ہونے والے ان عجیب حالات کے پیش آنے کے بارے میں اور بدن سے روح کے جدا ہونے کے بعد واقع ہونے والے ان حوادث کے بارے میں کوئی تردد یا شک ہو

فَلَآ اُقْسِمُ بِالشَّفَقِ تو میں شفق کی قسم اٹھاتا ہوں اور شفق اس سرخی کا نام ہے جو کہ غروبِ آفتاب کے بعد مغرب کے افق پر نمودار رہتی ہے اور اس وقت تک نمازِ مغرب کا

وقت باقی ہے جیسا کہ امام شافعی اور صاحبین کا مذہب ہے اور اسی پر فتویٰ ہے۔ (محقق علی الاطلاق ابن الہمام نے فتح القدیر میں اس کا رد کیا ہے۔ شامی ج ا ص ۳۶۱ میں اختیار سے نقل کرتے ہوئے لکھا ہے کہ شفق سے مراد سفیدی ہے اور یہ حضرت ابوبکر الصدیق' معاذ بن جبل اور اُم المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہم کا مذہب ہے جبکہ امام بیہقی نے شفق بمعنی سرخی صرف حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اور حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ سے بعض روایات میں منقول ہے کہ شفق اس سفیدی کا نام ہے جو کہ سرخی ختم ہونے کے بعد پیدا ہوتی ہے اور دیر تک رہتی ہے لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ حضرت امام اعظم رضی اللہ عنہ سے اس مذہب سے رجوع فرمالیا ہے۔

(محقق ابن الہمام کے شاگرد رشید علامہ قاسم نے تصحیح القدوری میں فرمایا کہ آپ کا رجوع ثابت نہیں ہے کیونکہ ائمہ ثلاثہ سے لے کر آج تک تمام اکابرین نے دونوں اقوال کی حکایت کی ہے۔ دیکھئے شامی ج ا ص ۳۶۱۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اور عربوں کا شفق کو اپنے شعروں میں سرخ رنگوں کے ساتھ تشبیہ دنے کے مقام میں استعمال کرنا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ شفق سے مراد سرخی ہے نہ کہ سفیدی۔

اور وہ جو بعض علماء نے فرمایا ہے کہ دن کی ابتدا میں مشرقی اُفق کی سرخی روزہ اور نماز میں سے کسی باب میں معتبر نہیں ہے بلکہ معتبر سفیدی ہے جسے صبح صادق کہتے ہیں تو چاہیے کہ نمازِ مغرب کا وقت نمازِ صبح کے وقت کے برعکس ہو کہ اس کی ابتدا غروبِ آفتاب اور اس کی انتہا مغرب کی سفیدی کے زائل ہونے سے ہوتی ہے۔ جیسا کہ نمازِ فجر کے وقت کی ابتدا سفیدی کے طلوع سے ہے اور اس کی انتہا طلوع آفتاب سے ہے۔ اس کا جواب یہ ہے کہ فجر کا وقت تاریکی میں نور کے ظہور کا وقت ہے اور نور کے ظہور کی ابتدا صبح صادق کے طلوع سے ہے جو کہ سفیدی ہے' ہر عام خاص کو محسوس ہوتی ہے کیونکہ پہلے رات کی تاریکی میں تھے جبکہ مغرب کا وقت اس نور میں جس میں پہلے تھے' تاریکی لاحق ہونے کا وقت ہے اور سرخ شفق کے جانے کے بعد عام خاص کی نظر میں تاریکی میں کوئی امتیاز نہیں رہتا اور سورج کے اثر کا بقایا بالکل زائل ہو جاتا ہے پس اس وقت کو سرخی کے جانے پر مقرر کرنا زیادہ مناسب

ہے اور اس وقت کو سفیدی آنے پر مقرر کرنا موزوں ہے اور دونوں وقتوں میں فرق نور پر تاریکی کو پہلے لانے اور اس کے عکس کے ساتھ ہے اس لیے کہ حکمت کا قاعدہ ہے کہ دو ضدوں میں سے ایک کے ساتھ حس کا متاثر ہونا دوسری ضد کے احساس کی سرعت اور قوت کا موجب ہوتا ہے اور اس ضد کے اثر کی کمزوری محسوس ہوتی ہے۔ واللہ اعلم

وَالَّيْلِ وَمَا وَسَقَ رات کی قسم ہے اور اس کی جسے رات جمع کرے' انسانوں اور جانوروں سے اس لیے کہ جاندار کی ہمیشہ کی عادت ہے کہ دن میں روزی کی تلاش کے لیے اپنے مکان سے باہر نکلتا ہے اور ہر کوئی کسی طرف جاتا ہے۔ اور یوں سب پھیل جاتے ہیں اور منتشر ہو جاتے ہیں اور جب رات آتی ہے' اس کے تمام رشتے دار اور تعلق والے ایک گھر میں جمع ہو جاتے ہیں اور مل کر رات گزارتے ہیں تو گویا رات متفرق افراد کو جمع کرنے والی ہے اسی لیے اچھے اور بُرے کام جن کا تعلق چھپانے اور پردہ کرنے کے ساتھ ہے جیسے ذکر کے حلقے' تراویح کی جماعت اور رقص اور شراب خوری کی محفلیں سب کی سب رات کو منعقد ہوتی ہیں اور ان کے لیے اجتماع متحقق ہوتا ہے۔

وَالْقَمَرِ اِذَا اتَّسَقَ اور چاند کی قسم جب اس کا نور پورا ہو جائے اور شام سے صبح تک رات کی تاریکی کو دُور کرے اور اجنبیت کے پردے کو اُٹھائے۔

موت کے بعد آدمی کی تین حالتیں

اور یہ تینوں چیزیں یعنی شفق' اندھیری رات اور چمکتا چاند ان تین حالتوں کا نمونہ ہیں جو کہ مرنے کے بعد جو کہ گویا زندگی کے آفتاب کے غروب کا نمونہ ہے' آدمی پر طاری ہوں گی۔ پہلی وہ حالت جو کہ صرف روح کے بدن سے جدا ہونے کی وجہ سے ظاہر ہوگی کہ گزشتہ زندگی کا کچھ اثر اور بدن اور ابنائے جنس میں سے شناساؤں کے ساتھ تعلق کی اُلفت باقی ہے اور وہ وقت گویا دنیوی زندگی اور قبر کی دنیا میں بہمہ وجوہ منہمک ہونے کے درمیان برزخ ہے کہ اس میں کچھ یہاں کی اور کچھ وہاں کی چیزیں ہیں اور بعینہٖ شفق باقی رہنے کے وقت کی طرح ہے کہ ابھی مخلوقات کے کام کاج اور ان کی آمد و رفت منقطع نہیں ہوئی اور سب جان دار' بے دار' حساس اور متحرک ہیں اور دن کے باقی ماندہ کاموں میں مصروف۔

میت کے لیے خیرات' فاتحہ اور ایصالِ ثواب

اور یہ کچھ نیکیوں اور برائیوں کی جزا کے ظاہر ہونے کی حالت ہے اور مرنے والوں کے لیے زندوں میں مدد اس حالت میں نسبتاً جلد پہنچتی ہے اور مرنے والے اس طرف سے امداد ملنے کے منتظر ہوتے ہیں' اور وہ یوں گمان کرتے ہیں کہ ابھی ہم زندہ ہیں اسی لیے حدیث شریف میں قبر کے حالات کے بارے میں واقع ہے کہ وہاں مسلمان کہتا ہے کہ دعونی اصلی مجھے چھوڑ دو تا کہ میں نماز پڑھ لوں۔ نیز وارد ہے کہ مرنے والا اس حالت میں اس ڈوبنے والے کی طرح ہوتا ہے جو کہ فریاد رسی کا انتظار کرتا ہے اور اس وقت صدقات' دعائیں اور فاتحہ شریف بہت کارآمد ہوتی ہے اور یہی وجہ ہے کہ لوگ ایک سال تک خصوصاً چہلم تک موت کے بعد اس قسم کی امداد میں بہت کوشش کرتے ہیں اور مرنے والے کی روح بھی موت کے قریب خواب میں اور عالم مثال میں زندوں سے ملاقات کرتی ہے اور اپنا مافی الضمیر بیان کرتی ہے۔

(اقول و باللہ التوفیق فاتحہ سوئم یعنی تیجا اور اسی طرح دسواں' چالیسواں' ششماہی اور سالانہ کی یہی حکمت ہے اور مفسر علام رحمۃ اللہ علیہ کی صراحت کے مطابق میت کو اس کا انتظار شدید رہتا ہے اور اس سے اسے بہت فائدہ حاصل ہوتا ہے۔ چنانچہ بخاری شریف ج ا کتاب الوصایا میں ہے کہ حضرت سعد بن عبادۃ رضی اللہ عنہ کی والدہ کے وصال کے بعد انہوں نے پوچھا یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم ھل ینفعھا ان اتصدق عنھا فقال رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نعم فقال حائط کذا و کذا صدقة عنھا عرض کی کیا والدہ کی طرف سے صدقہ کروں تو اسے نفع پہنچے گا؟ فرمایا پہنچے گا۔ عرض کی پھر میرا فلاں باغ ان کی طرف سے صدقہ ہے۔ اس کارِ خیر سے روکنے والوں کے امام مذہب مولوی اسماعیل دہلوی نے اس حقیقت کو اپنی کتاب صراطِ مستقیم میں یوں تسلیم کیا ہے'' جب میت کو نفع پہنچانا بھی مقصود ہے تو کھانا کھلانے پر موقوف نہیں ہونا چاہیے اگر میسر ہو تو بہتر ہے ورنہ سورۃ فاتحہ اور اخلاص کا ثواب نہایت بہتر ہے۔ ایصالِ ثواب اور روحوں کے اپنے گھروں کو آنے کے مسئلے کے متعلق بہترین تحقیق کے لیے امام اہلِ سنت مجدد دین وملت اعلیٰ

حضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ کے رسالہ الحجۃ الفائحہ اور اتیان الارواح کا مطالعہ کریں۔ نیز جاء الحق جلد اوّل از حکیم الامت مولانا مفتی احمد یار خان صاحب گجراتی سے استفادہ کریں)

دوسری حالت وہ ہے جو کہ دنیوی زندگی سے بالکل منقطع ہونے کے بعد رونما ہوتی ہے اور اسے نیکی اور بدی کے لئے اپنی کمائی ہوئی کیفیات میں بہت زیادہ استغراق حاصل ہوتا ہے اور اس کی ادراک وتصرف کرنے والی قوتیں اس جہان سے ٹوٹ کر اس جہان کی طرف متوجہ ہو جاتی ہیں' اس کی معنوی حس وحرکت اس جہان سے بالکل ختم ہو جاتی ہے اور یہ حالت رات کی تاریکی کی مثل ہے جو کہ شفق کے زائل ہونے کے بعد ہجوم کرتی ہے اور لوگوں کو نیند اور حواس وحرکات معطل ہونے کی کیفیت لاحق ہوتی ہے اور وہ دن کی مصروفیات سے بالکل غافل ہو جاتے ہیں۔ ہاں وہ مصروفیات بدن کے ظاہر سے منتقل ہو کر باطن میں جمع ہو جاتی ہیں اور روح رنگا رنگ شکلوں میں ان کا مطالعہ کرتی ہے اور لذت وتکلیف حاصل کرتی ہے اور یہ حالت مرنے والے عام لوگوں کی ہے۔

اولیائے اللہ سے بعد از وصال حاجت روائی اور مشکل کشائی کے لیے استمداد اور نسبت اویسی کا بیان

اور اولیائے اللہ میں سے بعض خاص اولیاء کو جو کہ انسانوں کی تکمیل اور انہیں رشد وہدایت دینے کا آلہ بن گئے ہیں اس حالت میں بھی دنیا میں تصرف کرنے کی طاقت دی گئی ہے اور ان کی قوتوں میں کمال وسعت کے پیش نظر ان کا استغراق انہیں اس طرف متوجہ ہونے سے نہیں روکتا اور اویسی مشرب والے حضرات ان سے باطنی کمالات حاصل کرتے ہیں اور حاجات اور مقاصد والے ان سے اپنی مشکلات کا حل مانگتے اور پاتے ہیں اور اس وقت ان کی زبان حال ان نغمات سے معمور ہوتی ہے۔

من آیم بجاں گر تو آئی بہ تن

(اقول وباللہ التوفیق حضور غوث الثقلین محبوب سبحانی حضرت شیخ ابو محمد محی الدین سید عبدالقادر جیلانی قدس سرہ اور خواجۂ خواجگان عطائے رسول حضرت خواجہ معین الدین چشتی اجمیری رحمۃ اللہ علیہ صرف ان اکابرین میں سے ہی نہیں بلکہ اس سطح کے مقربین کے سرتاج

اور مقتدا ہیں لہٰذا ان سے استمد اد یا حضرت شیخ عبدالقادر جیلانی شیئاً اللہ مدد باذن اللہ اور مگر داب بلا افتاد کشتی مدد کن یا معین الدین چشتی کہنا اور ورد کرنا درست ہے کہ مفسر علام کے مطابق ایسے اکابرین سے اہلِ حاجات اپنی مشکلات کا حل مانگتے بھی ہیں اور پاتے بھی ہیں۔ فللّٰہ الحمد وھو ولی الھدایۃ والتوفیق۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

تیسری وہ حاجت جو کہ ایام بیض کے چاند کی طرح حشر ونشر کے بعد ظاہر ہوگی کہ تاریکی کے پردے کو دُور کر کے ان کے اچھے بُرے اعمال کو کئی طریقوں سے ظاہر کرے گی اور ہر شخص نفع بخش اور نقصان دہ' دوست دشمن اور زہر و تریاق میں امتیاز کرے گا اور اسی حالت میں اعمال ناموں کا دیا جانا' اچھے بُرے اعمال کا مختلف صورتوں میں ظاہر ہونا' اعمال کا وزن' نیکی بدی کا حساب اور دوسرے بہت سے واقعات رونما ہوں گے اور اس حالت کی انتہا ایک اور زندگی ہے جو کہ اس جہان کی زندگی سے زیادہ کامل ہے لیکن چونکہ وہ زندگی بدلتی نہیں' یکساں ہمیشہ قائم ہے اس کے لیے کوئی مثال نہیں کہ اسے قسم کے مقام پر لایا جائے بلکہ وہ زندگی نئے بدلتے ہوئے حالات کے قبیلے سے بھی نہیں کہ اسے ان حالات کے بیان کے مقام میں لایا جائے اس بناء پر انہیں تین قسموں پر اکتفاء فرمایا گیا جس مضمون کو ثابت کرنا منظور ہے' اسے بیان فرمایا جارہا ہے کہ

لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ تم ضرور ایک حال سے گزر کر دوسرے حال پر پہنچو گے یعنی اس دنیا کے بعد تم پہلے ایک حال پر رہو گے جسے تم رجوع الی اللہ سمجھو گے۔ اس کے بعد اس حالت سے گزر کر ایک اور حالت میں پہنچو گے اور جان لو گے کہ رجوع کی حالت یہی ہے۔ اور پہلی حالت تو اس حالت کی تمہید تھی۔ علیٰ ہذا القیاس یہاں تک کہ جنت اور دوزخ میں جگہ پاؤ اور سفر ختم ہو جائے اور اس کے بعد ہمیشہ کے لیے قیام کرو۔

اور اس لیے کہ اس حالت میں گزرنا منزلیں عبور کرنے اور مرحلے طے کرنے کے مشابہ ہے یہاں رکوب کا لفظ لایا گیا جو کہ سوار ہونے کے معنوں میں ہے اور چونکہ یہ حرکت اوپر جانے کی ہے کہ لوگ نچلے خاکدان سے عالم بالا کی بلندی کی طرف جاتے ہیں اس لیے اس کے حالات اور منزلوں کو طبق عن طبق فرمایا گیا ہے کیونکہ طبق عن طبق تہ بہ تہ کو کہتے ہیں

جیسا کہ آسمان کے سات طبق مشہور ہیں اور عرف کی زبان میں طبقات عمارات کا لفظ رائج ہے۔

اور چونکہ ہر دن رات اور ہر سال و مہینہ میں ان انقلابات کے دلائل ہر خاص و عام کی نظر میں موجود ہیں' موت کے بعد ان حالات کے پیدا ہونے پر کافروں کے ایمان نہ لانے اور یقین نہ کرنے کو غیر معقول قرار دیتے ہوئے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ

فَمَا لَهُمْ لَا يُؤْمِنُونَ ان کفار کو کیا ہے کہ اس واضح بیان اور روشن مثالوں کے باوجود ایمان نہیں لاتے اور یقین نہیں کرتے کہ ہمیں موت کے بعد ایک لوٹنا اور ایک سفر درپیش ہے اور اس سفر کا غم نہیں کرتے اس کے لیے سفر خرچ تیار نہیں کرتے اور اس جہان کے نفع و نقصان کے ہوش نہیں کرتے جو کہ اس سفر کی انتہا ہے۔

اور بعض مفسرین نے لَتَرْكَبُنَّ طَبَقًا عَنْ طَبَقٍ کو ایک اور معنی پر محمول کیا ہے جس کی اس مقام کے ساتھ اتنی مناسبت نہیں ہے اور اگرچہ وہ امر واقعی ہے اور وہ یہ ہے کہ یہ خطاب ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت کو ہے اور مراد جھڑکنا ہے یعنی تم بھی گناہوں کے ایک طبقے کے بعد دوسرے طبقے کے مرتکب ہوگے یعنی پہلی اُمتوں کی طرح کہ انہوں نے جو صغیرے اور کبیرے گناہ اور الحاد و بدعت کی جو قسمیں اپنائی تھیں' تم بھی وہی کروگے۔ چنانچہ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی اُمت سے فرمایا کہ تم بھی پہلے لوگوں کے تتبع میں بعینہٖ وہی کروگے جو انہوں نے کیا بالشت کے برابر بالشت اور گز کے برابر گز یعنی اگر پہلوں نے راہِ حق سے گز بھر دُوری اختیار کی تھی تو تم میں سے بھی بعض لوگ اسی قدر حق سے دُوری اختیار کریں گے اور اگر پہلے لوگ بالشت بھر دُور ہوئے تھے تو تم میں سے ایک گروہ اسی قدر دُور ہوگا یہاں تک کہ اگر پہلوں میں سے کسی بدبخت نے اپنی ماں سے کھلم کھلا بُرائی کا ارتکاب کیا ہوگا تو تم میں سے بھی بعض لوگ ایسا کریں گے اور پہلوں سے اگر کوئی گوہ کے سوراخ میں داخل ہوا ہے' تم میں سے بھی کوئی اس سوراخ میں داخل ہوگا۔

نیز صحیح حدیث شریف میں ہے کہ حقوق اللہ اور حقوق العباد کو توڑنے' رسول علیہ السلام

اور قیامت کو جھٹلانے اور دوسرے گناہوں کے مرتکب ہونے میں تمہارا حال بعینہٖ پہلی اُمتوں کے مطابق اور موافق ہے جس طرح کہ ایک جوتا دوسرے جوتے کے مطابق ہوتا ہے کہ دونوں کے درمیان ایک جو کے برابر بھی فرق نہیں ہوتا البتہ تم چند چیزیں زیادہ کرو گے جو کہ پہلی اُمتوں میں نہ تھیں۔

وہ گناہ جو کہ پہلی اُمتوں میں نہ تھے اس اُمت میں ہیں

جیسے آزاد لوگوں کو بیچنا ہے یعنی جو شخص آزاد ہو اور وہ کسی کا غلام یا کنیز نہیں اسے مکر اور حیلے کے ساتھ بیچنا اور اس کی قیمت ہضم کرنا' سقر بازی یعنی دو عورتوں کی باہم شہوت رانی۔ رسول علیہ السلام پر ایمان لانے کا دعویٰ کرنے کے باوجود ان کی اولاد کو قتل کرنا کہ یہ کام کسی اُمت میں نہیں ہوا دوسرے کفار نے اگرچہ اپنے رسولوں علیہم السلام کو شہید کیا ہے اور انہیں ستایا ہے لیکن ایمان کا دعویٰ کیے بغیر کفر کی حالت میں۔

اور بعض قاریوں نے لَتَرْکَبَنَّ کو با کی زبر سے پڑھا ہے اور مفسرین نے اس کے معنوں میں یوں کہا ہے کہ یہ حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے خطاب ہے اور اس سے معراج کا وعدہ مراد ہے کہ آپ براق پر سوار ہو کر یکے بعد دیگرے آسمان کے ساتوں طبقات سے ضرور گزریں گے اور یہ معنی بھی آیات کے سیاق و سباق کے ساتھ بالکل مناسبت نہیں رکھتا بلکہ با کی زبر کی صورت میں بنی آدم میں سے ہر کسی سے خطاب ہے جیسا کہ ضمہ کی صورت میں بنی آدم سے مجموعی خطاب ہے۔

بہرحال ظاہر معنی وہی ہے جو کہ ذکر کیا جا چکا ہے اور مقصد کفار کو ڈانٹنا ہے جو کہ سفر آخرت کے نمونوں کو دیکھنے کے باوجود اس سفر کا انکار کرتے ہیں اور وہاں کے حادثے کے حالات پر ایمان نہیں لاتے اور اگر ان کی عقل خود بخود ان حالات کی دریافت تک نہیں پہنچی تھی تو چاہیے تھا کہ قرآن پاک کے بیان سے فائدہ حاصل کرتے لیکن یہ آخرت پر ایمان لانے سے اتنے دُور ہیں کہ ان مضامین کو قرآن پاک میں سُن کر بھی نہیں مانتے۔

وَاِذَا قُرِئَ عَلَيْهِمُ الْقُرْاٰنُ اور جب ان پر قرآن پڑھا جاتا ہے اور اس کی عاجز کر دینے والی عبارت سُن کر حیرت میں ڈوب جاتے ہیں لیکن عاجزی اختیار نہیں کرتے اور

جب مسلمان اپنی عاجزی کے اظہار کے لیے سجدہ کرتے ہیں' وہ

لَا یَسْجُدُوْنَ سجدہ نہیں کرتے حالانکہ حضرت حق جل شانہ جو کہ اعجاز پر مبنی قرآن نازل فرمانے والا ہے' کے لیے سجدہ کسی آئین اور مذہب میں ممنوع نہیں ہے اور وہ صرف نہ ماننے اور سجدہ نہ کرنے پر ہی اکتفاء نہیں کرتے۔

بَلِ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا یُکَذِّبُوْنَ بلکہ جو لوگ کافر ہیں' قرآن پاک کا انکار کرتے ہیں اگرچہ زبان سے نہیں کہتے لیکن حق تعالیٰ ان کے دِلوں میں موجود انکار کو جانتا ہے۔

وَاللّٰہُ اَعْلَمُ بِمَا یُوْعُوْنَ اور اللہ تعالیٰ اسے خوب جانتا ہے جو کچھ وہ (باطن) کے ظرف میں رکھتے ہیں یعنی تکذیب و انکار کے علاوہ احکامِ خداوندی کی مخالفت' اس کی نافرمانی' دنیوی زندگی کی مسرت اور خوشی' یہ گمان کہ ہمیں آخرت کا سفر درپیش نہیں ہے' گناہوں اور شہوتوں کی محبت اور اپنے رُسل علیہم السلام کے ساتھ مکروفریب سے جو کچھ ان کے باطن کے ظرف میں بھرا پڑا ہے' اللہ تعالیٰ سے پوشیدہ نہیں ہے۔

اور یُوْعُوْنَ کے لفظ میں اس طرف اشارہ ہے کہ یہ ناعاقبت اندیش لوگ ان قبیح چیزوں کو پوری احتیاط کے ساتھ اپنے باطن کے ظرف میں سنبھالے ہوئے ہیں حالانکہ ضرورت کے وقت جب یہ موذی چیزیں اس برتن سے باہر آئیں گی تو انہیں معلوم ہوگا کہ ہم نے کیا غلطی کی اور رات کی تاریکی میں پھولوں کا ہار سمجھ کر سیاہ سانپ کو گردن میں ڈال لیا اور کیا ہی اچھا کہا گیا ہے

بوقت صبح شود ہمچو روز معلومت
کہ باکہ باختۂ عشق در شب دیجور

یعنی صبح کے وقت تجھے روزِ روشن کی طرح پتہ چل جائے گا کہ اندھیری رات میں تو نے کس سے عشق کیا۔

لیکن جب یہ جاہل لوگ ان بُرائیوں کو اچھائیاں خیال کرتے ہیں اور آئندہ نفع کے لیے جمع کیے ہوئے خزانے کی طرح پانی اور مٹی کے برتنوں میں نہیں بلکہ جان و دل کے برتنوں میں ان کی حفاظت کرتے ہیں تو آپ کو بھی چاہیے کہ ان کے باطل اعتقاد کے مطابق

تحکم واستہزاء کے طریقے سے گفت وشنید کریں۔

فَبَشِّرْهُمْ بِعَذَابٍ اَلِيْمٍ تو آپ انہیں ان کے دنیوی سرور اور خوش وقتی کے بدلے دردناک عذاب کی بشارت دیں اور یہاں بشارت کا لفظ ڈرانے دھمکانے کے لیے استعارہ تہکم ہے یعنی ان سے استہزاء کرنے کے لیے عاریۃً لیا گیا ہے۔

اِلَّا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ یعنی ان میں سے سب کے ساتھ عذابِ الیم کا وعدہ فرمائیں مگر ان لوگوں کے ساتھ نہیں جو کہ ایمان لائیں اور عمل صالح اپنائیں اور اپنے کفر اور گناہوں کو اس سبب سے صاف کر دیں کہ ان پر کوئی عذاب نہیں ہے نہ الیم نہ غیر الیم بلکہ لَهُمْ اَجْرٌ ان کے لیے ایمان' نیک اعمال اور کفر و گناہ کو دُور کرنے پر ایک ایسا اجر ہے غَيْرُ مَمْنُوْنٍ جو کہ ختم ہونے والا نہیں ہے' ابدی ہے اگرچہ نیند اور غفلت کے وقت ان کا ایمان منقطع ہو گیا تھا اور ان کے نیک اعمال بھی بیماری' مصروفیت' سفر اور موت کی وجہ سے منقطع ہو گئے لیکن اللہ تعالیٰ کی رحمت نے اس غیر دائمی ایمان کو ایمان دائمی کا حکم عطا فرمایا اور اس منقطع ہونے والے عمل کو ہمیشہ کے عمل کی صورت میں قبول فرمائے اور اس کے بدلے نعمت جاودانی عطا فرمائی۔

سجدۂ تلاوت کے وجوب کا بیان

اور یہ سورۃ سجدے کی سورتوں میں سے ہے اور آیت لایسجدون کے بعد سجدے کا محل ہے۔ اور حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے سجدہ ترک کرنے پر یہاں وارد ہونے والی مذمت اور عذاب سے اس بات پر دلیل لی ہے کہ سجدۂ تلاوت واجب ہے اس لیے کہ ترک سنت پر مذمت اور عتاب نہیں ہوتا جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے نزدیک سجدہ تلاوت سنت ہے اور وہ اس دلیل کا جواب یہ دیتے ہیں کہ یہاں سجدے سے مراد عاجزی اور انکساری کرنا ہے اور نماز میں فرض سجدہ کی ادائیگی کا پختہ عزم کرنا ہے نہ کہ سجدۂ تلاوت اور اس جواب میں ایک اُلجھن ہے اس لیے کہ اگر مراد یہ تھی تو یہاں سجدۂ تلاوت مسنون کیوں ہوتا حالانکہ صحیح حدیث میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ آپ نے یہ سورۃ نمازِ عشا میں تلاوت فرمائی ہے اور اس مقام پر سجدہ فرمایا ہے اور مقتدیوں اور سننے والوں نے بھی آپ کے ہمراہ

سجدہ کیا ہے۔ چنانچہ حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ بھی اس جماعت میں داخل تھے اور ظاہر ہے کہ جب اس آیت میں ان کفار کی مذمت فرمائی گئی جو کہ سجدہ نہیں کرتے تو ایمان والے کے لیے لازمی چاہیے کہ کفار کی مخالفت کے طور پر سجدہ کرے اور قرآن پاک میں جتنی بھی آیاتِ سجدہ ہیں یا تو ان میں سجدہ ترک کرنے پر کفار کی مذمت ہے یا سجدہ کرنے کی وجہ سے ایمان والوں اور فرشتوں کی تعریف لیکن یہ لازم ہوا اس طرف سے ہے یعنی قرآن پاک میں جو سجدہ بھی ہے اس قسم کی آیات میں ہے نہ کہ اس کے برعکس اس لیے کہ قرآن پاک میں کئی مقام ہیں جہاں اس قسم کی آیات آئی ہیں اور وہاں سجدہ نہیں ہے اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ آیاتِ سجدہ توقیفی ہیں' قیاسی نہیں ہیں۔

سورۃ البروج

سورۃ البروج مکی ہے اس کی بائیس (۲۲) آیات' ایک سونو (۱۰۹) کلمات اور چار سو تیس (۴۳۰) حروف ہیں۔

سورۃ الانشقاق سے رابطے کی وجہ

اور اس سورۃ کے سورۃ الانشقاق کے ساتھ رابطے کی وجہ یہ ہے کہ اس کی ابتدا میں آسمان کا پھٹنا بیان کیا گیا جو کہ قیامت کے دن ہوگا جبکہ اس سورۃ میں آسمان کا دنیا میں بارہ (۱۲) مساوی قسموں میں منقسم ہونا بیان کیا گیا ہے جس میں سے ہر ایک کا حکم جدا ہے اور اس سورۃ کی انتہا میں بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا يُكَذِّبُوْنَ وَاللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا يُوْعُوْنَ واقع ہے جبکہ اس سورۃ کے آخر میں بَلِ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا فِیْ تَكْذِیْبٍ وَاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِیْطٌ ہے اور یہ دونوں مضامین ایک دوسرے کے ساتھ اتحاد رکھتے ہیں جیسا کہ پوشیدہ نہیں ہے اور اس سورۃ کے وسط میں جنتیوں اور جہنمیوں کے حال کا ذکر ہے جس طرح کہ اس سورۃ کے وسط میں بھی وہی ذکر ہے۔ پس دونوں سورتوں میں پوری مناسبت حاصل ہوگئی۔

سبب نزول

اور اس سورۃ کے نزول کی وجہ یہ تھی کہ کفارِ مکہ مسلمانوں کو اسلام کی وجہ سے قسم قسم کی

تکالیف اور دُکھ پہنچاتے تھے اور مسلمان یہ شکایت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بارگاہِ بے کس پناہ میں عرض کرتے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرماتے کہ ایک وقت آئے گا کہ اللہ تعالیٰ تمہیں ان لوگوں سے بدلہ لینے کی طاقت بخشے گا اور جو سلوک وہ تمہارے ساتھ کرتے ہیں' تم ان کے ساتھ کرو گے۔ کفار نے جب یہ ماجرا سنا تو طنز اور مذاق کرنے لگے اور کہنے لگے کہ ان کمزور' ذلیل اور بے مایہ لوگوں کے لیے کیا امکان ہے کہ ہم سے بدلہ لینے کی طاقت حاصل کریں اگر اللہ تعالیٰ کے نزدیک ہماری عزت اور ان کی ذلت ثابت نہ ہوتی تو ہمیں ان پر غلبہ کیوں دیا جاتا۔ تو معلوم ہوا کہ اللہ تعالیٰ کا انعام ہر وقت اور ہر آن میں ہمارے نصیب ہے جبکہ ذلت' عاجزی اور رسوائی ان کے نصیب ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کفار کی اس گفتگو کے جواب میں یہ سورۃ نازل فرمائی اور اس سورۃ کی ابتدا میں آسمان کی قسم اُٹھائی جس کے بارہ (۱۲) برج ہیں اور ہر برج جہان اور جہان والوں کے انقلاب کا موجب ہوتا ہے' کئی چیزیں جو کہ ایک برج کے حکم کے مطابق بہت عزیز تھیں دوسرے برج میں خوار' ذلیل اور بے وقعت ہو جاتی ہیں جیسا کہ گرمیوں میں پشمینہ کی چادر اور کوٹ اور سردیوں میں ٹھنڈا پانی' لذیز شربت اور برف یہاں سے چاہیے کہ وہ حالات کے بدل جانے کا سراغ لگائیں اور اپنی عزت پر مغرور نہ ہوں اور مسلمانوں کی کمزوری پر طعن اور مذاق نہ کریں کیونکہ وہ ہر سال مختلف موسموں میں اس قسم کے انقلاب کا مشاہدہ کرتے ہیں۔

یہاں سے معلوم ہو گیا کہ اس سورۃ کو سورۃ البروج اسی وجہ سے کہا گیا ہے کہ اس سورۃ میں نیکی اور بدی کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے اور سعادت و نحوست کے ایک دوسرے سے بدلنے کو بیان کرنا منظور ہے تاکہ پتہ چلے کہ جو شخص مسلمانوں کو تکلیف اور دُکھ دیتا ہے اور وہ پورا غلبہ اور قوت رکھتا ہے' ہو سکتا ہے کہ میرے انتقام میں گرفتار ہو جائے اور عوام کے نزدیک سعادت اور نحوست کے ایک دوسرے کے پیچھے آنے کا سب سے مشہور سبب آسمان کے بارہ (۱۲) برج ہیں اسی لیے اس بارے میں بارہ (۱۲) قمری مہینوں کا اعتبار نہیں فرمایا گیا ہے اس لیے کہ ان کے اختلاف کی وجہ سے جہان میں ایک انقلاب محسوس نہیں ہوتا ہے اور یہی وجہ ہے کہ قمری مہینے ہر موسم میں آتے ہیں اور اس موسم کا حکم حاصل کرتے ہیں اور

برجوں کے احکام کے انقلاب کی وجہ سے خود بھی انقلاب پذیر ہو جاتے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الْبُرُوْجِ برجوں والے آسمان کی قسم! اور ہر برج نیکی' بدی اور سعادت ونحوست میں جدا حکم رکھتا ہے اور احکام کے مختلف ہونے کے باوجود چکر کے ساتھ ایک دوسرے کے پیچھے آتے ہیں۔ ایک مدت تک اس کا حکم دنیا میں جاری ہوتا ہے پھر زائل ہو جاتا ہے پھر لوٹتا ہے۔ پس ایک شخص کے حق میں ایک حالت کے ہونے اور دوسرے کے حق میں اس کے نہ ہونے پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے کہ ہو سکتا ہے کہ یہ موجودہ حالت معدوم ہو جائے اور وہ معدوم حالت پھر آ جائے۔

برجوں کی حقیقت

اور برجوں کی حقیقت یہ ہے کہ سورج کے گھومنے کی وجہ سے آسمان میں دائرہ پیدا ہو جاتا ہے جسے دائرۃ البروج کہتے ہیں اور سورج اس دائرے کو ایک سال کی مدت میں پورا کرتا ہے جب اس دائرے کو بارہ (۱۲) برابر قسموں میں تقسیم کریں' ہر قسم کا نام برج رکھیں تو بارہ (۱۲) برج پیدا ہوں اور کمی بیشی کے بغیر اس دائرے کو بارہ (۱۲) قسموں میں تقسیم کرنے کی وجہ کہ دربارِ خداوندی سے تمام بنی آدم کے ذہنوں میں یہی ڈالا گیا اور ہندوؤں' فارسوں' یونانیوں' عربیوں' فرنگیوں اور دیگر اقوام کے تمام گروہ اس پر متفق ہیں۔ یہ ہے کہ جب فلک کی منزلوں میں سے ہر منزل میں سورج کے ٹھہرنے کی مدت کے لیے ایک موسم مقرر کیا گیا ہے کہ ان موسموں کی ہوا اور خاصیت ایک دوسرے سے مختلف ہے جیسے موسمِ ربیع اور خریف اور گرمی اور سردی اور ہر موسم کی ایک ابتدا' درمیان اور ایک انتہا ہے کہ ان حالات میں اس موسم کا حکم قوت اور ضعف میں مختلف ہو جاتا ہے' ناچار اس بناء پر فلک کو بارہ (۱۲) قسموں میں تقسیم کر دیا گیا اور ہر قسم کا نام برج رکھا گیا ہے۔

نیز سورج کو اپنے ایک مکمل دورے میں بارہ (۱۲) مرتبہ قمر کے ساتھ جمع ہونے کا اتفاق ہوتا ہے کہ دونوں فلک کی ایک جگہ سے اکٹھے ہوتے ہیں اور قمر کے ہر اجتماع سے آخر تک قمری مہینہ ہے۔ ناچار شمس وقمر کے اجتماعات کے بعد فلک کو بارہ (۱۲) قسموں میں کر دیا

گیا اور ہر قسم کے لیے ایک برج مقرر کیا گیا ہے اور اس برج میں ستاروں کے جمع ہونے کی وجہ سے جو شکل پیدا ہوئی اسی کے مطابق اس برج کا نام رکھا گیا جیسے حمل' ثور' جوزا' سرطان' اسد' سنبلہ' میزان' عقرب' قوس' جدی' دلو اور حوت یعنی مینڈھا' بیل' بکرا' کیکڑا' شیر' گیہوں کا خوشہ' ترازو' کمان' بزغالہ' ڈول اور مچھلی

اور ان برجوں میں سے ہر ایک کے لیے حرکت آفتاب کے دنوں کی مقدار کو تیس (۳۰) قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس برج کی ہر قسم کو درجہ کا نام دیا گیا ہے اور ہر درجے کو ساٹھ (۶۰) قسموں میں تقسیم کیا گیا ہے اور اس درجے کی ہر قسم کو دقیقہ کہتے ہیں کہ ہندی زبان میں اس مقدار کے گزرنے کی مدت کو گھڑی کہتے ہیں اور ہر دقیقے کو ساٹھ (۶۰) قسموں میں تقسیم کر کے ثانیہ کہتے ہیں جسے ہندی زبان میں پل کہتے ہیں اور ہر ثانیے کو ساٹھ (۶۰) قسموں میں تقسیم کر کے ثالثہ کہتے ہیں جسے ہندی زبان میں چھن کہتے ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس

اور یہ بارہ (۱۲) برج شکل اور احکام میں آپس میں بالکل مختلف ہیں۔ پس حمل ایک مینڈھے کی شکل میں ہے جس کا سر مغرب کی طرف ہے اور دُم مشرق کی طرف اور منہ پیچھے کی طرف کر کے کسی چیز کو دیکھتا ہے اور جو ستارے اس کی شکل میں واقع ہیں' تئیس (۲۳) ستارے ہیں اور پانچ دوسرے ستارے بھی اس کی شکل کے ساتھ ایک تعلق رکھتے ہیں اگرچہ شکل سے باہر واقع ہوئے ہیں۔

ثور ایک بیل کی شکل میں ہے جس کا سر مشرق کی طرف اور دُم مغرب کی طرف ہے اور اس کی شکل بتیس (۳۲) ستاروں سے مرکب ہے اور دوسرے ستارے جیسے عین الثور اور ثریا جو کہ انگور کے خوشے کی مثل ہے اور کچھ اور ستارے بھی اس کی شکل سے تعلق رکھتے ہیں اگرچہ شکل سے باہر ہیں۔

اور جوزا دو آدمیوں کی شکل میں ہے جو کہ ایک دوسرے سے ملے ہوئے اور چمٹے ہوئے ہیں جن کے سر شمال اور مشرق کی جانب اور پاؤں جنوب اور مغرب کی طرف ہیں اور اس برج کی شکل میں اٹھارہ (۱۸) ستارے داخل ہیں اور سات ستارے باہر ہیں' ذراع اور

ہقعہ وغیرہما۔

اور سرطان ایک معروف جانور کی شکل پر ہے جسے فارسی میں خرچنگ اور ہندی میں کیکڑا کہتے ہیں اور اس کی شکل نو ستاروں سے مرکب ہوئی ہے۔

اور اسد شیر کی شکل میں ہے جو کہ ستائیس (۲۷) ستاروں سے مرکب ہے اور کچھ دوسرے ستارے جیسے قلب الاسد اور زہرہ بھی اس سے تعلق رکھتے ہیں۔

اور سنبلہ ایک عورت کی شکل میں ہے جس کے ہاتھ میں ایک خوشہ ہے اس عورت کا سر اسد کی دُم کی طرف اور اس کے پاؤں میزان کی طرف ہیں اور چھبیس (۲۶) ستاروں سے مرکب ہے اور کچھ دوسرے ستارے بھی اس کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں اور اس کے خوشہ والے ہاتھ کے متصل ایک سیارہ ہے جسے سماک اعزل کہتے ہیں۔

اور میزان ترازو کی صورت میں آٹھ ستاروں سے مرکب ہے۔

اور عقرب بچھو کی صورت میں ہے اکیس (۲۱) ستاروں سے مرکب ہے اور قلب العقرب' اکلیل اور چند دوسرے ستارے بھی اس سے تعلق رکھتے ہیں۔

اور قوس ایک مرد کی شکل میں ہے جس کے ہاتھ میں کمان اور تیر ہے اور اکیس (۲۱) ستاروں سے مرکب ہے۔

اور جدی ایک بزغالہ یعنی بکری کے بچے کی شکل میں ہے' اٹھائیس (۲۸) ستاروں سے مرکب ہے۔ سور ذابح بھی اس کے متعلق ہے۔

اور دلو بھی ایک ایسے آدمی کی صورت میں ہے جو ڈول کو کنویں سے نکال کر ہاتھ میں پکڑ کر اس ڈول کو اُلٹا کیے ہوئے پانی زمین پر گرا رہا ہے اور اس کی شکل بیالیس (۴۲) ستاروں سے مرکب ہے۔

اور حوت دو مچھلیوں کی شکل میں ہے جو کہ آپس میں پشت اور پیٹ چمٹائے ہوئے [illegible] ہیں' ان میں سے ایک کو سمک مقدم کہتے ہیں جو جنوب کی طرف ہے اور یہ دونوں مچھلیاں [illegible] ستاروں سے مرکب ہیں' یہ برجوں کی شکلوں کے مختلف ہونے کا بیان ہے۔

[illegible] احکام کے مختلف ہونے کا بیان تو حمل' مریخ کا گھر' زہرہ کا وبال اور

آفتاب کا شرف ہے۔ انیسویں (۱۹) درجے میں ہے اور زحل کا ہبوط ہے۔ ہبوط کسی ستارے کا ایسے برج میں آنا ہے جس کا اثر نحوست ہو اور حمل کو برج مذکر' نہاری یعنی دن والا گرم خشک صفراوی' برج منقلب' ربیعی اور شمالی کہتے ہیں۔

اور ثور زہرا کا گھر' مریخ کا وبال' قمر کا شرف ہے۔ تیسرے درجے میں ہے اور اسے مؤنث' لیلی یعنی رات والا سرد' خشک' سوداوی اور ثابت شمار کرتے ہیں۔

اور جوزا عطارد کا گھر' مشتری کا وبال' راس کا شرف اور ذنب کا ہبوط ہے' اسے مذکر' نہاری' گرم وتر' دموی اور دو جسموں والا خیال کرتے ہیں۔

اور سرطان قمر کا گھر' زحل کا وبال' مشتری کا شرف' مریخ کا ہبوط' مؤنث' لیلی اور برج منقلب یعنی بدلنے والا ہے۔

اور اسد شمس کا گھر' زحل کا وبال ہے اور اس میں شرف اور ہبوط نہیں ہے اور ثابت یعنی قائم رہنے والا مذکر' نہاری' گرم وخشک اور صفراوی ہے۔

اور سنبلہ عطارد کا گھر' عطارد کا شرف' مشتری کا وبال' زہرہ کا ہبوط اور دو جسموں والا ہے اور مؤنث لیلی' سرد اور خشک اور سوداوی ہے۔

اور میزان زہرہ کا گھر' مریخ کا وبال' زحل کا شرف' آفتاب کا ہبوط' برج منقلب' مذکر' نہاری' گرم وتر اور دموی ہے۔

اور عقرب مریخ کا گھر' زہرہ کا وبال' قمر کا ہبوط' برج ثابت' مؤنث' سرد وتر اور بلغمی ہے۔

اور قوس مشتری کا گھر' عطارد کا وبال' ذنب کا شرف' راس کا ہبوط' دو جسموں والا' مذکر' نہاری' گرم' خشک اور صفراوی ہے۔

اور جدی' زحل کا گھر' قمر کا وبال' مریخ کا شرف' مشتری کا ہبوط' برج اور مؤنث ہے۔

اور دلو' زحل کا گھر' آفتاب کا وبال ہے اور اس سے کسی ستارے کو شرف اور ہبوط نہیں ہے اور برج ثابت ہے اس کی ہوا گرم اور تر' مذکر اور نہاری ہے۔

اور حوت' مشتری کا خانہ' عطارد کا وبال اور اس کا ہبوط' زہرہ کا شرف' مؤنث' لیلی'

سرد تر، بلغمی اور دو جسموں والا ہے۔

بہرحال ان برجوں کے ظاہر خواص اور احکام سے جو کہ عوام کے ذہنوں میں بہت روشن اور واضح ہیں، موسموں کا اختلاف ہے جس کے ضمن میں تمام جہان میں عزت و ذلت کا آگے پیچھے آنا اور باہم بدلنا رونما ہوتا ہے اور ہر سال میں یہ انقلاب برپا ہوتا ہے اور پھر دوسرے سال میں انہیں گزشتہ اطوار کے مطابق گم شدہ عزت اور معدوم ذلت پر لوٹتی ہے۔ پس یہ حالات کے بدلنے اور عزت کے ذلت اور ذلت کے عزت میں منقلب ہونے پر صریح دلیل ہوگی اور جب اس قسم کے ساتھ اس انقلاب کو ثابت فرمایا گیا جو کہ عوام و خواص کی نظر میں ہمیشہ مشہور اور محسوس ہے اب ایک عظیم انقلاب جو کہ واقع ہونے والا ہے اور عوام و خواص کی نظر سے پوشیدہ ہے اور نورِ نبوت علیٰ صاحبہا الصلوات والتحیات کی امداد کے بغیر کسی عقل مند کی عقل خود بخود اسے دریافت نہیں کر سکتی، کو بیان کرنے کے لیے ایک اور قسم یاد فرمائی جا رہی ہے۔

وَالْيَوْمِ الْمَوْعُوْدِ اور مجھے اس دن کی قسم ہے جس کا جزا کے لیے وعدہ کیا جا چکا ہے اور اس روز ایک زبردست انقلاب رونما ہوگا کہ آسمان، آسمانی برج اور زمین سب کے سب اس دن اس انقلاب سے متاثر ہوں گے اور ایک نئے جہان کی از سرِ نو بنیاد رکھی جائے گی اور اس جہان کی ظاہری عزت والوں کو اس روز انتہائی ذلت اور اس جہان کے کمزوروں کو اس جہان میں کمال عزت حاصل ہوگی۔

جزا کے لیے تین چیزیں ضروری ہیں

اور چونکہ اس دن جزا کے لیے وعدہ کیا گیا ہے، جزا پہنچانے کے لیے تین چیزوں کے بغیر چارہ نہیں۔ پہلی چیز جزا کا حق دار، دوسری چیز وہ حاکم جو کہ ہر کسی کو اس کے حق کے مطابق جزا دے اور تیسری چیز نیکی اور بدی کے وہ کام جن کے مطابق جزا دی جائے اور ان تینوں چیزوں کے بیان کے لیے کہ جس دن جمع ہوں گے، دو اور قسمیں بیان فرمائی گئی ہیں۔

وَشَاهِدٍ اور میں انسان، جن اور فرشتوں کی جنس سے ہر حاضر ہونے والے کی قسم اُٹھاتا ہوں کہ اس روز ایک جگہ جمع ہوں گے اور اتنا بڑا مجمع ترتیب پائے گا کہ اس کی مثال

خیال میں نہیں سماسکتی اور اس اجتماع کی وجہ سے جزا کا مقدمہ پورا ہو جائے گا کیونکہ مدعی علیہ اور سب محکموں کے گواہ موجود ہوں گے۔

وَمَشْهُوْدٍ اور میں اس کی قسم اُٹھاتا ہوں جس کے پاس حاضری ہوگی اور اس چیز کی بھی چند صورتیں ہیں۔ پہلی صورت اچھے بُرے عمل جو کہ شخص قبر سے اُٹھتے اور زندہ ہوتے ہی نمودار ہوں گے اور ہر شخص کے ہمراہ ہوں گے۔

دوسری صورت مختلف اچھی اور ڈراوٗنی شکلوں میں انعام دینے اور عذاب دینے کے لیے فرشتے ظاہر ہوں گے اور ساتوں آسمانوں والے' عرش اُٹھانے والے اور اعمال لکھنے والے تمام فرشتے آدمی کی نظر میں بے حجاب ظاہر ہوں گے۔

تیسری صورت: ہر کسی کو اعمال نامے دیئے جائیں گے تاکہ مطالعہ کریں۔

چوتھی صورت: ترازو حاضر کرنے کے وقت اعمال کا وزن صاف کھل جائے گا۔

پانچویں صورت: تجلی الٰہی جو کہ اس دن کی حاکم ہے' بے پردہ ظاہر ہوگی۔

چھٹی صورت: جنت اور دوزخ جو کہ اس جہان میں پوشیدہ ہیں' زینت و آرائش اور ہولناکیوں اور شدتوں کے ساتھ ظاہر ہوں گے۔

اور ان چھ امور کے کھل جانے کی وجہ سے آدمی کے جسم و جان میں بلکہ تمام عالم میں ایک عمدہ انقلاب رونما ہوگا۔

شاہد اور مشہود کی تفسیر میں اختلاف

اور شاہد و مشہود کی تفسیر میں بہت اختلاف ہے جو کچھ ذکر ہوا' معتبر صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے منقول ہے جیسے حضرت عبداللہ بن عباس' حضرت امام حسن' ضحاک' مجاہد اور ابن المسیب رضی اللہ تعالیٰ عنہم لیکن امام بغوی کی معالم التنزیل اور حدیث پاک کی دوسری معتبر کتابوں میں حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے مروی ہے کہ شاہد سے مراد جمعہ کا دن ہے کہ ہر اس شہر اور ہر اس مسجد میں کہ جہاں جمعہ شریف پڑھا جاتا ہے اس دن کی برکتیں حاضر ہوتی ہیں جبکہ مشہود سے مراد روز عرفہ ہے کہ حج کرنے والے اس دن اطراف و اکناف عالم سے حج کے انوار حاصل کرنے کے لیے ایک خاص

مکان میں اکٹھے ہوتے ہیں تو گویا وہ دن اسی مکان میں سکونت پذیر ہے کہ لوگ اس کے مشتاق ہو کر اس کے پاس پہنچتے ہیں۔

اور سابقہ معرف بلام قسموں کے برخلاف شاہد اور مشہود کو نکرہ لانے کی وجہ یہی ہے کہ روزِ جمعہ اور روزِ عرفہ ایک فرد میں منحصر نہیں ہیں' تکرار سے وارد ہوتے ہیں۔ بخلاف روزِ قیامت' آسمان اور آسمانی برجوں کے کہ ان میں تکرار نہیں۔

روزِ جمعہ اور روزِ عرفہ کی فضیلت

اور حدیث پاک میں وارد ہے کہ وہ بہتر دن جس میں سورج طلوع ہوتا ہے' جمعہ کا دن ہے اس میں آدم علیہ السلام کو پیدا کیا گیا۔ اسی دن میں انہیں جنت میں داخل کیا گیا۔ اسی دن میں انہیں زمین پر اُتارا گیا اور اسی دن میں قیامت قائم ہوگی اور اسی دن میں اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام کی توبہ کو شرفِ قبولیت بخشا۔

نیز وارد ہے کہ جمعہ کے دن ایک ایسی ساعت ہے کہ اگر کوئی مسلمان اس ساعت کو اچھے مقصد کے حصول کے لیے بارگاہِ خداوندی میں دعا و التجا میں بسر کرے تو اس کا مقصد پورا ہو جائے۔ نیز وارد ہے کہ اکثروا الصلوۃ علی یوم الجمعۃ یعنی مجھ پر جمعہ کے دن درود شریف کی کثرت کرو کہ وہ متبرک دن ہے۔

نیز حدیث پاک میں ہے کہ اللہ تعالیٰ عرفہ کے دن فرشتوں سے فرماتا ہے کہ میرے بندوں کو دیکھو کہ خاک آلود اور پریشان بالوں کے ساتھ دُور دُور سے میرے گھر کا حج کرنے آئے ہیں' تم گواہ رہو کہ میں نے انہیں بخش دیا اور اس دن بخشش الٰہی کو عام دیکھ کر شیطان چیخ و پکار کرتا ہے اور اپنے سر پر مٹی ڈالتا ہے اور اس دن کا روزہ گزشتہ اور آئندہ دو سال کے گناہوں کا کفارہ ہے۔

نیز حدیث شریف میں ہے کہ ایک ہفتے کے دِنوں میں بہترین جمعہ کا دن ہے جبکہ سال کے دِنوں میں بہترین عرفے کا دن ہے یعنی ذوالحجہ کی نو (۹) تاریخ اور اگر دونوں جمع ہو جائیں تو نور علی نور ہو جائے اور ان دونوں دِنوں میں بھی ایک قسم کا انقلاب ہے اس لیے کہ جمعہ کا دن ہماری شریعت میں ہفتے کی ابتدا ہے جبکہ عرفہ کا دن عبادتِ کبریٰ جو کہ خانہ کعبہ کا

حج ہے' کے ساتھ سال کی عبادات کی انتہا ہے۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ ہر وہ دن جس میں عظیم اجتماع واقع ہو اور لوگ کافی تعداد میں کوئی مہم سرانجام دینے یا کوئی برکت حاصل کرنے کے لیے اکٹھے ہوں' مشہود ہے اور اس دن کے حاضرین شاہد اور اس تفسیر پر مشہود روزِ جمعہ' روزِ عرفہ' دونوں عیدوں' یومِ ترویہ یعنی آٹھویں ذوالحجہ اور اجتماعات کے دوسرے دِنوں کو شامل ہے۔

اور اربابِ تفسیر کے ایک گروہ نے شاہد و مشہود کو مشہود بمعنی حضور سے نہیں لیا ہے بلکہ شہادت سے قرار دیا ہے جو کہ گواہی کے معنوں میں ہے اور اس صورت میں شاہد اور مشہود چند چیزیں ہیں۔ اوّل ذات حضرت حق جل شانہ چنانچہ حضرت سالم بن عبداللہ رضی اللہ عنہما نے فرمایا ہے کہ شاہد خدا ہے اور مشہود مخلوق' وَكَفٰى بِاللّٰهِ شَهِيْدًا اور سعید بن جبیر رضی اللہ نے فرمایا ہے کہ شاہد خدا ہے اور مشہود به توحید' شهد الله انه لا اله الا الله

دوسری چیز یہ کہ شاہد انبیاء علیہم السلام ہیں اور مشہود علیہ اُمتیں۔ قال الله تعالیٰ فَكَيْفَ إِذَا جِئْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ بِشَهِيْدٍ

تیسری چیز یہ کہ شاہد اعمال لکھنے والے فرشتے ہیں اور مشہود علیہ مکلفین۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: وجاء ت كل نفس معا سائق وشهيد

چوتھی چیز یہ کہ شاہد آدمی کے اعضاء ہیں اور مشہود علیہ آدمی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا:
يَوْمَ تَشْهَدُ عَلَيْهِمْ أَلْسِنَتُهُمْ وَأَيْدِيهِمْ وَ أَرْجُلُهُم

پانچویں چیز یہ کہ شاہد دن اور رات ہے اور مشہود بہ بنی آدم کے اعمال۔ چنانچہ امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ مامن يوم الا و ينادى انى يوم جديد وانى على مايعمل في شهيد یعنی ہر روز ندا دیتا ہے کہ میں نیا دن ہوں اور مجھ میں جو عمل کیا جائے گا اس پر گواہ ہوں۔

چھٹی چیز یہ کہ شاہد آسمان اور زمین ہے کہ آسمان کا ہر ٹکڑا اور جو کچھ نیکی اور بُرائی سے اس کے نیچے واقع ہے اور اسی طرح زمین کا ہر خطہ اور جو کچھ نیکی اور بُرائی سے اس کے اوپر واقع ہے' قیامت کے دن گواہی دیں گے اور مشہود بہ وہ اچھے اور بُرے کام ہیں جو کہ آسمان

کے نیچے اور زمین کے اوپر واقع ہوتے ہیں۔

ساتویں چیز یہ کہ شاہد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات پاک ہے اور آپ کی اُمت جبکہ مشہود علیہ دوسری اُمتیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَكَذٰلِكَ جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا۔

آٹھویں چیز یہ کہ امام رازی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ شاہد تمام ممکنات ہیں اور مشہود لہ واجب الوجود کی ذات پاک، کہ ذرات عالم میں سے ہر ذرہ اللہ تعالیٰ کی ذات اور صفات کے وجود پر گواہ ہے اور اسی تفسیر کے مطابق اہلِ کلام کی اصطلاح ہے کہ غائب کا شاہد پر قیاس درست نہیں ہے جبکہ شاہد سے غائب پر دلیل لی جا سکتی ہے۔

نویں چیز یہ کہ شاہد حجر اسود ہے اور مشہود لہ حج کرنے والے اس لیے کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ الحجر الاسود يمين الله في الارض يجيئ يوم القيامة له عينان يبصر بهما ولسان ينطق به ويشهد على من استلمه بحق یعنی حجر اسود زمین میں اللہ سبحانہ وتعالیٰ کا دستِ قدرت ہے، قیامت کے دن آئے گا، اس کی دو آنکھیں ہوں گی جن سے دیکھے گا اور زبان ہوگی جس سے بولے گا اور ہر اس شخص کے متعلق گواہی دے گا جس نے اسے حق کے ساتھ چوما۔

دسویں چیز یہ کہ حضرات صوفیہ قدس اسرارہم نے فرمایا ہے کہ اجلاء یعنی جلوہ گر ہونے کے مقام میں شاہد حق ہے اور مشہود خلق جبکہ طلب جلوہ کے مقام میں شاہد خلق اور مشہود حق۔

بہر حال یہ چیزیں جن کا ذکر ہوا، اپنی عظمت و شرافت کی وجہ سے اس قابل ہیں کہ ان کی قسم اُٹھائی جائے اور حاصل کلام یہ ہے کہ انقلاب احوال پر بھی دلالت کرتی ہیں اور بعض معنوں کے اعتبار سے انہیں نکرہ لانا اور مبہم رکھنا بھی ان سے مناسبت رکھتا ہے۔

جواب قسم میں اختلاف

اور ان قسموں کے جواب کے تعین میں مفسرین کا بہت اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ان قسموں کا جواب لام اور قد کے مقدر ماننے کے ساتھ قتل اصحاب الاخدود ہے اور بعض کہتے ہیں کہ کلام تقدیم و تاخیر پر مبنی ہے یعنی قتل اصحاب الاخدود والسماء

ذات البروج اور حضرت ابن مسعود اور قتادہ رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ اس قسم کا جواب اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ہے اور اس کے درمیان جو کچھ ذکر فرمایا گیا ہے جملۂ معترضہ کا حکم رکھتا ہے اور صاحبِ کشاف اور بعض متقدمین نے یوں اختیار فرمایا ہے کہ قسم کا جواب محذوف ہے یعنی لعن من یوذی المومنین لایمانھم کما لعن اصحاب الاخدود یعنی اس پر لعنت ہو جو ایمان کی بناء پر ایمان والوں کو ستائے جیسا کہ اصحابِ اخدود پر لعنت ہوئی۔

اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ قسم کا جواب اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ ہے جبکہ قتل اصحاب الاخدود کو چاروں قسموں کے بعد اس مضمون پر بطورِ گواہی لانے کے درمیان میں لایا گیا ہے تا کہ عقلی دلائل، نقلی دلائل کے ساتھ مل کر پوری قوت سے مقصد کو ثابت کریں۔ نیز ان قسموں سے مطلقاً عالم کا انقلاب اور ظالم سے انتقام دنیا میں دائرۂ نحوست آنے کے وقت اور یومِ موعود میں گواہوں کے قائم کرنے اور مشہود بہ کے ظاہر کرنے کا وقت ثابت ہوتا ہے اور اس واقعہ سے خصوصیت کے ساتھ یہ مقصد ایمان والوں کی امداد کے بارے میں وضاحت کے ساتھ انجام پاتا ہے۔ پس یہ واقعہ لا نابات کی مقصدیت کو پورا کرنے اور عام کو خاص پر نازل کرنے کے لیے ہے کہ مقاصد کے اندازے کے لیے اس سے چارہ نہیں۔ گویا یوں فرمایا جا رہا ہے کہ مسلمانوں پر ظلم کرنے والوں سے دنیا میں بھی اور آخرت میں بھی گواہ لانے اور حق ثابت کرنے کے بعد انتقام واقع ہونے والا ہے جیسا کہ ماضی میں بھی واقع ہوا کہ

قُتِلَ اَصْحَابُ الْاُخْدُوْدِ خندق والوں کا قتلِ عام کیا گیا جس کا طول چالیس چالیس (۴۰،۴۰) گز اور عرض بارہ بارہ (۱۲،۱۲) گز تھا تا کہ مسلمانوں کو ان خندقوں میں ڈالیں اور عذاب دیں اور وہ خندقیں اس حد تک گرم تھیں کہ

اَلنَّارِ ذَاتِ الْوَقُوْدِ وہ ساری خندق ایک زبردست شعلوں کی آگ تھی یا بے پناہ ایندھن والی آگ جسے اس میں ڈال کر بہت زیادہ بھڑکایا گیا تھا اور حدیث شریف میں ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سورۃ کی تلاوت میں اس آیت پر پہنچتے تو فرماتے اَعُوْذُ بِاللّٰهِ مِنْ جهد البلاء اور خندق والوں کا یہ قتلِ عام جو واقع ہوا، ایک فوری اور جلدی

انتقام تھا جو کہ مسلمانوں کو اس میں ڈالنے کے بعد آگ کے بھڑکنے اور اس کے چنگاروں کے منتشر ہونے کی وجہ سے فی الفور ہلاک ہو گئے اور انہیں اپنے گھروں کو لوٹنے کی مہلت بھی نہ ملی اس لیے کہ یہ انتقام اس وقت رونما ہوا کہ

اِذْهُمْ عَلَيْهَا قُعُوْدٌ جبکہ وہ خندقوں والے اس آگ کے کنارے بیٹھے تھے اس سے پہلے کہ کرسیوں سے اُٹھیں اور گھروں کو جائیں' جل گئے اور انہوں نے تھوڑی سی مہلت بھی نہ پائی اور اس قسم کا فوری انتقام زیادہ تر عوام کی نظر میں عبرت کا باعث ہوتا ہے اور فی الواقع اس گروہ نے ظلم کرنے میں انتہائی بے دردی کا مظاہرہ کیا اور اس فوری انتقام میں گرفتار ہوئے اس لیے کہ اور ظالم اپنے سامنے کسی کی پٹائی نہیں کراتے بلکہ پیادوں اور جیل کے نوکروں کو حکم دیتے ہیں کہ مجرموں کو سزا دیں تاکہ خلاف مروت اور جنسیت کے تقاضے کی مخالفت نہ ہو۔

وَهُمْ عَلٰى مَا يَفْعَلُوْنَ بِالْمُؤْمِنِيْنَ شُهُوْدٌ اور یہ ظالم جو کہ خندقوں والے تھے' ایمان والوں کے ساتھ جو سلوک کر رہے تھے' بذاتِ خود وہاں حاضر تھے۔

اصحابِ خندق کے واقعات کا بیان

یہاں جاننا چاہیے کہ اصحابِ خندق کا واقعہ کہ جنہوں نے دین اور ایمان کی وجہ سے لوگوں کو آگ سے بھری ہوئی اس خندق میں ڈالا تھا اور خود بھی کسی فرصت کے بغیر فوری انتقام میں گرفتار ہو کر جہنم کا ایندھن بن گئے' حجاز کے علاقے کے قریب چار سمتوں پر واقع ہوا ہے۔ احتمال ہے کہ اس آیت سے چاروں ہی مراد ہوں اور اہلِ مکہ کو ڈرانا پیش نظر ہے تاکہ خود کو معلوم ان واقعات سے عبرت پکڑیں اور مسلمانوں کو ستانے میں بے دردی نہ کریں۔

پہلا واقعہ

جو کہ شام کے ملک میں رونما ہوا اس کی کیفیت صحیح حدیث شریف میں جو کہ مسلم اور دوسری صحاح میں حضرت صہیب رومی رضی اللہ عنہ کی روایت سے وارد ہوئی' یوں ہے کہ اس ملک میں ایک طاقت ور بادشاہ تھا اس کے پاس ایک جادوگر تھا جو کہ جادو کے فن میں پوری مہارت رکھتا تھا۔ اور اس بادشاہ کی بادشاہی کے کام کی بنیاد اس جادوگر کے جادو پر تھی جب

بھی اس کے ملک میں کوئی مخالف پیدا ہوتا' وہ جادوگر اسے جادو کے ساتھ ہلاک کر دیتا اور جنگ اور لڑائی کی ضرورت نہ پڑتی اور مملکت کے امراء اور افسران جب بھی بادشاہ اور اس کی حرکات سے بددل ہوتے' وہ جادوگر جادو کے زور سے ان کے دِلوں کو رام کر لیتا۔ علیٰ ہذا القیاس تمام مہمات میں اس کا جادو کارگر ہوتا۔ یہاں تک کہ جادوگر بوڑھا ہو گیا اور زندگی سے مایوس ہو گیا۔ اس نے بادشاہ سے کہا کہ میں بوڑھا ہو گیا ہوں اور قریب ہے کہ میں اس جہان سے چلا جاؤں' اپنے غلاموں میں سے ایک ہونہار اور ہوشیار لڑکا میرے سپرد کر دیجیے تا کہ میں اسے جادو کی تعلیم دوں تا کہ میرے بعد آپ کی مملکت کا کام کاج وہ لڑکا سرانجام دے۔

بادشاہ نے اپنے غلاموں میں سے ایک عقل مند لڑکا مقرر کر دیا کہ صبح سے شام تک جادوگر کے پاس حاضر رہے اور جادو کا فن سیکھے۔ اس لڑکے نے ہر روز جادوگر کے ہاں آمدورفت شروع کر دی اور جادو کا فن سیکھنا شروع کر دیا۔ اتفاقاً ایک دن اس نے راستے میں دیکھا کہ بہت سے لوگ ایک گھر سے نکل رہے ہیں' پوچھا کہ اس گھر میں کیا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ اس گھر میں ایک راہب ہے یعنی عبادت گزار جو کہ دنیا چھوڑ کر خدا تعالیٰ کی عبادت میں مشغول ہے۔ وہ لڑکا بھی راہب کے گھر میں آیا اور اس کی خدمت میں بیٹھ گیا اور اس کی گفتگو سُنی۔ راہب کے کلام نے اس کے دل میں اثر کیا اور اس گفتگو کی محبت اس کا باعث ہوئی کہ جب بھی بادشاہ کے محل سے جادوگر کے گھر جاتا' راستے میں راہب کے پاس بیٹھ جاتا اور کبھی دیر تک بیٹھنے کی وجہ سے جادوگر اسے ڈانٹ ڈپٹ کرتا کہ تو نے دیر کیوں کی؟ وہ کہتا کہ مجھے گھر میں دیر ہو گئی۔ اور جب جادوگر نے یہ ماجرا بادشاہ سے کہہ دیا تو بادشاہ نے پابندی لگا دی کہ اس لڑکے کو علی الصبح جادوگر کے ہاں بھیجا جائے۔ لوگوں نے عرض کی کہ یہ لڑکا یہاں سے تو علی الصبح چلا جاتا ہے۔ اگر اسے کوئی تاخیر ہوتی ہے تو راستے میں ہوتی ہے' گھر میں نہیں۔ بادشاہ اور جادوگر دونوں ہی یہ بات سُن کر اس لڑکے پر ناراض اور پریشان ہوئے اور انہیں معلوم ہوا کہ وہ راستے میں بچوں کے کھیل کود میں مشغول رہتا ہے۔

یہاں تک کہ ایک دن جبکہ یہ لڑکا جادوگر کے گھر سے شاہی محل کی طرف لوٹ رہا تھا'

اس نے دیکھا کہ سرراہ ایک بہت بڑا اژدہا گلی روکے بیٹھا ہے اور راستے بند ہونے کی وجہ سے لوگ کھڑے ہیں اس لڑکے نے دل میں سوچا کہ آج آزمائش کروں کہ مجھے جادوگر کی صحبت بہتر ہے یا گوشہ نشین راہب کی۔ اس نے ایک پتھر اُٹھایا اور کہا اے خدایا! اگر گوشہ نشین راہب کا دین و مذہب جادوگری اور جادوگر سے بہتر ہے تو اس اژدہا کو ہلاک فرما تا کہ لوگ خلاصی پائیں اور وہ پتھر اس اژدہے کی طرف پھینک دیا۔ وہ پتھر لگتے ہی اژدہا مر گیا اور لوگوں میں شور برپا ہو گیا کہ یہ لڑکا جادو میں کمال کے مرتبے کو پہنچ گیا۔ اور رفتہ رفتہ یہ خبر اس گوشہ نشین نے بھی سُن لی اس نے تنہائی میں لڑکے سے کہا کہ اے بیٹے! تجھے حق تعالیٰ نے بزرگ بنا دیا اور تیرا کام وہاں تک پہنچے گا کہ میں جانتا ہوں لیکن تو ایک مصیبت میں گرفتار ہوگا۔ خبردار میرا پتہ نشان نہ دینا' لڑکے نے مذکور گوشہ نشین کے ساتھ پختہ قول قرار کیے کہ میں آپ کا نام بالکل نہیں لوں گا اور آپ کا پتہ نہیں دوں گا' مطمئن رہیں۔

اللہ تعالیٰ نے لڑکے کو اس گوشہ نشین کی صحبت' انجیل مقدس کی تلاوت جو کہ اس نے اس سے سیکھی تھی اور دینِ عیسوی کی پیروی کہ اس وقت حقیقت اسی دین میں منحصر تھی' کی برکت سے ولایتِ عظمیٰ کے مرتبے تک پہنچا دیا۔ یہاں تک کہ پھلبہری والے اور مادرزاد اندھے کو اس کے ہاتھ کی برکت سے شفا ہو جاتی اور بے شمار بیماروں کو جن کے علاج سے طبیب عاجز آجاتے اس لڑکے کی دعا سے تندرستی نصیب ہو جاتی۔

اتفاقاً بادشاہ کے مصاحبوں میں سے ایک اندھا ہو گیا اور اندھے پن کی وجہ سے وہ بادشاہ کی صحبت سے محروم ہو گیا۔ اس لڑکے کی تعریف و توصیف سُن کر اس کے پاس آیا' نذریں اور ہدیے لایا اور بولا کہ مجھ پر توجہ کیجیے اور شفا دیجیے۔ لڑکے نے کہا کہ میں کیا ہوں کہ تجھے شفا دے سکوں' شفا تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ اگر تو خدا تعالیٰ پر ایمان لے آئے اور بت پرستی چھوڑ دے اور بادشاہ کو اپنا پروردگار نہ جانے تو میں دعا کروں گا تا کہ تجھے شفا حاصل ہو۔ وہ شخص اسی مجلس میں مشرف بہ ایمان ہو گیا اور اس لڑکے کی دعا سے فی الفور بینائی درست ہو گئی۔ اور وہ معمول کے مطابق بادشاہ کی مجلس میں حاضر ہوا' بادشاہ نے بہت تعجب کیا اور کہا کہ سرکاری طبیب اور ہمارے ماہرین تیری آنکھوں کے علاج سے عاجز ہو گئے تھے تو

کیسے بینا ہو گیا؟ اس نے کہا کہ میرے پروردگار نے اسباب کی وساطت کے بغیر مجھے بینا کر دیا۔ بادشاہ بولا کیا کوئی میرے سوا تیرا پروردگار ہے؟ مصاحب نے کہا کہ میرا پروردگار اور تیرا پروردگار حضرت خدا تعالیٰ ہے۔

بادشاہ بہت خفا ہوا اور اس کی پٹائی شروع کر دی کہ تو نے یہ عقیدہ کس سے سیکھا؟ جب سخت تکلیف ہوئی تو ناچار اس نے لڑکے کا نام لے دیا۔ بادشاہ نے لڑکے کو اپنے سامنے طلب کیا اور بولا کہ تجھے میری پرورش اور میرے جادوگر کے فیض سے یہ مقام ملا ہے کہ تو نابینے کو بینا کرتا ہے اور ہر مرض کو شفا دیتا ہے' یہ کیا ناشکری ہے کہ تو نے ہماری پرورش کو ایک طرف کر کے اپنا پروردگار کوئی اور قرار دے لیا ہے؟ لڑکے نے کہا کہ شفا میرے ہاتھ میں ہے نہ تمہارے جادوگر کے ہاتھ میں۔ صرف خدا تعالیٰ کی قدرت ہے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ لڑکے کو سخت عذاب دیا جائے اور کہنے لگا کہ یہ لڑکا جو کہ جادوگر سے غائب رہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ اس نے یہ عقیدہ کسی اور جگہ سے حاصل کیا ہے۔ جادوگر بھی یہ ماجرا سنتے ہی گرتا پڑتا بادشاہ کے دربار میں پہنچا اور کہنے لگا کہ یہ لڑکا ایک مدت سے میرے پاس نہیں آتا' معلوم نہیں کہاں جاتا ہے اور درباری نوکروں نے بھی کہا کہ یہ بچہ صبح نکل جاتا ہے اور گھر میں نہیں رہتا۔

بادشاہ نے حکم دیا کہ اس لڑکے کو مختلف قسم کی سزائیں دے کر پوچھو کہ اس نے یہ عقیدہ کہاں سے سیکھا ہے؟ اس لڑکے نے عذاب کی شدت سے بے چین ہو کر اس گوشہ نشین کا نام لے دیا۔ بادشاہ نے اس گوشہ نشین کو بلوا کر آرہ بھی دربار میں منگوا لیا اور کہنے لگا کہ اگر تو اپنے دین سے نہ پھرا تو تیرے سر پر آرہ چلا دوں گا۔ راہب نے کہا کہ میں اس دین سے پھرنے والا ہرگز نہیں' بادشاہ کی جو مرضی ہو کرے۔ بادشاہ نے حکم دیا' لوگوں نے اس کے سر پر آرہ رکھا اور اسے دو ٹکڑے کر کے پھینک دیا پھر اس مصاحب کو بھی راہب کے دین سے روگردانی کا حکم دیا۔ اس نے بھی انکار کیا اس کے سر پر بھی آرہ چلا کر چیر دیا گیا۔ پھر اس لڑکے کو لایا گیا۔ بادشاہ نے کہا کہ تو نے ان دونوں کی سزا دیکھ لی اب اگر اپنی زندگی چاہتا ہے تو اس دین سے بے زار ہو جا۔ لڑکے نے بھی انکار کر دیا' بادشاہ نے اپنے چند معتمد لوگوں کو حکم دیا

کہ اسے فلاں بلند پہاڑ پر لے جاؤ اور پہاڑ کی چوٹی پر کھڑا کر دو اگر اس دین سے پھر جائے تو میں اسے اپنی امارت اور مصاحبت کے مرتبے پر فائز کر دوں گا اور اگر اصرار کرے تو اس چوٹی سے نیچے پھینک دو تا کہ اس کے جسم کے اجزا پاش پاش ہو جائیں۔

جب لڑکے کو اس پہاڑ کی چوٹی پر لے گئے تو اس نے دربارِ خداوندی میں دعا کی کہ بارِ خدایا! تو جیسے چاہے ان کے شر سے مجھے بچا' پہاڑ میں شدید زلزلہ پیدا ہوا' بادشاہ کے تمام معتمد نیچے گر پڑے اور مر گئے۔ وہ لڑکا بادشاہ کے دربار میں صحیح و سالم پہنچ گیا' بادشاہ نے پوچھا کہ تیرے ساتھیوں کو کیا ہوا؟ لڑکے نے کہا کہ اسی خدا تعالیٰ نے جس کا میں نے دین قبول کیا ہے' مجھے ان کے شر سے بچا لیا۔ بادشاہ زیادہ غضب ناک ہوا اور اس نے اپنے دیگر معتمدوں کو حکم دیا کہ اس لڑکے کو کشتی میں بٹھا کر سمندر میں لے جاؤ اگر اپنے اس دین سے پھر جائے تو درست۔ ورنہ اسے سمندر میں پھینک دینا جب وہ سمندر کے اندر پہنچے تو اسے مرتد ہونے کا حکم دیا' لڑکے نے بارگاہِ خداوندی میں دعا کی کہ بارِ خدایا! مجھے اس گروہ کے شر سے بھی محفوظ فرما۔ اچانک کشتی اُلٹ گئی اور بادشاہ کے معتمد سب کے سب غرق ہو گئے اور لڑکا صحیح و سالم پھر بادشاہ کے دربار میں پہنچ گیا۔ بادشاہ نے پوچھا کہ اب تو کیا کر آیا؟ لڑکے نے سارا واقعہ بیان کر دیا' بادشاہ حیران رہ گیا۔

لڑکے نے کہا کہ اگر بادشاہ کا دِلی ارادہ مجھے قتل کرنے کا ہے تو ایک حیلے کے بغیر ممکن نہیں۔ بادشاہ نے کہا کہ بتاؤ! لڑکے نے کہا کہ اس کا حیلہ یہ ہے کہ اس شہر کے تمام لوگوں کو شہر سے باہر ایک میدان میں جمع کیا جائے اور مجھے پھانسی پر لٹکائیں اور اپنے ترکش سے ایک تیر نکال کر اس کا منہ کمان کے چلّے پر رکھ کر یہ کلام پڑھیں۔ بسم اللّٰہ رب الغلام یعنی اس خدا کے نام کے ساتھ جو کہ اس لڑکے کا پروردگار ہے پھر وہ تیر میری طرف چھوڑ دیں' میں قتل ہو جاؤں گا۔ بادشاہ نے یونہی کیا اور وہ تیر لڑکے کی کنپٹی میں لگا اس نے اپنا ہاتھ وہاں رکھا اور بولا کہ میں نے اپنا مطلب پا لیا کہ اپنے پروردگار کے نام پر ذبح ہوا ہوں اور لوگوں سے شور اُٹھا کہ آمنا برب الغلام' آمنا برب الغلام یعنی ہم اس لڑکے کے رب پر ایمان لائے۔

بادشاہ کو اس کے مصاحبوں نے کہا کہ اس مقدمے میں بہت خرابی واقع ہو گئی اور ہم جس چیز سے ڈرتے تھے' وہی رونما ہوئی اس لیے کہ شہر کے سب لوگوں نے لڑکے کے رب کو تم سے زیادہ قوی اور قدرت والا مان لیا اور تمہاری عاجزی دیکھ لی کہ جب تک آپ نے اس کے پروردگار کا نام نہیں لیا اس کے قتل پر قادر نہیں ہوئے۔ بادشاہ کے غصہ اور شرمندگی میں مزید اضافہ ہوا اور اس نے حکم دیا کہ شہر کے کوچوں کے شروع میں خندقیں کھودی جائیں اور ان میں آگ جلائی جائے اور جو بھی اس لڑکے کے دین سے روگردانی نہ کرے' اسے خندق میں ڈال دیں اور بادشاہ اور تمام ارکانِ سلطنت خندق کے پاس کرسیاں ڈالے اس عذاب کا تماشا کر رہے تھے حتیٰ کہ ایک عورت کو پکڑ کر لائے جس کی گود میں شیر خوار بچہ تھا' انہوں نے اس عورت کو بھی اس آگ میں پھینکنا چاہا' وہ عورت آگ میں جانے سے ڈر گئی اور اپنا پاؤں پیچھے کر لیا۔ بادشاہ نے کہا کہ اس عورت کو مہلت دو' ہو سکتا ہے کہ اپنے دین سے پھر جائے۔ شیر خوار بچہ جو کہ اس کی گود میں تھا' بلند آواز سے بولنے لگا جسے ہر عام و خاص نے سنا کہ اے بے سمجھ ماں! تو کیا کر رہی ہے' صبر کر کہ تو سچے دین پر ہے' بات اتنی سی ہے کہ آنکھیں بند کر کے آگ میں گھس جا' یہ آگ تجھ پر گل و گلزار بن جائے گی۔ وہ عورت بے دھڑک اپنے بچے کے ہمراہ آگ میں چلی گئی اور آگ ایک دم اس طرح بھڑکی اور اس سے اس طرح چنگارے نکلے کہ بادشاہ اور اس کے ارکانِ سلطنت جو کہ کرسیوں پر بیٹھے تماشہ دیکھ رہے تھے' اُٹھنے نہ پائے اور بھسم ہو گئے اور ہر خندق کی آگ میں اسی طرح کا زبردست اشتعال پیدا ہوا اور شہر کے اکثر لوگ جو کہ بادشاہ کی پیروی میں ایمان والوں کو ستانے اور انہیں جلانے میں مصروف تھے' خود جل گئے اور ہلاک ہو گئے۔

حضرت ربیع بن انس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کی جان کو جنہیں آگ میں ڈالا جا رہا تھا' ان کے جسموں کو آگ کی تپش پہنچنے سے پہلے ہی قبض فرما لیتا تھا اور جنت میں داخل کر دیتا تھا۔

اس واقعہ میں حضرت شیخ اکبر رحمۃ اللہ علیہ کی نکتہ آفرینی

اور اس واقعہ میں ایک باریک نکتہ ہے جس کا حضرت شیخ اکبر اور ان کے پیروکاروں

نے سراغ لگایا ہے اور وہ یہ ہے کہ بادشاہ کے ہاتھوں لڑکے کا قتل دنیوی انتقام کی بناء پر تھا کہ وہ راہب کے ساتھ قول وقرار کر کے اس سے پھر گیا تھا ورنہ بادشاہ اس لڑکے پر قابو نہ پاتا اور دنیوی انتقام کا ایک پروگرام اخروی انتقام سے جداگانہ ہے اس لیے کہ دنیوی انتقام میں اس قسم کے واقعات میں دربارِ خداوندی سے کوئی عتاب یا ناراضگی نہیں ہوتی بلکہ یہ اہلِ کمال کے درجات میں ترقی کے باعث ہوتا ہے بخلاف اخروی انتقام کے۔ چنانچہ حضرت سید الشہداء حمزہ رضی اللہ عنہ کو حضرت امیر المومنین مرتضٰی علی کرم اللہ وجہہ کی اونٹنیاں ذبح کرنے' ان کے جگر پھاڑنے اور ان کے کباب کھانے کے بارے میں ایسا ہی واقعہ رونما ہوا کہ خود شہید بھی ہوئے اور کفار نے آپ کا سینہ چاک کیا' جگر کو نکال کر چبایا اور پھینک دیا اور اس پر اسرار مقام کی تفصیل فتوحات مکیہ میں موجود ہے۔

دوسرا عجیب واقعہ

جو کہ یمن کے ایک شہر نجران کی سرزمین میں واقع ہوا' اس کی کیفیت یوں ہے کہ مسلمانوں میں سے جو کہ اس وقت انجیل کے پیروکار تھے' ایک آدمی ایک شخص کے گھر آ کر نوکر ہو گیا' وہ اس کے دروازے پر بیٹھا رہتا تاکہ صاحبِ خانہ جس کام کا حکم دیں' بجا لائے اور اس دوران وہ انجیل مقدس کی تلاوت کرتا رہتا جس شخص کا یہ مسلمان نوکر تھا' اس کی لڑکی کو یوں معلوم ہوا کہ انجیل کے تلاوت کے وقت اس کے سینے سے ایک عظیم نور نکلتا ہے اور جہان میں پھیل جاتا ہے۔ بیٹی نے اپنے باپ کے سامنے اس عجیب امر کا ذکر کیا اس کے باپ نے بھی انجیل کی تلاوت کے وقت سوراخ میں سے دیکھا کہ فی الواقع نورِ عظیم ظاہر ہوا اس نے اس نوکر سے پوچھا کہ یہ کیا کلام ہے اور کیا اثر ہے جو میں تجھ سے سنتا اور دیکھتا ہوں؟ وہ مسلمان آدمی وہاں کے بادشاہ اور رئیسوں کی قوت اور دبدبہ پر نظر کرتے ہوئے اسے چھپانے کی کوشش کرتا تھا اور وہ شخص اس کا پیچھا کر کے اسے تنگ کرتا' مجبور ہو کر اس نے دینِ اسلام اور انجیل مقدس کے حالات اس کے سامنے بیان کر دیئے اور وہ شخص اور اس کی لڑکی فی الفور مسلمان ہو گئے اور انجیل سیکھ کر تلاوت میں مشغول ہو گئے۔ رفتہ رفتہ اس شہر میں یہ بات مشہور ہو گئی اور دیگر ستاسی (۸۷) مرد اور عورتیں مسلمان ہو گئے حتیٰ کہ یوسف بن ذی نواس

حمیری نے جو کہ اس شہر کا بادشاہ تھا اور بت پرستی میں غرق تھا' یہ ماجرا سنا' ان سب مسلمانوں کو جن کی تعداد نوے (۹۰) تھی' اپنے دربار میں بلایا اور آگ سے پُر خندق تیار کی اور کہنے لگا کہ اگر تم دینِ عیسوی سے نہ پھرے تو تمہیں اس آگ میں ڈال دوں گا۔ ان لوگوں میں بھی ایک عورت شیر خوار بچے سمیت موجود تھی اس شیر خوار بچے نے بلند آواز سے کہا کہ آؤ بسم اللہ اس آگ میں کود جاؤ کیونکہ اس آگ کا پھل ہمیشہ کی جنت ہے۔ مسلمانوں کے آگ میں جانے کے بعد بادشاہ اور چند دوسرے رئیس جو کہ خندق کے کنارے کرسیوں پر براجمان تھے' آگ کے چنگاروں سے ہلاک ہو گئے اور یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا علیہم الصلوٰۃ والسلام کے آسمان پر اُٹھائے جانے سے بعد کا ہے اس کے بعد نجران کے لوگوں نے دینِ نصرانیت کو سچا جان کر قبول کر لیا۔ چنانچہ وہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے عہد مبارک تک اسی دین پر تھے اور ان کے سردار سید اور عاقب نامی مدینہ عالیہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زیارت کو آئے اور انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں بحث و تفتیش کی اور ان کے جواب میں آیۃ مباہلہ نازل ہوئی۔

تیسرا واقعہ

جو کہ سرزمینِ فارس میں واقع ہوا' اس کی کیفیت حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ آپ نے فرمایا کہ دراصل مجوسیوں کے پاس بھی ایک آسمانی کتاب تھی اور وہ ایک نبی کے دین کے پیروکار تھے اور چونکہ ان کے دین میں اتنی سی شراب جسمانی بہتری کے لیے حلال تھی جو بے ہوش نہ کرے۔ ایک دن مجوسیوں کے بادشاہ نے بہت سی شراب پی لی اور مستی کی حالت میں اپنی بہن سے بُرا کام کیا جب ہوش میں آیا' بہت نادم اور شرم سار ہوا اس نے اپنی بہن سے اس لاحق ہونے والی عار کی تدبیر پوچھی۔ بہن نے کہا کہ اس کی تدبیر یہ ہے کہ تو بہن کے حلال ہونے کا دعویٰ کر دے اور کہہ کہ حضرت آدم علیہ السلام کی اولاد میں بھائی اپنی بہن کے ساتھ نکاح کر لیتا تھا' ہم بھی اسی پرانی وضع پر قائم ہیں۔ بادشاہ نے لوگوں کو اکٹھا کر کے یہ مذہب اور یہ مسئلہ بیان کرنا شروع کر دیا۔ لوگوں نے اسے بالکل قبول نہ کیا۔ بادشاہ کی بہن نے کہا کہ انہیں کوڑے لگا' اس نے ایسا ہی کیا' وہ پھر بھی نہ

مانے۔ اس نے کہا کہ ان پر تلوار چلا۔ اس نے اسی طرح کیا مگر وہ نہ مانے۔ اس نے پھر کہا کہ حکم دے تا کہ آگ سے بھری ہوئی خندقیں تیار کریں اور جو شخص اس مسئلے کو قبول نہ کرے اس آگ میں ڈال دیں اس نے ایسا ہی کیا اور لوگوں کو آگ میں ڈالنے کے دوران خود بھی جل مرا اس کے بعد مجوسیوں کے مذہب میں بہن کو حلال جاننا رائج ہوا اور آتش پرستی کا بھی ان میں رواج ہو گیا۔

چوتھا واقعہ

امام زاہدی کی تفسیر میں منقول ہے کہ بنی اسرائیل میں مسلمانوں کا ایک شہر تھا' اس شہر میں قحط پڑ گیا اور مسلمان اس شہر سے گروہ در گروہ حبشہ کی طرف بھاگنے لگے۔ حبشیوں نے جو کہ کافر تھے' اس شہر کے بادشاہ سے کہا کہ یہ قحط زدہ مسلمان اس شہر میں آئیں گے تو ہم پر غلہ تنگ ہو جائے گا اور یہاں بھی قحط پڑ جائے گا۔ بادشاہ نے حکم دیا تا کہ شہر کے دروازے پر ایک خندق بنائی جائے اور اسے آگ سے پُر کر دیا گیا اور بادشاہ خود بھی اس خندق کے قریب اپنا تخت رکھ کر بیٹھ گیا اور وہاں ہاتھی کے جسم کے برابر ایک بہت بڑا بت نصب کیا اور منادی کرائی کہ پردیسیوں میں سے اس شہر میں جو بھی ہو گا اگر اس بت کو سجدہ نہ کرے' اسے آگ میں پھینک دیں۔ پردیسیوں میں سے ایک عورت کو پکڑ کر لایا گیا جس کی گود میں ایک بچہ تھا۔ اس عورت کو کہا گیا کہ بت کو سجدہ کر۔ اس نے کہا خدا کی پناہ! بادشاہ نے حکم دیا کہ اس کے بچے کو آگ میں پھینک دو' اس کے بچے کو آگ میں ڈال دیا گیا۔ ماں بے قرار ہو گئی اور بچے نے آگ میں سے آواز دی کہ اے ماں! ڈر نہیں تو بھی آگ میں آ جا کہ یہ آگ نہیں ہے' گل و گلزار ہے۔ عورت نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے اور عرض کی اے میرے خدا! تو دیکھتا اور جانتا ہے' تیرے حضور بیان کرنے کی ضرورت نہیں۔ آگ اس خندق سے اُچھلی اور چالیس (۴۰) گز ہوا میں اونچی نکل گئی اور کفار کے اردگرد پردوں کی طرف محیط ہو گئی اور سب کو جلا دیا۔

اور جب ان چاروں واقعات کی طرف اجمالی اشارے سے فراغت ہوئی اور یہ بیان فرمایا گیا کہ ان ظالموں سے دنیا میں مہلت کے بغیر فوری انتقام واقع ہوا اور ان کا کام اُلٹ

ہو گیا جو آگ مسلمانوں کو جلانے کے لیے جلائی تھی اس نے انہیں بھی بھسم کر دیا۔ اب مہلت کے بغیر اس فوری انتقام کی جو کہ عادت کے خلاف ہے' وجہ بیان فرمائی جا رہی ہے کہ

وَمَا نَقَمُوْا مِنْهُمْ اور ان ظالم کفار نے مسلمانوں سے بُرا نہ جانا۔ اِلَّا اَنْ یُّؤْمِنُوْا بِاللّٰهِ مگر اس کہ وہ خدا تعالیٰ پر ایمان لاتے تھے اور مستقبل کا صیغہ اس وجہ سے لایا گیا ہے کہ کفار کا مقصد یہ تھا کہ کہ ایمان والے زمانہ مستقبل میں ایمان کو ترک کر دیں' ان کے ایمان پر ثابت رہنے اور صبر کرنے پر انہیں عذاب دیتے تھے نہ کہ ماضی میں ایمان ترک کرنے پر اور اس عبارت سے معلوم ہوا کہ ان ظالموں کو ایمان والوں کے ساتھ اور کسی وجہ سے عداوت نہ تھی' صرف ایمان کی وجہ سے تھی۔ پس اس جہت سے ایمان والوں سے دشمنی ایمان سے دشمنی قرار پائی۔ بخلاف دوسرے کفار کے انہوں نے مسلمانوں کو دُکھ تکلیف پہنچانے میں بہت مہلت پائی ہے اور پاتے ہیں اس لیے کہ ان کی دشمنی صرف ایمان کی جہت سے ہی نہ تھی بلکہ سرداری اور دیگر دنیوی مقاصد کی جہت سے پیدا ہوئی تھی جبکہ ان لوگوں کو خالص عداوت حاصل تھی اور جس ایمان سے عداوت کرتے تھے' بالکل صحیح ایمان تھا اس لیے وہ ایمان اس ذات سے متعلق تھا جو کہ ان صفات سے موصوف ہے۔

الْعَزِیْزِ الْحَمِیْدِ الَّذِیْ لَهٗ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ یعنی وہ خدا جو کہ غالب ہے' محمود ہے اور وہ ذات ہے جس کے لیے آسمانوں اور زمین کی بادشاہت ہے۔ اور ان تینوں صفات میں سے ہر صفت اس پر ایمان لانے کا تقاضا کرتی ہے۔ اس لیے کہ جب وہ اپنے ماسوا پر غالب ہے اور کسی چیز کی عزت اس کی عزت تک نہیں پہنچتی تو اس پر ایمان لانا ضرور عزت و افتخار کا موجب ہوگا اور جب وہ محمود ہے تو اس کا شکر دل' زبان اور اعضاء کے ساتھ واجب ہو جاتا ہے اور ایمان کا اظہار فرض اور لازم ہو جاتا ہے اور جب آسمانوں اور زمین کی بادشاہی اسی کے لیے ہے تو اس کے مخالفین سے ڈرنا جائز نہیں اور جس طرح یہ تینوں صفات مذکورہ اظہارِ ایمان کا موجب ہیں اسی طرح فوری انتقام کا باعث بھی ہیں اس لیے کہ عزت کا تقاضا دشمنوں سے بدلہ لینا ہے ورنہ ایک قسم کی ذلت لاحق ہوگی اور محمودیت کا تقاضا بھی دشمنوں سے انتقام لینا ہے اس لیے کہ اپنے مخالفوں سے بدلہ نہ لینے والے کی کوئی تعریف

نہیں کرتا مگر معاف کرنے کی صورت میں اور کفر معاف کرنا جائز نہیں اور بادشاہت بھی دشمنوں سے انتقام کا موجب ہے ورنہ دشمن دلیر ہو جائیں اور بادشاہت کا کاروبار خلل میں پڑ جائے۔ اور اگر ان صفات کے باوجود کوئی انتقام چھوڑ دے تو وہ لازماً اپنی رعایا کے حالات سے بے خبر ہوگا کہ دشمنوں کی دشمنی اور دوستوں کی دوستی کو جانتا ہی نہیں۔ یا دشمنوں کی ایذاء رسانی جو دوستوں کو دوستی کی وجہ سے پہنچتی ہے اس کی اسے اطلاع نہیں ہوتی یا دوسرے اسباب پر محمول کرتا ہے اور اللہ تعالیٰ اس بے خبری سے پاک ہے۔

وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيْدٌ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر مطلع ہے اور جب بھی کافروں نے ایمان کی وجہ سے ایمان والوں کی عداوت میں کوشش کی اور اللہ تعالیٰ کے انتقام سے غافل ہوئے۔ گویا وہ اس جناب کی بادشاہی' خبرداری اور قابلِ ستائش ہونے سے انکار کرتے ہیں۔ پس ان اسباب کے جمع ہونے کی صورت میں اللہ تعالیٰ کی حکمتیں فوری انتقام کا تقاضا فرماتی ہیں جیسا کہ خندقوں والوں کے واقعہ میں رونما ہوا اور جب خاص جزئی میں دلیل صحیح ہوئی تو اس پر کلی کو قیاس کرنا درست ہوا۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے

اِنَّ الَّذِيْنَ فَتَنُوا الْمُؤْمِنِيْنَ تحقیق جن لوگوں نے ایمان سے عداوت کی وجہ سے ایمان والے مردوں کو ایذاء پہنچائی۔ وَالْمُؤْمِنٰتِ اور ایمان والی خواتین کو بھی ستایا اگرچہ ان کا ایمان عقل کے ناقص ہونے اور خواہش کے غلبے کی وجہ سے ناقص ہے لیکن وہ کمزوری ان کی بے کسی اور عاجزی کی وجہ سے جو کہ ان میں موجود ہے' مقابلے اور دفاع سے متحیر ہو جاتی ہے۔

ثُمَّ لَمْ يَتُوْبُوْا پھر طویل فرصت اور مہلت کے باوجود انہوں نے اس ظلم سے توبہ نہ کی اور اسی ناپاک شغل میں مر گئے کیونکہ اگر توبہ کر لیتے اگرچہ حقوق العباد کی جہت سے ان سے باز پرس ہوتی اور انہیں عذاب ہوتا لیکن ان پر یہ شدت نہ ہوتی کیونکہ ایمان کی عداوت اور حقوق اللہ کو ضائع کرنے سے پاک ہو جاتے۔

اور اس آیت سے دلیل لی گئی ہے کہ جو کسی مسلمان کو جان بوجھ کر قتل کر دے اور پھر توبہ کرے اس کی توبہ مقبول ہے لیکن اس استدلال میں بحث ہے اس لیے کہ مسلمان کا عمداً

قتل اگر کفر کی حالت میں واقع ہو تو بالاجماع اس سے توبہ مقبول ہے۔ اختلاف کی گنجائش نہیں جبکہ اس آیت میں مراد کفار ہیں جو کہ ایمان کی وجہ سے مسلمانوں کو قتل کرتے تھے اور ستاتے تھے۔

فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ تو ان کے لئے دوزخ کا عذاب ہے جس کی بے شمار قسمیں اور بے پناہ سختیاں ہیں اور ہر قسم کی سختیاں ان کے متعلق بروئے کار لائی جائیں گی۔

وَلَهُمْ اور ان کے لیے دیگر ظالموں کے علاوہ عَذَابَ الْحَرِيقِ جلن کا عذاب ہے جس میں ان کی جان اور جسم گرفتار ہوں گے جس طرح کہ انہوں نے دنیا میں ظلم و تعدی کر کے ایمان والوں کے دِلوں کو جلایا تھا۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جلن کا عذاب دوزخ کے عذاب سے پہلے قبر میں ہوگا اور بعض نے خندقوں والوں کے جلنے پر محمول کیا ہے جو کہ آگ کے چنگاروں کے مشتعل ہونے کی وجہ سے جل گئے تھے اور جب ظالموں کا حال سُن کر جو کہ ایمان والوں کو ایمان کی بناء پر ستاتے تھے' سننے والے کو ایک انتظار سا لاحق ہو جاتا ہے کہ وہ ایمان والے جو کہ ظلم کی آزمائش میں گرفتار ہوئے ہیں اور ان کی جانیں ضائع ہو گئیں اس روز اس کے بدلے میں کیا پائیں گے اس انتظار کو دُور کرنے کے لیے نئے سرے ایمان والوں کے حالات کو بیان کرنا ضروری ہوا اس بناء پر کہ یہ سامع کے انتظار کی تسکین کے لیے ایک نئے سرے سے بیان ہے یہاں اصلی مقصود نہ تھا' حرفِ عطف کو ترک فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا جا رہا ہے

إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا تحقیق وہ لوگ جو ایمان لائے ہیں اور ظالموں کے ہاتھوں گرفتار ہونے اور ان کی ایذاء برداشت کرنے کے باوجود ایمان پر ثابت قدم رہے۔

وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اور انہوں نے وہ نیک اعمال کیے جو اس قسم کے حالات میں ضروری ہوتے ہیں جیسے تکلیف پر صبر کرنا' قضا پر راضی رہنا اور ماسوا پر محبتِ خداوندی کو ترجیح دینا۔

لَهُمْ جَنَّاتٌ ان کے لیے جنتیں تیار ہیں جو کہ دنیوی مصائب برداشت کرنے کے مقابلے میں پائیں گے۔ جلن کا دوزخی عذاب اس شخص کو ستانے کی مانند ہے کہ جسے اس

کے محبوب کے سامنے اس محبوب کی محبت پر سزا دیں جو کہ عین راحت بن جاتی ہے۔

تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ جن کے درختوں کے نیچے دودھ' شہد اور شراب کی قسم قسم کی نہریں جاری ہیں' ان کے اس خون اور پسینہ کے مقابلے میں جو کہ کفار کے ظلم کی وجہ سے بہتا تھا۔

ذٰلِكَ الْفَوْزُ الْكَبِیْرُ یہ بہت بڑی کامیابی ہے اس لیے کہ دنیائے فانی کے مقاصد میں کامیابی پانا فانی ہے جبکہ یہ مقاصد باقی ہے' ان میں فنا بالکل نہیں۔ نیز دنیوی مطلب حاصل کرنے میں محبوب حقیقی کی رضامندی مشکوک اور نامعلوم ہے جبکہ ان اخروی لذتوں میں یقینی اور قطعی ہے۔

ایک جواب طلب سوال

یہاں ایک سوال باقی رہ گیا جو کہ جواب طلب ہے اور وہ یہ ہے کہ کفار کے اعمال کی جزا بیان کرنے میں فائے جزائیہ لائے ہیں اور فَلَهُمْ عَذَابُ جَهَنَّمَ ارشاد فرمایا گیا جبکہ ایمان والوں کی جزا کے بیان میں یہ حرف ترک کر دیا گیا اور لهم جنات فرمایا گیا۔ اسلوب بیان کی اس تبدیلی میں نکتہ کیا ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ آخرت کا ثواب محض فضلِ خداوندی ہے' عمل پر موقوف نہیں۔ چنانچہ نابالغ بچہ اور وہ جو بلوغ کے وقت سے مجنون ہو گیا یا وہ جو کسی پہاڑ پر بالغ ہوا اور اسے کسی مسلمان کے ساتھ مل بیٹھنے کا موقع ہی نہ ملا اور اس نے عبادت و طاعت کی توفیق نہ پائی' آخرت میں عمل اور اطاعت کے بغیر ثواب پائے گا۔ بخلاف دوزخ کے عذاب کے کہ کفر یا فسق کے بغیر نہیں ہوگا اس لیے کہ عذاب عدل کا تقاضا ہے اور سبب کے بغیر عدل کا تصور نہیں ہوتا' ان دونوں چیزوں کے درمیان فرق کرنے کے لیے جو کہ فضل اور عدل ہیں وہاں سبب اور انجام قرار دینے کی تصریح کے پیش نظر حرف فا لایا گیا اور یہاں حذف کیا گیا ہے۔

اور جب اللہ تعالیٰ کا معاملہ ان ظالموں کے ساتھ جو ایمان کی وجہ سے مسلمانوں کے درپے ایذاء ہوتے اور ان مظلوموں کے ساتھ جو کہ ایمان کی خاطر ظلم و جفا برداشت کرتے ہیں' دنیا و آخرت میں بیان ہو چکا تو یہ بات ثابت ہو گئی کہ

اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ تحقیق آپ کے پروردگار کی پکڑ بہت سخت ہے اس لیے کہ دوسروں کی دست برد سے مقابلہ' زاری' صبر اور سفارش کے ساتھ خلاصی پانا ممکن ہے جبکہ اللہ تعالیٰ کے عذاب سے ان کفار کے لیے کسی وجہ سے خلاصی پانا ممکن نہیں۔ نیز دوسروں کی پکڑ کی انتہا یہ ہے کہ موت اور ہلاکت تک پہنچے اور موت و ہلاکت کے بعد وہ ایذاء نہیں دے سکتے اس لیے کہ وہ معدوم کو دوبارہ لوٹانے کی طاقت نہیں رکھتے۔ پس وہ ہمیشہ کا عذاب نہیں دے سکتے جبکہ مرنے اور خاک ہونے پر بھی اللہ تعالیٰ کی پکڑ سے خلاصی ممکن نہیں ہے' وہ طاقت رکھتا ہے کہ زندہ فرمائے پھر ابدالآباد تک عذاب دے اس لیے کہ

اِنَّهٗ هُوَ يُبْدِئُ وَ يُعِيْدُ تحقیق وہی ہے جو آغاز میں پیدا فرماتا ہے اور فنا کے بعد پیدا فرماتا ہے۔

وَهُوَ الْغَفُوْرُ الْوَدُوْدُ اور وہ اپنی شدید گرفت کے باوجود اپنے ایمان والے بندوں کو بخشنے والا اور دوست رکھنے والا ہے۔ کہ اس عظیم دوستی کی وجہ سے اپنے دوستوں کے گناہ چھپاتا ہے اور ان کے عیب پردے میں رکھتا ہے اور دوستوں اور دشمنوں کے اس کا معاملہ ایسا کیوں نہ ہو حالانکہ وہ

ذُو الْعَرْشِ الْمَجِيْدِ جہان کی بادشاہی کے تخت والا ہے اور اس کی بزرگی قدیم ہے۔ لغتِ عرب میں مجد موروثی خاندانی بزرگی کو کہتے ہیں اور چونکہ موروثی خاندانی بزرگی کے لیے دوام لازم ہے اس لیے یہاں قدیم بزرگی مراد لی گئی ہے اور قدیم السلطنت بادشاہوں کی عادت ہے کہ دشمنوں اور دوستوں کے ساتھ رضامندی اور ناراضگی کا اسی قسم کا معاملہ کرتے ہیں ورنہ ان کی سلطنت کی ہمیشگی میں خلل واقع ہو جائے اس کے باوجود دوسرے بادشاہوں سے ایک چیز میں ممتاز ہے جس کا کسی بادشاہ میں تصور ہی نہیں اور وہ چیز یہ ہے کہ

فَعَّالٌ لِّمَا يُرِيْدُ جو چاہے' وہی کرتا ہے جب اس کا ارادہ کسی چیز کے ساتھ متعلق ہوتا ہے تو پھر اسے پیچھے ہٹنے کا امکان نہیں رہتا۔ بخلاف دوسرے بادشاہوں کے کہ وہ کئی چیزیں چاہتے ہیں اور نہیں کر پاتے اور اس طرح کے شہنشاہ سے ڈرتے رہنا چاہیے اور اس کی رحمت پر بھروسہ بھی ہونا چاہیے۔

ایک جواب طلب سوال

ایک جواب طلب سوال باقی رہ گیا اور وہ یہ ہے کہ پہلی صفات میں جیسے کہ الغفور، الودود اور ذوالعرش المجید لام تعریف معرف باللام کی اضافت کے ساتھ واقع ہے جبکہ فعال لما یرید کی صفت میں تنکیر یعنی نکرہ لانے کو اختیار فرمایا گیا ہے اس میں کیا نکتہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ فَعَّالٌ لِّمَا یُرِیْدُ مضاف کے مشابہہ ہے جیسے طالع جبلا اور مضاف کے مشابہہ مضاف کا حکم رکھتا ہے، اسے معرفہ لانے کی ضرورت نہیں ہے اور فاعل لما یرید کے صیغہ پر مبالغہ کے صیغے کو اس وجہ سے اختیار فرمایا گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے مرادات اور مفعولات کی کثرت کا اشارہ ہو جیسا کہ واقع میں ہے۔

حاصل کلام یہ کہ ان متضاد اور باہم جدا جدا اثر رکھنے والی صفات کو اسی ترتیب سے لانے کا مقصد یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ سے بعید نہیں ہے کہ کبھی بندوں کے ساتھ مہربانی، بخشش اور دوستی کا معاملہ فرمائے اور کبھی سخت پکڑ فرمائے بلکہ اللہ تعالیٰ سے یہ بعید نہیں کہ ایک گروہ اور ایک فرد کے بارے میں مختلف اوقات کے اعتبار سے انعام اور انتقام جمع فرمائے۔ پس اللہ تعالیٰ کے انعام پر جو کہ اپنے اوپر ہو، غرور نہیں کرنا چاہیے اور دوسرے وقت میں اس کے انتقام سے بے خوف وخطر نہیں ہونا چاہیے۔ چنانچہ فرمایا جارہا ہے

هَلْ اَتٰكَ حَدِیْثُ الْجُنُوْدِ کیا تمہارے پاس ان لشکروں کا واقعہ پہنچا ہے کہ جن پر ایک مدت تک انعام کا دروازہ کھلا تھا اور ان پر ہر طرف سے قسم قسم کی نعمتیں پہنچتی تھیں پھر ان سے کس طرح انتقام لیا گیا اور ان کے انتقام کا سبب وہی کمزور اور قلیل سے لوگ ہوئے جنہیں وہ انعامِ الٰہی کے زور کی وجہ سے انتہائی رسوائی اور ذلت میں رکھتے تھے اور وہ لشکر فِرْعَوْنَ وَ ثَمُوْدَ یعنی فرعون کے پیروکار اور ثمود کا گروہ۔ پس فرعونیوں کو ایک مدت تک مختلف قسم کی نعمتوں سے معزز رکھ کر بنی اسرائیل پر پورا تسلط دیا گیا تھا کہ انہیں غیر مہذب اور حقیر کاموں میں بے گار میں پکڑتے تھے پھر ان کا تمام ملک اور مال بنی اسرائیل کے حوالے کر دیا گیا اور انہیں بنی اسرائیل کے سامنے پوری ذلت اور رسوائی کے ساتھ بحیرۂ قلزم میں غرق کر دیا گیا۔

اور ثمود کے لوگ پہلے بہت طاقت رکھتے تھے حتیٰ کہ انہوں نے تراشے ہوئے پتھروں کی عمارتوں کے ساتھ سات سو شہر آباد کیے اور وہ حضرت صالح علیٰ نبینا وعلیہ السلام اور کمزور مسلمانوں کو اونٹنی کے بارے میں کئی طرح سے پریشان کرتے تھے' ان سب کو ایک تیز آواز کے ساتھ ہلاک فرما دیا گیا اور ان کے شوخ اور شریر لوگوں کو حضرت صالح علیہ السلام کی دعا سے اندھا کر دیا گیا۔ پس یہ واقعات عقل مندوں کی عبرت کے لیے کافی ہیں تا کہ اللہ تعالیٰ کے انعام پر مغرور نہ ہوں اور اس کے انتقام سے ڈرتے رہیں لیکن کفار ان واقعات سے کوئی سبق نہیں لیتے اور غرور اور بے خوفی میں اُلجھے ہوئے ہیں۔

بَلِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ تَكْذِيْبٍ بلکہ جو کافر ہیں' ان واقعات کے انکار کے درپے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہ واقعات اس قسم کے ہیں کہ مؤرخین نے لوگوں کو تعجب میں ڈالنے کے لیے گھڑ کر لکھ دیے ہیں اور وہ جانتے نہیں کہ ان واقعات سے قطع نظر اللہ تعالیٰ کی قدرت ہر کسی پر ہر وقت بے پردہ ظاہر ہے اگر وہ اپنے حال پر غور کریں تو جس سانس کے ساتھ ان کی زندگی وابستہ ہے اسی کے قبضے میں ہے۔

وَّاللّٰهُ مِنْ وَّرَآئِهِمْ مُّحِيْطٌ اور اللہ تعالیٰ ان کے آگے پیچھے محیط ہے یعنی ان کے زمانے سے پہلے بھی اس نے بہت سے ظالموں کو ہلاک فرمایا ہے اور ان کے زمانے کے بعد بھی بہت سے ظالموں کو ہلاک فرمائے گا اور ان واقعات کا انکار جن کی مانند ہر وقت واقعات نمودار ہوتے رہتے ہیں' بے جا ہے۔

اور اصل لغت میں وراء کا لفظ اس چیز کے معنوں میں ہے جسے آدمی چھپائے یا وہ چیز آدمی کو چھپائے اور اسی لیے آگے پیچھے دونوں کے لیے استعمال کرتے ہیں اور اس آیت میں اشتراک معنوی یا عموم مجاز کے طور پر دونوں معنوں کو شامل ہے اور اس کے باوجود یہ واقعات ایسے نہیں ہیں جنہیں صرف مؤرخین نے بیان کیا ہو۔

بَلْ هُوَ قُرْاٰنٌ مَّجِيْدٌ بلکہ یہ واقعات قرآن قدیم ہے جو کہ ان واقعات کے وقوع سے پہلے لکھا گیا تھا۔

فِيْ لَوْحٍ مَّحْفُوْظٍ اس تختی میں جو کہ شیاطین' جنوں اور انسانوں کے عمل دخل سے

محفوظ ہے' وہاں کسی کا تصرف نہیں کہ کمی بیشی یا تحریف کرے یا اپنی طرف سے کچھ ملا دے۔ پس میں اس میں جھوٹ کا احتمال کرنا عقل کے تقاضے کے خلاف ہے۔

لوحِ محفوظ اور اس کی پہلی عبارت کا بیان

اور معالم میں امام بغوی ابن عباس رضی اللہ عنہما سے سند کے ساتھ لائے ہیں کہ لوحِ محفوظ سفید مروارید سے ہے اس کا طول آسمان اور زمین کے مابین فاصلے کے برابر ہے اور عرض مشرق و مغرب کے مابین فاصلے کے برابر ہے اور اس کے کناروں پر یاقوت نصب کیے گئے ہیں اس کے دونوں پہلو سرخ یاقوت کے ہیں۔ نور کے قلم کے ساتھ اس میں قدیم کلام لکھا گیا' اس تختی کی ابتدا میں یہ عبارت واقع ہے۔ لاالہ الا اللہ وحدہ دینہ الاسلام ومحمد عبدہ و رسولہ فمن امن باللہ عزوجل' و صدق بوعدہ واتبع رسولہ ادخلہ الجنۃ' اللھم اجعلنا منھم۔ یا اللہ ہمیں ان میں سے کر دے۔

سورۃ الطارق

سورۃ الطارق مکی ہے' اس کی انیس (۱۹) آیات' اکسٹھ (۶۱) کلمات اور دو سو انتالیس (۲۳۹) حروف ہیں۔

وجہ ربط

اس سورۃ کا سورۂ بروج کے ساتھ رابطہ کلام کی ترتیب کی جہت سے بالکل ظاہر ہے کہ دونوں کی ابتدا میں آسمان' بروج اور ستاروں کی قسمیں ہیں جبکہ دونوں کے آخر میں امورِ غیبیہ جو کہ آسمان کی لوحِ محفوظ اور آدمی کی جان ہے' کی حفاظتِ خداوندی کا بیان ہے' بیان کی ضرورت نہیں۔

وجہ تسمیہ

اور اس سورۃ کا نام سورۃ الطارق اس وجہ سے رکھا گیا ہے کہ لغتِ عرب میں طارق اس مہمان کو کہتے ہیں جو کہ رات کے وقت آئے پھر ہر واقعہ کو جو رات کے وقت رونما ہو' بھی طارق کہتے ہیں اور اسی لیے حدیث شریف میں وارد ہے نعوذ باللہ من طوارق اللیل

یعنی ہم ان حادثوں سے اللہ تعالیٰ کی پناہ لیتے ہیں جو کہ اچانک رات کے وقت رونما ہوں اس لیے کہ ان حادثوں کا تدارک تدبیر' علاج اور مدد مانگنے کے ساتھ دشوار ہوتا ہے اور عرب کے اشعار میں معشوق کے خیال کو جو کہ عاشق کے دل میں بار بار آتا ہے' بھی طارق کہتے ہیں اس لیے معشوق کا خیال آنا زیادہ تر خلوت اور فراغت کے اوقات میں ہوتا ہے جو کہ غالب طور پر رات ہے۔

اور حدیث شریف میں مسافر کو منع فرمایا گیا ہے کہ وہ طروق کرے یعنی یہ کہ رات کے وقت اچانک گھر میں آئے تا کہ اس کے گھر والے ملاقات کے لیے مستعد اور تیار ہو جائیں اور اسے ناپسندیدہ حالات دیکھ کر گھن سی پیدا نہ ہو۔

اور اس سورۃ میں طارق سے مراد آسمان کا ستارہ ہے کہ تمام ستارے اس وصف میں برابر ہیں اس لیے کہ رات کے وقت ظاہر ہوتے ہیں اور دن میں اوجھل ہو جاتے ہیں اور بعض علماء نے اس بات پر نظر کرتے ہوئے خاص زحل ستارہ مراد لیا ہے کہ سب سے اونچا ستارہ ہے اور اس کی شعاع سات آسمانوں کے جسم کو چیر کر زمین پر پڑتی ہے۔ پس اس میں ثاقبیت یعنی خیرہ کرنے کا معنی زیادہ کامل ہے۔ اور بعض نے ثریا مراد لیا ہے اس لیے کہ چند ستاروں کے انوار جمع ہونے کی وجہ سے اس میں زیادہ چمک آ گئی ہے جبکہ اکثر علماء اسی پر ہیں کہ ستاروں کی جنس مراد ہے اور ہر ستارہ اس میں داخل ہے اس لیے کہ ہر ستارے کی تین صفتیں ہیں۔ پہلی یہ کہ اپنی شعاع سے تاریکی کو دور کرتا ہے' دوسری یہ کہ خشکی اور تری کے مسافروں کی راہ کی علامت اور مشرق و مغرب کی سمت کا تعین حاصل ہوتا ہے تیسری یہ کہ شیاطین کے شر آسمان کی حفاظت کا سبب ہوتا ہے۔ اور اس کی دو جہتیں ہیں۔ پہلی جہت یہ کہ شیاطین دھوئیں کے مارے سے پیدا ہوئے ہیں اور طبعی طور پر ظلمت اور تاریکی کو پسند کرتے ہیں اور روشنی سے بھاگتے ہیں۔ چنانچہ تجربہ کیا گیا ہے کہ ان کا زیادہ تر غلبہ تاریکی کے وقت اور تاریک مکان میں ہوتا ہے اور شمع اور چراغ کے ہوتے ہوئے مکان میں کم دخل دیتے ہیں۔ پس آسمان کو ان نورانی قندیلوں سے روشن کیا گیا ہے تا کہ اجزائے آسمان میں جو کہ صاف و شفاف ہیں' روشنی پھیلنے کی وجہ سے شیاطین خیرہ ہو کر بھاگ جائیں۔

دوسری جہت یہ کہ ستارے کی شعاع سے فرشتے گیند کی طرح بنا کر شیاطین کے پیچھے چلاتے ہیں جیسے توپ کا گولا جو کہ دشمن کو بھگانے کے لیے پھینکا جاتا ہے اور ستاروں کے ساتھ آسمان کی حفاظت کی اسی طرح رعایت کی گئی ہے جس طرح قلعہ کی حفاظت اس توپ خانے سے کی جاتی ہے جو کہ اس کے برجوں اور فصیل کے اوپر نصب کیا جاتا ہے۔ فرق یہ ہے کہ آسمانی ستاروں اور گولے کی شکل جو کہ ان کی شعاع سے پیدا ہوتی ہے' دونوں کو لغت میں ستارہ' نجم اور کوکب اور ہندی میں تارہ کہتے ہیں اور توپ خانے میں غلولے کو توپ کا نام نہیں دیتے اور قرآن مجید میں ستاروں کے اس فائدے کو جابجا ذکر فرمایا گیا ہے۔

اور یہ تینوں صفات جو کہ ہر ستارے میں موجود ہیں اس قسم میں پیش نظر ہیں اس لیے کہ جس مضمون کی اس قسم کے ساتھ تاکید فرمائی گئی ہے' یہ ہے کہ آدمی کی جان جتنی بھی سختیوں اور مصیبتوں میں گرفتار ہو جائے' اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے ساتھ محفوظ ہے اس کا ٹوٹنا اور فنا قبول کرنا محال ہے۔

آدمی کی جان ابدی ہے' فنا پذیر نہیں

اسی لیے حدیث شریف میں وارد ہے انما خلقتم للابد یعنی آدمی کی جان کہ حقیقت میں آدمی اسی سے عبارت ہے' ابدی ہے' فنا پذیر ہرگز نہیں۔ اور وہ جو عرف میں مشہور ہے کہ موت جان کو ہلاک کرتی ہے' محض مجاز ہے۔ موت کا کام اتنا ہے کہ جان بدن سے جدا ہو جائے۔ اور مربی اور محافظ نہ پانے کی وجہ سے پاش پاش ہو جائے ورنہ جان کے لیے فنا کا تصور نہیں ہے اور عالم برزخ اور حشر ونشر کا امکان اسی مسئلے پر مبنی ہے اور اس سورۃ میں بھی اسی راہ سے آخرت کو ثابت فرمایا گیا ہے۔

اجمال کی تفصیل

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آدمی دو چیزوں سے مرکب ہے: جان اور جسم اس کا جزو اعظم جان ہے۔ جس میں تغیر وتبدل راہ نہیں پاتا جبکہ بدن بمنزلہ لباس ہے جس کا رنگ ماں کے پیٹ میں ہونے کی صورت میں اور تھا۔ اور پیٹ سے باہر آنے کے بعد بچپنے کی آخری عمر تک اس کا رنگ اور ہوتا ہے۔ اور اس میں جوانی اور بڑھاپے میں کافی اختلاف

رونما ہوتا ہے تو اس کا جزو اعظم جو کہ جان ہے اور شعور' ادراک' لذت حاصل کرنا اور تکلیف محسوس کرنا اس کا خاصہ ہے جب فنا قبول نہ کرے اور ان محافظوں کے قبضے میں رہے جو کہ بارگاہِ خداوندی سے اس پر مقرر ہیں تو جسم کے اجزاء جمع کرنے اور اسی شکل وصورت میں انہیں جوڑنے اور ترکیب دینے میں کیا دُوری رہی کہ اس طرح کے عمل کا بننے کی ابتدا سے لے کر عمر کی انتہا تک بارہا مشاہدہ کیا جاتا ہے اور جب جان کی حفاظت کی دلیل ستاروں کے ذریعے آسمان کی حفاظت کے لیے محافظ مقرر کرنے کے ساتھ تھی۔ اس مطلب کو ثابت کرنے کی ابتدا میں آسمان اور ستاروں کی قسم یاد فرمائی گئی اور اس سورۃ کو ستارے کے نام سے موسوم کیا گیا کیونکہ مقصد کا زیادہ تر ثبوت اس کی حفاظت کو دیکھنا ہے۔

یہاں جاننا چاہیے کہ اس سورۃ کے نزول کا سبب اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ طارق سے مراد بھاگنے والا ستارہ ہے جسے شہاب کہتے ہیں اور حقیقت میں شیاطین کی گزر سے آسمان کی حفاظت کرنے والا بھی وہی ہے کہ یہ شیاطین کی راہ بند کرتا ہے اور انہیں جلا دیتا ہے اگرچہ توپ کے گولے کی طرح گڑے ہوئے ستاروں کی شعاع سے پیدا ہوا ہو تو زیادہ بہتر یہ ہے کہ طارق کو شہاب پر محمول کیا جائے۔

سببِ نزول

اس سورۃ کے نزول کا سبب یہ تھا کہ ایک رات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابوطالب حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ہاں حاضر آئے' آپ نے ان کے لیے کھانا حاضر فرمایا جو کہ روٹی اور دودھ تھا اور دونوں نے تناول کرنا شروع کر دیا اسی دوران ایک ستارہ آسمان سے نیچے اُترا اور زمین کے اس قدر قریب ہوا کہ اس کی شعاع سے سارا گھر منور ہو گیا' اور ابوطالب کی آنکھیں چندھیا گئیں اور بے قرار ہو کر انہوں نے کھانے سے ہاتھ کھینچ لیا اور کھڑے ہو گئے اور بولے کہ یہ کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ ایک ستارہ ہے جسے شیاطین سے آسمان کی حفاظت کے لیے فرشتے پھینکتے ہیں اور یہ قدرتِ الٰہی کی علامات میں سے ایک علامت ہے۔ ابوطالب نہایت متعجب ہو کر خاموش ہو کر خاموش بیٹھ گئے' حضرت جبرئیل علیہ السلام یہ سورۃ لائے۔

اور اس سورۃ میں اس بات کا پتہ دیا گیا ہے کہ ان چیزوں کو دیکھ کر دینِ اسلام کے سچے عقائد پر دلیل لینا چاہیے اور انہیں ضائع نہیں کرنا چاہیے اس لیے کہ یہ معاملہ آدمی کے حشر ونشر اور آخرت میں لوٹائے جانے پر ایک قوی دلیل ہے اس لیے کہ جب اپنی عظمت' بزرگی اور اتنی بلندی کے باوجود کہ وہاں تک کسی کا ہاتھ نہیں پہنچ سکتا' آسمان اللہ تعالیٰ کی حفاظت کا محتاج ہے اور اس کی حفاظت کی صورت اس انداز میں نمودار ہوئی کہ آسمان میں گڑے ہوئے ستاروں کی شعاع سے ایک لپکتا ہوا ستارہ پیدا ہوتا ہے اور شیطانوں کی راہ روکتا ہے اور انہیں بھگاتا ہے تو آدمی کی جان جو کہ بہت ناتواں ہے' اللہ تعالیٰ کی حفاظت کے بغیر مصائب وحوادث کی اس کشمکش میں کیسے باقی رہ سکتی ہے۔ اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کی حفاظت کے لیے محافظ مقرر کیے گئے ہیں۔ پس آدمی کی جان اللہ تعالیٰ کے قبضے اور تصرف میں ہے۔ خواہ زندگی میں ہو خواہ موت کے بعد اور یہیں سے سمجھا جا سکتا ہے کہ موت کے بعد وہاں کا انعام پانا اور تکلیف اُٹھانا اسی کے دستِ قدرت میں ہے۔ باقی رہ گیا جسم کا حال کہ اسے بھی غور وفکر کے ساتھ لوٹانے کے لائق جانا جا سکتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالسَّمَآءِ وَالطَّارِقِ مجھے قسم ہے آسمان کی اور ستارے کی جو کہ رات کے وقت نمودار ہوتا ہے چونکہ اس ستارے میں جو کہ رات کے وقت بھاگتا ہوا نظر آتا ہے' لوگوں کا اس میں بہت تردد ہے۔ بعض یوں کہتے ہیں کہ زمین کی طرف سے دھواں اُٹھ کر آسمان کی طرف جاتا ہے جب بھی کرۂ نار میں پہنچتا ہے تو اس تیل کی وجہ سے جو اس میں باقی ہے' جل اُٹھتا ہے اگر لطیف ہے تو جلدی بجھ جاتا ہے اور اگر غلیظ ہے تو چند روز تک نیزے یا دُم دار ستارے یا دوسری شکلوں میں قائم رہتا ہے۔

اور بعض یوں کہتے ہیں کہ قمر کے آسمان کے نیچے کرۂ نار ہے اور اس کرے سے کبھی بھڑ کنے کی حرکت کی وجہ سے جو کہ فلک کے درجات میں سے کسی درجے میں گرم مزاج ستاروں کے اجتماع کی شعاعوں کی قوت سے پیدا ہوتی ہے' کوئی چیز جدا ہو کر نیچے آ جاتی ہے اور دھوئیں کے طبقے میں جو کہ کرۂ نار اور نرم ہوا کے درمیان ہے' نمودار ہوتی ہے اور دوڑتے

ہوئے ستارے کی مانند نظر آتی ہے اور طبقۂ زمہریر میں پہنچتی ہے تو جامد ہو جاتی ہے اور نظر سے غائب ہو جاتی ہے۔

اور ان دونوں باتوں میں بحث ہے اس لیے کہ وہ نور جو بھاگتے ستاروں میں دیکھا جاتا ہے' آگ کے اس شعلے کے ساتھ مشابہت ہرگز نہیں رکھتا جو کہ دھوئیں کے اندر بھڑکا ہو بلکہ اس ستارے کا نور انوارِ آسمانی کے ساتھ پوری مشابہت رکھتا ہے جیسا کہ محسوس ہوتا ہے۔

نیز ان ستاروں کی حرکت کی سمت صرف اوپر سے نیچے میں منحصر نہیں ہے تا کہ اوپر اُٹھنے والے دھوئیں کے بھڑکنے یا نیچے جسم ناری کے پھیلنے پر محمول کیا جا سکے۔ یہ زیادہ تر بائیں سے دائیں اور دائیں سے بائیں بھاگتے ہیں اور صریح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ ان کی حرکتیں طبعی حرکات نہیں ہیں بلکہ ارادہ و اختیار والی چیزوں میں سے کوئی زبردست چیز انہیں زبردستی دوڑاتی ہے' ان شکوک و شبہات کو دُور کرنے کے لیے سوال و جواب کے طریقے سے ارشاد فرمایا جا رہا ہے۔

وَمَآ اَدْرٰىكَ مَا الطَّارِقُ اور تو کیا جانے کہ وہ رات کو آنے والا ستارہ کیا ہے۔

اَلنَّجْمُ الثَّاقِبُ ایک ستارہ ہے جو کہ اپنی شعاع سے شیاطین کو خیرہ کرتا ہے اور کبھی اس شعلے سے جو کہ اس کی شعاع سے پیدا ہوتا ہے' انہیں جلا دیتا ہے اور اس کی شعاع کی قوت کی وجہ سے شیاطین کی بعینہٖ وہی حالت ہو جاتی ہے جو کہ سورج کی شعاع میں چمگادڑ کی ہوتی ہے اور جب طارق کی حقیقت بیان کرنے سے فراغت ہوئی تو اب وہ مضمون بیان فرمایا جا رہا ہے جس پر قسم اُٹھائی گئی ہے کہ

اِنْ كُلُّ نَفْسٍ لَّمَّا عَلَيْهَا حَافِظٌ نہیں ہے کوئی جان چھوٹی ہو یا بڑی' نیک ہو یا بُری مگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس پر ایک نگہبان ہے جو کہ اسے مصائب اور حوادث کے صدموں کی وجہ سے فنا نہیں ہونے دیتا۔

محافظ فرشتوں کا بیان

یہاں جاننا چاہیے کہ آدمی کی جان کی معدوم اور فنا ہونے سے حفاظت کرنے والا

داروغہ ایک فرشتہ ہے جو کہ حضرت اسرافیل علیہ السلام کے لشکر سے ہے جو کہ آخر میں اس جان کو دونفخوں کے درمیان کی مدت میں صور میں پہنچا دے گا۔ آدمی کے متعلقہ دوسرے محافظین بہت ہیں جو کہ باری باری دن رات کے پہرے کے طور پر آدمی کے جسم کی حفاظت کرتے ہیں مگر اس وقت تک جب تک کہ اس کے جسم کو ضرر پہنچانے کے ساتھ تقدیر الٰہی متعلق نہیں ہوئی ہے اور جیسے ہی ضرر کا وقت مقدر پہنچتا ہے' وہ دست بردار ہو جاتے ہیں اور تقدیر کے حوالے کر دیتے ہیں۔

اور حدیث پاک میں وارد ہے کہ وکل بالمومنین مائۃ وستون ملکا یذبون عنہ کما یذب عن قصعۃ العسل الذباب و لووکل العبد الی نفسہ طرفۃ عین لاختطفتہ الشیاطین عضوا عضوا ہر مومن پر ایک سو ساٹھ فرشتے مقرر ہیں جو کہ شیاطین کو اس سے اس طرح دُور رکھتے ہیں جس طرح شہد کے پیالے سے مکھیاں دُور کی جاتی ہیں اگر بندے کو اس کی اپنی حفاظت پر چھوڑ دیا جائے تو شیاطین اس کا ایک ایک عضو اُچک لیں۔

اور اس حدیث سے معلوم ہوا کہ ایمان والے کی دوسرے لوگوں کے مقابلے میں زیادہ محافظت اور نگہبانی ہے اس لیے کہ ایمان کی وجہ سے اس کے بہت سے دشمن پیدا ہو گئے ہیں جو کہ کافروں کے دشمن نہیں ہیں اور عام محافظوں کا ذکر جو کہ ہر مومن و کافر کی بدنی آفات سے نگہبانی کرتے ہیں۔ سورۃ رعد میں موجود ہے لہ معقبات من بین یدیہ ومن خلفہ یحفظونہ من امر اللہ اور ہر کسی کی جان کے محافظوں کا ذکر سورۂ انعام میں ہے کہ وھوالقاھر فوق عبادہ ویرسل علیکم حفظۃ حتی اذا جاء احدکم الموت توفتہ رسلنا وھم لایفرطون اور دوسرے فرشتے جو کہ بندوں کے اچھے بُرے اعمال لکھنے پر مامور ہیں' ان کا ذکر سورۂ اذا السماء انفطرت میں ہے اور وہ فرشتہ جو کہ آدمی کے ہر لفظ اور حرف پر مقرر ہے اور اسے گنتا اور لکھتا ہے اس کا ذکر سورۂ ق میں ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ یہاں جان کی حفاظت کا بیان کرنا مقصود ہے جو کہ ہر کسی کے لیے واقع ہے اس حفاظت میں کبھی کوئی کوتاہی نہیں ہوتی اور جب آدمی کو آخرت میں لوٹنے

کی بحث سے اپنے نفس کی بقاء اور موت سے پہلے اور موت کے بعد اپنی جان کا محفوظ رہنا معلوم ہو گیا اور اس نے جان لیا کہ میری جان جو کہ حقیقت میں میری ذات ہی ہے اور بدن لباس کے طور پر ہے' مالکِ حقیقی کے قبضے میں ہے تو اسے قیامت کے دن لوٹنے اور حشر و نشر کے صحیح ہونے کے اعتقاد میں کوئی شک نہ رہا مگر صرف جسم کے لوٹانے کو دُور از امکان سمجھنے کی جہت سے کچھ شک باقی ہے کہ اس کے اجزا موت کے بعد بالکل منتشر ہو جاتے ہیں' کچھ زمین کی خاک میں مل کر نیست و نابود ہو جاتے ہیں اور کچھ حیوانات کا لقمہ ہو جاتے ہیں اور وہ حیوانات مختلف مقامات میں جا مرتے ہیں اور مٹی میں برابر ہو جاتے ہیں اور کچھ پرندوں میں ایک ملک سے دوسرے ملک اور صحرا سے دوسرے صحرا تک پھیل جاتے ہیں تو ان سب منتشر اجزا کو جمع کرنا اور جدا جدا کرنا کہ یہ فلاں جسم کا جزو ہے اور یہ فلاں جسم کا حصہ ہے' ایک ایسا کام ہے جو کہ ظاہر بین عقل میں بہت دشوار معلوم ہوتا ہے اسی لیے کسی کہنے والے نے ہندی شعر میں کہا ہے

پات جھڑنتے یوں کہیں سُن رے بنکی رائے
اب کے بچھڑے نا ملیں دور پڑیں گے جائے

ناچار اس اُلجھن کو دُور کرنے کے لیے آدمی کو ایک اور راہ کا پتہ دیا جا رہا ہے۔

فَلْيَنْظُرِ الْاِنْسَانُ مِمَّا خُلِقَ چاہیے کہ آدمی دیکھے کہ وہ کس چیز سے پیدا کیا گیا اور اس کی خلقت کا مادہ کہاں کہاں سے جمع کر کے لایا گیا ہے۔

خلقت انسانی کی تفصیل

اس کی تفصیل یہ ہے کہ آدمی کا نطفہ اس خون کا نچوڑ ہے جو کہ غذا سے حاصل ہوتا ہے اور غذا نباتی ہے یا حیوانی۔ نباتی غذا کی بے شمار اقسام ہیں۔ دانے' غلے' سبزیاں' پھل' گرم اور سرد مصالحے اور حیوانی غذا جیسے گوشت' دہی' دودھ' گھی' پنیر اور انڈہ وغیرہ ہے اور علم طب میں طے شدہ بات ہے کہ صالح غذا کھانے کے بعد جب بہتر (۷۲) گھنٹے گزرتے ہیں تو منی وجود میں آتی ہے۔ پس ہر شخص کو اپنی روزانہ کی غذا میں غور کرنا چاہیے کہ چاول کہاں سے لائے گئے ہیں' کس مملکت میں واقع کس صوبے سے متعلق کس ضلع کی تحصیل کی

کس دیہات کی زمین کے کس قطعہ میں کاشت کیے گئے تھے اور سوداگروں کو کیا ضرورت پیش آئی کہ انہوں نے اس دُور دراز کے ملک سے بیلوں اور اونٹوں پر لاد کر بازار میں لاکر مجھ مسکین کے ہاتھوں فروخت کیے اور مجھے یہ چاول کھلائے گئے اور اسی قیاس پر اپنی غذا کے تمام ارکان اور ضروریات کے حال کو سمجھیں اور جان لیں کہ میرے والدین کو بھی اسی طریقے سے دُور دراز کے شہروں سے مختلف غذائیں جمع کر کے کھلائی گئی ہیں حتیٰ کہ میرا نطفہ ان کے جسم میں پیدا ہوا اور میں اس نطفے سے پیدا ہوا اور جو غذا میں ہر روز اس قدر متفرق اجزا کو جمع فرماتا ہے اور مہیا کرتا ہے کہ اگر یہ سب کچھ ایک جگہ ڈھیر کیا جائے تو آدمی کے جسم کی تعداد سے حجم میں ہزاروں مرتبہ زیادہ ہو اس سے کیا بعید ہے کہ چالیس سال کی مدت میں جو کہ دو نفخوں کے درمیان ہے، جسم کے تمام اجزا کو جو کہ بلاشبہ اس مقدار سے کم تر ہیں، مختلف اور دُور دراز جگہوں سے مہیا کر کے گوشت اور کھال کا لباس پہنا دے۔

پھر اس کے بعد کہ غذا نطفہ ہو گئی، اسے کہاں سے یکجا کرتے ہیں اور اس نطفے کی راہ میں کون کون سی سخت ہڈیاں حائل ہیں جو کہ آدمی کے جسم کے پہاڑ کی مثل ہیں اور اس کے باوجود اس نطفے کو کس تدبیر کے ساتھ مغز کے گودے سے باہر نکال کر آلے کے سوراخ تک پہنچایا جاتا ہے اور وہاں سے رحم کی گہرائی میں کس طرح پہنچتا ہے۔ چنانچہ فرمایا جارہا ہے

خُلِقَ مِنْ مَّآءٍ دَافِقٍ یعنی آدمی کو دنے والے پانی سے پیدا کیا گیا ہے اور وہ پانی مرد اور عورت کا نطفہ ہے جو کہ رحم میں ایک دوسرے کے ساتھ مل کر یکساں ہو جاتا ہے اور اگرچہ کودنا مرد کی منی کا خاصہ ہے لیکن چونکہ باہم ملنے کے بعد ایک چیز ہو گئی تو تغلیب کی بناء پر اس مجموعی مرکب پر مرد کا اطلاق فرمایا گیا اور بعض طبیب اس کے قائل ہیں کہ عورت کی منی کے لیے بھی رحم کے اندر کودنا ہے لیکن رحم کی گہرائی کے پوشیدہ ہونے کی وجہ سے محسوس نہیں ہوتی جیسا کہ وہ حرکت جو کہ انزال کے وقت عورت کو ہوتی ہے اس پر گواہ ہے۔ پس ان تمام غذاؤں کو ہضم کے مراحل طے کرنے کے بعد صورت بخشنا اس بات کی صریح دلیل ہے کہ صورتوں کو بدلنا قدرتِ الٰہی میں ایک نہایت ہی آسان کام ہے۔

يَخْرُجُ مِنْ بَيْنِ الصُّلْبِ وَالتَّرَآئِبِ جو کہ پشت اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان

سے نکلتا ہے اس لیے کہ مادہ منویہ پہلے دماغ سے ٹپکتا ہے اور کانؔ کی پچھلی رگوں میں جاری ہو کر حرام مغز میں پہنچتا ہے اور حرام مغز کا محل پشت اور سینے کے درمیان ہے۔ پس مرد کا وہ مادہ پشت کی ہڈی کے مہروں سے گزر کر گردوں اور وہاں سے خصیوں میں اور وہاں آلے کی نچلی نالی تک پہنچتا ہے اور رحم میں گرتا ہے جبکہ عورت کا مادہ سینے کی طرف سے اسی طرح گزر کر خصیوں میں پہنچتا ہے جو کہ رحم کی گردن میں رکھے گئے ہیں اور حرکتِ جماعی اور گدگدی کی وجہ سے رحم کے منہ میں گرتا ہے اور رحم کے اندر دونوں پانی جمع ہو جاتے ہیں۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ اس آیت میں اس پانی کا گزارنا مقصود ہے کہ اسے کس طرح اس دشوار اور سنگلاخ میں جاری کیا جاتا ہے جس کے دونوں طرف ہڈیاں واقع ہیں اور اسے سفر کی انتہا تک پہنچاتے ہیں نہ یہ کہ مادہ منویہ پشت اور سینے کی ہڈیوں کے درمیان میں پیدا ہوتا ہے تاکہ طب کے قواعد کے خلاف ہو اس لیے کہ ان کے نزدیک منی تمام اعضاء سے لی جاتی ہے اسی لیے بیٹے میں والدین کی مشابہت کا ہر عضو میں مشاہدہ ہوتا ہے اور وہ مادہ دماغ میں جمع ہو کر وہاں سے رگوں کے راستے کانوں کے پیچھے گرتا ہے۔

اور جب انسان کو اپنی جان کی بقاء حضرت حق تعالیٰ کے قبضہ اور تصرف میں ہونے کا علم ہو گیا اور اپنی غذا کے متفرق اجزا کے جمع ہونے کی کیفیت اور ابتدائے خلقت میں اپنے مادہ کا وجود میں آنا اور اس کے حال کا ایک صورت سے دوسری صورت میں بدلنا اور اس کا ایک جگہ سے دوسری جگہ کی طرف گزرنا بھی ظاہر ہو گیا اور اس نے اپنی ابتدا اور دنیوی زندگی کو خوب جان لیا تو وہ آخرت میں لوٹنے کے مقدمے کو بھی انہیں دو حالتوں پر قیاس کر لے گا اور اسے یقین سے ثابت ہو جائے گا کہ

اِنَّہٗ عَلٰی رَجْعِہٖ لَقَادِرٌ تحقیق اللہ تعالیٰ جو کہ اس مذکورہ طریقے کے ساتھ آدمی کو پیدا کرنے والا ہے یقیناً اسے لوٹانے پر قادر ہے اور حدیث پاک میں وارد ہے کہ جب اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ فرمانے کا ارادہ فرمائے گا تو عرشِ عظیم سے ایک بارش نازل فرمائے گا جس کے پانی میں مرد کے مادہ منویہ کی خاصیت ہے اور اس میں گرہ لگانے کی قوت رکھی گئی ہے تاکہ مردہ جسم کے اجزا کو زندگی قبول کرنے کی استعداد بخشے اور اس کے ساتھ ارواح کا تعلق

درست ہو جائے لیکن یہ لوٹانا اس وقت پر موقوف ہے جس کا بیان اس آیت میں ہے۔

يَوْمَ تُبْلَى السَّرَآئِرُ جس دن کہ پوشیدہ چیزیں ظاہر کر دی جائیں۔

تحقیق مقام

اور اس مقام کی تحقیق یہ ہے کہ دنیا میں آدمی کے بدن کے احکام غالب ہیں اور روح کے احکام مغلوب اس لیے وہ تصنع اور تکلف کے ساتھ اپنی روح کے اوصاف کو اس حد تک چھپا سکتا ہے کہ ان کا اثر بدن پر بالکل ظاہر نہ ہونے دے۔ چنانچہ لوگ بزدلی' بخل اور اپنی دوسری بُری صفات کو تکلف اور تصنع کے ساتھ چھپائے رکھتے ہیں اور گھبراہٹ اور بے چینی کے اثرات اپنے بدن پر ظاہر نہیں ہونے دیتے۔ قیامت کے دن بدن کا حکم مغلوب ہو جائے گا جو تاریکی جو ہر روح میں مخفی تھی' چہرے کی سیاہی کے ساتھ ظاہر ہو جائے گی اور جو ارواح اعضاء میں پھیلی ہوئی ہیں' ان اعضاء کے کردار کی گواہی دیں گی اور باطن کی تمام صفات ظاہر اور منکشف ہو جائیں گی اور جب آدمی کو لوٹانا جزا پہنچانے کے لیے ہے ناچار اس وقت پر ہی مقرر ہو گا اور اس سے پہلے اسے لوٹانا حکمت کے تقاضا کے خلاف ہے۔

اور لغت میں سرائر پوشیدہ چیزوں کو کہتے ہیں اور یہاں عقائد باطلہ' ناپاک نیتوں اور اچھے بُرے اعمال کے اثرات کو شامل ہے۔ جو کہ آدمی کی روح میں پختہ ہو جاتے ہیں اور اچھے بُرے رنگ کی طرح روح کے چہرے پر جم جاتے ہیں اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ سرائر سے مراد پوشیدہ گناہ اور مکروفریب ہیں جنہیں دنیا میں چھپانے کی کوشش کی جاتی تھی اور بعض نے کہا ہے کہ اس سے مراد ایسے فرائض ہیں کہ جن کا ادا کرنا اور نہ کرنا محض آدمی کے ظاہر کرنے سے وابستہ ہے' کسی دوسرے کو اس پر مطلع ہونا ممکن نہیں جیسے نماز' روزہ' وضو' غسل جنابت' زکوٰۃ ادا کرنا اور دوسرے واجبات جو کہ انسان اور اللہ تعالیٰ کے درمیان واقع ہیں' دوسرے لوگوں کو ان کے مطالبے کا حق نہیں اور ان کی ادائیگی دوسروں سے متعلق نہیں ہے۔ مثلاً بے روزہ آدمی ظاہر کرے کہ میں روزے سے ہوں یا جنبی ظاہر کرے کہ میں نے غسل کیا ہے یا بے وضو شخص کہے کہ میرا وضو ہے یا وہ شخص جو سونے چاندی کی زکوٰۃ نہیں دیتا اور ظاہر کرتا ہے کہ میں نے زکوٰۃ دی ہے صرف اس کے کہنے پر اسے چھوڑ دینا چاہیے اور تعارض

نہیں کرنا چاہیے۔

اور تحقیق یہ ہے کہ سرائر کا لفظ ان چیزوں سے زیادہ عام اور وسیع ہے۔

فَمَا لَهٗ مِنْ قُوَّةٍ تو آدمی کو اس روز اظہار کو روکنے اور اسرار کو چھپانے کی کوئی طاقت نہیں ہوگی جس طرح کہ دنیا میں سنبھالنے اور روکنے کی طاقت رکھتا تھا اور بے چینی کے وقت خود کو مستقل ظاہر کرتا تھا اور پٹائی کے باوجود چوری اور دوسرے جرائم کا اقرار نہیں کرتا تھا۔

وَّلَا نَاصِرٍ اور اس کا کوئی مددگار نہ ہوگا جو کہ جرم ظاہر ہونے کے باوجود اس سے اس کی سزا کو دُور کر دے۔ جس طرح کہ دنیا میں مدد کرنے والے اور ساتھی حقوق کے ثابت ہونے کے باوجود بدلہ پہنچانے میں رکاوٹ بن جاتے ہیں اور چھڑا لیتے ہیں اور جب دنیا میں جرم اور گناہ سے نجات کی راہ انہیں دو طریقوں میں منحصر ہے یا تو اس گناہ کو چھپانے میں پوری قوت کے ساتھ کوشش کر کے اسے ثابت نہ ہونے دے یا ظاہر کرنے کے باوجود ساتھیوں اور حامیوں سے مدد لے کر اس کی سزا سے بچ جائے اس روز ان دونوں طریقوں کی نفی کر دی گئی ہے اور انہیں ختم کر دیا گیا ہے تاکہ مستحق تک جزا کے پہنچنے میں کوئی اختلاف اور کوتاہی راہ نہ پائے ورنہ اس دن کا مسئلہ بھی دنیا کی طرح درہم برہم ہو جائے اور روز فصل نہ رہے۔

اگرچہ ان آیات میں دو مضمون بیان کیے گئے' ایک تو یہ کہ روح اور جسم کی ترکیب کے ساتھ آدمی کو لوٹانا اللہ تعالیٰ کی قدرت میں داخل ہے اور دوسرا یہ کہ قیامت کا دن مخفیات اور پوشیدہ چیزوں کے ظاہر ہونے کا دن ہے کہ نفس کے اندر مخفی حالات اس دن ظہور پذیر ہوں گے اور کسی حیلہ و تدبیر کے ساتھ انہیں روکنا ممکن نہیں ہوگا' ان دونوں مضامین کو ثابت کرنے کے لیے قسم کی صورت میں دو اور دلیلیں بیان کی جا رہی ہیں۔

وَالسَّمَآءِ ذَاتِ الرَّجْعِ مجھے گردش والے آسمان کی قسم ہے جو کہ ہمیشہ حرکت دوریہ میں اپنی چھوڑی ہوئی طرز کو پھر طلب کرتا ہے اور دن رات کے ہر دورے میں اپنی چھوڑی ہوئی طرز کی طرف رجوع کرتا ہے۔ بعض ستارے سال میں اور مہینے میں اور بعض اس سے زائد مدت میں اپنے چھوٹی ہوئی طرزوں کی طرف رجوع کرتے ہیں تو روح انسانی کا اپنی

چھوڑی ہوئی زندگی کی طرف رجوع کرنا اور اپنے پرانے بدن کی تدبیر کرنا کیا بعید ہے؟ کہ اس کی مثل عمل کا فلک کی حرکت دوریہ میں ہر دن رات میں مشاہدہ ہوتا ہے۔

وَالْاَرْضِ ذَاتِ الصَّدْعِ اور مجھے زمین کی قسم ہے جو کہ پھٹنے اور ظاہر کرنے والی ہے۔ قسم قسم کی نباتات اس کے باطن سے ظاہر میں آتی ہیں' چشمے جاری ہوتے ہیں اور اس کی کانوں سے سونا اور جواہرات نکالے جاتے ہیں تو نفسِ انسانی میں سپرد کیے گئے اسرار کا قیامت کے دن ظاہر ہونا بعید نہ رہا۔ اس لیے کہ جب خزاں کے دنوں میں زمین کو دیکھا جاتا ہے' تمام نباتات اس میں چھپے ہوئے اور پوشیدہ ہیں اور جیسے ہی موسمِ بہار پہنچا اور بارش کے پانی نے زمین کے اجزا میں مخلوط ہو کر انہیں نشوونما دی' وہ تمام پوشیدہ چیزیں ظاہر میں جلوہ گر ہو گئیں اور عالمِ آخرت میں روح کے اثر کے فیضان کی وجہ سے نفس کی یہی حالت ہے۔

اور بعض مفسرین نے رجع کو بارش پر محمول کیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ زمین اور دریا کے بخارات اوپر اُٹھ کر جب طبقۂ زمہریر کے پاس پہنچتے ہیں تو پانی ہو کر ٹپک پڑتے ہیں اور اس تفسیر پر بھی بخارات کے مادہ کے لیے اپنے اصلی مکان کی طرف رجوع ثابت ہوا اور وہ انسان کے عالمِ روحانی کی طرف لوٹنے کی دلیل ہے جو کہ اس کا اصلی ٹھکانہ تھا اور اس سخن سے پہلا مضمون ثابت ہوتا ہے۔

اِنَّهٗ تحقیق یہ بات کہ حق تعالیٰ انسان کو لوٹانے پر قادر ہے اور اس کا لوٹانا اسرار کے ظہور کے وقت کے ساتھ مقرر ہے جو کہ قیامت کا دن ہے۔

لَقَوْلٌ فَصْلٌ البتہ ایک واضح سی بات ہے کہ جس میں کوئی شبہ نہ رہا۔ وَمَا هُوَ بِالْهَزْلِ اور یہ بات کوئی بے ہودہ بات نہیں جس کی کوئی قوی دلیل نہ ہو اور تخیل کے طور پر دل میں گزری ہو اور شاعروں کے مبالغہ کی طرح بے حقیقت ہو جس طرح کہ کفار کہتے ہیں کہ قیامت اور جزا کے دن کے متعلق انبیائے علیہم السلام کے وعدے وعید اسی طرح کے ہیں جیسے موہومہ چیزوں سے بچوں کو ڈراتے ہیں تا کہ خوشی نہ کریں اسی طرح انبیائے علیہم السلام نے اس مقصد کے لیے جہاں کی رسم خراب نہ ہو اور بُری رسمیں اور بُرے اعمال رائج نہ ہوں' ازرہ عقل وعدہ اور وعید کے ساتھ رغبت دلاتے اور ڈراتے ہیں۔ حقیقت میں یہ چیزیں

محالات کے قبیلے سے ہیں اور ان کے محال ہونے کو ثابت کرنے کے لیے بعید از امکان شبہات کا ذکر کرتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے

اِنَّهُمْ تحقیق یہ کفار جو کہ قرآن پاک کو کلام فصل تسلیم نہیں کرتے بلکہ ہزل گمان کرتے ہیں۔

یَكِيْدُوْنَ كَيْدًا مضامین قرآن کو رد کرنے کے لیے ازرہ مکر وفریب حیلے تراشتے ہیں اور بعید قسم کے شبہات لاتے ہیں تاکہ عوام کے نزدیک اس کا ہزل ہونا ثابت ہو۔

وَاَكِيْدُ كَيْدًا اور میں بھی ان کے مقابلے میں اپنی خفیہ تدبیر فرماتا ہوں تاکہ اس کا مدلل اور واضح کلام ہونا عام خاص کے نزدیک ظاہر ہو جائے۔ اس لیے کہ جب بھی کفار جزا' حشر اور نشر کے وقوع کے بعید ہونے میں کوئی شبہ بروئے کار لاتے تھے اس کے جواب میں حشر ونشر کے وقوع کے بارے میں جزا کے مقدمات کی مثال اور دلیل زیادہ واضح ہوتی یہاں تک کہ اجمال تفصیل تک جا پہنچا اور اس میں کوئی شک شبہ نہ رہا۔ پس ان کے شبہات' مطالب کو زیادہ ثابت کرنے اور مقصد کو زیادہ واضح کرنے کا موجب ہوئے اور کفار اس معنی سے بے خبر رہے اور کید کی حقیقت یہی ہے کہ بے خبر مخالف کو ملزم بنا دیں اور اس کے مطلوب کے خلاف چیز کو بروئے کار لائیں۔

اور اگرچہ اللہ تعالیٰ قادر ہے کہ کفار کے باخبر ہونے کی صورت میں بھی اثبات مطلب کو بروئے کار لائے لیکن بے خبری کے الزام میں ان کی انتہائی ذلت ورسوائی مقصود ہے اس لیے کہ وہ بدبخت بھی اللہ تعالیٰ کے رسولوں علیہم السلام کی پریشانی کا قصد کرتے تھے اور جب ثابت ہو گیا کہ اس وقت جو کہ نزولِ وحی اور اسلام کے اوائل کا وقت تھا اور عقائد اسلام کو باطل کرنے میں قسم قسم کے شبہات لانا اس اعتبار سے کہ دلائل اسلامی کی ترقی اور اس کے عقائد واضح ہونے کا موجب ہے اور جب تک وہ زندہ ہیں اور شبہات قائم کر رہے ہیں۔ گویا دلائل اسلام کی ترقی میں کوشش کر رہے ہیں اس وجہ سے کہ بے خبر ہیں کفار کا ہونا عین حکمت اور سراسر منفعت ہے تو اس وقت ان کی ہلاکت کی دعا مناسب نہ تھی اگرچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم چاہتے کہ وہ جلد ہلاک ہوں اسی لیے ارشاد ہوا

فَمَهِّلِ الْكَافِرِيْنَ پس کفار کو مہلت دیں اور ان کی ہلاکت کی دعا میں جلدی نہ کریں تاکہ ان کے شبہات کی وجہ سے ان کے جواب میں پے در پے وحی کا نزول ہو اور شریعت اور دین کے حقائق اور حشر و نشر کے حالات کی کما حقہ تحقیق و تفصیل ہو سکے۔ اس کے بعد جب دین پورے طور پر ظاہر ہو جائے اور الزام حجت اور شبہات کا رد انتہا تک پہنچ جائے اس وقت ہم آپ کو جہاد اور لڑائی کا حکم دیں اور آپ کے ہاتھوں انہیں ہلاک کریں۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے

اَمْهِلْهُمْ رُوَيْدًا آپ انہیں تھوڑے سے وقت کے لیے مہلت دیں جو کہ بعثت شریفہ کی ابتدا سے چودہ سال کے قریب تھا اور اسی اثناء میں ان کے دلوں میں جو شبہ گزرا' انہوں نے وارد کیا اور اس کا جواب پایا۔ اس کے بعد ان کے ذہن میں کوئی شبہ نہ رہا اور ان کا عناد اور سرکشی ظاہر ہو گئی اور سزا اور وار نگ کے قابل ہو گئے اور اتنی مدت مہلت دینے میں نکتہ یہ ہے کہ یہ مقدار آدمی کے سنِ بلوغ کی ہے کہ جب وہ اس عمر کو پہنچتا ہے اس کی عقل اور جسم کامل ہو جاتے ہیں اور وہ سزا و جزا کے لائق ہو جاتا ہے۔ پس بعثت کی ابتدا میں مکہ اور عرب کے کفار بچے کا حکم رکھتے تھے کہ انہیں آہستہ آہستہ شریعت کی سمجھ' دلائل میں غور و فکر اور دین کے قواعد کے حسن و قبح کو جاننے کی تعلیم و تربیت منظور تھی۔ اور اس باب میں معجزات اور آیات کو ظاہر کرنا کافی تھا اور جب اس مدت تک ان میں سے بعض اصلاح پذیر نہ ہوئے اور پوری پرورش کے باوجود ادب سکھانے اور سزا دینے کے محتاج ہوئے تو جہاد اور لڑائی کا حکم نازل ہوا۔

سورۃ الاعلیٰ

سورۃ الاعلیٰ مکی ہے اس سورۃ میں انیس (۱۹) آیات' بہتر (۷۲) کلمات اور دو سو اکہتر (۲۷۱) حروف ہیں۔

رابطے کی وجہ

اور سورۂ طارق کے ساتھ اس سورۃ کے رابطے کی وجہ یہ ہے کہ اس سورۃ میں بیان فرمایا

گیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہر نفسِ انسانی کا ایک محافظ ہے جبکہ اس سورۃ میں اس بات کا ذکر ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نفسِ مقدس کی خود خدا تعالیٰ اس امر سے حفاظت فرماتا ہے کہ علومِ غیبیہ کی وحی فراموش ہو جائے۔ نیز وہاں انسان کی تخلیق کی ابتدا کی کیفیت کا بیان ہے کہ اس کا نطفہ کہاں سے آتا ہے اور کہاں سے گزرتا ہے جبکہ یہاں اس کی تخلیق کی انتہا کی کیفیت کا بیان ہے کہ پوری تربیت کے بعد اس نے کیا صورت اختیار کی ہے۔ نیز وہاں قرآن پاک کے اوصاف کا ذکر ہے کہ فی نفسہ اس اعجاز پر مبنی کلام کا کیا مرتبہ ہے جبکہ یہاں بھی آدمیوں کی نسبت سے قرآن مجید کے اوصاف کا بیان ہے کہ اس پر عمل نجات کا موجب ہے اور اس سے روگردانی ہلاکت کا باعث اور ان مضامین کا آپس میں جو رابطہ ہے' پوشیدہ نہیں ہے۔

وجہ تسمیہ

اور اس سورۃ کا نام سورۃ الاعلیٰ اس لیے رکھا گیا ہے کہ اس کی ابتدا میں اسمائے حسنیٰ میں سے یہ نام مذکور ہے اور اس نام کی حقیقت اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ اللہ تعالیٰ ہر کمال کا مرجع ہے۔ اس کمال کے آغاز میں بھی اور انتہا میں بھی اس لیے کہ اس عالم میں مرتبہ کی بلندی دو قسموں میں منحصر ہے' ایک قسم ابتدا کی بلندی ہے کہ کمال وہاں سے شروع ہوتا ہے اور ایک قسم انتہا کی بلندی کہ کمال وہاں ختم ہوتا ہے اور جو دونوں قسموں کا جامع ہے' اعلیٰ ہے جب حق تعالیٰ کا اس نام سے ذکر کیا گیا تو معلوم ہوا کہ اس کے کمالات نقصان میں ہرگز نہیں رہتے ورنہ ابتدا یا انتہا میں اس کے علو مرتبت میں قصور لازم آئے۔ پس حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس نام کے صرف ذکر سے ہی قلبی اطمینان حاصل ہو جائے اور قلبِ مقدس میں پیدا ہونے والا اندیشہ بالکل زائل ہو جائے۔

سبب نزول

اور اس سورۃ کے نزول کا سبب یوں بیان کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر طویل سورتوں کی وحی شروع ہوئی اور جبرئیل علیہ السلام کے واسطے سے غیب سے بے حد و حساب علوم اُترنا شروع ہوئے تو آپ کے دل مبارک میں یہ اندیشہ گزرتا تھا کہ میں بالکل اُمی ہوں'

ان الفاظ اور ان معانی کو لکھے بغیر اور کتاب کی طرف رجوع کیے بغیر یاد رکھنا مجھ سے کیسے ممکن ہوگا؟ کہیں ایسا نہ ہو کہ اس میں سے کچھ فراموش ہو جائے اور رسالت کی ذمہ داری میں فرق پڑ جائے۔ حق تعالیٰ نے آپ کے قلب مقدس کی تسلی کے لیے یہ سورۃ اُتاری اور اس میں بشارت دی کہ رب العزت آپ کی استادی خود فرمائے گا' آپ کو سبق فراموش ہونے کا خطرہ بالکل نہیں ہونا چاہیے۔

اسی لیے حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس سورۃ کو بہت پسند فرماتے تھے اور اکثر اوقات وتر کی پہلی رکعت اور جمعۃ المبارک کی پہلی رکعت میں اس کی تلاوت فرمایا کرتے تھے اور اکثر پہلے بزرگانِ دین نمازِ تہجد میں اس سورۃ کو پڑھا کرتے تھے اور اس کی برکت کے امیدوار ہوتے۔

اور حضرت عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ جب آیت فَسَبِّحْ بِاسْمِ رَبِّكَ الْعَظِيْمِ نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں حکم دیا کہ اس تسبیح کو اپنے رکوع میں کرلو۔ یعنی رکوع میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْعَظِيْمِ کہو۔ اور جب آیت "سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى نازل ہوئی تو فرمایا کہ اس تسبیح کو اپنے سجدے میں بجا لاؤ یعنی سجدے میں سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى کہو۔ نیز حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ جو شخص سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى پڑھے' اسے چاہیے کہ اس کے بعد سُبْحَانَ رَبِّيَ الْاَعْلٰى کہے تاکہ حکمِ خداوندی کی تعمیل کا شرف حاصل کرے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

سَبِّحِ اسْمَ رَبِّكَ الْاَعْلٰى اپنے پروردگار کے نام کو پاک جان جو کہ ہر بلند سے زیادہ بلند ہے۔

یہاں جاننا چاہیے کہ اکثر مفسرین کے نزدیک نام کو پاک جاننا ذات کو پاک جاننے سے کنایہ ہے اس لیے کہ عرب کا قاعدہ ہے کہ تعظیم و ادب کے مقام میں ذات سے نام کے ساتھ تعبیر کرتے ہیں جیسا کہ عرف میں مشہور ہے کہ بادشاہوں اور سرداروں کو خطاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ حضرت کے نام سے یہ کام ہو گیا اور یہ فتح میسر آئی اور اگر سبح ربک کہا جاتا

تو تعظیم وادب کی رعایت حاصل نہ ہوتی۔ نیز حضرت حق جل شانہ کی ذات کو اس کے سوا کوئی نہیں جانتا تو اس کی ذات کو پاک جاننے کا معنی یہی ہے کہ اس ذات پاک پر ناقص اور خلاف ادب ناموں کا اطلاق نہ کریں۔

ذاتِ حق کو پاک جاننے کا مفہوم

اور ذاتِ حق کو پاک جاننے کا معنی جس قدر شریعت میں وارد ہے یہ ہے کہ اجمالی طور پر جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات عقول واوہام کی گرفت سے بالاتر ہے اور کوئی غیر موزوں وصف' نقصان اور عیب اس کے سراپردۂ جلال کے قریب نہیں پھٹکتا۔

اور تفصیل کے ساتھ سمجھنا چاہیے کہ وہ ذاتِ اقدس جوہر نہیں اور جسم نہیں ہے اور عرض نہیں ہے اور کل اور بعض کی اس میں کوئی گنجائش نہیں ہے اور اسے صورت' جہت' حد' انتہا' مکان اور مجلس بالکل لاحق نہیں۔ اور کوئی شے اس کے مشابہ نہیں ہے اور وہ کسی چیز کے ساتھ مشابہت نہیں رکھتا۔ پس مثل اور شریک سے' بیوی اور بیٹے سے' اور کھانے پینے' اور ان سب چیزوں سے جو حدوث کو لازم ہوں یا زوال وفنا کا موجب ہوں' وہ ذات پاک منزہ اور مبرا ہے۔

اور مفسرین کی ایک جماعت نے کہا ہے کہ جس طرح اللہ تعالیٰ کو پاک جاننا فرض ہے اسی طرح اس کے اسماء کی تعظیم اور احترام بھی واجب ہے۔ پس اس آیت میں اللہ تعالیٰ کے نام کو پاک رکھنا مراد کیوں نہ ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کے اسماء کو پاک رکھنا یہ ہے کہ اس کا نام اس چیز سے نہ لیں جو نقصان اور عیب پر دلالت کرے اور اس کے ناموں کو اس کے غیر پر جاری نہ کریں اور اللہ تعالیٰ کے نام کا ذکر تعظیم کے طریقے' طہارت کی شرط' حضور قلب اور کمال توجہ کے ساتھ بجالائیں تاکہ اس سے دل کی صفائی حاصل ہو اور اچھے نتائج برآمد ہوں۔

اور ظاہر یہ ہے کہ اعلیٰ رب کریم کی صفت ہے اس لیے کہ اگلی صفات یعنی اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی وغیرہا صفاتِ رب ہیں نہ کہ صفاتِ اسم اور بعض صوفیاء نے فرمایا ہے کہ اعلیٰ صفتِ اسم ہے۔

تصوف کا ایک مسئلہ

اور وہ مسائل تصوف میں سے ایک مسئلہ کی طرف اشارہ ہے اس لیے کہ اہلِ تصوف

کے نزدیک مخلوقات میں سے ہر مخلوق کے لیے اسمائے الٰہیہ میں سے ایک رب ہے جو کہ اس مخلوق کے تعین کا مبداء اور اس مخلوق کی انتہا کا مرجع ہے اور اس کے سفر کا منتہی ہے اور روح محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات جو کہ اکمل مخلوقات ہے' کا رب اسم اعلیٰ ہے اور وہ ذات مع جمیع الصفات سے عبارت ہے اور اس اسم کی تسبیح کا معنی یہ ہے کہ حق کے ماسوا سے تجرد اختیار کرو اور غیر کو دیکھنے سے اپنی حفاظت کرو تا کہ تمہاری ذات پر کمالات حقانیہ پورے طور پر تجلی فرمائیں کیونکہ تمام کمالاتِ الٰہیہ کو قبول کرنے کی مکمل استعداد ذاتِ محمدی علی صاحبہا الصلوٰۃ والتسلیمات کے سوا کسی مخلوق کو حاصل نہیں ہے اور ہر چیز کی تسبیح جو کہ اس چیز کے ساتھ خاص ہے' اسمائے الٰہیہ میں سے اسی اسم کی تسبیح ہے جو کہ اس چیز کا مربی اور اس کے کمال کا مرجع ہے۔

(اقول و باللہ التوفیق جب کمالاتِ الٰہیہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم پر پورے طور پر متجلی ہیں جیسا کہ مفسر علام نے نقل فرمایا تو ان کمالاتِ حقانیہ کے جلووں سے ذات پاک حبیب علیہ الصلوٰۃ والسلام روشن اور منور ہے اور آپ کی ذات مقدس کمال کی ہر نقیض سے پاک ہے۔ سچ فرمایا حضرت شیخ محقق دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے

ہر نعمتے کہ داشت خدا شد بروتمام

اسی لیے امام اہلِ سنت اعلیحضرت بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نقل فرماتے ہیں هو صلی اللہ علیه وسلم خزانة السر وموضع نفوذ الامر جعل خزائن کرمه و موائد نعمه طوع یدیه لیطی من یشاء ویمنع من یشاء لاینفذ امر الا منه ولاینقل خیر الاعنه حضورِ اقدس صلی اللہ تعالیٰ علیہ وسلم خزانۂ الٰہی اور جائے نفاذ حکم خداوندی ہیں۔ رب العزت جل جلالہ نے اپنے کرم کے خزانے اپنی نعمتوں کے خوان حضور کے قبضے میں کر دیئے جسے چاہیں دیں اور جسے چاہیں نہ دیں' کوئی حکم نافذ نہیں ہوتا مگر حضور کے دربار سے کوئی نعمت' کوئی دولت کسی کو نہیں ملتی مگر حضور کی سرکار سے صلی اللہ علیہ وسلم یہی معنی ہیں اس ارشاد کے کہ اِنَّمَا اَنَا قَاسِمٌ وَاللّٰهُ يُعْطِيْ جز ایں نیست میں ہی بانٹنے والا ہوں اور اللہ دیتا ہے۔

لا ورب العرش جس کو جو عدان سے ملا

بٹتی ہے کونین میں نعمت رسول اللہ کی

(الناقل محمد محفوظ الحق غفرلہ)

خلاصہ کلام یہ کہ اس اسم کو یہاں لانا اس مقصد کو بیان کرنے کے لیے ہے کہ اے حبیب پاک علیک السلام کہ آپ میں جو کمال بھی متجلی ہوا ہے اس کے نقصان کا خوف نہ کریں اس لیے کہ آپ کا پروردگار وہی ہے اعلیٰ جو کہ ہر کمال کا مبداء اور مرجع ہے اور ہر چیز کو اپنی شان کے لائق کمال کی حد تک پہنچاتا ہے اور تکمیل و تربیت میں اس کے افعال ناقص نہیں رہتے۔ چنانچہ اس مقصد کی گواہی کے لیے اور یہ ثابت کرنے کے لیے کہ اللہ تعالیٰ ہر کمال کا مبداء اور مرجع ہے' تین اور صفات لا کر فرمایا جا رہا ہے۔

اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی آپ کا پروردگار وہ ذات ہے جس نے ہر چیز کو پیدا فرمایا۔ پس اسے پورا فرمایا اور معتدل بنایا۔ حاصلِ گفتگو یہ کہ اس نے ہر چیز کی پیدائش کو اس چیز سے مقصود خواص' منافع اور فوائد کے اعتبار سے حد کمال تک پہنچایا اور اسے ایک خاص مزاج بخشا جو کہ اس کمال کو قبول کرے اور اس سے وہ منافع اور فوائد ظاہر ہوں۔ چنانچہ جو شخص انسان اور ہاتھی سے لے کر مچھر اور پسو تک کا مطالعہ کرے اور اسی طرح نباتات کا تجسس کرے تو یقین سے جان لے کہ ہر چیز کو اس کے فوائد اور منافع حاصل کرنے کے اسباب عطا فرمائے گئے ہیں۔

وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی اور آپ کا پروردگار وہ ذات ہے جس نے ہر کسی کے لیے کوئی نہ کوئی کمال مقدر فرمایا۔ پس اس نے اس چیز کو اپنے کمالات حاصل کرنے کی راہ دکھائی ہے یہاں تک کہ ماں کے پیٹ میں بچے کو پیٹ سے باہر آنے کی کیفیت الہام فرمائی جاتی ہے۔

اور پیٹ سے باہر آتے ہی اسے پستان سے دودھ چوسنے اور رو کر شکایت کا اظہار کرنے کا الہام ہوتا ہے۔ اور ہر نر کو مادہ پر کودنے' پانی میں تیرنے' کنواں پہچاننے اور روزی کی دوسری مصلحتیں غیب سے تلقین کی جاتی ہیں اور شہد کی مکھی کو ماہر انجینئر بنایا گیا ہے کہ عجیب گھر بناتی ہے پھر اس سے شہد نکالتی ہے۔ اور کہتے کہ افعی جو کہ ایک سخت زہریلی قسم کا سانپ ہوتا ہے' موسم سرما میں ہوا کی ٹھنڈک کی وجہ سے اندھا ہو جاتا ہے اور جب بہار کے دن آتے

ہیں تو سونف کے پودے کا قصد کرتا ہے اور اپنی آنکھیں اس کے پتوں پر کھجلاتا ہے تاکہ بینا ہو جائے۔

اور وہ الہامات جو کہ پرندوں' وحشی جانوروں' چارپایوں اور کیڑوں مکوڑوں کو روزی کے اسباب حاصل کرنے' توالد و تناسل اور دوسرے ضروری امور میں ہوتے ہیں' عجائب المخلوقات کی کتابوں میں شرح وبسط کے ساتھ بیان کیے گئے ہیں اور حکماء نے کہا ہے کہ ہر مزاج ایک خاص قوت کی استعداد رکھتا ہے اور ہر قوت ایک کام کی لیاقت کے لیے معین ہے تو تقدیر اس بات سے عبارت ہے کہ جسم کے اجزا کو اس طرح مرکب کیا جائے کہ ایک قوت کو قبول کرنے کے لیے مستعد ہو جبکہ ہدایت اس قوت کا فیض دینے سے عبارت ہے تاکہ معین کام کا مصدر قرار پائے اور اس انداز تصرف سے جہان کی مصلحتوں کا انتظام ہو۔

وَالَّذِیْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی اور تیرا پروردگار وہ ذات ہے کہ جس نے اپنی قدرت سے اس چیز کو نکالا جسے جانور چرتے ہیں' قسم قسم کی گھاس جسے چارپائے اور وحشی جانور کھاتے ہیں اور رنگارنگ پھول کہ شہد کی مکھی اور دوسرے پرندے اسے غذا بناتے ہیں اور قسم قسم کی کھیتیاں' میوے اور پھل جنہیں انسان اور بعض جانور کھا کر نفع پاتے ہیں۔

فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی پس اس چراگاہ کو خشک سیاہ کر دیا کیونکہ موسم سرما کی خشکی اور ٹھنڈک کی وجہ سے اس کی رطوبت اور تری زائل ہو جاتی ہے اور خشک اور سیاہ ہو کر ذخیرے کے کام آتی ہے تاکہ نہ ملنے کے وقت صرف ہو سکے۔

مذکورہ تین صفات کے بیان کی حکمت

یہاں جاننا چاہیے کہ یہ بات ثابت کرنے کے لیے کہ پروردگارِ عالم ہر بلند سے بلند تر ہے اور ہر کمال کی ابتداء و انتہاء کا مرجع ہے' ان تینوں صفات کو اختیار فرمایا گیا ہے اس کا نکتہ یہ ہے کہ جہان میں کمال تین قسموں سے باہر نہیں ہے۔ اس لیے کہ ہر شے کا کمال یا اپنی ذات میں ہے یا دوسرے کو نفع دینے کے لیے اور کمال ذاتی یا جسم اور ظاہر کے اعتبار سے ہے یا روح اور باطن کے اعتبار سے تو کمال ذاتی جس کا تعلق جسم اور ظاہر کے ساتھ ہے' ثابت کرنے کے لیے اَلَّذِیْ خَلَقَ فَسَوّٰی لایا گیا' ۔ لیے کہ ہر چیز کے جسم کی پیدائش میں

اعتدال' اعضاء کے تناسب اور ہاتھ کو ہاتھ کے ساتھ' کان کو کان کے ساتھ' آنکھ کو آنکھ کے ساتھ اور پاؤں کو پاؤں کے ساتھ برابر کرنے کی رعایت کمال اور خوب صورتی کے ساتھ ہمارے مشاہدے میں ہے اور محسوس ہو رہی ہے۔

اور کمال ذاتی کو جو کہ روح کے ساتھ تعلق رکھتا ہے' ثابت کرنے کے لیے وَالَّذِیْ قَدَّرَ فَهَدٰی لایا گیا اس لیے کہ ارواح کو استعدادوں کے اندازے کو مختلف کرنا پھر استعداد کے مطابق راہ دِکھانا تا کہ اس کمال کو حاصل کرے جو کہ اس کی استعداد کے لائق ہے' بھی مشاہدے میں ہے اور محسوس ہو رہا ہے۔

اور وہ کمال جس کا تعلق دوسرے کو نفع دینے کے ساتھ ہے' ثابت کرنے کے لیے وَالَّذِیْ اَخْرَجَ الْمَرْعٰی فَجَعَلَهٗ غُثَآءً اَحْوٰی لایا گیا ہے اس لیے کہ گھوڑوں کا چارہ انسانوں کی غذا اور قسم قسم کی خوشبویات اور ملبوسات' ادویات اور زہریں پیدا کرنا اور انہیں ایک وقت تک ترادت اور رطوبت کے ساتھ نشو ونما دینا اور اس کے بعد رطوبتوں میں خشکی اور ٹھنڈک مسلط کر کے ان سے فضلہ دُور کرنا تا کہ طویل مدت تک پڑے رہنے کی وجہ سے ان میں تعفن پیدا نہ ہو اور انہیں ذخیرہ کیا جا سکے اس کمال کی ابتدا اور انتہا پر قوی دلیل ہے۔

اور جب معلوم ہو گیا کہ حق تعالیٰ رَبِّ اعلیٰ ہے کہ ہر کمال کا مرجع ہے ابتدا میں بھی اور انتہا میں بھی اور آپ کو اس کے نام کی تسبیح کی وجہ سے اس ذات پاک سے عظیم مناسبت حاصل ہو گئی تو اپنے کمال کے نقصان کے متعلق فکر مند نہ رہیں اس لیے کہ

سَنُقْرِئُكَ ہم آپ کو قرآن اور اس سے نکلنے والے بے انتہا علوم خود پڑھائیں گے اور آپ اس تسبیح کے ساتھ اپنے قلب مقدس کا تصفیہ فرمائیں تا کہ کوئی حجاب نہ ہو۔

فَلَا تَنْسٰی پس آپ نہیں بھولیں گے اس لیے کہ تصفیہ قلب کی وجہ سے آپ کی استعداد کامل ہو جائے گی اور غیبی فیض کے آگے کوئی حجاب نہیں ہو گا۔

اِلَّا مَاشَآءَ اللّٰهُ یعنی جو علوم غیب آپ کی استعداد کے لائق ہیں اور روزِ میثاق جو کہ استعدادات کی تقسیم کا وقت تھا' آپ کے حصے میں آئے' ان میں سے آپ کوئی چیز فراموش نہیں کریں گے مگر جو خدا تعالیٰ نے چاہا ہے اور اس کی حکمت تقاضا فرماتی ہے کہ اس دنیا میں

آپ کے ذہن سے فراموش ہو جائے تا کہ قیامت کے دن محمود کے حصول کے لیے ذخیرہ ہو۔ چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ مقامِ محمود میں مجھے اس قسم کے محامد الٰہی تعلیم دی جائیں گی جو کہ اس وقت میرے ذہن میں حاضر نہیں ہیں اور بلاشبہ وہ محامد الٰہیہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی استعداد میں درج تھیں اور آپ عالمِ روحانی میں ان محامد پر اجمال توجہ رکھتے تھے۔ گویا اس دنیا میں کسی حکمت کی بناء پر ان سے بے توجہی کرائی گئی تھی۔

اور بعض قرآنی آیات جو کہ فراموش کرا کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ پاک کی تختی سے محو ہوئیں، وہ بھی ماشاء اللہ میں داخل ہیں کیونکہ فراموش کرانا بھی نسخ کی ہی ایک قسم ہے۔ چنانچہ سورۂ بقرہ میں فرمایا گیا ہے کہ مَا نَنْسَخْ مِنْ آيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَا اَوْ مِثْلِهَا لیکن جاننا چاہیے کہ فراموش کرانا نسخ کی علامت اس وقت ہوگا جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور اُمت کے سب قاریوں کے سینے سے محو ہو جائے ورنہ حدیث صحیح میں وارد ہے کہ ایک مرتبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نماز کی قرأت میں ایک آیت چھوڑ گئے، نماز کے بعد آپ نے ابی بن کعب رضی اللہ عنہ سے پوچھا کہ کیا میں اس سورۃ میں ایک آیت چھوڑ گیا ہوں؟ ابی نے عرض کی ہاں یارسول اللہ! فلاں آیت رہ گئی۔ فرمایا تو نے یاد کیوں نہ کرائی؟ عرض کی کہ میں سمجھا کہ یہ آیت منسوخ ہوگئی۔ فرمایا منسوخ نہیں ہوئی میں فراموش کر گیا تھا اگر منسوخ ہوتی تو میں تمہیں اس کی خبر دیتا۔ (اقول و باللہ التوفیق سہو و نسیان کے متعلق اکابرین کی رائے یہ ہے کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام پر سہو و نسیان جائز ہے لیکن صرف وہاں جہاں مسئلہ شرعی جاری کرنا مراد ہو۔ چنانچہ عمدۃ القاری از علامہ بدرالدین محمود عینی رحمۃ اللہ علیہ ج ۳ ص ۶۴۰ پر ہے۔ ان السهو و النسيان جائزان على الانبياء عليهم الصلوٰة والسلام فيما طريقه التشريع. محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اِنَّهٗ يَعْلَمُ الْجَهْرَ وَمَا يَخْفٰى تحقیق اللہ تعالیٰ آپ میں جلوہ گر ان کمالات کو جانتا ہے جو بالکل آشکار ہیں اور ہر کس و ناکس انہیں دیکھتا اور جانتا ہے اور جو پنہاں ہیں یعنی ابھی تک آپ کے نہاں خانۂ استعداد میں ہیں جو کہ مصلحتوں کے مطابق اپنے وقت پر قوت سے فعل میں ظہور کریں گے اور جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی استادی کے ساتھ تسلی دے دی

گئی تا کہ قرآن کے حفظ سے آپ کا دل فارغ ہو اور آپ کو معلوم ہو کہ پورا قطعاً اور یقیناً بارآور ہونے والا ہے' ایسا نہیں ہے کہ بشری اساتذہ کسی کی تعلیم کے درپے ہوتے ہیں اور وہ شخص اُلجھنوں اور رکاوٹوں کی بناء پر کمال تک نہیں پہنچ پاتا اور ناقص رہتا ہے اب دوسرے علوم کی حفاظت کے متعلق آپ کو مطمئن فرمایا جا رہا ہے کہ

وَنُيَسِّرُكَ لِلْيُسْرٰى اور ہم آپ کے لیے آسانی کی راہ چلنا آسان کر دیں گے جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سب سے قریبی راستہ ہے' عبادت میں بھی اور ملک و ملت کی سیاست میں بھی۔ پس وہ علوم جو ان تینوں چیزوں کے ساتھ متعلق ہیں' فوارے کی طرح آپ کے قلب مقدس سے جوش ماریں گے اور آپ کو ان علوم کے حاصل کرنے میں کوئی مشقت نہیں ہوگی اور آپ کسی کتاب' دستور العمل' مرشد اور استاذ کے محتاج نہیں ہوں گے۔

اور جب یہ معاملہ ایسا ہے تو آپ کو قرآن پاک اور دوسرے علوم یاد کرنے میں مبالغے اور کوشش کی ضرورت نہیں ہے بلکہ آپ کو چاہیے کہ دوسروں کو ان کے بھولے ہوئے علوم یاد دِلائیں اور آپ کمال سے مکمل کرنے والے بنیں کہ آپ کو صرف اُمت کے دُکھ' تکلیف اور تکمیل کے لیے بھیجا گیا ہے' آپ کی تکمیل ہمارے ذمہ کرم پر ہے۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے کہ

فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى تو آپ لوگوں کو یاد دِلائیں اگر یاد دِلانا اور نصیحت کرنا نفع دے تا کہ آپ کا کمال آگے بڑھے اور ہزاروں لوگ آپ کے رنگ میں رنگے جائیں۔

ایک جواب طلب سوال

اور یہاں ایک جواب طلب سوال ہے کہ اکثر مفسرین اس سے پیچ و تاب میں ہیں اور وہ یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب یاد دِلانا اور وعظ و نصیحت کرنا ہے خواہ کوئی قبول کرے یا نہ کرے تو اس شرط کو کس لیے بڑھایا گیا ہے حتیٰ کہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ مراد الٰہی یہ ہے کہ ان نفعت الذکری وان لم ینفع یعنی نفع دے نہ دے تو انہوں نے ایک قرینہ محذوف مانا ہے جیسا کہ رب المشارق اور سرابیل تقیکم الحر میں ہے یعنی والمغارب اور والبرد محذوف ہے اور بعض نے اسی قیاس پر اور جوابات ذکر کیے ہیں۔

اور اس مقام کی تحقیق یہ ہے کہ یاد دِلانا' وعظ اور نصیحت کرنا یہ سب کچھ قبولیت کے

گمان کے ساتھ مشروط ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا منصب ہر کسی کو یاد دِلانا اور وعظ کرنا نہیں ہے ہاں حکمِ الٰہی کی تبلیغ اور اس کے عذاب سے ڈرانا تاکہ الزام حجت ہو اور جہالت اور نہ جاننے کا عذر اُٹھ جائے ہر کسی کے نسبت سے ضروری ہے لیکن اسے تذکیر و موعظت نہیں کہتے اور سورۂ غاشیہ میں قول صحیح کے مطابق کہ الامن تولّٰی و کفر میں استثناء مذکر سے ہے اس شرط کی صراحت سمجھ میں آتی ہے اور کہا جا سکتا ہے کہ یہ شرط تذکیر کے امر کی تاکید کے لیے ہے یعنی اگر کسی کو تذکیر نفع دے تو آپ کو اسے تذکیر یعنی یاد دِلانا چاہیے اور یقین ہے کہ جہان میں کسی کو تو تذکیر ضرور نفع کرتی ہے' گو ہر کسی کو نہیں کرتی تو یہ قطعی الوقوع شرط کے ساتھ کسی شے کے تعلق کے قبیلے سے ہے کہ تاکید کا موجب ہے۔ چنانچہ حدیث صحیح میں ہے کہ قد کان فی ما قبلکم من الامم محدثون فان یك فی امتی احد فانه عمر

دو سوالات اور ان کے جوابات

اور یہاں دو اور سوالات تفاسیر میں مذکور ہیں' انہیں جوابات سمیت لکھا جاتا ہے۔ پہلا سوال یہ ہے کہ شرط کے ساتھ معلق کرنا اس کے حق میں بجا ہے جسے کام کے انجام کی خبر نہ ہو اور حق تعالیٰ جو کہ علام الغیوب ہے' اس کے کلام میں تعلیق بالشرط کا کیا مقصد؟

اس کا جواب یہ ہے کہ انبیاء علیہم السلام کی دعوت اور ان سب کی بعثت ظواہر پر مبنی ہے' مخفیات پر نہیں اسی لیے حضرت موسیٰ علیہ السلام نے حضرت خضر علیہ السلام کی حرکات پر گرفت فرمائی جو کہ بظاہر درست نہ تھیں اور باطن میں اچھی تھیں۔ نیز فرعون سے خطاب کے بارے میں حضور موسیٰ علیہ السلام کو ارشاد ہوا کہ فَقُوْلَا لَهٗ قَوْلًا لَّیِّنًا لَّعَلَّهٗ یَتَذَكَّرُ اَوْ یَخْشٰی یعنی فرعون کے ساتھ نرم بات کریں ہو سکتا ہے کہ وہ نصیحت قبول کرے یا خدا سے ڈرے حالانکہ علمِ الٰہی میں یہ بات مقرر تھی کہ وہ نصیحت قبول نہیں کرے گا اور خدا تعالیٰ سے نہیں ڈرے گا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ وعظ کو تذکیر کا نام کیوں دیا گیا حالانکہ لغت میں تذکیر یاد دِلانے کے معنوں میں ہے اور یاد دِلانے کا تصور اس چیز میں ہے جو پہلے سے معلوم ہو اور فی الحال فراموش ہو گئی ہو۔

اس کا جواب یہ ہے کہ دین' عبادتِ خداوندی اور توحید کی خوبی بنی آدم کی عقلوں میں جبلی اعتبار سے گڑی ہوئی ہے۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ فطرۃ اللہ التی فطر الناس علیھا تو گویا امورِ دین کے متعلق علم ہر شخص کے نفس میں حاصل تھا' فطری اُلجھنوں اور رکاوٹوں کی وجہ سے بُھول گیا۔ اب انبیاء علیہم السلام کی وعظ و نصیحت اس بُھولے ہوئے علم کو یاد دِلانے کے مرتبے میں ہیں اسی لیے بعض عقل والوں نے کہا ہے کہ بنی آدم کی ارواح بدن سے متعلق ہونے سے پہلے ان چیزوں کو جاننے والی تھیں جنہیں جاننا ضروری ہے جب اس دنیا میں تدبیر بدن میں لگ گئیں تو سب کچھ بُھول گیا جیسا کہ شدید بڑھاپے کی حالت میں جبکہ تدبیر بدن مشکل ہو جاتی ہے' سابقہ معلومات فراموش ہو جاتی ہیں تو انہیں یہی فراموش شدہ معلومات انبیاء علیہم السلام اور واعظوں کے ذریعے یاد کرائی جاتی ہیں۔ چنانچہ حدیث الارواح جنود مجندۃ ماتعارف منھا ائتلف وما تناکر منھا اختلف سے اس بات کی مہک سونگھی جاسکتی ہے۔

اور افلاطون سے منقول ہے کہ وہ اپنے شاگردوں سے کہتا تھا کہ میں تمہیں وہ نہیں پڑھاتا جو تم جانتے نہیں بلکہ میں تمہیں وہ کچھ یاد دِلاتا ہوں جو تم جانتے تھے اور جب یہ بیان فرمایا گیا کہ آپ کو مخلوقِ خدا کو نفع پہنچانے کے لیے وعظ کرنا چاہیے اب اس کا بیان ہو رہا ہے جو کہ نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی وعظ سے نفع حاصل کرے گا۔

سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى قریب ہے کہ وہ شخص نصیحت قبول کرے جو کہ خدا تعالیٰ سے ڈرتا ہے یعنی اگرچہ آپ پر عمومی طور پر وعظ کرنا فرض ہے لیکن ہر شخص اس سے نفع نہیں پائے گا بلکہ اس کا نفع استعداد کی شرط کے ساتھ مشروط ہے اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ ۔

اصل استعداد شرط صحبت است
مرد چوں کور ست عینک لعبت است

یعنی صحبت شیخ کے لیے دراصل استعداد شرط ہے جب آدمی اندھا ہو تو عینک ایک کھلونا ہے۔

اور خوفِ خدا کی علامت دل کی نرمی اور معنوی مصاحبوں کی باطل قسم کی باتوں سے

فطرت کا محفوظ ہونا ہے تا کہ روح کی نورانیت اور صفائی تاریکی اور کدورت میں نہ بدلے اور نبوت کی شعاع کا عکس قبول کرے اور بعض مفسرین نے اس آیت کا معنی یوں کیا ہے کہ اگر ایک بار نصیحت کرنے سے نفع ہوا ہو تو بار بار نصیحت کریں اس لیے کہ جو ایک بار نصیحت کرنے سے خدا سے ڈر جائے' وہ جلد پوری نصیحت حاصل کر لے گا اور اس صورت میں اعتراض بھی بالکل زائل ہو گیا اور جسے نصیحت کرنا نفع دے' اس کی علامت بھی درمیان میں آ ئے گی۔ اور باب تفعیل جو کہ تکرار کرنے پر دلالت کرتا ہے اس معنی کے ساتھ پورے طور پر مناسب ہو گیا اور جب نصیحت سے نفع پانے والوں کے بیان سے فراغت ہوئی اب نفع نہ لینے والوں کا بیان ہو رہا ہے۔

وَيَتَجَنَّبُهَا الْأَشْقَى اور اس نصیحت سے وہ شخص کنارہ کرے گا جو انتہائی بدبخت ہے اور درحقیقت یہ وہی ہے جسے کوئی خوف خدا نہیں ہے اور کفر و عناد میں غرق ہے۔ پس حقیقت کلام اس طرح لانا تھی وَيَتَجَنَّبُهَا مَنْ لَّا يَخْشٰى لیکن اس حقیقت کو جتلانے کے لیے کہ جسے خوف خدا نہیں وہ انتہائی بدبخت ہے اَشْقٰى کو مَنْ لَّا يَخْشٰى کی جگہ لایا گیا۔

یہاں جاننا چاہیے کہ آدمی کی بدبختی یہ ہے کہ اس کا اعتقاد اور عمل درست نہ ہو اور جس کا عمل نادرست اور اعتقاد درست ہو' وہ بھی شقی ہے لیکن جو عقیدہ بھی غلط رکھتا ہے' وہ اس کی نسبت زیادہ بدبخت ہے پھر اگر اس کے اعتقاد میں کوئی کوتاہی نری نادانی کی وجہ سے یا سبب جہالت سے مانوس ہونے اور مذاہب باطلہ میں سے کسی مذہب کا مقلد ہونے کی وجہ سے ہو تو اسے ممکن ہے کہ نیکوں کی صحبت اور مرشد کے سمجھانے سے راستے پر آ جائے اور جس کا عقیدہ عناد کی وجہ سے خراب ہے کہ جان بوجھ کر اس نے حق کے انکار کی مشق کی اور اس کی استعداد کے آئینے پر گہرا پردہ پڑ گیا' اس کی اصلاح معلم کی تعلیم اور مرشد کے ارشاد کے ساتھ ہرگز ممکن نہیں رہی' وہ بدبختی کی انتہا کو پہنچ گیا۔ لا تغنی الایات والنذر اسی کے بارے میں ہے یعنی اسے آیات اور ڈرانے والے نفع نہیں دیتے اور اس آیت میں اشقی سے مراد وہی ہے اور اس کے کام کا انجام یہ ہے کہ

الَّذِيْ يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى یہ شخص وہ ہے جو کہ بڑی آگ میں داخل ہو گا جس کا

حال سورۂ واللیل میں اس جگہ پہ ہے جہاں فرمایا گیا ہے کہ فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى اور وہ ایک ایسی آگ ہے جو دوزخ کے نچلے طبقے میں ہے جو کہ ساتویں تہ ہے جو کہ آلِ فرعون اور اس اُمت کے منافقوں اور حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے مائدہ کے منکروں کی جگہ ہے اور دوسری تہوں کی آگ سے زیادہ تیز اور جلانے والی ہے۔

اور اگرچہ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ نارکم ھذہ جزء من سبعین جزء من نار جھنم کلھن مثل حرھا یعنی یہ آتش دنیا گرمی میں جہنم کی آتش کا سترواں حصہ ہے۔ پس جہنم کی آگ کی اصل دنیوی آگ کی بہ نسبت بہت بڑی ہے اسی لیے حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے نار کبری جہنم کی آگ اور نار صغریٰ دنیا کی آگ ہے لیکن جو آگ اُس تہ میں ہے' وہ دوسری تہوں کے مقابلے میں وہی حکم رکھتی ہے جو کہ جہنم کی آگ دنیوی آگ کے مقابلے میں رکھتی ہے۔ پس درحقیقت بڑی آگ وہی ہے۔

اور گرمی کی زیادتی کی وجہ سے اس آگ کو دوسری آگوں کے مقابلے میں ایک مثال کے ساتھ ذہن میں لانا چاہیے کہ سرد علاقوں میں بارش' برف اور بھرپور سردیوں کے وقت ٹھنڈک کے کام میں جیسے ملاحی اور پانی بھرنا خصوصاً ٹھنڈی عمر اور ٹھنڈے مزاج میں جیسے کہ بلغمی مزاج بوڑھا اس قدر جلن رکھتی ہے کہ اسے بدن پر برداشت نہیں کیا جا سکتا پھر اسی آگ کو گرم علاقوں میں' موسمِ گرما کے سورج کی عین گرمی اور گرم کام میں مشغول ہوتے میں جیسے باورچی گری اور روٹی پکانا خصوصاً جب صفراوی مزاج آدمی جو کہ روزہ دار اور بخار میں مبتلا ہو' قیاس کرنا چاہیے کہ کس قدر فرق ہے اور اسی قیاس پر اس آگ کی گرمی کو دوسری آگوں کی گرمی کے مقابلے میں سمجھنا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ آگ کی سب اقسام سے اپنی پناہ میں رکھے۔

اور جب دنیا میں آدمی کو جو مصیبت بھی پیش آتی ہے اس کا آخر انجام یہ ہے کہ موت تک پہنچا دیتی ہے اور موت اس مصیبت سے راحت اور خلاصی پانے کا موجب ہو جاتی ہے جبکہ اس بدبخت کو اس راحت سے بھی محروم کر دیا گیا ہے کہ اس قدر شدت کی گرمی کے باوجود ہلاک نہیں ہوتا۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے

ثُمَّ لَا يَمُوْتُ فِيْهَا پھر اس قدر عذاب کی شدت اور اتنی طویل مدت اس آگ میں رکھنے کے باوجود نہیں مرے گا کہ مر کر اس کے جسم کا ڈھانچہ کھل جائے اور جدا جدا ہو جائے اور اس کی روح اس دکھ سے نجات پائے اس لیے کہ اس جہان کے جسموں کے ڈھانچوں کا کھلنا اور بکھرنا ممکن نہیں ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ اس جہان میں روح کے احکام بدن پر غالب آتے ہیں اور ابدان کو ارواح کا حکم مل جاتا ہے اور روح کو معدوم ہونا محال ہے اسی لیے دنیا میں گرچہ مصیبتیں اور ناقابلِ برداشت صدمے پیش آتے ہیں' روح معدوم نہیں ہوتی بلکہ اسے انتہائی بے چینی اور تکلیف میں چھوڑ کر چلی جاتی ہے اور جب وہاں کے جسموں کو ارواح کا حکم حاصل ہو جائے گا تو ان کی ترکیب کا بکھرنا بھی محال ہو جائے گا۔

وَلَا يَحْيٰى اور نہ زندہ رہے گا اس لیے کہ وہ اس کی روح دائمی طور پر درد اور عذاب میں ہے یہاں تک کہ وہ موت کی آرزو کرتا ہے اور موت نہیں آتی اور اس قسم کی زندگی حقیقت میں زندگی نہیں۔ بیت

عمر چوں خوش گزرو زندگی خضر کم است
وربنا خوش گزرو نیم نفس بسیار است

یعنی جب عمر خوشی میں گزرے تو عمر خضر بھی تھوڑی ہے اور اگر تکلیف میں گزرے تو آدھا سانس بھی بہت ہے ہاں اس کے جسم کی کھال آگ کی تاثیر سے جل جائے گی پھر روح کے غلبے کی وجہ سے آناً فاناً دوسری تازہ کھال جسم پر اُگ آئے گی جس میں درد کے احساس کی قوت پہلے سے زیادہ قوی ہوگی جیسا کہ دنیا میں زخم پر انگور آنے کے بعد مشاہدہ ہوتا ہے۔

اور جب آیت سَيَذَّكَّرُ مَنْ يَّخْشٰى میں اس شخص کا بیان کیا جا چکا جو کہ انبیاء علیہم السلام کی نصیحت سے نفع حاصل کرتا ہے اب فرمایا جا رہا ہے کہ بزرگوں کی وعظ و نصیحت سن کر آدمی کے دل میں خوفِ الٰہی پایا جانا کمال کی ابتدا ہے' کمال کی انتہا اور چیز ہے صرف خوف پائے جانے پر اعتماد نہیں کرنا چاہیے کہ اگر وہ خوف دل میں پیدا ہونے والے خیال کی طرح آیا اور چلا گیا تو کوئی فائدہ نہیں۔ جب وہ دل میں جاگزیں ہو اور قوتوں اور اعضاء کو

نامناسب کاموں سے روک دے اور مناسب کاموں پر پابند کر دے تو اس وقت وہ قابلِ اعتبار ہے اور نجات کا موجب

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی تحقیق وہ خلاصی پا گیا جس نے پاکیزگی حاصل کی۔

پاکیزگی کی چند اقسام

اور پاکیزگی کی چند قسمیں ہیں۔ پہلی قسم نفس کا کفر' شرک' عقائد باطلہ' بُری نیتوں اور مذموم اخلاق جیسے غل یعنی بد باطنی' کینہ' دغابازی' حسد' تکبر وغیرہ سے پاک ہونا۔

دوسری قسم: بدن اور کپڑے کا نجاستوں سے پاک ہونا جیسے خون' پیپ' بول' براز' منی' مذی وغیرہ

تیسری قسم: جسم کا بے وضگی اور جنابت سے وضو اور غسل کے ساتھ پاک ہونا

چوتھی قسم: جسم کا سنت کے طور پر فالتو چیزوں سے پاک ہونا جیسے زیر ناف اور بغل کے بال' ناخن' جسم کی میل کچیل وغیرہ

اور اگر کسی کی ریش یا سر کے بال لمبے ہیں تو اسے ہر ہفتہ میں جمعہ کے دن ان بالوں کو دھونا' کنگھی کرنا اور عطر لگانا سنت مؤکدہ ہے۔

پانچویں قسم: مال کا پاک ہونا' زکوٰۃ اور صدقات دے کر اور سودی مال اور دوسرے حرام طریقوں سے حاصل شدہ مال کو ملانے سے پرہیز کرنا جیسے جوا کھیلنا' بدکاری کی اُجرت' حجامت یعنی سینگ سے چوس کر خون نکالنے کی اُجرت اور وہ مال جو ناپاک چیزوں کی تجارت سے حاصل ہو جیسے مردار کا چمڑا جو رنگا نہیں گیا اور ذبح کی اُجرت اور دوسرے کام جن میں نجاست کے ساتھ ملوث ہونا لازمی ہوتا ہے۔

وَذَکَرَ اسْمَ رَبِّہٖ اور پوری طہارت کے بعد اپنے پروردگار کا نام لیا' ابتدا نماز میں تکبیر تحریمہ کے ساتھ۔ اور دورانِ نماز قرأت' تسبیح' تشہد اور حضور قلبی کے ساتھ۔ اور نماز کے اوقات کے علاوہ زبان اور دل کے ساتھ۔ اس لیے کہ ذکر استعداد کے تصفیہ اور کمالات کا فیض پہنچنے کا موجب ہے اور ذکر میں پروردگار کا نام جس قدر زیادہ واقع ہو' معرفت کا درخت اتنا ہی زیادہ نشوونما پاتا ہے۔

فَصَلّٰی پس اس نے نماز ادا کی اور جو ذکر دل اور زبان سے کرتا ہے' اعضاء کے افعال ملا کر اسے ایک مخصوص شکل کا لباس پہناتا ہے اور دل' زبان اور اعضاء کی موافقت کی وجہ سے منعم حقیقی کی نعمتوں کے شکر کا مرتبہ کامل حاصل کرتا ہے۔

اکابرین کے تفسیری اقوال

حضرت مولانا یعقوب چرخی رحمۃ اللہ نے فرمایا ہے کہ اس آیت میں منازل سلوک کا اشارہ ہے جس کی ابتدا توبہ اور اس کے بعد بُری صفات زائل کر کے اور اچھے اوصاف حاصل کر کے نفس کو پاک اور صاف کرنا ہے اس کے بعد لسانی' قلبی' روحی اور سری ذکر کا دوام ہے اس کے بعد مشاہدات تک پہنچنا ہے۔ پس قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى پہلے مرتبہ کا اشارہ ہے اور ذَكَرَ اسْمَ رَبِّهٖ ذکر قلبی کے دوام کا اشارہ ہے اور فصلیٰ مرتبہ مشاہدہ تک پہنچنے کا اشارہ ہے کیونکہ اَلصَّلٰوةُ مِعْرَاجُ الْمُؤْمِنِیْنَ

حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے جو صدقہ فطر ادا کرے اور عیدگاہ کے راستے میں اور عیدگاہ میں پہنچنے پر تکبیرات عید کہے اور نمازِ عید ادا کرے' مجھے امید ہے کہ اس آیت کی بشارت میں داخل ہو جائے گا۔ پس اس سورۃ میں لفظ تزکیٰ زکوٰۃ سے لیا گیا ہے اور صدقہ فطر جو کہ واجب یا فرض ہے' زکوٰۃ کا حکم رکھتا ہے تو یہ لفظ صدقہ فطر دینے کا اشارہ ہوگا اور وذکر اسم ربہ تکبیرات اور فصلی نمازِ عید کا اشارہ ہے۔

خلاصۃ الکلام یہ ہے کہ اس تفسیر سے حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کی مراد یہ ہے کہ قرآن مجید میں ہر جگہ زکوٰۃ کا ذکر صلوٰۃ کے بعد آیا جبکہ یہاں نماز بلکہ ذکر سے بھی پہلے لایا گیا ہے۔ لازماً کوئی خاص صورت مراد ہے کہ جہاں یہ تینوں فعل ترتیب کے ساتھ واقع ہوں اور وہ صورت شریعت میں اس صورت کے سوا کہیں نہیں ہے۔

ان آیات سے فقہاء کا استدلال

اور اکثر فقہاء نے تینوں مضامین کو نماز کے شرائط اور اس کے ارکان پر وارد کیا ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ تزکی طہارت کا اشارہ ہے' وضو ہو خواہ غسل خواہ تیمم اور وذکر اسم ربہ تکبیر تحریمہ کا اشارہ ہے اور فصلی ادائیگی نماز کا اشارہ ہے اور حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے اس تفسیر

کے مطابق مسائل فقہ سے دو مسئلے اس آیت سے نکالے ہیں' ان میں سے ایک یہ کہ تحریمہ باندھتے وقت خصوصیت کے ساتھ اللہ اکبر کے الفاظ لازم نہیں ہیں جو چیز ذکر خدا ہو سکے' کافی ہے جیسے اَلرَّحْمٰنُ اَعْظَمُ' یَالَآاِلٰہَ اِلَّا اللّٰہُ یا سُبْحَانَ اللّٰہِ ہاں وہ ذکر جو کسی غرض اور حاجت کے ساتھ ملا ہوا ہو' اس کے ساتھ نماز شروع کرنا جائز نہیں جیسے اَللّٰھُمَّ اغْفِرْلِیْ اس لیے کہ خالص ذکر نہیں ہے

(اقول و باللہ التوفیق ان الفاظ تعظیمی سے ابتدا تو ہو جائے گی مگر یہ تبدیلی مکروہ تحریمی ہے۔ چنانچہ مراقی الفلاح میں ہے ویصح الشروع بکل ذکر خالص للّٰہ تعالٰی...... وان کرہ لترك الواجب اور اس کے حاشیے طحطاوی میں ہے وان کرہ اے تحریما بہارِ شریعت ج ۳ ص ۶۷۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

دوسرا مسئلہ یہ ہے کہ آپ کے نزدیک تکبیر تحریمہ نماز کی شرط ہے' نماز میں داخل نہیں ہے اس لیے کہ فصلی کو وذکر اسم ربہ پر حرف فا کے ساتھ معطوف کیا گیا ہے جو کہ معطوف اور معطوف علیہ کے ایک دوسرے کا غیر ہونے پر دلالت کرتا ہے اور اس مذہب پر متفرع مسئلہ یہ ہے کہ اگر نماز کی شرائط جیسے طہارت' ستر عورت اور استقبالِ قبلہ تکبیر تحریمہ کے وقت کسی کو حاصل نہ ہوں اور اس کے بعد بلا فصل حاصل ہو جائیں تو اس کی نماز درست ہے جبکہ امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ تکبیر تحریمہ بھی نماز میں داخل ہے اس وجہ سے کہ مذکورہ تکبیر قیام کی حالت میں شرائط کا وصول ہونا ضروری ہے۔

اور جب اس آیت میں بیان فرمایا گیا کہ حصول کمال اور عذاب سے خلاصی پاکیزگی' ذکر اور نماز سے وابستہ ہے جو کہ خوف خدا کا نتیجہ ہے تو یہاں گنجائش تھی کہ کفار شبہ کے طور پر ذکر کریں کہ ہمیں پوری عقل و دانش کے باوجود ان اعمال اور افعال کی خوبی کیوں معلوم نہیں ہوتی اور حصولِ فلاح کے لیے ان اسباب کی سببیت ہماری نگاہ سے کیوں پوشیدہ ہے جواب میں فرمایا جا رہا ہے کہ تم ازلی بدبختی کی وجہ سے ان چیزوں کو کمال نہیں سمجھتے ہو۔

بَلْ تُؤْثِرُوْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا بلکہ تم دنیوی زندگی کو آخرت پر اختیار کرتے ہو جو کہ ایک چراگاہ سے زیادہ نہیں ہے اور آخر خشک سیاہ گھاس کی طرح ہونے والی ہے اور کمال کو

دنیا کی محسوس لذتوں اور نام اور مرتبہ حاصل کرنے میں منحصر سمجھتے ہو حالانکہ دنیا کی زندگی ہرگز اس قابل نہیں کہ اسے اخروی زندگی پر ترجیح دی جائے کیونکہ

وَالْاٰخِرَةُ خَيْرٌ اور آخرت سب کی سب نیکی ہے وہاں بدی کی کوئی گنجائش نہیں۔ بخلاف دنیا کی زندگی کے اگرچہ نعمت' دولت' مرتبہ اور رعب کے ساتھ گزاری جائے لیکن درد' دکھ' فکر اور غم اس کی ذات کو لازم ہیں۔ اور کوئی دنیوی نعمت نظر نہیں آتی مگر اس کے پہلو میں کوئی درد' کمزوری اور اضمحلال ہے اور اگر بالفرض دنیا بھی نیک ہو اور اس میں کسی وجہ سے بھی شر اور بُرائی کی گنجائش نہ ہو اگرچہ یہ فرض کرنا محال ہے پھر بھی دنیا میں اس قابل نہیں کہ اسے آخرت پر ترجیح دی جائے اس لیے کہ آخر دنیا فانی ہے اور آخرت باقی ہے۔ چنانچہ فرمایا جارہا ہے

وَاَبْقٰى اور دنیا سے زیادہ باقی رہنے والی ہے اس لیے کہ دنیا کی بقاء گرچہ دراز اور طویل ہو لیکن اس کے پیچھے فنا ہے جبکہ آخرت کی بقاء' فنا کے کھٹکے کے بغیر ہے اور کیا ہی اچھا کہا گیا ہے

حاصل دنیاز کہن یا بنو چوں گزرندہ است نیرز د بجو

یعنی پرانی نئی دنیا کا حاصل یہ کہ جب گزرنے والی ہے تو ایک جو کے برابر نہیں' دنیا کا مقصد اسی قدر ہے کہ اسے آخرت کا وسیلہ بنائیں کہ الدنیا مزرعة الاخرة

اسی لیے عقلمندوں نے کہا ہے کہ دنیا کو اس گھر کی طرح سمجھ جسے آگ لگی ہوئی ہو جو کچھ ہو سکے' اس سے نکال لے۔ بیت

حافظا عمر عزیز است غنیمت دانش
گوئے چیزے کو توانی ببراز میدانش

اے حافظ عمر عزیز ہے اسے غنیمت جان اس کے میدان سے جو نکال سکے نکال لے۔

اہلِ کلام نے کہا ہے کہ اس اعجاز پر مبنی کلام میں کمال اختصار کے باوجود دنیا کو آخرت پر ترجیح کے باطل ہونے پر دو مضبوط دلیلیں مذکور ہیں یعنی خیر ہونا اور باقی ہونا۔ اس لیے کہ کوئی عقلمند اعلیٰ کے بدلے ادنیٰ کو نہیں لیتا۔ نیز باقی کے بدلے فانی کو اختیار نہیں کرتا۔ پس آخرت

پر دنیا کی ترجیح تاجروں کی عقل کے تقاضے کے خلاف ہے جو کہ بادشاہوں' سرداروں' علماء اور حکماء کی عقل سے بہت کم ہے۔

جب اس مضمون کو کہ آخرت پر دنیا کو ترجیح نہیں دینا چاہیے اور دنیا میں دل نہیں لگانا چاہیے' بنی آدم کے نفوس کے تقاضے کے خلاف دیکھا کہ ان کی جبلت میں دنیا کی محبت اور آخرت سے روگردانی سپرد کی گئی ہے اور آخرت کی سمت کو ترجیح دینے کو ان کا گمان تسلیم نہیں کرتا۔ ناچار اس مقصد کو ثابت کرنے کے لیے پہلی کتابوں سے جو کہ جہان والوں کے نزدیک خصوصاً دیارِ عرب کے رہنے والوں کے نزدیک مسلم الثبوت تھیں' ایک سند لا کر فرمایا جا رہا ہے

اِنَّ هٰذَا تحقیق یہ مضمون جو کہ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى سے لے کر یہاں تک مذکور ہوا۔

لَفِی الصُّحُفِ الْاُوْلٰى البتہ پہلی کتابوں میں مذکور ہے اور یہ مضمون کبھی بھی منسوخ نہ ہوا اور نہ ہی بدلا۔

صُحُفِ اِبْرٰهِیْمَ وَمُوْسٰى ان صحیفوں میں جو کہ حضرت ابراہیم اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کو آسمان سے عطا کیے گئے تھے تو یہ مضمون دین و شریعت کے ان قواعد کلیہ میں سے ہے جو کسی نبی علیہ السلام کے زمانے میں منسوخ نہیں ہوئے اس کا انکار گویا علوم فطریہ کا انکار ہے جو کہ سوفسطائیوں کا کام ہے۔

آسمانی کتابوں کی تعداد

کشاف میں مذکور ہے اور حدیث کی بعض کتابوں میں ضعیف سند کے ساتھ دیکھا گیا ہے کہ حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام سے پوچھا کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے کتنی کتابیں نازل ہوئی ہیں؟ آپ نے فرمایا ایک سو چار کتابیں۔ حضرت آدم علیہ السلام پر دس (۱۰) صحیفے' حضرت شیث علیہ السلام پر پچاس (۵۰) صحیفے اور تورات۔ انجیل' زبور اور قرآن مجید اور کشاف کے حاشیہ میں طیبی نے ۱۱۴ کا ذکر کیا ہے۔ ان میں سے دس صحیفے حضرت ادریس علیہ السلام پر تیس (۳۰) صحیفے' حضرت ابراہیم علیہ السلام پر دس

(۱۰) صحیفے' حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات کے علاوہ نازل ہوئے۔ واللہ اعلم لیکن یہودیوں کے ہاں تورات کے علاوہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے صحائف میں سے کوئی چیز سننے میں نہیں آئی جبکہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحائف موجود ہیں اور ان میں قسم قسم کے مواعظ اور نصیحتیں درج ہیں۔ ان میں سے یہ ہے کہ ینبغی للعاقل ان یکون حافظا للسانہ عارفا بزمانہ مقبلاعلی شانہ یعنی عقل مند کو چاہیے کہ اپنی زبان کی نگہبانی کرے' اپنے زمانے کو پہچانے اور اپنے کام میں پورے طور پر مصروف ہوں۔

سورة الغاشیہ

مکی ہے' اس کی سولہ (۱۶) آیات ہیں' بہتر (۷۲) کلمات اور ایک سو اکانوے (۱۹۱) حروف ہیں۔ اور حدیث صحیح میں تکرار کے ساتھ وارد ہوا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اکثر نمازوں خصوصاً نمازِ جمعہ اور نمازِ عشا میں اس سورة کو سورۂ سبح اسم ربک الاعلیٰ کے ساتھ دو رکعات کی قراءت میں جمع فرماتے۔

وجہ ربط

پس اس سورة کا سورة الاعلیٰ کے ساتھ رابطہ نبی کریم علیہ السلام کے اشارے سے ہی ثابت ہو گیا اسی لیے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے تالیف قرآن کے وقت اس سورة کو سورة الاعلیٰ کے بعد لکھا ہے اور غور وفکر کے بعد اس رابطے کی بہت سی وجوہ ظاہر ہوتی ہیں۔ ان میں سے یہ ہے کہ اس سورة میں فَذَكِّرْ اِنَّمَا اَنْتَ مُذَكِّرٌ واقع ہے جبکہ وہاں فَذَكِّرْ اِنْ نَّفَعَتِ الذِّكْرٰى ہے اور ان میں سے یہ ہے کہ یہاں تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً واقع ہے جبکہ وہاں يَصْلَى النَّارَ الْكُبْرٰى ہے اور ان میں سے یہ ہے کہ اس سورة کا خاتمہ دنیا کی زندگی کو پسند کرنے کی مذمت اور آخرت کی خیریت کے بیان پر ہے جبکہ اس سورة میں ان لوگوں کے حال کی تفصیل ہے جو کہ دنیا میں لذتوں میں مشغول ہو گئے ہیں اور انہوں نے آخرت کو فراموش کر دیا ہے اور ان لوگوں کا حال ہے جنہوں نے دنیا میں آخرت کی زندگی کے لیے تکلیفیں اٹھائی ہیں۔ نیز آخرت کی خیریت کی تفصیل ہے کہ قسم قسم کی نعمتیں رکھتی ہے

جو کہ باقی اور غیر فانی ہیں تو گویا اس معنی میں یہ سورۃ اس سورۃ کا بقایا ہے۔ گو کلام کے انداز اور عبارت میں مشابہت کم ہوگی۔

وجہ تسمیہ

اور اس سورۃ کا نام سورۃ غاشیہ اس لیے رکھا گیا ہے کہ غاشیہ قیامت کا نام ہے اور اس سورۃ کے آغاز میں قیامت کی ہولناکیوں سے ڈرانا ہے جبکہ قیامت کے حالات سے ڈرانا قرآن کریم کے بہت بڑے موضوعات میں سے ہے۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

هَلۡ اَتٰىكَ حَدِيۡثُ الۡغَاشِيَةِ کیا آپ تک قیامت کی خبر پہنچی ہے کہ لوگوں کے ساتھ کیا کرے گی اور لغت میں غاشیہ اس چیز کو کہتے ہیں جو ڈھانپ لے۔ اسی لیے زین پوش کو غاشیہ کہتے ہیں اور قیامت کا حادثہ چند چیزوں کو ڈھانپ لے گا۔ ایک تو ہوش کو جو کہ ڈر کی شدت سے پوشیدہ ہو جائے گی' دوسرے جسموں کو اس دن کا عذاب نیچے' آگے پیچھے' دائیں بائیں سے ڈھانپ لے گا جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا گیا ہے يَوۡمَ يَغۡشٰهُمُ الۡعَذَابُ مِنۡ فَوۡقِهِمۡ وَمِنۡ تَحۡتِ اَرۡجُلِهِمۡ وَيَغۡشٰى وُجُوۡهَهُمُ النَّارُ تیسرے یہ کہ کفار کے اچھے کاموں کو ڈھانپ لے گی اور ایمان والوں کے برے کاموں کو بھی چھپا لے گی' پہلوں کو احتیاط کے ساتھ اور دوسروں کو معاف کرنے اور بخشنے کے ساتھ۔

اور اس پوچھنے سے کہ کیا آپ تک قیامت کی خبر پہنچی ہے؟ مقصد یہ ہے کہ سننے والا پوری توجہ کے ساتھ دھیان کرے اور اگلی بات کو حضور دل کے ساتھ سنے۔ چنانچہ اس بے دار کرنے اور ہوش میں لانے کے بعد اس دن کا کاروبار لوگوں کے سامنے بیان فرمایا جا رہا ہے۔

وُجُوۡهٌ يَّوۡمَئِذٍ خَاشِعَةٌ اس روز ایک گروہ کے چہرے ذلیل و رسوا ہوں گے اور اگرچہ ذلت و رسوائی ان چہرے والوں کی صفت ہے لیکن چونکہ ذلت و رسوائی کے اثرات زیادہ تر چہروں پر ظاہر ہوتے ہیں۔ گویا یہ صفت ہی چہروں کی ہے اور عرب کا قاعدہ ہے کہ کسی شخص کی ذات کی تعبیر چہرے' گردن اور سر کے ساتھ کرتے ہیں اس لیے کہ یہ اعضاء کسی

کی ذات کی بقاء کا مدار ہوتے ہیں تو گویا ذات کے قائم مقام ہیں۔

اور وہ چہرے ان لوگوں کے ہوں گے جو دنیا میں دین کے مقدمات کے سلسلے میں اپنے اوپر عاجزی' انکساری اور ذلت و رسوائی پسند نہیں کرتے تھے۔ اور وہ دینی تکلیف اور مشقت سے استراحت چاہتے تھے۔ اور تن آسانی اور بدن پروری میں غرق اور اسی کی حرص میں رہتے۔ اسی لیے دنیا سے ان کا زیادہ تر مقصد لذیذ کھانے کھانا' لطیف مشروبات پینا اور عطریات استعمال کرنا تھا۔ اس روز اس سب کاہلی اور تن پروری کے بدلے انہیں ذلت و رسوائی میں گرفتار کریں گے۔ اگر انہیں دنیا میں دینی معاملات اور ربِ کریم کی عبادت میں یہ خشوع نصیب ہوتا تو سب سے عظیم ثواب پاتے لیکن اپنی تن پروری کے لیے مشقت طلب اعمال سے جی چراتے تھے۔ چنانچہ اس کے بدلے انہیں اس روز مشقت طلب اعمال کی تکلیف دیں گے اور انہیں بے تحاشہ دُکھ لاحق ہوگا۔ چنانچہ فرمایا جارہا ہے۔

عَامِلَةٌ وہ چہرے اس روز کئی کام کریں گے' ایک یہ کہ جہنم کے آتشیں پہاڑوں پر سخت مشقت سے چڑھنا۔ اور انہیں میں سے گردن اور پاؤں میں آتشیں طوق اور زنجیر پہننا ہے اور آتشِ دوزخ میں نیچے جانا جیسا کہ اونٹ دلدل میں غوطے کھاتا ہے اور اس روز کے ان مشقت طلب اعمال کی تفصیل قرآن مجید کی دوسری سورتوں میں مذکور ہے جیسے سارھقه صعودا ' خذوه فغلوه ثم الجحيم صلوه ثم في سلسلة ذرعها سبعون ذراعا فاسلكوه. ويوم يدعون الى جهنم دعا. ويطوفون بينها وبين حميم آن

گناہ گاروں کے عذاب کی اقسام

اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ زکوٰۃ نہ دینے والے کی پیشانی' پہلو اور پشت پر آگ سے گرم کی ہوئی سونے اور چاندی کی تختیوں کے ساتھ داغ لگائیں گے اور جن کے مویشی تھے اور وہ مویشیوں سے اللہ تعالیٰ کا حق نہیں دیتے تھے' انہیں قیامت کے میدان میں پشتوں کے بل ڈال کر مویشیوں کو حکم ہوگا کہ انہیں روند ڈالیں اور تصویر سازوں کو تکلیف دی جائے گی کہ اپنی بنائی تصویروں میں جان ڈالیں اور انہیں جو خواب کے متعلق جھوٹ بولتے تکلیف دیں گے کہ جو میں گرہ لگائیں اور جو لوگ حق بات کہنے سے خاموش ہوگئے' ان کے

منہ میں آگ کی لگام ڈالیں گے۔ علیٰ ہذا القیاس

نَاصِبَةٌ یعنی وہ چہرے اس روز ان اعمال کی وجہ سے رنج اُٹھاتے ہوئے ہوں گے اس لیے کہ مشقت طلب کام جو کسی ثواب اور تحسین کی توقع پر نہ ہو نری تکلیف ہے۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ یہ عمل اور رنج دونوں دنیا میں ہی ہیں اور اس سے مراد ہندوؤں، یہودیوں، نصاریٰ اور دوسرے مذاہب باطلہ کے ریاضت کرنے والوں کے چہرے ہیں جو کہ دنیا میں خدا تعالیٰ کے لیے مشقت طلب کام کرتے تھے اور نری تکلیف اُٹھاتے تھے اس لیے کہ ان کی ریاضتیں پیغمبر وقت پر ایمان نہ لانے کی وجہ سے سب ضائع اور بے فائدہ ہیں۔

اور بعض مفسرین نے کہا کہ عمل دنیا میں اور رنج آخرت میں مراد ہے۔ اور وہ عیش و عشرت کرنے والوں اور مال و مرتبہ چاہنے والوں کے چہرے ہیں کہ انہوں نے ان دنیوی مقاصد کے لیے شدید مشقتیں اور ناقابلِ برداشت تکالیف اُٹھائیں اور آخرت میں انہیں ان سب مشقتوں کا پھل بے فائدہ رنج کی صورت میں حاصل ہوگا بلکہ ان کا پھل صرف رنج ہی نہیں، ایک اور چیز بھی تعاقب میں ہے، جس کا بیان ان آیات میں ہے۔

تَصْلٰى نَارًا حَامِيَةً وہ ایک انتہائی گرم اور جلانے والی آگ میں داخل ہوگا، اس کے بدلے کہ خدا تعالیٰ سے غافل ہو کر پُر فضا مکانات اور ٹھنڈی ہوا میں چھت کے پنکھوں اور خس کی ٹٹیوں کے نیچے بیٹھتے تھے اور اس آگ کی گرمی کا بیان حدیث شریف میں اس طرح وارد ہے کہ اسے ایک ہزار سال تک جلایا گیا یہاں تک کہ سفید ہوگئی۔ پھر اسے مزید ایک ہزار سال تک جلایا گیا حتیٰ کہ سرخ ہوگئی۔ پھر اسے مزید ایک ہزار سال تک جلایا گیا یہاں تک سیاہ ہوگئی۔ اب اسی سیاہی پر ہے۔ اور جب دوزخ کی ہوا کی گرمی ان کے اندر تشنگی پیدا کرے گی تو بے اختیار ہو کر العطش العطش پکاریں گے اور پانی پی کر اس گرمی کی تسکین کا قصد کریں گے اور اس وقت

تُسْقٰى مِنْ عَيْنٍ اٰنِيَةٍ انہیں اس چشمے سے پانی پلایا جائے گا جو کہ انتہائی گرم ہے اور وہ پانی پینے سے دوزخیوں کے ہونٹ کباب ہو جائیں گے اور ان کی انتڑیاں ریزہ ریزہ ہو کر

باہر آجائیں گی۔ پھر انہیں درست کر کے عذاب میں گرفتار کریں گے اور ان کی یہ تواضع ان لذیذ شربتوں اور سوڈا واٹروں کے عوض ہوگی جو برف میں لگا کر پیتے تھے اور جب دوزخ کی ہوا کی حرارت اور اس پانی کی گرمی ان کے اندر جمع ہو کر بھوک کی آگ بھڑکائے گی' ایک ہزار سال تک ان پر بھوک کا عذاب مسلط کیا جائے گا اور حدیث شریف میں ہے کہ دوزخیوں کی نظر میں یہ اکیلا عذاب دوزخ کے تمام دردناک عذابوں کے برابر ہے اور بے شمار نالہ و فریاد کے بعد جہنم کے موکلوں کو اجازت ہوگی کہ انہیں کوئی چیز کھلائیں۔ لیکن

لَیْسَ لَھُمْ طَعَامٌ ان کے لیے وہاں کوئی طعام نہیں ہے جو کہ ان مرغن اور لذیذ کھانوں کا عوض ہو جو دنیا میں لذت اور جسم موٹا کرنے کے لیے کھاتے تھے۔ اور صبح سے شام تک باورچیوں سے قسم قسم کے کھانوں کی فرمائش میں گزارتے تھے اِلَّا مِنْ ضَرِیْعٍ مگر ضریع کی جنس سے۔ اور یہ ایک ایسی گھاس کا نام ہے جو کہ زیادہ تر دریاؤں کے ساحل اور نہروں کے کناروں پر اُگتی ہے۔ جب تک یہ تر ہوتی ہے اسے شبرق کہتے ہیں اور اونٹوں کے چارے کے طور پر استعمال ہوتی ہے اور جب خشک ہو جائے تو اسے ضریع کہتے ہیں اور زہر قاتل بن جاتی ہے اور اسے کوئی جانور نہیں کھاتا۔

اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ وہاں کی ضریع کو یہاں کی ضریع پر قیاس نہ کیا جائے۔ وہ آگ میں ایسی چیز ہے جو چبھنے میں کانٹے کی طرح ہے اور ایلوے سے زیادہ کڑوی' مردار سے زیادہ بدبودار اور آگ سے زیادہ سخت گرم ہے۔ اور اس کی وجہ یہ ہے کہ جس طرح دنیا میں خاک اور پانی کا جوہر نباتات اور حیوانات کی طبیعتوں پر غالب ہے اسی طرح جہنم میں جوہر ناری وہاں کے نباتات اور حیوانات پر غالب ہے۔ پس وہاں کے نباتات اور حیوانات صورت میں یہاں کے نباتات اور حیوانات سے مشابہت رکھتے ہیں اسی لیے ایک کے نام کو دوسرے پر بولا جاتا ہے لیکن معنوی اعتبار سے ان کا مادہ جوہر آتش ہے اور وہاں کی ہر چیز میں ناریت اور جلن موجود ہے۔

اور چونکہ کھانے کا مقصد تین چیزوں سے خالی نہیں ہوتا' لذت یا جسم کو موٹا کرنا یا بھوک دُور کرنا اور ضریع اور اس کے وہ اوصاف جو کہ حدیث شریف میں وارد ہیں' ذکر کرنے

سے لذت تو میلوں دُور جا پڑی اب دو چیزوں کی جو بعض اوقات کے بے لذت کھانا کھانے سے مقصود ہوتی ہے، نفی فرمائی جا رہی ہے۔

لَّا يُسْمِنُ وَلَا يُغْنِي مِن جُوعٍ نہ بدن کو موٹا کرے اور نہ بھوک دُور کرنے کے کام آئے جبکہ طعام کے فوائد یہی چیزیں ہیں اور جب طعام ان تینوں چیزوں سے خالی ہے گویا طعام ہی نہیں اگر جسم کو موٹا کرتا تو بھی دوزخیوں کو فائدہ ہوتا کہ اس کی وجہ سے کچھ قوت ملتی اور اس قوت کی وجہ سے ان پر عذاب برداشت کرنا آسان ہوتا۔ اگر بھوک دُور کرتا تو بھی اس عذاب کی شدت میں کچھ کمی آتی جو کہ بھوک کے غلبہ کی وجہ سے تھا۔

دو جواب طلب سوالات

یہاں دو سوالات باقی رہ گئے جو کہ جواب طلب ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ آگ میں نباتات کا وجود ممکن نہیں ہے اس لیے کہ موسم گرما کی گرمی اکثر درختوں کو جلا دیتی ہے۔ چہ جائیکہ آگ کی گرمی خصوصاً اس قسم کی آگ۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب اس آگ میں انسان کے جسم کا پایا جانا اور سانپ اور بچھو کا وجود تسلیم شدہ ہے تو نباتات کے پائے جانے میں کیا امر مانع ہے۔ علاوہ اس کے سورج کی عین گرمی اور سوزش میں بعض نباتات کے سرسبز ہونے اور نشوونما پانے کا مشاہدہ کیا جاتا ہے۔ جیسے اونٹ کی مرغوب خاردار گھاس اور بھکھڑا اور دوسرے موسم گرما کے درخت۔ پس کیا بعید ہے کہ وہاں کی آگ میں بھی یہ خاصیت سپرد کی گئی ہو کہ بعض نباتات کو سرسبز کرے اور نشوونما دے۔ خصوصاً جبکہ ان نباتات کی طبیعت کی بنیاد میں جوہر آتشیں غالب ہو تو ہم مثل ہونے کے اعتبار سے آگ کی گرمی سے مدد لے لیں جیسے کہ آگ کا کیڑا (سمندر) دنیا کی آگ میں۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ اس آیت میں دوزخیوں کا طعام صرف ضریع کو قرار دیا گیا ہے کہ اس کے علاوہ ان کے وہاں کوئی کھانا نہیں ہوگا حالانکہ دوسری آیات میں دوزخیوں کے لیے اور طعام بھی مذکور ہے۔ ان میں سے زقوم ہے إِنَّ شَجَرَتَ الزَّقُّومِ طَعَامُ الْأَثِيمِ اور ان میں سے غسلین ہے وَلَا طَعَامٌ إِلَّا مِنْ غِسْلِينٍ

اس کا جواب یہ ہے کہ دوزخ کے مختلف طبقے ہیں' اس کے بعض طبقات کا یہی کھانا ہوگا نہ کہ کچھ اور۔ اور وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ خَاشِعَۃٌ سے مراد اس طبقے والے ہوں۔ پس کوئی اعتراض نہیں ہے جبکہ بعض مفسرین نے کہا ہے کہ من ضریع سے مراد خاص ضریع ہی مراد نہیں ہے بلکہ ہر وہ چیز جو بے لذتی' تلخی' بدبو' موٹا نہ کرنا اور بھوک دُور نہ کرنے میں ضریع کی جنس سے ہے' سب ضریع میں داخل ہے یہاں تک کہ بعض مفسرین نے ضریع کو فعیل بمعنی مفعل جیسے علیم اور بدیع لیا ہے اور اس کا معنی یوں بیان فرمایا ہے کہ ہر وہ کھانا جو کہ زاری' خواری اور طبیعت کی بدمزگی کا موجب ہوتا ہے' ضریع ہے اور اس صورت میں بھی اعتراض دُور ہو جاتا ہے۔

اور جب دوزخیوں کی رہائش گاہ' کھانے اور پینے کی چیزوں کا حال بیان کرنے سے فراغت ہوئی اب جنتیوں کی رہائش گاہوں' مشروبات' فرشوں اور برتنوں کا حال بیان فرمایا جا رہا ہے اور چونکہ جنتیوں کے حال کا بیان اس اجمال کی تفصیل ہے جو کہ حدیث الغاشیہ میں مذکور ہوا ہے اس لیے یہاں حرف عطف ذکر نہیں فرمایا گیا۔ بخلاف سورۃ قیامت کے کہ وہاں حرف عطف کے ساتھ مذکور ہے اس لیے کہ وہاں مجمل کی تفصیل نہیں ہے اور پہلے سے کوئی اجمال نہیں گزرا۔

وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاعِمَۃٌ اس روز ایک گروہ کے چہرے نرم اور خوش منظر ہوں گے اس لیے کہ ذلت و رسوائی کے اسباب خوف' خطرہ' مشقت اور دُکھ نے ان کے چہروں میں اثر نہیں کیا بلکہ ان چہرے والوں نے آج کے دن کی سختیوں سے نجات پانے کے لیے دنیا میں بے شمار سختیاں جھیلیں اور برداشت کیں اور اپنے پروردگار کی خوشنودی کے لیے اپنی جان اور جسم پر تکالیف اور مشقتیں گوارا کیں۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے

لِّسَعْیِھَا رَاضِیَۃٌ اس روز اپنی کوشش سے خوش ہوں گے کہ وہ ساری کوششیں جو وہاں کیں' اچھا انجام رکھتی ہیں۔

فِیْ جَنَّۃٍ عَالِیَۃٍ وہ چہرے ایک باغ میں ہوں گے جو کہ بلند ہے اور اس کی بلندی کی وجہ سے قیامت کی ہولناکیوں اور دوسری تکلیف دینے والی چیزیں ان تک نہیں پہنچتیں اور اس بلند مکان تک آگ کی گرم ہوا راہ نہیں پاتی بلکہ

لَا تَسْمَعُ فِیْهَا لَاغِیَةً اس باغ میں بے ہودہ گفتگو نہیں سنتے' وہاں گالی گلوچ کا کیا کام اور جہنمیوں کی چیخ پکار جو کہ نری بے ہودہ ہے وہاں نہیں پہنچتی۔ کہ ان کا آرام وآسائش مکدر نہ ہو اور جنتیوں کو یہ صفت تَصْلٰی نَارًا حَامِیَةً کے مقابلے میں دی گئی ہے اور گرم چشمے کے مقابلے میں ان کے لیے

فِیْهَا عَیْنٌ جَارِیَةٌ اس باغ میں ایک چشمہ ہوگا جس کا پانی جاری ہے جو کہ برف سے زیادہ ٹھنڈا' شہد سے زیادہ میٹھا ہے اور دوزخیوں کی ذلت اور رسوائی کے مقابلے میں ان کے لیے

فِیْهَا سُرُرٌ مَّرْفُوْعَةٌ اس باغ میں بلند تخت ہوں گے تا کہ پورے وقار سے بیٹھیں اور دوزخیوں کے دُکھ' تکلیف اور ناپاک خورد ونوش کے مقابلے میں ان کے لیے

وَّاَكْوَابٌ مَّوْضُوْعَةٌ ان تختوں پر ترتیب کے ساتھ چنے ہوئے کوزے ہوں گے یعنی انہیں جب بھی کسی کھانے یا شراب' پانی' دودھ اور شہد میں سے کوئی شے پینے کی رغبت ہوگی' طلب کے بغیر اُٹھا لیں اور استعمال کریں اور اس کی ضرورت نہیں ہوگی کہ تختوں سے نیچے اُتریں اور تکلیف اُٹھائیں اور اس جنت میں فرش کے طور پر ان کے لیے

وَّنَمَارِقُ مَصْفُوْفَةٌ تکیے اور توشکیں ہوں گی جنہیں صف بصف بچھایا گیا ہے تا کہ جس تکیے اور توشک پر چاہیں' آرام کریں اور ٹیک لگائیں اور ان کے مکانوں میں

وَّزَرَابِیُّ مَبْثُوْثَةٌ متفرق قالین ہوں گے تا کہ جس مکان میں جو چاہیں حکم دیں کہ بچھایا جائے۔

اور جب اس سورۃ میں جہنمیوں اور جنتیوں کے حالات پوری تفصیل کے ساتھ مذکور ہوئے تو کفار نے طعن اور مذاق کے طور پر کہا کہ یہ نبی (علیہ السلام) اُلٹی گفتگو کرتا ہے' دوزخیوں کے لیے مکان اور کھانے پینے کو اس طرح بیان کرتا ہے اور یہ بھی کہتا ہے کہ اس عذاب کی وجہ سے دوزخی مریں گے نہیں' ابدالآباد تک زندہ رہیں گے حالانکہ آدمی اور جاندار چیز کے لیے اس قسم کے عذاب میں ایک لمحے کے لیے زندگی بسر کرنا محال ہے۔ نیز جنتیوں کی تعریف میں کہتا ہے کہ بلند تختوں پر بیٹھے ہوں گے اور انہیں کوئی رنج اور مشقت نہیں ہوگی

حالانکہ بلند تختوں پر بار بار چڑھنا اور اُترنا ایک تکلیف دہ مشقت ہے۔ نیز کہتا ہے کہ وہاں پانی اور شراب سے بھرے ہوئے کوزے رکھے گئے ہیں اور مسندوں اور قالینوں کے فرش بچھائے گئے ہیں حالانکہ ایک تخت صرف بیٹھنے کے لیے ہوتا ہے اور اس میں اتنی چیزوں کی گنجائش نہیں ہوتی۔ نیز اگر وہ کوزے اوندھے ہو جائیں تو فرش تر ہو جائیں اور مل بیٹھنا بے مزہ ہو جائے۔

حق تعالیٰ نے اس طعن اور مذاق کے جواب میں یہ آیات بھیجیں اور جواب کا خلاصہ یہ ہے کہ جنتیوں اور دوزخیوں کا نمونہ دنیا میں موجود ہے اور جنت اور دوزخ کی صورت بھی نمودار ہے۔ پس وہ جنتیوں اور دوزخیوں کے حالات اور جنت اور دوزخ کی صفات کا کیوں انکار کرتے ہیں اور اس چیز میں' جو اُن میں سے ہر ایک کے سامنے موجود ہے' غور نہیں کرتے اور وہ چار چیزیں ہیں۔ پہلی چیز جانوروں سے جو کہ اونٹ ہے' دوسری چیز عالم بالا کے فرشوں سے جو کہ آسمان ہے' تیسری چیز معدنیات سے جو کہ پہاڑ ہے اور چوتھی چیز عالم سفلی کے فرشوں سے جو کہ زمین ہے۔ پس پہلے اونٹ کا ذکر فرمایا گیا ہے کہ

اَفَلَا یَنظُرُوْنَ اِلَی الْاِبِلِ کَیْفَ خُلِقَتْ تو کیا وہ اونٹوں کی طرف نظر نہیں کرتے کہ وہ کیسے پیدا کیے گئے ہیں اور ان کی پیدائش میں جہنمیوں اور جنتیوں دونوں کا نمونہ موجود ہے۔ اپنی ذات اور بود و باش میں دوزخیوں سے مشابہت رکھتے ہیں اور اپنے فوائد اور منافع کے اعتبار سے جنتیوں سے مناسبت رکھتے ہیں۔

ذات اور بود و باش کے اعتبار سے اونٹ کی دوزخیوں سے مشابہت کا بیان

اپنی ذات اور بود و باش کے بارے میں ان کی دوزخیوں سے مشابہت اس وجہ سے ہے کہ جسم کے لمبا' اونچا اور بڑا ہونے کے باوجود اس قدر ذلیل اور خوار ہیں کہ انسانوں کے بچے بلکہ ایک چوہا اس کی مہار کو کھینچ کر ہر طرف لے جا سکتا اور بٹھا سکتا ہے اور جو چاہے اس پر لاد دے پھر کھڑا کرے اور چلائے اور یہ سب کچھ اس کے چہرے کی رسوائی کی وجہ سے ہے۔ اس کی ناک چیر کر اس میں نکیل ڈالتے ہیں اور اس کی وجہ سے وہ ذلیل اور مطیع ہو جاتا ہے۔ اور اس جانور کی بود و باش کی جگہ زیادہ تر گرم علاقے اور ریگستان ہے جو کہ گرم ہوا چلنے

اور سورج کی تپش کی وجہ سے آگ کا روپ دھار لیتا ہے اور یہ جانور مدتوں پانی کے بغیر رہتا ہے اور اگر اسے کچھ میسر ہوتا ہے تو بالکل گرم پانی جو کہ لو کی گرمی کی وجہ سے جوشاندہ یا قہوہ کی مانند ہے اور اس کی خوراک خاردار زہریلے درخت جیسے کھنگھرا اور ضریع اور اس کے باوجود بوجھ اٹھانے کی' مشکل کام کرنے' پہاڑوں پر چڑھنے اور ان سے اترنے اور پانی اور کیچڑ میں داخل ہونے کی جو قوت اور طاقت وہ رکھتا ہے' کوئی جانور نہیں رکھتا اور ہمیشہ اسی دکھ تکلیف میں گرفتار ہے۔

فوائد اور منافع کے اعتبار سے اونٹ کی جنتیوں سے مشابہت کا بیان

رہی فوائد اور منافع کے اعتبار سے جنتیوں کے ساتھ اس کی مناسبت تو وہ اس طرح ہے کہ اگر اس کی پشت کو دیکھیں تو ایک اونچا رکھا ہوا تخت ہے اور اس بلندی کے باوجود کہ آدمی کا ہاتھ اس کی پشت تک نہیں پہنچ سکتا جب چاہیں اسے بٹھالیں اور جنت کے تختوں کی طرح اس پر سوار ہو جائیں۔ چنانچہ معالم التنزیل میں یہ روایت لائی گئی ہے کہ جنت کے تخت دور سے بلند معلوم ہوں گے اور جنتی چاہیں گے کہ ان پر بیٹھیں تو نیچے ہو جائیں گے پھر اونچے ہو جائیں گے اور اونٹنی کے چار پستان دودھ سے بھرے ہوئے کوزے ہیں جو کہ تیار کر کے سنبھال کر رکھے ہوئے ہیں اور ان سے دودھ کا چشمہ جاری ہے اور اس کی پشم سے نمدہ اور قالین بناتے ہیں۔ مخمل کی مسندیں بناتے ہیں اس کا گوشت کھایا جاتا ہے۔ اس کا دودھ پیا جاتا ہے۔ اس کے بالوں کا لباس بنتا ہے۔ اور اس کی پشت پر سواری کی جاتی ہے۔ اور جب بوجھ لاد کر چلائیں تو کشتی ہے جو کہ اپنے پاؤں پر جاری ہے اور بغیر بوجھ کے بھیجیں تو ایک دوڑتا ہوا ایلچی ہے۔ اور جب اہل وعیال سمیت خود اس پر سوار ہوں اور اپنی ضرورت کا سامان اس پر رکھ لیں تو اپنے پاؤں پر چلتا ہوا ایک گھر ہے۔ پس دنیا کے جانوروں میں یہ ایک انتہائی عجیب جانور ہے لیکن کثرت سے میل جول کی وجہ سے اس سے تعجب نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں کہ کسی جانور میں یہ صفت نہیں ہے کہ اگر اس پر بوجھ لادیں تو سارے گھر کا سامان اٹھا لیتا ہے اور کسی جگہ بھیجیں جو کہ طویل مسافت پر ہو تو چلا جاتا ہے اور اگر اس کا دودھ نکالیں تو گھر بھر کو سیر کر دیتا ہے اور اس کا گوشت حاصل کریں تو ایک محلے کو کافی ہے۔

اور اسی لیے حدیث شریف میں وارد ہے کہ الابل عز لاھلھا والغنم برکة والخیل معقود بنواصیھا الخیر الی یوم القیامة یعنی اونٹ اپنے مالک کے لیے عزت ہے۔ اور بکری بابرکت ہے۔ اور گھوڑے کی پیشانی کے ساتھ قیامت تک خیر وابستہ ہے۔ اور اتنا بڑا جسم ہونے کے باوجود ایک سو اونٹ کی قطار کو ایک بچہ کھینچ سکتا ہے بخلاف ہاتھی اور دوسرے طاقت ور حیوانات کے کہ ان میں یہ اطاعت اور عاجزی نہیں ہے اور اس کے باوجود بے حد صبر کا مالک ہے اور دس (۱۰) دن تک پیاس برداشت کر لیتا ہے اور اپنے کام اور مشقت میں بھی کوئی کمی نہیں کرتا۔

اونٹ کے عجائب اور خواص

اور اس کے عجائب اور خواص میں سے یہ ہے کہ اکثر اوقات روبقبلہ جاتا ہے اور اگر اس کی پشم کو جلائیں اور اسے خشک پیس کر جاری خون پر چھڑک دیں تو خون بند ہو جائے اور اس کے دودھ اور پیشاب میں استسقاء، تلی اور بواسیر کے مریضوں کے لیے جو فائدے رکھے گئے ہیں، طب والوں پر ظاہر ہیں۔ اور اونٹ کی تھیلی کو عاشق کی آستین پر باندھیں اس کا عشق زائل ہو جائے۔ اور اونٹ تمام حیوانات میں سے غیرت کے ساتھ موصوف ہے کہ جانتے ہوئے اپنی ماں اور بہن کے قریب نہیں جاتا اور مستی کے وقت اس پر جو عشق کے آثار اور جنون کا ولولہ پیدا ہوتا ہے، سچے عاشقوں کا نمونہ ہوتا ہے اس وقت اپنی عادت سے تین گنا زیادہ بوجھ اُٹھا لیتا ہے۔ اور اس کا کھانا پینا گھٹ جاتا ہے۔ اور اس کی پیدائش میں اس کی گردن کی لمبائی عجائبات میں سے ہے۔

منقول ہے کہ بعض اہلِ فراست کے سامنے ذکر کیا گیا تھا کہ جانوروں میں سے ایک جانور ہے جسے شتر کہتے ہیں اس کی خصوصیتوں میں سے یہ ہے کہ اسے بٹھا کر اس پر خاطر خواہ بوجھ لاد دیں پھر وہ اپنی طاقت پر کھڑا ہو جاتا ہے اور یہ خاصہ کسی جانور میں نہیں ہے کہ بوجھ لادنے کے بعد کھڑا ہو سکے اس صاحبِ فراست نے کہا کہ اس جانور کی گردن لمبی ہوگی تاکہ وہ گردن کے زور سے کھڑا ہو سکے۔

نیز اونٹ کی خوراک اکثر اوقات اونچے درختوں کے پتے ہیں اگر اس کی گردن لمبی نہ

ہوتی تو اونچے درختوں کے پتے کھانے سے محروم رہتا۔ اور یہاں سے معلوم ہو گیا کہ اس مقام پر ہاتھی کا ذکر کیوں نہ فرمایا گیا اس لیے کہ ہاتھی میں جنت اور دوزخ کا نمونہ موجود نہیں ہے اور اس کے بود و باش کی جگہ سبز اور پانی والی ہوتی ہے اور اس کی خوراک کیلئے کے پتے اور دوسری کھیتیاں ہیں۔ اور کاموں میں مشقت اور دُکھ برداشت نہیں کر سکتا۔ اور عاجز اور مقہور بھی نہیں ہے بلکہ اس میں قیافہ سے زیادہ غرور اور تکبر پایا جاتا ہے۔ اور زیادہ تو پوری عزت اور آرام کے ساتھ بادشاہوں اور امیروں کے فیل خانوں میں ہوتا ہے جو اسے چارے کی بجائے کماد کھلاتے ہیں اور اسے روغنی روٹیوں کا مالیدہ دیتے ہیں۔ اسے دوزخ کے خشک معاش والوں سے کسی طرح بھی مناسبت نہیں ہے۔ اور اسی طرح بے فائدہ جانور ہے نہ دودھ رکھتا ہے نہ پشم نہ اس کا گوشت کھانے کے لائق ہے۔ نہ اس کی سواری ہر وقت ہر کسی کو میسر اور نہ اسے اطاعت اور فرماں برداری کا شوق۔ پس جنت کا نمونہ بھی نہیں ہو سکتا اگرچہ اس کا جثہ بڑا ہے اس سے کیا کام کیونکہ یہاں ایک دیگر مقصد بیان کرنا مقصود ہے۔

وَاِلَى السَّمَآءِ كَيْفَ رُفِعَتْ اور آیا آسمان کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس طرح بلند کیا گیا ہے تاکہ تم جنت کی بلندی اور وہاں کے تختوں کی بلندی کو بعید نہ سمجھو۔ اور آسمان کی اس بلندی کی باوجود حرکت دوری کی وجہ سے اس کے اجزا میں سے ہر جز ورات دن کی گردش میں پست بھی ہوتا ہے اس حد تک کہ سر کی طرف سے قدم کی طرف میں آ جاتا ہے اور جنتی کے قدم کے نیچے جنت کے اونچے تختوں کا جھک جانا اس بلندی اور پستی سے سمجھا جا سکتا ہے۔ نیز آسمان میں ستارے کوزوں کی طرح رکھے گئے ہیں کہ آسمان کی حرکت دُوری کی وجہ سے اپنے مرکز سے بالکل نہیں ہلتے اور اُلٹتے نہیں جس طرح بہشت کے کوزے گرم اور سرد قسم کے مشروبات سے پُر ہیں اسی طرح آسمانی کوزے رنگارنگ شعاعوں سے معمور ہیں۔ مثلاً زہرہ کی شعاع مرواریدی ہے اور مریخ کی شعاع سرخ اور مشتری کی بالکل سفید' زحل کے لیے تاریکی اور گدلا پن اور کف الخضیب کی شعاع عباسی ہے۔ اور گرمی اور سردی میں بھی مختلف ستاروں کی شعاعیں کئی قسم کی ہوتی ہیں اور جو ٹھنڈک چاند کے نور میں ہے' محسوس ہو رہی ہے۔ اسی طرح سورج کی تپش' زحل کی خشکی اور زہرہ کی رطوبت۔ علیٰ ہذا القیاس

نیز آسمان میں سورج کا چشمہ اور چاند کا چشمہ جنت کے جاری چشمے کا نمونہ ہیں کہ ایک سے سرخ شراب فوارے کی طرح تیزی سے پھوٹتی ہے جبکہ دوسرے سے ٹھنڈا دودھ نکلتا ہے۔ نیز جو ستارے برجوں' منزلوں اور دوسری شکلوں میں مشاہدے میں آتے ہیں' مخمل کی مسندوں اور رنگا رنگ قالینوں کی طرح ہیں کہ بعض کو ملا کر صف کی شکل میں پھیلایا گیا ہے اور بعض کی بکھرے پھولوں کی طرح متفرق کر کے ڈالا گیا ہے۔ پس دنیا میں آسمان جنت کا نمونہ ہے اور وہاں کے رہنے والے جو کہ فرشتے ہیں' نورانی چہروں اور اچھی کاوشوں کے ساتھ مسرور و شاداں ہیں اور وہاں تسبیح اور ذکر الٰہی کے سوا کوئی بے مقصد بات سنائی نہیں دیتی اور اگر اسی آسمان کو شیطانوں اور بنی آدم کے تباہ حالوں اور زمانے کے بدنصیبوں کی نسبت سے ملاحظہ کریں تو دوزخ کی مثال سامنے آتی ہے اور شیاطین اور بدکاروں کی ارواح کے لیے وہاں سے آگ کے شعلوں کے ساتھ مسلسل دُھتکار' طعن اور سنگ باری جاری ہے اور ان کے لیے وہاں نری ذلت اور خواری ہے اور ملائکہ کی گفتگو کی چوری کے لیے جانے' ملک الموت کی پکڑے بھاگنے اور سخت ذلت اور خسارے کے ساتھ واپس آنے میں شہاب کی آگ اور آسمان کے دربانوں کی آتش قہر ان کے لیے وہاں تیار ہے اور گرم چشمے کی طرح گرم سورج کی گرمی ان پر برستی ہے اور کسی غذا کا استعمال موکلوں کے کوڑوں کے سوا وہاں میسر نہیں۔

وَاِلَى الْجِبَالِ كَيْفَ نُصِبَتْ اور کیا پہاڑوں کو نہیں دیکھتے کہ کس طرح کھڑے کیے گئے ہیں کہ ہوائیں چلنے' بارشیں برسنے اور زلزلے آنے کے باوجود اپنی جگہ سے گرتے نہیں اور اُلٹتے نہیں اسی طرح جنت کے کوزوں کی حالت کو سمجھنا چاہیے بلکہ اگر غور کیا جائے تو پہاڑ بلندی اور اچھی ہوا کی وجہ سے جنت کی مانند ہے کہ زمین کی بدبو' موذی چیزیں اور ردی بخارات وہاں نہیں پہنچتے اور دنیا والوں کی لغو باتیں اور لڑنے جھگڑنے والوں کے جھگڑے وہاں بالکل سنے نہیں جاتے اور میٹھے پانی کے چشمے جاری ہیں اور صاف چٹانیں' اونچے تختوں کی طرح اپنی جگہ پر قائم ہیں اور خودرو درختوں پر لٹکتے پھل جنتی کوزوں کی طرح رکھے گئے ہیں اور عجیب و غریب سبزے مسندوں اور قالینوں کی طرح بکھرے ہوئے ہیں۔

اور اگر کوئی اسی پہاڑ کو بدبختوں اور بدنصیبوں کی نسبت سے جو کہ گرفتارِ مصیبت ہیں اور وہاں تباہ حال پڑے ہوں گے' ملاحظہ کرے تو جہنم کا نمونہ ظاہر ہے کہ چڑھنا اور وہاں سے اُترنا سراسر مصیبت اور تکلیف اور وہاں کی غیر موافق آب و ہوا خصوصاً دامنِ کوہ کہ جسے ہندی زبان میں اول کہتے ہیں' جہنم کے گرم چشمے کی مانند اور خارزار جھاڑیاں ضریع اور زقوم کی طرح

وَاِلَى الْاَرْضِ كَيْفَ سُطِحَتْ اور کیا وہ زمین کی طرف نہیں دیکھتے کہ کس طرح بچھائی گئی ہے' کہیں چند قطعات ترتیب یافتہ صاف صف بستہ مسندوں کی طرح واقع ہیں اور کہیں چند متفرق قطعات رنگارنگ پھولوں اور کلیوں سے معمور ہیں' بکھرے ہوئے قالین بلکہ یہی زمین امیروں اور دولت مندوں کی نسبت جنت کا حکم رکھتی ہے' پوری عزت کے ساتھ باغات اور سیرگاہوں میں پُرتکلف فرشوں پر بیٹھتے ہیں اور مشروبات سے چھلکتے برتن تیار ہیں' سونے اور جواہرات کے چشمے کانوں اور خزانوں سے جاری ہیں' بلند مرصع اور ترتیب کے ساتھ پڑے ہوئے تخت بیٹھنے اور سوار ہونے کے لیے موجود ہیں۔ اور اگر اسی زمین کو غریبوں اور مفلسوں کی نسبت سے ملاحظہ کریں تو خصوصاً ان لوگوں کی نسبت سے جو کہ گرم علاقوں میں عین گرمی کے موسم میں اسباب' سواری اور سفر میں کسی نفع کی توقع کے بغیر بھاگ دوڑ میں گرفتار ہو چکے ہوں تو دوزخ کا حکم رکھتی ہے کہ تکلیف اور دُکھ کے سب اسباب وافر ہیں جبکہ لذت اور راحت منزلوں دُور ہے۔

پس ان چار چیزوں کو ملاحظہ کرنا جنت اور دوزخ کے حالات کو سمجھنے میں عقل مندوں کے لیے کافی ہے اور مثال سمجھنے کے لیے ان چار چیزوں کو اس لیے اختیار فرمایا گیا ہے کہ اس معجزانہ کلام کے مخاطب عرب کے بادیہ نشیں اور ان علاقوں کے صحراؤں میں پھرنے والے لوگ تھے جو کہ جانوروں میں سے زیادہ تر اونٹ کی پرورش کرتے تھے اس کا گوشت کھاتے تھے اس کا دودھ پیتے تھے اور اس کی اون اور ریشم سے اپنے لیے کپڑے اور فرش بناتے تھے اور سفروں میں اس پر سواری کرتے اور بوجھ لادتے تھے۔

اور اہلِ تجربہ نے کہا ہے کہ ملک عرب کے کاروبار کی بنیاد اونٹ پر ہے اور ایران

والوں کا کاروبار اشتر پر ہے اور تورانیوں کا کاروبار گھوڑے پر ہے اور ہندوستان کے لوگوں کے کاروبار کی بنیاد گھاس پر ہے چونکہ صحرانشیں زیادہ تر مویشی پالتے ہیں' انسان کو پانی اور گھاس کی سخت ضرورت ہوتی ہے اس لیے کہ اکثر اوقات ان کی نگاہیں آسمان پر گڑی رہتی تھیں کہ کس طرف سے ہوا چلتی ہے اور کونسی ہوا بارش لاتی ہے اور ان کی جائے قرار اور جائے پناہ بڑے بڑے پہاڑ ہوتے ہیں کہ دشمن کے قریب آنے یا زمین پر پانی اور گھاس کا قحط پڑنے کے وقت دوڑ کر پہاڑوں میں چلے جاتے اور وہاں بافراغت وقت گزارتے۔ چنانچہ ان میں سے کوئی کہنے والا فخر کے مقام پر کہتا ہے لنا جبل

پھر اس قسم کے لوگوں کی بلکہ بادشاہ سے لے کر گدا تک بنی آدم کی سب اقسام کی زمین کی طرف محتاجی پوشیدہ نہیں کہ چارہ اُگنے کی جگہ بھی ہے' کاشت کاری اور پھلوں کا محل بھی ہے' مقامِ سکونت بھی اور مقامِ عمارت بھی۔ اور اس میں سونے اور جواہرات کی کانیں بھی ہیں۔ پس یہ چار چیزیں اس عکے رہنے والوں کے خیال میں غالبًا جلد جمع ہو جاتی ہیں۔ اور اس مثال کی بنیاد محسوسات کی خیالی صورتوں کو ذہنوں میں حاضر کرنے پر ہے کہ ان صورتوں سے معنی معقولہ تک لے جایا جائے اور جو خیال میں جلدی گزرے' اس کی مثال دینا زیادہ مفید ہے اور بلاغت کا کمال اسی مثال کو بیان کرنے میں ہے۔

اور محققین نے فرمایا ہے کہ قرآن مجید میں اپنی نعمتیں یاد دِلانے' ذات و صفات کی وحدت کے دلائل اور اپنی ذات کے کمالات ذکر کرنے میں ایسی راہ اختیار کی گئی ہے جو کہ شہوت' حرص اور دنیوی زینت کی طرف نگاہ اُٹھانے کا باعث نہ ہو ورنہ مثال بیان کرنے کی غرض فوت ہو جائے اور لوگ اپنی مرغوبات اور خواہشات کے ذکر کی وجہ سے ان میں ڈوب کر مقصد سے مشرق و مغرب کی دُوری پر جا پڑیں اور اسی طرح وہ عجیب چیزیں بھی جو کہ بنی آدم کی کاری گریوں کی وجہ سے صورت پذیر ہوئیں اور کام میں آئیں' مقامِ استدلال کے خلاف ہیں کہ کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ ان تمام عجائبات کو بنی آدم کے ارادہ و اختیار اور ان کی حکمت اور قدرت کے حوالے کر دیں اور مقصد تک پہنچنے سے محروم رہیں' ناچار اس چیز کو جو ہر کسی کو حاصل ہے اور حرص و طمع کا موجب نہیں ہوتے اور طبعی حسن و جمال رکھتی ہے اس کلام

پاک میں مثال بیان کرنے کے لیے جگہ جگہ منتخب کیا گیا ہے اسی لیے کہیں نہیں فرمایا گیا کہ بادشاہوں کے باغات اور عجمیوں کی عجائبات میں غور کریں یا بے ریش لڑکوں یا خوب صورت عورتوں کی اچھی شکلوں میں غور کریں اور وہاں سے حضرت صانع جل مجدہ کی حکمت کے کمال کا سراغ لگائیں۔

زمین کی شکل کا بیان

اور بعض علماء نے سطحت کے اس لفظ سے جو کہ زمین کے بارے میں بولا گیا ہے اس بات پر استدلال کیا گیا ہے کہ زمین کی شکل گول نہیں لیکن یہ استدلال بہت ضعیف ہے اس لیے کہ زمین اگرچہ حقیقت میں گول ہے لیکن بہت بڑی ہونے کی وجہ سے دیکھنے میں گول نہیں لگتی اور اس کے باہم ملے ہوئے اجزا کے اوپر نیچے ہونے کی دریافت نہ ہونے کی وجہ سے بچھی ہوئی معلوم ہوتی ہے اور گفتگو ان وہم وخیال والوں سے ہو رہی ہے جو کہ اس قدر بڑے جسم کے گول ہونے کو دریافت نہیں کر سکتے۔

اور جب جنت اور دوزخ کے متعلق اور جنتیوں اور دوزخیوں کے حالات کے بارے میں کفار کے طعن اور بعید سمجھنے کے جواب سے فراغت ہوئی۔ گویا ایسا مقام آ گیا کہ مذکورہ کفار کے شدید تمرد اور عناد پر نظر کرتے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پند ونصیحت کرنے میں بے توجہی فرمائیں اور اس سب وعظ ونصیحت کو بے فائدہ سمجھیں اس بناء پر اس کی امر تاکید منظور ہوئی اور آپ کے قلب مقدس کی تسلی ضروری ہوئی اس لیے فرمایا جا رہا ہے کہ

فَذَكِّرْ اِنَّمَآ اَنْتَ مُذَكِّرٌ تو آپ نصیحت کریں' آپ تو نصیحت کرنے والے ہیں یعنی جب آپ نے چاروں چیزوں کو جو کہ ہر کس وناکس کے سامنے موجود ہیں' آخرت کے امور کی طرح جان لیا اور جنت اور دوزخ کے حالات پر قوی دلیل پالی تو ان کے طعن اور بعید سمجھنے کے لفظ سے جو کہ جھگڑے سے زیادہ کچھ نہیں' آپ پریشان نہ ہوں' اپنا وعظ ونصیحت کا کام کرتے جائیں۔

لَسْتَ عَلَيْهِمْ بِمُصَيْطِرٍ آپ ان پر داروغہ نہیں ہیں کہ انہیں سیدھی راہ سے بالکل پھرنے نہ دیں اور ان کے دلوں میں جبراً حق بات کو بٹھائیں' یہ مقلوب القلوب کا کام ہے'

کسی کے اختیار میں نہیں۔

اِلَّا مَنْ تَوَلّٰى وَكَفَرَ یعنی سب کو بار بار پند و نصیحت کریں مگر جس نے آپ کی وعظ و نصیحت سے روگردانی کی اور کفر اختیار کیا اور آپ کی رسالت کا انکار کیا' اسے بار بار وعظ و نصیحت کرنا آپ پر فرض نہیں ہے' ایک بار احکامِ الٰہی کی تبلیغ اور ہمیشہ کے کے عذاب سے ڈرانا ضروری تھا اس سے آپ فارغ ہو گئے اب اس کا معاملہ خدا کے سپرد ہے۔

فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الْعَذَابَ الْاَكْبَرَ تو اسے اللہ تعالیٰ ایسا عذاب دے گا جو کہ دوسرے گناہ گاروں کے عذاب سے بڑا ہے جنہوں نے کفر اختیار نہیں کیا اور روگردانی نہیں کی اور وہ ہمیشہ کا عذاب ہے کہ ایمان والا آدمی اگرچہ کبیرہ گناہوں کا مرتکب ہو اور توبہ کے بغیر مر جائے اس دردناک عذاب سے محفوظ ہے اور اگر یہ ضدی کفار اللہ تعالیٰ کے عذاب دینے میں جو کہ ان کے حواس کی گرفت سے غائب ہے اور بنی آدم کی پٹائی کے سوا کوئی عذاب نہیں جانتے' شک کریں تو بے جا ہے اس لیے کہ

اِنَّ اِلَيْنَا اِيَابَهُمْ تحقیق ان کا لوٹنا ہماری طرف ہی ہے کہ مرنے کے بعد ہر کسی کی روح حواس کی گرفت سے پوشیدہ ہو جاتی ہے اور جہانِ غیب میں پہنچ جاتی ہے۔ پس ناچار ہر کسی کو اس جہان میں جانا ہے جس کا اللہ تعالیٰ کے سوا کوئی مالک نہیں۔

ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ پھر تحقیق ان کا حساب ہمیں پر ہے' ہم ہر چھوٹے بڑے گناہ اور کفر و عناد کی قسموں پر ان کے مطابق جزا دیتے ہیں تو جس کی روگردانی اور کفر زیادہ شدید ہوگا اس کا عذاب اور سزا بھی زیادہ بڑی ہوگی۔ والعیاذ باللہ تعالیٰ مِنْهُ

پس آیت اِنَّ اِلَيْنَا اِيَابَهُمْ میں احوال برزخ کا اشارہ ہے جو کہ موت کے فوراً بعد پیش آنے والا ہے جبکہ آیت ثُمَّ اِنَّ عَلَيْنَا حِسَابَهُمْ میں روزِ قیامت کے معاملے کا اشارہ ہے جو کہ مدت دراز کے بعد رونما ہوگا اسی لیے کلمہ ثم جو کہ تاخیر اور مہلت پر دلالت کرتا ہے اس آیت کی ابتدا میں لایا گیا۔

سورة الفجر

مکی ہے' اس کی تیس (۳۰) آیات' ایک سوسینتیس (۱۳۷) کلمات اور پانسوستانوے (۵۹۷) حروف ہیں۔

رابطے کی وجہ

اور سورۃ الغاشیہ کے ساتھ اس کا رابطہ یہ ہے کہ وہاں بھی قیامت' جنت' دوزخ' ثواب اور عذاب کا ذکر ہے اور لوگوں کو جنتی دوزخی دوگروہوں میں منقسم ہونا اور نیکی و بدی کے آثار چہروں پر ظاہر ہونا مذکور ہے جبکہ یہاں بھی یہی مضمون مذکور ہے۔ نیز وہاں لِسَعۡيِهَا رَاضِيَةٌ نیکوں کی تعریف میں فرمایا گیا جبکہ یہاں رَاضِيَةً مَّرۡضِيَّةً فرمایا گیا وہاں کافروں کے بارے میں فَيُعَذِّبُهُ اللّٰهُ الۡعَذَابَ الۡاَكۡبَرَ ارشاد ہوا جبکہ یہاں فَيَوۡمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗۤ اَحَدٌ فرمایا گیا اور ہر ایک کے یہی دونوں مضمون ہیں۔

ملحدین کا شبہ اور اس کا جواب

اور اس سورۃ کا نزول ایک شبہ کے جواب میں ہے جو کہ اکثر ملحدین اور زندیقوں کے دل میں گزرتا ہے اور وہ اس شبہ کے ساتھ انبیاء علیہم الصلوٰۃ والسلام اور واعظوں کا مقابلہ کرتے ہیں۔ جس کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کو بندوں کی اطاعت اور ان کی نافرمانی کی پرواہ بالکل نہیں۔ پس وہ جو انبیاء علیہم السلام اور واعظ لوگ کہتے ہیں کہ جہانِ دنیا کے بعد ایک اور جہان ہے جس میں حشر ونشر' سوال و جواب اور جزا و سزا ہوگی' نری بے اصل بات ہے اس لیے کہ اللہ تعالیٰ بنی آدم کے اچھے برے اعمال کی ہر چیز پر مطلع ہے اور ہر کسی کو اس کی سزا تک پہنچانے پر قادر ہے اگر وہ نیکیوں سے خوش ہوتا اور گناہوں سے ناراض تو اطاعت کرنے والوں کو بے شمار نعمتوں سے کیوں نہ نوازتا اور گناہ گاروں کو سزاؤں میں گرفتار کیوں نہ کرتا اور جزا کی تاخیر اور قیامت آنے کا انتظار یا تو اس لیے ہے کہ اس وقت اسے آدمیوں کے احوال' نیکی بدی اور ان کے کردار کی اطلاع نہیں یا اس لیے کہ فی الوقت وہ انتقام کی قدرت نہیں رکھتا اور دونوں امور کا اللہ تعالیٰ کے بارے میں تصور بھی نہیں تو معلوم

ہوا کہ اسے اچھے بُرے کو جزا دینا منظور نہیں اور جو کچھ کرتا ہے‘ بے پروائی کے ساتھ اسی جہان دنیا میں کرتا ہے‘ کسی کو نعمتوں کے ساتھ نوازتا ہے اور عزت دیتا ہے اور کسی کو قسم قسم کی مصیبتوں اور محتاجی میں گرفتار کر دیتا ہے اور ذلیل کرتا ہے۔

اور اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے علم و قدرت کے کمال کے باوجود حکیم مطلق ہے اور اس کی حکمت کا تقاضا ہے کہ ہر کسی کو اس کی جزا دینے میں قیامت کے دن کا انتظار کیا جائے۔

جزائے اعمال کو قیامت پر موقوف کرنے کی حکمت

اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ آدمی کی تین حالتیں ہیں۔ پہلی حالت دنیا کہ جس میں انواع و اقسام کی ضرورتوں میں گرفتار ہے اور مخلوق کے ساتھ کئی قسم کے تعلقات رکھتا ہے جیسے رشتے داری‘ دوستی اور ہمسائیگی۔ نیز طاعت اور بندگی کا مکلف اور آخرت کا سفر خرچ حاصل کرنے میں مصروف ہے اور اپنے راس المال کو بڑھانے اور نفع زیادہ کرنے میں لگا ہوا ہے۔

دوسری برزخ کی حالت کہ موت کے بعد اسے ان مصروفیات سے فراغت ملی لیکن جو کچھ اس کے بھائیوں‘ رشتہ داروں‘ شاگردوں اور دوستوں نے اس کے لیے اور اس کے حکم پر دنیا میں کیا ہے اسی کی طرف منسوب ہوتا ہے تو گویا ابھی تک وہ خود دار العمل میں ہے۔ نیز برزخ میں ان حقوق والوں کے اجتماع کی صورت نہیں بنتی جن کے ساتھ اس نے نیکی اور برائی کرنے کے قسم قسم کے معاملات کیے تھے۔ اس لیے کہ ہر کسی کی موت ایک وقت پر مقرر ہے۔ پس حقوق والوں کی حاضری کے بغیر اس کے معاملات کا فیصلہ کرنا عدل کے خلاف ہے۔

تیسری آخرت کی حالت جس میں اسے کوئی عمل اور مصروفیت نہیں ہے اور اس کی نوع والے اور اس کی پیروی کرنے والے سب موجود اور جو کچھ اس نے خود کیا تھا یا دوسروں نے اس کے لیے اور اس کے حکم پر کیا تھا‘ سب کا سب اس کے پاس پہنچ چکا اور نوع انسانی ختم ہونے کی وجہ سے آئندہ کسی اور چیز کے پہنچنے کی توقع بالکل نہ رہی۔ پس اس کی حکمت ہرگز تقاضا نہیں کرتی کہ اسے دنیوی حالت میں سزا دی جائے اس لیے کہ ابھی وہ کام میں مصروف ہے اور عمر کی پوری مدت جو کہ بمنزلہ اس کے سرمائے کے ہے‘ ابھی تک اسے پوری

ہاتھ نہ لگی اور اس نے اوقات کے جمع اور خرچ کو برابر نہیں کیا۔ پس اگر اسے اس حالت میں جزا میں گرفتار کر دیں تو وہ جواب میں کہہ سکتا ہے کہ مجھے مہلت دینا چاہیے تھی تا کہ میں اپنی عمر پوری کروں اور ابتدائے جوانی اور ناتجربہ کاری میں مجھ سے جو کوتاہیاں واقع ہوئیں' آخر عمر میں اس کا تدارک کر لوں۔

اور تاجروں کا دستور یہی ہے کہ جب کسی ملازم کو کاروبار کے لیے کسی طرف بھیجتے ہیں تو اسے مہلت دیتے ہیں کہ اپنے اختیار اور صوابدید کے مطابق مدت دراز تک مال کی گردش میں تصرف کرے اور اس سے کسی ایک معاملے میں غبن یا نقصان دیکھیں تو اس سے مواخذہ نہیں کرتے کہ شاید کسی دوسرے معاملے میں اس کی طرف سے اس غبن اور نقصان کا تدارک ظاہر ہو جائے۔

اور اسی طرح برزخ میں جزا پہنچانا بھی خلاف حکمت ہے اس لیے کہ ہر مکلّف کے اعمال کے نفعوں اور نتائج کی وصولی بنی نوع انسان کے باقی ہونے کی وجہ سے ابھی تک باقی ہے تو گویا ابھی تک اس کا جمع اور خرچ برابر نہیں ہوا۔ نیز حقوق والے جمع نہیں ہوئے تا کہ پتہ چلے کہ اس کا حق کس پر نکلتا ہے اور اس پر کس کا حق بنتا ہے اور حقوق والوں میں سے کون اپنا حق مانگتا ہے اور کون معاف کرتا ہے۔ تو ناچار جزا دینے کے لیے جہانِ آخرت ہی مقرر ہوگا اور اس وقت تک اللہ تعالیٰ بندوں کے اچھے بُرے اعمال کو ملاحظہ فرماتا ہے اور لکھتا ہے' غفلت بالکل نہیں ہے اور اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ کا یہی معنی ہے اور اسی مضمون کو اس سورۃ میں چند قسموں کی تاکید فرما کر بیان فرمایا گیا ہے۔

وجہ تسمیہ

اور اس سورۃ کا نام سورۃ الفجر اس لیے رکھا گیا ہے کہ پہلی قسم فجر کی واقع ہوئی ہے اور جیسا کہ چاہیے فجر کی روزِ قیامت کے ساتھ مشابہت ہے کہ لوگ ساری رات اس فجر کے آنے کا انتظار کرتے ہیں اور جب فجر ہوگئی گویا موت کے بعد اُٹھائے گئے اور بازاروں' درباروں اور راستوں میں اجتماعات ہوئے اور جن کاموں کا انتظار میں ساری رات گزری' انہیں سرانجام دینے کی صورت بنی اور جب ان قسموں میں کام سرانجام دینے کے انتظار کا

بیان مقصود ہے جو کہ بنی آدم کے فرقوں میں سے ہر فرقے کی عادت ہے اور یہ مقصد ثابت کرنے کے لیے فجر بہت بڑی دلیل ہے ناچار اس سورۃ کو اس نام کے ساتھ موسوم کیا گیا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْفَجْرِ مجھے فجر کے وقت کی قسم ہے کہ اکثر مخلوقات اپنے کام سرانجام دینے میں اس کا انتظار کرتے ہیں اور کام کے اسباب کے باوجود فجر ہونے تک تاخیر کرتے ہیں' اُڑنے والے جانور رزق کی تلاش کے لیے گھونسلے سے باہر نکلنے میں بھوکے اور خالی پیٹ اس کے منتظر رہتے ہیں۔ اور چرنے والے جانور چراگاہوں کو جانے کے لیے بھی اسی کے منتظر ہوتے ہیں۔ اور کچہریوں والے اپنے مقاصد پورے کرنے' مقدمات والے اپنے جھگڑے حکام کے پاس لے جانے' ہنر اور بازار والے اپنے کاروبار' کاشت کار ہل چلانے اور اپنے دوسرے کاموں کے لئے اور مسافر سفر طے کرنے کے لیے اسی کے منتظر ہوتے ہیں اور ہر وہ سب کام جو کہ اظہار اور اعلان سے وابستہ اور روشنی حاصل ہونے پر موقوف ہیں' سب کے سب فجر طلوع ہونے پر معلق ہیں۔

اور بعض فجروں کی خصوصیات زیادہ ہیں کہ ان کے انتظار میں بہت سی مخلوق وقت گزارتی ہے جیسے حاجیوں کے لیے روز عرفہ اور روز نحر کہ سارا سال اسی دن کی آرزو میں گزارتے ہیں اور دُور دراز علاقوں سے وہ دن پانے کے لیے ان متبرک مقامات میں پہنچتے ہیں۔

اور نماز صبح بھی اسی وقت میں ہے' وہ فرشتے جو کہ بندوں کی حفاظت پر مامور ہیں' باری باری دن رات میں آتے اور جاتے ہیں اس وقت میں نشست و برخاست کی دونوں چوکیاں جمع ہو کر اس وقت کی نماز کا انتظار کرتے ہیں اسی لیے حدیث شریف میں وارد ہے کہ من صلی صلٰوۃ الفجر فھو فی ذمۃ اللّٰہ کہ جس نے نماز فجر ادا کی' وہ اللہ تعالیٰ کے ذمے میں ہے اور سورۂ اسریٰ میں واقع ہوا اِنَّ قُرْآنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا یعنی فجر کی قرأت حاضری میں ہوتی ہے اور اس کی تفسیر حدیث شریف میں فرمائی گئی ہے کہ دن رات کے فرشتے اس وقت حاضر ہوتے ہیں اور ان کے حاضر ہونے کی وجہ سے انوار و برکات میں کئی گنا اضافہ ہوتا ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ اکثر مخلوقات کو اپنے کاروبار کے لیے فجر کے آنے کا جو انتظار ہوتا ہے' پوشیدہ نہیں۔ درد والے ساری رات اس امید پر درد کے ساتھ گزارتے ہیں کہ جب فجر ہوگی' طبیب کے پاس جائیں اور اس سے علاج کرائیں اور گدا اور فقیر ساری رات بھوک اور خالی پیٹ کے ساتھ اس امید پر کاٹتے ہیں کہ صبح امیروں کے دروازوں پر جا کر سوال کریں اور روٹی کے سر ہوں۔ علیٰ ہذا القیاس

بنی آدم کے تمام گروہ اپنی ضرورتیں صبح ہونے پر موقوف رکھتے ہیں۔ پس ضرورت اور قدرت کے باوجود اس وقت کے انتظار میں کاموں کو موخر کرنا جسے حکمت نے اس کام کے لیے معین کیا ہے' نوعِ انسانی کی جبلت ہے اسی قیاس پر قیامت کا دن آنے کے انتظار میں جزا کے مقدمے کو مؤخر کرنا سمجھنا چاہیے۔

وَلَيَالٍ عَشْرٍ اور مجھے دس راتوں کی قسم ہے جو کہ بہت بزرگ اور متبرک ہیں اور لوگ سارا سال ان دس راتوں کے آنے کے انتظار میں گزارتے ہیں اور اپنے کاروبار کو ان کے آنے پر موقوف رکھتے ہیں۔

دس متبرک راتوں کا بیان

اور ان دس راتوں کی تین اقسام ہیں: پہلی قسم ذوالحجہ کے مہینے کی پہلی دس راتیں کہ اطراف واکناف کے حاجی ان دس راتوں میں مکہ معظمہ کے شہر اور اس کے نواح میں حج کرنے اور طواف کرنے کی خاطر جمع ہوتے ہیں اور اجتماع کی ابتدا پہلی رات سے ہوتی ہے اور اس کی انتہا دسویں رات میں ہوتی ہے اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ کوئی دن ایسا نہیں جس میں کیا ہوا عمل صالح ذوالحجہ کی دس راتوں سے بہتر اور افضل ہو' ان کے ہر دن کا روزہ ایک سال کے روزوں کے برابر ہے اور ان میں سے ہر رات کی عبادت شب قدر کی عبادت کے برابر ہے۔

دوسری قسم ماہِ رمضان المبارک کی آخری دس راتیں کہ عبادت گزار سنت اعتکاف ادا کرنے اور لیلۃ القدر کی برکات پانے کے لیے سارا سال ان کے انتظار میں ہوتے ہیں اور حدیث شریف میں ہے کہ جب یہ دس راتیں آتیں' حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام گھر چھوڑ کر مسجد

شریف میں اعتکاف بیٹھتے تھے اور کمر مبارک کو خوب باندھ لیتے اور شب بیداری میں اپنے اہل وعیال کو اپنا رفیق بناتے اور انتہائی مجاہدہ فرماتے۔

تیسری قسم محرم کی پہلی دس راتیں ہیں کہ یہ شہداء کی غربت کے دن ہیں اور انہوں نے اللہ تعالیٰ کی راہ میں جو صبر اور رنج برداشت کیا ہے اس کا بے حد وحساب ثواب ان کی ارواحِ مقدسہ پر ان دس راتوں میں نازل ہوتا ہے اور بدعتی لوگ جہالت کے طریقے سے گریہ زاری' سینہ پیٹنے' کتاب پڑھنے' مرثیے پڑھنے' تعزیے بنانے اور ڈھول بجانے کی رسم بجا لانے کے انتظار میں سارا سال کرتے ہیں۔

اور بعض مفسرین نے یہ دس راتیں پورے سال میں جدا جدا بیان کی ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ رمضان المبارک کے آخری دہاکے کی پانچ طاق راتیں جن کے متعلق لیلۃ القدر کی برکات کی امین ہونے کا گمان ہے' ایک عیدالفطر کی رات' ایک عرفہ کی رات' ایک بقرعید کی رات اور ایک معراج النبی صلی اللہ علیہ وسلم کی رات جو کہ رجب کی ستائیسویں رات ہے اور ایک شب برأت مراد ہے۔ واللہ اعلم

یہاں جاننا چاہیے کہ اس سورۃ میں ساری قسمیں معروف باللام لائی گئی ہیں جبکہ لیال عشر کو نکرہ لایا گیا اس کی وجہ ان دس راتوں کی تعظیم بیان کرنا ہے اس لیے کہ ان کی تعظیم کا سب مخفی اور پوشیدہ ہے۔ بخلاف دوسری قسموں کے کہ ان کی عظمت کی وجہ ظاہر اور روشن ہے۔ نیز لیال عشر میں چار وجہوں کا احتمال ہے جیسا کہ بیان ہوا۔ پس ان کے مبہم اور ظاہر ہونے کا فائدہ دینے کے لیے انہیں نکرہ لایا گیا تا کہ سارے احتمالات کی گنجائش ہو۔

وَالشَّفْعِ وَالْوَتْرِ اور مجھے جفت اور طاق عدد کی قسم جو کہ اعداد کے سارے مرتبوں کو شامل اور محیط ہے اس لیے کہ کوئی عدد ان دو قسموں سے باہر نہیں ہوسکتا اور تمام معدودات کو بلکہ تمام موجودات کو شامل ہے اور انسانوں کو جس طرح اپنی مہمات سرانجام دینے کے لیے اوقات کا انتظار ایک جبلی اور فطری امر ہے اسی طرح عدد کے جفت اور طاق مرتبوں کی اپنے معاملات اور قرضوں کے لین دین میں انتظار کرنا فطری اور جبلی چیز ہے۔ حاملہ کے لیے وضع حمل میں نو ماہ کا انتظار کرنا چاہیے جو کہ طاق عدد ہے اور بچے کو دودھ سے روکنے کے لیے دو سال کا انتظار کرنا چاہیے جو کہ جفت عدد ہے۔

بالغ ہونے کی مدت کے تعین کا ذکر

اور بچے کو مکتب میں بٹھانے میں چار سال' تعلیم نماز میں سات سال' روزہ سکھانے میں دس سال اور بالغ ہونے اور شادی نکاح میں پندرہ سال کا انتظار کرنا چاہیے۔ علیٰ ہذا القیاس ہر مہم اور کام کے لیے مہینوں کی تواریخ میں طاق اور جفت کے عدد کا انتظار کرتے ہیں اور شمسی سال پورا کرنے میں بارہ برجوں اور قمری سال میں بارہ مہینوں کا انتظار کرنا چاہیے اور ہفتہ پورا کرنے میں سات دن اور مہینہ پورا کرنے میں تیس یا انتیس دنوں کا انتظار کرنا چاہیے اور دو رکعت و چار رکعت کی نماز میں تکبیر کے شروع سے لے کر سلام پھیرنے تک دو رکعت یا چار رکعت کا انتظار کرنا چاہیے اور تین رکعت کی نماز میں تین رکعت کا انتظار۔ علیٰ ہذا القیاس تمام شرعی اور عرفی امور میں طاق اور جفت کے عدد کا انتظار معمول اور رواج ہے۔

شفع اور وتر کے بارے میں مفسرین کے مختلف اقوال

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ جفت سے مراد مخلوق ہے اس لیے کہ مخلوقات میں سے ہر چیز کو دوسری چیز کے ساتھ ملا کر ذکر کرتے ہیں جیسے آسمان و زمین' روز و شب' نور و ظلمت اور نر مادہ جبکہ طاق سے مراد حضرت حق جل جلالہ کی ذات پاک ہے کہ کوئی چیز اس کے برابر نہیں ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ شفع سے مراد مخلوق کی صفات ہیں جو کہ نقیض اور ضد کے ساتھ مخلوط ہیں جیسے علم اور جہالت' قدرت اور عجز' حیات اور موت' عزت اور ذلت اور قوت اور ضعف جبکہ وتر سے مراد صفات حق تعالیٰ ہیں کہ وجود ہے عدم کے بغیر' قدرت ہے عجز کے بغیر' علم ہے جہالت کے بغیر' حیات ہے موت کے بغیر' عزت ہے ذلت کے بغیر اور قوت ہے ضعف کے بغیر۔

اور بعض نے کہا ہے کہ شفع سے مراد دو رکعتی اور چار رکعتی نمازیں ہیں جبکہ وتر سے مراد تین رکعتی نمازیں مراد ہیں اور یہ تفسیر حضرت عمران بن حصین رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوتا ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ جفت سے مراد جنت کے درجات اور اس کے دروازے ہیں جو

کہ آٹھ ہیں جبکہ طاق سے مراد جہنم کے طبقات اور اس کے دروازے ہیں جو کہ سات ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ جفت بارہ برج ہیں جبکہ طاق سات سیر کرنے والے ستارے ہیں جن کی ان برجوں میں گردش کی وجہ سے دنیا میں گوناگوں حالات اور انقلابات رونما ہوتے ہیں۔

اور بعض نے کہا ہے کہ جفت سے مراد وہ مہینہ ہے جو پورے تیس دنوں کا ہے جبکہ طاق سے مراد وہ مہینہ ہے جس کے انتیس دن ہوتے ہیں اور بعض نے کہا ہے کہ جفت سے مراد ہر رکعت کے دو سجدے ہیں جبکہ طاق سے مراد ایک رکوع ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ جفت سے مراد وہ بارہ چشمے ہیں جو کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے دست مبارک سے ایک پتھر پر عصا مارنے سے جاری ہوئے جبکہ طاق سے مراد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے وہ نو معجزات ہیں جو کہ آپ نے فرعون کے مقابلے میں ظاہر فرمائے اور قرآن مجید میں بھی ان کا اشارہ ہے۔ وَلَقَدْ اٰتَیْنَا مُوْسٰی تِسْعَ اٰیَاتٍ بَیِّنَاتٍ

اور حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ کی روایت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ثابت ہوا کہ جفت سے مراد عید قرباں کا دن ہے جو کہ ذوالحجہ کی دسویں تاریخ ہے جبکہ طاق سے مراد ذوالحجہ کی نویں تاریخ ہے اور یہ تفسیر لیال عشر کے ساتھ پوری مناسبت رکھتی ہے۔

وَالَّیْلِ اِذَا یَسْرِ اور مجھے رات کی قسم ہے جس وقت کہ اس کی تاریکی جہان میں سرایت کرتی ہے کہ وہ بھی انتظار کرنے کا وقت ہے' ان کاموں کے لیے جو کہ پردے اور چھپنے سے وابستہ ہیں' خواہ نیک ہوں یا بُرے جیسے شب زندہ داروں کی عبادت' نکاح کا جشن' چوروں کی چوری' نقب لگانے والوں کا رقص' عیاشوں کی عیاشی' جادوگروں کا جادو' شعبدہ بازوں کا طلسم اور چہرہ بازوں کا دیدار۔ پس ان پانچ قسموں کے ساتھ ثابت ہوگیا کہ کام کے اسباب اور وسائل کے جمع ہونے کے باوجود وقت اور عدد کا انتظار انسان کی جبلی حکمت کے مطابق ہے جس کی ہر اچھے اور بُرے کام میں رعایت کرتا ہے اور ان چیزوں میں غور و فکر کرنا عقل مند کو قیامت تک جزا کو مؤخر کرنے کے راز اور حکمت تک پہنچا دیتا ہے اسی لیے فرمایا جا رہا ہے کہ

هَلْ فِيْ ذَالِكَ قَسَمٌ لِّذِيْ حِجْرٍ کیا اس میں جو کہ ذکر کیا گیا کوئی قسم ہے جو کہ صاحبِ عقل کے لیے کافی ہو۔ گویا یہ پانچوں قسمیں عقل مند کے لیے اس بات کو ثابت کرنے میں کافی ہیں کہ ہر نیک و بد کی جزا پہنچانے میں حق سبحانہ وتعالیٰ وقت قیامت کے انتظار میں ہے بلکہ ان قسموں کا لحاظ کیے بغیر ہی عقل جزا واجب کرنے اور جزا کے وقت کو عمل اور حکم عمل کے وقت سے جدا سمجھنے کے لیے کافی ہے اور اگر ناقص عقل والوں کو یہ چیز بعید اور محال نظر آتی ہے تو اس وجہ سے آتی ہے کہ اس روز جبکہ اوّلین اور آخرین سب کا اجتماع ہوگا' ہر کسی کو اس کی جزا پہنچانا ایک بہت دشوار کام ہے خصوصاً جب کہ وہ کثیر جماعت مقابلے کے لیے جمع ہو جائے اور وہ دفاع پر اُتر آئیں کہ ایسے وقت میں جزا پہنچانا ممکن نہیں رہتا اسی لیے اقتدار والے بادشاہوں نے طاقت ور ہجوم کو سزا دینے سے بربنائے حکمت کنارہ کیا ہے اور پہلے مختلف تدابیر اور حیلوں کے ساتھ ان کی جمعیت کو منتشر کر کے ان کی قوت کو پاش پاش کیا پھر انتظام میں مصروف ہوئے ہیں تو اگر گناہ گاروں میں سے ہر ایک کے ساتھ جزا دینے کا معاملہ جدا جدا عمل میں لایا جاتا تو اس دشواری سے زیادہ دُوری ہوتا۔

اللہ تعالیٰ نے ان مذکورہ قسموں اور جس مضمون پر یہ قسمیں اُٹھائی ہیں جو کہ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ ہے کے درمیان جملہ معترضہ کے طور پر دنیا میں جزا دینے کے اپنے تین واقعات بیان فرمائے جن میں سے ہر ایک واقعہ میں نہایت طاقت ور اور کثیر التعداد جماعت والوں کو انتہائی آسان اسباب کے ساتھ بالکل تباہ اور نیست و نابود فرما دیا تو اس کی قدرت کے سامنے طاقت وروں کی کثیر تعداد کو جزا دینے کے معاملے کو دشوار اور محال ہرگز نہیں سمجھنا چاہیے اور اس کی قدرت کو ذوی الاقتدار بادشاہوں کی قدرت پر قیاس نہیں کرنا چاہیے کہ ان کی اس سے کوئی نسبت نہیں۔

اور یہاں تین واقعات کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ اگر کسی سے کوئی ایسا کام ایک مرتبہ صادر ہوتا ہے جو کہ خلافِ عادت ہو تو اسے امر اتفاقی خیال کرتے ہیں لیکن جب دوبار یا سہ بار واقع ہوتا ہے تو یقین حاصل ہو جاتا ہے کہ یہ کام اس شخص کے لیے بہت آسان اور ہلکا ہے۔

اور یسرا اصل میں یسری تھا' یا کو حذف کر کے کسرہ کو اس پر دلیل کے طور پر چھوڑ دیا

گیا۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص نے اخفش نحوی سے اس یا کے گرانے کی وجہ پوچھی۔ اخفش نے کہا کہ جب تک تو ایک سال تک میری خدمت نہ کرے، میں تجھے اس یا کے گرانے کی وجہ نہیں بتاؤں گا ایک سال کی خدمت کے بعد اس نے یوں بیان کیا کہ یسری مشتق ہے سریٰ سے جس کا معنی ہے رات کو چلنا اور یہ رات کو چلنے والوں کی صفت ہے نہ کہ رات کی صفت لیکن مجازی طور پر اسے رات کی صفت بنا دیا گیا ہے اس لیے کہ یہ رات کو چلنے کا وقت ہے اور عربوں کی اصطلاح میں مجازی طور پر فعل کو زمان یا مکان کی طرف منسوب کرنے کا بہت رواج ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ لیلہ قائمٌ نہارہ صائمٌ تو جب یسری کے معنوں میں تبدیلی واقع ہوگئی تو انہوں نے چاہا کہ اس کے لفظ میں بھی کچھ تبدیلی کر دیں تا کہ لفظ معنی کے مطابق ہو۔ یہ ہے وہ جواب جو اس بارے میں اخفش سے منقول ہے۔ لیکن یہ بات دو مقدمات پر موقوف ہے۔ ایک یہ کہ یسری، سری سے مشتق ہے اور یہ لازم نہیں بلکہ ظاہر یہ ہے کہ سرایت سے مشتق ہے تا کہ وَاللَّيْلِ إِذَا سَجٰى، وَاللَّيْلِ إِذَا يَغْشٰى کے مطابق ہو جائے۔ دوسرا یہ بات کہ اگر سری سے مشتق ہو تو چلنے والوں کی صفت ہوگی نہ کہ رات کی صفت اور یہ بھی لازم نہیں ہے بلکہ ظاہر یہ ہے کہ رات کو چلنے سے جدا کر کے مطلق چلنا مراد لیا گیا ہے۔ واللیل اذا ادبر کے انداز میں۔ پس یہ رات کی صفت ہوگی یا شب روی کا استعارہ رات کے جانے کے لیے ہوگا اس لیے کہ رات کا جانا اور رات میں جانا ایک دوسرے کے موافق ہیں بلکہ اگر ہم تحقیقی نظر سے کام لیں تو شب روی کی حقیقت بھی رات کی صفت ہو سکتی ہے اس طرح سے کہ حقیقت میں رات زمین کے گاؤدم سائے کا نام ہے جو کہ آفتاب کے مقابلے میں حرکت کرتا ہے اور اس گاؤدم کے پیندے کے آفاق میں سے کسی اُفق پر پورا اُترنے کی وجہ سے اس اُفق کی رات آ جاتی ہے اور وہ گاؤدم ہمیشہ حرکت میں ہے لیکن ہر اُفق کی نسبت سے اس کی حرکت رات میں اس اُفق میں ہوتی ہے۔ پس زیادہ بہتر یہ ہے کہ اس یا کو گرانے کی وجہ گزشتہ آیات کے آخری کلمات سے ہم شکل ہونے کی رعایت ہے، کچھ اور نہیں۔

أَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ کیا تو نے دیکھا نہیں کہ تیرے پروردگار نے کیا کیا اور یہاں دیکھنا جاننے کے معنوں میں ہے اس لیے کہ یہ واقعہ تواتر اور شہرت کے اس مرتبے پر تھا

کہ اسے جاننا گویا دیکھنا ہے۔

لفظ ربك لانے کی وجہ

اور یہاں بلکہ اس ساری سورۃ اور دوسری سورتوں میں اسم ذات پاک کی بجائے ربک کا لفظ استعمال ہوا ہے اور یہاں اور اس جیسے دوسرے مقامات میں اس لفظ کو اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہ ربوبیت جو کہ عظیم الشان رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف منسوب ہے' جامع ہے اور جامع ربوبیت بلاشبہ عدل و انصاف قائم کرنے کا متقاضی ہے جبکہ عدل و انصاف نافرمانوں اور سرکشوں کو ہلاک کرنے کا تقاضا کرتا ہے۔

بِعَادٍ اِرَمَ ذَاتِ الْعِمَادِ ارم کے رہنے والے فرقۂ عاد کے ساتھ اور وہ ارم بلند پُرتکلف ستونوں والا تھا عماد' عمد کی جمع ہے جیسے کہ جبال' جبل کی جمع ہے۔

عاد دو فرقوں کا نام ہے

یہاں جاننا چاہیے کہ عاد دو گروہوں کا نام ہے۔ عاد اولیٰ کہ جنہیں قدیم عاد بھی کہتے ہیں اور وہ عاد بن ارص بن ارم بن سام بن حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد ہیں اور انہیں عاد ارم بھی کہتے ہیں اس لیے کہ ارم ان کا دادا تھا اور انہوں نے شہر ارم کو بھی اپنے دادا کے نام سے موسوم کیا تھا اور ان کی رہائش گاہیں عدن کے ساتھ تھیں۔

عاد دوم کہ یہ ایک دوسرے شخص کی اولاد ہیں اس کا نام بھی عاد تھا۔ عاد اولیٰ کی باقی رہنے والی نسل میں سے تھا اس نے حضر موت کے ساتھ احقاف کی زمین میں وطن بنایا اور اس کے بیٹے اس ملک میں پھیل گئے اور اپنے نبی علیہ السلام کے ساتھ جو کہ حضرت ہود علیہ السلام تھے' عاد دوم کا واقعہ قرآن مجید میں تکرار کے ساتھ وارد ہے جیسا کہ اپنے مقام پر مذکور ہے جبکہ عاد اولیٰ کا واقعہ قرآن مجید میں دو مقامات سے زیادہ نہیں آیا اور وہ بھی اجمالی طور پر ہے ایک یہاں اور دوسرے سورۃ النجم میں کہ وَاَهْلَكَ عَادَ نِ الْاُوْلٰى اشارہ کرتا ہے۔

عاد اولیٰ کا بقدر کفایت واقعہ

حاصلِ کلام یہ کہ ان کا واقعہ بس قدر اس آیت کی تفسیر میں کافی ہے یہاں لکھا جاتا

ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اس گروہ کو بہت بڑے جسم' دراز قد اور بے تحاشا طاقت دی تھی اور وہ اپنے زمانے والوں میں سے ان صفات میں ممتاز تھے۔ ان میں سے سب سے چھوٹے قد والا بارہ گز کا تھا۔ اور ان میں سے ہر شخص بڑی بڑی چٹانوں کو کہ جنہیں کثیر جماعت کے بغیر اُٹھا نہیں سکتے تھے۔ ایک ہاتھ سے اُٹھا کر پلٹ دیتا تھا۔ اور وہ پورے ملک یمن پر اپنی طاقت اور قوت کی وجہ سے قابض تھے یہاں تک کہ دو بڑے بادشاہ ان میں پیدا ہوئے۔ پہلا شدید اور دوسرا شداد اور یہ دونوں بادشاہ مشرق سے مغرب تک زمین پر قابض تھے اور ان کے بے شمار لشکر اور بے پناہ خزانے تھے۔ خصوصاً بڑے بھائی شدید کے مرنے کے بعد شداد کی دولت اور حکومت حد سے زیادہ بڑھ گئی' چار سو سے کچھ اوپر بادشاہوں نے اس کی ماتحتی اختیار کی اور زمین کے بادشاہوں میں سے کسی میں بھی اس کے مقابلے کی طاقت نہ رہی۔

اس تکبر کی وجہ سے اس نے خدائی کا دعویٰ کر دیا اس زمانے کے واعظوں اور داناؤں نے جن کے پاس انبیاء علیہم السلام کی میراث میں سے کچھ علم باقی تھا اس لعین کو وعظ و نصیحت کے طور پر خدا تعالیٰ سے ڈرایا۔ اور اسے اللہ تعالیٰ کی عبادت کی دعوت دی۔ اس نے کہا کہ مجھے اللہ تعالیٰ کی عبادت میں اس دولت' نعمت' مرتبہ اور ثروت سے زیادہ اور کیا حاصل ہوگا' جو کسی کی خدمت بجا لاتا ہے' طمع اور مرتبے کی ترقی یا حصول دولت کے لیے بجا لاتا ہے۔ مجھے یہ سب کچھ حاصل ہے' کسی کی خدمت کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ انہوں نے کہا کہ یہ سب دنیوی حکومت و دولت زائل اور فانی ہے' اللہ تعالیٰ اپنی عبادت کے ثواب میں ایک چیز ساری دنیا سے بہتر عطا فرماتا ہے جس کا نام بہشت ہے اور گزشتہ انبیاء علیہم السلام اس کی تعریف بیان کر گئے ہیں اس نے پوچھا کہ اس بہشت کی کیا صفت ہے؟ واعظوں نے انبیاء علیہم السلام سے منقول اوصاف کے مطابق تمام اوصاف بیان کر دیئے اس نے کہا کہ مجھے اس بہشت کی بھی ضرورت نہیں اس لیے کہ میں دنیا میں اس کی مانند بہشت بنا سکتا ہوں۔

شداد لعین کی خود ساختہ بہشت کا واقعہ

اس نے اپنے معتبر سرداروں میں سے ایک سو آدمیوں کی ڈیوٹی لگا دی اور ان میں سے

ہر ایک کے ساتھ ہزاروں کو مقرر کر دیا تاکہ وہ عمارت کے پروگرام اور اعمال میں اس سردار کی مدد کریں اور سرداروں کو ڈیوٹیوں پر لگا دیا۔ اور ساری دنیا کے تمام ممالک میں احکام بھیج دیئے کہ جہاں بھی سونے اور چاندی کی کانیں ہوں' ان کی اینٹیں بنا کر بھیجی جائیں اور اس نے زمین کے مدفون خزانے نکال باہر کیے اور کوہِ عدن کے ساتھ ایک مربع شکل کے شہر کی جس کا حلقہ چالیس کوس تھا' ہر طرف سے دس کوس مقرر کر کے بنیاد رکھی۔ پہلے اس کے حکم پر اس کی بنیاد کو کھود کر پانی تک پہنچایا گیا اور اسے سلیمانی پتھر کے ساتھ پُر کیا گیا اور جب اس کی بنیاد سطح زمین پر ظاہر ہو گئی تو سونے اور چاندی کی اینٹوں سے اس شہر کی چاردیواری بنائی گئی اور اس کی دیوار کی بلندی اس وقت کے متعارف پیمانے کے مطابق پانسو گز بنائی گئی۔ سورج طلوع ہونے کے وقت اس کی شعاعیں چمکنے سے نگاہیں اس دیوار کو دیکھنے سے چندھیا جاتی تھیں۔

اور مذکورہ چاردیواری کے اندر ایک ہزار محلات کی بنیاد رکھی گئی' ہر محل ہزار ستونوں پر مشتمل تھا اور ستونوں کو قسم قسم کے زمرد اور یاقوت کے ساتھ مرصع کیا گیا اور شہر کے عین وسط میں ایک نہر بنائی اور اس نہر سے چھوٹے چھوٹے کھالے محلات کی طرف جاری کیے۔ اور ان نہروں کے صحن کو یمنی یاقوت اور دوسرے جواہرات سے پُر کیا۔ اور نہر اور کھالوں کے کنارے درخت کھڑے کیے جن کے تنے سونے کے' شاخیں زمرد کی اور شگوفوں کے بجائے یاقوت اور مروارید لگانے کا حکم دیا اور مکانوں اور دُکانوں کو اندر کی طرف سے گلاب کے ساتھ مشک و عنبر کا گارا بنا کر لیپا گیا۔

اور سونے' یاقوت اور جواہر کے اچھی آواز والے اور خوب صورت پرندے درختوں پر بنائے اور شہر کے اردگرد ایک ہزار سونے کے اور جواہر کے مینار تیار کیے اور میناروں میں چوکیدار مقرر کیے تاکہ باری باری پہرہ دیں اور جب مکانات اور محلات سمیت یہ شہر بن گیا تو اس نے حکم دیا کہ پورے شہر کے لیے قالین اور فرش سونے کی تاروں سے بنائے جائیں اور سونے اور چاندی کے برتن اس شہر کے مکانوں میں سلیقے کے ساتھ چن دیں اور بعض نہروں میں میٹھا پانی' بعض میں شراب' بعض میں دودھ اور بعض میں شہد جاری کر دیا اور بازاروں اور

دُکانوں کو بھی سونے کی تاروں سے منقش پردوں سے آراستہ کر کے پیشے اور صنعت سے وابستہ لوگوں کو حکم دیا کہ وہ اپنے اپنے کام میں لگ جائیں اور انواع و اقسام کے کھانے' مٹھائیاں وغیرہ تیار کر کے حکم دیا کہ دربار شاہی کے جوٹھے کھانے کے طور پر تمام شہریوں کو پہنچائے جائیں اور اس کیفیت کے ساتھ یہ شہر بارہ سال کی مدت میں تیار ہوا۔

اس کے بعد اس نے حکم دیا کہ تمام بڑے بڑے امراء پوری زیب و زینت کے ساتھ اس شہر میں داخل ہوں اور سکونت اختیار کریں اور وہ خود بھی اپنے پیروکاروں اور لشکر سمیت پورے تکبر اور غرور کے ساتھ اس شہر کو دیکھنے کے لیے چلا۔ اور وہ واعظوں اور نصیحت کرنے والوں کو مذاق اور تمسخر کے طور پر کہہ رہا تھا کہ تم مجھے یہی جنت حاصل کرنے کے لیے تکلیف دے رہے تھے کہ میں کسی کے حضور اپنا سر جھکاؤں اور عاجزی کروں۔ یہ ہے میری قدرت اور دولت' تم نے دیکھی اور میرا استغناء اور بے نیازی کا مشاہدہ کیا۔ کہتے ہیں کہ جب وہ اس شہر کے قریب پہنچا تو اس شہر کے لوگ گروہ در گروہ استقبال کے لیے باہر آ کر اس پر زر جواہر کی نچھاور کر رہے تھے اور تحفے و تحائف پیش کر رہے تھے ابھی شہر کے دروازے سے ایک قدم باہر اور ایک قدم اندر تھا کہ آسمان کی طرف سے ایک تیز آواز پیدا ہوئی جس سے ساری مخلوق ہلاک ہوگئی اور بادشاہ بھی دروازے پر گرا اور تڑپ کر مر گیا اور جس شہر کو اس مشقت اور تلاش کے ساتھ محنت کر کے بنایا تھا' اسے دیکھنے کی حسرت دل میں ہی لے گیا۔

حضرت ملک الموت کی رقت کے دو واقعات

اور بعض کتابوں میں پڑھا ہے کہ حق تعالیٰ نے ملک الموت سے فرمایا کہ تجھے کسی مخلوق کی روح کو قبض کرنے میں کبھی رقت پیدا ہوئی ہے یا نہیں؟ عرض کی بار خدایا! دو شخصوں کی روحیں قبض کرنے میں مجھے بہت رقت دامن گیر ہوئی۔ اگر تیرا حکم نہ ہوتا تو میں ان کی جان لینے کا اقدام ہرگز نہ کرتا' ان دو میں سے ایک نومولود بچہ تھا جو کہ اپنی ماں کے ہمراہ سمندر میں کشتی کے ایک تختے پر رہ گیا تھا' مجھے اس کی ماں کی جان قبض کرنے کا حکم ہوا اس وقت مجھے اس بچے کے حال پر بہت رقت دامن گیر ہوئی کہ اس بچے کی اس کی ماں کے بغیر خبر گیری کرنے والا کوئی نہ تھا۔ دوسرا ایک بادشاہ تھا جس نے ایک شہر بڑی آرزوؤں کے ساتھ بنایا

تھا اور اس شہر جیسا دنیا میں کوئی شہر بنایا نہیں گیا۔ جب اس نے وہ شہر دیکھنے کے لیے اس کے دروازے پر قدم رکھا تو حکم ہوا کہ میں اس کی جان لے لوں اس وقت بھی وہ حسرت دیکھ کر جو وہ بادشاہ دل میں لے گیا' مجھے رقت ہوئی۔ دربارِ خداوندی سے ارشاد ہوا کہ یہ بادشاہ وہی بچہ تھا جسے میں نے اس کے ماں باپ کی پرورش کے واسطے کے بغیر اس دبدبے' قوت اور دولت تک پہنچایا جب وہ اس مرتبے پر پہنچا تو اس نے ہمارے حکم سے سرکشی کی اور تکبر اختیار کیا اور اپنی سزا پائی۔

شداد اور اس کی ماں کا واقعہ

مؤرخین یوں کہتے ہیں کہ کشتی کا وہ تختہ جس پر یہ بچہ رہ گیا تھا' ہوا کے حرکت دینے کی وجہ سے سمندر کے کنارے پہنچ گیا۔ ساحل پر دھوبی کپڑے دھو رہے تھے جب انہوں نے دیکھا کہ ایک بچہ میت کے ہمراہ تخت پر پڑا ہے' سمندر میں پہنچ گئے اور تختے کو کھینچ کر لے گئے۔ میت کو دفن کر دیا اور بچے کو دھوبیوں کے سردار کے پاس لے گئے۔ وہ خوب صورت اور خوش وضع بچہ دیکھ کر فریفتہ ہو گیا' اس کے ہاں اولاد نہ تھی' اسے اپنا بیٹا بنا لیا اور اس کی پرورش شروع کر دی یہاں تک کہ سات سال کا ہو گیا اور بچپنے سے ہی اس میں دانائی اور عقل مندی کے آثار ظاہر تھے' وہ ایک دن بستی سے باہر بچوں کے ہمراہ کھیل رہا تھا کہ اچانک شور اُٹھا کہ بادشاہ کی سواری گزر رہی ہے اور لشکر آنا شروع ہو گیا۔ دوسرے لڑکے ہیبت زدہ ہو کر بھاگ گئے اور یہ لڑکا جرأت کر کے ایک ٹیلے پر کھڑے ہو کر بادشاہ کی سواری اور لشکر کے گزرنے کا نظارہ کر رہا تھا یہاں تک کہ سب لشکری گزر گئے اور بادشاہی پیادے جو کہ گری پڑی شے کی حفاظت کے لیے لشکر کے پیچھے مقرر تھے' گزرنا شروع ہوئے۔ ان میں سے ایک پیادے نے دیکھا کہ ایک لپیٹا ہوا کاغذ سر راہ پڑا ہے اس نے وہ کاغذ اُٹھا لیا اور کھولا' دیکھا کہ اس کاغذ میں سرمہ لپیٹا ہوا ہے۔

اس نے اپنے دوستوں سے کہا کہ مجھے یہ سرمہ ملا ہے' میری نظر کمزور ہے اگر آپ کہیں تو میں آنکھ میں ڈالوں؟ شاید کوئی فائدہ ہو۔ انہوں نے کہا کہ گری ہوئی چیز اُٹھانا نہیں چاہیے اور اگر تو نے اسے اُٹھا لیا ہے تو آزمائے بغیر آنکھ میں ڈالنا بالکل درست نہیں۔ چاہیے کہ

پہلے اسے کسی اور کی آنکھ میں استعمال کروتا کہ اگر نقصان دہ نہ ہو تو خود بھی استعمال کر لینا۔ اس پیادے نے دائیں بائیں دیکھا اس لڑکے کے سوا کوئی نظر نہ آیا جو کہ ٹیلے پر کھڑا نظارہ کر رہا تھا اس نے کہا لڑکے! ادھر آؤ تمہاری آنکھوں میں سرمہ ڈالوں جس سے تمہاری آنکھوں کو زیب و زینت حاصل ہوگی۔ لڑکا بھاگتا ہوا گیا اور اس نے پیادے کے ہاتھ سے سرمے والا کاغذ لے کر ایک سلائی اپنی آنکھ میں ڈال لی۔ سرمہ ڈالتے ہی زیر زمین خزانے اس کی نظر میں ظاہر ہونے لگے اس چیز کی طرح جو کہ پانی کی تہ سے ظاہر ہوتی ہے۔ لڑکے نے ہوشیاری اور دانائی کے طریقے سے چیخنا شروع کر دیا کہ اے ظالمو! ناانصافو! تم نے میری آنکھوں کو اندھا کر دیا' میں بادشاہ کے حضور فریاد کرنے جا رہا ہوں اور تمہیں سزا دلواتا ہوں۔ پیادے یہ واقعہ سنتے ہی گرتے پڑتے حیران و پریشان بھاگ کھڑے ہوئے۔ یہ لڑکا سرمے والا کاغذ اپنے ہمراہ لے کر گھر آ گیا۔ دھوبیوں کے سردار سے یہ راز بیان کیا اس نے کہا کہ میرے یہ گدھے اور گھوڑے حاضر ہیں' رات کے وقت جب لوگ سو جائیں تو کسیاں اور کدال لے کر جہاں تمہیں خزانے نظر آئیں' یہ سب گدھے اور گھوڑے وہاں لے جاؤ اور قابلِ اعتماد مزدور جو کہ سالہا سال سے میرے رفیق اور دوست ہیں' ساتھ لے جاؤ اور جو کچھ ہو سکے' اُٹھا لاؤ۔

لڑکے نے یہی کام شروع کر دیا اور بے شمار مال لانا شروع کر دیا اور سب بستی والوں کو اپنے ساتھ متفق کر لیا اور اس بستی کے سردار کو قتل کر کے اس کی جگہ خود قابض ہو گیا۔ رفتہ رفتہ یہ خبر حاکموں اور فوجی افسروں تک پہنچ گئی' وہ اس کے انتقام کے درپے ہو گئے اس لڑکے نے بھی فوجیں اکٹھی کیں اور مقابلے کیے اور غالب آیا یہاں تک کہ بادشاہ مر گیا اور یہ لڑکا بغاوت کر کے بادشاہ بن گیا اور رفتہ رفتہ دُور دراز کی ریاستوں پر بھی قابض ہو گیا اور روئے زمین کے تمام بادشاہ اس کے حکم کے تابع ہو گئے۔

شداد کے شہر تک عبداللہ بن قلابہ رضی اللہ عنہ کی رسائی اور اس کے متعلق اخبار بالغیب

اب ہم یہاں پہنچے کہ مذکورہ شہر کا کیا بنا۔ معتبر تفاسیر میں لکھا ہے کہ اس بادشاہ اور اس

کے لشکریوں کے ہلاک ہونے کے بعد اس شہر کے لوگوں کی نظر سے چھپا دیا گیا مگر یہ کہ بعض راتوں میں عدن کے شہر کے مضافات میں رہنے والوں کو وہاں ایک چمک اور روشنی نظر آتی ہے اور کہتے ہیں کہ یہ چمک اسی شہر کی دیواروں کی ہے۔ اور حضرت عبداللہ بن قلابہ رضی اللہ عنہ جو کہ ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب میں سے ہیں' ایک دن اس علاقے میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ آپ کا ایک اونٹ بھاگ گیا' آپ اسے پکڑنے کے لیے دوڑے اور اس شہر کے پاس پہنچ گئے اور اس کے مینار اور دیواریں دیکھتے ہی دہشت زدہ اور ہکابکا رہ گئے اور دل میں سوچا کہ اس شہر کی صورت بعینہٖ اس بہشت کی ہے جس کا ہمارے رسولِ پاک صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمارے ساتھ وعدہ فرمایا ہے۔ شاید مجھے اس دارالعمل میں وہ بہشت دِکھائی گئی ہو جب اس شہر کے دروازے پر پہنچے اور اندر داخل ہو کر دیکھا کہ اس شہر کے محلات' نہریں اور درخت سب کے سب وعدہ شدہ جنت کے مشابہ ہیں اور شہر میں کوئی بھی نہیں۔ آپ نے محلات کے صحنوں میں بچھے ہوئے کچھ جواہرات اور یواقیت اپنی چادر میں اُٹھا لیے اور تنہائی کے خوف سے باہر آ کر دمشق کی راہ لی اور حضرت معاویہ بن ابوسفیان رضی اللہ عنہ کے پاس یہ ماجرا بیان کیا جو کہ اس وقت کے خلیفہ تھے۔ آپ نے ان سے پوچھا کہ آپ نے یہ شہر خواب میں دیکھا ہے یا بے داری میں؟ کہا بے داری میں دیکھا ہے اور میں نے اس شہر کی علامات کو دل میں پکا کر رکھا ہے کہ وہ عدن سے فلاں سمت کو اتنے فاصلے پر ہے اور دوسری سمت سے اس کی علامت فلاں درخت ہے اور دیگر سمت سے فلاں کنواں اور یہ ہیں وہ جواہرات اور یاقوت جو کہ میں نے وہاں سے اُٹھائے ہیں' میرے پاس موجود ہیں۔

حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ یہ ماجرا سُن کر بہت متعجب ہوئے اور آپ نے اس وقت کے علماء کے پاس آدمی بھیجے کہ کیا دنیا میں کوئی ایسا شہر ہے جو کہ سونے اور چاندی کے ساتھ بنایا گیا ہو اور اس کی صفات اس قسم کی ہوں۔ وقت کے علماء نے کہا کہ ہاں قرآن پاک میں اس شہر کا ذکر آیا کہ ارم ذات العماد ہے اور اس شہر کو حق تعالیٰ نے لوگوں کی نظر سے پوشیدہ رکھا ہے اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ میری اُمت کا ایک آدمی اس شہر میں داخل ہوگا جس کا رنگ سرخ' قد چھوٹا' گردن میں تل ہوگا اور وہ گم شدہ اونٹ کی تلاش میں

اس شہر تک پہنچے گا اور اس کے عجائبات کا مشاہدہ کرے گا جب حضرت امیر معاویہ رضی اللہ عنہ نے عبداللہ بن قلابہ رضی اللہ عنہ میں وہ اوصاف مطابق واقعہ پائیں تو فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کی قسم وہ شخص یہی ہے۔

خلاصۃ المرام آنکہ اس شہر کے اوصاف میں اس قدر سے زیادہ ذکر نہیں کیے جا سکتے کہ جمیع معلومات کو علم ذات کے محیط ہونے کے باوجود حضرت رب العزت نے اس کے بارے میں ارشاد فرمایا ہے کہ

اَلَّتِیْ لَمْ یُخْلَقْ مِثْلُهَا فِی الْبِلَادِ وہ شہر کہ جس کی مثل روئے کے شہروں میں سے کوئی شہر پیدا نہیں کیا گیا۔

وَثَمُوْدَ الَّذِیْنَ جَابُوا الصَّخْرَ بِالْوَادِ اور تیرے پروردگار نے فرقۂ ثمود کے ساتھ کیا سلوک کیا جو کہ وادیٔ القریٰ میں بڑے بڑے پتھر تراشتے تھے اور فرقۂ ثمود والے فرقۂ عاد والوں کے بچے تھے جو کہ عادیوں کی ہلاکت کے بعد حجاز مقدس اور شام کے درمیان رہائش پذیر ہو گئے تھے اور حجر سے لے کر وادی القریٰ تک سترہ سو آبادیوں پر قابض تھے۔ ہر شہر میں اونچے محلات اور ان میں پھول دار درختوں تراشے ہوئے پتھر کی محرابی عمارات اور گل و ریاحین کی تصویریں درست کر کے داد عیش دیتے تھے اور بت پرستی کرتے تھے حتیٰ کہ حق تعالیٰ نے حضرت صالح علیہ الصلوٰۃ والسلام کو رسول بنا کر ان کے پاس بھیجا اور ان کا واقعہ سورۂ والشمس میں مذکور ہے۔

اور وادیٔ القریٰ ایک شہر کا نام ہے جو کہ طول وعرض میں مکہ معظمہ کے برابر ہے وہاں کھجور کے باغات اور چشمے بے شمار ہیں اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم فتح خیبر کے بعد اس شہر پر اور اس کے مضافات پر قابض ہوئے اور اگرچہ ثمودیوں کی بنائی ہوئی زیادہ تر عمارات اور باغات حجر اور اس کے مضافات میں تھے لیکن وادیٔ القریٰ کو خصوصیت کے ساتھ اس لیے بیان فرمایا کہ یہ مقام ان کی آبادیوں کی آخری حد تھی اور حجاز مقدس کی سرحد سے متصل اور ابھی آباد تھا۔ بخلاف حجر کے اس کا تعلق شام کی طرف زیادہ ہے اور حجاز سے دور ہے۔ حجاز مقدس کے لوگ اس کے احوال پر کماحقہ مطلع نہ تھے۔ نیز ویران اور لق و دق پڑا تھا۔

وَفِرْعَوْنَ ذِی الْاَوْتَادِ اور کیا سلوک کیا فرعون کے ساتھ جو کہ میخوں والا تھا یعنی لوگوں کو چومیخا کر کے عذاب دیتا تھا۔ چنانچہ اس نے چند مسلمانوں کو جو حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائے تھے' اسی طریقے سے ہلاک کر دیا تھا۔

ان میں سے جبرئیل نامی اس کے خزانے کا داروغہ تھا اور وہ چوری چھپے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لے آیا تھا۔ فرعون نے اس کے اس حال پر مطلع ہو کر اسے چار میخ زمین میں لٹکا کر ہلاک کر دیا۔

ان میں سے داروغہ جبرئیل کی بیوی تھی جو کہ فرعون کی بیٹی کے بالوں میں کنگھی کرنے والی تھی' وہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکی تھی۔ فرعون کی لڑکی نے اس ماجرے پر مطلع ہو کر فرعون کو آگاہ کر دیا۔ فرعون نے اس عورت کو بلا کر کہا کہ اسلام سے پھر جا' وہ عورت برگشتہ نہ ہوئی اس نے حکم دیا حتیٰ کہ اس کے ہاتھ اور پاؤں کو چار میخوں کے ساتھ زمین میں گاڑ کر ہلاک کر دیا۔

اور ان میں سے حضرت آسیہ ہے' فرعون کی بیوی۔ وہ بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لا چکی تھیں۔ آپ فرعون کو جب وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو ستانا چاہتا تو پند و نصیحت کر کے باز رکھتی تھیں۔ حتیٰ کہ فرعون غضب ناک ہو گیا اور اس کے حکم پر انہیں بھی چار میخوں کے ساتھ باندھ دیا گیا اور سورج کی شدید گرمی میں ان کے سینے پر چکی کا پاٹ رکھ دیا گیا اس وقت حضرت آسیہ نے اپنے پروردگار کے حضور مناجات شروع کر دی کہ بارِ خدایا! میرے لیے بہشت میں ایک گھر بنا اور ان ظالموں سے نجات عطا فرما۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام پہنچ گئے اور ان کی روح کو بہشت میں پہنچا دیا اور انہیں اس گھر میں داخل کر دیا جو کہ مروارید سے خاص ان کے لیے بنایا گیا تھا جب فرعون اُٹھا اور اس نے دیکھا تو معلوم ہوا کہ ان کا تن بے جان پڑا ہے' مایوس ہو کر لوٹ گیا۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ میخوں سے مراد لشکر ہیں اس لیے کہ لشکریوں کا کاروبار سب میخ پر مبنی ہے' ان کے خیمے سب میخوں کے ساتھ قائم رہتے ہیں اور ان کے جانور گھوڑے' اونٹ اور بیل سب میخوں کے ساتھ باندھے جاتے ہیں۔ لہٰذا لشکری ایک میخ دینے

میں اس قدر بخل کرتے ہیں کہ شہری سونا دینے میں اتنا بخل نہیں کرتے اور فرعون کے بے شمار لشکر تھے' حد و حساب سے باہر تھے۔ کہتے ہیں کہ اس کے لشکر میں رسم یہ تھی کہ ایک رسالے کا دوسرے رسالے سے اور ایک مثل کا دوسرے مثل سے امتیاز گھوڑوں کے رنگوں کے ساتھ ہوتا تھا۔ مثلاً کمیت گھوڑوں کے سوار ایک گروہ کی صورت میں آتے تھے اور مشکیں گھوڑوں کے سوار دوسرے گروہ میں اسی طرح ابلق گھوڑوں کے سوار جن کا رنگ دوسروں سے کم تر ہوتا ہے' لشکر کے آگے آگے ہراوّل دستے کے طور پر چلتے تھے' ان کی تعداد ستر ہزار تھی اور یہاں سے اس کے کمیت گھوڑوں کے لشکر کو قیاس کرنا چاہیے۔

اور جب ان تین واقعات کے بیان سے جو کہ آن واحد میں نہایت طاقت ور کثیر التعداد گروہوں پر دارالابتلاء ہیں جو کہ جزا کا مقام نہیں' جزا واقع ہونے پر دلالت کرتے ہیں' فراغت ہوئی اب بیان فرمایا جا رہا ہے کہ ان طاقت ور سرکش تین گروہوں کو ہلاک کرنا ان کے ملک اور مال کی طمع کی بناء پر نہیں تھا جیسا کہ بادشاہوں کو اپنے دشمنوں کی ہلاکت میں منظور ہوتا ہے بلکہ ان کی نافرمانی اور سرکشی دفع کرنے کی بناء پر تھا اس لیے کہ ان کا حال یہ ہے

اَلَّذِیْنَ طَغَوْا فِی الْبِلَادِ یہ وہ لوگ تھے جنہوں نے شہروں میں نافرمانی اور سرکشی کی تھی۔ اور شہروں کی تخصیص اس لیے ہے کہ غالب طور پر امن و امان کی جگہ اور مخلوق کے ہر گروہ کے رہنے کی جگہ ہوتے ہیں اور اگر ملک کے مالک ظالم ہوں تو بھی اپنے شہروں میں امن اور انصاف کی راہ قائم رکھتے ہیں اگر ظلم و تعدی کرتے ہیں تو صحرا اور کوہستان میں اور ان لشکروں میں کرتے ہیں جو کہ اپنی قلمرو سے باہر ہوں جبکہ یہ تینوں بے باک گروہ اپنے شہروں میں طغیان اور سرکشی اختیار کیے ہوئے تھے۔

فَاَكْثَرُوْا فِیْهَا الْفَسَادَ پس شہروں میں فساد بہت کرتے تھے اور فساد زیادہ کرنا یہ ہے کہ شہر والوں کے عقائد خراب کرتے تھے۔ اور ظلم و تعدی اور اموال لوٹنے کی بری رسم بھی رائج کرتے تھے۔ اور قتل و غارت اور گالی گلوچ بھی عمل میں لاتے تھے تو لوگوں کا دین بھی برباد ہوتا تھا اور آبرو بھی اور جان و مال بھی۔ بخلاف دوسرے ظالموں کے کہ ان کی طرف

سے نقصان یہ ہے کہ زیادہ تر جان اور مال ضائع کرتے ہیں۔

فَصَبَّ عَلَيْهِمْ رَبُّكَ تو تیرے پروردگار نے ان پر بارش کی طرح گرایا جس کی ربوبیت عام اور جامع ہے جس طرح وہ فسادیوں کا رب ہے' مظلوموں کا بھی رب ہے اور اس کی ربوبیت مظلوموں کے لیے تقاضا فرماتی ہے کہ ان کے ظالموں سے واجبی انتقام لیا جائے۔

سَوْطَ عَذَابٍ عذاب کا ایک کوڑا اور کوڑے کے لفظ میں یہ بتایا گیا ہے کہ یہ سب سخت عذاب جو کہ ان تینوں گروہوں پر بارش کی طرح نازل ہوئے اس عذاب کے مقابلے میں جس کے یہ قیامت میں مستحق ہوئے ہیں اور وہاں ان کے لیے تیار ہے' تلوار کے مقابلے میں ایک کوڑے کا حکم رکھتے ہیں اور لفظ صب اور سوط کے مجموعے سے پتہ چلا کہ عذاب کے لیے دو استعارے فرمائے گئے ہیں۔ پہلا استعارہ بارش جس کی صب کا لفظ ترشیح ہے اور دوسرا استعارہ کوڑا جس کی بابت لفظ سوط صراحت کرتا ہے اور ایک عبارت میں دو استعاروں کو جمع فرمانا کلام اللہ کا دستور ہے۔ بشر کے کلام میں نہیں پایا جاتا جیسا کہ فَاَذَاقَهُمُ اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ میں مذکور ہے۔

مذکورہ تین واقعات کی تخصیص میں نکتہ

اور ان تینوں واقعات کو خصوصیت کے ساتھ لانے میں نکتہ یہ ہے کہ عوام کے ذہنوں میں کثیر مخلوقات سے بدلہ لینے اور انہیں سزا دینے کو محال سمجھنا یا تو اس جہت سے ہوتا ہے کہ وہ کثیر جماعت نہایت طاقت ور اور چالاک ہے کہ کوئی بھی ان کے مقابلے کی تاب نہیں رکھتا اس محال جاننے کو دُور کرنے کے لیے شداد اور عاد کا واقعہ بیان فرمایا گیا۔

یا مکان کے محفوظ اور قلعے کے مضبوط ہونے کی وجہ سے ہے اور اس طرح محال سمجھنے کو دُور کرنے کے لیے ثمود کا واقعہ ارشاد فرمایا یا ہجوم کی کثرت اور لشکروں کی زیادتی کی وجہ سے ہے اور اس بعید جاننے کو دُور کرنے کے لیے فرعون کا واقعہ یاد دِلایا گیا اور ہر واقعہ میں اجمالی طور پر ایک دو لفظ ایسے ارشاد فرمائے جو کہ محال جاننے کی وجہ کا پتہ دیتے تھے۔

اب اس مضمون کو بیان فرمایا جا رہا ہے کہ جس کے لیے پانچ قسمیں اور تین واقعات

بطورِ تمہید لائے گئے کہ

اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ تحقیق ثابت ہوا کہ آپ کا پروردگار البتہ کمیں گاہ میں ہے جیسے کہ کوئی سرراہ چھپ کر بیٹھا ہے اور گزرنے والوں کو دیکھ رہا ہے اور جانتا ہے کہ فلاں کیسے گزرا اس نے کیا کیا' فلاں کیا لایا' کیا لے گیا تاکہ بدلہ دینے کے وقت اس کے مطابق عمل کرے۔

پس اللہ تعالیٰ جو دنیا میں انتقام نہیں لیتا' صرف بنی آدم کے اچھے بُرے اعمال کو پورے طور پر جمع کرنے کے لیے ہے۔ کہ جب تک نوعِ انسانی ختم نہ ہو' پوری طرح جمع کرنے کی صورت نہیں بنتی' نہ یہ کہ ان کے اچھے بُرے اعمال سے غافل ہے یا انتقام لینا بے پرواہی کے طور پر اس کا مقصود نہیں تو یہ سب کچھ مہلت دینا ہے' بے مقصد چھوڑنا نہیں ہے۔

اور بندوں کے بارے میں زیادہ تر یہ کمیں گاہ اور انتظار مال' عزت' مرتبہ اور نعمت دینے یا نہ دینے کی جہت سے ہے جب تک یہ بات درجۂ ظہور میں نہ آئے کہ مال' مرتبہ اور نعمت دینے کی صورت میں شکر کرتا ہے اور اپنی حد سے باہر قدم نہیں رکھتا یا تکبر اور فخر کی راہ چلتا ہے اور نافرمانی اور سرکشی اختیار کرتا ہے اور مال اور مرتبہ نہ دینے کی صورت میں بھی ظاہر فرماتا ہے کہ آیا نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے اور بے چینی اور بے قراری کرتا ہے یا صبر کرتا ہے اور قضا پر راضی ہونا اپنا دستور بناتا ہے لیکن اس کمیں گاہی اور اس انتظار کو اللہ تعالیٰ' انبیاء علیہم السلام' صدیقوں' اولیائے اللہ اور علمائے کرام کے سوا کوئی نہیں جانتا اور جو لوگ کے غیب کی کیفیت اور معاملے سے غافل ہیں اس راز کو بالکل نہیں پہچانتے اور ظاہری نعمت اور مال پر فریفتہ ہو جاتے ہیں اور ظاہری غربت اور تنگی سے گھبراہٹ اور شکایت کا شکار ہو جاتے ہیں اور ناامید ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے

فَاَمَّا الْاِنْسَانُ تو رہا انسان' وہ اس پوشیدہ معاملے سے غافل ہے اور اس کی غفلت کی دلیل یہ ہے کہ

اِذَا مَا ابْتَلٰهُ رَبُّهٗ جب اس کا پروردگار مال دے کر اس کا امتحان لیتا ہے فَاَكْرَمَهٗ تو اسے اس مرتبے کی وجہ سے جو کہ مال دینے سے حاصل ہوا' عزت دیتا ہے۔ وَنَعَّمَهٗ اور اسے

نعمت میں رکھتا ہے اس لیے کہ مال ہر نعمت کے حصول کا سبب ہے۔

فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ پس کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے عزت دی بغیر اس کے کہ حقیقت کا سراغ لگائے اور جانے کہ یہ سب امتحان ہے۔ اللہ تعالیٰ کی خفیہ تدبیر سے بے خوف نہیں ہوا جا سکتا اور نہ ہی دھوکا کھایا جا سکتا ہے۔ کہ جب جب ابتدائی حالت میں عزت اور مال عطا فرمایا ہے' آخر میں بھی اسی کے مطابق عمل ہوگا بلکہ یہ مقدمہ ابھی تک حجاب اور پردے میں ہے۔

وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ اور جب اس کا پروردگار فقر اور غربت کے ساتھ اس کا امتحان لیتا ہے۔

فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ پس اس کے رزق کو اس پر تنگ فرمائے اگرچہ بقدرِ حاجت میسر آئے جس پر اس کی بقاء وابستہ ہے۔

فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ تو کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے ذلیل کر دیا بغیر اس کے کہ اس امر کی حقیقت کا سراغ لگائے کہ یہ سب کچھ میرے صبر اور سکون کے امتحان کے لیے ہے اور ابھی عزت اور ذلت کا مقدمہ پردۂ خفا میں ہے' بہت سے محتاجیاں ہیں جو کہ آخرت کی عزت کا موجب ہو گئیں اور بہت سے دولت اور مال ایسے ہیں جو کہ آخرت میں حسرت اور وبال کا باعث ہوئے۔ پس حال کی ابتدا سے دھوکہ کھانا اور نعمت اور مصیبت دونوں صورتوں میں غیب کے معاملے کو جو کہ امتحان اور آزمائش ہے' نہ سمجھنا اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ کے مضمون سے بہت بڑی غفلت کی دلیل ہے۔

چند سوالات اور ان کے جوابات

یہاں چند سوالات باقی رہ گئے جن کے جوابات ضروری ہیں۔ پہلا سوال یہ ہے کہ لفظ فا فرع بٹھانے کے لیے آتا ہے جبکہ لغتِ عرب میں اما کا کلمہ کسی مجمل کی تفصیل کے لیے ہے جو کہ پہلے کلام میں گزرا ہو اس کلام میں وہ مجمل کہاں ہے اور فرع لانا اور تفصیل بیان کرنا کس چیز کے ساتھ متعلق ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ وہ مجمل کلام اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ کا مضمون ہے اس لیے کہ

اس مضمون سے معلوم ہوا کہ پروردگار عالم آزمائش اور امتحان کے درپے ہے اور وہ بندوں کے حالات سے غافل نہیں ہے اور اس کا تقاضا ہے کہ بندے بھی خبردار اور پرحذر ہوں اور غافل نہ ہوں لیکن آدمی غفلت میں گرفتار ہے اور عزت و ذلت اور امیری غریبی دونوں صورتوں میں اس کی غفلت کا بیان اس مضمون کی تفصیل ہوا اور اس تفصیل کو اس اجمال پر فا کے لفظ کے ساتھ فرع کے طور پر لایا گیا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ دولت کی آزمائش کی طرف فاکرمہ فرمایا گیا اور بندے کی زبان سے بھی فاکرمن نقل فرمایا گیا جبکہ غربت کی آزمائش کی طرف فاہانہ نہیں فرمایا اور بندے کی زبان سے فاہانن نقل فرمایا گیا اس انداز کو بدلنے میں کیا نکتہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ رزق کی تنگی حقیقت میں ذلیل کرنے کا سبب نہیں ہے۔ پس فقیری کو ذلت کہنا غافل بندے کا کام ہے' واقعہ کے مطابق نہیں۔ اس لیے کہ بسا اوقات ظاہری فقر بندے کی دنیا و آخرت کی درستی کا سبب ہو جاتا ہے بلکہ عزت اور مرتبے کا ذریعہ بھی بن جاتا ہے جیسا کہ اولیائے اللہ کی اس جماعت میں اس کا مشاہدہ کیا گیا ہے جنہوں نے فقراء اور غربت میں زندگی بسر فرمائی ہے جبکہ دولت اور مال حقیقت میں غالب طور پر ظاہری عزت کا سبب ہے۔ گو آخرت کی عزت کا سبب نہ ہو بہرحال دنیا میں رزق کی فراخی دنیا و آخرت دونوں کے مجموعی خسارے سے بہتر ہے اس نکتے کے لیے یہاں فاکرمہ کا لفظ بڑھایا گیا ہے۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ کلام کا خلاصہ یوں معلوم ہوتا ہے کہ فَاَمَّا الْاِنْسَانُ فَيَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَكْرَمَنْ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَاَكْرَمَهٗ وَاَمَّا هو فَيَقُوْلُ رَبِّیْٓ اَهَانَنْ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ تو فَيَقُوْلُ دونوں جگہ مبتدا کی خبر ہے اور اَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰهُ فَيَقُوْلُ کا ظرف ہے جبکہ کلام مجید میں پہلے اما کو انسان پر داخل کیا گیا اور پھر اَمَّا کو اِذَا مَا ابْتَلٰهُ پر لایا گیا جو کہ یقول کا ظرف ہے اس تبدیلی میں کیا نکتہ ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ حقیقت میں اما ظرف پر داخل ہے اس لیے کہ لفظ اما لانے سے انسان کی تفصیل منظور نہیں ہے بلکہ دولت اور فقر کے ساتھ اس کی آزمائش کی تفصیل مطلوب

ہے اور پہلے قرینے میں جہاں لفظ انسان اما کے متصل وارد ہے ضمیروں کے مرجع کو معین کرنے کے لیے ہے جو کہ پہلے ذکر نہیں ہوا۔ پس معنوں پر نظر کرتے ہوئے اصل کلام کو یوں سمجھنا چاہیے کہ اِنَّ رَبَّكَ لَبِالْمِرْصَادِ والانسان غافل عن ذالك في كلتا الحالتين فاما اذا ما ابتلاه ربه فاكرمه ونعمه فيقول ربي اكرمن واما اذا ما ابتلاه فقدر عليه رزقه فيقول ربي اهانن یعنی آپ کا پروردگار ملاحظہ فرما رہا ہے جبکہ انسان اس بات سے دونوں صورتوں میں غافل ہے تو جب اسے اس کا پروردگار آزمائے پس اسے عزت عطا فرمائے اور نعمتیں دے تو کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے عزت دی اور جب اسے آزمائے پس اس پر اس کا رزق تنگ فرمائے تو کہتا ہے کہ میرے پروردگار نے مجھے رسوا کیا بلکہ اگر گہری سوچ سے دیکھیں تو یہاں دو تفصیلات مطلوب ہیں۔ پہلی یہ کہ اما الانسان فهو غافل عن كون ربه لبالمر صاد في كلتا الحالتين یعنی رہا انسان تو اپنے پروردگار کے مرصاد میں ہونے (یعنی اس کے حالات کا ملاحظہ کرنے) سے دونوں حالتوں میں غافل ہے۔ دوسری تفصیل یہ ہے کہ اما في حالة الابتلاء بالنعمة والمال فلايتلقى النعمة بالشكر واما في حالة الابتلاء بالفقر والضيق فلايتلقاه بالصبر ولايدرى ان ربه مترقب لمجازاته على معاملته یعنی نعمت اور مال کے ساتھ آزمائش کی صورت نعمت کو شکر کے ساتھ قبول نہیں کرتا اور فقر اور تنگی کے ساتھ آزمائش کی حالت میں اسے صبر کے ساتھ قبول نہیں کرتا اور نہیں جانتا کہ اس کا پروردگار اس کے معاملے پر اسے جزا دینے کے لیے نگہبانی فرمانے والا ہے۔

چونکہ پہلی تفصیل مقصود بالذات نہ تھی لفظ انسان کو اس تفصیل سے اس تفصیل کے آغاز میں بڑھا دیا گیا تاکہ اس تفصیل کا اشارہ ہو جائے اور دوسری تفصیل کو بھرپور انداز میں لایا گیا اس لیے کہ مقصود بالذات تھی۔ واللہ اعلم

چوتھا سوال یہ ہے کہ اکرمن اور اہانن کہنے پر انسان کی مذمت جو کہ اس معجزانہ کلام سے ظاہر ہوتی ہے کس چیز پر متوجہ ہے۔ حالانکہ بے چارہ انسان یہ کہنے میں سچا ہے۔ چنانچہ اکرام کی طرف میں تو اس کے مطابق خود اشارہ فرمایا گیا ہے جب کہ بندے نے بھی اسی

کے مطابق بات کہی تو انکار کی کونسی جگہ ہے اور اہانت کی سمت میں اگرچہ خود نہیں فرمایا گیا لیکن وہ بھی واقع کے مطابق ہے اس لیے کہ فقر اور تنگی معاش اکثر اوقات ظاہر بینوں کی نظر میں ذلت اور رسوائی کا موجب ہوتی ہے۔ چنانچہ انہوں نے کہا کہ عزۃ الدنیا بالمال وعزۃ الاخرہ بالاعمال یعنی دنیا کی عزت مال اور آخرت کی عزت اعمال کے ساتھ ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ اکرمن اور اہانن کہنے پر انکار اور مذمت اس وجہ سے نہیں کہ مطابق واقع نہیں ہے بلکہ اس وجہ سے ہے کہ بندہ دنیوی عزت و ذلت کی قید میں گرفتار ہو کر اس امتحان اور آزمائش سے غافل ہو جاتا ہے جو کہ اس عزت اور ذلت کے پردے میں پوشیدہ ہے۔

اور عزت و ذلت کی حقیقت کو جو کہ جزا کے دن ظاہر ہوگی، نہیں جانتا اور دنیوی عزت و ذلت کے سوا کسی عزت و ذلت کا تصور نہیں کرتا۔ پس بندہ ناقص العقل بچے کے مشابہ ہے جو کہ شکر میں لپٹی ہوئی زہر کو شکر سمجھتا ہے اور بدمزہ دوا کو جو کہ اس کے حق میں سراسر نفع بخش ہے، زہر گماں کرتا ہے اور انکار اور جھڑکی اس کے فہم کی کوتاہی پر ہے کہ حقیقت سے صورت پر اکتفاء کرتا ہے اور باطن سے ظاہر پر۔

پانچواں سوال یہ ہے کہ ابتلاء کا معنی عرف کے اعتبار سے فقر میں تو ظاہر ہے مگر دولت اور عزت پانے میں ابتلاء کا معنی کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہے کہ لغت میں ابتلاء کا معنی امتحان اور آزمائش ہے اور جس طرح فقر میں ایک آزمائش ہے کہ صبر کرے گا یا نہیں دولت میں بھی ایک آزمائش ہے کہ شکر کرے گا یا نہیں۔ بیت

باده نوشیدن و ہشیار نشستن سہل ست
گر بدولت برسی مست نہ گردی مردی

یعنی شراب کا پیالہ پینا اور ہشیار بیٹھے رہنا آسان ہے اگر تجھے دولت ملے اور تو بے ہوش نہ ہو تو مرد ہے۔ پس یہاں ابتلاء لغوی معنوں میں ہے نہ کہ عرفی معنوں میں۔

جب دولت اور فقر دونوں حالتوں میں آدمی کے حال کی تفصیل بیان کرنے سے

فراغت ہوئی اب اسے حقوق مالیہ اور شکر کے لوازمات ادا نہ کرنے پر ڈانٹا جا رہا ہے۔ کَلَّا یعنی یہ مقدمہ یوں نہیں کہ مال اور مرتبہ دینے پر فریفتہ ہو کر اللہ تعالیٰ کے حضور اپنی بزرگی سمجھو اور اس کی نعمتوں کو اس کی خوشنودی میں صرف نہ کرو جیسا کہ بنی آدم کا دستور ہے۔

بَلْ لَّا تُكْرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ بلکہ تم یتیم کی عزت نہیں کرتے ہو حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عزت اور مرتبہ اس لیے دیا ہے کہ عزت سے محروم لوگوں کو عزت دو خصوصاً یتیم کو جس کے پاس بے عزتی کے اسباب ہر طرف سے جمع ہیں۔ چنانچہ اس نے زائد مال اس لیے دیا ہے کہ فقیروں اور کمزوروں پر خرچ کرو اور انہیں سیر کرو اور تم یہ کام نہیں کرتے ہو۔

وَلَا تَحَاضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ اور دوسرے کو بھی منگتے کو کھانا کھلانے کی پابندی اور تاکید نہیں کرتے ہو بلکہ اپنے مال سے دینا تو ایک طرف دوسروں کے مال کو بے تحاشہ خرچ کرتے ہو۔ اس لیے کہ

وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا اور تم اپنے آباء کی میراث بے دریغ کھاتے ہیں اور اپنے حق کے درمیان جو کہ حلال ہے اور شرکاء کے حق کے درمیان جو کہ حرام ہے' کوئی فرق نہیں کرتے ہو۔ پس تمہارے فہم کا مرتبہ جانوروں کے فہم سے کمتر ہے جو کہ پہلے اپنا چارہ سونگھتے ہیں اور جس میں اپنا فائدہ اور مصلحت دیکھتے ہیں' کھاتے ہیں ورنہ چھوڑ دیتے ہیں اور اگر کوئی کہے کہ میرا نہ تو اپنا مال ہے جس میں سے یتیم اور مسکین کو دوں اور نہ ہی میں نے اپنے باپ کی وراثت سے کوئی مال پایا ہے کہ میں نے شریکوں کا حق کھایا ہو اس کے جواب میں فرمایا جا رہا ہے کہ

وَّتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا اور تم مال سے بہت سے زیادہ محبت کرتے ہو اگرچہ تمہارے ہاتھ میں کوئی مال نہ ہو لیکن تمہارے دل مال کے دام میں گرفتار ہیں اگر تمہارے ہاتھ لگ جائے تو وہی کچھ کرو جو دوسرے کرتے ہیں۔

محبت کے لیے مال کی حد

اور جمًّا کے لفظ سے معلوم ہوتا ہے کہ اتنے مال کی محبت اور اس سے دل کا متعلق ہونا بُرا نہیں ہے جس سے کہ ضروری حاجات پوری کی جاسکیں اس لیے کہ نظام عالم کی بقاء اسی

کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور جو مذموم ہے وہ وہی ہے جو حاجت سے زائد ہے۔

کَلَّا یوں نہیں سمجھنا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ بندوں کے اچھے بُرے اعمال سے غافل ہے یا اسے بندوں کے اعمال پر انہیں جزا دینا منظور نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ ملاحظہ فرما رہا ہے اور اس وقت کے انتظار میں ہے جس کے ساتھ اس کی حکمت نے جزا دینے کو وابستہ کر رکھا ہے اور اس وقت کا بیان یہ ہے۔

اِذَا دُكَّتِ الْاَرْضُ دَكًّا دَكًّا جس وقت زمین کو خوب کوٹا جائے یہاں تک کہ ریزہ ریزہ ہو جائے اور پہاڑ اور زمین کی بلندی اور پستی ہموار ہو جائیں اور یہ حالت زلزلے کی شدت کی وجہ سے ہوگی جو کہ قیامت کے وقت پیدا ہوگا اور اس زلزلے کی وجہ سے مردے قبروں سے باہر آ جائیں گے اور صور پھونکنے کی وجہ سے روحیں جسموں کے ساتھ مل جائیں گی۔

وَجَآءَ رَبُّكَ اور تیرا پروردگار آئے یعنی جلال اور قہر کی صفت کی تجلی فرمائے اور بندوں کو جزا دینے پر توجہ فرمائے۔

وَالْمَلَكُ صَفًّا صَفًّا اور فرشتے صف بصف آئیں' سات آسمانوں کے فرشتوں کی سات صفیں ہوں گی۔ حاملانِ عرش کی صف اور ہوگی۔ وعلیٰ ہذا القیاس

وَجِایْٓءَ یَوْمَئِذٍ بِجَهَنَّمَ اور اس روز جہنم کو لایا جائے اور لانے سے مراد ظاہر کرنا ہے جیسا کہ دوسری آیت میں فرمایا گیا ہے کہ وَبُرِّزَتِ الْجَحِیْمُ لِمَنْ یَّرٰی اور بعض روایات میں وارد ہے کہ جہنم کو ستر ہزار فرشتے ستر ہزار لگام ڈال کر اس کے مقام سے کھینچ کر عرشِ عظیم کی بائیں جانب لائیں گے اور جب حساب کے مقام سے دوسو سال کی راہ دُور رہ جائے گی اس سے شعلے باہر نکلیں گے اور اتنی مسافت سے اس کے گرجنے کی آواز اہلِ محشر کے کانوں میں آئے گی اس وقت اس مجمع کے حاضرین پر زبردست خوف غالب ہوگا۔ انبیاء علیہم السلام منبروں اور کرسیوں سے نیچے اُتر آئیں گے اور ساری مخلوق گھٹنوں کے بل ہو کر نفسی نفسی پکارے گی۔

یَوْمَئِذٍ یَّتَذَكَّرُ الْاِنْسَانُ اس دن آدمی نصیحت قبول کرے گا اور یاد کرے گا کہ جو

کچھ انبیاء علیہم السلام اور نصیحت کرنے والے کہتے تھے کہ اچھے بُرے کردار کی جزا برحق ہے اور قیامت آنے والی ہے' صحیح اور درست تھا اس لیے کہ جزا دینے کے تمام اسباب جمع ہوں گے۔ دوزخ جیسا قید خانہ پوری ہولناکی سمیت حاضر' فرشتوں جیسے بے شمار پیادے پکڑنے اور بند کھولنے کے لیے موجود۔ حضرت رب العزت جیسا قاہر حاکم پوری سطوت اور جلال کے ساتھ جلوہ گر' زمین جو کہ جسموں اور روح کا مسکن اور جائے قرار تھی' سب درہم برہم ہو چکی اس میں بھاگنے کی جگہ رہی نہ اس میں مضبوط قلعہ اور محفوظ مکان نظر آتا ہے لیکن اس وقت یاد کرنا کوئی فائدہ نہیں دے گا۔ چنانچہ فرمایا جارہا ہے کہ

وَاَنّٰى لَهُ الذِّكْرٰى اور اس وقت نصیحت پکڑنا اور یاد کرنا اسے کیا فائدہ کرتا ہے اس لیے کہ وہ دن عمل کا دن نہیں ہے۔ بلکہ جزا کا دن ہے' آج نصیحت قبول کرنا چاہیے تاکہ اس دن کام آئے ورنہ حسرت اور ندامت کے سوا جو کہ عذاب کی سب سے شدید قسم ہے کچھ بھی حاصل نہ ہوگا۔ چنانچہ فرمایا جارہا ہے

يَقُوْلُ يٰلَيْتَنِيْ قَدَّمْتُ لِحَيَاتِيْ کہے گا اے کاش! کہ میں اپنی اس زندگی کے لیے مال اور ایمان اور اطاعت جیسے نیک اعمال میں سے کوئی چیز آگے بھیج دیتا جو کہ ذخیرہ ہوتی اور یہ حسرت اس کے لیے جسمانی عذاب سے زیادہ سخت ہوگی۔

فَيَوْمَئِذٍ لَّا يُعَذِّبُ عَذَابَهٗ اَحَدٌ پس اس روز اللہ تعالیٰ کے عذاب جیسا کوئی عذاب نہیں کرے گا۔ نہ آگ' نہ آگ پر مقرر فرشتے' نہ سانپ' نہ بچھو جو کہ آگ میں ہوں گے اس لیے کہ ان کی طرف سے جو عذاب آتا ہے' جسمانی ہے اور جو عذاب اس مجرم کی روح کو اللہ تعالیٰ حسرت اور ندامت کے ذریعے فرمائے گا' روحانی عذاب ہے اور جسمانی عذاب کی روحانی عذاب کے ساتھ کوئی نسبت نہیں ہے۔

وَلَا يُوْثِقُ وَثَاقَهٗ اَحَدٌ اور اللہ تعالیٰ کے مقید کرنے کی طرح کوئی مقید نہیں کرے گا اس لیے کہ دوزخ کے موکل اگرچہ طوق' زنجیر' دروازے بند کرنے اور سرپوش پہنانے کے ساتھ مجرموں کو مقید کریں گے لیکن ان کی عقل اور خیال کو مقید نہیں کر سکتے جبکہ عقل اور خیال کی عادت ہے کہ بہت سے امور پر توجہ کرتے ہیں اور ان میں سے بعض امور بعض دوسروں

سے حجاب ہو جاتے ہیں۔ پس عین قید کے دوران بھی ایک شخص کو عقل اور خیال کی توجہ کی وسعت حاصل ہوتی ہے۔ برخلاف اس شخص کے جس کی عقل اور خیال کو حق تعالیٰ نے امورِ کثیرہ پر توجہ کرنے سے باز رکھا ہوا اور ایک دردناک چیز کی طرف اس کی ساری توجہ مبذول کر دے کہ وہ قید جسمانی قید سے ہزاروں مرتبہ زیادہ سخت ہوتی ہے۔ اسی لیے پاگلوں اور سودائیوں کو عین باغ اور صحرا کی سیر کے وقت وہم و خیال سے ایک تنگی محسوس ہوتی ہے کہ وہ تمام کھلا میدان ان کی نظر میں ایک انگوٹھی کے حلقے سے چھوٹا معلوم ہوتا ہے اور کیا ہی اچھا کہا گیا ہے کہ

اذا کان قلب المرء فی الامر حائر

فاضیق من تسعین رحب السباسب

یعنی جب آدمی کا دل کسی امر میں پریشان ہو تو وہ نوے بیابانوں کے میدانوں میں بھی تنگ ہوتا ہے۔

بعض معتبر قراء نے وَلَا يُعَذِّبُ وَلَا يُوْثِقُ کو مجہول صیغے کے ساتھ پڑھا ہے اور اس صورت میں معنی ظاہر ہے یعنی اس غافل کے عذاب کی مانند کسی کو عذاب نہیں کیا جائے گا اور اس غافل کو بند کرنے کی مانند کسی کو بند نہیں کیا جائے گا۔ اس لیے دوسرے گناہ گار اگرچہ گناہوں کے مرتکب تھے لیکن اس روز سے غافل نہیں تھے' کبھی کبھی اس دن کا خوف ان کے خیال میں گزرتا تھا جب وہ اس دن کو دیکھیں تو اتنا مدہوش نہ ہوں گے کیونکہ وہ پہلے سے ہی اسے جانتے تھے۔ ان کے حق میں بلائے ناگہانی نہیں ہوگی اور ان کے عذاب اور قید میں منکرین جزا کی نسبت کچھ تخفیف بھی حاصل ہوگی اور اس ہولناک دن میں کہ جسے دیکھتے ہی اچھے بُرے سب بے چین اور بے قرار ہو جائیں گے' اطاعت کرنے والوں اور نیکوں کو تسلی دی جائے گی اور ندا ہوگی کہ

يٰاَيَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ اے حق کے ساتھ آرام پانے والی جان! کہ تجھے اس اس جناب کے سوا کسی سمت توجہ نہ تھی' تجھے زمین کے ریزہ ریزہ ہونے' فرشتوں کی صفیں دیکھنے اور جہنم کی ہولناک آواز سننے کی کیا پرواہ ہے۔

ارْجِعِیٓ اِلٰی رَبِّكِ اپنے پروردگار کی طرف لوٹ جا کہ تو ہمیشہ اسی کے مشاہدے میں مستغرق تھی اور ماسوا کی طرف تیری کوئی توجہ نہ تھی۔

رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً اس حالت میں کہ تو جمالِ شہودی حق کی تجلی سے خوش وقت ہونے والی ہے اور تجھ میں جمیلِ مطلق کے جمال کے آثار ظاہر ہونے کی وجہ سے تو پسندیدہ ہے۔

فَادْخُلِیْ فِیْ عِبَادِیْ پس تو میرے مقرب بندوں کے زمرے میں داخل ہو جا جو کہ ہمارے دیدار کے مقام میں ہیں اور خوش ہیں اور یہ روحانی سعادت کے مرتبوں میں سب سے اعلیٰ ہے۔

وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ اور میری جنت میں داخل ہو جا کہ وہ حسی لذتوں کو پورے طور پر حاصل کرنے کا مقام ہے جیسے ماکولات' مشروبات' منکوحات' ملبوسات اور اچھے مکانات اور یہ جسمانی سعادت کے مرتبوں میں سے سب سے اعلیٰ ہے' اللہ تعالیٰ ہمیں دونوں سعادتیں حاصل کرنے میں کامیاب فرمائے۔

نفوسِ انسانی کی تین صفات

یہاں جاننا چاہیے کہ قرآن مجید میں نفسِ انسانی کو تین صفات سے موصوف فرمایا گیا ہے۔ امارہ' لوامہ اور مطمئنہ۔ امارہ ہونا کافروں اور گناہ گاروں کے نفوس کی صفت ہے جو کہ کفر اور گناہ سے باز نہیں آتے۔ اور ان کا نفس ہر وقت بُرے کاموں کا حکم دیتا ہے۔ اور لوامہ ہونا ان گناہ گاروں کے نفوس کی صفت ہے جو کہ اپنی بُرائی پر ندامت محسوس کرتے ہیں اور ارتکابِ گناہ کے بعد اپنے آپ کو ملامت کرتے ہیں کہ ہم نے کیوں کیا اور کیا کیا۔ جبکہ مطمئنہ ہونا انبیائے علیہم السلام' اولیائے اللہ اور اُمت کے نیک لوگوں کے نفوس کی صفت ہے جو کہ ایمان' طاعت' ذکر و فکرِ حق میں اطمینان پاتے ہیں اور گناہوں کے اسباب اور خطرات ان کے حال میں مزاحمت نہیں کرتے اور ان کے اوقات کو بے مزہ نہیں کرتے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ امارہ ہونا ہر نفس کی ذاتی صفت ہے جو کہ شہوت اور غضب کے وقت عقل اور شرع کے حکم پر ظہور کرتی ہے اور لوامہ ہونا بھی ہر نفس کی صفت ہے جس وقت کہ عقل و شرع کی طرف رجوع کرتا ہے اور خیر اور شر کو سمجھتا ہے اور اطمینان بھی ہر نفس کی

صفت ہے جبکہ ذکر کا نور ساری قوتوں پر غالب آ جاتا ہے۔

اور حضرت امام حسن بصری رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا ہے کہ قیامت کے دن تمام نفوس لوامہ ہوں گے اور خود کو ملامت کریں گے کہ اگر تم نے نیکی کی ہے تو زیادہ کیوں نہیں کی اور اگر نافرمانی کی تو کیوں کی؟

اور اگرچہ اصل میں اس ندا اور بشارت کا وقت فزع اکبر کا وقت ہے جو کہ قیامت کے دن ہوگا لیکن اس کا نمونہ ہر مومن کی وفات کے وقت ظہور کرتا ہے۔ چنانچہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے مروی ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا ہے کہ جب مردِ مومن کی اجل آتی ہے تو اس کے سرہانے خوب صورت' خوش لباس اور معطر جسم والے فرشتے آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اے حق کے ساتھ اطمینان پانے والی جان! راحت اور آسانی سے باہر آ کہ تجھ سے اللہ تعالیٰ راضی ہے' مومن کی جان پوری مسرت کے ساتھ باہر آتی ہے اور جہان اس کی خوشبو سے معطر ہو جاتا ہے اور فرشتے اسے معطر ریشمی کپڑوں میں لیتے ہیں اور آسمان کے دروازے کھل جاتے ہیں۔ اور وہاں کے دربان اسے مرحبا کہتے ہوئے استقبال کرتے ہیں۔ اور اس کی بخشش کی دعا کرتے ہیں۔ اور اسے عرشِ مجید کے نیچے لے جایا جاتا ہے تاکہ حق سبحانہ وتعالیٰ کے حضور سجدہ کرے۔ اور حضرت میکائیل علیہ السلام کو حکم ہوتا ہے کہ اس جان کو ایمان والوں اور نیکوں کی جانوں کے ٹھہرنے کی جگہ لے جا کر داخل کریں اور اس کی قبر کو فراخ کر دیں تاکہ اسے راحت اور آسانی ہو اور اسے فرمایا جاتا ہے کہ نئی دلہن کی طرح سو جا کہ اس کی نیند کو کوئی خراب نہیں کرتا اور اس کے برعکس معاملہ کافر کی جان کے ساتھ واقع ہوتا ہے۔

سورۃ البلد

سورۃ البلد مکی ہے' اس کی بائیس (۲۲) آیات' بیاسی (۸۲) کلمات اور تین سو اکتیس (۳۳۱) حروف ہیں۔

وجہ تسمیہ

اور اسے سورۃ بلد اس لیے کہتے ہیں کہ اس کے آغاز میں مکہ معظمہ کے شہر کی قسم اُٹھائی

گئی ہے۔ اور بلد لغتِ عرب میں شہر کو کہتے ہیں اور اس شہر کی قسم اُٹھانے کے وقت اس شہر کے حالات کا ملاحظہ کرنا اس بات کی بالکل ظاہر اور روشن دلیل ہے کہ آدمی کو دنیا میں یا آخرت میں دُکھ تکلیف اُٹھانے کے بغیر چارہ نہیں اس لیے کہ جب اس قسم کا عظمت والا شہر اس قسم کی تکلیفوں کی آماجگاہ ہو تو دوسرے شہر تو بطریق اولیٰ شدید مشقتوں سے خالی نہ ہوں گے اور چونکہ انسان مدنی الطبع ہے' شہر کے بغیر سکونت نہیں کر سکتا اور کوئی شہر راحت کی جگہ نہیں کہ کوئی خزانہ تکلیف کے بغیر نہیں ہے۔

مکہ معظّمہ کی عظمت کی وجوہ

اور مکہ معظمہ کے شہر کی عظمت بے شمار وجوہ کی بناء پر ہے۔ حرمِ الٰہی کا محل ہے' مخلوق کے لیے مقامِ امن اور مرجع ہے کہ لاکھوں انسان ہر سال دُور دراز علاقوں اور شہروں سے اس کا قصد کر کے آتے ہیں' دو عمدہ عبادتوں حج اور عمرہ کی ادائیگی کی جگہ ہے' دنیا کی سب سے پہلی عمارت ہے۔ یہاں جہان کا قبلہ اور مقامِ خلیل علیہ السلام ہے۔ اور سب سے بالاتر یہ کہ حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی جائے ولادت اور خدا تعالیٰ کی طرف سے آپ پر وحی اُترنے کا مقام ہے۔

ماقبل کے ساتھ رابطے کی وجہ

اور اس سورۃ کے سورۃ الفجر کے ساتھ رابطے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں یتیم کی عزت و حرمت رکھنے اور مسکین کو کھانا کھلانے کی تاکید اور مال کی محبت کی مذمت مذکور ہے جبکہ یہاں بھی یہی مضامین لکھے ہوئے ہیں۔ نیز وہاں طاقت ور سرکشوں جیسے عاد' فرعون اور ثمود کی ان کے گناہوں کی شامت کی وجہ سے ہلاکت کا ذکر ہے جبکہ یہاں بھی ایک کافر کو ڈانٹا گیا ہے جو کہ اپنی قوت پر ناز کرتا تھا اور کسی کو خاطر میں نہ لاتا تھا۔

سورۃ کا سببِ نزول

اور اس سورۃ کے نزول کا سبب یہ ہے کہ قریش میں کلدہ بن اسید نامی ایک کافر تھا' ایک قوی ہیکل زور آور پہلوان۔ جسے ابوالاسد کی کنیت دی گئی تھی اور اس کی قوت اس درجہ تھی

کہ گائے کی کھال کو اپنے قدم کے نیچے لیتا تھا اور کثیر جماعت سے کہتا کہ یہ کھال میرے پاؤں کے نیچے سے کھینچ لو' وہ سب اپنی پوری قوت صرف کرتے اور کھال پارہ پارہ ہو جاتی لیکن اس کے پاؤں کے نیچے سے نہیں ہلتی تھی۔ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے اسلام کی دعوت دی' وہ ایمان نہ لایا اور سخت سست باتیں کیں کہ آپ مجھے ایسے قید خانے سے ڈراتے ہیں جس کے کل انیس موکل ہیں' میں تو ان سب کو بائیں ہاتھ کے ساتھ کافی ہوں۔ کون ہے جو مجھ پر غالب آئے۔ نیز آپ مجھے ایک باغ کا فریب دیتے ہیں۔ حالانکہ میں نے شادیوں اور مروتوں میں اتنے ڈھیروں مال خرچ کیے ہیں کہ اگر ان کا شمار کریں تو آپ کے وعدے والا وہ باغ اپنے زیور' زیبائش' درختوں اور نہروں سمیت اس کے برابر کچھ نہ ہو۔ اس کی ان خرافات کے جواب میں حضرت حق تعالیٰ نے یہ سورۃ بھیجی اور اس سورۃ کا مضمون یہ ہے کہ آدمی کو جسمانی قوت' زورِ بازو' کثرت مال اور نام اور مرتبے کے اونچے ہونے پر مغرور نہیں ہونا چاہیے۔ اور اپنی پیدائش کی ابتدا کو موت کی حد تک نظر میں رکھنا چاہیے کہ کتنی سختیاں درپیش ہیں کہ جنہیں اللہ تعالیٰ کی امداد کے بغیر برداشت کرنے کی طاقت میسر نہیں ہے اور مال کو اس وقت نعمت سمجھا جا سکتا ہے جب آخرت کی گھاٹیوں میں کام آئے ورنہ دنیا کی نمود و نمائش تو سراب کے پانی اور پانی پر نقش کی طرح بے ثبات ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَآ اُقْسِمُ بِهٰذَا الْبَلَدِ مجھے اس شہر کی قسم ہے اور لا دراصل نفی کے معنی میں ہے اور یہاں قسم کی تاکید کے لیے لایا گیا ہے جیسا کہ لغتِ عرب میں اس کا استعمال بہت زیادہ ہے کہ تاکید کے مقام میں یہ لفظ لاتے ہیں اور اس لفظ سے تاکید سمجھانے کی وجہ یہ ہے کہ زیادہ تر قسم اس بات پر اٹھاتے ہیں جس کا کوئی منکر ہو۔ پس پہلے کلمۂ لا کے ساتھ منکر کے انکار کی نفی کرتے ہیں اس کے بعد قسم کے ساتھ اپنا مقصد ثابت کرتے ہیں۔ گویا مقصد دو وجہ سے ثابت ہوتا ہے۔ نقیض کو باطل کرنے اور عین مقصد کو ثابت کرنے کے ساتھ۔ اور اگر صرف قسم ذکر کریں تو مقصد کا اثبات ایک وجہ کے ساتھ ہو اس لیے کلمہ نفی لانا تاکید کی زیادتی کا موجب ہوا۔

اور علماء میں سے بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد قسم کی نفی ہے یعنی اس مطلب پر قسم کی حاجت نہیں کہ بالکل ظاہر ہے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ یہ کلمہ مقسم بہ کی بزرگی پر دلالت کرتا ہے یعنی وہ چیز اس سے بالاتر ہے کہ اس آسان مطلب پر اس کی قسم اُٹھائی جا سکے اور ہر صورت میں مطلب کے ثبوت سے کنایہ ہے یا اس کے ظاہر ہونے کا دعویٰ ہے۔ پس اس طرح سے بھی تاکید ثابت ہوئی۔

اور جب قسم کا مقصد یہ ہے کہ آدمی کی پیدائش ابتدا سے انتہا تک مشقت اور تکلیف میں ہے تو اس شہر مکہ کی قسم اُٹھانا اس مقصد کے عین مطابق واقع ہے اس لیے کہ مکہ معظمہ کا شہر ساری زمین کی اصل ہے کہ سب سے پہلے پانی کی سطح پر یہی نقطہ پیدا ہوا تھا۔ بعدازاں اس نقطے سے تمام زمین کو کشادہ کر کے بچھایا گیا۔ اور زمین انسان کے مادے کی اصل ہے تو جب اس کی اصل کی اصل مشقت اور رنج کا مقام ہو تو اسے کہاں سے توقع کرنا چاہیے کہ مشقت اور رنج سے خلاصی پائے۔

شہر مکہ کے مشقت اور رنج کا مقام ہونے کی وجہ

ہم یہاں پہنچے کہ یہ شہر کس جہت سے مشقت اور رنج کا مقام ہے۔ اوّل یہ کہ ایک سنگلاخ زمین ہے' ریگستان میں واقع ہے' کاشت کاری کے بالکل قابل نہیں' کڑوے پانی' سطح زمین سے دُور' سنگلاخ ہونے کی وجہ سے وہاں کنواں کھودنا دشوار۔ پس وہاں کے رہنے والوں کو پانی اور غلے کا قحط ہمیشہ لاحق ہے اور ایسی جگہ واقع ہے کہ جہاں پوری گرمیوں میں جو کہ جوزا اور سرطان کے دو مہینے ہیں' سورج ان کے سر کی طرف سے متصل دائیں بائیں ہوتا ہے اور سخت جلن کا موجب ہوتا ہے اور کوہستان سے سورج کی شعاعیں منعکس ہونے کی وجہ سے راتوں میں بھی شدت کی گرمی ہوتی ہے اور سخت گرم ہوا چلتی ہے اور بنجر اور بے سامانی کی ان وجوہ کی بناء پر زمانے کے عیش کوشوں اور خوش طبع لوگوں کا مسکن نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا قدیم زمانوں سے ذوی الاقتدار بادشاہ اس مملکت کے قریب نہیں گئے ہیں اور انہوں نے اسے اپنی قلم رو سے خارج کر دیا جو بھی اس مقام کا قصد کرتا ہے خالص زیارت کی نیت سے کرتا

ہے۔ کیونکہ وہاں سیر و تفریح کے اسباب نہیں ہیں اور اس عظیم مقام کی زیارت کے سفر میں جو تکلیفیں اور دُکھ اُٹھاتے ہیں' سمندر میں بھی اور خشکی میں بھی بالکل ظاہر اور روشن ہیں۔

اور یہ جو کچھ اس عالی شان مقام میں دنیوی مشقت اور رنج کے اسباب ذکر کیے گئے ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے وجود باجود سے پہلے موجود تھے۔ جب آپ کی بعثت شریفہ ہوئی' ایک اور پھول کھلا۔ اور ایک عظیم دینی مشقت رونما ہوئی کہ اس شہر والوں کی ایک جماعت حضور علیہ السلام پر ایمان لے آئی۔ اور انہوں نے اپنے آباء واجداد کا باطل مذہب چھوڑ دیا اور بتوں کی پرستش ختم کر دی اور ہر گھر میں مخالفت' دشمنی' جھگڑا اور لڑائی پیدا ہوگئی۔ کفار اس جماعت اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو ستانے اور قتل کرنے پر کمربستہ ہوگئے اس زبردست واقعہ کی وجہ سے اس کے شہریوں کے اوقات انتہائی مشقت اور دُکھ میں گزرنے لگے اور ہر روز اور ہر شام فریقین دار و گیر میں مصروف تھے۔

اس تازہ مشقت اور رنج کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس عبارت میں فرمایا جا رہا ہے

وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ مجھے اس شہر کی قسم اس وقت ہے جبکہ آپ اس شہر میں جلوہ گر ہیں کیونکہ آپ کے اس شہر میں نزول اجلال فرمانے سے اس شہر کی عزت اور بزرگی بھی بڑھ گئی کہ مکان کی عزت مکین سے ہوتی ہے اور دینی مشقت اور تکلیف کے اسباب بھی زیادہ ہوگئے اور اس شہر کے رہنے والے کبیرہ گناہوں میں سے سب سے بڑے گناہ میں گرفتار ہوگئے جو کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوق سے سب سے بہترین شخصیت کو قتل کرنا اور ستانا ہے۔ اور حرم کے احترام سے کہ جس کا لحاظ کرتے ہوئے موذی جانوروں کو قتل نہیں کرتے تھے' خاردار درختوں کو نہیں کاٹتے تھے' ایک دم صاف جواب دے کر اس عقیدہ کے خلاف ہوگئے اور اس وقت جو ظلم ان شہریوں سے وقوع پذیر ہوا' حضرت آدم علیہ السلام کے وجود سے لے کر اس وقت تک کسی سے بھی واقع نہ ہوا ہوگا۔ پس یہ قید بڑھانے کی وجہ سے کہ وَاَنْتَ حِلٌّۢ بِهٰذَا الْبَلَدِ اس قسم کو مقصد کے ساتھ مکمل وابستگی میسر آ گئی چونکہ اس قسم میں اور مقصد کے ساتھ اس کی مناسبت میں ایک قسم کی گہرائی اور پوشیدگی ہے جسے ذہین لوگوں کے سوا دریافت نہیں

کیا جا سکتا' ایک اور عام فہم قسم بھی ذکر فرمائی گئی۔

وَوَالِدٍ وَّمَا وَلَدَ جننے والے کی قسم! اور اس کی جسے جنتا ہے کہ دونوں کمال مشقت اور رنج میں گرفتار ہیں اس لیے کہ جننے والی کو پہلے تو حمل' ذائقے کی بے مزگی اور دردِ زہ کا بوجھ اُٹھانا چاہیے۔ بعدازاں بچے کی پرورش میں سختیاں اور تکلیفیں دیکھنا چاہیے اور جسے جنتی ہے' پہلے اسے رحم کی تاریکی میں انتہائی عاجزی اور کمزوری کے ساتھ وقت گزارنا چاہیے۔ بعدازاں اس سرائے فانی کی محنت میں، قسم قسم کے جسمانی اور روحانی دُکھوں میں مبتلا ہونا چاہیے اسی لیے کہا گیا ہے کہ پیدائش کے وقت بچے کا رونا اسی طرف اشارہ ہے کہ اس جہان میں روتے ہی گزرے گی اور کیا اچھا کہا گیا ہے

لما تؤذن الدنيا من صروفها
يكون بكاء الطفل ساعة يولد

والا فما يبكيه منها وانها
لاوسع مما كان فيه وارغد

یعنی جب دنیا اپنے حوادث کی وجہ سے ثقیل ہو گئی' بچہ ولادت کے وقت روتا ہے ورنہ وہ دنیا میں آنے سے کیوں روئے جبکہ دنیا اس مقام سے زیادہ وسیع اور خوشگوار ہے جہاں وہ تھا۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ والد سے مراد حضرت آدم علیہ السلام ہیں کہ کس مشقت سے جنت سے دنیا میں آئے اور دیکھی چکھی نعمتیں چھوڑنا پڑیں اور ماولد سے مراد آپ کی اولاد ہے جنہوں نے اپنی عمر میں اس دارالمحنت کے سوا کچھ نہ دیکھا اور انہوں نے اپنے اصلی وطن کے اوصاف بڑی حسرت اور افسوس سے سنے اور قسم کی ان دونوں جنسوں سے ثابت ہوا کہ انسان کی خاکی اصل بھی مشقت اور رنج کا مقام ہے اور اس کی آبی اصل بھی مشقت اور رنج کی جگہ۔ اب اس دلیل پر مدلول کو بطور فرع ذکر کر کے فرمایا جا رہا ہے۔

لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْ كَبَدٍ تحقیق ہم نے انسان کو مشقت اور رنج میں پیدا فرمایا اس لیے کہ عالمِ خاک میں آدمی کی اصل زمین مکہ معظمہ اور عالمِ آب میں اس کی اصل

حضرت آدم علیہ السلام کے نطفے کا پانی ہے اور دونوں مشقت میں گرفتار ہیں اور یہاں کبد کو با کی زبر سے پڑھنا چاہیے جو کہ مشقت کے معنوں میں ہے۔ کبد با کی زیر سے جو کہ جگر کے معنوں میں ہے' بھی اسی سے مشتق ہے اس لیے کہ آدمی کے جسم میں اس کی ڈیوٹی باورچی گری ہے' غذا لانے' اسے پکانے اور اسے تقسیم کرنے میں کئی مشقتیں برداشت کرتا ہے اور جبکہ دوسرے اعضاء لقمے پر بے دردی سے متصرف ہوتے ہیں۔

انسانی مشقتوں کا اجمالی تذکرہ

اور اگر آدمی کی مشقت اور تکلیف کو تفصیل سے بیان کیا جائے تو طویل دفتر چاہئیں لیکن اجمالی طور پر اس قدر جاننا چاہیے کہ پہلے تو آدمی کی پیدائش چار ضدوں گرمی اور سردی' رطوبت اور خشکی سے ہے اور یہ چاروں اس کے مزاج میں اپنا غلبہ چاہتی ہیں۔ اور اس کے اعتدال کو درہم برہم کرنے کے درپے ہوتی ہیں' وہ ہمیشہ ان چار اژدہاؤں کی کھینچا تانی میں رہتا ہے پھر کچھ عرصہ رحم کے قید خانے میں بند ہے۔ اور کچھ اور وقت میں انتہائی عاجزی اور کمزوری کے ساتھ گہوارے میں مردے کی طرح پڑا ہے۔ نہ زبان کہ اپنا ماضی الضمیر بیان کرے نہ ہاتھ پاؤں جن سے اپنی خواہش طلب کرے۔ پھر دانت نکلنے کے درد اور پستان چھوڑنے کی تکلیف میں مبتلا ہوتا ہے۔ پھر مکتب میں استاد کی ڈانٹ کی تکلیف اُٹھاتا ہے۔ اور جب عقل کے بندھنوں میں گرفتار ہوتا ہے تو یہ کر اور یہ نہ کر کی کھینچا تانی میں پڑ گیا۔ اور کئی قسم کے رنج اور ملال میں لپیٹا گیا۔ طبیعت اسے کبھی شہوانی زور اور قوت کے ساتھ جانور کی طرح ذلیل کرتی ہے اور اسے حرص میں گرفتار کرتی ہے۔ ایک درہم کی خاطر اس کے سر پر بھاری بوجھ رکھتی ہے اور سارا دن معمولی سی مزدوری کی خاطر اسے آگ اور دھوئیں کے سپرد کرتی ہے اور چند پیسوں کی محنت کے لیے اسے دُکان میں قید کر دیتی ہے اور چند دانوں کی خواہش کی وجہ سے اسے دو بیلوں کے پیچھے بھگاتی ہے۔

اور کبھی قوتِ غضبیہ کے جوش مارنے کی وجہ سے اسے درندوں کی گنتی میں ڈال دیتی ہے۔ اور اسے مخلوق کی نفرت اور جہان کی بدگوئی نصیب ہوتی ہے اور بھیڑیئے کی طرح تھوتھنی اور پنجہ کھولتا ہے اور مخلوق کو ستاتا ہے۔ اور ان سب سے عجیب تر دشواری یہ ہے کہ اس

پر طبیعت کا حکم بھی چلتا ہے اور شریعت کا بھی۔ شریعت' طبیعت کی مخالفت کرتی ہے جبکہ طبیعت نفس کی موافقت کرتی ہے۔ عبادت کی رکاوٹوں کے ہوتے ہوئے اسے عبادت کا حکم ہے اور گناہ کے محرکات کے ہوتے ہوئے اس گناہ سے روکا گیا ہے۔ دنیا میں کوئی تکلیف ضدوں کو جمع کرنے اور ہمزاد مخالفوں کو راضی کرنے سے بڑی نہیں ہے اور یہ تمام مشقتیں اور تکالیف ہر شخص کی ذات سے تعلق رکھتی ہیں۔

دوسروں کے حق سے وابستہ تکالیف کا تذکرہ

رہی وہ مشقتیں جو کہ غیر کے حق سے تعلق رکھتی ہیں تو ان سب سے زیادہ سخت ہیں' رعیت ہمیشہ بادشاہ کی اطاعت میں اسیر اور بادشاہ کے لیے اسی طرح رعیت پر عدل واحسان ضروری۔ بیٹا' ماں باپ کی خدمت کے رنج میں اور ماں باپ بیٹی اور بیٹے کے اخراجات کے رنج میں۔ اسی طرح بیوی کا حال شوہر کے ساتھ اور شوہر کا حال بیوی کے ساتھ اور غلام آقا کے ساتھ اور آقا غلام کے ساتھ۔ اور ہمسایہ دوسرے ہمسائے کے ساتھ۔ کوئی بھی اس قسم کی مشقت سے خالی نہیں ہے اور ان تمام دنیوی مشقتوں کے باوجود سکرات موت کی مشقت۔ مال کی جدائی اور اولاد کی نومیدگی کا رنج' قبر کی تنگی' لحد کی تاریکی' وہاں کی تنہائی' منکر نکیر کے سوالات' قیامت اور اٹھنے کے دن کی ہولناکی' صور پھونکنے کی ہیبت' سب اگلوں پچھلوں کے سامنے رسوائی کا خوف' حساب اور وزن اعمال کے وقت شرمندگی کا لاحق ہونا رب العزت کے حضور کھڑے ہونا اور اگر معاذ اللہ ان سب کے باوجود دوزخ نصیب ہوئی تو ہمیشہ کا خسارہ مل گیا' اس کی مشقت اور رنج بیان سے باہر ہو گیا اور جب کوئی عمر کی ابتدا سے لے کر اس کی انتہا تک اسی قسم کی تکالیف میں گرفتار ہوا سے زور بازو اور بے پناہ مال خرچ کرنے پر فخر کرنا انتہائی نازیبا ہے۔ چنانچہ فرمایا جارہا ہے:

اَیَحۡسَبُ اَنۡ لَّنۡ یَّقۡدِرَ عَلَیۡہِ اَحَدٌ کیا یہ مشقتوں اور تکلیفوں کی مخلوق گمان کرتی ہے کہ اس پر کوئی قادر نہیں ہوگا کہ اسے جزا دے اور اچھے برے اعمال کے متعلق باز پرس کرے' حالانکہ وہ ہر دم قہر الٰہی میں مغلوب اور اس کی لامتناہی قدرت کے ماتحت ہے بلکہ اس کی انتہائی کمزوری مخلوق جو کہ مکھی اور مچھر ہے' کے عہدے سے باہر نہیں آ سکتا۔

اور جب اس کا زیادہ تر فخر بہت سا مال خرچ کرنے پر تھا۔ اور اس دعوے میں کہ مجھ پر کوئی قابو نہیں پائے گا۔ اس کا زیادہ تر اعتماد اپنی عزت اور مرتبے پر تھا جو کہ اس نے بہت سا مال خرچ کر کے حاصل کیا تھا۔ کیونکہ جو شخص مال زیادہ خرچ کرتا ہے' وہ دِلوں میں پیارا اور نگاہوں میں بلند مرتبہ معلوم ہوتا ہے۔ اور کوئی شخص حیا کی وجہ سے یا اس کی طرف سے کسی نفع کی توقع کی وجہ سے اسے لتاڑنے اور ذلیل کرنے کی کوشش نہیں کرتا اس کے اس غرور کو مٹانے اور اعتماد کو باطل کرنے کے بارے میں فرمایا جا رہا ہے

يَقُوْلُ اَهْلَكْتُ مَالًا لُّبَدًا فخر کے مقام میں اور یہ ثابت کرنے میں کہ مجھ پر کوئی قابو نہیں پائے گا۔ کہتا ہے کہ میں نے ڈھیروں مال نیست و نابود کیا ہے اور ہر بڑے کام میں بڑی بڑی رقمیں صرف کی ہیں اور اس وجہ سے میرا مقام اور عزت لوگوں کے دِلوں میں جاگزیں ہے' کوئی شخص میرا مقابلہ کرنے کے لیے قدم نہیں اُٹھا سکتا۔

اَيَحْسَبُ اَنْ لَّمْ يَرَهٗٓ اَحَدٌ کیا وہ گمان کرتا ہے کہ اسے کسی نے نہیں دیکھا جبکہ وہ ماں کے پیٹ سے بھوکا اور ننگا باہر آیا تھا۔ اور اس کے پاس ایک دھیلہ تک نہ تھا۔ پھر جب اس نے مال کمانا شروع کیا تو کس طریقے سے حلال سے یا حرام سے؟ پھر جب اس نے مال خرچ کیا تو کس مصرف میں کیا؟ مناسب مقام پر یا بے جا خرچ کیا؟ اور کس نیت سے خرچ کیا؟ خدا تعالیٰ کی رضا کے لیے یا فخر و ریاء کے لیے؟ پس اسے وہ مال خرچ کرنے پر جو کہ اس کے ہاتھ میں بالکل مانگی ہوئی چیز ہے اور زیادہ تر حرام طریقے سے حاصل کیا گیا' حرام جگہ صرف کیا گیا اور بُری نیت سے خرچ ہوا' فخر کرنا اور خوش ہونا مناسب نہ تھا۔ اور اگر وہ یہ فخر اور خوشی کا اظہار کسی ایسے شخص کے پاس کرتا جو کہ اس کی ابتدائی حالت سے اس کے مال کی کمائی کی جہت سے اور اس کی باطنی نیت سے آگاہ نہ ہو تو گنجائش تھی۔ اس کی انتہائی بے حیائی ہے کہ اس نے رب الارباب' اسرار اور مخفیات کا علم رکھنے والے اور حال اور مستقبل کو جاننے والے کے سامنے فخر کے ساتھ لب کشائی کی۔ اور اگر وہ کفر اور جہالت کے طریقے سے اللہ تعالیٰ کے اسے دیکھنے کا انکار کرے تو اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ یوں ارشاد فرماتا ہے:

اَلَمْ نَجْعَلْ لَّهٗ عَيْنَيْنِ کیا ہم نے اس کے لیے دو آنکھیں نہیں بنائی ہیں تا کہ چیزوں کو دیکھے اور جو ذات دوسروں کو بینائی بخشے اور بینائی کے اسباب پورے کرے' اس کی اپنی بینائی میں کس طرح کمی ہوگی۔ اور اگر وہ خدا کے دیکھنے کو تسلیم کرتا ہے اور کہتا ہے کہ میرے دل کی نیتوں کو کوئی نہیں جان سکتا تو اس کے جواب میں فرمایا جارہا ہے

وَلِسَانًا وَّشَفَتَيْنِ کیا اور کیا ہم نے اس کی ایک زبان اور دو لب نہیں بنائے اور جس نے مافی الضمیر کو ظاہر کرنے کی قدرت دوسروں کو بخشی ہے' وہ دوسرے کے مافی الضمیر پر کس طرح مطلع نہ ہوگا۔ اور آدمی میں زبان کا فائدہ تو بالکل ظاہر اور واضح ہے کہ بات کرنے اور مافی الضمیر کو ظاہر کرنے کا آلہ وہی ہے۔

دولبوں کے چند فوائد

جبکہ دولبوں کے چند فائدے ہیں۔ پہلا فائدہ دودھ چوسنا اور اسی طرح پھلوں سے جیسے آم وغیرہ کا رس چوسنا۔

دوسرا فائدہ منہ کو ڈھانپنا کہ کوئی جانور یا تنکا وغیرہ منہ میں نہ جائے۔ تیسرا فائدہ دانتوں کو چھپانا کیونکہ ان کا کھلا رہنا انتہائی بھدا معلوم ہوتا ہے۔ چوتھا فائدہ بات کہنے میں مدد کرنا کیونکہ شفوی حروف ہونٹوں کے بغیر نہیں نکل سکتے جیسے با اور واؤ اور دوسرے حروف میں بھی ان کی مدد ضروری ہے۔ پانچواں فائدہ کھانا کھانے اور پانی پینے نیز چبانے' نیچے لے جانے اور فضلہ موڑنے میں ان سے مدد لینا ضروری ہوتا ہے۔ چھٹا فائدہ بانسری میں پھونک مارنے اور پھونک والے آلات میں ان کا نفع بالکل ظاہر اور واضح ہے۔

آنکھیں دو اور زبان ایک ہونے کی حکمت

اور باریک بیں علماء نے یوں فرمایا ہے کہ حق تعالیٰ نے آدمی کو دو آنکھیں اور ایک زبان عطا فرمائی ہے تا کہ اس بات کا اشارہ ہو کہ اس کا بولنا' دیکھنے سے کمتر ہونا چاہیے اس لیے کہ اس کا دیکھنا خیر اور شر کو شامل ہے جبکہ بولنا سوائے خیر کے قابلِ تعریف نہیں ہے اور اسی لیے ایک زبان کے لیے دو محافظ مقرر کیے گئے ہیں جو کہ دونوں ہونٹ ہیں تا کہ اسے معلوم ہو کہ [illegible]

مِنْ قَوْلٍ اِلَّا لَدَیْهِ رَقِیْبٌ عَتِیْدٌ یعنی آدمی زبان سے جو کلمہ بھی نکالتا ہے اس کے نزدیک ایک مستعد نگہبان اسی کام کے لیے مقرر ہے۔

اور حدیث صحیح میں ہے کہ جو شخص اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن پر ایمان رکھتا ہے اسے چاہیے کہ اچھی بات کہے یا خاموش رہے۔ اور ترمذی میں عقبہ بن عامر رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا کہ کس چیز میں نجات ہے؟ آپ نے فرمایا کہ اپنی زبان کو بند رکھ اور اپنے گھر میں بیٹھ جا اور اپنے گناہوں پر گریہ زاری کر اور بزرگانِ سلف نے فرمایا ہے کہ آدمی کی زبان ایک مہلک اژدہا ہے جس کا سوراخ منہ ہے اور کیا ہی اچھا کہا گیا ہے

احفظ لسانك ايها الانسان

لا يلدغنك انه ثعبان

یعنی اے انسان! اپنی زبان کی حفاظت کر' یہ ایک اژدھا ہے کہیں تجھے ڈس نہ لے۔

حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ جب آدمی بات کرنا چاہے تو اسے چاہیے کہ پہلے غور کرے اور اپنے دل سے مشورہ طلب کرے۔ اگر معلوم کرے کہ بات کرنے میں سراسر مصلحت ہے اور دین اور دنیا کے اعتبار سے کوئی نقصان نہیں تو بات کرنے کا اقدام کرے۔ اور اگر مصلحت کے وجود یا نقصان لاحق ہونے میں شک رکھتا ہے تو اسے بات کرنا ہرگز جائز نہیں۔ چہ جائیکہ اس میں کوئی مصلحت ہی نہ ہو اور نقصان کا گمان یا یقین ہو۔

نیز حدیث شریف میں وارد ہے کہ جب آدمی صبح کرتا ہے اس کے تمام اعضاء زبان کے آگے عاجزی اور زاری کرتے ہیں اور کہتے ہیں اے ظالم! انصاف کر ہم سب تیری خوبی کے ساتھ وابستہ ہیں اگر تو سیدھی راہ پر ہے تو ہم بھی نجات پاتے ہیں ورنہ تیرے عمل کی وجہ سے ہم سب گرفتار ہوتے ہیں۔

مذکورہ تین نعمتوں کی تخصیص کی ایک اور وجہ

اور اس آیت میں ان تین نعمتوں آنکھ' زبان اور لبوں کو خصوصیت کے ساتھ بیان کرنے کی ایک اور وجہ بھی ہے اور وہ یہ ہے کہ جب آدمی ماں کے شکم سے پیدا ہوتا ہے' بھوکا

ہوتا ہے اور پہلی چیز جو دنیا سے اپنی غذا کے لیے کماتا ہے' پستان سے دودھ چوسنا ہے۔ اور دودھ چوسنے میں ان تینوں اعضاء سے چارہ نہیں تاکہ دودھ دینے والی کو دیکھے اور لب کے زور سے پستان چوسے اور دودھ کو زبان اور مزہ چکھنے کی مدد سے حلق میں نیچے اُتارے۔ تو جو اپنی پہلی کمائی پر قادر نہ ہو جس پر اس کی بقاء اور زندگی موقوف ہے تو دوسری کمائیوں پر اسے خود بخود ناز کرنا کیسے درست ہوگا۔ اور اگر فریق مخالف جو کہ وہی مذکورہ کافر ہے' کہے کہ اگرچہ اللہ تعالیٰ ہر چیز کے ظاہر و باطن کو دیکھتا اور جانتا ہے لیکن جہاں میں نے مال خرچ کیا اور جس نیت کے ساتھ کیا' میں معذور تھا اس لیے کہ مجھے وہی مقام اور وہی نیت اچھی اور پسندیدہ لگی اور میں کسی دوسرے مقام اور دوسری نیت کو پہچانتا ہی نہ تھا کہ اس مقام میں اور اس نیت کے ساتھ مال خرچ کروں اس کے جواب میں فرمایا جارہا ہے کہ

وَهَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ اور ہم نے اسے خیر اور شر دونوں راہوں کا نشان دیا۔ پس پہچاننے اور تمیز نہ ہونے کے دعوے میں بالکل جھوٹ کہتا ہے اس لیے کہ پہلے ہم نے اسے عقل دی پھر ہم نے انبیاء علیہم السلام اور واعظوں کے وسیلے سے اس کے کانوں میں اچھی اور بُری راہ کی علامات پہنچائیں اور دونوں راہوں کو اس کی نظر میں جدا جدا کر دیا اس نے بُری راہ کو اختیار کیا اور سیدھی راہ سے بہک گیا اور اپنا مال قابل تعریف مقام میں بالکل صرف نہ کیا۔ چنانچہ فرمایا جارہا ہے

فَلَا اقْتَحَمَ الْعَقَبَةَ پس اس کافر سے یہ نہ ہوا کہ سخت اور دشوار ٹیلے پر گزرتا اور سختی اور دشواری بھی اچھی راہ کی عمدہ علامات میں سے ہے اس لیے کہ بُری راہ نفس کی مناسبت اور اس کی موافقت کی وجہ سے آسان اور ہلکی معلوم ہوتی ہے اور خواہش کی چیزوں میں لذتیں پوری کرنے میں مال خرچ کرنا آسان ہوتا ہے' مال خرچ کرنے میں دشواری وہاں ہوتی ہے جہاں کوئی لذت یا اس میں کسی منفعت کی توقع نہ ہو اور صرف اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے واقع ہو۔ چنانچہ فرمایا جارہا ہے کہ

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا الْعَقَبَةُ اور اے انسان! تو کیا جانے کہ وہ سخت اور دشوار ٹیلا کیا ہے کہ جہاں مال خرچ کرنا طبیعت اور نفس پر ناگوار اور گراں گزرتا ہے۔

فَكُّ رَقَبَةٍ وہ سخت اور دشوار ٹیلا گردن آزاد کرنا ہے۔

گردن آزاد کرنے کی چند صورتیں

اور یہ چند وجوہ سے ہوتا ہے۔ ایک تو اپنی ملک سے غلام آزاد کرنا۔ دوسری قسم جان کو قصاص اور خون سے خلاصی دینا ہے کہ اس کے عوض خون بہا دے کر اس کی جان بخشی کی جائے۔ تیسری قسم قرض دار کو چھڑانا ہے جسے اس کے قرض خواہ اپنے حق کے مطالبے میں پکڑ کر قید کر لیں اور وہ قرض ادا کر کے اسے اس کے قرض خواہوں سے رہائی بخشیں۔ چوتھی قسم اس قیدی کو چھڑانا ہے جو کسی کافر یا ظالم کے پاس گروی رکھا ہوا ہو اور مال دیئے بغیر چھٹکارا نہ پائے۔

اور حدیث صحیح میں وارد ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ عالیہ میں حاضر آیا اور عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم مجھے کسی ایسے عمل کا پتہ دیں جس کی وجہ سے میں جنت میں داخل ہو جاؤں۔ فرمایا غلام آزاد کرو اور گردن آزاد کرو اس نے عرض کی یا رسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم کیا یہ دونوں ایک چیز ہی نہیں ہیں؟ فرمایا نہیں! غلام آزاد کرنا یہ ہے کہ تو صرف اسے غلامی کی قید سے آزاد کرے جبکہ گردن کو چھڑانا یہ ہے کہ تو اسے کسی تاوان یا خون سے چھڑانے میں مدد کرے۔

حضرت امام اعظم رحمۃ اللہ علیہ نے مسکین کو کھانا کھلانے سے پہلے فک رقبۃ کو بیان کرنے سے استدلال فرمایا ہے کہ یہ اخراجات صدقہ سے بہتر ہیں جبکہ دوسرے علماء نے اس کے برعکس کہا ہے' وہ کہتے ہیں کہ صدقے میں جان کو ہلاکت سے رہائی دِلانا ہے اس لیے کہ جسم کی بقاء غذا کے ساتھ ہے اور غلام آزاد کرنے میں قید سے چھڑانا ہے اور قید اتنی تکلیف دہ نہیں کہ اس سے ہلاکت کا خوف ہے۔

اَوْ اِطْعَامٌ فِیْ یَوْمٍ ذِیْ مَسْغَبَةٍ یا اس دن کھانا کھلانا ہے کہ جس میں بھوک اور محتاجی زیادہ ہو جیسے قحط کے اور غلہ نہ ملنے کے ایام کہ اس وقت کھانا کھلانا سونا اور جواہرات بخشنے سے زیادہ بہتر ہو جاتا ہے۔

یَّتِیْمًا ذَا مَقْرَبَةٍ اس یتیم کو جو رشتے دار بھی ہو جیسے بھتیجا' پھوپھی زاد اور خالہ زاد

وغیرہ

احتیاج کے دن کی قید لگانے کی وجہ

اور یہ قید اس لیے لائی گئی ہے کہ کھانا کھلانا ہر وقت عبادت ہے اس لیے کہ کھانے والا بھوک کے بغیر نہیں کھا سکتا۔ تو ہر شخص امیر وغریب کھانا کھانے کے وقت محتاج ہی ہوتا ہے اور کھانا کھانے سے اس کی روح تازہ ہو جاتی ہے۔ اسی لیے جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے پوچھا گیا کہ اسلام کے کاموں میں بہترین کام کون سا ہے؟ آپ نے ارشاد فرمایا کھانا کھلانا جو ملے اسے سلام کہنا۔ اور رات کو اس وقت نماز پڑھنا یعنی نوافل ادا کرنا جب لوگ سوئے پڑے ہوں۔ اور جب کھانا قحط اور غلہ نہ ملنے کے وقت کھلایا جائے اس کا اجر کئی گنا زیادہ ہو جاتا ہے اس لیے کہ ان اوقات کے علاوہ اگر کوئی شخص بھوک کی ابتدا میں تکلیف اُٹھائے گا' ایک دو گھڑی بعد روٹی مل جائے گی اور اسے جان کی ہلاکت کا خطرہ نہیں ہوگا۔ بخلاف ایامِ قحط اور غلہ کی نایابی کے کہ ان دنوں وہ لوگ جو روزی کمانے کی کوشش اور تلاش کر سکتے ہیں یا کوئی والی وارث رکھتے ہیں' انہیں بھی ایک دودن بعد کھانا نصیب ہوتا ہے اور ان کے معاش کے ذمہ دار قلیل وکثیر کے ساتھ ان کی خبرگیری کر لیتے ہیں۔ جبکہ یتیم جس کے پاس ان میں سے کچھ بھی نہیں اور اس کی ہلاکت کا خوف یقین کی حد تک پہنچ جاتا ہے اور اس کی محتاجی انتہا کو پہنچ جاتی ہے۔ خصوصاً وہ یتیم جو کہ رشتے داری کا تعلق بھی رکھتا ہو کہ اسے کھانا کھلانا صدقہ بھی ہے اور صلہ رحمی بھی جو کہ ایک مستقل عبادت ہے۔ نیز یتیم کو کھانا کھلانے میں خصوصاً جو رشتے دار بھی ہو' ثوابِ آخرت کے بغیر کسی فوری یا بعد از مدت نفع کی توقع نہیں ہے اس لیے کہ بچہ ہونے کے اعتبار سے اس سے کوئی کام بھی نہیں ہو سکتا اور مدح وثناء کا کوئی اعتبار بھی نہیں ہوتا اور اگر اسے کھانا کھلانے کے وقت کوئی موجود بھی ہو تو اسے رشتے داری کے تعلق کے احترام پر محمول کرے گا۔ پس ریا اور فخر کرنے کا دروازہ بالکل بند ہو جائے گا اور خلوصِ نیت پورے طور پر متحقق ہوگا۔

اَوْ مِسْكِيْنًا ذَا مَتْرَبَةٍ یا اس منگتے کو کھانا کھلانا ہے جو خاکساری والا ہو اور خاک پر پڑا رہے اور یہ قید اس لیے لائی گئی ہے کہ مسکین کبھی ایسے محتاج کو کہتے ہیں جس کا خرچ اس کی

آمدنی سے زیادہ ہو جیسا کہ سورۂ کہف میں واقع ہے۔ وَاَمَّا السَّفِیْنَةُ فَکَانَتْ لِمَسَاکِیْنَ یَعْمَلُوْنَ فِی الْبَحْرِ لیکن وہ مسکین خاکساری اور اضمحلال کی حد تک نہیں پہنچتا تا کہ اس کی جان کو ہر دَم ہلاکت کا خطرہ لاحق ہو اور جب گدا کی نوبت اس حد تک پہنچ جاتی ہے تو وہ بھی کسی فوری اور بعد از مدت نفع کی توقع کا محل نہیں رہتا اور صرف رضائے خداوندی کے لیے مال خرچ کرنا متحقق ہو جاتا ہے۔

اور چونکہ ان تین وجوہ میں جو کہ ذکر کی گئیں' مال خرچ کرنا کبھی کافروں اور بدعقیدہ لوگوں سے بھی اپنی جنس پر رقت آنے اور فطری رحم کی وجہ سے واقع ہو جاتا ہے اور آخرت کے حساب میں وہ ضائع اور برباد ہو جاتا ہے۔ ناچار اس خرچ کرنے سے بچنے کے لیے ایک اور شق بڑھا کر ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ

ثُمَّ کَانَ مِنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا پھر وہ ان سب کے باوجود ان لوگوں میں سے ہو جو ایمان لائے ہیں اور انہوں نے دین' شریعت اور وقت کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تصدیق کی ہو تا کہ اس شخص کا یہ اچھا عمل آخرت میں کفر اور نبی علیہ السلام کی تکذیب کی نحوست کی وجہ سے رائیگاں اور برباد نہ ہو اور ثم کا لفظ اگرچہ ان اعمال سے ایمان کی تراخی اور تاخیر پر دلالت کرتا ہے۔ حالانکہ ایمان تمام عبادتوں اور نیکیوں کی قبولیت کی شرط ہے اور شرط ہمیشہ مشروط سے پہلے ہوتی ہے لیکن یہاں تراخی اور تاخیر بیان میں مراد ہے نہ کہ ایمان کے واقع ہونے میں جیسا کہ کہتے ہیں کہ نماز اس وقت مقبول ہوتی ہے جب اس کے ارکان کو تکبیر سے لے کر سلام تک ترتیب کے ساتھ ادا کریں پھر وضو بھی کیا ہو حالانکہ وضو نماز کی شرط ہے۔ نماز سے پہلے کرنا چاہیے لیکن بیان میں شرط کا مرتبہ مشروط کے مرتبے کے بعد ہے اس تاخیر کا پتہ دینے کے لیے یہاں لفظ ثم استعمال فرمایا گیا ہے اور اگر ایمان کا ذکر پہلے کیا جاتا تو یوں وہم ہو جاتا کہ ایمان بھی مال کے عقبہ کے ارکان میں داخل ہے جبکہ واقع میں ایسا نہیں ہے۔

اور بعض علماء نے کہا ہے کہ وقوع میں تاخیر مراد ہے اس لیے کہ کفار کے اچھے اعمال موقوف رہتے ہیں اگر وہ پچھلی عمر میں ایمان لے آئیں وہ سب سابقہ اعمال بعد میں لاحق ہونے والے ایمان کی برکت سے مقبول ہو جاتے ہیں اور وہ ان کا ثواب پاتے ہیں۔ چنانچہ

حدیث صحیح میں حضرت حکیم بن حزام رضی اللہ عنہ نے جو کہ حضرت اُم المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا کے بھتیجے ہیں' اسلام لانے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ یارسول اللہ! میں نے زمانۂ کفر میں اچھے اعمال بہت کیے ہیں۔ آپ نے فرمایا تیرے اسلام نے ان سب اعمال کو نیک بنادیا اور وہ مقبول ہو گئے۔ پس اس صورت میں آیت کا معنی یوں ہوگا کہ پہلے جس نے بھی وجوہ مذکورہ میں مال خرچ کیا اس کے بعد اسے ایمان کی توفیق بھی مل گئی' وہ سخت اور دشوار ٹیلے سے گزر گیا۔

ایک فنی سوال اور اس کا جواب

اور عربی کے علماء کو اس آیت کی ترکیب میں ایک مشہور مشکل درپیش ہے جس کا خلاصہ یہ ہے کہ کلام عرب میں فعل ماضی کی نفی لا کے ساتھ نہیں آئی ہے سوائے دعا کے جیسے لَابَارِكَ اللّٰهُ فِيْ سَهِيْلٍ یا سوائے تکرار کے جیسے فَلَاصَدَّقَ وَلَاصَلّٰى میں۔ اس آیت میں فلا اقتحم فعل ماضی کی نفی لا کے ساتھ ہے اور یہ دونوں قسموں سے خارج ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ جب عقبہ کو چند چیزوں کے ساتھ بیان کیا گیا تو معنوی اعتبار سے ماضی میں تکرار آ گیا تو گویا یوں فرمایا گیا کہ فَلَافَكَّ رَقَبَةً وَّلَااَطْعَمَ فِيْ يَوْمٍ ذِيْ مَسْغَبَةٍ وَّلَاكَانَ مِنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اور کلام میں زیادہ تر معنوں کا اعتبار ہوتا ہے نہ کہ لفظوں کا اور اس کے علاوہ قرآن پاک کی لغت کی حجت کافی ہے' کوئی گواہی لانے کی ضرورت نہیں۔

اور جب عقبہ کے بیان میں یہاں تک پہنچ گئے تو مال خرچ کرنے میں مرتبۂ کمال پورا ہوا اب اس باب میں مکمل کرنے کا مرتبہ بیان فرمایا جا رہا ہے اس لیے کہ تکمیل کے بغیر کمال چنداں اعتبار کے لائق نہیں۔

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ اور وہ ایک دوسرے کو صبر کی وصیت کرتے ہیں جو کہ اچھے اخلاق کا مجموعہ ہے۔

صبر کی فضیلت کا بیان

اور کتاب اللہ میں تمیں سے کچھ اوپر آیات میں اس کی تاکید واقع ہے اور حق تعالیٰ نے

اپنے پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کو اس کا حکم دیا ہے کہ فَاصْبِرْ کَمَا صَبَرَ اُولُوا الْعَزْمِ مِنَ الرُّسُلِ اور یہاں سے صبر کی فضیلت کا سراغ لگایا جا سکتا ہے کہ قرآن پاک میں اس کا ذکر نماز سے بھی پہلے لایا گیا ہے جہاں کہ فرمایا گیا ہے یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا اسْتَعِیْنُوْا بِالصَّبْرِ وَالصَّلٰوةِ نیز رب العزت نے اپنی رفاقت صبر والوں کے ساتھ مخصوص فرمائی ہے کہ ان اللہ مع الصابرین اور کسی مقام پر ان اللہ مع المصلین، مع الصائمین، مع المتصدقین، نہیں فرمایا۔ نیز ہر عمل کا ایک اجر مقرر فرمایا گیا ہے جبکہ صبر کے لیے بے حساب اجر کا وعدہ فرمایا گیا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا اِنَّمَا یُوَفَّی الصّٰبِرُوْنَ اَجْرَهُمْ بِغَیْرِ حِسَابٍ اور دین کے پیشواؤں کو صبر کے ساتھ وابستہ کیا گیا ہے کہ وَجَعَلْنَا مِنْهُمْ اَئِمَّةً یَّهْدُوْنَ بِاَمْرِنَا لَمَّا صَبَرُوْا اور بنی اسرائیل کو صبر کی برکت سے دین و دنیا کی عزت نصیب کی گئی وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ الْحُسْنٰى عَلٰى بَنِیْۤ اِسْرَآءِیْلَ بِمَا صَبَرُوْا۔

صبر کی حقیقت کا بیان

اب صبر کی حقیقت کو سمجھنا چاہیے تاکہ پتہ چلے کہ صبر کی وصیت کرنا گویا تمام وجوہ کمال کی وصیت کرنا ہے۔ صبر کی حقیقت یہ ہے کہ انسان طبیعت اور نفس کی کھینچا تانی کے وقت اپنے دین کے تقاضوں پر قائم رہے۔ اور پختگی اختیار کرے اور یہ استقلال اور ثابت قدمی کبھی جسم کے ساتھ ہوتی ہے اور اس کی دو قسمیں ہیں۔ مشقت طلب عبادت سے سستی نہ کرنا اور جی نہ چرانا اور مصیبتوں کے آنے سے متاثر نہ ہونا۔ اور اپنی دینی قدروں کو نہ چھوڑنا اور کبھی ثابت قدمی نفس کے ساتھ ہوتی ہے۔ پس اگر پیٹ اور شرم گاہ کی دونوں خواہشات سے اس کا نفس متاثر نہ ہو اور اس سے دین کے خلاف کوئی حرکت اور خواہش صادر نہ ہوا سے عفت یعنی پاک دامنی کہتے ہیں اور اس کے مقابل فجور ہے۔

اور اگر مکروہات اور شبہات سے پرہیز کرنے اور طبعی ناخوشگواریوں کو برداشت کرنے میں نفس ثابت قدم رہے اسے صبر مطلق کہتے ہیں اور اس کی ضد اضطراب اور بے تابی ہے۔

اور اگر مال داری اور دولت مندی کی صورت میں نفس کو حکم شرع کے تحت قابو رکھے اور تکبر اور غرور فراہم نہ کرے اور بے جا خوشی اور فخر نہ کرے تو اسے وسعت حوصلہ کہتے ہیں اور

اس کی ضد تنگی حوصلہ ہے۔
اور اگر جنگ میں بھاگنے اور کاہلی کرنے سے پرہیز کرے' اسے شجاعت کہتے ہیں اور اس کی ضد جبن یعنی بزدلی ہے اور اگر غصہ پینے کے وقت مستقل رہے' اسے حلم کہتے ہیں اور اس کی ضد طیش ہے اور اگر عظیم کام سرانجام دینے میں تنگ دل نہیں ہوتا' اسے سینے کی کشادگی کہتے ہیں اور اس کی ضد تنگ دل ہے اور اگر رازداری اور بھید چھپانے میں غیر ذمہ داری نہیں کرتا' اسے کتمان یعنی چھپانا کہتے ہیں اور اس کی ضد اظہار ہے۔ اور اگر حقوق جیسے امانت اور قرض کی حفاظت میں احتیاط کرتا ہے' اسے امانت کہتے ہیں اور اس کی ضد خیانت ہے۔ اور اگر دنیا کی لذت میں رغبت نہیں کرتا اور بقدرِ ضرورت اکتفاء کرتا ہے' اسے زہد اور قناعت کہتے ہیں۔ اور اس کی ضد حرص ہے۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ اکثر اخلاق ایمان صبر میں درج ہے اسی لیے حدیث صحیح میں وارد ہے کہ الصبر نصف الایمان۔
اور حرام سے صبر کرنا فرض اور مکروہ سے نفل ہے اور دین میں صبر سے بہتر کوئی چیز نہیں ہے اس لیے کہ عبادت کی بنیاد صبر پر ہے کیونکہ عبادت میں داخل ہونا نفس کی مرضی کے خلاف ہے اور عبادت کو پورا کرنا زیادہ تر نفس کے خلاف پڑتا ہے اگر صبر نہ ہو کوئی عبادت سرانجام نہیں ہوتی۔ نیز دنیا محنت اور آزمائش کا گھر ہے اور گھبراہٹ اور بے چینی نیکیوں سے روکنے والی ہے۔ اگر صبر نہ ہو تو دنیوی تکالیف ہمیشہ انسان کو بے چینی میں گرفتار رکھیں اور عبادت کے لئے کبھی فراغت میسر نہ آئے اور یہاں سے صبر کو نماز سے پہلے لانے کی وجہ واضح ہوگئی۔

صبر کے مختلف رنگوں اور شعبوں کا بیان

اور صبر کے مختلف رنگ اور قسم قسم کے شعبے ہیں اور شرع شریف میں ہر رنگ مطلوب ہے۔ پس جو صبر دنیوی لذتوں اور آرائشوں سے چاہیے یہ ہے کہ اس طرف جھکاؤ اور توجہ نہ کرے اور اللہ تعالیٰ کے حق کی رعایت پیش نظر رکھے۔ اور جو صبر نیکیوں میں چاہیے تو پہلے ریا۔ اور اخلاص کے خلاف چیزوں سے نیت کی حفاظت کرنا ہے پھر باطل کرنے اور توڑنے سے ان عبادات کی ادائیگی کو بچانا ہے اور پھر ان کے ثواب کو ضائع ہونے سے بچانا ہے۔ نیز

کوتاہی اور اوقات وشرائط کی رعایت نہ کرنے سے عبادت کی حفاظت کرنا ہے۔

اور گناہوں سے صبر یہ ہے کہ ریاضت کے ساتھ نفس کو ان میں رغبت کرنے سے روکے اور ورع کا قصد کرے جو کہ معصیت کے اسباب اور وسائل سے پرہیز کرنے سے عبارت ہے۔

اور مصیبت میں صبر کی دو قسمیں ہیں اس لیے کہ مصیبت کی بھی دو قسمیں ہیں۔ پہلی وہ مصیبت ہے کہ جس پر انتقام اور جزا دینے کی انسان میں طاقت ہو سکتی ہے اس قسم کی مصیبت پر صبر کرنا یہ ہے کہ تحمل کرے اور بدلہ نہ لے' قول سے نہ فعل سے اور اس باب میں بزرگانِ سلف نے ظالم کے بارے میں بددعا سے بھی پرہیز فرمایا ہے اور اسے صبر کے نقصان کا موجب قرار دیا ہے۔ چنانچہ صحیح حدیث میں وارد ہے کہ حضرت اُم المومنین عائشہ صدیقہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا سامان چرانے والے چور کے بارے میں دعائے ہلاکت فرما رہی تھیں' حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے سُن کر ارشاد فرمایا کہ کیا تو چاہتی ہے کہ اس چور کا عذاب ہلکا ہو جائے اور اس کی مصیبت کا دن آسان ہو جائے اور تیرا اجر بھی کم ہو جائے؟ اس کے بارے میں بددعا مت کرو تا کہ اس کا وبال زیادہ سخت ہو اور تمہارا اجر عظیم ہو۔

دوسری وہ مصیبت ہے کہ جس کا تدارک بندہ کے بس میں نہ ہو اور اس قسم کی مصیبت میں صبر یہ ہے کہ گھبرائے نہیں اور قول فعل سے شکایت بالکل نہ کرے۔

وَتَوَاصَوْا بِالْمَرْحَمَةِ اور ایک دوسرے کو مخلوقِ خدا پر مہربانی اور شفقت کی وصیت کرتے ہیں اس لیے کہ یہ خلق دربار الوہیت کے اخلاق میں سے ہے کہ الرحمٰن الرحیم اور دربارِ نبوت علیٰ صاحبہا الصلوٰات والتسلیمات کی عمدہ صفات سے ہے کہ بالمومنین رؤف رحیم اور بہت سے اچھے اخلاق کا منبع ہے۔ عفو وکرم اور لطف وحلم اسی خلق سے پیدا ہوتے ہیں اسی لیے حدیث صحیح میں وارد ہے کہ الراحمون یرحمھم الرحمٰن ارحموا من فی الارض یرحمکم من فی السمآء یعنی رحم کرنے والوں پر رحمٰن رحم فرماتا ہے' زمین والوں پر رحم کرو' آسمان والے تم پر رحم کریں گے اور ابویعلیٰ طبرانی نے حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ سے روایت کی ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم فرما رہے تھے کہ حق تعالیٰ اپنی

رحمت نازل نہیں فرماتا مگر رحیموں پر صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین نے عرض کی کہ یارسول اللہ! ہم میں سے ہر کوئی رحمت رکھتا ہے۔ فرمایا کہ رحیم وہ نہیں جو کہ اپنی جان اور اپنے بچوں پر رحمت کرے' رحیم وہ ہے جو کہ تمام مسلمانوں پر مہربان ہو' بڑوں کو باپ کی طرح' برابر والوں کو بھائی کی طرح اور چھوٹوں کو اولاد کی طرح جانے۔

اور ابن عدی کامل میں حضرت امیر المومنین ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں کو چاہیے کہ ایک دوسرے سے شفقت' دوستی اور حسن سلوک میں ایک جسم کی طرح ہوں اگر جسم کا ایک عضو درد کرے اس کے ساتھ سارا جسم بے خواب رہتا ہے اور اسے بخار ہو جاتا ہے۔

اور طبرانی نے اس حدیث کی روایت کے بعد کہا ہے کہ میں نے ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خواب میں زیارت کی اور آپ سے اس حدیث پاک کے بارے میں پوچھا' آپ نے دست مبارک کے ساتھ اشارہ کرتے ہوئے فرمایا صحیح' صحیح' صحیح

ایک دن حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ کے حکام میں سے ایک حاکم آپ کی ملاقات کے لیے حاضر آیا۔ اس نے دیکھا کہ آپ چت لیٹے ہوئے ہیں اور غریبوں کے بچے آپ کے پیٹ پر سوار ہو کر کھیل رہے ہیں۔ عرض کی کہ یہ حرکت خلافت کے رعب کے مناسب نہیں۔ آپ نے فرمایا کیا تو اپنی رعایا سے (محبت کا) یہ سلوک نہیں کرتا؟ اس نے عرض کی جب میں دربار میں بیٹھتا ہوں تو وہاں مغرور اور سرکش لوگ میری ہیبت سے دَم نہیں مار سکتے' چہ جائیکہ فقیروں اور غریبوں کے بچے میرے پیٹ پر کھیلیں۔ آپ نے فرمایا تو ہمارے کام کا نہیں' معزول ہو جا' ہمیں اپنے رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی اُمت پر نرمی اور مہربانی منظور ہے' فرماں روائی کے رعب اور ہیبت کا اظہار مقصود نہیں۔ نیز بعض احادیث میں مذکور ہے کہ میری اُمت کے ابدالوں کو یہ مرتبہ اعمال کی طاقت سے حاصل نہیں ہوتا بلکہ وہ سخاوتِ نفس' سینے کی صفائی اور مخلوقِ خدا پر مہربانی کر کے اس مرتبے پر پہنچے ہیں۔

صبر اور رحمت کی تخصیص کی وجہ

اب جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے عبادت مالی کی تکمیل کے بارے میں ان دو صفات

صبر اور رحمت کو خصوصیت کے ساتھ کیوں ذکر فرمایا۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ خیرات اور نیکیوں کی اقسام میں مال خرچ کرنے کی ان دو صفات کے بغیر صورت نہیں بنتی۔ پہلے چاہیے کہ حرام مال سے صبر کرے اور حلال کے ساتھ لذت حاصل کرنے میں بھی اپنے نفس کو باز رکھے اس کے بعد رحمت اور شفقت کی وجہ سے وہ مال محتاجوں' مسکینوں اور یتیموں پر خرچ کرے۔ پس صبر بمنزلہ رکاوٹ کو دُور کرنے کے ہے کیونکہ حرص جو کہ مال خرچ کرنے سے روکنے والی ہے' صبر کی وجہ سے دُور ہوتی ہے اور رحمت اور شفقت بمنزلہ مقتضا کے پائے جانے کے ہے کیونکہ یہ صفت حضرت ربوبیت کے اخلاق سے ہے اور ربوبیت احسان اور پرورش کا تقاضا کرتی ہے اور چونکہ رکاوٹ کو دُور کرنے والا مقتضا کے پائے جانے سے پہلے ہے اس لیے صبر کو ذکر کرنے میں رحمت سے پہلے لایا گیا۔

یہاں یہ بھی جاننا چاہیے کہ جاہلوں کے ذہنوں میں اکثر اوقات دل کی سختی صبر کے ساتھ مشتبہ ہو جاتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ مصیبت اور سختی میں مخلوقِ خدا کا بے تاب ہونا اور بے چینی کا اظہار کرنا صبر کے منافی ہے اور اسی خیالِ فاسد کی وجہ سے وہ اپنے رشتے داروں اور دوسری مخلوقِ خدا کی مدد کرنے سے محروم رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس وہم کو دُور کرنے کے لیے صبر کی وصیت کے رحمت کی وصیت کو ملا کر بیان فرمایا تا کہ اس بات کا اشارہ ہو کہ استقلال اور ثابت قدمی وہاں قابلِ تعریف ہے جہاں اللہ تعالیٰ کے بندوں میں سے کسی بندے کو نقصان پہنچنے کا گمان نہ ہو ورنہ

اگر بینم کہ نابینا و چاہ است
اگر خاموش بنشینم گناہ است

یعنی اگر مجھے نظر آ رہا ہے کہ اندھا ہے اور اس کے آگے کنواں ہے اب اگر میں چپ رہوں تو گناہ ہے۔ اسی لیے عرب کے بزرگوں نے اپنی مثالوں میں کہا ہے کہ صبرك فی مصیبتك خیر من جزعك وجزعك فی مصیبة اخیك خیر من صبرك یعنی اپنی مصیبت میں صبر کرنا گھبرانے سے بہتر ہے اور اپنے بھائی کی مصیبت میں گھبرانا صبر سے بہتر

ہے۔

اُولٰٓئِكَ اَصۡحٰبُ الۡمَيۡمَنَةِ وہ لوگ جو کہ ایک دوسرے کو یہ وصیتیں کرتے اور اس کے مطابق عمل کرتے ہیں' وہی برکت والے ہیں اس لیے کہ یمن اور برکت کا معنی یہ ہے کہ کسی چیز سے ہمیشہ کافی نفع حاصل ہو اور ان لوگوں سے ان وصیتوں کی وجہ سے جن پر کہ لوگ قیامت تک عمل کرتے ہیں' بے شمار فقراء اور مساکین اور یتیموں پر قیامت تک احسان رائج اور قائم رہتا ہے اور مخلوقِ خدا کو ہمیشہ کے لیے بے پناہ نفع پہنچتا ہے اور خود ان کے لیے ان تمام احسانات کا ثواب ان کے اعمال ناموں میں درج ہوتا ہے۔

اور بعض مفسرین نے میمنہ کو دائیں طرف پر محمول کیا ہے اس لیے کہ عرب کے عرف میں دائیں طرف کو میمون و مبارک جانتے تھے اور اسی لیے وہ دائیں طرف سے چلنے والی ہوا کو متبرک سمجھتے تھے اور بائیں جانب کو منحوس خیال کرتے تھے اس لیے اس سمت کی ہوا سے بدشگونی لیتے اور میثاق کے دن اہلِ نجات کو حضرت آدم علیہ السلام کی پشت کی دائیں سمت سے نکالا گیا اور قیامت کے دن اعمال نامے ان کے دائیں ہاتھوں میں دیئے جائیں گے اور انہیں جنت میں داخل کریں گے جو کہ اس دن عرشِ عظیم کی دائیں جانب ہوگی تو اس معنی کے اعتبار سے بھی اصحاب المیمنہ یہی بزرگوار ہیں۔

وَالَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا بِاٰيٰتِنَا اور جنہوں نے ہمارے احکام کا انکار کیا اگرچہ اپنی فاسد نیتوں' دنیوی مقاصد یا اپنے بتوں اور معبودانِ باطلہ کی خوشنودی کی خاطر انہوں نے گردنیں آزاد کی ہوں' یتیموں اور مسکینوں کو کھانا کھلایا اور ایک دوسرے کو صبر اور رحمت کی وصیت کی ہو لیکن ان کے کفر کی نحوست کی وجہ سے انہیں کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔

هُمۡ اَصۡحٰبُ الۡمَشۡـَٔمَةِ وہی نحوست اور ذلت والے ہیں کہ انہیں ایک کلمۂ کفر کی وجہ سے دائمی عظیم نقصان نصیب ہوا۔ اور ان کی تمام نیکیاں اور اچھائیاں برباد ہوگئیں۔ تو تمام مالی عبادتوں کے ساتھ کفر کے مقابلے سے پتہ چلا کہ وہ تمام مالی عبادات جب کفر کے ساتھ ملی ہوئی ہوں تو بالکل بے فائدہ اور بے ہودہ ہیں' فخر اور مسرت کا مقام نہیں اور کفار جس طرح نحوست اور رسوائی والے ہیں اسی طرح میثاق کے دن حضرت آدم علیہ السلام کی پشت

کی بائیں سمت سے باہر آئے اور قیامت کے دن اپنے اعمال نامے بائیں ہاتھوں میں پائیں گے اور عرشِ عظیم کی بائیں جانب جو کہ جہنم کی راہ ہے' روانہ ہوں گے تو اگر مشئمہ کو بائیں کے معنی میں لیا جائے تب بھی درست ہے اور جب اس قدر بیان ہو چکا کہ کافر کو کسی کام سے بھی فخر نہیں اس لیے کہ اسے ذلیل ورسوا کرنے کے لیے اس کا کفر ہی کافی ہے اب بیان فرمایا جارہا ہے کہ ان کے بارے میں اسی ذلیل ورسوا کرنے پر ہی اکتفاء نہ ہوگا بلکہ

عَلَيْهِمْ نَارٌ مُّؤْصَدَةٌ ان پر ایسی آگ مسلط ہوگی جو کہ سرپوش کر دی جائے گی اور اس کے دروازے بالکل بند تاکہ اس کی گرمی کا کوئی گرم سانس باہر نہ آئے اور باہر کی سردی سے ٹھنڈا سانس اندر نہ پہنچے کہ کچھ تخفیف حاصل ہو اور اس وقت ان کی مشقت اور تکلیف انتہا کو پہنچے' ہم دوزخیوں کے حال سے اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔

سورۃ والشمس

سورۂ والشمس مکی ہے' اس کی پندرہ (۱۵) آیات' چون (۵۴) کلمات اور دو سو چھیالیس (۲۴۶) حروف ہیں۔

گزشتہ سورۃ کے رابطے کی وجہ

اور سورۃ لااقسم کے ساتھ اس سورۃ کے رابطے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں خیر وشر کی راہ کی ہدایت کا ذکر ہے کہ هَدَيْنَاهُ النَّجْدَيْنِ جس طرح کہ یہاں فجور وتقویٰ کے الہام کا بیان ہے۔ نیز وہاں اصحاب میمنہ اور اصحاب مشئمہ کا بیان ہے جیسا کہ یہاں تزکیہ نفس اور تذلیل نفس والوں کا بیان ہے اور دونوں مضامین ایک دوسرے کے قریب ہیں۔

وجہ تسمیہ

اور اس سورۃ کا نام والشمس اس لیے رکھا گیا ہے کہ راہِ خداوندی کے سالک کو جو عمدہ چیز درکار ہے' آفتابِ نبوت کی شعاع ہے جس کی وجہ سے اس کی بصیرت کی آنکھ راہِ نجات اور راہِ ہلاک کے درمیان تمیز کرتی ہے اور دوست کا دشمن سے امتیاز کرتی ہے اور مخالف اور موافق میں فرق کرتی ہے۔

آفتابِ نبوت کی سورج کے ساتھ مناسبت کا بیان

آفتابِ نبوت حسی انوار کی دنیا میں آفتاب کے ساتھ جسے لغتِ عرب میں شمس کہتے ہیں' کمال مناسبت رکھتا ہے اور اس ابہام کی وضاحت یہ ہے کہ دنیا میں جو کہ آخرت کی کھیتی ہے' نفسِ انسانی بمنزلہ ایک مزارع کے ہے جسے معرفتِ الٰہی کا بیج دے کر اور اس بیج کی کاشت کے آلات جو کہ قوتیں اور اعضاء ہیں' عطا فرما کر اس کھیتی میں بھیجا گیا ہے' ہر مزارع کے لیے چھ چیزوں کے بغیر چارہ نہیں کہ ان کے بغیر زراعت کا عمل ممکن نہیں۔

سب سے پہلی چیز آفتاب ہے جس کی شعاعوں سے زمین کی اصلاح ہوتی ہے اور زمین کے باطن میں گرمی پیدا ہوتی ہے اور اس گرمی کی وجہ سے نشوونما کی قوت جوش مارتی ہے اور اگر غور کریں تو زراعت کے بارے میں آفتاب' حیوانات کے بارے میں حرارت غریزی کے قائم مقام ہے اس لیے کہ جب بیج کو زمین میں رکھا جاتا ہے تو خاک' ہوا اور پانی تینوں مل کر حیات نباتی یعنی اُگنے کی صلاحیت پیدا کرتے ہیں۔ لیکن پکانے اور بدبودار کرنے کے لیے حرارت درکار ہے۔ اگر حرارت آگ کے عنصر سے لیں تو بیج جل جائے' ناچار حکمتِ الٰہی نے تقاضا فرمایا کہ اس پر آفتاب کی حرارت کو مسلط کیا جائے تا کہ آگ والا فائدہ حاصل ہو اور اس کا نقصان ختم ہو جائے۔ نیز موسموں کی تبدیلی' بہار اور موسمِ سرما کا آنا آفتاب کی حرکت کی وجہ سے ہے اور عمل زراعت کے لیے موسم کا آنا ضروری ہے۔ حاصلِ کلام یہ ہے کہ زراعت کی ابتدا سے لے کر اس کی انتہا تک آفتاب کے فائدے زراعت کا علم رکھنے والے پر پوشیدہ نہیں ہیں۔

دوسری چیز چاند ہے کیونکہ دانہ اور میوہ بننے اور اس کے زمین سے اونچا ہونے کے وقت پانی کی رطوبت کافی نہیں ہوتی۔ پس اوپر کی طرف ایک اور رطوبت چاہیے تا کہ میوہ اور دانہ پُر مغز اور موٹا پیدا ہو اس اعتبار سے دانہ اور میوہ بننے کے وقت چاند کی چاندنی سے گریز نہیں جیسا کہ یہ معنی بھی زراعت پیشہ لوگوں پر ظاہر اور روشن ہے۔

تیسری چیز دن جو کہ تلاش' محنت' ہل چلانے' پانی کھینچنے اور دیگر اعمال اور مصروفیات کا وقت ہے۔

چوتھی چیز' رات کیونکہ اگر رات نہ آئے' آدمی اور بیل آرام نہ پائیں اور سورج کی

شعاعوں کے ہمیشہ اثر کرنے سے کھیتیوں اور پھل اور درختوں کو جلانے تک نوبت جا پہنچے اور شبنم جو کہ تازگی اور سرسبزی کا باعث ہے' مہیا نہ ہو۔

پانچویں چیز' آسمان کہ بارش کا اُترنا اور ہواؤں کا چلنا ہر وقت کی ضرورت کے مطابق اسی جہت سے ہے۔

چھٹی چیز' وسیع اور فراخ زمین جو کہ کلر شور اور سنگلاخ نہ ہو اور ان دو چیزوں کی طرف کاشت کار کا محتاج ہونا اظہر من الشمس ہے۔

اور چونکہ نفسِ انسانی کو دنیا کی کھیتی میں مزارع بنا کر بھیجا گیا ہے' اسے بھی ان چیزوں کے بغیر چارہ نہیں۔

ایک ایسا آفتاب جو اس کے کام آئے' اپنے زمانے کے نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کا قلب مقدس ہے جس کی شعاعیں دُور و نزدیک تک پہنچتی ہیں اور وہ چاند جو اسے کام دے' اپنے صاحبِ طریقہ کا نورِ ولایت ہے اور جس طرح حسی چاند حسی سورج کا خلیفہ ہے اسی طرح نورِ ولایت نورِ نبوت کے قائم مقام ہے۔

بلکہ حقیقت میں وہی نور ہے جس کی کیفیت دوسری ہے۔

نورِ نبوت اور نورِ ولایت کی کیفیت میں فرق

اور اگر دونوں کیفیتوں کے درمیان فرق مطلوب ہو تو سننا چاہیے کہ نورِ نبوت غلبے اور حکمرانی کے ساتھ ملا ہوا ہے اسی لیے انبیاء علیہم السلام اپنی اُمتوں پر وہی حکم رکھتے ہیں جو بادشاہوں کا حکم رعایا پر ہے۔ اور ان سب پر ان کی اطاعت فرض اور واجب ہے۔ جن کی طرف انہیں بھیجا گیا ہے اور ان کی مخالفت ہمیشہ کی تباہی اور خسارے کا موجب ہے اور ان کی طرف سے معجزات قاہرہ کا ظاہر ہونا اور زبان اور تلوار اور نیزے کے ساتھ جہاد کرنا لازم اور یقینی ہے جبکہ نورِ ولایت نورِ جمال ہے اور اُلفت دِلانے' مائل کرنے اور کھینچنے کا نور ہے لہٰذا اس میں یہ چیزیں ضروری نہیں ہیں اور کیا ہی اچھا کہا گیا ہے۔

آں بادۂ شعلہ گوں کہ وارد خورشید
در کاسۂ ماہ چوں رسد شیر شود

یعنی وہ شعلوں جیسی شراب جو کہ سورج میں ہے جب چاند کے پیالے میں پہنچتی ہے' دودھ بن جاتی ہے۔

نیز دونوں نوروں میں اصل اور ظل ہونے کا فرق ہے کہ سورج کا نور اس کا ذاتی ہے جبکہ چاند کا نور اس کے جسم کے صیقل ہونے اور اس کے پیچھے اس میں سورج کی شعاعوں کے چمکنے کی وجہ سے ہے۔ اسی لیے مقابل ہونے اور قریب ہونے اور تربیع یعنی ہلال اور بدر کی درمیانی رات کی حالت میں مختلف اور بدلا ہوا نظر آتا ہے۔ اسی طرح نورِ نبوت اصلی ہے اور نورِ ولایت ظلی یعنی اس کا سایہ

اور جو دن سالک طریقت اور مزارع آخرت کو درکار ہے' کمائی' فیض حاصل کرنے اور ریاضت کرنے کا وہ وقت ہے جس میں نورِ نبوت اور نورِ ولایت کو کوشش' تلاش اور کدوکاوش کے ساتھ کام میں لاتا ہے۔ اور جو رات اس کے لیے مفید ہے اس کے فطری تقاضوں' راحت' اپنی ضروریات اور اہل و عیال اور دوسری مخلوق کے حقوق کی ادائیگی میں مصروفیت کے اوقات ہیں اور اگر اس کے لیے یہ رات نہ ہو تو نورِ نبوت اور نورِ ولایت کا اس کے دل پر ہمیشہ جلوہ ریز ہونا اسے دنیوی کام کاج سے معطل کردے اور اس سے لوازم انسانیت علیحدہ ہو جائیں۔

اور اسے جو آسمان درکار ہے' آسمانِ شریعت ہے جو کہ تمام اعمال' اخلاق' احوال' مقامات' عقائد اور مذاہب کو محیط ہے اور وہیں سے رحمتِ الٰہی کا فیض بارش کی طرح اس پر برستا ہے اور جذب وکشش کی ہوائیں چلتی ہیں اور اسے مختلف حالات کے ساتھ نشیب و فراز دیتی ہیں تاکہ اپنے کمال کی حد تک پہنچ جائے۔

اور اس کی زمین اس کی استعداد کی زمین ہے جس کی فراخی اور صفائی کے اندازے کے مطابق اسے احوال اور مقامات کی نشوونما میسر آتی ہے اور جب ان امور میں سے عمدہ اور اس روحانی پروگرام کی بنیاد نورِ نبوت ہے تو اس سورۃ کو جو کہ سلوک طریقت اور کمال معرفت کی زراعت کے لوازم کے بیان میں ہے' آفتاب کے ذکر سے شروع فرمایا گیا جو کہ اس کے مناسب ہے اور اس سورۃ کو اسی نام سے موسوم کردیا گیا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالشَّمْسِ مجھے آفتاب کی قسم ہے جو کہ وقت کے نبی علیہ السلام کے دل کی مثال ہے۔
وَضُحٰهَا اور اس کی شعاع کی قسم جو کہ تمام مخلوقات پر نورِ نبوت چمکنے کی مثال ہے۔
وَالْقَمَرِ اور مجھے چاند کی قسم ہے جو کہ صاحبِ طریقہ مرشد کی مثال ہے اور نبی علیہ السلام کے تشریف لے جانے کے بعد ان کے خلیفے کی مثال ہے۔ اِذَا تَلٰهَا جب وہ آفتاب کی پیروی کرے اور یہ شرط اس لیے لائی گئی ہے کہ مرشد کی آبرو نورِ نبوت کی پیروی کے ساتھ مشروط ہے اور کمال اتباع کی وجہ سے اسے منصب خلافت نصیب ہوا۔
اور چاند کا سورج کی پیروی کرنا چند وجہ کے ساتھ ہے۔ پہلی وجہ نور کا استفادہ کرنے میں' دوسری وجہ غروب میں اس کی پیروی اور وہ مہینے کی ابتدا میں ہوتی ہے' تیسری وجہ طلوع میں اس کی پیروی اور وہ مہینے کے وسط میں ہوتی ہے' چوتھی وجہ حسن ظاہر کے اعتبار سے جسم کے بڑے ہونے میں پیروی کیونکہ چاند کے سوا کوئی ستارہ حسن میں سورج کی برابری نہیں کرتا اگرچہ طول وعرض اور گہرائی کے دلائل کے مطابق بڑا ہو۔ پانچویں وجہ اس جہان کی مصلحتوں کے اس کی حرکت کے ساتھ وابستہ ہونے میں پیروی کیونکہ ظاہر ہے کہ سال کے موسموں کا بدلنا' پورے سال کے ساتھ متعلق حساب اور دوسرے بڑے بڑے کام آفتاب کی حرکت سے وابستہ ہیں اور ماہانہ صورتوں کا بدلنا اور مہینے کے ساتھ متعلق حساب ماہتاب کی حرکت کے ساتھ مربوط ہیں اور ان گرم بیماریوں کا بخار' حیوانات کے دماغوں میں رطوبتوں کی زیادتی' ہڈیوں کے مغز' دودھ والے جانوروں کا دودھ' بدن میں خون کا جوش مارنا اور سمندر کا مدوجذر سب کا سب چاند کے نور کی زیادتی کے ساتھ وابستہ ہے۔
وَالنَّهَارِ اِذَا جَلّٰهَا مجھے دن کی قسم ہے جب اس آفتاب کو روشن کر دے جو کہ سالک کی ریاضت کے وقت کی مثال ہے اور یہاں بھی ایک شرط زیادہ کی گئی ہے کہ تاکہ اس بات کا پتہ چلے کہ ریاضت کا وقت اسی وقت عزت اور بزرگی پیدا کرتا ہے جب اس ریاضت کی وجہ سے سالک کے دل پر نورِ نبوت جلوہ فگن ہو اور حجاب اُٹھ جائیں ورنہ جوگیوں اور دوسرے مذاہب باطلہ والوں کی جھوٹی ریاضتیں جن کی وجہ سے نورِ نبوت جلوہ فگن نہیں ہوتا اور درمیان

سے پردہ نہیں اُٹھتا' کوئی عزت اور بزرگی عطا نہیں کرتیں۔

ایک شبہ اور اس کا حل

یہاں اکثر مفسرین شبہ وارد کرتے ہیں کہ دن کو روشن کرنا آفتاب کا کام ہے نہ کہ آفتاب کو روشن کرنا دن کا کام ہے تو یہاں یہ ترکیب اُلٹی کیوں لائی گئی حتیٰ کہ بعض مفسرین نے اس شبہ کی قوت پر نظر رکھتے ہوئے ضمیر کو آفتاب سے پھیر کر زمین کی طرف لوٹایا ہے اور اضمار قبل الذکر لازم آنے سے مرجع پر دلالت کرنے والے قرائن ذکر کے جان چھڑائی۔

اور حق یہ ہے کہ ضمائر کو منتشر کرنا اچھا نہیں کیونکہ ضحٰھا اور تلاھا کی ضمیر بلاشبہ آفتاب کی طرف لوٹتی ہے اور ذکر شدہ مرجع کے ہوتے ہوئے محذوف مرجع کی طرف لوٹنا ممکن نہیں لیکن اس ترکیب کی وجہ کو سننا چاہیے جو کہ بظاہر اُلٹی نظر آتی ہے۔ وہم کی عادت ہے کہ جب کسی چیز کو وقتِ مقرر میں دیکھتا ہے اور یہ دیکھنا بار بار ہو تو اس وقت کے آنے کو اس چیز کا سبب سمجھتا ہے اور عقلی قانون کے مطابق بھی اثر کا پایا جانا مؤثر کے پائے جانے کی دلیل ہے جیسا کہ برہانِ انی کی بحث میں طے شدہ ہے۔ تو جب عقلی اور وہمی دونوں وجہ سے زمانہ آفتاب کو جلوہ گر کرتا ہے تو اس کی طرف نسبت کر دی گئی اور یہ مجاز جو یہاں لایا گیا ممثل لہ کی حقیقت پر نظر کرتے ہوئے جو کہ ریاضت کا وقت ہے اور نورِ نبوت کے جلوہ گر کرنے کا موجب ہے۔ حقیقت استعمال کرنے سے بہتر ہے اور احتمال ہے کہ اِذَا جَلّٰهَا کا معنی یہ ہو کہ اس دن کوئی بادل اور غبار حائل نہ ہو اس صورت میں روشن کرنے کی نسبت دن کی طرف کرنا بلاتکلف درست قرار پاتا ہے۔

وَالَّيْلِ اِذَا يَغْشٰهَا اور مجھے رات کی قسم جب کہ آفتاب کو ڈھانپ لیتی ہے جو کہ راحت اور اہل و عیال کے حقوق کی ادائیگی کے وقت اور غفلت اور نورِ نبوت سے پردے میں ہونے کے وقت کی مثل ہے۔ اور یہ بھی آخرت کے مزارع اور طریقت کے سالک کے لیے ضروری ہے ورنہ جہانِ دنیا دگرگوں ہو جائے اور ان عبادات سے جو کہ حقوق خلق کے ساتھ متعلق ہیں جیسے بیمار پرسی' رشتے داروں کی ملاقات اور اہل و عیال کے لیے روزی کمانا وغیرہ سے محرومی رہے اور آخرت کی کھیتی کے نقصان کا باعث ہو۔

حدیث صحیح میں وارد ہے کہ حضرت امیرالمومنین ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ایک دن حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی محفلِ مقدس سے اُٹھ کر اپنے گھر جا رہے تھے کہ اچانک راستے میں حنظلہ نامی ایک صحابی سے ملاقات ہوگئی اور اس نے بلند آواز سے کہا کہ حنظلہ منافق ہوگیا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پوچھا کہ کیا بات ہے؟ اس نے کہا کہ جب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے نورانی دربار میں ہوتا ہوں تو عالمِ غیب اس طرح واضح ہوتا ہے کہ گویا سر کی آنکھوں سے دیکھ رہا ہوں اور جب اس محفلِ مقدس سے اُٹھ کر اپنے گھر جاتا ہوں اور اہل وعیال میں گھل مل جاتا ہوں تو وہ کیفیت باقی نہیں رہتی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ یہ حالت تو ہر کسی کو لاحق ہے۔ آیئے تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہو کر عرض کریں' دونوں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بارگاہ بے کس پناہ میں حاضر آئے اور حنظلہ نے اسی انداز میں بلند آواز سے عرض کی کہ حنظلہ منافق ہوگیا۔ سرکار علیہ السلام کے پوچھنے پر سارا ماجرا بیان کر دیا۔ آپ نے فرمایا اگر تمہاری وہ حالت دائمی رہے جو کہ میری بارگاہ میں یا ذکر کی محفلوں میں رونما ہوتی ہے تو کبھی بھی اہلِ خانہ سے لذت حاصل نہ کرو اور جنگل میں نکل کر نعرے لگاتے رہو اور فرشتے تمہارے ساتھ مصافحہ کریں لیکن یہ حالت کسی کے لیے دائمی نہیں ہوتی بلکہ ایک ساعت اس حالت میں گزرتی ہے اور ایک ساعت غفلت میں تاکہ توجہ بحق اور توجہ بخلق دونوں کا انتظام ہو۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ غفلت اور راحت کے اوقات کی بھی وقعت ہے کہ آئندہ ریاضت میں امداد کرتے ہیں اور ان عبادات کا ثواب حاصل کرنے کا باعث بھی ہوتے ہیں، جو کہ حقوقِ خلق سے متعلق ہیں۔ چنانچہ حضرت معاذ بن جبل رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ انی لاحتسب نومتی کما احتسب قومتی یعنی میں اپنی نیندیں بھی اجر وثواب کی توقع رکھتا ہوں جیسا کہ اپنی تہجد میں۔ کیونکہ اگر تہجد حضرت خالق جل وعلا کے حق کی ادائیگی ہے تو نیند بھی حق نفس کی ادائیگی ہے اور دونوں حقوق اللہ کے واجب قرار دینے کی وجہ سے واجب ہیں۔ ہاں جو غفلت کہ نیکی پر امداد نہ کرے اور حکم شریعت اور فرمانِ الٰہی کی تعمیل کی نیت کے ساتھ نہ ہوں' وہ غفلت کوئی وقعت نہیں رکھتی بلکہ مطلقاً حرام ہے اور یہاں سے معلوم ہوا کہ

درحقیقت یہ چاروں قسمیں آفتاب کے ساتھ متعلق ہیں اسی لیے اس سورۃ کا نام آفتاب رکھا گیا ہے۔

وَالسَّمَآءِ وَمَا بَنٰھَا اور مجھے آسمان کی قسم ہے اور اس حکمتِ الٰہی کی جس نے اسے ہر اس چیز پر محیط بنایا ہے جو اس کے پیٹ میں ہے اور یہ شریعت کی مثال ہے جو کہ آسمان کی طرح مکلفین کے تمام اعمال کو محیط ہے اور اس میں ہر عمل کا حکم موجود ہے۔ اور اس میں آسمان کی طرح چار مثلثوں کے ضمن میں بارہ برج ہیں۔ پہلا مثلثہ جو کہ اعتقاد کا مثلثہ ہے' تین برجوں پر مشتمل ہے۔ برج ذات وصفات' برج انبیاء علیہم السلام وملائکۃ وکتب اور برج آخرت۔ دوسرا مثلثہ جو کہ مثلثہ عبادات ہے' تین برجوں پر مشتمل ہے۔ بدنی عبادات کا برج جیسے نماز' روزہ' تلاوتِ قرآنِ مجید' اذکار' دعائیں اور درود وسلام' مالی عبادات کا برج جیسے زکوٰۃ' صدقات' وقف اور مسجدیں' سرائیں' مدرسے' کنویں' پل اور مہمان خانے بنانا اور بدنی اور مالی سے مرکب عبادات کا برج جیسے حج وعمرہ' جہاد' عیدیں قائم کرنا۔

اور تیسرا مثلثہ معاملات کا مثلثہ ہے' وہ بھی تین برجوں پر مشتمل ہے' وہ معاملات جو کہ ایک وجہ سے عبادت بھی ہیں جیسے نکاح' خدمتِ والدین' پرورشِ اولاد اور غلاموں' ہمسایوں' ہم نشینوں' مہمانوں اور دوسرے رشتے داروں کے حقوق کی رعایت کرنا اور وہ معاملات جو کہ عبادات کی کوئی وجہ نہیں رکھتے جیسے خرید وفروخت' اجارہ' رہن' شرکت' وکالت اور کفالت و غیر ذالک اور وہ معاملات جن میں نیکی اور احسان کی وجہ بھی ملی ہوئی ہے جیسے ہبہ کرنا' قرض لینا' قرض دینا اور مضاربت

اور چوتھا مثلثہ جو کہ سیاست کا مثلثہ ہے' یہی تین برجوں پر مشتمل ہے۔ کفارات جو کہ سیاست کے ساتھ ایک جہت عبادات کی بھی رکھتے ہیں جیسے قسم کا کفارہ' قتلِ نفس کا کفارہ' روزہ توڑنے کا کفارہ' ظہار کرنے کا کفارہ' حالتِ حیض میں جماع کرنا وغیرہ اور تعزیرات۔ اور قصاص کی حدود جو کہ صرف سیاست ہیں جیسے زنا کی حد' شراب پینے کی حد' ڈکیتی کی حد' گالی دینے کی حد وغیرہ۔ اور خون بہا اور متعلقات کی ضمانت کہ سیاست کے ساتھ ایک جہت معاملے کی بھی رکھتے ہیں۔

نیز اس میں ستارے بھی ہیں جو کہ احکام کے دلائل ہیں' ان میں سے سات ستارے گردش کرنے والے ہیں کہ احکام کی قسموں میں گھومتے ہیں۔ کتاب' سنت' اجماع' قیاس' استصحاب' تعامل اور اباحت اصلیہ اور باقی ستارے ثابت ہیں کہ اپنی جگہوں میں قائم ہیں جیسے جزوی مصلحتیں جو کہ ہر فرد میں پائی جاتی ہیں۔

اور اس آسمان کی تعمیر جو کہ شریعت سے عبارت ہے اس طرح واقع ہوئی ہے کہ جہاں بھی مکلفین اس کے تقاضے کے پابند ہوں' ان کے اچھے اعمال قبولیت کے مقام تک پہنچ جائیں اور اس طرف سے وہ قبولیت رحمت و ہدایت کی صورت پکڑ کر بارش کی طرح برسے جیسا کہ بخارات جو کہ زمین سے اُٹھتے ہیں اور آسمان پر جا کر پانی کی شکل اختیار کر کے واپس لوٹتے ہیں اور کھیتی کے سرسبز اور شاداب ہونے کا ذریعہ بنتے ہیں۔

وَالْاَرْضِ وَمَا طَحٰىهَا اور مجھے زمین کی قسم اور اس حکمتِ الٰہی کی جس نے اسے وسیع اور فراخ کر کے بچھایا ہے اور وہ نفسِ انسانی کی استعداد کی مثال ہے جو کہ وسعت کی بناء پر تخم معرفت بونے کے قابل ہے اور جب عالم حسن میں نفسِ انسانی کی کوئی شبیہہ اور نظیر جو کہ قابلِ تعظیم ہو اور اس کی قسم اُٹھائی جائے' پائی نہیں جاتی خود اس نفس کی قسم اُٹھا کر فرمایا جا رہا ہے

وَنَفْسٍ مجھے نفس کی قسم ہے جس میں دو چیزیں ہیں' اوّل کسب کمال کی صلاحیت اور دوسری چیز کمال کا بالفعل فقدان کہ ان دو چیزوں کی وجہ سے اسے تخم معرفت کی کاشت میسر آئے اور وہ انسانی نفس ہے اس لیے کہ نفوس ملائکہ اپنے کمالات بالفعل حاصل رکھتے ہیں' انہیں کمال حاصل کرنے کی ضرورت نہیں اور نفوس حیوانی کسب کمال کی صلاحیت نہیں رکھتے۔ پس ان سے تخم معرفت کی کاشت ممکن نہیں اور اسی نکتے کے لیے نفس کو نکرہ لایا گیا تاکہ نفوس کی انواع میں سے ایک نوع پر دلالت کرے۔ بخلاف دوسری قسموں کے کہ انہیں معرفہ لایا گیا ہے اس لیے کہ ان سب چیزوں کا ایک رنگ ہے' ان میں نوع کے متعدد ہونے کا تصور نہیں ہے کیونکہ آفتاب' ماہتاب' آسمان اور زمین فردِ واحد میں منحصر کلیات ہیں اور دن رات اگرچہ عقلی استدلال کے مطابق متعدد معلوم ہوتے ہیں لیکن عرف کی تحقیق ان کے اعادہ اور

تکرار کا حکم دیتی ہے' متعدد ہونے پر یقین نہیں کرتی۔

وَمَا سَوّٰاهَا اور مجھے اس حکمتِ الٰہی کی قسم ہے جس نے اس نفس کو درست بنایا ہے اور اسے مزاج کا اعتدال' ظاہری باطن حواس' طبعی' حیوانی اور نفسانی قوتیں سب کچھ عطا فرمایا تاکہ پڑھانے اور سمجھانے کے لائق ہو جائے اور مشقت طلب اعمال' صبر اور ثابت قدمی کا متحمل ہو اور ان آلات کے ساتھ تخم معرفت کی کاشت کر سکے۔

اور بعض مفسرین نے نفسِ انسانی کے سوا ان چھ قسموں کی تخصیص کی وجہ میں یوں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس سورۃ میں نفسِ انسانی کا حال اور فجور و تقویٰ کے الہام کو قبول کرنے میں اس کا اختلاف بیان کرنا اور اس کی وسعت اور فراخی کا ذکر کرنا منظور ہے تاکہ قوتِ عملیہ کے مطابق تمام جہان کا نمونہ بن جائے اور سارا جہان اپنے ظلی وجود کے ساتھ اس میں نہ سمائے اور اپنی قوتِ عملیہ کے مطابق حضرت ربوبیت کا خلیفہ ہو کہ مخلوقات میں سے ہر چیز کو ایک کام میں مصروف کر دے اور کاری گروں کو کام کرنے اور ذراتِ عالم میں سپرد کیے گئے منافع اور مصالح کو پورے طور پر حاصل کرنے کا قصد کرے۔ پس ابتدائے کلام میں چھ چیزوں کو قسم کے طور پر یاد فرمایا گیا کہ وہ چھ چیزیں اطلاق اور وسعت کے عموم میں حضرت الوہیت کا نمونہ ہیں۔

اجمال کی تفصیل

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کو جہان میں وہ وسعت اور فراخی عطا فرمائی ہے جو کسی چیز کو حاصل نہیں۔ ایک زمان' دوسرا مکان لیکن وسعتِ مکان کا رنگ اور ہے اور وسعتِ زمان کا رنگ جدا۔ مکان نے عرش سے لے کر فرش تک آن واحد میں بے شمار مخلوقات کو پکڑ رکھا ہے اور اپنے اندر جگہ دی ہے اور وہ خود ایک ہی وضع پر ثابت ہے اور اس کے اندر کی چیزیں گزر رہی ہیں' ایک چلا جاتا ہے' اس کی جگہ دوسرا آ جاتا ہے۔

اور زمان کا عموم اس طرح ہے کہ خود گزر رہا ہے جبکہ اس کے اندر کی چیزیں قائم ہیں اس کا ہر لمحہ اور ہر گھڑی قائم اور راسخ نہیں اور اس بے ثباتی کے باوجود اپنے اندر موجود بے حد و حساب چیزوں کو محیط اور قابو کیے ہوئے ہیں۔ عموم کی ان دونوں قسموں کو یاد دلانے کے

لیے آسمان اور زمین کو جو کہ عمدہ مکانات میں سے ہیں' ذکر فرمایا گیا ہے اور دن رات کو جو کہ ردوبدل کی مدت مختصر ہونے کے باوجود کھلا اختلاف اور واضح امتیاز رکھتے ہیں' زمان کے اجزا میں سے لایا گیا اور یہاں انوار کا فیض دینے میں عموم اطلاق کی ایک قسم ہے جو کہ ذلیل اور عزیز' غنی اور فقیر' مسلمان اور کافر' نیک اور بد کے درمیان فرق کیے بغیر واقع ہے اور وہ دربارِ الوہیت سے وجود اور نوعی صورتوں کے لوازمات کا فیض دینے کے ساتھ پوری مشابہت رکھتی ہے۔ آفتاب اور ماہتاب کو ذکر کر کے اس قسم کی مہک سمجھ دار لوگوں کے مشام تک پہنچائی گئی ہے۔

باقی رہ گئی یہ بات کہ عموم کی ان تینوں قسموں میں دو دو چیزوں کی قسم کیوں اُٹھائی گئی ہے اس کا جواب یہ ہے کہ عموم کا فائدہ دینے کے باوجود کمال ونقصان' نورانیت وظلمت اور اصلیت وتبعیت کا اختلاف بھی منظور ہے تا کہ ان صفات میں عموم تصرف کے باوجود نفوسِ انسانی کے اختلاف کا بھی پتہ دیا جائے اس مقصد کے لیے ضروری ہوا کہ تینوں قسموں میں دو دو چیزوں کا ذکر کیا جائے۔ عالمِ انوار میں آفتاب اصل ہے اور ماہتاب ظل' اجزائے زمان میں سے دن روشن ہے اور رات تاریک اور آسمان اونچا اور محیط اور زمین پست اور محاط ہے جب نفسِ انسانی کے عموم کو ان چیزوں کے عموم پر قیاس کریں تو اس کی دورنگی بھی ظاہر ہو جائے۔ چنانچہ فرمایا جارہا ہے

فَأَلْهَمَهَا فُجُورَهَا پس اس نفس کو اس کی بدکاری کا الہام کیا اور لغت میں الہام کسی شخص کے حلق میں کھانا ڈالنا ہے' اس کے بغیر کہ اس شخص کی طرف سے دانتوں کی حرکت واقع ہو' کسی چیز کے متعلق کہا جاتا ہے الہمتہ اے لتلعتہ میں نے اسے نگل لیا۔ الہمہ یعنی اس نے اسے نگل لیا اور قرآن پاک کے عرف میں کسی سابقہ غور وفکر کے بغیر کسی کے دل میں کسی کام کی خواہش ڈالنے سے عبارت ہے۔ اور چونکہ بنی آدم کے اچھے بُرے سب اعمال خواہش اور ارادہ کے تابع ہیں پس نیک وبد کی اہلیت اسی خواہش اور ارادے کے ساتھ وابستہ ہے اور اس اہلیت کو اپنے قبضے میں رکھا گیا ہے اور کسی دوسرے پر جیسے نفس' شیطان' مشیروں اور مصاحبوں پر نہیں چھوڑا گیا۔ ہاں یہ چیزیں عالمِ غیب سے نیک وبد کی خواہش

کے فیضان کا سبب تیار کرنے والی ہو جاتی ہیں اور اسی وجہ سے لوگ عتاب اور ملامت کا محل بنتے ہیں اور حدیث صحیح میں وارد ہے کہ ان قلوب بنی آدم بین اصبعین من اصابع الرحمن یقلبها کیف یشاء یعنی بنی آدم کے دل قدرت کی دو انگلیوں کے درمیان ہیں' انہیں جس طرف چاہے' پھیر دیتا ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اگر یہاں کسی کے دل میں شبہ گزرے کہ جب نیکی اور بدی کی خواہش ڈالنا اس طرف سے ہے تو جبر لازم آیا اور بے اختیاری ثابت ہو گئی۔ اور جزا دینے' نصیحت کرنے' ڈرانے اور رغبت دِلانے کا سب پروگرام دگرگوں ہو گیا اور انبیاء علیہم السلام کو بھیجنا' کتابیں نازل کرنا' قیامت قائم کرنے' حشر نشر' سوال اور حساب سب کا فائدہ ختم ہو گیا؟

اس کا جواب یہ ہے کہ جبر اس صورت میں لازم آتا ہے کہ درمیان میں ارادہ اور اختیار نہ ہو اور جہاں جو کچھ بھی کرایا جاتا ہے اس شخص کے ارادہ و اختیار سے کرایا جاتا ہے تو جبر کیوں لازم آئے؟ ہر کسی کے لیے اپنے اچھے بُرے اعمال میں جو کہ وہ اپنے ارادے اور اختیار سے کرتا ہے اور جمادات کی حرکات میں جیسے پانی کا بہنا' پتھر کا گرنا فرق بالکل ظاہر ہے۔ جبر یہ ہے نہ کہ وہ اور جزا دینے اور دوسرے مذکورہ امور کے لیے اختیار کا پایا جانا کافی ہے نہ یہ کہ اختیار بھی اپنے ہاتھ میں ہو اور جب بندے کی ذات نے دوسری جگہ سے قیام اور وجود پایا ہے تو اس کا اختیار کیوں اپنے پاس سے ہوگا کیونکہ صفت کا مرتبہ موصوف سے کم ہوتا ہے۔

فجور کا معنی

اور فجور کا معنی یہ ہے کہ آدمی کو تین قوتیں دی گئی ہیں۔ قوتِ عقلی جس کے ساتھ اچھے بُرے کو پہچانتا ہے' قوتِ شہوی جس کے ساتھ چیزوں میں رغبت کرتا ہے اور مرغوب چیزوں کو حاصل کرتا ہے اور قوتِ غضبی جس کے ساتھ مخالفت کرنے والے اور مزاحمت کرنے والے کو روکتا ہے جب یہ دونوں قوتیں یعنی شہوی اور غضبی قوتِ عقلی کے تابع ہو جائیں اور اس کی رہنمائی سے باہر نہ نکلیں اور وہ رغبت اور نفرت میں سے جس چیز کا حکم دے' بجا لائیں

اور جس کے ساتھ کہے' جنگ کریں اور مقابلہ کریں اور اس قوتِ عقلی کو نورِ شریعت کے ساتھ منور اور انبیاء علیہم السلام کی ہدایت کے ساتھ مزین کرے اور نیکی کو نیکی اور بُرائی کو بُرائی سمجھ کر ان دونوں قوتوں کو کام میں لگا دے تو اسے تقویٰ کا مقام حاصل ہو۔

اور اگر معاذ اللہ قوتِ عقلی نورِ شریعت کے ساتھ منور نہ ہوئی اور اس نے نیک کو بُرا اور بُرے کو نیک گمان کیا یا نورِ شریعت کے ساتھ منور ہونے کے باوجود اس کا حکم دونوں قوتوں پر جاری نہ ہوا اور ان دونوں قوتوں نے اس کی صوابدید پر عمل نہ کیا بلکہ اسے اپنا تابع کے جس چیز میں چاہا' رغبت کی اور جس سے چاہا' جھگڑا کیا تو فجور کا مرتبہ حاصل ہو گیا تو فجور کی حقیقت قوتِ شہویہ اور غضبیہ کو قوتِ عقلیہ پر غالب کرنا ہے۔

وَتَقْوٰهَا اور اس نفس کو تقویٰ کا الہام کیا اور حقیقت تقویٰ قوتِ عقلی کو قوتِ شہویہ اور غضبیہ پر غالب کرنا ہے اور جب قسمیں یاد کرنے سے فراغت ہوئی تو اس مضمون کو بیان فرمایا جا رہا ہے جس کے لیے قسمیں اُٹھائی گئی ہیں۔

قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا تحقیق اس نے چھٹکارا پایا جس نے اس نفس کو پاک کیا اور نفس کو پاک کرنا اسی طریقے سے ہے کہ قوتِ شہویہ اور غضبیہ کو عقل کے تابع کر دے اور عقل کو شرع کے تابع کر دے تا کہ روح اور قلب تجلی الٰہی کے نور سے روشن ہوں اور اس شخص کا مرتبہ فرشتوں کے مرتبے سے بلند تر ہے اس لیے کہ فرشتے صرف قوتِ عقلیہ رکھتے ہیں نہ قوتِ شہویہ اور نہ ہی قوتِ عقلیہ جبکہ اس شخص نے قوتِ شہویہ اور غضبیہ کو نیچا کر کے نورِ شرع سے روشن عقل کا خادم بن مجاہدے کا وہ مقام حاصل کر لیا جو کہ فرشتوں کو میسر نہیں ہے۔ نیز اس شخص کی شہوت اور غصہ شرع شریف کے تابع ہو کر ذوق' شوق' غیرتِ الٰہی اور دشمنانِ دین سے لڑائی کرنے کے ایسے عجیب حالات بروئے کار لاتے ہیں کہ فرشتوں کو ان میں سے کچھ بھی حاصل نہیں۔

اور تزکیۂ نفس کے بارے میں اصحابِ طریقت نے رسالے اور کتابیں تالیف کی ہیں جیسے قوت القلوب' احیاء العلوم' تعرف عوارف اور اس فن کی دوسری کتابیں۔ لیکن قرآن پاک سے جو کچھ معلوم ہوتا ہے' یہ ہے کہ بیس (۲۰) آیات میں بعض اچھے اعمال پر فلاح کا لفظ ذکر

کیا گیا ہے اور اس آیت میں فلاح کو تزکیہ کے ساتھ مربوط کیا گیا ہے۔ پس اس اشارے کے مطابق ان اعمال کو بجالانا تزکیۂ نفس کے لیے کافی ہے اور درحقیقت اہلِ طریقت کے رسائل اور کتابیں ان بیس (۲۰) آیات کی شرح اور تفصیل ہیں۔ وہ آیات سورۂ بقرہ اور سورۂ مومنون کے اوائل میں اور سورۂ روم' سورۂ توبہ اور دوسری سورتوں میں پھیلی ہوئی ہیں۔

وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا اور تحقیق وہ زیاں کار اور محروم رہا جس نے اس نفس کو گمنام کر دیا اور نفس کو گمنام کرنا یہ ہے کہ اس پر تجلی الٰہی کے نور کی چمک نہ پڑے اور یہ صورت شہوت اور غضب کے تقاضوں کو نورِ شرح سے روشن عقل کے تقاضوں پر ترجیح دینے کی وجہ سے حاصل ہوتی ہے۔ اور جب وہ اس نور سے محروم رہا تو اس کا مرتبہ حیوانات کے مرتبے سے گھٹ گیا اس لیے کہ حیوانات میں اس نور کو حاصل کرنے کے اسباب نہ تھے جبکہ اس شخص کے پاس سارے اسباب موجود تھے اور اس نے اسباب کے باوجود اسے حاصل نہ کیا بلکہ حجاب میں پڑ گیا جس کا اُٹھانا دشوار نہیں۔

اور چونکہ عوام الناس کے نزدیک شہوت وغضب کو عقل اور شرع کے تقاضوں پر غالب کرنا' نامرادی اور محرومی کا موجب نہیں ہے بلکہ اس قسم کے مواقع پر جرأت کرنا لذتیں حاصل کرنے میں کامیابی کا سبب شمار کرتے ہیں اور نام اور مرتبہ حاصل کرنے کے لیے مضبوط سبب سمجھتے ہیں اور اسی لیے کہا گیا ہے کہ من راقب الناس مات حما و فاز باللذات الحبور یعنی جو لوگوں کی نگہبانی کرے' بخار سے مرتا ہے اور خوش رہنے والا لذتیں حاصل کرنے میں کامیاب ہوتا ہے۔ نیز کہتے ہیں کہ الرزق یعطی باب عاقل قومه ویبیت بوابالباب الاحمق یعنی رزق قوم کے عقل مند کا دروازہ بھول جاتا ہے جبکہ احمق کے دروازے پر پہرے دار بن کر رات گزارتا ہے۔ اس بناء پر ضروری ہوا کہ قَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَا کے مضمون پر مثال اور گواہی لانے کے طریقے سے ایک واقعہ بیان کیا جائے تا کہ اس واقعہ سے واضح ہو جائے کہ شہوت اور غضب کو عقل وشرع پر غالب کرنا رفتہ رفتہ دین کی تکذیب اور انکار تک لے جاتا ہے اور ابدی ہلاکت کا سبب ہوتا ہے بلکہ بعض اوقات دنیوی ہلاکت بھی اس کا نتیجہ ہوتا ہے اب اس واقعہ کی طرف اشارہ فرمایا جا رہا ہے۔

كَذَّبَتْ ثَمُوْدُ بِطَغْوٰىهَآ ثمود نے اپنی سرکشی کی وجہ سے جو کہ شہوت وغضب کو شرع و عقل کے حکم پر ترجیح دینے سے عبارت ہے' نبی علیہ السلام اور حکمِ الٰہی کا انکار کیا اور یہ ترجیح ان کے حق میں انکار اور تکذیب کا سبب ہوئی۔

لفظ طغوی میں اشکال اور اس کا جواب

اور لفظ طغوی میں ایک مشہور اُلجھن ہے اس لیے کہ یہ طغیان سے مشتق ہے۔ پس چاہیے کہ طغیی ہو۔ یا کو واؤ کے ساتھ کیوں بدلا گیا۔ علماء نے اس اُلجھن کے جواب میں لکھا ہے کہ فعلی کبھی اسم ہوتا ہے اور کبھی صفت۔ اسم اور صفت میں فرق کرنے کے لیے اسم میں یا کو واؤ سے بدل دیتے ہیں اور صفت اپنی اصل پر رہتی ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں امرء ة صديا وخز یا یعنی ایک ورت ہے تشنہ اور رسوا۔

ثمود کا تعارف

اور ثمود حضرت نوح علیہ السلام کی اولاد سے ایک شخص کا نام ہے جو کہ عامر بن ارم بن سام بن نوح علیہ السلام کا بیٹا ہے اور چوتھی پشت میں حضرت نوح علیہ السلام تک پہنچتا ہے اس شخص کی اولاد فرقۂ عاد کی ہلاکت کے بعد عرب کے علاقوں میں پھیل گئی اور قابض ہوگئی اور ان کا وطن شام اور حجاز کے درمیان تھا جو شہر انہوں نے شام کی طرف بنایا اس کا نام حجر ہے اور جو حجاز کی طرف بنایا اس کا نام وادیٔ القریٰ ہے۔ ان دونوں شہروں کے درمیان بستیوں اور قصبوں سے سترہ سو (۱۷۰۰) آبادیاں ان کے قبضے میں تھیں اور انہوں نے ہر جگہ پتھر کے اونچے محلات تعمیر کر رکھے تھے' کاشت کاری کرتے تھے' چشمے کھودتے البتہ ان کی زمین میں پانی کم تھا' پتھریلی زمین ہونے کی وجہ سے کنویں اور چشمے بڑی مشکل سے کھودے جاتے تھے' اکثر اوقات اپنے مال پہاڑوں میں عمارتیں بنانے' باغ لگانے' نہریں' چشمے اور کنویں کھودنے میں خرچ کرتے۔ یہاں تک کہ ان کے سنگ تراش اور کاری گر پہاڑوں پر منقش عمارات تراشتے' رفتہ رفتہ پتھروں سے عجیب وغریب مورتیاں تراش کر ان میں مورتیوں کو پوجنے کا رواج ہو گیا اور بت پرستی پھیل گئی۔ اور حضرت حق جل شانہ سے بالکل بے خبر اور غافل ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ کی ہدایت نے حضرت صالح بن عبید کو چن لیا جو کہ شکل اور حسن کے اعتبار

سے بھی ان میں سے ممتاز اور جدا تھے اور حسب ونسب کے اعتبار سے بھی اور بچپنے سے ہی آپ سے ہدایت اور صلاحیت کے آثار ظاہر ہونا شروع ہو گئے یہاں تک وحی الٰہی پہنچی اور حکم ہوا کہ اپنی قوم کو بتوں کی پوجا سے منع کریں اور انہیں اللہ تعالیٰ کی عبادت میں مصروف کریں۔ اور ان تک اللہ تعالیٰ کے احکام پہنچائیں اور سمجھائیں کہ یہ تمام نعمتیں جو تمہیں حاصل ہیں' اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہیں' ان نعمتوں کا شکر ادا کرو اور سرکشی اور تکبر مت کرو۔

حضرت صالح علیہ السلام نے حکم الٰہی کی تعمیل میں انہیں دین کی طرف بلانے کا کام شروع فرما دیا۔ انہوں نے بالکل قبول نہ کیا اور حضرت صالح علیہ السلام سے معجزہ طلب کیا۔ آپ نے فرمایا کہ اگر میں تمہارے سامنے معجزہ ظاہر کر دوں اور تم مجھ پر ایمان نہ لاؤ تو سب کے سب عذاب خداوندی میں گرفتار ہو جاؤ گے۔ انہوں ن اس بات پر یقین نہ کیا اور کہنے لگے کہ ہم سال میں فلاں روز شہر سے باہر آتے ہیں اور اپنے بتوں کو بھی مکلّف پوشاک اور مرصع زیور سے آراستہ کر کے ظاہر کرتے ہیں۔ آپ بھی ہمارے ہمراہ چلیں۔ ہم اپنے بتوں سے سارے سال کی ضرورتیں اس روز طلب کرتے ہیں۔ وہ ہمیں دیتے ہیں۔ آپ بھی اپنے خدا سے کوئی حاجت طلب کریں۔ ہم دیکھیں گے کہ آپ کا خدا کیا دیتا ہے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے قبول فرما لیا اور ان کے ہمراہ باہر تشریف لائے اور وہ قلیل سی جماعت کے لوگ جو آپ پر ایمان لائے تھے' آپ کے پیچھے ہو لیے۔ جب عیدگاہ پہنچے' دیکھا کہ بتوں کو پورے تکلف اور آرائش کے ساتھ تختوں پر رکھ کر انہیں سامنے رکھا ہوا ہے اور پوری عاجزی اور ادب کے ساتھ ان کے سامنے کھڑے ہو کر اپنی حاجتیں پیش کر رہے ہیں۔ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ تم اپنے بتوں سے عادت کے خلاف چیز مانگو تا کہ میں دیکھوں کہ ان میں کیا طاقت ہے؟ انہوں نے اپنے بتوں سے خلاف عادت چیزیں مانگنا شروع کر دیں اور حد سے زیادہ آہ و فغاں کی' گلے پھاڑنے کے سوا انہیں کوئی فائدہ نہ ملا جب عاجز ہو گئے تو حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ تم جو کہو میں اپنے خدا تعالیٰ سے مانگوں' اس کی قدرت کا تماشا کرو۔ ان کے بڑے لیڈر نے جس کا نام جندع بن عمرو تھا' دوسروں سے کہا کہ انہیں ایسی بات کہو جو کہ عقل کی نظر میں محال ہو اور یہ ایسا کرنے سے عاجز ہو تا کہ

ہمارے بتوں کی عزت اور آبرو برقرار رہے ورنہ ہمیں خفت ہوگی اور الزام آئے گا۔

حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کا واقعہ

سب نے کہا کہ تو ہمارا سردار ہے اور تجھے عقل و دانش میں برتری حاصل ہے' سوچ کر ایسی چیز کی فرمائش کر کہ یہ عاجز ہو جائیں اور ایسا نہ کر سکیں۔ جندع نے حضرت صالح علیہ السلام سے کہا کہ آپ پہاڑ کے اس ٹیلے سے جو کہ عیدگاہ کے سامنے ہے اور اسے ان کے عرف میں کاثیہ کہتے تھے' ہمارے لیے اونٹنی نکالیں جس کی پیشانی سیاہ اور باقی جسم سفید ہو' اس کے بال لمبے ہوں ریشم سے پُر ہو اور دس ماہ کی امید سے ہو اس کا جسم اس قدر بڑا ہو کہ لوگوں کے دیکھنے میں اس پہاڑی ٹیلے کے برابر معلوم ہو' باہر آنے کے بعد ہمارے سامنے بچہ جنے جو کہ شکل' قد اور جثے کے بڑا ہونے میں اس کے برابر ہو۔ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ اگر میں اس قسم کی اونٹنی اس پہاڑی ٹیلے سے باہر نکال لوں تو کیا تم ایمان لاؤ گے اور اللہ تعالیٰ کے دین کی پیروی کرو گے؟ سب بولے کہ ہاں! حضرت صالح علیہ السلام ان سے تاکیدی عہد و پیمان اور مضبوط قول و قرار لے کر اور مسلمانوں کو اپنے ہمراہ لے کر اس پہاڑی ٹیلے کے پاس تشریف لے گئے' دو رکعت نماز ادا فرمائی اور بارگاہِ خداوندی میں دعا میں مصروف ہو گئے اور آپ نے مسلمانوں سے فرمایا کہ میرے پیچھے کھڑے ہو کر آمین' آمین کہتے رہو اور فرقہ' ثمود کے سردار اپنی افواج اور سپاہیوں سمیت ان کے اردگرد دائرہ باندھے دیکھ رہے تھے کہ کیا ہوتا ہے۔

اچانک قدرتِ الٰہی سے اس پہاڑی ٹیلے سے جانور کے رونے کی آواز سنائی دینے لگی جو کہ دردِ زہ کی حالت میں ہوتی ہے یہاں تک کہ وہ ٹیلا پھٹ گیا اور مذکورہ بالا صفات والی اونٹنی باہر نکل آئی اور اس نے جنگل میں چرنا شروع کر دیا۔ ایک ساعت کے بعد اسے دردِ زہ شروع ہو گیا اور بچہ بھی باہر آ گیا جو قد اور شکل میں اس کے برابر تھا۔ یہ دیکھ کر مخلوق سے شور و غوغا اُٹھا اور سب کے سب اس بات کے قائل ہو گئے کہ صالح علیہ السلام کا خدا بس عجیب قدرت رکھتا ہے اس پر ایمان لانا چاہیے اور جندع بن عمرو اپنے چھ ہزار پیروکاروں سمیت اسی وقت مشرف بہ اسلام ہو گیا اور حضرت صالح علیہ السلام کے قدموں

پر گر پڑا اور اپنے جرموں کی معافی کی درخواست کی۔ دوسرے سرداروں نے نفس کی شامت کی وجہ سے انکار پر اصرار کیا۔ اور انہوں نے اپنے پیروکاروں کو گمراہ کرنا شروع کر دیا کہ تم اس جادو پر فریفتہ نہ ہونا' اپنے دین و مذہب پر قائم رہو کہ یہ امتحان کا وقت ہے' ان بدبختوں نے اپنے سرداروں کے گمراہ کرنے کی وجہ سے پھر کفریہ کلمات بکنے شروع کر دیئے اور حضرت صالح علیہ السلام کو جادوگر قرار دیا۔ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ اب تم نے عہد کی خلاف ورزی کی ہے اور مجھ پر ایمان نہیں لائے ہو۔ لیکن اس اونٹنی اور اس کے بچے کو پوری تعظیم کے ساتھ اپنے پاس رکھو اور اسے کسی طرح بھی تکلیف نہ دینا کیونکہ تمہارے امن و امان کا باعث ہے جب تک یہ اونٹنی اور اس کا بچہ تمہارے درمیان رہیں گے' تم پر عذاب نہیں آئے گا۔

(اقول و باللہ التوفیق معلوم ہوا کہ اہلِ اللہ کے جانوروں کی تعظیم نبوتؐ کی تعلیمات کا حصہ ہے۔ نیز یہ جانور عذابِ خداوندی سے حفاظت کا ذریعہ ہیں۔ اندازہ کیجیے کہ جن کے جانور قابلِ تعظیم اور دافع البلاء ہوں' ان مقربین بارگاہِ خداوندی کی تعظیم کس قدر مطلوب و مقصود ہونی چاہیے اور خود ان کے دافع البلاء ہونے میں کیا شک باقی رہا۔ اور پھر سید عالم نورِ مجسم صلی اللہ علیہ وسلم کی عظمت کا کیا عالم ہوگا؟ ولنعم ما قیل۔

شرک ٹھہرے جس میں تعظیم حبیب
اس بُرے مذہب پہ لعنت کیجیے

(محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اس معجزہ کی تخصیص میں نکتہ

یہاں جاننا چاہیے کہ اس فرقے کے لیے اس معجزے کی تخصیص میں نکتہ یہ تھا کہ وہ لوگ سنگ تراشی میں تصویر کی بڑی باریکیاں پیدا کرتے تھے اور سحرکاری کرتے تھے۔ پس یہ معجزہ ظاہر کرنے میں انہیں ایک باریک اشارہ کیا گیا ہے کہ اگرچہ تم پتھروں سے عجیب و غریب تصویریں بناتے ہو لیکن ان میں جان نہیں ڈال سکتے ہو' ہم پتھر سے ایک جان دار کو جو کہ ان علاقوں کے جانوروں میں سب سے بڑا ہے' نکال سکتے ہیں۔

بیت

کافراں از بت بے جاں چہ تمتع دارید
بارے آں بت پر ستید کہ جانے دارد

یعنی اے کافرو! بے جان بت سے نفع کی کیا امید رکھتے ہو اس بت کو تو پوجو جس میں جان ہے۔

نیز اس بات کا اشارہ ہوا کہ ہدایتِ الٰہی پتھروں کو نرم کر دیتی ہے اور اس سے روح کے اوصاف ظاہر کرتی ہے۔

اونٹنی کا باقی واقعہ اور اس کی خصوصیات

ہم باقی واقعہ بیان کرتے ہیں کہ وہ اونٹنی اپنے جثے میں بہت بڑی اور قوی ہیکل تھی۔ چنانچہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے حضرت ابوموسیٰ اشعری رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں ثمود کے شہر حجر میں گیا تھا۔ اس اونٹنی کے بیٹھنے کی جگہ کی جو کہ ان علاقوں میں معروف اور مشہور ہے اور وہ اس کی زیارت کرتے ہیں' میں نے اپنے ہاتھ سے پیائش کی اس کا گھیرا ساٹھ (۶۰) گز یا ساٹھ (۶۰) ہاتھ تھا اور اس اونٹنی کی خاصیت یہ تھی کہ گھریلو اور وحشی تمام جانور اسے دیکھتے ہی بھاگ جاتے تھے اور وہ جس جنگل میں چرتی تھی' کوئی دوسرا جانور قدم نہیں رکھ سکتا تھا اور وہ جس کنویں اور چشمے پر پہنچ جاتی تھی سب کا سب پی جاتی اور چراگاہ کو بھی چارے سے خالی کر دیتی تھی۔ شام کے وقت شہر میں آ جاتی' شہر کے لوگ اس کے دودھ سے اپنے برتن بھر لیتے اور پورے شہر والوں کو اس کا دودھ کافی ہوتا۔ جب ایک مدت گزر گئی' مویشیوں اور جانوروں والے اس کی سیر اور گردش سے عاجز آ گئے۔ حضرت صالح علیہ السلام کے حضور فریادی ہوئے۔ آپ نے یوں طے فرمایا کہ ایک دن تم لوگ اپنے جانوروں کو چراگاہ میں چھوڑ دیا کرو اور ہم اس اونٹنی کو گھر میں روک لیں گے اور ایک دن ہم اس اونٹنی کو چھوڑ دیا کریں گے اور تم لوگ اپنے جانوروں کو گھروں میں روک لیا کرو۔ ایک مدت تک اس قول وقرار پر عمل ہوتا رہا لیکن اکثر شہر والوں کو جو کہ مویشیوں اور جانوروں کی پرورش کا شوق رکھتے تھے' یہ تقسیم بھی ناگوار ہوئی۔

وہ دل میں چاہتے تھے کہ اس اونٹنی کو کسی حیلے سے دُور کر دینا چاہیے تاکہ ہمارے جانور بافراغت پانی پئیں اور چراگاہ میں چریں۔ لیکن عہد شکنی اور قول وقرار کی خلاف ورزی سے گریز کرتے تھے۔ اسی اثناء میں ان میں سے ایک نوجوان قذار بن سالف نامی شوخ آدمی موٹی گردن والا' ہٹا کٹا' ماں کو ستانے والا' باپ سے بے زار' تیز زبان اور بے حیا پیدا ہوا اور اسے عزہ نامی ایک فاحشہ عورت کے ساتھ عشق ہو گیا جو کہ حسن و جمال' باہمی گفتگو کی خوبی' ظرافت طبع اور نزاکت میں اس ملک میں ضرب المثل تھی اور وہ اپنے دوستوں میں سے آٹھ افراد کے ساتھ جو کہ اسی وضع کے لوگ تھے' ان میں سے ایک کا نام مصدع بن واہر تھا جو کہ اس کا چچازاد بھائی تھا اس فاحشہ عورت کے گھر جاتا اور دادِ عیش دیتا اور اس کے دوسرے دوست بھی شرابیں پی کر اس فاحشہ کی لونڈیوں کے ساتھ روسیاہی کرتے۔ ایک دن اس قذار نامی نوجوان نے اس فاحشہ سے کہا کہ ہم کب تک یہ چوری کی محفلیں جاری رکھیں گے تو میرے نکاح میں کیوں نہیں آ جاتی تاکہ عمر دراز اطمینان کے ساتھ گزاری جائے اس نے کہا کہ تجھے اس کام کا شوق ہے تو میری ایک فرمائش پوری کر تو میں اپنے تمام اموال اور کنیزوں سمیت تیری ہو کے رہوں گی اور وہ فرمائش یہ ہے کہ یہ اونٹنی جس کے وجود سے ہمیں اور ہمارے سب شہر والوں کو رنج اور ملال ہے اور بے زبان جانور بھوک اور پیاس میں گرفتار ہیں' قتل کر دے اور ختم کر دے اور اس فاحشہ کے بھی بہت سے مویشی تھے اس وجہ سے اسے اس اونٹنی سے بہت رنج اور دُکھ تھا۔

قذار نے انتہائی ردی خواہش کی بناء پر یہ مہم سرانجام دینے کی ذمہ داری قبول کر لی اور اس کام کے پیچھے لگ گیا اور اپنے دوستوں کو بھی اس [illegible] میں اپنا شریک بنا لیا حتیٰ کہ ایک دن ایک تنگ کوچے میں جو کہ اونٹنی کی [illegible] رہگاہ تھی اس کی راہ میں چھپ کر بیٹھ گیا اور اپنے دوست بھی اس کوچے میں پھیلا دیئے جب اونٹنی چراگاہ سے واپس ہوئی اور اس کوچے میں داخل ہوئی' مصدع نے پہلے ایک تیر اس کی پیشانی پر مارا اور سات دوسرے آدمی تلواریں لہراتے ہوئے نعرے لگاتے ہوئے اونٹنی پر حملہ آور ہوئے۔ اونٹنی تیر کا زخم برداشت کرنے کے باوجود ان پر حملہ کرتی تھی اور وہ منتشر ہو جاتے تھے اور قذار نے پیچھے سے پہنچ کر اس اونٹنی پر

حملہ کیا اور کونچیں کاٹ دیں۔ اونٹنی زمین پر گر پڑی اس کے بعد اس کے ساتھیوں نے اونٹنی کو تلواروں کے نیچے دھر لیا اور ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ شہر والوں کو اونٹنی کے مارے جانے سے خوشی ہوئی اس کا گوشت تقسیم کر کے گھروں کو لے گئے اس اونٹنی کا بچہ جو کہ پیچھے تھا جب اس نے دیکھا کہ اس کی ماں کو قتل کر رہے ہیں' بھاگ کر اسی پہاڑی ٹیلے پر جا کھڑا ہوا۔

جب حضرت صالح علیہ السلام کو یہ خبر پہنچی' آپ افسوس کرتے ہوئے باہر تشریف لائے اور شہر کے لوگوں سے فرمایا کہ تم نے یہ کیا کیا؟ اپنے اوپر عذابِ خداوندی کو نازل کر لیا اب تدبیر یہ ہے کہ میرے ساتھ آؤ اور اس کے بچے کو شہر میں لاؤ تا کہ اس بچے کے وسیلے سے عذاب سے بچ جاؤ۔ قذار اور دوسرے کفار نے اس بات پر کوئی توجہ نہ دی اور اسے آسان سمجھا اور مسلمان حضرت صالح علیہ السلام کے ہمراہ بچے کو لانے کے لیے صحرا میں گئے جب اس بچے نے حضرت صالح علیہ السلام کو دیکھا' تین آوازیں کیں' پہاڑی ٹیلہ پھٹ گیا اور وہ اس میں سما گیا۔ حضرت صالح علیہ السلام افسوس کرتے ہوئے واپس تشریف لے آئے اور آپ نے شہر والوں سے فرمایا کہ ان تین آوازوں کی تعبیر یہ ہے کہ تمہیں تین دن کی مہلت ہے۔ پہلے دن تمہارے چہرے زرد' دوسرے دن سرخ اور تیسرے دن سیاہ ہو جائیں گے اور یہ واقعہ بدھ کے روز شام کو پیش آیا تھا۔

حضرت صالح علیہ السلام کی قوم کی ہلاکت کا واقعہ

جمعرات کو شہر والے صبح اُٹھے' سب کے چہرے زرد ہو چکے تھے' انہیں یقین ہو گیا کہ حضرت صالح علیہ السلام نے جو فرمایا ہے' برحق ہے لیکن اس وقت ان کی قوتِ غضبیہ نے جوش میں آ کر عقل کو معزول کر دیا۔ قذار نے آٹھ دوسرے آدمیوں کے ساتھ مل کر باہم قسم اُٹھائی اور کہنے لگے کہ تین دن گزرنے اور عذاب آنے سے پہلے حضرت صالح (علیہ السلام) کا کام تمام کر دیا جائے اور رات کے وقت یہ نو بدبخت حضرت صالح علیہ السلام کو (معاذ اللہ) قتل کرنے کے ارادے سے آئے۔ آپ اپنی مسجد میں تشریف فرما تھے اس میں ایک درخت تھا اس درخت نے بلند آواز سے حضرت صالح علیہ السلام کو خبر دی کہ قذار اپنے ساتھیوں سمیت آپ کے قتل کے ارادے سے آ رہا ہے' آپ اپنے گھر تشریف لے جائیں

اور دروازہ بند کرلیں۔ چنانچہ آپ اپنے دولت کدہ میں تشریف لے گئے اور دروازہ بند کرلیا جب قذار مسجد میں پہنچتا ہے وہاں حضرت صالح علیہ السلام کو نہیں پاتا اس نے اور اس کے ساتھیوں نے دروازہ توڑ کر آپ کے دولت کدہ میں داخل ہونے کا ارادہ کیا اسی اثنا میں فرشتے حضرت صالح علیہ السلام کی حمایت کے لیے پہنچ جاتے ہیں اور اپنے پر قذار اور اس کے احباب کے منہ پر مارتے ہیں' وہ سہمے ہوئے اور حیران و پریشان گرتے پڑتے نابینے ہو کر دائیں بائیں بھاگ رہے ہیں' کسی کا سر دیوار سے ٹکرایا اور پھٹ گیا بعض کنویں میں گر گئے۔

قصہ مختصر وہ نوافراد سب کے سب ہلاک ہوگئے جب ان کے وارث صبح اُٹھے' کیا دیکھتے ہیں کہ تمام شہر والوں کے چہرے سرخ ہیں۔ قذار اور اس کے دستوں کی تلاش کرنے لگے جب پتہ چلا کہ حضرت صالح علیہ السلام کے گھر کے پڑوس میں سر پھٹے ہوئے ذلیل و رسوا پڑے ہیں تو یہ سارا ماجرا شہر کے سرداروں سے بیان کیا جو کہ کافر تھے اور سب شہر والوں نے آپ کے گھر پر دھاوا بول دیا اور کہنے لگے کہ آپ نے ان نو افراد کو اونٹنی کے بدلے رات کو قتل کر دیا ہے' ہم آپ کو اور آپ کے سب اہلِ خانہ کو قصاص میں قتل کریں گے۔ حضرت صالح علیہ السلام نے فرمایا کہ میں ان کے گھروں میں نہیں گیا' انہوں نے رات کے وقت میرے گھر پر حملہ کر دیا' انہیں جو سزا ملی' غیب سے ملی۔ اسی سوال و جواب کے دوران جندع بن عمرو جو کہ شہر کے سرداروں میں سے مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے اور حضرت صالح علیہ السلام کے معتقد اور مخلص تھے' یہ حالات معلوم کر کے اپنا لاؤ لشکر لے کر حضرت کی حمایت کے لیے نکل آئے اور دوسرے سرداروں کے ساتھ مقابلہ کیا۔ آخر لوگوں نے درمیان میں صلح کرا دی اور بات یوں طے ہوئی کہ حضرت صالح علیہ السلام اس شہر سے نکل جائیں۔ آپ اسے غنیمت جانتے ہوئے جندع بن عمرو اور دوسرے مسلمانوں کو ساتھ لے کر شہر سے باہر تشریف لے گئے اس دن صبح کے وقت جو کہ ہفتے کا دن تھا' تمام شہر والوں کے چہرے سیاہ ہو گئے اور اس دن تشویش میں پڑ گئے اور سنگین اور مضبوط مکانات خالی کر کے اس امر کی تیاری کی کہ اگر عذابِ الٰہی آسمان کی طرف سے یا زمین کی طرف سے آئے تو ان مضبوط مکانات

میں چھپ جائیں گے' ان میں نہ تو زلزلہ اثر کرتا ہے اور نہ ہی بارش اور ژالہ باری نقصان پہنچاتی ہے۔

اتوار کی صبح کو حضرت جبرئیل علیہ السلام آسمان اور زمین کے درمیان انتہائی بڑی اور ہیبت ناک شکل میں ظاہر ہوئے اور سخت تیز آواز ظاہر کی جس کی وجہ سے پہاڑوں کو جنبش آ گئی اور تیز ہوا چلنے لگی' تمام شہر والے ہیبت کے مارے پتھر کے مکانوں میں گھس گئے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے دوسری مرتبہ پہلے کی نسبت زیادہ تیز آواز کی اس آواز کے صدمے کی وجہ سے سب لوگ اپنے زانوؤں پر رکھے گر پڑے اور ان کے پتے پھٹ گئے اور مر گئے اور ان میں سے کوئی بھی باقی نہ رہا۔

حضرت صالح علیہ السلام نے یہ خبر سننے کے بعد مسلمانوں سے فرمایا کہ اس شہر کو چھوڑ دو جو کہ غضب الٰہی کے نازل ہونے کا مقام ہے اور مکہ معظمہ کے حرم کی نیت سے احرام باندھ لو اور وہیں سکونت اختیار کرو۔ اسی پر عمل کیا گیا اور صحیح حدیث میں وارد ہے کہ تبوک کے سفر میں جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم حجر شہر کے دروازے سے گزرے تو اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین سے فرمایا کہ چاہیے کہ تم میں سے کوئی بھی اس شہر میں داخل نہ ہو اور اس شہر کا پانی نہ پیئے اور اس عذاب پانے والے گروہ پر گزر نہ کرے مگر اس حالت میں کہ رو رہا ہو اور عبرت حاصل کر رہا ہو کیونکہ ان بدبختوں کی روحوں کو اس شہر میں عذاب ہو رہا تھا جس جگہ عذاب الٰہی ظاہر ہو وہاں سے دُور رہنا بہتر ہے۔

نیز حدیث شریف میں وارد ہے کہ ثمود کے کافروں میں سے کوئی بھی باقی نہ بچا مگر ابو رغال نامی ایک شخص جو کہ کسی تقریب کی وجہ سے حرم مکہ میں گیا ہوا تھا جب تک وہ حرم شریف میں تھا' عذاب سے محفوظ رہا جب حرم شریف سے باہر نکلا اور طائف کی طرف روانہ ہوا تو راستے میں اسے بھی وہی عذاب پہنچا جو اس کی قوم کو پہنچا تھا۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم طائف کی مہم پر تشریف لے جاتے وقت جب اس کی قبر کے پاس پہنچے اور اس علاقے کی عادت تھی کہ سب گزرنے والے اس کی قبر کو سنگسار کرتے تھے۔ آپ نے صحابہ کرام علیہم الرضوان سے فرمایا کہ کچھ جانتے ہو کہ یہ کس کی قبر ہے؟ غلاموں نے عرض کی کہ ہمیں کوئی علم

نہیں' خدا تعالیٰ اور خدا تعالیٰ کے رسول علیہ السلام ہی بہتر جانتے ہیں۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سارا واقعہ تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا۔

ارشاد فرمایا کہ میری سچائی کی علامت یہ ہے کہ اس شخص کے ہمراہ سونے کی ایک چھڑی دفن کی گئی ہے۔ صحابہ کرام یہ ماجرا سُن کر وہاں پہنچے اور اس کی قبر کو اپنی تلواروں کے ساتھ اُکھاڑا' وہ سونے کی چھڑی برآمد ہوئی' اُٹھا لائے اور اس کی قبر کو پھر بند کر دیا گیا۔ ثمود کا واقعہ یہ ہے جو کہ ذکر کیا گیا۔ چنانچہ اس واقعہ کا بعض حصہ دوسری سورتوں میں تفصیل کے ساتھ مذکور ہے۔ یہاں حق تعالیٰ نے اشارے کے طور پر اس واقعہ کا کچھ حصہ جو کہ اس مقام کے مناسب ہے' یاد دِلایا ہے اور فرمایا جا رہا ہے کہ ثمود کو سرکشی اور شہوت و غضب کو عقل و شرع کے تقاضے پر غالب کرنے کی وجہ سے احکامِ الٰہی کے انکار اور رسول علیہ السلام کی تکذیب تک نوبت پہنچ گئی۔

اِذَانۢبَعَثَ اَشْقٰهَا جب کہ اس گروہ کا سب سے بڑا بدبخت خوش و خرم اُٹھا اور اس نے عقل و شرع کے تقاضوں کے خلاف شہوت و غضب کی پیروی کی اور اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور حضرت صالح علیہ السلام کو قتل کرنے کے در پے ہوا اور سب سے بڑا بدبخت قدار بن سالف تھا۔

قول رسول قول خدا ہے

فَقَالَ لَهُمْ رَسُوْلُ اللّٰهِ تو انہیں اللہ تعالیٰ کے رسول نے فرمایا جو کہ حضرت صالح علیہ السلام تھے اور یہاں رسول اللہ کا لفظ اس لیے لایا گیا ہے اور حضرت صالح علیہ السلام کا نام نہیں لیا گیا تا کہ پتہ چلے کہ حضرت صالح علیہ السلام کا یہ کہنا خدا تعالیٰ کا کہنا تھا اور آپ کا ڈرانا بعینہٖ خدا تعالیٰ کا ڈرانا ہے اس لیے کہ کسی کا بھیجا ہوا اسی کا حکم رکھتا ہے اور وہ جو کہتا ہے اسی کی زبان سے کہتا ہے اور اگر حضرت صالح علیہ السلام کا نام لیا جاتا تو اس حقیقت کا پتہ نہ چلتا۔

نَاقَةَ اللّٰهِ خدا تعالیٰ کی اونٹنی کو چھوڑ دو تا کہ جہاں چاہے' چرے اور جو پانی چاہے' پیئے اور اسے کوئی تکلیف اور اذیت نہ پہنچاؤ اور اس کے قتل کے در پے نہ ہونا۔ اس لیے کہ کسان

اور دیہاتی اپنی ناقص عقل کے باوجود اتنی بات کو سمجھتے ہیں کہ طاقت وروں کے مویشیوں کو پانی اور چارے سے ہانکنا نہیں چاہیے اور قتل کرنے اور تکلیف دینے کے درپے نہیں ہونا چاہیے۔ پس خدا تعالیٰ جو کہ سب طاقت وروں سے زیادہ طاقت ور اور فوری انتقام لینے پر قادر ہے' کے جانور کو ستانا اور قتل کرنا ظاہر ہیں عقل کے تقاضوں کے خلاف ہے اور شہوت سے مغلوب ہونے کی وجہ سے اتنی سی بات کو جو کہ کسان اور بکریوں کے چرواہے جانتے ہیں' نہ سمجھنا انتہائی حماقت ہے۔

اللہ تعالیٰ کی اونٹنی کہنے کی وجہ

اور اس اونٹنی کی نسبت خدا تعالیٰ کی طرف اس وجہ سے کی گئی ہے کہ وہ خدا تعالیٰ کے سوا کسی کی ملک نہ تھی۔ نیز ماں باپ کے واسطے کے بغیر چٹان سے پیدا ہوئی۔ نیز قدرتِ الٰہی کی مظہر تھی اور قیامت قائم ہونے اور قبروں سے مردوں کو زندہ کرنے کی دلیل تھی۔ پس اسے جانوروں میں وہ مرتبہ حاصل تھا جو کہ عمارات اور مکانات میں بیت اللہ کو حاصل ہے۔

وَسُقْيٰهَا اور اس کے پانی کے حصے کو چھوڑ دو تا کہ تمہارے جانور اس کے پانی کے حصے میں تصرف نہ کریں اس لیے کہ تم نے معاہدہ کیا ہے اور قول و قرار کیا ہے کہ ایک دن یہ اونٹنی پانی پیئے اور دوسرے دن تمہارے جانور اور عہد شکنی اور قول و قرار کی مخالفت تمام شریعتوں میں حرام اور ممنوع ہے۔ شہوت و غضب سے مغلوب ہونے کی وجہ سے عہد شکنی کا اقدام انتہائی بے دینی ہے۔

فَكَذَّبُوْهُ تو اس ساری قوم نے اس ڈرانے اور سمجھانے میں حضرت صالح علیہ السلام کی تکذیب کی اور آپ کی بات پر جو کہ لَا تَمَسُّوْهَا بِسُوْٓءٍ فَيَاْخُذَكُمْ عَذَابٌ اَلِيْمٌ کا مفہوم ہے' یقین نہ کیا۔

فَعَقَرُوْهَا پس اس اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور اگرچہ کونچیں کاٹنے والا وہی قذار بن سالف اور اس کے آٹھ ساتھی تھے لیکن جب یہ فعل سب کی مرضی سے ہوا۔ گویا وہ سب اس میں شریک ہو گئے اسی لیے گروہ کے ایک شخص کے کام کو جو کہ سب کے مشورے اور مرضی سے ہو اس گروہ کی طرف منسوب کیا جاتا ہے۔ اور سورۃ قمر میں جو فتعاطی وعقر واقع ہوا تو

فعل کو اس کے مرتکب کی طرف منسوب کرنا مراد ہے۔ پس کوئی اختلاف نہیں۔

فَدَمْدَمَ عَلَيْهِمْ رَبُّهُمْ تو ان کے پروردگار نے ان پر ان کے روزگار کو اُلٹ دیا جس طرح کہ انہوں نے اس کی ترتیب کے حسن کو اُلٹ دیا تھا کیونکہ اللہ تعالیٰ نے انہیں شہوت اور غضب کی طاقت اس لیے دی تھی کہ ان دونوں کو عقل کے تابع کر دیں اور عقل اس لیے دی تھی کہ اسے شریعت کے تابع کر دیں جبکہ انہوں نے اس کے برعکس شریعت کو عقل کے اور عقل کو شہوت و غضب کے تابع کر دیا۔

بِذَنْبِهِمْ ان کے گناہ کی وجہ سے جو کہ حکمتِ الٰہی کی ترتیب کو باطل کرنا اور اس کی ضد پر عمل کرنا تھا اس شخص کی طرح جو اپنے غلام کو تلوار تھمائے کہ میرے دشمن کو قتل کر دو اور وہ اس کے بیٹے کو قتل کر دے۔

فَسَوّٰهَا پس اس گروہ کو مٹی کے برابر کر دیا اس لیے کہ اس اونٹنی کے قتل میں معنوی طور پر سب شریک ہوئے اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ جس وقت زمین میں گناہ سرزد ہوتا ہے تو جو شخص اس محفلِ گناہ میں حاضر ہو اور اس گناہ سے دلی طور پر بیزار اور متنفر ہو وہ ایسا ہے کہ بہت دُور فاصلے پر واقع ہے۔ اسے اس گناہ کی کوئی آلائش نہیں پہنچتی۔ اور جو اس محفلِ گناہ سے دُور ہو مگر دلی طور پر اس گناہ سے راضی اور خوش ہو وہ ایسا ہے کہ اس محفل میں حاضر لہٰذا اس گناہ میں شریک ہے۔

وَلَا يَخَافُ عُقْبٰهَا اور اللہ تعالیٰ اس فرقے کی ہلاکت کے انجام سے نہیں ڈرتا اس لیے کہ کسی کام کے انجام سے ڈرنا اس کی شان ہے جو پہلے تو اس کی اچھائی اور بُرائی کو نہیں پہچانتا اور نہ جانتے ہوئے اس میں قدم رکھتا ہے۔ یا اس کی شان ہے جس کی طاقت اس خرابی کا تدارک نہ کر سکے جو اس کام پر مرتب ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ علام الغیوب' کمال قدرت والا اور غنی مطلق ہے' اسے اس کی پرواہ نہیں ہے کہ اس کی مخلوق سے کوئی گروہ گھٹ جائے اور اس کی حسرت نہیں ہے کہ میں نے عرصہ دراز تک اس فرقے کو پالا تھا' میری پرورش ضائع گئی اور میں نے جس کام کے لیے پرورش کی تھی' انہوں نے وہ کام نہیں کیا۔

یہاں جاننا چاہیے کہ حدیث صحیح میں جو کہ مسند امام احمد اور دوسری معتبر کتابوں میں

واقع ہے' وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت امیرالمومنین علی مرتضٰی کرم اللہ وجہہ سے تکرار کے ساتھ ارشاد فرمایا کہ تمہیں کچھ معلوم ہے کہ پہلی اُمتوں کا سب سے بڑا بخت کون تھا اور اس اُمت کا سب سے بڑا بد بخت کون ہے؟ آپ نے عرض کی مجھے معلوم نہیں' آپ نے فرمایا کہ پہلی اُمتوں کا بدبخت ترین ثمود کا وہ سرخ رنگ کا آدمی ہے یعنی قذار بن سالف جس نے اللہ تعالیٰ کی اونٹنی کی کونچیں کاٹ دیں اور اس اُمت کا بدبخت ترین وہ شخص ہے جو تمہارے سر پر تلوار مارے یہاں تک کہ تمہاری ریش تمہارے خون سے تر ہو جائے اور تو اس تلوار سے شہید ہو جائے۔

ثمود کے قذار اور اس اُمت کے ابن ملجم کے بدبخت ترین ہونے کی وجہ

تو یہاں یہ امر ضروری ہے کہ پہلوں میں سے قذار اور اس اُمت میں سے حضرت مرتضٰی علی کرم اللہ وجہہ کے قاتل ابن ملجم کے بدبخت ترین ہونے کی وجہ بیان کی جائے اور اس کا بیان چند مقدمات کی تمہید پر موقوف ہے۔

پہلا مقدمہ یہ ہے کہ شرم گاہ کی شہوت سب سے زیادہ حقیر شہوت ہے کہ اس حالت میں انسان عقل سے بہت دُور ہو جاتا ہے اور اس سے جانوروں کی حرکتیں صادر ہوتی ہیں اور اس خواہش کو پورا کرنے کا مقام بھی نجاستوں اور پلیدیوں کی آماجگاہ ہے اور ستر کا کھلنا جس کا چھپانا بنی آدم کے تمام گروہوں کے نزدیک لازم ہے اس خواہش کو پورا کرنے میں ضروری ہوتا ہے۔ لہٰذا بنی آدم کی جبلت ہے کہ اس خواہش کو انتہائی پردے اور ستر میں پورا کرتے ہیں اور اپنی محافل ومجالس میں اس کا نام اشارے اور کنائے کے بغیر نہیں لیتے اور جہان میں جو گالی سُنی جاتی ہے اسی خواہش کی کمی بیشی سے لی گئی ہے۔

دوسرا مقدمہ یہ کہ شہوت مطلقاً خواہ اس جنس سے ہو خواہ دوسری جنس سے جیسے کھانا' پینا' لباس' مسکن' سواری' نظارہ کرنے کی جگہ جیسے باغ اور بوستان' سننا' کھیلیں' عطریات وغیرہ غضب اور غیرت سے حقیر تر ہے۔ اسی لیے عرف میں ان لوگوں کو جو کہ ان شہوتوں سے مغلوب ہوتے ہیں جیسے عیاش بادشاہ ان لوگوں سے بدتر جانتے ہیں جو کہ غضب اور غیرت سے مغلوب ہو جیسے ظالم بادشاہ۔ اور اس میں راز یہ ہے کہ قوتِ غضبیہ' تسلط' غلبے اور سیاست

کے پیدا ہونے کی جگہ ہے جبکہ قوت شہویہ خوشامد اور چاپلوسی کا منبع ہے اور لوگوں کے ذہنوں میں اثر ڈالنے والی قوت اثر قبول کرنے والی قوت سے بہتر ہے۔

تیسرا مقدمہ شہوت اور غضب جب حقوق واجبہ میں سے کسی حق کو ضائع کرنے تک پہنچائیں تو تمام انسانوں کے نزدیک معیوب اور قابلِ طعن و تشنیع ہوتے ہیں اور حق جس قدر بڑا ہوگا' عیب اور طعن اسی قدر زیادہ لاحق ہوگا۔ پس بدبخت وہ ہے جو اپنی شہوت اور غضب کو اپنے نفس کے حق سے پہلے رکھے اور اس حق کو ضائع کر دے اور اس سے زیادہ بدبخت وہ ہے جو کہ اپنی شہوت اور غضب کو پورا کرنے کے لیے غیر کے حق کو ضائع کر دے اور اس سے بھی زیادہ بدبخت وہ ہے جو ان دونوں کے لیے کثیر جماعت کے حقوق کو ضائع کر دے پھر حقوق کا بھی آپس میں اختلاف ہے۔ دنیوی حق ضائع کرنا آسان ہے اور اخروی حق کو ضائع کرنا اس سے سخت ہے۔

چوتھا مقدمہ آدمی کے ذمے تین بڑے حق ثابت ہیں۔ پہلا اللہ تعالیٰ کا حق جو کہ اس کا مالک اور اسے نعمتیں عطا فرمانے والا ہے اور آدمی ہر لحہ اللہ تعالیٰ کے احسان کے نیچے ہے اور ہر کام میں اس کی مدد کا محتاج اس لیے کوئی حق اس حق کی برابری نہیں کرتا۔ دوسرا اپنی جماعت کا حق کہ جینے مرنے میں ان کا محتاج ہے اور ان سے ہر کسی قسم کی امداد کی توقع رکھتا ہے۔ تیسرا اپنے نفس کا حق اس حق کا عمدہ ہونا بالکل ظاہر ہے' بیان کی ضرورت نہیں۔ پس بدبختوں میں سے زیادہ بدبخت وہ ہے جو کہ ان تینوں حقوق کو حقیر ترین شہوت کے بدلے ایک دَم ضائع کر دے اور یہ وصف گزشتہ اُمتوں میں قدار بن سالف میں تھی جس نے اس حقیر ترین خواہش کو پورا کرنے کے لیے اپنا حق بھی تلف کیا کہ کافر مرا اور دوزخ کا ایندھن ہو گیا۔ ا۔ زندگی برباد کر لی۔ اور اپنی قوم کا حق بھی ضائع کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کے عذاب کے ساتھ ان کی جڑ کٹ گئی اور یہاں تک نیست و نابود ہو گئے کہ ان کا نام و نشان بھی باقی نہ رہا اور اللہ تعالیٰ کا حق بھی ضائع کر دیا کہ اس کی اونٹنی کی جو کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت کی صورت تھی اور اس کی عنایت نے اس جانور کے جسم میں متجسم ہو کر کعبہ کا حکم حاصل کیا تھا' کونچیں کاٹ دیں۔

اور اس اُمت میں حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کے قاتل میں یہ وصف تھی اور

اس ابہام کی وضاحت یہ ہے کہ جس طرح ناقۃ اللہ حضرت صالح علیہ السلام کے کمال کی صورت تھی اور آپ کی نبوت کی صداقت کی دلیل۔ اور اللہ تعالیٰ کی وہ عنایت جو کہ ثمود کی ہدایت کے لئے حضرت صالح علیہ السلام کی بعثت میں غیب سے متوجہ ہوئی تھی۔ اس گروہ کے طلب کرنے کے مطابق اونٹنی کی شکل اختیار کر کے اور حیوانی خلعت پہن کر ان میں قائم رہی حتیٰ کہ عذاب دُور کرنے میں اس اونٹنی کی تعظیم اور اس کا حق ادا کرنا حضرت صالح علیہ السلام کی شریعت قبول کرنے اور ان کے دین میں داخل ہونے کے قائم مقام ہونے کی طرح ہو گیا تھا۔ گویا حضرت صالح علیہ السلام کا نورِ ولایت اس راستے سے جلوہ گر ہوتا تھا اور اللہ تعالیٰ کے حضور آپ کا قرب اور مرتبہ اور اس دربار میں آپ کی دعا کی قبولیت اسی جھروکے سے ظاہر ہوتی تھی۔

فضائل شاہ ولایت حضرت علی کرم اللہ وجہہ

اسی طرح حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ کا وجود جسمانی جو کہ خاتم الخلفاء ہے دربارِ نبوت علیٰ صاحبہا الصلوٰات والتسلیمات کے کمال ولایت کی صورت ہو چکا تھا اور ان کا نورِ ہدایت اس سے جلوہ ریز ہوتا تھا اور دربارِ نبوت کا قربِ معنوی اسی جھروکے سے نمودار تھا اور اس وقت پیغمبری کی خلافت اور حضور کی جانشینی اس شاہ ولایت رضی اللہ عنہ کی ذات قابلِ الصفات میں منحصر ہو چکی تھی اسی لیے حدیث شریف میں جس طرح کعبہ کے حق میں فرمایا گیا ہے کہ النظر الی الکعبۃ عبادۃ اور قرآن مجید کے متعلق فرمایا گیا ہے کہ النظر الی المصحف عبادۃ اسی طرح اس شاہ ولایت کرم اللہ وجہہ کے بارے میں ارشاد ہوا کہ النظر الی وجہ علی عبادۃ گویا آپ کا وجود مبارک حضرت نبوت علیٰ صاحبہا الصلوٰات والتحیات کے وجود شریف کا عکس جمیل تھا کہ تشنگانِ اُمت اس ایک منبع سے سیراب ہوتے تھے اور کمالاتِ نبوی کے جامع ہونے کی وجہ سے ہر ظاہری اور باطنی حاجت آپ کی ذات سے پوری ہوتی تھی۔

(معلوم ہوا کہ دربارِ نبوت کے انوار سے فیض یاب ہونے کی وجہ سے ہر ظاہری اور باطنی حاجت مولائے کائنات شاہ ولایت علی کرم اللہ وجہہ کی ذات سے پوری ہوتی تھی جیسا

کہ مفسر علام قدس سرہ نے ارشاد فرمایا اس لیے آپ کو حاجت روا اور مشکل کشا کہنا درست قرار پایا اسی لیے اکابر سنِ اسلام نے آپ کو مشکل کشا مانا ہے حتیٰ کہ امداد اللہ صاحب مہاجر مکی ارشاد مرشد کے ص ۱۳ پر یوں دعا کرتے ہیں

دُور کر دل سے حجاب جہل و غفلت میرے رب

کھول دے دل میں درِ علم حقیقت میرے رب۔ ہادی عالم علی مشکل کشا کے واسطے۔

(محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اس سب سے بڑے بدبخت نے جس نے اس قسم کے وجود منور کو شہید کیا' خدا تعالیٰ کا حق بھی تلف کیا اور پوری اُمت کا حق بھی کہ رسی کے بغیر جھاڑو کی طرح کمالات کے انتشار کا شکار ہو کر اپنی وجدانی کیفیت کھو بیٹھے اور کوئی اور آپ کا قائم مقام نہ رہا اور اپنا حق بھی ضائع کیا کہ جہنم کا ایندھن بن گیا اور اپنی زندگی برباد کر دی اور یہ سب کچھ اسی حقیر ترین خواہش کی پیروی کی بناء پر تھا۔

حضرت علی کرم اللہ وجہہ کی شہادت

اس لیے کہ صحیح روایات میں وارد ہے کہ حضرت کا قاتل عبداللہ بن ملجم نامی ایک خارجی مذہب آدمی تھا' کوفہ میں آیا اور اس کی نظر قطام نامی ایک خوب صورت عورت پر پڑ گئی اور اس فن کار عورت پر دل و جان سے عاشق ہو گیا۔ وہ عورت بھی خارجیہ تھی اور اس کا باپ اور بھائی حضرت شاہ ولایت کرم اللہ وجہہ کے ہاتھوں جنگِ نہروان میں جہنم رسید ہوئے تھے۔ ابن ملجم کو اس عورت کے وصال کا خبط سوار ہو گیا' ان کے درمیان خط و کتابت شروع ہو گئی۔ اس عورت نے پیغام بھیجا کہ اگر تو میری ایک فرمائش پوری کرے تو میں تجھے قبول کرتی ہوں اور خود کو تیرے سپرد کرتی ہوں اور وہ فرمائش یہ ہے کہ حضرت شاہ ولایت کرم اللہ وجہہ کو قتل کر کے اپنا منہ سیاہ کر اور اپنا دین برباد کر اس ملعون نے شہوت سے مغلوب ہو کر یہ مہم سرانجام دینا قبول کر لیا' ہزار درہم سے ایک تلوار خریدی۔ اسے زہر آلود کیا۔ اور اپنے دوستوں سے اس مہم کو سر کرنے میں مشورہ کیا۔ انہوں نے کہا کہ یہ اتنا مشکل کام نہیں اس لیے کہ حضرت علی کا کوئی محافظ نہیں ہوتا۔ آپ اندھیرے میں اکیلے ہی مسجد کو جاتے ہیں' کسی دن اس مسجد

میں چھپ کر بیٹھ جا اور یہ کام کر گزر۔

رمضان پاک کی انیس (۱۹) تاریخ صبح کے وقت ابھی اندھیرا تھا' حضرت شاہ ولایت کرم اللہ وجہہ الکریم گھر سے مسجد میں تشریف لائے یہ لعین مسجد کے ستون کے پیچھے چھپا ہوا اس کام کے لیے تیار بیٹھا تھا اور حضرت کی عادت شریفہ یہ تھی کہ سوتے ہوئے لوگوں کو مسجد میں بلند آواز سے تکبیر کہہ کر بے دار فرماتے تھے تا کہ اُٹھ کر وضو اور طہارت میں مصروف ہوں۔ اسی دوران کہ آپ مسجد کے دروازے سے اندر آئے اس لعین نے ستون کے پیچھے سے آپ کے سر مبارک پر تلوار کی ایک ضرب لگائی اور ضرب لگانے کے بعد بھاگ گیا۔ لوگ ہر سمت سے اسے پکڑنے کے لیے دوڑے اور اسے گرفتار کر لیا۔ زخم اگرچہ اتنا نہ تھا لیکن زہر نے سرایت کی اور حضرت شاہ ولایت کرم اللہ وجہہ عالم جاودانی کو انتقال فرما گئے اور اکیسویں شب کو آپ کا جسم مبارک نجف الحیرہ میں دفن کیا گیا جو کہ کوفے کے قریب جامع مسجد سے ایک فرسخ کے فاصلے پر حیرت النعمان کی راہ میں واقع ایک مقام ہے۔ اور آپ کی قبر مبارک کو اونچا نہ کیا گیا اور علامت کے بغیر رکھا گیا تا کہ خارجی لوگ جو کہ اس زمانے میں کوفہ کے گرد و نواح میں پھیلے ہوئے تھے' بے ادبی نہ کریں۔ اور یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ہجرت سے چالیسویں سال میں واقع ہوا اور نبوت کے بعد جو خلافت تھی' منقطع ہو گئی۔ اور ساری اُمت پر ایک عام مصیبت ٹوٹ پڑی کہ انہوں نے مقامِ نبوت کے نائب کو گم کر دیا اس حادثے کو معلوم کر کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو سخت افسوس ہوا۔ چنانچہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا سے مروی ہے کہ جب آپ نے حضرت ولایت مآب رضی اللہ عنہ کی رحلت کی خبر سُنی تو فرمایا اب عرب جو چاہیں کریں' وہ نہ رہا جو انہیں ناپسندیدہ کاموں سے منع فرماتا تھا۔

یہاں جاننا چاہیے کہ آپ کی شہادت کے بعد صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اجمعین میں بے شمار علماء اور واعظ موجود تھے جو کہ لوگوں کو غیر پسندیدہ کاموں سے بے رو و رعایت روکتے تھے اور بنی اُمیہ کے بادشاہوں اور دوسرے سرداروں میں سے کسی کے مرتبے اور دبدبے کا لحاظ نہیں کرتے تھے لیکن ان کا امر و نہی علماء کے امر و نہی' اولیاء کے ارشاد' اور واعظوں کے

پند و نصیحت کے رنگ میں تھا نہ کہ حکم پیغمبر کے رنگ میں اس وجہ سے حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے یہ کلمہ ارشاد فرمایا۔

یہاں سے معلوم ہوتا ہے کہ حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ کے قاتل کو اشقی ہونے کے ساتھ مخصوص کرنے کی وجہ کیا ہے؟ وہ یہ ہے کہ اس وقت آپ کی ذات قائم مقام نبی ہونے کے کمال میں ان کمالات کے جامع ہونے کی وجہ سے جو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جانشین کے لیے چاہئیں' منفرد یعنی تنہا تھی۔ بخلاف خلفاء کے کہ ان میں یہ انفرادیت نہ تھی اگر ان کے قاتلوں نے اس نور کو بجھانے کی کوشش کی تو ان کی کوشش آگے نہیں بڑھی اس لیے کہ ابھی خلافتِ کبریٰ کی صلاحیت رکھنے والے اور لوگ موجود تھے اور حضرت شاہ ولایت کرم اللہ وجہہ چونکہ خاتم الخلفاء تھے' آپ کا قتل نورِ الٰہی کو بجھانے کا موجب ہوا اور ایسی مصیبت رونما ہوئی جس کا تدارک ممکن نہ رہا۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اور اگر کسی کے دل میں شبہ گزرے کہ ثمود کے بدبخت ترین کی حرکت کی وجہ سے تمام فرقۂ ثمود تباہ ہو گیا جبکہ اس اُمت کے بدبخت ترین کی حرکت کی وجہ سے باقی اُمت کو کوئی گزند نہ پہنچی۔ یہاں فرق کس لیے ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ دو وجہ سے فرق ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ ثمود کی ساری قوم اونٹنی کو قتل کرنے پر راضی ہو گئی جبکہ اس اُمت کی اکثریت اس حرکت پر راضی نہ تھی بلکہ انہوں نے یہ حرکت کرنے والے پر نفرت اور لعنت بھیجی۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ اونٹنی کے قتل کے بعد اس کا بچہ غائب ہو گیا جبکہ حضرت شاہ ولایت کرم اللہ وجہہ کی وفات کے بعد آپ کی اولاد کرام باقی رہے اور جس نور کے حامل حضرت ولایت مآب رضی اللہ عنہ تھے' طبقہ بعد طبقہ ایک حامل پیدا ہوتا رہا جو کہ اپنے وقت کا امام ہوتا تھا۔ اس وجہ سے اس اُمت کو اس نور سے محرومی نصیب نہ ہوئی اور وہ اس ہدایت سے فیض پاتے رہے۔ گرچہ کمالات کی وجدانی کیفیت دگرگوں ہو گئی اور وہ کمالات استعداد کے مطابق اچھے گروہوں میں سے ہر گروہ میں متفرق اور منتشر ہو گئے اور آپ کی شہادت

کے بعد جو عجیب واقعات رونما ہوئے ان میں سے ایک یہ ہے کہ آپ کی شہادت کے دن بیت المقدس میں کوئی ایسا پتھر نہ تھا جس کے نیچے سے خون نہ اُبلتا ہو۔

سورۂ واللیل

مکی ہے اس میں اکیس (۲۱) آیات' اکہتر (۷۱) کلمات اور تین سو دس (۳۱۰) حروف ہیں۔

سورۃ والشمس کے ساتھ رابطے کی وجہ

اور سورۂ والشمس کے ساتھ اس سورۃ کے رابطے کی وجہ یہ ہے کہ دونوں ہی قسموں کے ساتھ شروع ہونے میں پوری مناسبت رکھتی ہیں۔ وہاں انسانی نفوس کے اختلاف کا ذکر ہے کہ بعض کو فجور کا الہام ہوتا ہے اور بعض کو تقوے کا۔ اور ان لوگوں کی اچھی حالت کا بیان ہے جو کہ تزکیۂ نفس میں مصروف ہوتے ہیں۔ اور ان لوگوں کی بُری حالت کا ذکر ہے جو شہوت اور غضب کی پیروی کر کے نفس کو ذلیل وخوار کرتے ہیں۔ جبکہ یہاں بھی بنی آدم کے اعمال کا سعادت اور شقاوت میں اور بعض کو آسانی کی راہ چلنے کی توفیق دینے اور بعض کو رسوا کرنے اور شقاوت کی راہ ڈالنے میں مختلف ہونا بیان فرمایا گیا ہے۔ نیز دونوں سورتوں میں بدبختوں کا ذکر ہے وہاں ثمود کے اشقیٰ کا ذکر ہے جبکہ یہاں اس بدبخت کا حال بیان کیا گیا جو کہ اس اُمت کے آغاز میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت کو عذاب دے کر شقاوت کی دلالی میں پڑ گیا اور اس اعتبار سے کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت کی سرفرازی نصیب ہوئی۔ حضرت صالح علیہ السلام کی اونٹنی کے ساتھ ایک گونہ مشابہت حاصل ہوگئی۔

وجہ تسمیہ

اور اس سورۃ کا نام سورۂ واللیل اس لیے رکھا گیا ہے کہ لغتِ عرب میں لیل رات کو کہتے ہیں اور اس سورۃ میں لوگوں کے اعمال کا نیکی اور بدی میں اختلاف بیان کرنا مقصود ہے اور رات اس اختلاف کے قابلِ ذکر اوقات میں سے ہے۔ عابدوں کی رات' چوروں کی

رات' عیاشوں کی رات' فراق اور جدائی میں دردمندوں کی رات اور احباب کے وصال کی رات کا آپس میں کس قدر فرق ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں ع

شب تنور گزشت وشب سمور گزشت

اور ہر دن میں اگرچہ اسی قسم کا اختلاف اور رنگارنگی ہے لیکن چونکہ وقت اسرار کے کھلنے اور واضح ہونے کا ہے' سب لوگ بناوٹ اور تکلف کے ساتھ اپنے آپ کو متفق کرتے ہیں' چور عابد کے رنگ میں باہر آتا ہے۔ اور فاسق اپنے آپ کو نیکوں کے لباس میں ظاہر کرتا ہے۔ بخلاف رات کے کہ تاریکی کے پردے کی وجہ سے حیا کا حجاب اُٹھ جاتا ہے اور ہر شخص اپنے نفس اور دل میں پوشیدہ خواہش کے مطابق بے تکلف اور بے حجاب ایک کام میں مشغول ہو جاتا ہے اور بناوٹی اتفاق زائل ہو جاتا ہے۔

شانِ نزول

اور اس سورۃ کا سبب نزول یہ ہے کہ مکہ معظمہ میں دو سردار مال دار تھے' ایک حضرت ابوبکر الصدیق رضی اللہ عنہ اور دوسرا اُمیہ بن خلف۔ مال خرچ کرنے میں دونوں کا معاملہ مختلف ہو گیا۔ اُمیہ بہت مال دار تھا اس نے بارہ (۱۲) غلاموں کو تربیت کر کے ہر ایک کو ایک کام پر لگا رکھا تھا اور اس تدبیر کے ساتھ مال زیادہ کرتا تھا کہ ایک غلام کو کاشت کاری کا منتظم کر دیا' دوسرے غلام کو پھل دار باغات کا کام سپرد کر دیا' ایک غلام کو بیش قیمت منقش کپڑوں کی تجارت کے لیے یمن اور شام کی طرف بھیجتا اور کسی غلام کو مویشیوں پر مقرر کر کے دودھ' دہی اور نسل کشی سے مال بڑھاتا۔ علیٰ ہذا القیاس اور اتنا امیر اور دولت مند ہونے کے باوجود منگتے کو ایک درہم نہیں دیتا تھا اور اگر اس کا کوئی غلام اس کے مال سے کسی محتاج کو کچھ دے دیتا تو اسے ملامت کرتا اور خدمت سے معزول کر دیتا اور اگر اسے کوئی کہتا کہ اتنا مال ہوتے ہوئے تو آخرت کا ذخیرہ کیوں نہیں بناتا؟ تو کہتا کہ پہلے تو آخرت ہے کہاں؟ اور اگر بالفرض آخرت ہو تو میں نے اس قدر مال اور اولاد کی کمائی کی ہے کہ مجھے جنت کی نعمتوں کی ضرورت بالکل نہیں ہو گی' مجھے اس لالچ کی بالکل پرواہ نہیں کہ محتاجوں کو کچھ دے کر انہیں اپنا بنایا جائے۔

حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے فضائل اور ان کی تکالیف کا بیان

اور اس کے غلاموں میں سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ بھی تھے جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے خادم خاص ہیں اور ان کی بزرگی اس حد تک پہنچ چکی تھی کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انہیں جنت میں اپنے آگے آگے دیکھا اور فرمایا کہ جنت بلال کی مشتاق ہے۔

جن دنوں حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس کے غلام تھے' خفیہ طور پر مشرف بہ اسلام ہو گئے' ہوتے ہوتے اسے آپ کے مسلمان ہونے کا پتہ چل گیا۔ پہلے تو اس نے آپ کو خدمت سے معزول کر دیا' خزانے اور بت خانے کی حفاظت کا کام جو آپ کے سپرد تھا' کسی دوسرے غلام کو دے دیا۔ پھر آپ کو اپنے روبرو بلا کر پوچھنے لگا کہ تو کس کی عبادت کرتا ہے؟ حضرت بلال رضی اللہ عنہ نے فرمایا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے خدا کی۔ اس لعین نے کہا کہ اس دین سے دست بردار ہو جا ورنہ تجھے سخت ترین عذاب کے ساتھ ہلاک کر دوں گا۔ فرمایا میں اس سے منہ پھیرنے والا نہیں جو چاہے کر' میں تیرا غلام ہوں۔ وہ ظالم کافر دن کے آغاز میں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے جسم سے کپڑے اُتار دیتا اور کیکر کے کانٹے آپ کے جسم میں پیوست کر دیتا یہاں تک کہ وہ کانٹے ہڈی تک پہنچ جاتے۔ اور جب دن گرم ہو جاتا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو اپنے دوسرے غلاموں کے سپرد کر دیتا کہ اسے سورج کی گرمی میں پشت پر لٹا دو۔ اور دھوپ میں جلے ہوئے گرم پتھر اس کے سر سے لے کر پاؤں تک چُن دو اور اس کے اردگرد آگ جلا دو تا کہ اسے اپنے کام کی حقیقت معلوم ہو جائے جب دن ختم اور سورج غروب ہو جاتا تو حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو بیڑیاں اور طوق ڈال کر تاریک حجرے میں بند کر دیتا اور اپنے غلاموں سے کہتا کہ باری باری ساری رات اسے کوڑے مارو اور صبح تک کوڑے کی آواز بند نہ ہو۔ حضرت بلال رضی اللہ عنہ اس زبردست تکلیف میں وقت گزارتے اور احد احد کہتے یعنی میرا خدا ایک ہے' میرا خدا ایک ہے۔

ایک دن حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا رات کے وقت اس کوچے سے گزر ہوا اس لعین کے گھر سے گریہ وزاری کی آواز آپ کے کانوں میں پہنچی۔ پوچھا کہ اس کے گھر میں کیا واقعہ رونما ہوا ہے؟ لوگوں نے کہا کہ وہ بلال نامی اپنے غلام کو عذاب دے رہا ہے اور

وہ غلام گریہ وزاری کرتا ہے۔ صبح ہوتے ہی حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس کے گھر گئے اور اسے نصیحت فرمانے لگے کہ خدا سے ڈر اور اس غلام کو ناحق سزا نہ دے اور ظلم نہ کر۔ کیونکہ اس نے دینِ حق کو قبول کیا ہے اور خدا تعالیٰ کی دوستی حاصل کی ہے۔ چاہیے کہ تو اس غلام کو غنیمت سمجھے اور اس کے ساتھ اچھا سلوک کرے کہ آخرت میں تیرے کام آئے اس لعین نے کہا کہ آخرت کہاں ہے اور یہ دین کہاں سے حق بن گیا اور اگر بالفرض آخرت ہو بھی تو مجھے دنیا میں کیا کمی ہے کہ آخرت کی بنی بر وہم نعمتوں پر فریفتہ ہو جاؤں۔ جنت میرے پاس نقد موجود ہے جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ مال کی کوئی قسم نہیں جو میرے خزانوں اور کارخانوں میں موجود نہیں۔

حضرت ابوبکر صدیق کا حضرت بلال کو خریدنا رضی اللہ عنہما

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے پھر اسے نصیحت فرمائی اس نے کہا کہ اگر اس غلام کے بارے میں آپ کو دلی تکلیف ہے تو آپ کے پاس مال بھی وافر مقدار میں موجود ہے اور آپ آخرت کا عقیدہ بھی رکھتے ہیں تو آخرت کا ثواب حاصل کرنے کے لیے اسے مجھ سے خرید کیوں نہیں لیتے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ بالکل میری یہی آرزو ہے۔ تو جو چاہے اس کے بدلے میں اسے خریدتا ہوں اس کافر نے عاجز کرنے کے طور پر کہا کہ آپ اسے خرید نہیں سکتے اور اگر اس کام کا ذوق ہے تو نسطاس رومی مجھے دے دیں۔ جو کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے غلاموں میں سے تجارت کے بارے میں بہت لائق اور قابل تھا اور اس نے دو ہزار دینار سرمایہ جمع کیا تھا اور یہ غلام لے لیں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے جان و دل سے قبول کیا بلکہ چالیس اوقیہ چاندی اس پر مزید بڑھا دی اور اسے پہنچا دی اور حضرت بلال رضی اللہ عنہ کا ہاتھ پکڑ کر قید خانے سے باہر لائے اور اپنے ہمراہ لے گئے۔

وہ بدبخت کافر ہنس رہا تھا اور اپنے پاس بیٹھنے والوں سے کہہ رہا تھا کہ یہ شخص کمال ذہانت اور عقل کے ہوتے ہوئے کاروبار میں کس قدر نقصان میں رہا۔ اگر کوئی یہ غلام مجھے فروخت کرتا تو میں اسے درہم کے چھٹے حصے کے عوض بھی نہ خریدتا جبکہ اس شخص نے اس

طرح کے قابل غلام کے ساتھ تبادلہ کر لیا جو کہ دو ہزار دینار کا مالک ہے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے یہ بات سن کر فرمایا کہ میری نظر میں یہ غلام اس مرتبے کا ہے کہ اگر تو یمن کی ساری بادشاہی کے عوض بیچتا تو میں خرید لیتا۔

بعد ازاں حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں پیش کر کے عرض کی کہ یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم میں نے یہ غلام اس طرح خریدا ہے' آپ گواہ رہیں کہ میں نے رضائے خداوندی کے لیے اسے آزاد کر دیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا اس دن سے حضرت بلال رضی اللہ عنہ فارغ البال ہو کر بارگاہِ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی حاضری کی سعادت سے مشرف ہوئے۔

فضائل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اور آپ کے آزاد کردہ غلاموں کی تفصیل

اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ابتدائے اسلام اور مسلمانوں کی انتہائی کمزوری اور غربت کے وقت اپنا مال راہِ خدا میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اخراجات' مسلمانوں کو کفار کے ہاتھوں چھڑانے اور دوسرے اچھے طریقوں پر خرچ کر کے آخرت کا ذخیرہ جمع فرمایا جیسا کہ حضرت بلال رضی اللہ عنہ کے واقعہ میں آپ نے جو کچھ خرچ کیا' معلوم ہو چکا اور اسی طرح آپ نے قریش کے سات غلاموں اور کنیزوں کو جو کہ دینِ اسلام پر مضبوطی سے قائم تھے اور ان کے مالک کفر کے تعصب کی بناء پر انہیں قسم قسم کے عذاب دیتے تھے' خرید کر آزاد فرمایا۔

ان میں سے ایک عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ ہیں جو کہ ہجرت کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھے' آپ نے انہیں ان کے مالکوں سے جو کہ بنی جدعان تھے' ایک رطل خالص سونے کے عوض خرید کر آزاد فرمایا۔ جو کہ شاہجہان آباد میں رائج آدھ سیر کے قریب ہے۔ عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ بیرِ معونہ کے واقعہ میں شہید ہوئے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے اکابر اولیاء اللہ میں سے تھے۔

ان میں سے ایک زنیرہ رضی اللہ عنہا ہیں جو کہ ایمان و صلاحیت میں عظیم المرتبت کنیز تھیں۔ جب آپ نے اسے خرید کر آزاد فرمایا اس کی آنکھوں میں درد ہوئی اور بینائی ختم

ہوگئی' پر انے مالکوں نے ایک دن طعن و تشنیع کرتے ہوئے کہا کہ تو نے لات اور عزیٰ کا کرشمہ دیکھا کہ کس طرح تیری بینائی سلب کر لی اس نے کہا تم جھوٹ کہتے ہو لات وعزیٰ میں یہ طاقت نہیں کہ اللہ تعالیٰ کے حکم کے سوا کسی کو کوئی نقصان یا نفع پہنچائیں۔ پس اللہ تعالیٰ نے اس کی اس بات پر مہربانی فرمائی اور اسی وقت اس کی بینائی درست ہوگئی۔

اور ان میں سے مہدیہ اور اس کی بیٹی ہے' دونوں بنی عبدالدار کی ایک عورت کی ملک تھیں' وہ عورت انہیں سخت عذاب دیتی تھی۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اس ماجرا پر مطلع ہوکر اس عورت کے ہاں تشریف لے گئے اور اسے نصیحت فرمائی کہ ان سے دست بردار ہو جا اور ان کی قیمت میں جو چاہے' مجھ سے لے لے اس عورت نے بھاری قیمت کا مطالبہ کیا۔ آپ نے اسی وقت ادا کر دی اور ان دونوں کو جو کہ اس عورت کا آٹا پیسنے میں مصروف تھیں' خوش خبری دی کہ میں نے تمہیں خرید کر آزاد کر دیا ہے۔ اب اٹھو اور میرے ساتھ آؤ' ان دونوں نے عرض کی کہ حضرت! اتنے سالوں کی صحبت کا حق یہ ہے کہ ہم اس ڈیوٹی سے فارغ ہوکر اسے آٹا پہنچا کر پھر حاضر ہوں۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا شاباش! تمہارا صبر بہت اچھا ہے' ایسا ہی کرو۔

اور ان میں سے ایک کنیز ہے جو کہ بنو مومل کی ملک تھی جو کہ بنو عدی کا ایک گروہ ہے اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس وقت مشرف بہ اسلام نہیں ہوئے تھے۔ آپ اس لونڈی کو اسلام کے بارے میں شدید ایذاء دیتے تھے یہاں تک کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے اسے بھی خرید کر آزاد فرمایا۔ علیٰ ہذا القیاس اُم عبیدہ اور چند اور لوگوں کو بھی آزاد فرمایا۔

اور ان تمام اخراجات کے بعد چالیس ہزار درہم جو کہ آپ کا سرمایہ تھا' حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر اور آپ کے حکم پر مسلمانوں کی ضروریات پر خرچ فرمایا اور چھ ہزار درہم جو کہ مکی زندگی کے تیرہ سال کے عرصے میں باقی بچ گئے تھے' ہجرت کے دوران' مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوات والتسلیمات کی زمین کی خریداری اور خیرات کی دوسری وجوہ میں خرچ کر دیئے۔ چنانچہ یہ کلمات حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک پر بارہا آئے ہیں کہ مانفعنی مال احد قط مانفعنی مال ابی بکر یعنی مجھے کسی کے مال نے کبھی اتنا نفع نہ دیا جتنا کہ ابوبکر (رضی اللہ عنہ) کے

مال نے نفع دیا۔

حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مال اور دیگر خدام کے مال میں فرق

کیونکہ ظاہر ہے کہ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا اور جناب ابوطالب اور حضرت عبدالمطلب کا مال جو کہ حضور علیہ السلام کے خرچ میں آیا' صرف خوراک' پوشاک' صلہ رحمی' مہمان نوازی اور محتاجوں کی خبر گیری کے لیے تھا جبکہ یہ مال عظمتِ اسلام بڑھانے' کفار کے ہاتھوں سے مسلمانوں کو چھڑانے اور کمزور مسلمانوں کی امداد کرنے کا موجب تھا اور ان دونوں قسم کے خرچ میں آسمان وزمین کا فاصلہ ہے۔

بارگاہِ خداوندی سے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ پر سلام

اس کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا مال بالکل ختم ہو گیا اور آپ پر فقر نے غلبہ کیا' ایک دن آپ کرتے کی جگہ ایک کمبل گلے میں ڈالے اسے ایک کانٹے کے ساتھ باہم جوڑے ہوئے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس مبارک میں حاضر تھے کہ جبرئیل علیہ السلام نازل ہوئے اور پوچھا کہ یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم باوجود اتنے مال دار ہونے کے ابوبکر کا یہ کیا حال ہے کہ اس فقیرانہ لباس میں بیٹھے ہیں؟ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا انہوں نے اپنا سارا مال مجھ پر اور میری راہ میں خرچ کر کے ختم کر دیا ہے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام نے کہا کہ خداتعالیٰ نے ابوبکر پر سلام فرمایا ہے اور پوچھا ہے کہ کہو اس فقر کی صورت میں مجھ پر راضی ہو یا کوئی خلش ہے؟ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ پر یہ سنتے ہی ایک کیفیت طاری ہو گئی کہ اربابِ وجد کی طرح مست ہو کر کہہ رہے تھے کہ مجھے اپنے پروردگار کے ساتھ کیا خلش ہے؟ اور بار بار بلند آواز کے ساتھ یہی نغمہ سرائی فرما رہے تھے کہ انا عن ربی راض انا عن ربی راض میں اپنے رب سے راضی ہوں' میں اپنے رب سے راضی ہوں۔

اللہ تعالیٰ اس سورۃ میں ان دونوں معاملات کا ذکر فرما رہا ہے اور تمام نیکیوں اور گناہوں کا معاملہ۔ لوگوں کی ہمتوں اور ان کی کوششوں کا اختلاف جو کہ نیکی اور بُرائی حاصل کرنے میں مختلف اور جدا جدا واقع ہوئے' انہیں دونوں معاملات پر قیاس فرماتا ہے۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

وَاللَّیۡلِ اِذَا یَغۡشٰی مجھے رات کی قسم ہے جس وقت کہ سورج کے نور کو ڈھانپ لیتی ہے اور جہان کو تاریک کر دیتی ہے اور یہ بُرے عمل کا نمونہ ہے جو کہ روح اور قلب کے نور کو اپنی تاریکی کے ساتھ ڈھانپ لیتا ہے اور چھپنے اور پوشیدہ ہونے کا وقت بھی ہے اور جو اعمال کہ ستر اور حیا کے ساتھ متعلق ہیں' زیادہ تر اسی وقت واقع ہوتے ہیں جیسے راز کی بات کہنا' چھپ کر بھاگنا' چوری کرنا' بدکاری کرنا' جادو ٹونہ اور شیطانی اعمال۔

وَالنَّہَارِ اِذَا تَجَلّٰی اور مجھے دن کی قسم ہے جب سورج طلوع ہونے اور بادل اور غبار چھٹنے کے ساتھ روشن ہو جو کہ روح اور قلب کو روشن کرنے میں نیک عمل کا نمونہ ہے اور جو اعمال ظہور اور بے حجابی کے ساتھ تعلق رکھتے ہیں' زیادہ تر اسی میں واقع ہوتے ہیں جیسے روزی کی تلاش' کمائی کے لیے مخلوق کا منتشر ہونا' ایک دوسرے کی ملاقات اور فائدہ دینا اور لینا۔

وَمَا خَلَقَ الذَّکَرَ وَالۡاُنۡثٰی اور اس حکمتِ الٰہی کی قسم جس نے حیوانات کی اقسام سے نر اور مادہ کو پیدا فرمایا۔ تاکہ وہ ملیں اور نسل' دودھ اور گھی پیدا ہو۔ اور نر اور مادہ کی یہ پیدائش اعمال میں خیر اور شر اور کمال اور نقصان کے مخلوط ہونے کا نمونہ ہے اور بے شمار نتائج اور ثمرات پیدا ہونے کا سبب ہے کہ ایک میں خیر اور شر' کمال اور نقصان کی توقع نہ تھی اور جس مضمون پر یہ تین قسمیں اُٹھائی گئی ہیں' یہ ہے کہ

اِنَّ سَعۡیَکُمۡ لَشَتّٰی تحقیق اعمال اور مصروفیات میں تمہاری کوشش بہت مختلف اور رنگارنگ ہے' ایمان اور کفر' صلاح اور فسق' سخاوت اور بخیلی علیٰ ہذا القیاس اور آدمیوں کے اچھے بُرے اعمال کا اختلاف اس حد تک ہے کہ اسے ضبط نہیں کیا جا سکتا مگر یہ کہ ان کی بنیادی قسمیں تین اقسام سے باہر نہیں ہیں۔ پہلی قسم صرف خیر' دوسری قسم نرا شر' تیسری قسم جہاں خیر اور شر دونوں آپس میں مخلوط ہیں۔ چنانچہ ان تینوں قسموں میں ان تین اقسام کا اشارہ فرمایا گیا ہے۔

محض خیر ان اعمال میں ہے جن کا ظاہر و باطن نیک ہو اور وہ ایسا عمل ہے جس میں تین

ارکان پائے جائیں' اس کی صورت جائز ہو' نیت خالص ہو اور صحیح عقیدے اور درست یقین پر مبنی ہو۔

محض شر وہ ہے جس میں تینوں چیزیں ناپید ہوں اس کی صورت ناجائز' نیت فاسد اور وہ غلط عقیدے پر مبنی ہو اور جس میں خیر اور شر مخلوط ہوں' اس کی چند قسمیں ہیں۔ پہلی قسم یہ ہے کہ اس کی صورت جائز ہو اور نیت خراب جیسا ریا کاری کی نماز' دوسری قسم یہ ہے کہ اس کی صورت ناجائز اور نیت صحیح جیسے شہدائے کربلا کے لیے نوحہ و ماتم اور شوقِ الٰہی اُبھارنے کے لیے مزامیر کا سننا' تیسری قسم یہ ہے کہ صورت اور نیت دونوں صحیح ہوں مگر اعتقاد درست نہ ہو جیسے کفار کی مالی عبادات۔ جو صرف اللہ تعالیٰ کی رضا کے لیے عمل میں لاتے ہیں اور ان اقسام میں سے ہر ایک بہت وسعت رکھتی ہے اور اس میں بے شمار انواع اقسام کی گنجائش ہے جیسا کہ غور کرنے والے پر مخفی نہیں ہے لیکن ان تمام انواع و اقسام کی جائے بازگشت یہی تین اقسام ہیں اور یہ تینوں اقسام جزا میں تفریق کا سبب ہوئی ہیں اور ہر ایک قسم ثواب اور عذاب کا جدا جدا یا ایک دوسرے کے ساتھ مخلوط ہو کر تقاضا کرتی ہے۔ چنانچہ مال خرچ کرنے کے بارے میں اس اختلاف کی تفصیل کہ اس سورۃ میں یہی بیان کرنا مقصود ہے' بیان کی جارہی ہے۔

فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی تو جس نے اپنا مال دیا۔ وَاتَّقٰی اور ریاء وسمعہ سے' گناہوں اور شہوتوں میں خرچ کرنے سے' بدعتیوں کی مدد کرنے سے پرہیز کیا اور خرچ کرنے کے بعد بھی احسان جتلانے اور عوض مانگنے سے پرہیز کیا۔

وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی اور اچھی شریعت اور اچھی جزا کی تصدیق کی جس کی اسے دار آخرت میں توقع ہے۔ تو اس شخص نے وہ عمل کیا جو کہ ہر طرح سے نری خیر ہے۔ اس کا ظاہری عمل مال دینا ہے جو کہ ساری شریعتوں میں جائز ہے۔ اور اس کا باطنی عمل ریاء وغیرہ سے بچنا ہے جو کہ نیت کو صحیح کرنے اور مال خرچ کرنے کے انجام کو باقی رکھنے میں کافی ہے۔ اور اس کا عقیدہ بھی صحیح اور درست ہے کہ اچھی شریعت اور آخرت میں اعمال کی جزا کی تصدیق کرتا ہے اور اس کی توقع پر مال خرچ کرتا ہے۔ پس وہ اچھی جزا کا مستحق ہو گیا۔

چنانچہ فرمایا جارہا ہے کہ

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى پس قریب ہے کہ ہم اس کی نظر میں آسانی کی راہ آسان کر دیں۔ یعنی ہم اسے تمام دنیوی خیرات اور آخرت کے درجات قرب کی توفیق عطا فرمائیں تاکہ اس کی وجہ سے نیکیاں اور عبادتیں آسان ہو جائیں اس لیے کہ نیک اعمال کی خاصیت ہے کہ جب کوئی شخص ان پر ہمیشگی کرتا ہے اس کے نفس میں نورانی استعداد پیدا ہو جاتی ہے جس کی وجہ سے اس پر خیر کی راہ پر چلنا آسان ہو جاتا ہے حتیٰ کہ اس کا تکلف طبیعت کا حکم حاصل کر لیتا ہے اور العبادۃ طبیعۃ ثانیہ اسے اس راہ پر چلنے میں کوئی تکلیف اور مشقت نہیں رہتی۔ پھر جب موت اور اس دنیا سے جانے کا وقت پہنچے تو اسے اور آسانی نصیب ہوتی ہے اور موت کے بعد نکیرین کے سوال' حشر ونشر' حساب' میزان اور پل صراط سے گزرنے میں بھی اسے آسانی پر آسانی عطا کی جاتی ہے اور ان سخت مقامات میں اس پر کوئی رنج اور دُکھ نہیں رہتا۔

وَاَمَّا مَنْۢ بَخِلَ وَاسْتَغْنٰى اور جس نے اپنے مال میں بخل کیا اور اخروی نعمتوں سے لاپرواہی کی اور اسے اپنی لاپرواہی کا سرمایہ سمجھا۔

وَكَذَّبَ بِالْحُسْنٰى اور اچھی شریعت اور اچھی جزا کی تکذیب کی تو اس شخص نے ایسا عمل کیا جو نرا شر ہے اس لیے کہ بخل تمام دینوں میں مذموم اور معیوب ہے اور آخرت کے ثواب سے لاپرواہی کرنے کی وجہ سے اچھی نیت بالکل دگرگوں ہوگئی۔ اور شریعت کی تکذیب کی وجہ سے اس کا عقیدہ خراب ہوگیا۔ پس نہ اس کے ظاہری عمل میں جو کہ بخل ہے نہ باطنی عمل میں جو کہ ثواب آخرت سے مال کی وجہ سے لاپرواہی کرتا ہے اور نہ اس کے اعتقاد میں جو کہ شریعت کی تکذیب ہے۔ کسی وجہ سے اچھائی نہ رہی پس اس کی جزا بھی محض بُری ہوگی چنانچہ فرمایا جارہا ہے کہ

فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى تو قریب ہے کہ ہم اس کی نظر میں دشواری اور سختی کی راہ آسان کریں حتیٰ کہ وہ غلط راہ اور بُرے اعمال میں تکلیفیں اُٹھاتا ہے اور رنج برداشت کرتا ہے جبکہ دو رکعت نماز میں سستی کرتا ہے اور جی چراتا ہے جیسا کہ دوسرے مقام پر اس قسم کے لوگوں

کے بارے میں فرمایا گیا ہے کہ اِذَا قَامُوْا اِلَی الصَّلٰوۃِ قَامُوْا کُسَالٰی نیز فرمایا گیا کہ وَاِنَّھَا لَکَبِیْرَۃٌ اِلَّا عَلَی الْخَاشِعِیْنَ اور جب موت کا وقت آ پہنچے تو انتہائی سختی سے اس جہان سے جائے اور موت کے بعد نکیرین کے سوال' حشر ونشر' حساب' میزان اور جہنم کے کئی قسموں کے عذاب میں سختی پر سختی دیکھے اور جس مال کو اس نے اس قسم کی سختیوں کے لیے سنبھال رکھا تھا اور اسے اس کی توقع تھی کہ سختی کے وقت کام آئے اور سختی کو آسان کرے اس سے جدا ہو کر لوٹنے والے ورثاء کے ہاتھوں میں جا پڑے۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے

وَمَا یُغْنِیْ عَنْهُ مَالُهٗ اِذَا تَرَدّٰی اور جب وہ ہلاک ہو تو اس کا مال اس کے کسی کام نہ آئے اور ایک کفن کے سوا کچھ بھی ہمراہ نہ لے جائے۔

یہاں جاننا چاہیے کہ بنی آدم کے اعمال جیسا کہ قسم میں اس کا اشارہ گزرا ہے' تین قسم کے ہیں اور جزا کے بیان میں صرف دو قسم کے اعمال کی جزا کے ذکر پر اکتفاء فرمایا گیا جو کہ خیر محض اور شر محض ہیں اور اس عمل کی جزا کو جس میں خیر اور شر مخلوط ہوں' درمیان میں نہیں لایا گیا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عقل مند تھوڑی سی توجہ سے اس کے حکم کو ان دو قسموں کے حکم سے معلوم کر سکتا ہے اس لیے کہ جہاں خیر اور شر جمع ہوتے ہیں' النتیجه تتبع الاخس الارذل یعنی نتیجہ ردی اور ذلیل شے کے تابع ہوتا ہے' کے مطابق شر کا حکم غالب آتا ہے اور خیر کا حکم مغلوب ہو جاتا ہے۔

مسئلہ شرعی

چنانچہ شریعت میں یہ بات طے شدہ ہے کہ جو حیوان حلال اور حرام جانور سے پیدا ہوا ہو' حرام ہے جیسے خچر اور جس مال میں حلال اور حرام مخلوط ہو کر ایک جان ہو جائیں جیسے اپنا دودھ چھینے ہوئے دودھ یا اپنا دودھ چھینے ہوئے پانی کے ساتھ مل کر شربت ہو گیا ہو' حرام ہے تو اسی قیاس پر جب کسی عمل میں خیر اور شر جمع ہو جائیں' وہ عمل شر قرار پائے گا اور اس کا خیر ہونا مغلوب ہو جائے گا۔ واللہ اعلم

مذکورہ تین قسموں کی تخصیص میں نکتہ

اور بعض مفسرین نے ان تین قسموں کو خصوصیت کے ساتھ بیان کرنے کے نکتہ کے

متعلق یوں ذکر فرمایا ہے کہ بنی آدم کے اعمال کا اختلاف بیان کرنا مقصود ہے۔ پہلے رات اور دن کی قسم لائی گئی جو کہ اعمال کے اختلاف کا زمانہ ہے' چوروں کی رات اور عابدوں کی رات میں اور بدکاروں کی رات اور پرہیزگاروں کی رات میں جو فرق ہے' بالکل ظاہر ہے اسی طرح دن میں بھی اس کے بعد بنی آدم کے اصل الاصول جو کہ نر اور مادہ ہیں' میں بھی اعمال' افعال' ہمت اور رغبت کا پورا اختلاف ہے۔ مردوں کے اعمال اور ہیں اور ان کی ہمتیں بلند جبکہ عورتوں کے اعمال اور ہیں اور ان ہمتیں پست' مردوں کی رغبت نام اور مرتبہ حاصل کرنے میں مصروف ہے جبکہ عورتوں کی رغبت لباس اور آرائش میں محدود ہے۔ پس ان دونوں اصول کی قسم بھی یاد فرمائی گئی تا کہ بنی آدم کے اعمال کے مختلف ہونے' ہمتیں اور محرکات جدا جدا ہونے کی دلیل ہو کہ اصل کا حکم فرع پر جاری ہوتا ہے اسی لیے کہا گیا ہے کہ الولد سر لابیہ اور حضرت امیر خسرو قدس سرہ العزیز کا ارشاد ہے۔

در جوانمردی و مردی ہر کہ کارے پیش برد
تا جوانمردی بود گر برزباں آرد سخن

یعنی مردی میں جس نے کوئی کام کیا اگر زبان پر اس کے متعلق کوئی بات لائے تو جوانمردی نہیں ہوگی۔

آنکہ او کرد و نگفت اورا شمر مرد تمام
وانکہ او کرد و بگفت او زن بود بے ہیچ ظن

جس نے کام کیا اور زبان سے اس کی بات نہیں کی' اسے پورا مرد سمجھو اور جس نے کام کیا اور اس کے متعلق بات کی وہ بلاشبہ عورت ہے۔

آنکہ نا کرد و نگفت آنرا مداں جزنیم مرد
وآنکہ نا کرد و بگفت اور الخواں جزنیم زن

اور جس نے کام کیا نہ بات کی اسے صرف آدھا مرد سمجھو اور جس نے کام نہ کیا اور بات کی اسے آدھی عورت کہو۔

اور زمان کا حکم بھی زیادہ تر زمانے والوں پر جاری ہوتا ہے جیسا کہ حضرت امیر المومنین

علی کرم اللہ وجہہ نے فرمایا ہے کہ الناس بزمانھم اشبہ منھم بآبائھم لوگو! اپنے آباؤ اجداد کی نسبت اپنے زمانے کے مشابہ زیادہ ہوتے ہیں اور حدیث شریف میں حضرت امیرالمومنین علی کرم اللہ وجہہ سے وارد ہے کہ ہم حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ ایک شخص کے جنازے میں نکلے اور آپ قبر کی تیاری کے انتظار میں تشریف فرما ہوئے' ہم آپ کے اردگرد بیٹھ گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تم میں سے ہر شخص کی جگہ جنت یا دوزخ علم الٰہی میں مقدر ہے اور لوحِ محفوظ میں لکھی ہوئی ہے جس میں تغیر و تبدل کی کوئی راہ نہیں۔ ہم نے عرض کی یارسول اللہ! صلی اللہ علیہ وسلم اگر معاملہ یوں ہے تو ہم اپنے متعلق لوحِ محفوظ کی تحریر پر اعتماد کیوں نہ کریں اور عمل کیوں ترک نہ کریں کہ بے فائدہ تکلیف کیوں برداشت کی جائے' جو ہونا ہے' ہو کے رہے گا؟ آپ نے فرمایا کہ عمل کرتے جاؤ۔ اس لیے کہ ہر کسی کو اسی عمل کی توفیق دی جاتی ہے جس کے لیے اسے پیدا کیا گیا ہے اگر اسے نیک بخت پیدا کیا گیا ہے تو اس سے نیک بختوں کے اعمال صادر ہوتے ہیں۔ اور اگر اسے بدبخت پیدا کیا گیا ہے تو اس سے بدبختوں کے اعمال صادر ہوتے ہیں تو جس طرح کہ ہر کسی کا مکان جنت یا جہنم مقرر ہے اسی طرح اچھے بُرے اعمال بھی ہر کسی کے لیے مقرر ہیں پھر آپ نے یہ آیت تلاوت فرمائی فَاَمَّا مَنْ اَعْطٰی وَاتَّقٰی آخر تک تلاوت فرمائی۔

مسئلہ تقدیر کی ایک نفیس توجیہ

اور یہاں یہ آیت تلاوت فرمانے سے ایک اور معنی سمجھ میں آتا ہے یعنی تمہارے کام علمِ الٰہی میں مختلف اور رنگارنگ ہیں' کسی کو نیک اور کسی کو فاسق لکھا گیا ہے اور دنیا میں اسی کے مطابق اس سے اچھے اور بُرے اعمال صادر ہوتے ہیں۔ پس اَعْطٰی وَاتَّقٰی وَصَدَّقَ بِالْحُسْنٰی سے مراد یہ ہے کہ علم الٰہی میں یہ اعمال اس سے مقدر ہیں اور فَسَنُيَسِّرُهٗ لِلْيُسْرٰى سے مراد یہ ہے کہ وہ دنیا میں ان کاموں کی توفیق پاتا ہے۔

حاصلِ کلام یہ ہے کہ اعمال کو جس مرتبے میں دیکھیں' ایک نتیجہ رکھتے ہیں۔ علمِ الٰہی میں کہ اچھے' بُرے اعمال مقدر ہیں۔ اس کا پھل دنیا میں توفیق اور رسوائی کا حاصل ہونا ہے اس لیے کہ دنیا عالمِ تقدیر کا سایہ ہے اور اس کے ساتھ اس کی نسبت ایسے ہے جیسے بنائی گئی

چیز کی نسبت اس کے سانچے کے ساتھ ہوتی ہے کہ اس سے کم و بیش نہیں ہو سکتی اور اگر انسان سے صادر ہونے کے بعد ان اعمال کو دیکھیں تو اس کا پھل اُخروی جزا ہے کہ آخرت اس کھیتی کے کاٹنے کا وقت ہے جسے دنیا میں کاشت کر گئے ہیں۔

بیت

از مکافات عمل غافل مشو
گندم از گندم بروید جو زجو
ایں چنیں گفتہ است پیر معنوی
کائے برادر ہرچہ کاری بدروی

یعنی عمل کی جزا سے غافل نہ ہو' گندم سے گندم اور جو سے جو اُگتے ہیں۔ پیر معنوی نے یوں فرمایا ہے کہ اے بھائی تو جو بوئے گا' وہی کاٹے گا۔

اور چونکہ یہاں اِک شبے کا گمان ہے کہ اگر نیکی اور بدی کی توفیق دربارِ الٰہی سے ہے تو پھر سب لوگوں کو نیکی کی توفیق کیوں نہیں دی جاتی اور برائی کی راہ سے مجبور کر کے کیوں نہیں روکا جاتا تاکہ سب کو آسانی کی راہ میسر آئے اور کوئی شخص سختی کا چہرہ نہ دیکھے اس کے جواب میں دو مقدمے ارشاد فرمائے جارہے ہیں۔

پہلا مقدمہ یہ ہے کہ اِنَّ عَلَيْنَا لَلْهُدٰى تحقیق نیکی اور بدی تک پہنچنے کے راستے کی رہنمائی اور دلالت کرنا ہمارے ذمے ہے۔ اور ہم یہ ہر کسی کے لیے کرتے ہیں۔ پہلے تو ہم نے ہر کسی کو قوتِ عقلیہ سمیت ظاہری حواسِ خمسہ اور باطنی حواسِ خمسہ عطا فرمائے جو کہ خیر اور شر میں تمیز کرتے ہیں۔ اس کے بعد ہم نے انبیاء علیہم السلام کی بعثت' کتابوں کے نزول' شرائع اور احکام کے بیان' جنت کی نعمتوں اور جہنم کی سختیوں کا ذکر' صاحبِ ارشاد لوگوں اور واعظوں کے تقرر اور تنبیہ اور عبرت کے اسباب کو پیدا کرنے کے ساتھ سیدھی راہ کو ٹیڑھی راہ سے جدا اور ممتاز کر کے سب کو پتہ دے دیا۔ اور مجبور کر کے اچھی راہ پر چلانا اور بُری راہ سے دُور رکھنا ہماری ذمہ داری نہیں ہے بلکہ دو راستوں میں سے ایک پر چلنے کو اختیار کرنا ہم نے بندے کے ارادے اور خواہش کے ساتھ وابستہ کر چھوڑا ہے۔ ورنہ امتحان اور اختیار ثابت نہ

ہو اور اطاعت گزار' نافرمان سے ممتاز نہ ہو کیونکہ جب تو راہِ راست پر چلنے کے لیے سب مجبور ہو جاتے اور ہدایت پانے والے کو گمراہ پر فضیلت میسر نہ آتی بلکہ ہدایت پانے اور گمراہ کرنے کی صورت ہی نہ بنتی اور آدمی آسمان' ستاروں' ہوا' مٹی' پانی اور آگ کی طرح چارو ناچار تسخیر اور اطاعت میں ہوتا اور انسانی تخلیق کی خصوصیتیں جو کہ ان چیزوں سے پورا امتیاز چاہتی ہیں' بے کار اور معطل رہ جاتیں اور کیا' نہ کیا برابر ہو جاتا۔

دوسرا مقدمہ یہ کہ وَاِنَّ لَنَا لَلْاٰخِرَةَ وَالْاُوْلٰى اور تحقیق عالمِ آخرت اور عالمِ دنیا لیے اور ہمارے لیے اور ہمارے ہی تصرف میں ہے۔ تو جو ہم سے آخرت طلب کرے' اسے ہم آخرت دیتے ہیں۔ اور جو دنیا طلب کرے اسے دنیا تک پہنچاتے ہیں اور جو دونوں چاہے تو دونوں سے نوازتے ہیں اور اگر ہم سب کو مجبور کر کے آخرت کی راہ پر چلاتے تو جہانِ دنیا خراب اور بے وقعت ہو کر رہ جاتا۔ اور دنیوی آرائشیں اور تکلفات عدم کے پردے میں چھپی رہ جاتیں۔ اور انہیں حاصل کرنے میں کوئی رغبت نہ کرتا۔ پس دونوں جہانوں کی تعمیر کے لیے لوگوں کی ہمتوں کو ہم نے مختلف کر دیا اور ہر کسی کے دل میں اسی کام کی خواہش ڈال دی جو کہ ان دونوں جہانوں میں سے ایک کی تعمیر کے لیے مطلوب ہے اور کیا ہی خوب کہا گیا ہے کہ ؎

ہر کسے را بہر کارے ساختند
میل آں را در دلش انداختند

اور جس وقت فَسَنُیَسِّرُهٗ لِلْعُسْرٰى کے لفظ میں اجمالی طور پر اس سختی کا ذکر فرمایا گیا جو کہ بد عمل کو درپیش ہے اب اس سختی کی اقسام میں سے جو سب سے زیادہ شدید اور قبیح ہے' اس کا ذکر فرمایا اور اس سے ڈرایا جا رہا ہے۔

فَاَنْذَرْتُكُمْ نَارًا تَلَظّٰى پس میں تمہیں اس آگ سے ڈرا رہا ہوں جو کہ شعلے مارتی ہے اور اس کا شعلہ اس قدر بلند ہوتا ہے کہ کافر کو دو سو سال کی راہ سے اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور وہ کافروں کے لیے مخصوص آگ ہے۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے

لَا يَصْلٰهَآ اِلَّا الْاَشْقَى اس آگ میں تمام بدبختوں سے زیادہ بدبخت ہی داخل ہوگا جو

کہ کافر ہے۔

بدبختی کی اقسام

یہاں جاننا چاہیے کہ بدبختی کی چند قسمیں ہیں کسی کو دنیا میں بدبخت کیا جاتا ہے کہ اس کا جسم کسی زحمت میں مبتلا ہوتا ہے اور ہر تلاش وکمائی میں مال حاصل کرنے سے محروم رہتا ہے حتیٰ کہ لوگوں کے نزدیک خوار‘ ذلیل اور بے وقعت ہوتا ہے۔ اور کسی کو امورِ آخرت میں بدبخت کیا جاتا ہے اور اس کے بھی کئی درجے ہیں۔ بعض کو صغیرہ گناہوں پر ضد کرنے اور نیکیوں میں کوتاہی کرنے میں مبتلا کرتے ہیں اور کسی کو کبیرہ گناہوں کے ارتکاب اور توبہ کی توفیق سے محرومی میں گرفتار رکھتے ہیں۔ اور کسی کو بدبختی کے سب سے اونچے مرتبے شرک و کفر کے ساتھ نامزد کرتے ہیں۔

تو جب دنیوی امور فانی اور زائل ہونے والے ہیں‘ ان امور میں بدبختی کا اتنا وزن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہاں بدبخت وہی ہے جو کہ امورِ آخرت میں بدبخت ہے۔ اور ان امور میں سے بھی بعض اس سطح کے ہیں کہ برزخ میں سختیاں دیکھنے اور کئی قسم کا عذاب چکھنے اور مقاماتِ قیامت‘ حشر ونشر‘ حساب اور میزان میں رنج اور مشقت اٹھانے اور انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ کی شفاعت کی امداد کی وجہ سے ختم ہو جائیں گے جیسے صغیرہ اور کبیرہ گناہ اور بعض اس سطح کے ہیں کہ ان کا اثر زائل نہیں ہوگا اور ان کے تدارک میں کوئی سفارش کام نہیں آئے گی تو جو شخص پہلی قسم میں گرفتار ہے‘ شقی ہے اور جو دوسری قسم میں گرفتار ہوا‘ اشقیٰ ہو گیا اسی لیے اشقیٰ کی تفسیر اس آیت کے ساتھ فرمائی جا رہی ہے۔

اَلَّذِیْ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی یعنی بدبختوں میں سب سے زیادہ بدبخت وہ ہے جس نے دین کی تکذیب کی اور حکمِ خداوندی سے روگردانی کی۔ اور یہ تفسیر سوائے کافر کے کسی پر پوری نہیں اُترتی کیونکہ مومن اگرچہ گناہوں کا ارتکاب کرتا ہے لیکن اس کی دینی تصدیق میں رخنہ نہیں پڑتا اور وہ حکمِ خداوندی کو قبول کرنے سے کبھی روگردانی نہیں کرتا۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال باقی رہ گیا اور وہ یہ ہے کہ جب اشقیٰ کا معنی کافر ہوا تو آگ میں

داخل ہونے کو کافر میں منحصر کرنا کس طرح درست ہوا کیونکہ بعض گناہ گار مومن بھی آگ میں داخل ہوں گے؟ (العیاذ باللہ)

اس کا جواب یہ ہے کہ پہلے اشارہ ہو چکا ہے کہ شعلے مارنے والی آگ سے مراد ایسی آگ ہے جو کہ کفار کے ساتھ مخصوص ہے۔ گناہ گار مومن کو گرچہ آگ میں داخل ہونا ہوگا لیکن دوسری آگ میں نہ کہ اس آگ میں۔ تو حصر درست ہے۔

اور بعض مفسرین نے یوں فرمایا ہے کہ گناہ گار مومن کا دوزخ میں داخل ہونا چونکہ گھورنے اور ادب سکھانے کے انداز میں ہے۔ گویا داخلہ ہے ہی نہیں ایسا داخلہ جس کے بعد نکلنا ثابت ہی نہ ہو' کافر کے ساتھ مخصوص ہے۔ پس اس قسم کا حصر مراد ہے نہ کہ مطلق داخلہ جس طرح کہ کہتے ہیں کہ جنگ نہیں کی مگر زید نے' غنیمت نہیں پائی مگر عمرو نے۔ یعنی زیادہ جنگ نہیں کی مگر زید نے اور بے شمار مال غنیمت ہاتھ نہ آیا مگر عمرو کے۔

چونکہ اگلی آیت میں وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى کے الفاظ وارد ہیں' حرف حصر مذکور نہیں پس وہاں یہ شبہ بالکل ہی وارد نہیں ہوتا۔ اور وہ جو کہتے ہیں کہ اگر نارا تلظّٰی سے مراد کفار کے ساتھ مخصوص آگ ہے تو اس سے دور رہنے میں تمام ایمان والے شریک ہیں تو اتقی کی تعریف کیا ہوئی؟ ہم کہتے ہیں کہ اس آگ سے دور رہنا بھی بڑی وسعت رکھتا ہے اس سے انتہائی دوری اَتْقٰی کے لیے ہے جبکہ دوسرے ایمان والوں کے لیے اس قدر دوری نہیں ہے۔ نیز احتمال ہے کہ وَسَيُجَنَّبُهَا کی ضمیر مطلق آگ کی طرف لوٹتی ہو جیسا کہ مذکورہ آگ کا مقید ہونا دلالت کرتا ہے اور اس صورت میں مفید مدح ہو۔

تقی اور اتقیٰ کی تعریف

وَسَيُجَنَّبُهَا الْاَتْقَى اور قریب ہے کہ اس آگ سے اسے دور رکھا جائے جو کہ بہت تقویٰ والا ہے اور اہل شرع کی اصطلاح میں تقی وہ ہے جو کہ کفر' کبائر اور صغائر سے پرہیز کرے۔ اور اگر کبھی کوئی گناہ صادر ہو جائے تو توبہ استغفار اور ندامت کے ساتھ اس کا جلد تدارک کرے تا کہ اس گناہ کا اثر دل میں جگہ نہ پکڑے اور پختہ نہ ہو جائے۔ اور اتقیٰ کا مرتبہ اس حد سے زیادہ اونچا ہے اور وہ یہ ہے کہ آداب شریعت وطریقت چھوڑنے میں بھی احتیاط

اور پرہیز کرے اور گناہ کے وسوسوں اور بُری نیتوں سے بھی بچے اور ظاہر و باطن کو یکساں رکھے اور یہ معنی بہت نادر اور نایاب ہے۔

اور یہاں مفسرین کے اجماع کے مطابق اتقی سے مراد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ ہیں کہ یہ سورۃ آپ کی شان میں نازل ہوئی جیسا کہ اشقیٰ سے مراد اُمیہ بن خلف ہے جس نے شقاوت کفر کو بخل' نافرمانیوں' حضرت بلال رضی اللہ عنہ کو ستانے اور اسلام کی عداوت کے ساتھ جمع کر کے اشقیٰ کا درجہ حاصل کیا تھا۔

افضل البشر بعد الانبیاء علیہم السلام حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ ہیں

اور اہلِ سنت و جماعت نے اسی لفظ کے ساتھ انبیاء علیہم السلام کے بعد جو کہ خارج از بحث ہیں' حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ساری اُمت سے افضل ہونے کی دلیل پکڑی ہے اور دلیل اس طرح پکڑی ہے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو اللہ تعالیٰ نے یہاں اتقی فرمایا جبکہ دوسری آیت میں فرمایا ہے اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ تو دونوں آیات کے مجموعی تقاضے کے مطابق ثابت ہوا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ اللہ تعالیٰ کے ہاں اکرم الناس ہوں اور افضلیت کا معنی یہی ہے۔

افضلیت کے خلاف تفضیلہ کی دلیل اور اس کا جواب

اور فرقۂ تفضیلہ والے کہتے ہیں کہ اس آیت میں اتقی سے مراد تقی ہے نہ یہ کہ آپ کا تقویٰ ہر کسی سے بڑھا ہوا ہو اس لیے کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تقویٰ میں جناب رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے کمتر ہیں۔ پس اس معنی میں اتقی کا اطلاق ان پر درست نہیں بیٹھتا بلکہ یہ لفظ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہو گیا اور جب اتقی بمعنی تقی ہو تو آپ کی افضلیت پر دلالت نہیں ہوتی۔

اہلِ سنت اس کا جواب یہ دیتے ہیں کہ اتقی کو تقی کے معنوں میں لینا لغتِ عربیہ کے خلاف ہے تو کلامِ الٰہی کو جو کہ قرآن عربی ہے اس پر محمول کرنا درست نہ ہوگا۔ اور اس معنی پر محمول کرنے کی جو ضرورت بیان کی گئی ہے' وہ یوں دُور ہو جاتی ہے کہ کلام سارے لوگوں کے سارے میں ... انبیاء علیہم السلام ...

اللہ تعالیٰ کے حضور عزت اور مرتبے میں انبیاء علیہم السلام ممتاز ہیں' انہیں سارے لوگوں پر اور سارے لوگوں کو ان پر قیاس نہیں کیا جا سکتا۔ (معلوم ہوا کہ حضور علیہ السلام بلکہ تمام انبیاء علیہم السلام کو اپنے اوپر قیاس کرنا' عام انسانی کمزوریوں اور ضابطوں پر قیاس کر کے ان میں عام لوگوں کی سی صفات کا عقیدہ رکھنا منشاء قرآن مجید سے کھلی بغاوت ہے' عارف رومی رحمۃ اللہ علیہ نے کیا خوب فرمایا ۔

کار پاکاں را قیاس از خود مگیر
زانکہ باشد در نوشتن شیر و شیر

(محمد محفوظ الحق غفرلہ)

پس عرف شرع میں درجات کی فضیلت اور بڑائی کے سلسلے میں اس قسم کے الفاظ اُمت کے لیے مخصوص کیے جاتے ہیں اور عرف کی تخصیص ذکر کی تخصیص سے زیادہ قوی ہے۔ چنانچہ جو کہے کہ گندم کی روٹی دوسری روٹیوں سے بہتر ہے تو اس سے بادام کی روٹی سے افضل ہونا ہرگز نہیں سمجھا جائے گا اس لیے کہ بادام کی روٹی کا استعمال معروف ہے اور بحث سے خارج ہے کیونکہ اس قسم کے مقام میں بحث دانوں اور غلوں کے ساتھ مخصوص ہوتی ہے نہ کہ پھلوں اور میووں کے ساتھ۔

اور اہلِ سنت کے بعض بزرگوں سے سنا گیا ہے کہ فرما رہے تھے کہ یہاں اتقیٰ اپنے معنوں میں ہے یعنی وہ جو اپنے تمام ماسوا سے تقویٰ میں بڑا ہو خواہ پیغمبر ہو' خواہ اُمت لیکن ان لوگوں کے ساتھ مخصوص ہے جو کہ حیاتِ ظاہری میں ہوں۔ پس حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ' اپنی عمر کے آخری حصے میں جو کہ سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی رحلت کے بعد آپ کی خلافت کا زمانہ تھا اس کلمے کا مصداق ہو سکتے ہیں اور چونکہ حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام آسمان میں اُٹھائے گئے ہیں اور وہ اس سے مستثنیٰ ہیں اور اتقیٰ کے لیے لازم نہیں ہے کہ ہر وقت اور زندوں اور رحلت کرنے والوں میں سے ہر شخص کی نسبت سے تقویٰ میں بڑھا ہوا ہو ورنہ کسی کو اتقیٰ کہنا درست نہ ہو کیونکہ طفلی کے زمانے میں تقویٰ کا تصور نہیں ہے اور شرعی طور پر قابلِ تعریف ہر منصب میں اعتبار آخری عمر کا ہے جیسے صلاحیت' غوثیت' قطبیت'

ولایت اور نبوت اس لیے ان لوگوں کو جو کہ عمر کے آخری حصے میں ان درجات سے مشرف ہوئے ہیں' ان درجات کے الفاظ کے ساتھ یاد کرتے ہیں اگرچہ اوائل میں انہیں یہ درجات حاصل نہ تھے تو اتقیٰ وہ ہے جو کہ عمر کے آخری حصے میں جو کہ اعمال کے اعتبار کا وقت ہے' دوسرے موجود لوگوں سے تقویٰ میں بڑھا ہوا ہو اور اسی کے ساتھ کسی تکلف اور تاویل کے بغیر مدعیٰ ثابت ہو جاتا ہے۔

اور چونکہ آگ سے دُور رکھنے کے سلسلے میں اتقیٰ کا ذکر فرمایا گیا اس لیے اس کے کچھ اچھے اوصاف کا بھی ذکر فرمایا جا رہا ہے جو کہ اس سورۃ کے نزول کے وقت بارگاہِ خداوندی میں قبول ہوئے تھے۔

اَلَّذِیْ یُؤْتِیْ مَالَهٗ یعنی وہ صاحبِ تقویٰ جو کہ اپنا مال راہِ خدا میں دیتا ہے جیسا کہ حضرت بلال اور دوسرے غلاموں اور کنیزوں کے خریدنے میں جو کہ مشرف بہ اسلام ہو چکے تھے اور غلام ہونے کے ناطے گرفتار اور سخت عذاب میں مبتلا تھے' سونا دے کر انہیں خلاصی دِلا کر آزاد کیا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ضروریات اور اخراجات میں اور سامانِ ہجرت اور مسجد نبوی علیٰ صاحبہا الصلوٰات والتسلیمات کے لیے قطعۂ زمین کی خریداری میں دیا اور یہ مال دینے میں اس کا مقصد یہ ہے کہ

یَتَزَکّٰی وہ اپنے آپ کو پاک کرتا ہے اور دَم بدم مالِ دے کر ترقی کر رہا ہے اور اس کا کمال اس پاکیزہ پودے کی طرح ہے جسے آب و ہوا مہیا ہے اور وہ دن بدن نشوونما پا رہا ہے اس لیے کہ زکوٰۃ کے دو معنی ہیں' پاکیزگی اور نشوونما۔ اسے دونوں معنی حاصل ہیں۔

وَمَا لِاَحَدٍ عِنْدَهٗ مِنْ نِّعْمَةٍ تُجْزٰۤی اور اس پر کسی کا کوئی انعام اور احسان نہیں ہے کہ مال دے کر اس بدلہ چکایا جائے کیونکہ احسان کے بدلے میں مال دینا بھی قابلِ تعریف ہے لیکن چونکہ نام اور مرتبے کا فتنہ رکھتا ہے اس لیے اخلاص کے کمال کے مرتبے سے نیچے رہ جاتا ہے۔

فضائل ابوبکر صدیق بربانِ رسالت علیٰ صاحبہا الصلوٰات والتسلیمات

اور حدیث صحیح میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا جس کا مفہوم یہ ہے کہ

جس کسی نے بھی میری خدمت کی ہے' میں نے اس کا بدلہ چکا دیا ہے سوائے ابوبکر صدیق کے' انہوں نے میری وہ خدمت کی ہے کہ میں نے اس کا بدلہ نہیں چکایا' قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ان کی جزا کی خود کفالت فرمائے گا۔ یہیں سے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے ثواب کا اندازہ لگا لینا چاہیے۔

نیز حدیث صحیح میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حیاتِ ظاہری کے آخری ایام میں وصال مبارک سے چند روز پہلے خطبہ ارشاد فرمایا اور اس خطبے میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مناقب اور فضائل ارشاد فرمائے۔ ان میں سے یہ ہے کہ مجھ پر کسی کو اس قدر مالی' بدنی اور جانی حق خدمت ثابت نہیں جس قدر کہ ابوبکر کو ہے اس نے اپنی صاحب زادی میرے نکاح میں دی اور مجھ سے حق مہر نہ کیا۔ بلال کو اپنے خالص مال سے خرید کر آزاد کیا' مجھے اسباب سفر زادِ راہ اور سواری سمیت دار الہجرت یعنی مدینہ عالیہ اٹھا کر لایا' اپنی جان اور اپنے مال کے ساتھ ہر وقت میری غم خواری کی۔ اب ابوبکر کے دروازے کے سوا اس مسجد کے سارے دروازے بند کر دو۔

اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مرتبے کا کمال ہے کہ حق تعالیٰ ان کے دلی خلوص کی گواہی خود ارشاد فرما رہا ہے اور فرماتا ہے کہ وہ یہ سب کام نہیں کرتا۔

إِلَّا ابْتِغَاءَ وَجْهِ رَبِّهِ الْأَعْلَىٰ مگر اپنے پروردگار کی رضا چاہنے کے لیے جو کہ بلند و بالا ہے اور اسے اس مال کے خرچ کرنے میں کسی طرح سے نفسانیت پیش نظر نہیں۔ بلکہ ثواب کی طمع اور عذاب کو دفع کرنا بھی مقصود نہیں۔ چنانچہ حدیث صحیح میں ہے کہ جب حضرت ابوبکر صدیق نے مسلمان غلاموں اور لونڈیوں کو بھاری مال کے عوض خرید کر آزاد فرمایا تو آپ کے باپ ابوقحافہ نے ملامت کی کہ اگر تمہیں غلام آزاد کرنا منظور تھا تو چاہیے تھا کہ کارآمد غلاموں کو جو کہ کمائی کرنے اور تمہاری امداد کرنے پر قادر ہوتے' خرید کر آزاد کرتا۔ یہ کمزور غلام اور لونڈیاں جو کسی کام کے نہیں ہیں اور آزادی کے بعد بھی ان کی خوراک اور پوشاک تم نے اپنے ذمے لے رکھی ہے' انہیں خریدنے اور آزاد کرنے کا کیا فائدہ۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اپنے باپ کے جواب میں یہی کہا کہ اس حرکت

سے میرا مقصد حق تعالیٰ کی خوشنودی ہے اور کچھ نہیں۔

اور جامع عبدالرزاق میں صحت کے طریقے سے مروی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مسلمانوں میں سے کسی کا مال میرے حق میں حضرت صدیق اکبر کے مال سے زیادہ نافع نہ ہوا۔ راوی فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مال میں بلا جھجک اس طرح تصرف فرماتے جیسا کہ اپنے مال میں۔ آپ اپنے مال میں اور ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مال میں کوئی فرق اور امتیاز نہیں فرماتے تھے۔

اور سنن ابن ماجہ میں مذکور ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ مجھے کسی کے مال نے اتنا نفع نہ دیا جتنا کہ ابوبکر کے مال نے نفع دیا اس وقت حضرت ابوبکر صدیق وہاں موجود تھے ان پر رقت طاری ہوگئی اور بچشم پُرنم عرض کی کہ یارسول اللہ! میں اور میرا مال سب آپ کی ملک ہے اور اس واقعہ کو امام احمد نے بھی روایت فرمایا ہے۔

نیز حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے مرتبے کا کمال ہے کہ حق تعالیٰ نے اپنے رسول علیہ السلام کی دل جوئی اور خاطر داری کے مقام میں جس چیز کا سورۂ والضحیٰ میں وعدہ فرمایا ہے کہ وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ اسی کی مانند اس سورۃ میں حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے لیے وعدہ فرمایا ہے کہ وَلَسَوْفَ يَرْضَىٰ اور یقیناً ابوبکر خدا سے راضی ہوگا یا خدا ابوبکر سے اس لیے کہ یرضیٰ کی ضمیر کے دو احتمال ہیں۔ ایک یہ کہ حضرت ابوبکر کی طرف لوٹتی ہو دوسرا یہ کہ خدا تعالیٰ کی طرف راجع ہو دونوں صورتوں میں مدعا حاصل ہے اور کیا خوب کہا گیا ہے۔

بخت اگر مدد کند دامنش آورم بکف
گر بکشم زہے طرب ور بکشد زہے شرف

یعنی اگر میرا بخت یاوری کرے تو میں ان کا دامن پکڑلوں اگر میں کھینچ لوں تو عظیم خوشی کی بات ہے اور اگر وہ کھینچ لیں تو عظیم عزت ہے۔

حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے آپ نے فرمایا کہ ایک دن ہم مہاجرین اور انصار کی ایک جماعت کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے دروازۂ پاک پر حاضر

تھے اور آپس میں صحابہ کرام کے فضائل اور بزرگیوں کا ذکر کر رہے تھے اسی اثناء میں کچھ آوازیں جو بلند ہوئیں، حضور صلی اللہ علیہ وسلم دولت خانہ سے باہر تشریف لائے اور فرمایا، کیا کر رہے ہو؟ ہم نے عرض کی کہ صحابہ کرام کے فضائل کا ذکر ہو رہا ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ اگر یہ کام کر رہے ہو تو خبردار! کسی کو ابوبکر پر فضیلت نہ دینا اس لیے کہ وہ تم سے دنیا و آخرت میں افضل ہے۔

اور حضرت ابودرداء رضی اللہ عنہ سے دارقطنی میں سند صحیح کے ساتھ روایت ہے کہ آپ نے فرمایا کہ ایک دن میں راستے میں حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے آگے آگے جا رہا تھا، اچانک حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے ملاقات ہوگئی۔ آپ نے فرمایا کیا تو ایسے شخص کے آگے آگے چلتا ہے جو دنیا و آخرت میں تجھ سے بہتر ہے۔ اللہ تعالٰی کی قسم انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے بعد کسی ایسے شخص پر سورج طلوع ہوا نہ غروب جو ابوبکر سے بہتر ہو۔

ابن السمان کتاب الموافقہ میں حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ سے سند صحیح کے ساتھ روایت کرتے ہیں کہ انہوں نے اپنے والد بزرگوار امام محمد باقر، انہوں نے اپنے والد گرامی حضرت امام زین العابدین، انہوں نے جناب سید الشہداء خاتم آل عبا سبط رسول الثقلین حضرت امام حسین رضی اللہ تعالٰی عنہم اور انہوں نے حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ سے روایت فرمائی ہے کہ آپ فرماتے تھے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا کہ انبیاء و مرسلین علیہم السلام کے بعد کسی ایسے پر سورج طلوع ہوا نہ غروب جو کہ ابوبکر سے بہتر ہو۔

اور حافظ خطیب بغدادی حضرت جابر رضی اللہ عنہ سے روایت کرتے ہیں کہ ایک روز میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت عالیہ میں حاضر تھا، آپ نے ارشاد فرمایا کہ ابھی وہ شخص آ رہا ہے کہ میرے بعد اللہ تعالٰی نے اس سے بہتر کسی کو پیدا نہیں فرمایا ہے اور قیامت کے دن اس کی شفاعت انبیاء علیہم السلام کی شفاعت کی طرح ہوگی۔ جابر فرماتے ہیں کہ تھوڑا سا وقت گزرنے نہ پایا کہ حضرت ابوبکر تشریف لے آئے۔ پس حضور علیہ السلام اُٹھے اور آپ نے ان کی پیشانی پر بوسہ دیا اور ایک ساعت انہیں بغل میں دبا کر اُنس حاصل کیا۔

یہاں سے معلوم ہوا کہ جب طرح حضرت رسول کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی رضا اُمت کی شفاعت میں منحصر ہے اسی طرح حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی رضا بھی اُمت کی شفاعت میں ہے اس لیے کہ رضائے ابوبکر رضی اللہ عنہ' رضائے مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم میں فانی تھی۔

(اقول وباللہ التوفیق معلوم ہوا کہ حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کو سید الشہداء کہنا مفسر علام کے نزدیک درست ہے' ان لوگوں کے لیے لمحۂ فکریہ جو اس سے اختلاف کرتے ہیں۔ نیز مسئلہ شفاعت برحق ہے۔ حضور شفیع المذنبین صلی اللہ علیہ وسلم کے خدام بھی شفاعت کریں گے۔ نیز معلوم ہوا کہ قیامِ تعظیمی جائز ہے جیسا کہ سرکار علیہ السلام نے حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کے لیے فرمایا۔ محمد محفوظ الحق غفرلہٗ)

سورۂ والضحیٰ

سورۂ والضحیٰ مکی ہے' اس کی گیارہ (۱۱) آیات' چالیس (۴۰) کلمات اور ایک سو بانوے (۱۹۲) حروف ہیں۔

وجہ تسمیہ

اسے سورۂ والضحیٰ اس لیے کہتے ہیں کہ اس سورۃ کے آغاز میں ضحیٰ بمعنی چاشت اور سورج کے اونچا ہونے کے وقت کی قسم فرمائی گئی ہے اور ہر روز اس وقت کا رات کی تاریکی کے بعد آنا ایک کے بعد دوسری مرتبہ وحی پر آنے کی دلیل ہے اور اس سورۃ کا مقصد یہی ہے اس لیے کہ اس کے نزولِ سبب یوں ذکر کیا گیا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مکہ معظمہ میں اسلام کی دعوت کو عام فرمایا تو مکہ کے لوگوں نے مدینہ کے یہودیوں کے پاس کسی کو بھیجا کہ ہمارے درمیان اس قسم کا آدمی پیدا ہوا ہے جو کہ نبوت کا دعویٰ کرتا ہے' تم اس کے امتحان اور دعوے کی سچائی کے لیے کسی علامت کا پتہ دو اس لیے کہ تم اہلِ کتاب ہو اور انبیاء کی علامات سے پوری واقفیت رکھتے ہو تا کہ ہم اس علامت سے اس کا امتحان لیں۔ یہودیوں نے کہا اس سے تین چیزوں کی بابت سوال کرو ذوالقرنین کا واقعہ اصحابِ کہف کا

واقعہ اور حقیقتِ روح۔ کفار مکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے اور ان تین چیزوں کے متعلق سوال کیا۔ آپ نے فرمایا کہ میں تمہیں ان چیزوں کے متعلق کل خبر دوں گا اور آپ کی زبان مبارک پر اس وقت انشاء اللہ کا کلمہ نہ آیا چند روز وحی منقطع رہی۔ بعض کے مطابق دس روز' بعض کے مطابق پندرہ روز اور بعض نے اس سے بھی زیادہ کہا ہے اور یہ مدت چالیس دن تک بڑھائی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اس وجہ سے انتہائی غم لاحق ہوا اور کفار نے اس پر خوش ہوتے ہوئے طعن و تشنیع شروع کر دی حتیٰ کہ ابولہب ہر مجلس میں کہتا ان محمدا ودعہ ربہ و قلاہ یعنی محمد کو اس کے پروردگار نے چھوڑ دیا اور اس سے ناراض ہو گیا اور ابولہب کی عورت نے انتہائی بے حیائی' طعن اور چھیڑ چھاڑ کے طریقے سے جو کہ عورتوں کی جبلت ہے' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آ کر کہا ما اری شیطانک الاقدترکک یعنی مجھے یوں گمان ہوتا ہے کہ جو تیرے پاس آتا تھا' تجھے چھوڑ گیا ہے۔ ان وحشت انگیز باتوں سے سرکار علیہ السلام کو انتہائی پریشانی ہوئی۔ اور آپ نے اس سلسلے میں حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے بات کی۔ اسی اثنا میں یہ سورۃ نازل ہوئی اور اس کے آغاز میں دن رات کی جہان میں آمد و رفت اور نور اور تاریکی کا ایک دوسرے کے پیچھے آنا ذکر فرمایا گیا تاکہ اشارہ ہو کہ دنیا کا کام ایک ہی ڈگر پر نہیں ہے' کبھی روشن دن سارے جہان کو پرانوار کر دیتا ہے اور کبھی اندھیری رات تاریکی کا بستر پھیلا دیتی ہے اور جس طرح نور ہمیشہ نہیں رہتا' تاریکی بھی دائمی نہیں ہے اور تاریکی کے بعد نور اور نور کے بعد تاریکی آتی ہے اسی طرح وحی کے نزول اور اس کے منقطع ہونے کو سمجھنا چاہیے اور اگرچہ چند روز یہ سلسلہ منقطع ہو جائے تو پریشان نہیں ہونا چاہیے کہ اس انقطاع میں بھی حکمتیں ہیں جس طرح کہ رات کی آمد میں حکمتیں ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالضُّحٰى مجھے چاشت کے وقت کی قسم ہے۔ جو کہ آفتاب کے اونچا ہونے اور اس کی سلطنت کے ظاہر ہونے کا وقت ہے۔ اس لیے کہ پورے دن رات میں آفتاب دو حرکتیں کرتا ہے۔ پہلی حرکت صاعدہ یعنی اوپر آنے کی حرکت جو کہ گزشتہ آدھی رات سے شروع

ہوتی ہے اور نصف دن تک رہتی ہے اور دوسری حرکت ہابطہ یعنی نیچے اُترنے کی حرکت جو کہ زوال کے بعد شروع ہوتی ہے اور آئندہ آدھی رات تک رہتی ہے اور یہ چاشت کا وقت اس کی پہلی حرکت کی انتہا کا وقت ہے تو یہ نزولِ وحی کے وقت کے ساتھ پوری مشابہت رکھتا ہے جو کہ حقائق الٰہی اور حقائق کائنات کے ظہور کے کمال کا وقت ہے اور یہ وقت اور خصوصیات بھی رکھتا ہے۔ ایک یہ کہ روزی کمانے اور علم و ہنر حاصل کرنے کا زیادہ تر یہی وقت ہے۔ دوسری یہ کہ یہ وقت فریضۂ نماز سے خالی ہے اور نفلی عبادات کے لیے فارغ ہے۔ تیسری یہ کہ یہ وہ وقت ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ حق تعالیٰ کی گفتگو اسی وقت ہوئی تھی۔ چوتھی یہ کہ فرعون کے جادوگر اسی وقت میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کا معجزہ دیکھ کر ایمان لائے اور انہوں نے سجدہ کیا۔ پس یہ وقت سابقہ اُمت میں باطل کی تاریکی کا جو اثر ہوا تھا اس پر نورِ حق کے کمال ظہور کا وقت ہے۔ پانچویں یہ کہ چاشت کی نماز کے لیے یہی وقت مقرر ہے۔

نمازِ چاشت کا بیان

اس کی کم سے کم چار رکعت ہیں اور زیادہ سے زیادہ بارہ رکعت اور اس نماز کے بہت سے فضائل ہیں جو کہ حدیث شریف میں وارد ہوئے اور تجربہ کار لوگ یوں کہہ گئے ہیں کہ جو غربت سے ڈرے' چاہیے کہ نماز چاشت ادا کرے اور جو قبر سے ڈرے کہ رات کی نماز ادا کرے اور مشائخ کے اوراد میں مقرر ہے کہ وہ نمازِ چاشت کی چار رکعت میں یہ چار سورتیں پڑھتے تھے۔ والشمس' واللیل' والضحٰی اور الم نشرح

وَاللَّيْلِ اِذَا سَجٰى اور مجھے رات کی قسم ہے جس وقت کہ وہ اپنی تاریکی کی وجہ سے مخلوق کی نظر سے چیزوں کو ڈھانپ لے۔ اور رات کا ڈھانپنا اس وقت ہوتا ہے جبکہ اس میں چاند' مشعل' شمع اور چراغ کا نور نہ ہو۔ پس اس قسم کی رات زمانۂ جاہلیت کا نمونہ ہے جبکہ چاشت کا وقت جو کہ نور کے کمال کا وقت ہے' وحی نازل ہونے کے وقت کا نمونہ ہے اور وحی منقطع ہونے کے بعد حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے وصال اور آپ کے خلفائے راشدین کی بقاء کے ساتھ رات آ گئی لیکن ایسی رات کہ اس کی ابتدا سے اس کی انتہا تک قمر کی روشنی موجود ہے اور جس طرح قمر' آفتاب کا خلیفہ ہے جو کہ اس کی روشنی اپنے اندر حاصل کر کے

اس کی جگہ جہان کو روشن کرنے کے لیے موجود رہتا ہے اسی طرح خلفائے راشدین رضی اللہ تعالیٰ عنہم نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سینۂ مبارک کی روشنی کو اپنے اندر جلوہ گر کر کے جہان والوں کو اپنے نور سے منور کیا ہے۔ اور خلافت کا زمانہ منقطع ہونے کے بعد رات کی تاریکی نے ہجوم کر دیا۔ طالبانِ حق میں سے ہر گروہ والے اپنی ہمت کے مطابق چراغ، شمع اور مشعل سے مدد لیتے ہیں اور کام چلاتے ہیں۔

اور یہی وجہ ہے مجتہدین کے مذاہب اور اولیاء اللہ کے طریقے اس نور کا فیض دینے میں مختلف اور جدا جدا ہیں۔ پس چاشت کا وقت حضور نبی پاک صلی اللہ علیہ وسلم کے قلب مقدس پر نورِ الٰہی کے چمکنے کے وقت کی مثال ہے اور رات ظلمت بشری کی مثال ہے جو کہ نفوس اور ارواح پر ہجوم کر کے ہر چیز کو نظر سے اوجھل کر دیتی ہے۔

دو سورتوں کے واللیل اور والضحیٰ سے آغاز کی حکمت

اور یہاں ایک بحث ہے اور وہ یہ ہے کہ واللیل کی سورۃ میں پہلے رات کی قسم اٹھائی گئی ہے اس کے بعد دن کی جبکہ یہاں اس ترتیب کے برعکس ہے اس کا سبب کیا ہوگا۔

مفسرین نے یوں ذکر فرمایا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے رات کو بھی بزرگی کی ایک قسم کے ساتھ مخصوص فرمایا ہے کہ وہ راحت، سکون، آرام، خواب اور پردہ پوشی کا موجب ہے اور دن کو بھی ایک قسم کی بزرگی سے مخصوص فرمایا ہے کہ وہ روزی کے انتظام، ایک دوسرے کی ملاقات اور آمد و رفت کی سہولت وغیرہ کا باعث ہے۔ پس قسم اٹھانے میں کبھی رات کو دن پر مقدم کر دیا گیا اور کبھی دن کو رات پر تا کہ پہلے ذکر کرنے کی عزت سے دونوں کو حصہ ملے۔

اور یہاں سے پتہ چلا کہ وہ جو اسد طوسی نے دن اور رات کے مناظرے میں ذکر کیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قسم اٹھانے میں دن کو رات سے پہلے یاد فرمایا ہے۔ سورۂ واللیل سے غفلت پر مبنی ہے اس کے تمام ابیات کا ترجمہ یہ ہے۔

رات اور دن کی بحث کا ایک واقعہ سن جو کہ دل سے غم کی شدت کو دور کرتا ہے، دونوں کے درمیان فضیلت پائے جانے کے اعتبار سے تعریف اور مذمت میں کافی طویل گفتگو ہوئی۔ رات نے کہا کہ دن سے میری فضیلت زیادہ ہے کہ خدا تعالیٰ کے دربار میں دن میں

عبادت کرنے والے سے رات کے وقت سجدہ و عبادت کرنے والے کا مقام زیادہ ہے۔
حضرت موسیٰ علیہ السلام قوم کو مناجات کے لیے رات کے وقت لے گئے اور حضرت لوط علیہ السلام بھی رات کے وقت قوم کے ظلم و ستم سے جدا ہوئے۔ حضرت محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے رات کے وقت آسمان کا چاند دو ٹکڑے فرمایا۔ اور مسجد حرام سے معراج کے لیے رات کے وقت ہی تشریف لے گئے۔ دن میں تین اوقات ایسے ہیں جن میں نماز منع ہے جبکہ ساری رات کی نماز نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام اور اُمت کے لیے فخر ہے' تیری وجہ سے آسمان ایک نیلگوں فرش کی طرح ہے اور میری وجہ سے باغ ارم کی طرح سجا ہوا ہے' عرب کے ماہ و سال کی گنتی میرے چاند سے ہے۔ نیز میرے چاند پر جبرئیل علیہ السلام کے پر کی تحریر ہے۔

دن یہ بات سُن کر پریشان ہوا اور کہنے لگا کہ خاموش ہو جا تو مجھ سے زیادہ پختہ بات کیا کر سکتی ہے۔ تو دن میں عیب کا طعنہ کیسے کرتی ہے کہ عرش کے رب نے قسم فرمانے میں دن کی تعریف تجھ سے پہلے کی ہے جو روزہ ساری مخلوق رکھتی ہے' سب دن میں ہیں۔ حج کا احرام بیت الحرام سے دن کے وقت ہے' حشر کے لیے مخلوق دن کے وقت اُٹھے گی جس وقت سب لوگ عدم سے وجود میں آئے' دن تھا' میری وجہ سے آفاق کا چہرہ اچھا معلوم ہوتا ہے جبکہ تیری وجہ سے بُرا لگتا ہے۔ میری وجہ سے مخلوق کی آنکھوں کا نور بڑھتا ہے اور تجھ سے نمی۔ میری وضع اسلام کی ہے اور تیری کفر کی' میرا لباس خوشی کا اور تیرا لباس غم کا۔ جب میرا سورج علم بلند کرتا ہے' تیرا ستاروں کا لشکر ایک دَم بھاگ جاتا ہے۔ اگر تیرے چاند سے عرب کے ماہ و سال کا پتہ چلتا ہے تو میرے آفتاب سے عجمیوں کے ماہ اور سال وابستہ ہیں۔ تیرا چاند میرے سورج کی روشنی سے نور پاتا ہے' سورج کے حضور اپنی پشت ختم کرتا ہے۔ تین فرض نمازیں دن میں ہیں جبکہ رات میں دو ہیں' تیری ایک نماز اس لیے کم ہے کہ تو مجھ سے کم ہے۔

سورۂ واللیل میں رات کی قسم پہلے لانے کی حکمت

اب ہم یہاں پہنچے کہ سورۂ واللیل میں رات کی قسم کو پہلے لانے کے ساتھ مخصوص فرمایا

گیا اور اِس سورۃ کو اس انداز کے ساتھ کیوں مخصوص کیا گیا۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ سورۃ واللیل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی سورۃ ہے اور نورِ اسلام سے پہلے آپ جس ماحول میں تھے' وہ تاریک تھا۔ جبکہ یہ سورۃ حضرت علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سورۃ ہے' آپ کو ابتدا ہی سے نورِ عصمت حاصل تھا۔ پس اس سورۃ کی ابتدا میں دن کا ذکر کیا گیا جو کہ نورِ ایمان کے مشابہ ہے۔

اور یہاں ایک اور لطیفہ ہے کہ اگر پہلے رات کا ذکر کریں جو کہ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کے مناسب ہے اور پھر وہاں سے اوپر چلیں اور حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو پالیں جو کہ دن کے مشابہ ہیں چنانچہ رات کے بعد دن آتا ہے اور اگر دن کا ذکر پہلے کریں جو کہ حضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کے مشابہ ہے اس کے بعد نزول کریں بلافصل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو پالیں جو کہ رات کے مشابہ ہیں کیونکہ دن کے بعد بغیر فاصلے کے رات آتی ہے اور اس لطیفے سے ان دونوں بزرگوں کی باہمی رفاقت باحسن وجوہ جلوہ گر ہوتی ہے۔ چنانچہ غار کے واقعہ اور مزارات کے اتصال اور دوسری صحبتوں میں اس رفاقت کا اثر ظاہر ہوا۔

خلاصہ کلام یہ کہ اس سورۃ کے آغاز میں دن اور رات کی قسم واقع ہے۔ گویا اشارہ فرمایا جا رہا ہے کہ کبھی ہم دن کی ساعتوں کو کم کرتے ہیں اور رات کی ساعتوں کو بڑھاتے ہیں اور کبھی اس کے برعکس اور یہ کمی بیشی محبت وعداوت کی بناء پر نہیں بلکہ حکمت کی رعایت کی بناء پر ہے اسی طرح رسالت اور نزولِ وحی کے پروگرام کو سمجھنا چاہیے کہ کبھی یوں ہے اور کبھی یوں۔

لطیفہ

اور اس مقام کے لطائف میں سے یہ ہے کہ جب کفار نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر دعویٰ کیا کہ آپ کے پروردگار نے آپ کو جواب دے دیا اور رخصت کر دیا اور مدعی بن گئے اور مدعی پر گواہ لازم ہے اور انکار کرنے والے پر قسم۔ پہلے انہیں فرمایا گیا کہ گواہ لاؤ جب وہ عاجز آ گئے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم پر قسم لازم آئی۔ پس دن اور رات کی قسم فرما کر ان کے مدعی کا انکار کیا گیا اور اس قسم میں اشارہ ہے کہ دن رات بھی کمی بیشی سے محفوظ نہیں ہوتے'

آپ بھی توقع نہ رکھیں کہ مخلوق کی زبان سے محفوظ رہیں گے۔ نیز رات تنہائی اور وحشت کا وقت ہے۔ جبکہ دن اجتماع اور روزی کا تو گویا یوں فرمایا گیا کہ آپ خوش رہیں اس لیے کہ انقطاعِ وحی کی پریشانی کے بعد آپ کو ملائکہ کے ساتھ اجتماع کا وقت حاصل ہوگا۔ نیز دن سرور اور اجتماع کا وقت ہے جبکہ رات غموں اور وحشت کا اور دن کے وقت میں سے چاشت کا انتخاب فرما کر اس کی قسم یاد فرمائی گئی اور رات کی قسم میں ساری رات ذکر کر دی' یہ اس بات کا اشارہ ہوگا کہ دنیا کے غم مسرت اور خوشی سے زیادہ ہیں۔

ضحیٰ اور لیل کے متعلق اقوال

بعض مفسرین نے یوں فرمایا ہے کہ ضحیٰ سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے میلادِ پاک کا دن ہے جبکہ لیل سے مراد شبِ معراج ہے۔

اور بعض فرماتے ہیں کہ ضحیٰ سے مراد سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کا رُخِ انور ہے اور لیل سے مراد آپ کے بال مبارک جو کہ سیاہی میں رات کی طرح ہیں۔ بعض کے نزدیک دن سے مراد آپ کا یومِ وصال ہے جبکہ رات سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی عبادتِ خداوندی میں مشغولی کی رات ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ ضحیٰ سے مراد وہ نورِ علمی ہے جو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عطا فرمایا گیا اور اس کی وجہ سے غیب کی دنیا کے پردہ نشین جلوہ گر اور ظاہر ہو گئے جبکہ رات سے مراد آپ کا معاف کرنے کا خلق ہے جس نے اُمت کے عیب چھپا لیے۔

بعض نے فرمایا کہ دن سے مراد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ظاہری احوال ہیں جن پر خلق مطلع ہوئی جبکہ رات سے مراد آپ کے باطنی حالات ہیں جن پر علام الغیوب کے سوا کوئی بھی آگاہ نہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ دن سے مرادِ اسلام کی سربلندی کا وقت ہے جبکہ رات اسلام کی غربت کا زمانہ ہے جیسا کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ ان الاسلام سیعود غریبًا اور بعض کہتے ہیں کہ ضحیٰ سے مراد زندگی کا زمانہ ہے جبکہ رات قبر میں سکونت اختیار کرنے کا وقت ہے اور ہر ایک کے احتمال کی گنجائش ہے۔ (اقول و باللہ التوفیق آپ کے تو ظاہری کمالات پر بھی کما حقہٗ ماسوائے ذات کے کسی کو اطلاع نہ ہو سکی۔ محمد محفوظ الحق غفرلہٗ)

مَا وَدَّعَكَ رَبُّكَ وَمَا قَلٰی آپ کے پروردگار نے آپ کو جدا نہیں فرمایا ہے اور نہ ہی

آپ سے ناراض ہے یعنی وحی کے غائب رہنے کا وقت جو دراز ہو گیا اس وجہ سے نہیں کہ اللہ تعالیٰ کی تربیت میں کوئی کوتاہی ہے یا آپ کی صفات کمال میں کوئی نقص واقع ہو گیا بلکہ ایک حکمت کی بناء پر ہے اور عنقریب وحی دوبارہ شروع ہو جائے گی جیسا کہ دن کے بعد جلد ہی رات لوٹ آتی ہے اور اگر بعض عوارض کی وجہ سے وحی کا انقطاع واقع ہو تو فکر نہ کریں کہ آخر نور حق غالب آئے گا اور سب عوارض ختم ہو جائیں گے اور جدائی کے بغیر وصال نصیب ہوگا۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے۔

وَلَلْاٰخِرَةُ خَيْرٌ لَّكَ مِنَ الْاُوْلٰى البتہ ہر بعد والی حالت آپ کے لیے پہلے معاملے سے بہتر ہوگی حتیٰ کہ آپ کی بشریت کا وجود بالکل نہ رہے اور آپ پر ہمیشہ کے لیے نور حق کا غلبہ حاصل ہو۔ اور اگر آخرت کو مابعد الموت پر محمول کریں تو بھی گنجائش ہے اس لیے کہ اس دن حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی سیادت کا ظہور، آپ کی مرکزیت اور آپ کی ذات والا صفات کے سرچشمہ سے اللہ تعالیٰ کا فیضان اور جود و کرم پوری قوت اور بلندی پر ہوگا۔ یہاں تک کہ قیامت کے دن سب اوّلین و آخرین آپ کی شفاعت کے محتاج ہوں گے اور آپ کے جھنڈے کے نیچے سایہ پائیں گے اور آپ کے حوض کے پانی سے سیراب ہوں گے اور جنت کے درجات اور مکانات کی تقسیم آپ کے دست کرم سے ہی ہوگی۔ (اقول وباللہ التوفیق امام السید طحطاوی رحمۃ اللہ علیہ محشی مراقی الفلاح نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی کنیت ابوالقاسم کی ایک توجیہ یہ بھی بیان فرمائی ہے لانه يقسم الجنة بين اهلها یعنی آپ کو ابوالقاسم اس لئے کہا گیا ہے کہ آپ جنتیوں میں جنت تقسیم فرمائیں گے۔ بلکہ سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد منقول ہے انما انا قاسمٌ واللّٰه يعطي میں تو تقسیم کرتا اور اللہ تعالیٰ عطا فرماتا ہے چونکہ رب العزت کی عطا عام ہے پتہ چلا کہ حضور علیہ السلام کی تقسیم بھی عام ہے یعنی رب العزت کی ہر عطا کے قاسم حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام ہیں اسی لیے اعلیٰ حضرت الشاہ احمد رضا خاں فاضل بریلوی رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا:

لا ورب العرش جس کو جو ملا ان سے ملا
بٹتی ہے کونین میں نعمت رسول اللہ کی (محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اور رَبُّكَ کے لفظ میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے کمال تسلی ہے یعنی کیا خیال ہے کہ جس مالک نے آپ کو اس انداز سے پالا ہو اور آپ کے حق میں اپنی مختلف قسم کی تربیت مصروف فرمائی یہاں تک کہ کسی مرشد اور رسول کے واسطے کے بغیر آپ کی روح پر اپنے نور کی تجلی فرمائی' آپ کو رخصت کر دے گا اور جواب دے دے گا' یہ بات تو مجازی مالکوں سے بھی بعید ہوتی ہے جیسا کہ مشہور ہے کہ نواختہ را نباید انداخت یعنی جسے نوازا جائے اسے گرایا نہ جائے۔ چہ جائیکہ مالکِ حقیقی جو کہ ہر چیز کے وجود سے پہلے اس کی استعداد اور کردار کو جانتے ہوئے ہر ایک کو کسی مقام اور مرتبے کے ساتھ مخصوص فرماتا ہے اور کیا خوب کہا گیا ہے کہ ۔

چوں بعلم ازل مرا دیدی
دیدی آنکہ بعیب بگویدی
من بعیب آں تو بعلم ہماں
درمکن آنچہ خود پسندیدی

یعنی جب تو ازل سے ہی میرے عیب جانتا ہے' میں وہی ہوں مجھے رد نہ فرما۔

یہاں جاننا چاہیے کہ جب مہربان اور قدردان مالک اپنے نوکروں میں سے کسی نوکر کو کسی خدمت پر مقرر کرے اور وہ نوکر پوری محنت اور کوشش کے ساتھ اس کام میں مشغول ہو' حاسد اور چغل خور اس کی دل شکنی کے درپے ہو جائیں اور اس کے متعلق بے اصل افواہ اڑا دیں کہ فلاں اپنے مالک کی نظر سے گر گیا اور جس خدمت پر مامور تھا' اس سے معزول ہو گیا اس وقت اس مالک کو چاہیے کہ کمال لطف و شفقت کے طور پر اس نوکر کی دل جوئی کرے اور اسے تسلی دے اور اس غبار کو دور کرنے کے لیے جو کہ اس افواہ کے سننے سے اس نوکر کے دل میں بیٹھ گیا' اسے کسی انعام' خلعت اور اس کے مرتبے کی ترقی کے وعدے سے مخصوص کرے اسی قسم کا یہ کلام ہے۔

وَلَسَوْفَ يُعْطِيكَ رَبُّكَ فَتَرْضَىٰ اور البتہ آپ کا پروردگار آپ کو اس قدر عطا فرمائے گا کہ آپ راضی ہو جائیں اور اس سے آپ کی استعداد کا پیمانہ بھرپور ہو جائے اور

کوئی طلب اور پیاس باقی نہ رہے اور اس وعدے میں کمال وسعت ہے خصوصاً مخاطب کی استعداد کے پیش نظر جو کہ ایسا عالی مرتبت رسول علیہ السلام ہو' معلوم کیا جا سکتا ہے کہ اسے عطائے الٰہی کس قدر دی جائے گی تا کہ وہ سیر ہو جائے۔

اور حدیث شریف میں ہے کہ جب یہ آیت نازل ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین سے فرمایا کہ میں ہرگز راضی نہیں ہوں گا جب تک کہ اپنی اُمت میں سے ہر ایک کو جنت میں داخل نہ کر لوں اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی روح انور کی پیدائش کی ابتدا سے لے کر جنت میں داخل ہونے تک آپ کے حق میں اللہ تعالیٰ کی جو نوازشات واقع ہوئیں' ہو رہی ہیں اور ہوں گی' قیاس کی گرفت اور بیان کی حد سے باہر ہیں۔ ان میں سے اجمالی طور پر کچھ بیان کی جاتی ہیں۔

جاننا چاہیے کہ جب کوئی شخص اپنے متوسلین میں سے کسی کو اپنا محبوب بنا لے تو اسے بہت سی چیزوں' لباس' سواری' بیٹھنے کی جگہ اور دوسرے حالات میں ممتاز کر دیتا ہے تا کہ اس کی محبوبیت ہر خاص و عام کی نظر میں جلوہ گر ہو جائے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خصوصیات کی دو قسمیں ہیں

اور بارگاہِ خداوندی میں سے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو جو خصوصیات حاصل ہوئیں' دو قسم کی ہیں: پہلی وہ خصوصیات جن میں دوسرے انبیاء علیہم السلام بھی شریک ہیں لیکن آپ کو وہ نعمت سب سے پہلے اور سب سے زیادہ نصیب ہوئی اور اس کی وجہ سے آپ کو ممتاز کیا گیا۔

اور ایک قسم وہ ہے جو صرف آپ کے ساتھ مخصوص ہے اور کسی کو اس میں سے حصہ نہیں ملا اور ہم یہاں دونوں قسموں میں سے چند ایک باہم ملا کر بیان کرتے ہیں تا کہ اس آیت کا معنی سننے والوں کے ذہن میں پوری طرح راسخ ہو جائے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی جسمانی خصوصیات

آپ کے جسم مبارک میں جو خصوصیات رکھی گئی تھیں' یہ ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی پشت مبارک کی طرف سے اسی طرح دیکھتے تھے جس طرح کہ سامنے سے دیکھتے تھے'

دہن شریف کڑوے پانی کو میٹھا کر دیتا تھا۔ آپ شیر خوار بچوں کو لعاب دہن کا قطرہ عطا فرماتے اور وہ بچے سارا دن سیر رہتے اور دودھ نہیں مانگتے تھے۔ جیسا کہ عاشورا کے دن اہلِ بیت کے بچوں کے متعلق تجربہ ہوا اور حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بغل شریف کا رنگ سفید براق تھا۔ بال بالکل نہیں تھے اور آپ کی آواز وہاں تک پہنچتی تھی کہ دوسروں کی آواز اس کے سویں حصے تک بھی نہیں جاتی تھی۔ اور آپ اتنے دُور کے فاصلے سے سُن لیتے تھے جہاں سے دوسرے نہیں سُن سکتے تھے۔ آپ آرام فرماتے مگر دل خبردار رہتا' ساری زندگی سرکار علیہ السلام کو جماہی نہیں آئی اور آپ کو خواب میں کبھی غسل کی حالت لاحق نہیں ہوئی تھی۔ آپ کے پسینے مبارک میں کستوری سے بھی زیادہ مہک تھی یہاں تک کہ اگر آپ گلی میں سے گزرتے تو ہوا میں دیر تک آپ کے پسینے کی خوشبو رچی رہنے کی وجہ سے لوگ سراغ لگا لیتے تھے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس کوچے سے گزرے ہیں۔ کسی شخص نے آپ کے فضلہ مبارک کا اثر زمین پر نہیں دیکھا' زمین مشق ہو کر اسے اپنے اندر لے لیتی تھی۔ ولادت کے وقت آپ ختنہ شدہ' ناف بریدہ اور پاک صاف تشریف لائے۔ آپ کے جسم مبارک پر کوئی آلائش نہ تھی' زمین پر سجدے کی صورت میں اپنی انگشت مبارک آسمان کی طرف اُٹھاتے ہوئے جلوہ گر ہوئے۔ اور آپ کی ولادت کے وقت نور کی ایسی شعاعیں نکلیں جن کی وجہ سے آپ کی والدہ محترمہ نے شام کے شہروں کو دیکھا۔ آپ کا پنگھوڑا فرشتے ہلاتے تھے۔ بچپنے میں جب آپ گہوارے میں ہوتے تو چاند آپ سے ہم کلام ہوتا۔ آپ جب اس کی طرف اشارہ فرماتے تو آپ کی طرف جھک جاتا' آپ نے پنگھوڑے میں بارہا گفتگو فرمائی۔

موسمِ گرما کی دھوپ میں بادل ہمیشہ آپ کے سرانور پر سایہ کرتا اگر آپ کسی درخت کے نیچے تشریف فرماتے تو درخت کا سایہ آپ کی طرف متوجہ ہو جاتا۔ آپ کا سایہ زمین پر نہیں پڑتا تھا' آپ کے پیراہن مقدس پر مکھی نہیں بیٹھتی تھی۔ جوں آپ کو تکلیف نہیں دیتی تھی۔ اگر آپ کسی جانور پر سوار ہوتے تو جب تک آپ سوار رہتے۔ پیشاب وغیرہ نہیں کرتا تھا۔ عالمِ ارواح میں سب سے پہلے آپ کا نور ظہور ہوا جس نے سب سے پہلے اَلَسْتُ بِرَبِّکُمْ کے جواب میں بلیٰ کہا' وہ آپ ہیں۔ سیرِ معراج آپ کے لیے مخصوص ہے۔ براق

کی سواری بھی آپ کے ساتھ مخصوص ہے۔ آسمان پر جانا' قابَ قوسین کی حد تک پہنچنا' دیدارِ الٰہی سے مشرف ہونا اور فرشتوں کا آپ کے سپاہی اور لشکری بننا یہاں تک کہ انہوں نے آپ کی معیت میں لڑائی کی' یہ بھی آپ ہی کا خاصہ ہے۔ چاند کا دو ٹکڑے ہونا اور دیگر عجیب وغریب معجزات بھی آپ کے ساتھ مخصوص ہیں۔

اور قیامت کے دن جو کچھ آپ کو عطا ہوگا' کسی کو نہیں دیا جائے گا۔ سب سے پہلے مزارِ پُرانوار سے آپ باہر تشریف لائے گے۔ سب سے پہلے آپ کو افاقہ ہوگا۔ آپ کو براق پر سوار کر کے میدانِ حشر میں لایا جائے گا' آپ ستر (۷۰) ہزار ملائکہ کے جلوس کے ساتھ تشریف لائیں گے۔ عرش کی دائیں طرف آپ کو کرسی پر رونق افروز کیا جائے گا' مقامِ محمود کا شرف آپ ہی کو حاصل ہوگا' آپ کے ہاتھوں میں لواء الحمد ہوگا کہ حضرت آدم علیہ السلام اور آپ کی تمام اولاد اس جھنڈے کے نیچے ہوگی' تمام انبیاء علیہم السلام اپنی اُمتوں کے ہمراہ آپ کے پیچھے چلیں گے اور دیدارِ خداوندی سب سے پہلے آپ سے شروع ہوگا اور آپ کو شفاعتِ عظمیٰ سے مخصوص کیا جائے گا۔ (اقول وباللہ التوفیق یعنی شفاعتِ عظمیٰ کا عملی اظہار اس وقت ہوگا ورنہ یہ منصب تو آپ کو پہلے ہی سے عطا فرمایا جا چکا ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہٗ) اور سب سے پہلے پلِ صراط سے آپ ہی کا گزر ہوگا۔

حضرت سیدہ خاتونِ جنت رضی اللہ عنہا کا اعزاز

اور تمام مخلوق کو حکم ہوگا کہ اپنی نگاہیں جھکا لو تا کہ حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم کی صاحب زادی سیدہ فاطمۃ الزہرا رضی اللہ عنہا پلِ صراط سے گزر جائیں۔ سب سے پہلے جنت کا دروازہ آپ کھولیں گے۔ اور قیامت کے دن آپ کو وسیلہ کا مرتبہ عطا فرمایا جائے گا اور وہ ایک ایسا مرتبہ ہے جو کہ نہایت بلند ہے۔ مخلوقات میں سے کسی کو نصیب نہیں ہوا اور حقیقت یہ ہے کہ اس دن دربارِ خداوندی سے آپ کو سلطنتِ الٰہیہ کی وزارت کا مقام حاصل ہوگا۔

آپ کی شرعی خصوصیات

اور آپ کی شرائع میں جو خصوصیات [illegible]

باعث ہوگا۔ کافروں کی غنیمتوں کا حلال ہونا۔ آپ کی اُمت کے لیے سارے روئے زمین کو مسجد کا حکم دیا گیا ہے اور زمین کی خاک کو آپ کی خاطر پاک اور پاک کرنے والی بنا دیا گیا۔ نمازِ پنج گانہ اس طریقے کے مطابق وضو' اذان' اقامت' سورۂ فاتحہ' آمین' روزِ جمعہ' جمعۃ المبارک کے دن میں قبولیت کی ساعت' ماہِ رمضان المبارک کی برکات اور لیلۃ القدر سب آپ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ یہ ہیں وہ خصوصیات جن تک ظاہری نظر پہنچتی ہے۔

آپ کے باطنی کمالات

لیکن آپ کی وہ خصوصیات جو کہ مراتب باطنی کے اعتبار سے تھیں' وہ انوار و تجلیات جو کہ روز بروز ترقی اور اضافے میں ہیں۔ وہ درجات جو آپ کی پیروی کے طفیل آپ کے اُمتیوں کو قیامت تک حاصل ہوئے اور ہو رہے ہیں۔ اور وہ علوم و معارف جن کا فیضان آپ کو پہنچ رہا ہے۔ پس یہ لامتناہی سلسلہ ہے اور اس آیت میں ان تمام چیزوں کا اشارہ ہے اسی لیے عطا کو خاص نہیں فرمایا گیا کہ کیا چیز دیں گے۔

اور جب کسی آدمی کو مستقبل میں کسی نعمت کا وعدہ دیا جاتا ہے تو اس وعدے کو اس نعمت کے شواہد اور دلائل کے ساتھ جو کہ زمانہ ماضی میں صادر ہوئے' پکا کیا جاتا ہے تاکہ وہ انتہا کو ابتدا پر قیاس کرے۔ اور اس کی اُمید قوی ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ اس وعدے کے بعد وہ گزشتہ نعمتیں جو کہ کسی سابقہ خدمت اور کسی سوال کی مناسبت کے بغیر محض ایک ابتدا تھیں اور کسی شخص کے دل میں گمان بھی نہیں ہو سکتا کہ وہ نعمتیں ایک جزا کے طور پر ہوں' حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو یاد کرائی جا رہی ہیں اور ان نعمتوں کا شکر طلب کیا جا رہا ہے۔

اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی کیا آپ کو یتیم نہ پایا پس آپ کو جگہ عطا فرمائی۔ اور اس نعمت کا بیان یہ ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم اپنی والدہ محترمہ کے پاس بطور امانت پدری تھے' آپ کے والد بزرگوار حضرت عبداللہ وفات پا گئے۔ اور جب آپ پیدا ہوئے تقریباً چھ سال کے تھے کہ آپ کی والدہ محترمہ کا انتقال ہو گیا۔ اور آپ کی والدہ کی وفات کے دو سال بعد آپ کے دادا بزرگوار حضرت عبدالمطلب بھی وفات پا گئے۔ پس آپ کو تینوں قسموں کی یتیمی جو کہ والدین اور دادا کا وصال ہے' حاصل ہو گئی۔ اور اس حالت میں اس بات کا گمان

ہوتا ہے کہ بچہ ضائع ہو جائے اور اس کی صحیح پرورش نہ ہو۔ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ نے ابتدا سے آپ کی پرورش کی صورت یوں ظاہر فرمائی کہ آپ کے والد بزرگوار کی وفات کے بعد آپ کے جدامجد اور والدہ محترمہ کے دل میں بیش از پیش شفقت پیدا کر دی یہاں تک کہ وہ شفقت' پدری شفقت کے قائم مقام ہوگئی اور آپ کے دادا اور والدہ محترمہ ہر دن رات آپ میں محبوبیت کے کرشمے ظاہر کرتے تھے۔ حتیٰ کہ عاشقوں کی طرح آپ کی پرورش میں کوشش کرتے تھے۔ اور اپنی جانوں سے بھی زیادہ عزیز رکھتے تھے اور جب آپ کے جدامجد کا وصال ہو گیا' وہ آپ کو آپ کے حقیقی چچا ابوطالب کے سپرد کر گئے اور آپ کی خدمت کے لیے انہیں انتہائی تاکید کر دی۔ ابوطالب نے ان کی وصیت کے مطابق آپ کی خدمت میں انتہائی کوشش کے ساتھ کام کیا۔ اور اس دوران اللہ تعالیٰ کی معنوی تربیت حسن اخلاق اور مخفی آداب کی رعایت سے پوشیدہ طور پر اپنا کام کر رہی تھی حتیٰ کہ آپ بلوغ کی حد کو پہنچ گئے اور اوصاف کمال کے جامع ہو کر اپنی قوم کا فخر بن گئے۔

وَوَجَدَكَ ضَآلًّا فَهَدٰى اور آپ کو ضال پایا پس ہدایت فرمائی۔

اس ہدایت اور ضلال کا بیان یہ ہے کہ بلوغ کی حد کو پہنچنے کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی عقل خداداد کے کمال سے یہ علم تھا کہ بتوں کی پوجا اور جاہلیت کی رسمیں سب فضول اور بے ہودہ ہیں۔ آپ دینِ حق کی جستجو میں لگ گئے۔ اور آپ نے پرانے بوڑھوں سے سنا کہ اصل دین حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دین ہے۔ آپ اسی جستجو میں بتوں کی پوجا سے بے زار اور جاہلیت کی رسموں سے کنارہ کیے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے رب کی معرفت کی تلاش میں مصروف ہوئے۔ لیکن چونکہ کسی کو ملتِ ابراہیمی یاد نہیں رہی تھی اور نہ وہ کسی کتاب میں جمع تھی اور نہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کوئی کتاب پڑھ سکتے تھے' ناچار آپ اس ملت کے احکام کی تلاش میں بے چین اور بے قرار رہتے۔ اور معلومات کے مطابق تسبیحات' تہلیلات' تکبیرات' اعتکاف' جنابت سے غسل' مناسکِ حج' خلوت اور اس قسم کی دوسری مصروفیات میں لگے رہتے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اپنی وحی کے ساتھ ملتِ حنفی کے اصول سے آگاہی بخشی اور اس ملت کی فروع کو آپ کے لیے نہایت احسن

طریقے سے مقرر فرمایا اس وقت وہ پیاس اور بے چینی زائل ہو گئی۔ گویا اپنی گم شدہ چیز مل گئی۔ آپ چاہتے تھے کہ ایک راہ پر چلیں اور اس کا پتہ نہیں چلتا تھا اس راہ کو آپ کی نظر میں ظاہر کر دیا گیا۔ پس اس پیاس' بے چینی اور اس راہ کے متعین نہ ہونے کے دُکھ کو راستہ گم کرنے سے تعبیر فرمایا گیا اور ارباب تفسیر اس ضلال کی تفسیر میں دُور دُور تک گئے ہیں۔

حضور علیہ السلام کے بچپنے میں ابو جہل کا معجزہ دیکھنا

بعض کہتے ہیں کہ ضال سے مراد ظاہری راستہ گم کرنا ہے کہ بچپنے کے وقت آپ مکہ شریف کے پہاڑی دروں میں گھر کا راستہ گم کر کے حیران پھر رہے تھے اچانک وہاں سے ابو جہل اونٹنی پر سوار گزرا اور آپ کو اُٹھا کر حضرت عبدالمطلب کے پاس لے آیا۔ اور عبدالمطلب سے کہنے لگا کہ ہمیں پتہ نہیں کہ تیرے اس بچے کے ہاتھوں ہمارا کیا حشر ہوگا۔ حضرت عبدالمطلب نے فرمایا کیا بات ہے؟ ابو جہل کہنے لگا کہ میں نے اس بچے کو فلاں پہاڑ میں حیران اور راستہ گم کیے ہوئے پایا' میں نے پہلے اسے اُٹھا کر اپنے پیچھے سوار کر لیا' یہ اونٹنی بالکل چلتی ہی نہ تھی بلکہ بیٹھ گئی اور اُٹھنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ یہاں تک کہ میں نے اسے اپنے آگے بٹھا لیا' اونٹنی فوراً اُٹھی اور چلنے لگی اور اس واقعہ میں حضرت موسیٰ علیہ السلام کے واقعہ کے ساتھ مشابہت ہے کہ جس طرح آپ کی پرورش آپ کے دشمن فرعون سے کرائی گئی اسی طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم کو آپ کے دشمن ابو جہل کے ہاتھوں آپ کے جدامجد تک پہنچایا گیا۔

حلیمہ سعدیہ سے حضور علیہ السلام کا گم ہونا

اور بعض کہتے ہیں کہ جب آپ کی دائی حلیمہ آپ کو حضرت عبدالمطلب کے پاس پہنچانے کے لیے لائیں' آپ مکہ معظمہ کے دروازے پر ان سے گم ہو گئے' وہ بے چین ہو کر ایک بڑے بت ہبل کے پاس گئیں اور بلند آواز کے ساتھ شکایت شروع کر دی۔ جیسے ہی اس نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا نام لیا سب بت سرنگوں ہو کر گر پڑے۔ اور بتوں کے اندر سے ایک آواز پیدا ہوئی کہ خبردار! تو کیا نام لے رہی ہے' ہماری بربادی اسی بچے کے ہاتھوں ہے۔ اس اثناء میں جبرئیل امین علیہ السلام نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا ہاتھ پکڑ کر انہیں آپ

کے جدامجد حضرت عبدالمطلب تک پہنچا دیا تھا۔ دائی حلیمہ نے بت خانے سے مایوس ہو کر ارادہ کیا کہ حضرت عبدالمطلب کو آپ کی گم شدگی کی اطلاع دے تاکہ کہیں تلاش کریں یہاں پہنچتی ہے تو حضرت کو جناب عبدالمطلب کے پاس دیکھتی ہے اور متعجب رہ جاتی ہے۔ پس اس آیت میں اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے۔

اور بعض کہتے ہیں کہ ضلال سے مراد ہجرت کی سمت کو گم کرنا ہے کہ کدھر جانا چاہیے یا قبلہ گم کرنا یا پہلی بار جبرئیل علیہ السلام کو نہ پہچاننا یا امور دنیا کی راہ گم کرنا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم عبادتِ خداوندی میں مشغولیت کی زیادتی کی وجہ سے امور دنیا کی راہ و رسم کی طرف متوجہ نہیں تھے یا آسمانی راہوں کو گم کرنا ہے جن کے متعلق شب معراج میں ہدایت واقع ہوئی۔

اور بعض کہتے ہیں کہ یہاں ضلال اختلاط کے معنوں میں ہے۔ عرب کہتے ہیں کہ ضل الماء فی اللبن یعنی پانی دودھ میں اس طرح مل گیا کہ تمیز نہیں کی جا سکتی اور بعثت سے پہلے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اس معاشرہ میں کسی امتیاز کے بغیر عمر بسر فرماتے رہے (اقول باللہ التوفیق ایسے گئے گزرے معاشرے میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم ابتدائی چالیس (۴۰) سال جلوہ گر رہے مگر آپ نے اس معاشرے کا اثر قبول نہیں کیا بلکہ معاشرے کو متاثر فرمایا حتیٰ کہ وہ لوگ آپ کو صادق اور امین کے القابات سے یاد کرتے تھے اور خود ابوجہل نے تسلیم کیا کہ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے کبھی جھوٹ نہیں بولا۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اور بعض کہتے ہیں کہ ضلال سے مراد محبت اور مرتبۂ عشق ہے جیسا کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کے بیٹوں نے حضرت یوسف علیہ السلام کے ساتھ آپ کے والہانہ عشق کی ان لفظوں کے ساتھ تعبیر کی ہے کہ اِنَّكَ لَفِیْ ضَلٰلِكَ الْقَدِیْمِ اور ہدایت سے مراد یہ ہے کہ ہم نے محبوب حقیقی تک پہنچنے کا آپ کو پتہ دیا۔ خلاصۃ الکلام یہ ہے کہ اہل تفسیر کے اسی قسم کے اقوال ہیں۔

عصمت انبیاء علیہم السلام کا مسئلہ

یہاں اتنی بات یقین کے ساتھ جاننا چاہیے کہ انبیاء علیہم السلام بعثت سے پہلے بھی

گمراہی اور کفر اصلی اور طبعی سے معصوم اور محفوظ ہیں۔ بلکہ جان بوجھ کر گناہ کرنے سے بھی پاک ہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں ہے کہ میں نے کبھی بھی اہلِ جاہلیت کے کسی کام کا قصد نہیں کیا مگر دو بار اور دونوں بار ہی اللہ تعالیٰ کے لطف و کرم نے اس سے بچا کر رکھا اور اللہ تعالیٰ کی حفاظت میرے اور اس کام کے درمیان حائل ہوئی اور وہ دو کام یہ ہیں کہ ایک دن میں نے قریش کے ایک نوجوان کو کہا جو کہ میرے ہمراہ مکہ شریف سے باہر بکریاں اور بھیڑیں چرایا کرتا کہ آج کی رات میری بکریوں اور بھیڑوں کی خبر گیری کرنا تا کہ میں شہر مکہ میں جاؤں اور وہاں چند ایک نوجوان بیٹھ کر افسانے کہتے ہیں' میں بھی وہ افسانے سنوں جب میں اس قصد سے مکہ شریف میں داخل ہوا۔ پہلا گھر جو میرے راستے میں آیا اس میں سے میں نے مزامیر اور طبل اور دوسرے سازوں کی آواز سُنی' پوچھا یہ کیا ہو رہا ہے؟ لوگوں نے بتایا کہ فلاں کی شادی ہے' میں بھی اس گھر میں داخل ہوا اور چاہا کہ وہ تماشا دیکھوں جیسے ہی میں بیٹھا مجھ پر اس قدر نیند غالب آئی کہ سورج کے طلوع تک بے دار نہ ہو سکا۔

اس کے بعد جب میں بیدار ہوا تو محفل برخاست ہو چکی تھی اسی طرح بار دگر میں نے ارادہ کیا اور نیند میرے اور افسانے مزامیر سننے کے درمیان حائل ہو گئی۔ اور میں اللہ تعالیٰ کی حفاظت کی وجہ سے محفوظ رہا اور اس کے بعد میرے دل میں کبھی خیال تک نہ گزرا یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اپنی رسالت سے نوازا اور اس عصمت کو دوبالا کر دیا لیکن شرائع کو جاننے اور انہیں دریافت کرنے کی پیاس انبیاء علیہم السلام کو بعثت سے پہلے بھی ہوتی ہے' وہ راہِ حق کی تلاش میں ہوتے ہیں اور لفظ ضلال کے استعمال کے لیے اسی قدر کافی ہے جیسا کہ گزر چکا۔

وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی اور آپ کو عیال دار پایا پس غنی کر دیا۔

حضور علیہ السلام کو غنی کرنے کا بیان

اور اس نعمت کا بیان یہ ہے کہ پہلے تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ کے دادا عبدالمطلب کے مال کے ساتھ غنی کر دیا کہ وہ آپ کو اپنے تمام بیٹوں سے زیادہ عزیز سمجھ کر پرورش کرتے تھے اس کے بعد ابو طالب کے مال کے ساتھ غنی فرمایا جو کہ اپنے والد بزرگوار

کی وصیت کے مطابق آپ کو اپنی اولاد سے مقدم رکھتے تھے۔ بعدازاں جب آپ پچیس (۲۵) سال کے ہو گئے تو حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا جو کہ انتہائی مال دار تھیں، حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے نکاح میں آ ئیں۔ وہ آپ کی محبت اور خدمت میں اس قدر مصروف ہوئیں کہ اپنا سارا مال، سونا، نقدی اور جنس آپ کی خدمت میں پیش کر دیا۔ اور قریشی سرداروں کو بُلا کر گواہ بنایا کہ یہ سارا مال حضور کا ہے اگر آپ چاہیں تو ابھی اسے تقسیم کر دیں اور اگر چاہیں سنبھال رکھیں۔ اور جب حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا گزر گئیں تو آپ کو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے مال کے ساتھ غنی کر دیا۔ اور حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے دل میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خوشنودی میں فنا اور محبت اس قدر اُتر چکی تھی کہ آپ نے اپنا چالیس ہزار درہم کا راس المال حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ضروریات میں خرچ کر دیا اور ہجرت کے بعد انصار کے مال کے ساتھ غنی فرمایا۔ اس کے بعد کفار کی فتوحات اور ان بدبختوں کے مالِ غنیمت کے مال کے ساتھ کمال استغناء حاصل ہوئی۔

اور اگرچہ ان میں سے بعض واقعات اس سورۃ کے نازل ہونے کے بعد واقع ہوئے لیکن جو کچھ علم الٰہی میں ہے، واقع جیسا ہی ہے۔ لہٰذا احسان جتلانے کے مقام میں انہیں بھی بیان فرمایا گیا ہے۔ اور اس ظاہری غناء کے باوجود باطنی غنا جسے قناعت کہتے ہیں، حضور علیہ السلام کو اس قدر عطا فرمائی گئی کہ سیرت نگاروں کی زبان پر یہ الفاظ جاری اور گردش کر رہے ہیں کہ آپ کے نزدیک پتھر اور سونا برابر تھے۔

حضور علیہ السلام کے یتیم تشریف لانے کی حکمت

محققین نے لکھا ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یتیم اس لیے فرمایا گیا تاکہ لوگ یتیموں کو حقارت کی نظر سے نہ دیکھیں۔ اور جہاں بھی کسی یتیم کو دیکھیں تو انہیں یاد آ جائے کہ ہمارے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بھی ایک وقت میں یتیم تھے تو اس کے ساتھ اکرام اور تعظیم کے ساتھ پیش آ ئیں اور کم از کم جاہل لوگ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تصویر مبارک دیکھ کر جو تعظیم بجا لاتے ہیں وہ بجا لائیں۔ نیز تاکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یتیموں کی قدر شناسی اور ان پر مہربانی فرمائیں اور یاد فرمائیں کہ یتیمی کا دور کس قدر بھاری ہے۔ نیز

حضور علیہ السلام کے حق میں منظور یہ تھا کہ آپ عمر شریف کی ابتداء سے انتہاء تک اللہ تعالیٰ کے سوا کسی پر اعتماد نہ فرمائیں اور آپ کو اعلیٰ توکل کا مرتبہ نصیب ہو اور یہ مقصد یتیمی کے بغیر پورا نہیں ہوتا۔

نیز یتیم ہونا عام عادت کے مطابق بچوں کی زندگی ضائع اور ان کے غیر مہذب انداز میں بالغ ہونے کا موجب ہے۔ اور جب کوئی شخصیت اس حالت میں کمال حسن اخلاق اور تہذیب سے موصوف پیدا ہو تو بلاشبہ اسے ایک معجزہ شمار کریں اور اسے نبوت کی دلیل قرار دیں۔

آپ کے فقر کا راز

اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فقر اور آپ کو دادا، چچا، اہلیہ، یار غار اور جان نثار انصار کے مال کے ساتھ غنی کرنے میں راز یہ ہے کہ اگر شروع سے ہی آپ کو دولت مند کر دیا جاتا تو عادتِ الٰہی کے مطابق دولت مندوں کی عادتیں جو کہ برتری اور بڑائی چاہتی ہیں' اثر کر جاتیں اور نشست و برخاست دولت مندوں کی ساتھ ہوتی اور تواضع، کسر نفسی دَم بدم اللہ تعالیٰ کے حضور زاری اور بے مایگی کی لذت کا احساس نہ ہوتا۔ نیز جس صورت میں کہ آپ کو خود اپنے مال کے ساتھ دولت مند اور غنی کیا جاتا' آپ کے پیروکاروں کے حق میں بدگمانی ہوتی کہ وہ اس مرتبے والے انسان کے مال اور رواداری کی طمع اور لالچ کے لیے اس کے پیروکار ہوئے ہیں۔ اور برا اخلاص، ایمان اور حق کی رعایت کا پتہ نہ چلتا۔ (اقول وباللہ التوفیق یہ سب مفروضے عقل کے اعتبار سے ہیں کہ علائق بشری کی وجہ سے اکثر اسی قسم کے اثرات مرتب ہوتے ہیں لیکن حضور سیدِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان سب سے قطعاً مبرا ہیں جیسا کہ مفسر علام قدس سرہ نے آپ کے جسمانی خصائص بیان کر کے خود اعتراف فرمایا ہے)۔ بقول حضرت مولانا حسن رضا بریلوی ؎ سر سے پا تک ہر ادا ہے لاجواب خوبروؤں میں نہیں ان کا جواب۔ بموجب اللّٰہ اعلم حیث یجعل رسالتہ اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی حمایت و عنایت شروع سے ہی ان کی نگہبانی کرتی ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہٗ ولوالدیہ)

بنابریں آپ کی ولادت فقر کی حالت میں ہوئی اور لوگوں کو آپ کی محبت کی کشش میں مسخر فرما دیا گیا تا کہ وہ خود بخود اپنا مال اور جان آپ پر نثار کریں اور یہ بات آپ کے کمال پر بہت بڑی دلیل ہے کہ کسی ظاہری سبب کے بغیر لوگ آپ کے اس قدر گرویدہ ہو رہے ہیں۔

ایک نکتہ

یہاں ایک نکتہ جاننا چاہیے اور وہ یہ ہے کہ ہر امیر اور غریب اپنی ابتدائی حالت میں بے مایہ اور بغیر کسی چیز کے ہوتا ہے اور دوسرں کے مال کے ساتھ غنی ہوتا ہے لیکن اگر اپنی طرف سے طمع اور خواہش کرے اور کمائی اور تلاش کے ساتھ مال کی کثرت حاصل کرے تو ہر کسی کے سامنے ذلیل، خوار اور حقیر ہوتا ہے اور اگر مختلف تدبیروں اور حیلوں کے ساتھ دوسروں کو اپنا مطیع کر کے ان کے مال سے نفع حاصل کرے تو اس کی عزت و شوکت کا موجب ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ بادشاہ باوجود اس کے کہ رعایا کے اموال کے ساتھ غنی ہے اور ان سے باج اور خراج کے طور پر مال لیتا ہے' عزت والا ہے اور جو کہ اپنے جیسے لوگوں سے اسی طرح اور اس سے بھی کمتر مانگتا ہے' ذلیل ہے تو پتہ چلا کہ مال کا ہونا عزت کو لازم نہیں کرتا اور اس کا نہ ہونا حقارت کا موجب نہیں۔ ہاں جو مال قناعت، بے پروائی اور طمع چھوڑنے کے ساتھ حاصل ہو' عزت کا موجب ہے اور جو فقیر طمع اور تلاش کی وجہ سے مشقت اٹھائے' باعث ذلت ہے۔

اور چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دوسروں کے اموال کے ساتھ عزت، غلبہ اور شوکت کے طریقے سے غنا حاصل ہوئی' آپ کے مرتبے کی بلندی کا باعث ہوئی اور کسی قسم کی عار لاحق ہونے کا سبب بالکل نہ ہوئی اور جب ان تین نعمتوں کے بیان سے فراغت ہوئی تو ان کا شکر طلب کرتے ہوئے ارشاد فرمایا جا رہا ہے کہ

فَاَمَّا الْيَتِيْمَ فَلَا تَقْهَرْ پس یتیم پر بالکل قہر نہ کریں یعنی اس کا مال اور حق تلف نہ کیا جائے اور گفتگو میں اس کے ساتھ سختی نہ کی جائے اس لیے کہ آپ خود یتیم رہے ہیں اور یتیم کی کمزوری کا آپ کو حق الیقین کے ساتھ علم ہے کہ معمولی سبب سے اس کی دل شکنی ہو جاتی ہے

اور یہ اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی کی نعمت کا شکر یہ ہے۔

وَاَمَّا السَّآئِلَ فَلَا تَنْهَرْ اور سائل کو سخت آواز کے ساتھ رد نہ کریں اس لیے کہ آپ عیال دار اور اسباب ظاہری سے فارغ رہے ہیں اور آپ ضرورت کا دُکھ جانتے ہیں اور یہ شکر وَوَجَدَكَ عَآئِلًا فَاَغْنٰی کی نعمت کے مقابلے میں ہے۔

وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ اور اپنے پروردگار کی نعمتوں کی بات کریں اور بیان فرمائیں اس لیے کہ اس نے آپ کو بے شمار نعمتیں عطا فرمائی ہیں اور آپ کے قلب مقدس پر بے حد و حساب علوم و معارف نازل فرمائے ہیں اس نعمت کا شکر یہ ہے کہ آپ دوسرں کو بھی ان نعمتوں کی دلالت فرمائیں اور ان میں سے حصہ عطا فرمائیں۔

ایک لطیفہ

یہاں ایک لطیفہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ہدایت کو جو کہ دینی احسان اور نعمت ہے، غنی کرنے پر جو کہ دنیوی نعمت ہے، مقدم فرمایا گیا ہے جبکہ شکر طلب کرنے کے مقام میں جو دنیوی نعمت کے مقابل تھا، مقدم کیا گیا ہے اور جو دینی نعمت کے مقابل تھا، بعد میں لایا گیا ہے اس لیے کہ نعمت دنیوی کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت طلب فرمائی گئی ہے اور دینی نعمت کے مقابلے میں باطنی نعمتیں حاصل کرنے کے طریقے پر دلالت طلب فرمائی گئی اور اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر شفقت انہیں ہدایت دینے پر مقدم ہے اس لیے کہ جب تک معاش کا معاملہ منظم نہ ہو۔ دل کو ذمہ داریاں قبول کرنے اور امور آخرت کی تلاش کرنے کی فرصت نہیں ملتی۔ نیز کہا جا سکتا ہے کہ سائل کو یتیم کے ساتھ پوری مناسبت ہے اس لیے جو شکر سائل کے حق کے ساتھ متعلق تھا، یتیم کے ساتھ متصل لایا گیا اور نعمتوں کے شمار میں ہدایت کی نعمت کو غنا کی نعمت سے پہلے لایا گیا اس لیے کہ غنی ہونا اس وقت نعمت ہے جب اموال میں تصرف کرنے کا طریقہ معلوم ہو اور اس کا ہدایت کے بغیر تصور ہی نہیں اور تینوں شکروں کی تینوں نعمتوں کے ساتھ مناسبت ظاہر ہے جیسا کہ بیان کی گئی۔

مذکورہ نعمتوں کے ساتھ مذکورہ شکروں کی باطنی مناسبت اور مسئلہ شفاعت

اور ایک اور پوشیدہ مناسبت ہے کہ یہ تینوں شکر قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کی اُمت کی شفاعت پر دلیل ہو سکتے ہیں اس لیے کہ یتیم سب سے زیادہ کمزور ہے اور اسے قوت دینے کی کوشش کرنا کمال لطف اور رحم کرنا ہے۔ اور سائل اکثر اوقات بے موقع اور بے وقت سوال جھگڑے اور زاری کے ساتھ ستاتا ہے تو اس کی ایذاء رسانی پر صبر کرنا اور اس کے اس ستانے کے بجائے احسان کرنا گناہ کو معاف کرنے کی دلیل ہے۔ اور کیے کو نہ کیا سمجھنا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بیان کرنا ایک دردِسر چاہتا ہے اور اس مشقت کو برداشت کرنا جو کہ نفع دینے کے لیے ہے، بارگاہِ خداوندی میں لوگوں کو اس کے عذاب سے چھڑانے کے لیے عرض و درخواست پیش کرنے کی تکالیف برداشت کرنے کی دلیل ہے۔

اور وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ کے الفاظ میں اس بات کی دلیل ہے کہ اپنے اور اپنے لواحقین کے اوپر خدائی نعمتوں کو بیان کرنا مستحبات میں سے ہے لیکن یہ اس وقت ہے جبکہ مقصد صحیح ہو جیسے زبان کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے شکر کی اشاعت کرنا یا دوسرے لوگوں کی اقتداء حاصل کرنا۔ اور اگر کسی شخص کو نعمت بیان کرنے سے خود بینی اور تکبر کا ڈر ہو تو اس کے بارے میں چھپانا اور پوشیدہ رکھنا زیادہ بہتر ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ آپ اپنی شب بیداری کے حالات صبح کے وقت لوگوں کے سامنے بیان کرتے کہ آج رات میں نے اتنے نوافل ادا کیے اور اتنی تلاوت کی۔ بعض نادانوں نے اعتراض کیا کہ یہ اظہار ریاء کے قبیلے سے ہے۔ آپ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے کہ وَاَمَّا بِنِعْمَةِ رَبِّكَ فَحَدِّثْ اور میرے نزدیک اس کے برابر اور کوئی نعمت نہیں ہے کہ مجھے نیکی کی توفیق عطا فرمائی گئی ہے۔ تو میں یہ نعمت کیوں بیان نہ کروں اور اس کے شکر سے محروم رہوں؟

حق یتیم، حق سائل اور تحدیث نعمت کے متعلق حضور علیہ السلام کے معمولات

جاننا چاہیے کہ اس سورۃ میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تینوں چیزوں کی انتہائی تاکید فرمائی گئی ہے۔ یتیم کے حق کی رعایت کرنا، سائل کے حق کی نگہبانی کرنا اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کو بیان کرنا اور اس انتہائی تاکید کی وجہ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان تینوں چیزوں کے بارے میں بے حد کوشش فرماتے تھے۔ جیسا کہ نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کی سیرت

طیبہ کی آگاہی رکھنے والوں پر بالکل ظاہر ہے۔

حدیث صحیح میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا ہے کہ یتیم کو پالنے والا خواہ وہ یتیم اس کا رشتے دار ہو یا اجنبی' قیامت کے دن میرے اس طرح قریب ہو گا جیسا کہ ہاتھ کی دو انگلیاں جو باہم متصل ہیں اور آپ نے اپنی دو انگلیوں کے ساتھ اشارہ فرمایا۔

نیز حدیث شریف میں ہے کہ ایک شخص حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) میرا دل بہت سخت ہے اس کا علاج فرمائیں۔ آپ نے ارشاد فرمایا کہ یتیموں پر مہربانی کرو اور ان کے سروں پر ہاتھ رکھو' تمہارے دل کی سختی دُور ہو جائے گی۔

نیز وارد ہے کہ جو شخص شفقت کے ساتھ یتیم کے سر پر ہاتھ پھیرے اس کے لیے ہر بال کے بدلے ایک نیکی لکھی جاتی ہے۔ اور بزرگانِ سلف نے فرمایا ہے کہ جب یتیم روتا ہے عرش ہلنے لگتا ہے تو جس نے دل جوئی کر کے یتیم کو رونے سے چپ کرایا گویا اس نے عرش کو ہلنے سے ساکن کر دیا۔

حق سائل کے متعلق نقش سیرتِ طیبہ

اور سائلوں کے بارے میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بخشش اس قدر تھی کہ آپ کی زبان مبارک پر کبھی لا کا لفظ جاری نہیں ہوتا تھا۔ چنانچہ بخاری میں حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہما کی روایت کے ساتھ مروی ہے کہ کسی نے کبھی بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے کسی چیز کا سوال نہ کیا جس کے جواب میں آپ نے لا فرمایا ہو۔ چنانچہ فرزدق شاعر اس مفہوم کو مبالغہ کے طریقے سے اس شعر میں نظم کر کے کہتا ہے

ماقال لاقط الافی تشہد، لولا التشہد کانت لاء ہ نعم

یعنی آپ نے تشہد کے سوا کبھی لا نہ فرمایا اگر تشہد نہ ہوتا تو آپ کا لا نعم ہوتا۔

اور ترمذی میں روایت کی گئی کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں بحرین کی طرف سے نوے (۹۰) ہزار درہم لائے گئے تھے' آپ انہیں مسجد شریف کی

چٹائیوں پر ڈھیر کر کے نمازِ فجر کے بعد تقسیم فرمانے لگے اور نمازِ ظہر تک ایک درہم بھی باقی نہ بچا۔ اور اس دوران جو سائل بھی آیا' آپ نے اسے عطا فرمایا۔ اتفاقاً تقسیم سے فارغ ہوئے تو ایک اور سائل آ دھمکا۔ آپ نے فرمایا کہ اب تو سب کچھ تقسیم ہو چکا لیکن جاؤ تمہیں جس چیز کی ضرورت ہے' بیوپاریوں سے خرید لو اور میرے نام درج کرادو جب وہ میرے پاس آئے گا' میں قیمت ادا کردوں گا۔ اسی اثناء میں حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ نے حاضر ہو کر عرض کی کہ یا رسول اللہ! (صلی اللہ تعالیٰ علیہ وآلہ وسلم) اللہ تعالیٰ نے آپ کو مقدور سے زیادہ تکلیف نہیں دی ہے تو آپ یہ قرضے کیوں برداشت فرما رہے ہیں؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہ بات پسند نہ آئی اور آپ کے چہرۂ انور پر ناپسندیدگی کے آثار ظاہر ہوئے۔ ایک انصاری حاضر تھے' انہوں نے عرض کی انفق ولا تخش من ذی العرش اقلالا حضور آپ بلاتکلف خرچ فرمائیں اور آپ عرش کے مالک کی طرف سے کسی قلت کا کوئی خطرہ محسوس نہ فرمائیں۔ سرکار صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مسکرائے اور آپ کے رُخ انور پر خوشی کے آثار نمایاں ہوئے اور فرمایا کہ مجھے اسی روش کا حکم دیا گیا ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ سائلوں پر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جود وسخا اس حد تک تھی کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو میانہ روی کا حکم دیا اور بہت زیادہ خرچ کرنے سے روک دیا۔ چنانچہ سورۂ اسریٰ کی تفسیر میں مذکور ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تشریف فرما تھے کہ ایک بچہ حاضر ہوا اور عرض کی کہ یا رسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) میری ماں عرض کر رہی ہے کہ میرے پاس پہننے کا کُرتہ نہیں ہے' مجھے ایک کُرتہ عطا فرمائیں۔ آپ نے فرمایا ذرا ٹھہر کر آنا' عطا کروں گا۔ بچہ چلا گیا اور پھر آیا اور کہنے لگا میری ماں عرض کر رہی ہے کہ یہی کُرتہ جو جسم مبارک پر ہے' مجھے عنائت فرمائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دولت خانہ میں تشریف لے جا کر کُرتہ بدن مبارک سے اُتار کر کُرتہ اس بچے کو بھیج دیا کہ اپنی والدہ کو دے دے اور خود برہنہ جسم تشریف فرما رہے۔ صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو کہ آپ کے باہر تشریف لانے کے منتظر تھے' اُٹھ کر چلے گئے۔ اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی وَلَا تَبْسُطْهَا كُلَّ الْبَسْطِ یعنی دستِ مبارک میں اتنی فراخی نہ فرمائیں کہ آپ برہنہ جسم گھر میں تشریف فرما

رہیں اور ان مخلص احباب اور صحابہ کرام سے مل بیٹھنا بھی نہ ہو سکے جو کہ فیض حاصل کرنے کے لیے آپ کی خدمت میں حاضر ہوتے ہیں۔

اور بخاری میں وارد ہے کہ ایک مرتبہ ایک خاتون نے اپنے ہاتھ سے ایک چادر سی کر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خدمت میں پیش کی اور عرض کی کہ میری آرزو یہ ہے کہ آپ اسے بنفسِ نفیس زیب تن فرمائیں کہ میں نے اسے اپنے ہاتھوں سے سیا ہے اور پُر تکلف حاشیہ لگایا ہے۔ سرکار علیہ السلام کو بھی چادر کی ضرورت تھی' آپ نے لے کر پہن لی اسی دوران ایک شخص آ گیا اس نے عرض کی کہ یہ چادر کتنی خوبصورت ہے اور اس کا حاشیہ کس قدر پُرکشش ہے۔ یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) یہ چادر مجھے عنایت فرمائیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا بہت اچھا اور وہ چادر اسے عطا فرما دی جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مجلس شریف سے اُٹھ کر تشریف لے گئے تو احباب نے اس شخص کی ملامت کی اور کہا کہ تو نے اچھا نہیں کیا اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہ چادر بڑی رغبت اور ضرورت کے ساتھ زیب تن فرمائی تھی اور تجھے معلوم ہے کہ آپ کسی سائل کو رد نہیں فرماتے تو نے سوال کیوں کیا؟ اس نے کہا کہ میں نے یہ چادر دنیا میں پہننے کے لیے نہیں مانگی ہے بلکہ اپنے کفن کے لیے مانگی ہے کیونکہ یہ چادر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہاں مقبول اور آپ کے قلب مبارک کو پسندیدہ تھی۔

اور اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا بیان جو کہ آپ کے بارے میں دربارِ خداوندی سے دنیا و آخرت میں بارش کی طرح برستی تھیں' صبح و شام حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وقوع پذیر ہوتا تھا اور ان کے بیان کے شکر کے مقام میں آپ نے دفتروں کے دفتر ارشاد فرمائے ہیں جیسا کہ حدیث شریف کی کتابوں سے واقف حضرات سے پوشیدہ نہیں ہے۔

گمشدہ کے لیے سورۃ والضحیٰ کی خصوصیت

اور اس سورۃ کے مجرب خواص میں سے یہ ہے کہ گمشدہ کے لیے اس سورۃ کو سات (۷) بار پڑھ کر اپنے سر کے اردگرد شہادت کی انگلی گھمائیں اور سات مرتبہ پورا کرنے کے بعد اصبحت فی امان اللہ وامسیت فی جوار اللہ امسیت فی امان اللہ

واصبحت فی جوار اللہ پڑھ کر دستک دیں' وہ گم شدہ مل جائے گا۔ واللہ اعلم

سورۂ الم نشرح

مکی ہے، اس کی آٹھ (۸) آیات، اٹھائیس (۲۸) کلمات اور ایک سو تیس (۱۳۰) حرف ہیں۔

وجہ ربط

اور اس سورۃ کا سورۃ والضحیٰ کے ساتھ کلی طور پر رابطہ ہے کہ دونوں میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنی نعمتوں کا شمار مقصود ہے اور کلام کا انداز بالکل ایک جیسا ہے اسی لیے بعض لوگوں نے یعنی شیعہ فرقے کے لوگوں نے ان دونوں کو ایک سورۃ گمان کیا ہے۔ اور دونوں کو بسم اللہ کے ساتھ فاصلہ کیے بغیر ایک رکعت میں پڑھنے کا فیصلہ کیا ہے۔ لیکن اگر غور کریں تو ایک نکتہ معلوم کریں جسکی وجہ سے ان دونوں سورتوں کے ایک ہونے کا حکم درست قرار نہیں پاتا' لفظ میں بھی اور معنی میں بھی۔ جہت لفظی سے اس بناء پر کہ سورۃ والضحیٰ میں استفہام غائب کے صیغے کے ساتھ وارد ہے جیسے اَلَمْ یَجِدْكَ یَتِیْمًا فَاٰوٰی جبکہ یہاں متکلم کا صیغہ ہے اور یہ بالکل ظاہر فرق ہے جو کہ ایک دوسرے سے جدا ہونے کا موجب اور مناسبت کے منافی ہے۔ اور اگر صرف اس بات پر نظر کرتے ہوئے کہ ان دونوں سورتوں میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنی نعمتوں کا شمار مراد ہے' دونوں سورتوں کو ایک قرار دیں اور درمیان سے بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ کو گرا دیں تو اس قسم کی مناسبت ہمیں بہت سی سورتوں میں ملے گی بلکہ قرآن پاک سب کا سب ایک کلام کی طرح ہے تو اکثر سورتوں کے درمیان سے بسم اللہ کو گرانا لازم آئے گا۔

رہا معنوی اعتبار سے تو اس بناء پر کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اللہ تعالیٰ کی نعمتیں دو قسم کی ہیں: ایک قسم وہ ہے جس کا لوگ حس کے ساتھ مشاہدہ کرتے تھے اور وہ نعمتیں آپ میں ہر عام و خاص کو نظر آتی تھیں۔ اور دوسری قسم وہ ہے جو عام تو کیا خاص کو بھی نظر نہیں آتی تھیں۔ اور وہ ایک مخفی اور پوشیدہ امر ہے تو دونوں قسموں کو جدا جدا بیان کرنا ضروری ہے۔

پہلی قسم کو سورۃ والضحیٰ میں تفصیل کے ساتھ بیان فرمایا ہے جبکہ دوسری قسم کو اس سورۃ میں تا کہ کوئی شبہ نہ رہے۔

نیز جن نعمتوں کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مخصوص فرمایا گیا' ان کی دو قسمیں ہیں: پہلی وہ جو آپ کے ظاہر کے ساتھ تعلق رکھتی ہے اور دوسری وہ جن کا تعلق آپ کے باطن کے ساتھ ہے۔ پس سورۃ والضحیٰ میں پہلی قسم کو بیان کرنا مقصود ہوا جبکہ یہاں دوسری قسم کو بیان فرمایا گیا۔ تو گویا ایک سورۃ حضور علیہ السلام کی ان خصوصیات کو شمار کرنے کے لیے ہے جو ظاہر میں ہیں اور دوسری سورۃ آپ کی ان نعمتوں کے شمار کے ملیے جو باطن میں ہیں اور ظاہر و باطن میں جو فرق ہے' بالکل ظاہر ہے۔

سبب نزول

اور بعض مفسرین نے اس سورۃ کے نزول کا سبب یوں بیان کیا ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دربارِ خداوندی میں عرض کی کہ اے میرے پروردگار! تو نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو خلت کا مرتبہ بخشا۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو کلیمی کی خلعت عطا فرمائی۔ حضرت داؤد علیہ السلام کو پہاڑ اور لوہے کی تسخیر کے ساتھ ممتاز فرمایا اور حضرت سلیمان علیہ السلام کو جنوں اور انسانوں کی بادشاہت اور آگ کی تسخیر کے ساتھ انفرادیت بخشی' میرے لیے کون سی نعمت مخصوص کی گئی ہے؟ اس سوال کے جواب میں یہ سورۃ نازل ہوئی اور ظاہری طور پر یہ سوال واقعۂ معراج سے پہلے کا ہوگا اس لیے کہ اس واقعہ کے بعد جو خصوصیات آپ کو حاصل ہوئیں' گزشتہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کو بھی اس کا سوواں (۱۰۰واں) حصہ حاصل نہ تھا۔

نکتہ

اور سورۃ الم نشرح کے نکات میں سے ایک نکتہ یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ کی طلب کے بغیر اس قدر شرح صدر فرمائی کہ حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام نے دربارِ خداوندی سے اس کی طلب کی کہ رب اشرح لی صدری پھر بھی انہیں اس مرتبے کی شرح صدر میسر نہ ہوئی جیسا کہ اس واقعہ سے ظاہر ہوا جو انہیں اپنے بھائی

حضرت ہارون علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا اور اپنے مقام پر آئے گا تا کہ اس امر کا اشارہ ہو کہ جو کام اللہ تعالیٰ کی عنایت اور آدمی کی طلب کے بغیر سرانجام پائے اس کا مقام اونچا ہوتا ہے۔(اقول وباللہ التوفیق۔ یہاں یہ بھی اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنے رسل علیہم الصلوٰت والتسلیمات کو جو نعمتیں ان کے مانگنے پر دیتا ہے اپنے محبوب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ان کی طلب کا حوالہ دیئے بغیر عطا فرماتا ہے جیسے شرح صدر کے علاوہ رفعت ذکر کہ حضرت ابراہیم علیہ الصلوٰۃ والسلام عرض کرتے ہیں وجعل لی لسان صدق فی الآخرین۔ اور اس کی قبولیت میں فرمایا: وترکنا علیہ فی الآخرین سلامٌ علی ابراھیم جبکہ اپنے حبیب لبیب صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے متعلق فرمایا: وسلموا تسلیمًا نیز فرمایا: ورفعنا لك ذکرك۔محمد محفوظ الحق غفرلہ ولوالدیہ)

وجہ تسمیہ

اور اسے سورۃ الم نشرح اس لیے کہتے ہیں کہ یہ سورۃ کمال محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰۃ و السلام کے پیدا ہونے کی جگہ پر انتہائی تاکیدی انداز میں دلالت کرتی ہے۔ اس لیے کہ اس کی حقیقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معنوی سینے کا تجلیاتِ الٰہیہ کے انوار کے ساتھ کمال وسیع ہونا ہے۔

خاصیت

اور اس سورۃ کے خواص میں سے یہ ہے کہ جو شخص اس سورۃ کو سوتے وقت سترہ (۱۷) بار پڑھ کر اپنے سینے پر دَم کرے اسے وسوسے اور بُرے خیالات پریشان نہیں کرتے اور وہ تدبیروں میں غلطی نہیں کرتا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ نَشْرَحْ کیا ہم نے کشادہ نہیں فرمایا ہے لَكَ صَدْرَكَ آپ کے لیے آپ کا سینہ تا کہ وحی کا بوجھ برداشت کرے اور اس سینۂ پاک میں اسرارِ الٰہیہ سمائیں۔ اور دعوت و تبلیغ کا غم، اُمت اور دین کا غم، دنیا اور آخرت کا غم سب وہیں قرار پکڑیں اور کینہ، کھوٹ، بغض،

حسد اور بُرے اخلاق قریب نہ پھٹکیں اور علم، ایمان اور حکمت کا نور محیط ہو اور لک کا لفظ اس لیے لایا گیا ہے کہ آپ کے سینے کو فراخ کرنا صرف آپ کو نفع کے لیے ہے تا کہ آپ انتہائی کمال حاصل کریں اگر لک کا لفظ نہ ہوتا تو یہ معنی سمجھ میں نہ آتا۔

اصطلاح طریقت میں صدر کا مفہوم

اور لغتِ عرب میں صدر سینے کو کہتے ہیں اور اہلِ طریقت کی اصطلاح میں اس کا معنی یہ ہے کہ قلب کے دو دروازے ہیں: ایک دروازہ جو کہ نفس کی طرف ہے اس کا نام صدر ہے اور اس کا ایک دروازہ جو کہ روح کی طرف ہے، بہت کشادہ اور وسیع ہے اس کا نام قلب ہے اور صدر اس دروازے کے مقابلے میں بہت تنگ واقع ہوا ہے تو جب صدر کو کشادہ کر دیں، ظاہر ہے کہ وہ دروازہ اور کشادہ ہوگا اسی لیے یہاں لفظ صدر لایا گیا ہے نہ کہ لفظ قلب۔ اس لیے صدر کہ قلب کے لیے بمنزلہ قلعہ کے ہے۔ اور دنیوی افکار اور اس کی آرائشوں کی حرص کی وجہ سے شیطان زیادہ تر اسی سمت نفس کی طرف سے شورش کرتا ہے اور تنگ کرتا ہے اور اسکی تنگی کی وجہ سے قلب بھی تنگ ہوتا ہے اور دل کی تنگی کی وجہ سے نیکی کی لذت اور ایمان کی حلاوت کم ہو جاتی ہے اور جب اس سمت دل کو کشادگی مل گئی تو بندگی کی ادائیگی پورے ولولے کے ساتھ میسر آئی اور مقصد حاصل ہو گیا۔

یہاں جاننا چاہیے کہ شرح صدر کا معنی حوصلے کی فراخی ہے۔ اور ہر شخص کے حوصلہ کی فراخی اس کی استعداد کے مطابق اور اس کے کمال اور مرتبے کی وسعت کے اندازے پر ہوتی ہے۔ اور ہر مرتبے اور ہر کمال کے حوصلے کی فراخی جب تک اس مرتبے اور اس کمال کو نہ پہنچے، دریافت نہیں کی جا سکتی۔ اسی لیے اکثر عوام الناس چاہیں کہ بادشاہوں کے حوصلہ کی فراخی دریافت کر لیں اور معلوم کر لیں تو گفتگو کے ساتھ ہرگز نہیں سمجھ سکتے۔ اور اس قول کے مطابق کہ ولی را ولی می شناسد و نبی را نبی می شناسد۔ خصوصاً حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شرح صدر کا خود امکان نہیں کہ کوئی انسان کماحقہ تصور کر سکے اس لیے کہ آپ کے مرتبے کا کمال جو کہ خاتمیت ہے، کسی کو حاصل نہیں ہے اور کیا خوب کہا گیا ہے۔

یا صاحب الجمال، یا سید البشر، من وجهك المنير لقد نور القمر

لا یمکن الثناء کما کان حقہ، بعد از خدا بزرگ توئی قصہ مختصر

حضور رحمتِ عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شرح صدر کا بیان

لیکن حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کو جو حسی اور معنوی شرح صدر حاصل ہوئی یہاں اس کے متعلق مثال اور اجمال کے ساتھ نشان دینا ضروری ہے۔

معنوی شرح صدر

آپ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے معنوی شرح صدر کا اگر تصور کریں تو یوں سمجھنا چاہیے کہ آپ کے سینۂ پاک میں ایک بے پایاں فضا واقع ہے جس میں انتہائی وسیع ایک عظیم عمارت کی بنیاد رکھی گئی ہے اور وہ عمارت بارہ (۱۲) نشست گاہوں پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بعض کا تعلق دنیا اور بعض کا دین کے ساتھ ہے۔ جبکہ بعض دین و دنیا سے بالاتر ہیں۔

ایک نشست گاہ میں تصور کرنا چاہیے کہ اس میں ایک عظیم الشان بادشاہ جلوہ گر ہے۔ اور روئے زمین کے سب بادشاہ اس کے دربار میں حاضر ہو کر اس سے مملکت کے ضابطے اور تدبیریں پوچھتے ہیں اور فرامین کسریٰ، توزک تیموری، کلمات عالمگیری، واقعات بابری اور آئین اکبری سب یہیں درستی اور امتحان کے معیار پر پیش کیے جاتے ہیں۔ اور ممالک کی فرماں روائی اور مختلف ریاستوں اور دُور دراز شہروں کے ساتھ صلح و جنگ کے آداب اسی سے پوچھتے ہیں۔

اور دوسری نشست گاہ میں ایک حکیم جلوہ گر ہے جو کہ سیاست منزل، تہذیب اخلاق اور آداب کی آرائش کو کما حقہ بیان فرماتا ہے۔ اور زمانے کے حکماء اور جہان کے فلسفی اسی سے قوانین کا سبق لیتے ہیں۔ اور اس کے ہر قانون سے جو وہ بیان فرماتا ہے ارسطو، نصیر طوسی، ابن مسکویہ اور ابن سینا وغیرہ بے شمار علوم نکالتے ہیں اور اپنے فنون میں استعمال کرتے ہیں۔

اور تیسری نشست گاہ میں ایک قاضی مسند عدالت پر رونق افروز ہے۔ اور مقدمات کے فیصلے کرنے، جھگڑے نمٹانے اور فریقین کو راضی کرنے میں رنگا رنگ فیصلے کر رہا ہے اور زمانے کے جج حضرات اس کے ارشادات کو اپنا دستور العمل سمجھتے ہوئے سند کے طور پر لے

جارہے ہیں۔

اور چوتھی نشست گاہ میں ایک متبحر مفتی مسند افتاء پر براجمان ہے۔ اور فتووں کا سمندر اس کی زبان سے جوش مار رہا ہے۔ اور نئے رونما ہونے والے واقعات میں سے ہر واقعہ میں اصول کے مطابق کتاب وسنت سے حکمِ الٰہی واضح فرما رہا ہے۔ اور جہان کے راوی اور زمانے کے فرائض نویس سب اس کے اردگرد بیٹھے اس کے ہر لفظ کو نقل کر رہے ہیں اور اپنی ضرورتوں میں کام میں لاتے ہیں۔

اور پانچویں نشست گاہ میں ایک محاسبہ کرنے والا حکومت کے تخت پر فائز ہے' جلاد اس کے سامنے کھڑے ہیں اور مجرموں کو اس کے حضور پیش کر کے ہر کسی کو حدو تعزیر، قید اور سزا دے رہے ہیں۔ اور محاسبہ، حدود اور تعزیریں قائم کرنے اور اہلِ بدعت کو سزا دینے کے ضابطے اس امر سے وابستہ اہل کار اس سے یاد کر رہے ہیں اور وہ برائیوں کے اسباب کو روکنے اور شہوات، غضب اور ظلم کے داخلے کی راہوں کی پیش بندی میں موشگافیاں کر رہا ہے۔

اور چھٹی نشست گاہ میں سات قرأتوں کا ایک بہترین اور خوش الحان قاری روایات کو ازبر کیے ہوئے لوگوں کے سامنے تلاوت فرما رہا ہے اور دنیائے جہاں کے قاری حضرات اس سے ہر روایت کی وجہ کی تحقیق کر رہے ہیں۔ کسی کو ادغام کا قاعدہ سکھا رہا ہے' دوسرے کے سامنے ہمزہ کی تخفیف کی بحث کر رہا ہے' تیسرے کو ریلون، اظہار اور اخفاء کے قانون کی دلالت کر رہا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس

اور ساتویں خلوت نشست گاہ میں ایک اوراد پڑھنے والا عابد وظائف اور نوافل میں مشغول ہو کر دنیا و مافیہا کو صاف جواب دیئے ہوئے صبح سے شام تک اور شام سے صبح تک تلاوت قرآن پاک، اذکار نبوی، جزری کی حصن حصین، ملا علی قاری کی حزب اعظم اور شیخ الشیوخ کے اوراد میں مصروف ہے اور اذکار کے انوار کی کثرت کی وجہ سے عالم علوی اور سفلی کے ملائکہ اس کی محفل سے مانوس ہو کر گروہ در گروہ اس کے اردگرد حاضر ہو رہے ہیں اور اسے ان کی حاضری کی وجہ سے ایک عظیم انس اور ایسی لذت حاصل ہو رہی ہے کہ دنیا و مافیہا کو

فراموش کیے ہوئے ہے۔ اور جن لوگوں کو اس کام کا شوق ہے اس سے اس بحث کی تفتیش کر رہے ہیں' کسی کو دن رات کے نوافل ادا کرنے کا طریقہ بیان فرما رہا ہے' دوسرے کو لباس پہننے، پانی پینے، کھانا کھانے، چاند دیکھنے اور دوسرے کاموں کی دعائیں بتا رہا ہے اور اپنے اوقات کو ذکر و درود کی ہدایت کے ساتھ معمور کیے ہوئے ہے۔

اور آٹھویں نشست گاہ میں ایک عارف کامل اللہ تعالیٰ کی ذات، صفات اور افعال کے اسرار جو کہ کائنات میں منتشر اور بکھرے ہوئے ہیں۔ اور علومِ لامتناہی کو اپنی گوہر افشاں زبان سے وضاحت فرما رہا ہے۔ اور اس امر سے وابستہ لوگ فتوحاتِ مکیہ اور فصوص الحکم اس کی زبان سے سُن کر لکھ رہے ہیں اور عجیب روحانی لذتیں حاصل کر رہے ہیں۔

اور نویں نشست گاہ میں ایک واعظ منبر پر تشریف فرما ہو کر عام بجی ہوئی محفل میں دِلوں کو جنبش اور ارواح کو حرکت میں لا کر کسی کو عظیم ثواب کی ترغیب کے ساتھ راہِ راست پر لا رہا ہے۔ اور کسی کو دردناک عذاب سے ڈرا کر توبہ کرا رہا ہے۔ اور لوگوں کو قبر، حشر، نشر، حساب، میزان اور پل صراط سے گذرنے کے واقعات، دوزخ کی سزاؤں، جنت کے بلند درجات اور ان اعمال کا جو کہ ان مقامات میں نفع بخش ہوتے یا نقصان دیتے ہیں' واضح بیان کے ساتھ پتہ دے رہا ہے اس کی مجلس میں کافر زنار توڑ رہے ہیں' گناہ گار توبہ کر رہے ہیں' سخت دِلوں والے نرم دل ہو رہے ہیں اور حقوق نہ پہچاننے والے حقوق پہچان رہے ہیں۔

اور دسویں نشست گاہ میں ایک صاحب عزم رسول ہے جو کہ دِلوں کو نرم کرنے اور انہیں راہِ راست پر لانے میں قسم قسم کی تدبیریں اور حیلے بروئے کار لا رہا ہے۔ اور اس کام کے لیے لوگوں کے ایک گروہ کو اپنے ساتھ ملا کر ہر کسی کی استعداد کے مطابق اسے تبلیغ اور دعوت کے لیے ہر طرف بھیج رہا ہے۔ اور ہر قوم کے اپنے رسول کے ساتھ معاملے کو سُن رہا ہے اور اس معاملہ کے تدارک میں اپنی درست سوچ کے ساتھ کار آمد اور مؤثر تدبیریں سکھا رہا ہے۔

اور گیارہویں نشست گاہ میں ایک صاحب طریقت مرشد کامل رونق افروز ہے جس سے ہزاروں طالبان فدا ہجوم کیے ہوئے اپنی مشکلات کا حل مانگ رہے ہیں۔ اور وہ ہر کسی

کی استعداد کے مطابق ناشناسی کے پردے کو دُور کرنے میں کوشش کررہا ہے اور انہیں منزل تک پہنچانے کے طریقے کی نشاندہی فرمارہا ہے۔ اور انہیں احوال، مقامات، مراتب اور مناصب کی راہ دِکھا رہا ہے۔ اور فیض لینے والوں کی بواطن میں قسم قسم کی توجہات اور تاثیرات فرمارہا ہے اور ارشاد وتزکیہ کا بازار گرم کیے ہوئے ہے۔

اور بارہویں نشست گاہ میں ایک نازک، ماہ جبین بلکہ کعبہ صورت محبوب جلوہ فرما ہے جس کے جسم مقدس کو جمالِ الٰہی کی تجلی اپنا آشیانہ بنائے ہوئے ہے۔ اور طور پیکر مطلوب' جس پر حسن ازلی کے انوار چمک رہے ہیں۔ اور اس میں محبوبیتِ الٰہی کی شان جلوہ گر ہے اور وہ محبت کی کشش کے ساتھ دِلوں کا شکار کررہا ہے۔ اور حسنِ ازلی کے لاکھوں عاشق دیوانہ وار کسی نفع اور کمال حاصل کرنے کی توقع کے بغیر دُور دُور سے اس کی کشش کے کمند میں ہاتھ ڈالے بھاگے آرہے ہیں اور اس کے آستانے پر سجدے کررہے ہیں اور اس کے جمال کی ایک جھلک کے مشتاق ہیں اور یہ مرتبہ ان مراتب میں سے ہے جو کہ انسان کو اس بارگاہ محبوبیت کے مقبول محبوب کے وسیلہ جلیلہ کے بغیر نہیں ملا۔ اولیائے اللہ میں سے بعض ایسے ہیں جنہیں اس کی محبوبیت سے تھوڑی سی مہک نصیب ہوئی اور وہ مخلوق کے مسجود اور دِلوں کے محبوب ہوئے ہیں جیسے حضرت غوث الاعظم اور سلطان المشائخ نظام الدین اولیاء قدس اللہ تعالیٰ سرہما (اقول وباللہ التوفیق حضرت مفسر علام قدس سرہ کی مندرجہ بالا وضاحت سے پتہ چلا کہ ساری کائنات کا ظاہری اور باطنی نظام سید الکونین حبیب رب العالمین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اشاروں پر چل رہا ہے۔ ساری کائنات کی مشکلات یہیں سے حل ہوتی ہیں۔ امام احمد رضا بریلوی درست فرمارہے ہیں ۔

وہ جو نہ تھے تو کچھ نہ تھا — وہ جو نہ ہوں تو کچھ نہ ہو
جان ہیں وہ جہان کی — جان ہے تو جہان ہے

نیز کعبہ صورت محبوب، انوار حسن ازل کا ان کے جسم مقدس پر چمکنا' حسنِ ازلی کے طالبوں کا آپ کے آستانہ پاک پر سجدہ کناں ہونا اور قرب خداوندی کے تمام مراتب کا آپ کے وسیلہ سے ملنا' یہ تمام اوصاف بھی قابل توجہ ہیں کہ اگر نجدیوں کے بقول معاذ اللہ آپ

عام انسانوں جیسے ہیں تو حضرت مفسر علام کی ان تصریحات کے متعلق کیا فیصلہ کیا جائے گا اور پھر یہ بھی پتہ چلا کہ حضرت مفسر قدس سرہ حضور سید شہنشاہ بغداد رضی اللہ عنہ کو غوث الاعظم یعنی سب سے بڑا فریادرس مانتے ہیں۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ ولوالدیہ)

اور کسی کے دل میں ان بارہ (۱۲) حلوت گاہوں کے بارے میں کوئی شک اور شبہ گزرے تو چاہیے کہ ان معاملات میں جو کہ ذکر کیے گئے ہیں، غور کرے کہ ان تمام کاموں کی بنیاد کہاں سے ہے اسے یقیناً پتہ چل جائے گا کہ یہ سب کچھ کمال محمدی علیٰ صاحبہ الصلوات والتسلیمات کے انوار کا پرتو ہے جو کہ شاخ در شاخ اور شعبہ در شعبہ نہروں کی طرح دریا سے جدا ہوئے اور ہر گروہ تک پہنچے اور اس گروہ کو اپنے ہمسروں سے ممتاز کر دیا اور حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا سینہ پاک فی الحقیقت مجموعی طور پر ان کمالات کا مخزن تھا اور یہ تمام کام اور اشغال دن رات اسی دریا سے فوارے کی طرح اُبلتے تھا جیسا کہ اہلِ سیر پر جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے احوال کو ملاحظہ کرتے ہیں، پوشیدہ نہیں ہے۔

اور حکمت کا قانون ہے کہ دائمی افعال کا ایک نہج پر صادر ہونا ان افعال کی استعداد حاصل ہوئے بغیر محال ہے اور افعال جس قدر کمال انتظام کے مرتبے پر ہوں، استعداد کے کمال پر دلالت کرتے ہیں۔

حسی شرح صدر کے متعلق مقدمہ

اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حسی شرح صدر کو ایک مقدمہ کی تمہید کے بغیر سمجھانا بہت مشکل ہے اور وہ مقدمہ یہ ہے کہ عالمِ غیب کی عالمِ شہادت کے ساتھ نسبت وہی ہے جو اصل کی فرع کے ساتھ۔ اور آدمی کی سائے کے ساتھ نسبت ہے۔ پس عالمِ شہادت میں جو چیز بھی ہے اگر عالمِ غیب میں اس کی کوئی اصل ہے تو درست ورنہ ختم ہونے والے سراب اور جھوٹے خیال کی طرح ہوگی۔ اور ہر غیبی چیز کی اگر عالمِ شہادت میں کوئی مثال یا صورت نہ ہو تو پھل کے بغیر درخت اور دلیل کے بغیر مدلول کی طرح رہ جائے گی اسی لیے کہا گیا ہے کہ جو چیز عالمِ ارواح میں ہے، مصدر ہے اور جو عالم اجسام میں ہے مظہر ہے۔

تو جب اس مقدمے کو معلوم کر لیا تو جاننا چاہیے کہ جس وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم

کی معنوی شرح صدر عالمِ غیب میں قرار پائی حسی دنیا میں اس کی چار مرتبہ صورت بنی۔ پہلی یہ کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ابھی بطنِ مادر میں رونق افروز تھے کہ آپ کے والد بزرگوار واصل بحق ہو گئے۔ آپ کی ولادت باسعادت کے بعد آپ کی والدہ محترمہ نے چاہا کہ آپ کو پرورش کے لیے دایہ کے سپرد کر دیا جائے۔

حضرت حلیمہ سعدیہ رضی اللہ عنہا کے گھر شرح صدر کا ذکر

اور عربوں کی عادت تھی کہ بچوں کو پرورش کے لیے دائیوں کے سپرد کر دیتے تا کہ انہیں اپنے گھر لے جائیں۔ اتفاقاً ان دنوں بنی سعد کے قبیلے کی چند دودھ پلانے والی خواتین جو کہ شہر طائف کے گردونواح میں سکونت پذیر تھیں' بچوں کی طلب میں مکہ معظمہ میں وارد ہوئیں۔ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے والد بزرگوار واصل بحق ہو چکے تھے اس لیے کسی دایہ کو بھی آپ کو لینے کی توفیق نصیب نہ ہوئی۔ اور حلیمہ نامی ایک خاتون کو جو کہ ان خواتین میں سے تھی' کسی نے بھی پرورش کے لیے اپنا بچہ نہ دیا کیونکہ بہت غریب اور مفلوک الحال خاتون تھی۔ وہ بہت حیران ہوئی کہ میں پرورش کے لیے بچہ لینے کے لیے آئی تھی اگر خالی ہاتھ وطن جاؤں تو مجھے بہت خفت اور ندامت ہوتی ہے۔ ناچار اس یتیم کو ہی اختیار کرلوں۔ گرچہ اس کی پرورش میں اتنی دنیوی منفعت کی توقع نہیں' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لے کر روانہ ہوگئی۔ سواری کے لیے ایک لاغر جانور رکھتی تھی جو کہ بالکل چل نہیں سکتا تھا جیسے ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو گود میں لے کر اس پر سوار ہوئی' وہ اتنا طاقت ور اور تیز رفتار ہو گیا کہ تمام سواریوں سے آگے آگے جا رہا تھا۔ قافلے والے اس سے تعجب کر رہے تھے۔ حلیمہ جب گھر پہنچی اپنی زیادہ تر بکریوں کو لاغر چھوڑ گئی تھی دیکھا کہ اس کی تمام بکریاں دودھ والی اور فربہ ہو گئیں۔ اسے یقین کے ساتھ معلوم ہو گیا کہ یہ سب اسی بچے کی برکت ہے۔

وہ بڑی شفقت اور ادب کے ساتھ پرورش کرتی تھی۔ یہاں تک کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس کے گھر میں چار سال کے ہو گئے۔ ایک دن اپنی دایہ کے بچوں کے ہمراہ بکریاں چرانے میں مصروف تھے' دایہ کے لڑکے کھانا لینے کے لیے اپنی والدہ کے پاس چلے گئے اور

سرکار علیہ السلام بکریوں کے پاس اکیلے اس جنگل میں موجود تھے کہ اچانک گدھ کی شکل کے دو بڑے پرندے نمودار ہوئے۔ ایک نے دوسرے سے پوچھا کہ کیا یہ وہی شخصیت ہے؟ اس دوسرے نے کہا ہاں! تو دونوں حضور علیہ السلام کی طرف متوجہ ہوئے۔ آپ ان پرندوں کے خوف سے دوڑنے لگے یہاں تک کہ دونوں پرندوں نے آپ کے بازو پکڑ کر آپ کو زمین پر لٹا دیا اور اپنی چونچوں سے سرکار علیہ الصلوٰۃ السلام کے شکم مبارک کو چاک کر دیا اور سینۂ پاک سے دل مبارک؟؟ کو بھی باہر نکال کر چاک کیا اور اس سے جما ہوا سیاہ خون باہر نکال کر پھینک دیا اور انہوں نے کہا کہ یہ جما ہوا خون ہر شخص کے دل میں شیطان کا حصہ ہے۔ ہم نے اسے آپ کے دل سے باہر نکال لیا ہے اور اب یہ شیطان کا وسوسہ بالکل قبول نہیں کرے گا۔ (اقول و باللہ التوفیق۔ اور یوں بھی ہو سکتا تھا کہ یہ منجمد خون آپ کے قلب مقدس میں بالکل پیدا ہی نہ کیا جاتا مگر ایسا نہیں۔ کیونکہ اس کا پیدا کرنا تکمیل حکمت اور قلب کے حسن تخلیق کے لیے ضروری ہے اور پھر اُسے نکال باہر کرنا کمال نبوت کی دلیل ہے جس طرح بتقاضائے جسد انسانی حضور علیہ السلام کے جسد اطہر سے فضلات ظاہر تو ہوئے مگر کائنات سے مختلف بدبو نہ نجاست بلکہ طیب و طاہر اگر یوں نہ ہوتا تو اظہارِ عظمت نہ ہوتا۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اس کے بعد ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ برف کا پانی لاؤ اس کے ساتھ آپ کے شکم پاک کو دھویا گیا۔ بعد ازاں اولوں کا پانی طلب کیا گیا اور اس کے ساتھ دل مبارک کو دھویا گیا۔ ازاں بعد اس نے کہا کہ سکینہ لاؤ' وہ ایک چیز تھی جسے میرے دل میں ڈالا گیا۔ اس کے بعد ایک نے دوسرے سے کہا کہ اسے سی دو۔ اور اسے سی کر مہر نبوت کے ساتھ مہر لگا دی گئی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینے کو سی کر برابر کر دیا گیا۔ چنانچہ حضور علیہ الصلوٰۃ السلام کے حاضر باش خادم حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ فرماتے تھے کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سینۂ مبارک میں سوئی کا اثر دیکھا تھا۔ اور اس اثناء میں دایہ حلیمہ کے بیٹے کھانے لیے ہوئے آ گئے اور یہ حالت دیکھ کر بے چین ہو کر اپنی والدہ کے پاس پہنچے اور وہ بھی بے چین ہو کر اپنے شوہر کے ہمراہ وہاں جنگل میں پہنچ جاتی ہیں اور حضور علیہ

السلام کو دیکھتی ہیں کہ حیران کھڑے ہیں اور رنگ مبارک سبز ہے۔ دایہ نے آپ کو گود میں لیا اور دل جوئی کی اور ماجرا پوچھا۔ آپ نے جو کچھ دیکھا تھا' بیان فرمادیا' اس کے بعد دایہ آپ کو پوری احتیاط کے ساتھ گھر میں محفوظ رکھتی اور آپ کو باہر نہیں آنے دیتی تھی۔ یہاں تک کہ اس کے شوہر نے کہا کہ یہ بچہ عجیب مخلوق ہے اس پر ایسے حالات گزرتے ہیں جنہیں دریافت کرنے سے ہماری عقل عاجز ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ اسے ہمارے پاس کوئی گزند پہنچے۔ بہتر یہی ہے کہ ہم اسے اس کے دادا عبدالمطلب کے پاس پہنچادیں۔ چنانچہ اسی عمر میں آپ کو آپ کے دادا عبدالمطلب کے پاس پہنچادیا گیا۔

اور اس دفعہ جو شرح صدر کا واقعہ پیش آیا اس کا مقصد یہ تھا کہ دوسرے بچوں کے دلوں میں جو کھیل کود، فضولیات اور دوسری غیر شائستہ حرکات کی محبت ہوتی ہے' آپ کے دل کو اس سے پاک رکھا جائے۔ چنانچہ اسی طرح ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بچپنے اور طفلی کے وقت کھیل کود اور فضول کاموں کی طرف بالکل توجہ نہیں فرماتے تھے اور پورے وقار کے ساتھ اُٹھتے بیٹھتے تھے۔

شرح صدر کا دوسرا واقعہ

دوسرا واقعہ وہ ہے جو کہ ابن حبان، حاکم، ابونعیم، ابن عساکر، ضیائے مقدسی اور عبداللہ بن احمد نے زوائد مسند میں سند صحیح کے ساتھ روایت کیا ہے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دس سال کے ہوئے' آپ جنگل میں تھے کہ دو شخص "آدمیوں کی شکل میں ظاہر ہوئے۔ سرکار علیہ الصلوٰۃ والسلام فرماتے تھے کہ میں نے ان دونوں کے چہروں کی طرح کبھی کوئی نورانی چہرہ نہیں دیکھا' ان سے ایسی مہک آرہی تھی کہ میں نے کسی عطر میں محسوس نہیں کی۔ اور ان دونوں شخصوں کے کپڑوں جیسے نفیس اور صاف کپڑے کبھی نہیں دیکھے۔ اور وہ دونوں شخص حضرت جبرائیل اور میکائیل علیہما السلام تھے۔ دونوں نے میرے بازو اس طرح پکڑے کہ مجھے بالکل معلوم ہی نہیں ہوا اور مجھے بالکل نرمی کے ساتھ چٹیل میدان میں چت لٹا لیا کہ میرا کوئی عضو بے جا نہ ہوا اور کوئی تکلیف نہ ہوئی۔ پھر انہوں نے میرا شکم چاک کیا' خون بالکل نہ نکلا اور درد نہ ہوئی۔ اور ان میں سے ایک سونے کے طشت میں پانی لا رہا تھا

جبکہ دوسرا میرے سارے اندرونی حصے کو دھو رہا تھا پھر ایک نے دوسرے سے کہا کہ ان کا دل چاک کرو اور کینے اور حسد کے ممکنہ اثرات کو دُور کر دو۔ جما ہوا خون باہر نکالا گیا پھر اس نے کہا کہ ان کے دل میں مہربانی اور شفقت ڈال دو۔ چاندی کے تودے کی طرح کی ایک چیز لا کر میرے دل میں ڈال دی گئی اور ایک خشک دوائی اس کے اوپر چھڑک دی گئی پھر حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی انگلی پکڑ کر انہوں نے کہا کہ جائیں اور سلامت رہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ میں اس وقت سے اپنے دل میں ہر چھوٹے اور بڑے کے لیے شفقت اور رحمت پاتا ہوں اور اس دفعہ چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سنِ بلوغ کے قریب پہنچ چکے تھے۔ خواہش کی طرف جھکاؤ اور غضب کی تیزی جوانی کے لوازمات میں سے ہے۔ ان دونوں صفات کے ساتھ متعلق گناہوں سے جو کہ زیادہ تر جوانی میں اور جوانی کے بعد غلبہ کرتے ہیں' معصوم رکھنے کے لیے شق صدر کا واقعہ دوبارہ پیش آیا۔

شق صدر کا تیسرا واقعہ

تیسرا واقعہ یہ ہے کہ جب بعثت کا وقت قریب آیا اور حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے قلب مقدس پر وحی اترنے کا وقت نزدیک ہوا' آپ کے دل کو تصفیہ اور تقویت کے لیے پھر کھولا گیا اور اس واقعہ کو بیہقی اور ابونعیم نے دلائل میں اور داؤد طیالسی اور حارث ابن ابی حسامہ نے اپنی مسانید میں حضرت عائشہ صدیقہ کی روایت کے ساتھ یوں نقل کیا ہے کہ ایک دفعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے نذر فرمائی تھی کہ ایک ماہ کا اعتکاف کریں۔ حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا بھی اس اعتکاف میں آپ کے ساتھ شامل ہوئیں۔ اتفاقاً وہ مہینہ رمضان المبارک کا تھا' دونوں غار میں معتکف تھے۔ رمضان پاک کی ایک رات میں حضور علیہ السلام وقت دیکھنے اور ستاروں پر نگاہ ڈالنے کے لیے باہر تشریف لا کر کھڑے تھے کہ آواز آئی اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ مجھے یوں گمان گزرا کہ یہاں سے کسی جن کا گزر ہوا ہے۔ میں جلدی سے غار کے اندر چلا گیا اور اس واقعہ سے حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کو آگاہ کیا۔ انہوں نے عرض کی کہ یہ خوش خبری ہے اس لیے اَلسَّلَامُ عَلَیْکَ امن اور انس کی علامت ہے' فکر نہ فرمائیں۔

ایک دفعہ میں پھر باہر آیا' میں نے دیکھا کہ جبرئیل امین علیہ السلام سورج کے تخت پر بیٹھے ہیں' ایک پر مشرق اور دوسرا مغرب تک پہنچا ہوا ہے۔ میں یہ حالت دیکھ کر پھر غار کی طرف متوجہ ہوا۔ جبریل علیہ السلام نے مجھے مہلت نہ دی اور فوراً آ کر میرے اور غار کے دروازے کے درمیان حائل ہو گئے حتیٰ کہ انہیں دیکھنے اور سننے سے اُنس حاصل ہوا۔ اس وقت جبریل علیہ السلام نے مجھ سے وعدہ کیا کہ فلاں وقت آپ اکیلے آئیں۔ میں اس وقت اکیلا کھڑا انتظار کر رہا تھا جب بہت دیر ہو گئی' میں نے چاہا کہ گھر لوٹ جاؤں۔ اچانک دیکھتا ہوں کہ جبرئیل اور میکائیل علیہما السلام دونوں آسمان اور زمین کے درمیان پوری عظمت کے ساتھ آ رہے ہیں اور مجھے دونوں نے زمین پر لٹا لیا اور پھر میرا سینہ چاک کر کے اور میرے دل کو زریں طشت میں زمزم کے پانی کے ساتھ دھو کر اس سے کوئی چیز نکالی جس کا پتہ نہ چلا پھر دل کو اس کی جگہ رکھ کر سینے کو درست کر دیا پھر دونوں فرشتوں نے میرے ہاتھ اور پاؤں پکڑ کر لوٹ دیا جس طرح کہ برتن میں سے کسی چیز کو باہر ڈالنے کے لیے اُلٹا کرتے ہیں اس کے بعد انہوں نے میری پشت پر مہر لگائی حتیٰ کہ میں نے مہر لگانے کا اثر اپنے دل میں محسوس کیا۔

شق صدر کا چوتھا واقعہ

چوتھا واقعہ معراج کی رات رونما ہوا اور اس بار شق صدر اس لیے تھا کہ آپ کے قلب مقدس میں عالم ملکوت کی سیر کی قوت پیدا ہو اور اسے تجلیاتِ بدیہہ اور انوارِ مثالیہ کے مشاہدہ کی طاقت حاصل ہو۔ اور وہ واقعہ معراج کے واقعہ کے ضمن میں مشہور اور متواتر ہے اسے ذکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اور اس واقعہ میں قلب مقدس کو حکمت اور ایمان کے ساتھ پُر کرنا بھی مذکور ہے جیسا کہ اپنے مقام پر گزرا۔ بہر حال یہ حسی شرح صدر معنوی شرح صدر کا نمونہ تھا جو کہ بار بار ظہور پذیر ہوتا تھا اور اس کے تکرار کے راز کا بھی اس واقعہ کی باریکیوں میں اشارہ کر دیا گیا جیسا کہ پوشیدہ نہیں رہے گا۔

اور چونکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر پہلی نعمت یہی تھی کہ ان کی استعداد کے سینے کو اس قدر فراخی بخشی گئی کہ اس میں ان کمالات کی گنجائش ہو سکتی تھی اس سورۃ کے آغاز میں اسی

نعمت کا استفہام انکاری کے طریقے سے جو کہ نفی کی نفی اثبات ہے کہ قانون کے مطابق اثبات کا تاکید کے ساتھ فائدہ دیتا ہے' ذکر کیا گیا اس کے بعد دو اور نعمتیں بھی تنبیہ کے طور پر لائی گئیں جو کہ اس نعمت کے آثار میں سے ہیں۔ ان میں سے ایک نعمت یہ ہے کہ

وَوَضَعْنَا اور ہم نے حوصلہ کی یہ وسعت دے کر دُور پھینک دیا۔ عَنْكَ وِزْرَكَ آپ کا بوجھ کیونکہ انسان کی روح کی استعداد میں جو کچھ ہوتا ہے' جبلی طور پر اسے حاصل کرنے کی طرف مائل ہوتا ہے اور جب قوتیں اور اعضاء اس چیز کو برداشت نہ کرسکیں تو وہ چیز بارگراں معلوم ہوتی ہے۔ مثلاً ایک صاحب عزم جو کہ طبعی طور پر سرداری اور بادشاہی حاصل کرنے کی طرف جھکاؤ رکھتا ہے اور اسے مال کثیر خرچ کرنے، زبردست فوج جمع کرنے اور جسمانی اذیتیں اور روحانی تکلیفیں برداشت کرنے کے بغیر یہ مقصد ہرگز حاصل نہیں ہوتا۔ ناچار اس کے دل پر ایک بارگراں پڑتا ہے جب حوصلہ بھی فراخ ہو تو پرکمال کے مختلف اسباب کی مزاحمتیں اور رکاوٹیں اس کے دل میں تنگی وغیرہ کے ساتھ اثر نہیں کرتیں اس کا اثر بھی دُور ہوتا ہے اور پوری سہولت حاصل ہوتی ہے۔

اَلَّذِیْٓ اَنْقَضَ ظَهْرَكَ جس نے آپ کی پشت کو جھکا دیا تھا اور انتہائی متاثر کر رکھا تھا اس لیے کہ آپ کی ہمت کا تقاضا تھا کہ ان تمام کمالات کو جمع کرلے۔ اور تشویشوں کی وجہ سے آپ کے دل کو تنگی محسوس ہوتی تھی۔ جب ہم نے آپ کو فراخ حوصلہ بخشا تو یہ سب کچھ آپ پر آسان ہوگیا۔

وزر کی تفسیر میں مختلف اقوال

اور مفسرین اس بوجھ کے بیان میں دائیں بائیں گئے ہیں۔ اور انہوں نے حقیقت کا سراغ نہیں لگایا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ مکہ شریف سے باہر آنے کا غم تھا اور اس کا ازالہ مدینہ عالیہ پہنچانے سے ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ کفار کے ظلم وستم کا غم تھا اور اس کا ازالہ اللہ تعالیٰ کی تائید اور امداد سے ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ ملتِ حنفی کے احکام اور شرائع نہ پانے کا غم تھا اور اس کا ازالہ قرآن پاک کی وحی اور شرائع کے بیان کے ساتھ ہوا۔ بعض کہتے ہیں کہ وہ اُمت کا غم تھا اور اس کا ازالہ تمام شفاعت عطا فرمانے سے ہوا اور بعض کہتے ہیں کہ وہ

رسالت کی ذمہ داریوں کا بوجھ تھا اور اس کا ازالہ حضرت صدیق اکبر، فاروق اعظم، ذوالنورین اور علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہم جیسے مخلص جان نثار ساتھی مہیا کرنے کے ساتھ ہوا۔

بہرحال ان بزرگواروں نے جو کچھ ذکر کیا ہے اسی سمندر کا ایک قطرہ ہے اور اسی چھ گز سے ایک ٹکڑا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی شرح صدر کا دوسرا اثر یہ ہے کہ

وَرَفَعْنَالَكَ ذِكْرَكَ اور ہم نے آپ کے لیے آپ کا ذکر اونچا کیا' آپ کو جامعیت کمالات اس قدر میسر آئی کہ آپ مرتبہ الوہیت کا ظل ہو گئے اور آپ اس جامعیت میں منفرد اور یکتا ہیں اب آپ کو خدا تعالیٰ کے ساتھ یاد کیا جاتا ہے۔ مثلاً یہ کہا جاتا ہے اَللّٰهُ وَرَسُوْلُهٗ اَعْلَمُ۔ اللہ ورسول نے یوں فرمایا ہے۔ آپ واجب الاطاعت ہیں۔ علیٰ ہذا القیاس۔

(سچ فرمایا امام اہلِ سنت اعلیٰ حضرت بریلوی رحمتہ اللہ علیہ نے

ممکن میں یہ قدرت کہاں واجب میں عبدیت کہاں
حیراں ہو یہ بھی ہے خطا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں
حق یہ کہ ہیں عبد الٰہ اور عالم امکاں کے شاہ
برزخ ہیں وہ سر خدا یہ بھی نہیں وہ بھی نہیں

رفعت ذکر کی کیفیت اور تین مقامات کا ذکر جہاں حضور علیہ السلام کا نام خدا کے نام کے ساتھ نہیں۔

اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت جبرائیل علیہ السلام سے پوچھا کہ میرا ذکر اونچا کس طرح فرمایا گیا ہے حضرت جبرائیل علیہ السلام نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے آپ کا ذکر اپنے ذکر کے ساتھ ملایا ہے نماز کی اذان واقامت' التحیات اور خطبہ میں کلمہ طیبہ اور کلمہ شہادت میں۔ اطاعت کے حکم میں کہ اَطِيْعُوا اللّٰهَ وَاَطِيْعُوا الرَّسُوْلَ اور نافرمانی کی حرمت میں کہ مَنْ يَّعْصِ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ فَاِنَّ لَهٗ نَارَ جَهَنَّمَ خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا۔ تو جہاں بھی خدا تعالیٰ کا ذکر آیا' ذکر رسول علیہ السلام بھی ساتھ ہے۔ سوائے تین مقامات کے: پہلا مقام نماز کی اذان کے آخر میں کہ صرف لا الہ الا اللہ کہا

جاتا ہے' دوسرا مقامِ چھینک کے وقت صرف الحمد اللہ کہا جاتا ہے اور تیسرا مقامِ ذبح کے وقت کہ صرف بسم اللہ کہا جاتا ہے اور ان تینوں مقامات کے مستثنیٰ ہونے کی ایک وجہ ہے جو کہ اپنے مقام پر مذکور ہے۔

اور جب تینوں اصلی اور فرعی نعمتوں کو بیان فرمایا جا چکا' انبیاء علیہم السلام کے درمیان حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خصوصیت آپ میں موجود کمال کے ساتھ ثابت ہو گئی۔ اب فرمایا جا رہا ہے کہ یہ سب اس صبر کی برکت ہے جو آپ نے سختیوں پر کیا اور ہماری راہ میں تکلیفیں برداشت کیں۔

فَاِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا پس تحقیق ہر سختی کے ساتھ آسانی ہے جو کہ اس سختی کے دوران دربارِ خداوندی سے عطا کی جاتی ہے اور وہ آسانی اس سختی کو برداشت کرنے کی طاقت دینا ہے جسکی وجہ سے وہ سختی آسان ہو جاتی ہے اور اگر مصیبت کے وقت کے بعد یا اس سختی سے پہلے اسے یاد کریں تو اپنے اندر اس سختی کو برداشت کرنے کی طاقت ہرگز نہ پائیں اور اس قسم کی آسانی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کمالات حاصل کرنے کی سختی میں سینے کی وسعت اور حوصلے کی فراخی دے کر عطا فرمائی گئی۔ تاکہ آپ دل تنگ اور ملول نہ ہوں اور رکاوٹیں ظاہر ہونے اور قسم قسم کی مزاحمتیں پیش آنے کے باوجود اس کی انتہاء تک پہنچائیں۔

اِنَّ مَعَ الْعُسْرِ یُسْرًا تحقیق اس سختی کے ہمراہ ایک اور آسانی بھی ہے اور یہ آسانی مرتبے کی بلندی کی آسانی ہے اس لیے کہ ہر سختی میں صبر اگر اللہ تعالیٰ کے لیے ہے تو اس کے دربار میں مرتبے اور درجے کی بلندی کا موجب ہے اور اگر بندوں کے لیے ہے تو اس بندے پر خدمت اور مشقت کا حق ثابت کرنے کا موجب ہوتا ہے۔ اور مرتبے اور مقام کی بلندی کی لذت سے وہ سختی پورے طور پر سہل اور آسان ہو جاتی ہے۔ جیسا کہ دنیا والوں میں اس کی آزمائش اور تجربہ ہو چکا ہے اور اس تقریر پر وہ سوال وارد نہیں ہوتا جو کہ اس مقام پر مشہور ہے اور وہ یہ ہے کہ لغتِ عرب میں مع کا لفظ ملانے اور ساتھ کرنے کے لیے ہے تو زمانے کے ایک ہونے کا تقاضا ہوگا جبکہ تنگی اور آسانی کے زمانے کا ایک ہونا ممکن نہیں کہ دو ضدیں جمع نہیں ہوتیں۔

اور دانش مندی کے قانون کے مطابق جواب کی وضاحت یہ ہے کہ دو ضدوں کا اجتماع دو مختلف جہتوں سے ممکن ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ مسافر کو روزہ رکھنے میں اگرچہ روزے کی مشقت ہے لیکن مسلمانوں کی موافقت کی وجہ سے روزہ آسان ہو جاتا ہے اور مصیبت زدہ کے لیے اگرچہ مصیبت مشقت ہے لیکن رضائے الٰہی تک پہنچنا اور جزا پانا سہولت ہے اور اگر فقیر کے لیے تنگ دستی اور فقر دنیوی مشقت کا موجب ہے لیکن آخرت میں مال کے جمع و خرچ کا حساب دینے سے خلاصی۔ چوروں، ڈاکوؤں سے اور ظالموں کے تاوان دینے سے محفوظ رہنا بہت بڑی سہولت ہے۔ پس ہو سکتا ہے کہ ایک چیز ایک زمانے میں ایک جہت سے تنگی ہو اور دوسری جہت سے آسانی۔

اور بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اگرچہ اصل لغت میں مع کا لفظ ملانے کے لیے ہے لیکن جب ایک چیز دوسری چیز کے پیچھے قریبی زمانے میں حاصل ہو اور اس اتصال قریب کو ملانے کی طرح اعتبار کر کے اس لفظ کو وہاں استعمال کرتے ہیں اور یہ مقام بھی اسی طرح کا ہے کہ دنیا کی سختی اگرچہ دراز اور طویل ہو جائے لیکن آخرت کے دنیا کے ساتھ پورے اتصال کی وجہ سے اسے ملے ہونے کا حکم دیا گیا ہے۔

آیت کے تکرار کی وجہ

اس آیت کے تکرار کی دو وجوہ ہیں: پہلی وجہ یہ ہے کہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ اس آیت کے نزول کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خوش وخرم باہر تشریف لائے اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم سے فرمایا کہ خوش ہو جاؤ اللہ تعالیٰ نے دنیا کی سختی پر دو آسانیوں کا وعدہ فرمایا ہے ایک دنیا میں اور دوسری آخرت میں جیسا کہ بعض اہلِ حکمت نے اس حقیقت کی طرف اشارہ فرمایا ہے۔ اذا اشتدت بك البلوی ففکر فی الم نشرح، لعسر بین یسرین اذا فکر ته فافرح جب تجھ پر کوئی سخت آزمائش ہو تو الم نشرح میں غور کر اس لیے کہ ایک تنگی دو آسانیوں کے درمیان واقع ہے جب تو اس پر غور کرے تو خوش وخرم ہو جا اور صحیح حدیث پاک میں واقع ہے کہ لن یغلب عسر یسرین یعنی ایک سختی دو آسانیوں پر کبھی غلبہ نہیں کرے گی۔

اور اگر یہاں کسی کو خیال گزرے کہ جس طرح یسر کا ذکر دو جگہ پر ہے' عسر بھی دو جگہ مذکور ہے۔ پس عسر کا ایک ہونا اور یسر کا دو ہونا کہاں معلوم ہوتا ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ عربی دان کہتے ہیں کہ نکرہ کو نکرہ یا معرفہ کے بعد لائیں تو پہلے کا غیر ہونے کا تقاضا کرتا ہے اور اگر معرفہ کو نکرہ یا معرفہ کے بعد لائیں تو اس سے ایک ہونا سمجھا جاتا ہے جیسا کہ آیت میں ہے کہ اَرْسَلْنَآ اِلٰی فِرْعَوْنَ رَسُوْلًا فَعَصٰی فِرْعَوْنُ الرَّسُوْلَ واضح ہے اور جاء نی رجل فقال رجل میں بھی ظاہر ہے۔ پس عسر کو دوبارہ لایا گیا' دونوں ایک ہی ہیں اور یسر کو دونوں جگہ نکرہ لایا گیا تو دو آسانیاں معلوم ہوئیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ تکرار تاکید کے لیے ہے اس لیے کہ سختی کے وقت آسانی کی توقع نہیں ہوتی۔ پس یہ مقام ایسا ہے کہ اس سختی کے گرفتار اس سختی کے بعد آسانی حاصل ہونے کا یقین نہ کریں اسی لیے اس مضمون کی تاکید اور پختگی کی ضرورت پیش آئی۔

اور جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر اپنی نعمتوں کے شمار کی فراغت ہوئی' آپ سے اس نعمت کا شکریہ طلب فرمایا گیا کہ

فَاِذَا فَرَغْتَ فَانْصَبْ تو جب آپ پر اس مرتبہ اور منصب جو کہ ہم نے آپ کو عطا فرمایا ہے جیسے نبوت، رسالت، ارشاد، معرفت، خلافتِ کبریٰ، قضاء، افتاء، محاسبہ، عبادت گزاری، ولایت وغیرہ کے حقوق کی ادائیگی سے فارغ ہوں تو اللہ تعالیٰ کی یاد میں تکلیف اٹھائیں اور محنت کریں۔

وَاِلٰی رَبِّكَ فَارْغَبْ اور اپنے پروردگار کی طرف جس نے آپ کو اس طرح پرورش کر کے اس کمال تک پہنچایا جو کہ کائنات بشریت کے کمالات سے بالاتر ہے' رغبت کریں اور اسکے غیر کو نظر میں نہ لائیں۔

اور بعض مفسرین نے یوں فرمایا ہے کہ مراد یہ ہے کہ جب آپ فرض نماز سے فارغ ہوں تو دعا کے لیے ہاتھ اٹھائیں۔(اقول وباللہ التوفیق۔ معلوم ہوا کہ نماز فرض کے بعد ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگنا حکمِ خداوندی ہے بلکہ حضرت مفسر علام قدس سرہ نے زیر آیت وَلَنْ یَّتَمَنَّوْهُ اَبَدًا بِمَا قَدَّمَتْ اَیْدِیْهِمْ وَاللّٰهُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ یہ حدیث شریف نقل فرمائی ہے کہ حضرت

امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ آپ ہر نماز کے بعد یہ دعا کرتے تھے اللھم ارزقنی شھادۃ فی سبیلك ووفاۃ ببلد رسولك؟ اس سے پتہ چلا کہ فرائض نہیں بلکہ ہر نماز کے بعد دعا مانگنا صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کا معمول تھا۔ نیز مذکورہ تفسیری توجیہہ سے یہ بھی معلوم ہوا کہ نمازِ جنازہ سے فارغ ہوتے ہی ہاتھ اُٹھا کر دعا مانگنا قرآن پاک کی اس آیت سے مستفاد ہے۔ کیونکہ نماز فرض عین ہو یا فرض کفایہ بہرحال نماز ہے۔ دربارِ خداوندی میں دعا مانگنے سے روکنے والے توجہ کریں۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ) بعض مفسرین نے یوں فرمایا ہے کہ آپ جب تشہد سے فارغ ہوں تو اپنی دنیا و آخرت کے لیے دعا کریں۔

ایک سوال اور اس کا جواب

یہاں ایک سوال باقی رہ گیا جو کہ اہلِ عربیت ذکر کرتے ہیں اور وہ یہ ہے کہ الم نشرح کو صیغہ مضارع کے ساتھ لایا گیا جبکہ دوسرے معطوفات وَوَضَعْنَا وَرَفَعْنَا کو صیغہ ماضی کے ساتھ لایا گیا' ایسا کیوں ہے؟

اس کا جواب دورانِ تفسیر اشارۃً بیان ہو چکا کہ شرح صدر پہلی نعمت ہے اس کی نفی پر استفہام انکاری لایا گیا اور صیغہ مضارع کے ساتھ ذکر کیا گیا تا کہ شرح صدر کی تجدید پر دلالت ہو جبکہ وضع اور رفع ایک فرعی نعمت ہے جو کہ شرح صدر کی وجہ سے حاصل ہوئی اسے ایسے صیغے کے ساتھ بیان فرمایا گیا جو کہ استمرار پر دلالت نہ کرے اور اس بات کا اشارہ ہو کہ ہم اس شرح کی وجہ سے وضع اور رفع سے فارغ ہو گئے۔ گویا جو شرح صدر کی گئی ہے اس میں وضع اور رفع دونوں آ گئے کیونکہ یہ وضع اور رفع اسی شرح کا نتیجہ ہے۔ واللہ اعلم۔

سورۃ التین

یہ سورۃ مکی ہے' اس کی آٹھ (۸) آیات، چونتیس (۳۴) کلمات اور پچاس (۵۰) حروف ہیں۔

وجہ تسمیہ

اسے سورۃ التین اس لیے کہتے ہیں کہ لغتِ عرب میں تین' انجیر کے پھل کو کہتے ہیں اور

انجیر جامع ترین میوہ ہے جیسا کہ انسانی جسم جامع ترین ہے۔ اور اسی جامعیت کی وجہ سے اس روح کے فیض کا مستحق قرار پایا جو کہ کمالات کی جامع ہے۔ پس قرآن کریم کے الفاظ کے مشابہ ہے جو جامع اسرار کو ضمن میں لیے ہوئے ہیں اور اس سورۃ میں شرع اور آخرت کو پوری تاکید کے ساتھ ثابت کرنا مقصود ہے اسی لیے اس کے آغاز میں چار قسمیں ذکر فرمائی گئی ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

وَالتِّيْنِ مجھے انجیر کی قسم ہے۔ اور میووں کے درمیان انجیر کو ایک ظاہری خصوصیت ہے اور ایک باطنی

انجیر کی ظاہری خصوصیت اور فوائد

اس کی ظاہری خصوصیت یہ ہے کہ غذا بھی ہے۔ دوا بھی ہے۔ اور میوہ بھی ہے۔ اس لیے کہ وہ ایسا کھانا ہے کہ لطیف' جلد ہضم ہونے والا' طبیعت کو نرم کرنے والا اور بدن کے اندر سے بدبودار مادے پسینے کے راستے باہر نکالتا ہے۔ اسی لیے حرارت کے باوجود بخار کو فائدہ دیتا ہے۔ بلغم کی تحلیل کرتا ہے' گردے اور مثانے کی میل کچیل دُور کرتا ہے' جسم کو موٹا کرتا ہے' مسام کھولتا ہے اور جگر اور تلی کے غلیظ مواد کو دُور کرنے میں بے مثال ہے۔

اور اس میوہ کے عجائب میں سے یہ ہے کہ یہ سب کا سب کھایا جاتا ہے' گٹھلی نہیں رکھتا جسے پھینک دیں۔ قرآن پاک کی طرح کے سب کا سب مغز ہے اس میں دُور کرنے کا چھلکا ہے نہ پھینکنے کی گٹھلی۔

حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایک شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے انجیر سے بھرا ہوا خوانچہ بطور ہدیہ پیش کیا۔ سرکار علیہ السلام نے اس سے تناول فرمایا اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کو بھی حکم دیا کہ یہ میوہ کھاؤ۔ اور فرمایا کہ اگر میں کہوں کہ ایک میوہ جنت سے اُترا ہے تو اسی میوے کے بارے میں کہہ سکتا ہوں۔ اس لیے کہ اس میوے میں گٹھلی نہیں ہے اور جنتی میوے اسی طرح ہیں۔ پس اسے کھاؤ کہ بواسیر کے مواد کو کاٹتا ہے اور (پاؤں کی انگلی میں اُٹھنے والے ایک شدید درد) نقرس سے فائدہ دیتا ہے۔

حضرت امام علی بن موسیٰ رضی اللہ عنہما سے منقول ہے کہ انجیر ہمیشہ کھانا منہ کی بدبو کو ختم کرتا ہے۔ سر کے بالوں کو لمبا کرتا ہے۔ اور فالج سے بچاتا ہے۔ نیز اس میوہ کے عجائب میں سے یہ ہے کہ اسے ایک درمیانے لقمے کے برابر پیدا کیا گیا ہے۔ حتیٰ کہ اسے کھانے میں کوئی تکلیف اور مشقت نہیں ہوتی۔

انجیر کی باطنی خصوصیت

رہی اس کی باطنی خصوصیت تو اس میں سے یہ ہے کہ کاملین کے ساتھ پوری مشابہت رکھتا ہے کہ اس کا ظاہر و باطن ایک جیسا ہے۔ گٹھلی نہیں رکھتا' چھلکا نہیں پھینکتا۔ بخلاف دوسرے میووں کے کہ ان کا ظاہر کھانے کا ہے اور باطن پھینکنے کا۔ نیز اس پھل کا درخت ایک ایسا درخت ہے جو کہ دعویٰ سے پہلے اپنے کمال کا اظہار کرتا ہے۔ پہلے پھل لاتا ہے اس کے بعد شگوفہ۔ بخلاف دوسرے پھلوں کہ کے ان کے درخت پہلے اپنے آپ کو پتوں اور شگوفوں سے آراستہ کرتے ہیں اس کے بعد پھل لاتے ہیں۔ پس یہ درخت گویا ایثار کی صفت رکھتا ہے کہ پہلے دوسرں کو نفع دیتا ہے اس کے بعد اپنے آپ کو آراستہ کرنے کی فکر کرتا ہے۔

اور دوسرے درخت کاروباری حضرات کی طرح ہیں کہ پہلے خود کو سجاتے ہیں اس کے بعد دوسروں کو نفع پہنچاتے ہیں۔ نیز جو فیض اس پھل میں ہے دوسرے پھلوں میں نہیں ہے کہ ایک سال میں چند بار پھل لاتا ہے اور اس کے باوجود اس پھل کو انسان کے ساتھ ایک مناسبت ہے۔ اس لیے کہ حضرت آدم علیہ السلام سے جب جنت میں تعمیل حکم میں فروگزاشت کی وجہ سے جنتی لباس لے لیا گیا تو آپ لباس سے فارغ ہو گئے' آپ پتے لینے کے لیے جب کسی بھی درخت کے پاس دوڑ کر جاتے تاکہ ستر پوشی کریں' ہر درخت سرکشی کرتا تھا اور پتے نہیں دیتا تھا۔ جب آپ اس درخت کے پاس پہنچے اس نے سرکشی نہ کی اور آپ نے اس سے بیشمار پتے لے کر ستر پوشی فرمائی۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اور وہ جو کھیتی باڑی کرنے والوں نے کہا ہے کہ کامل درخت وہ ہے جو دس چیزوں کا جامع ہو: جڑ، شاخ، پتہ، پھول، میوہ، گٹھلی، گوند، چھال، چھلکا اور رس جیسے کھجور۔ اور جس

میں ان دس چیزوں میں سے کچھ کم ہو ناقص ہے۔ پس انجیر کہ جس میں گٹھلی نہیں، ناقص ہوا۔ اس کا جواب یہ ہے کہ یہ نقصان عین کمال ہے کیونکہ ہڈی کام نہیں آتی، پھینکنے کی چیز ہے تو اس کا نہ ہونا اس کے ہونے سے بہتر ہوگا۔ بہرحال فوائد کا جامع اور بے ضرر ہونے پر نظر کرتے ہوئی اس کی قسم اُٹھائی گئی ہے۔ اور جامعیت انسان کے ساتھ اس کی مناسبت کی رعایت فرمائی گئی ہے۔

وَالزَّیْتُوْنِ اور زیتون کے درخت کی قسم جس کے پھل کو بھی زیتون ہی کہتے ہیں اور وہ ظاہر میں بھی اور باطن میں بھی بے شمار فوائد کا جامع ہے۔

زیتون کے ظاہری فوائد

اس کے ظاہری فوائد میں سے یہ ہے کہ اس کے پھل کو جب سرکے میں اچار کر کے کام میں لائیں، معدے کو قوت دیتا ہے، بھوک کو بڑھاتا ہے اور پکے ہوئے زیتون کو جب غذا میں استعمال کریں تو بہت غذائیت دیتا ہے، جسم کو موٹا کرتا ہے، مردمی طاقت کو زیادہ کرتا ہے اور جب زیتون کی گٹھلی کے مغز کو چربی اور آٹے میں ملائیں اور پھلبہری پر لیپ کر دیں تو پھلبہری کو دُور کر دیتا ہے۔ اور زیتون کے رس کی بتی مقام مخصوص میں رکھنے سے سیلان الرحم کو نفع ہوتا ہے۔ جس نمکین پانی میں زیتون ڈالا گیا ہو جب اس سے کلی کریں تو دانتوں کی بنیاد کو مضبوط کر دیتا ہے۔

اور انجیر کے فوائد کہ غذا بھی ہے، میوہ بھی اور دوا بھی۔ زیتون میں بھی ایک زاید چیز کے ساتھ موجود ہیں اور وہ زائد یہ چیز ہے کہ زیتون مدت دراز تک فائدہ دیتا ہے۔ اس طرح کہ جو کچھ جھڑ جائے اس سے تیل نکالتے ہیں۔ اور اسے زیت الانفاق کہتے ہیں۔ اور چراغ اور قندیلیں روشن کرنے میں کام میں لاتے ہیں۔ اور اس کی روشنی انتہائی صاف اور لطیف ہوتی ہے کہ دوسرے تیلوں کی روشنی اس طرح نہیں ہوتی۔ اور جو زیتون پک جائے اس سے بھی تیل نکالتے ہیں اور اسے زیت الطیب کہتے ہیں۔ اچھی مہک رکھتا ہے۔ اور فوائد میں بے مثال ہے۔ قولنج (انتڑیوں میں پیدا ہونے والا شدید درد) سدے اور اسہال کھولنے میں دہن الخروع یعنی انجیر کی لکڑی کے تیل کی طرح اور طلاء اور لیپ میں گل روغن کی طرح اور

خارش، آتشک، کھجلی، داد، سردرد، بالوں کی سیاہی کی حفاظت، نقرس کا درد اور جوڑوں کے درد زائل کرنے، آشوبِ چشم اور آنکھوں کی پلکوں میں جمع ہونے والی غلیظ رطوبت کو دُور کرنے کے لیے بہت مفید ہے اور بچھو کے کاٹنے کی جگہ پر بھی اس کا رکھنا فائدہ دیتا ہے۔

زیتون کے باطنی فوائد

اس کے باطنی فوائد میں سے وہ عظیم نورانیت اور چمک ہے جو کہ اس میں روغن بنانے کے بعد پیدا ہوتی ہے۔ اور اس باطنی خصوصیت کی وجہ سے ان کاملین کے ساتھ پوری مناسبت رکھتا ہے جو کہ جب اپنی زندگی کو ریاضت کی بھٹی میں پگھلا کر روح کو لطیف کرنے میں کوشش کر کے رقت پیدا کرتے ہیں تو انہیں عظیم نورانیت اور روشنی میسر آتی ہے۔ اور اس کے علاوہ اس کے تیل کا نور ارواح کاملہ کے نور کی طرح دھوئیں کی تاریکی کی آمیزش سے بالکل صاف ہوتا ہے۔ بخلاف دوسرے تیلوں کے کہ جھوٹی ریاضت والوں کی طرح دھوئیں کی تاریکی سے آلودہ ہوتے ہیں۔

نیز فکر و استدلال والوں کے ساتھ بھی پوری مناسبت رکھتا ہے۔ جو کہ معلومات کے مواد کو قوتِ فکریہ میں ڈال کر پگھلاتے ہیں تا کہ روشنی اور نورانیت کا موجب اور حقائق اشیاء کے مطالعہ میں اسے چراغ کی روشنی کی طرح کام میں لائیں۔

نیز قرآن پاک کے الفاظ کے ساتھ پوری مناسبت رکھتا ہے کہ جب بھی ان الفاظ کے معنوں کو لفظی لباسوں سے جدا کریں' حقائق الہیہ کی روشنی اور نور چمکے اور ضوفشاں ہو۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ دنیا میں کسی درخت کی عمر اتنی لمبی نہیں جتنی کہ اس کی عمر دراز ہے اور فلسطین میں جو کہ سرزمین شام کا ایک آباد اور مشہور شہر ہے' یونانیوں کے لگائے ہوئے زیتون کے درخت ابھی تک موجود ہیں جبکہ یونانی لوگ سکندر کے عہد میں ان علاقوں میں وارد ہوئے تھے۔ پس ان درختوں میں سے ہر درخت کی عمر تادم تحریر دو ہزار سال کے قریب پہنچتی ہے۔

اور ان میں سے یہ ہے کہ اس درخت کے اُگنے کی جگہیں زیادہ تر سرزمین شام میں ہیں جو کہ انبیاء علیہم السلام کا مسکن اور اولیاء کا مقام ہے۔

اوران میں سے یہ ہے کہ حضرت ابراہیم علی الصلوٰۃ والسلام نے اس درخت کے لیے برکت کی دعا فرمائی ہے اوران میں سے یہ ہے کہ قرآن مجید میں اسے شجرۂ مبارکہ فرمایا گیا ہے۔

اوران میں سے یہ ہے کہ تعبیر کہنے والوں نے لکھا ہے کہ جو شخص خود کو خواب میں دیکھے کہ اس نے زیتون کا پتہ ہاتھ میں لیا ہوا ہے اسے اس امر کی بشارت ہے کہ وہ عروہ وثقیٰ کو مضبوطی کے ساتھ پکڑے گا۔

ایک مریض تعبیر کہنے والوں کے سردار ابن سیرین کے پاس آیا اور کہنے لگا کہ مجھے خواب میں دکھایا گیا ہے کہ دونوں لا سے کھاؤ۔ ابن سیرین نے فرمایا کہ زیتون کا پھل کھاؤ اس لیے کہ قرآن مجید میں اس کے بارے میں لاشرقیة ولاغربیة وارد ہوا ہے اور حدیث شریف میں ہے کہ کلوا الزیت وادھنوا به فانه من شجرة مبارکة یعنی زیتون کا تیل کھاؤ اور بدن پر اس کی مالش کرو اس لیے کہ وہ تیل بابرکت درخت سے لیا گیا ہے۔

خلاصۂ کلام یہ ہے کہ اس قسم میں پہلی قسم کے مقابلے میں ترقی واقع ہوئی اس لیے کہ پہلی قسم میں انجیر کا ذکر فرمایا گیا جو کہ باطنی نورانیت کے بغیر ظاہری فائدے رکھتا ہے جبکہ اس قسم میں زیتون کا ذکر فرمایا گیا جو کہ ظاہری فوائد کے علاوہ باطنی نورانیت بھی رکھتا ہے۔ پس کمال انسانی کے ساتھ اس کی مناسبت زیادہ ہوئی۔

وَطُوْرِ سِیْنِیْنَ اور درختوں والے پہاڑ کی قسم ہے۔ جاننا چاہیے کہ طور لغت میں پہاڑ کو کہتے ہیں اور پہاڑ دو قسم کے ہیں: ایک وہ پہاڑ جس میں درخت ہیں کہ اس میں سے پانی جاری ہے۔ اوران پانیوں کی وجہ سے اس میں سے بے شمار درخت اُگتے ہیں اور پھلوں کی دو قسموں میں سے چار مغز حب الزلم جسے ہندی میں جرونجی کہتے ہیں۔ انجیر، زیتون اور دوسرے بڑے بڑے درخت خصوصاً خودرو ساگوان بہت پیدا ہوتا ہے۔ اور دوائیں، جڑی بوٹیاں، گرم مصالحے، تھوہر، زہریں اور قسم قسم کے مفید اور مضر سبزے ہجوم کرتے ہیں اور وہاں عجیب وغریب جانور جیسے بارہ سنگا، سیاہ ہرن، مرغ زرین جو کہ تیتر کی شکل کا مور کے مشابہہ پرندہ ہے جس کے پر سونے کی طرح چمکتے ہیں اور دوسری بہت سی اقسام پیدا ہوتی ہیں اور

معدنیات میں بلور اور سبزی مائل پتھر یشب معرضِ وجود میں آتے ہیں۔ پس اس قسم کے پہاڑوں کی جامعیت بہت اونچے مرتبے کو پہنچتی ہے کہ اس میں کئی قسم کی نباتات بھی ہیں۔ انواع واقسام کے جانور بھی ہیں اور دیو اور پری کی قسم کی ارواح جنہ بھی اس قسم کے پہاڑوں میں بہت ہوتی ہیں اور ان چیزوں سے فائدہ لینے کے لیے وہاں انسانی افراد بھی سکونت اختیار کرتے ہیں۔ پس ایسی جامعیت حاصل ہوئی کہ کسی اور جگہ اس کا دسواں بھی ظاہر نہیں ہوتا۔

کوہِ طور کا بیان

لیکن اس جامعیت کے باوجود درختوں والا ہر پہاڑ تجلیٔ الٰہی سے خالی ہے۔ جب اس قسم کے پہاڑ میں تجلی الٰہی بھی حاصل ہوگئی تو نہایت کامل جامعیت نصیب ہوگئی۔ اور اس قسم کا درختوں والا پہاڑ ایک وہ پہاڑ ہے جو کہ مدین اور مصر کے راستے کے درمیان ہے جسے کوہِ فلسطین کہتے ہیں اور حضرت موسیٰ علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو اسی پہاڑ میں تجلی الٰہی سے مشرف فرمایا گیا۔ اور اسی پہاڑ سے آپ کے کانوں میں انی انا اللّٰہ ربّ العالمین کی ندا پہنچائی گئی اور وہاں آپ کو رُتبۂ کلیمی حاصل ہوا۔ اس واقعہ کے بعد بھی حضرت موسیٰ علیہ السلام نے مناجات کے لیے اس پہاڑ میں جا کر چلّے کیے اور عبادتیں کیں۔ اور دربارِ خداوندی سے تورات کی تختیاں اسی پہاڑ میں پائیں۔ پس ظاہری جامعیت کے ساتھ ساتھ وہ پہاڑ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وحی کے اسرار اور آپ کی عبادات کے انوار کا بھی جامع ہوا۔

اور جو سر اور نور اس پہاڑ پر متجلی ہوا جس کی وجہ سے حضرت موسیٰ علیہ السلام بے ہوش ہو گئے اس جگہ اس قدر قائم اور راسخ رہا کہ عرصہ دراز گزرنے کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکاروں کے قربِ خداوندی اور ان کی شرائع کی امداد کے لیے کافی ہوا۔ پس حضرت موسیٰ علیہ السلام کے انوار جن سے بنی اسرائیل منور اور مہذب ہوں' کی ابتدا و انتہا کا مقام وہی مبارک پہاڑ ہے۔ پس اس قسم میں گزشتہ قسم کی نسبت ترقی فرمائی گئی۔ اس لیے کہ زیتون میں جو نور ہے' وہ عنصری ہے اور جس نور نے اس پہاڑ میں تجلی فرمائی اور اس کے اعضاء کو ریزہ ریزہ اور پارہ پارہ کر دیا' نورِ الٰہی تھا جس کا اثر طویل زمانے گزرنے تک باقی

رہا اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے کمالات کے پودے کو اس سے تاابد سیراب رکھا گیا۔

دوسری قسم وہ خشک پہاڑ جس میں درخت اور پانی نہیں ہے۔ اور وہ پہاڑ انسان کے مردہ جسم کی طرح ہے کہ بظاہر انسان معلوم ہوتا ہے مگر باطن میں کوئی کیفیت انسانی نہیں ہے۔ اسی لیے وہ قسم کے قابل نہیں تھا۔ اس سے احتراز کی بناء پر لفظ سینین فرمایا گیا۔ اور اگرچہ اصل لغت میں طور سینین ہر درختوں والے پہاڑ کو کہا جا سکتا ہے لیکن عرف عرب میں یہ لفظ موسیٰ علیہ السلام کے اسی پہاڑ کے ساتھ خاص ہے جس پر تجلی الٰہی واقع ہوئی اور سینین کا لفظ لغت نبط سے ہے جو کہ ریاست شام کے کاشت کار ہیں اور عرب لوگ اس لفظ کو کئی طرح کا تصرف کر کے استعمال کرتے ہیں۔ کبھی سینین کہتے ہیں، کبھی س کی فتح کے ساتھ سینا جیسا کہ قد افلح کی سورۃ میں واقع ہے اور کبھی سینا، سین کے کسرے کے ساتھ پڑھتے ہیں جیسا کہ ابوعمر، نافع اور ابن کثیر پڑھتے ہیں۔

بعض مفسرین نے کہا ہے کہ انجیر سے مراد اصحاب کہف کی مسجد ہے جس کے اردگرد انجیر کے درخت بے شمار ہیں جبکہ زیتون سے مراد مسجد بیت المقدس ہے۔ جس کے اردگرد یہ درخت بہت زیادہ ہے اور بعض نے کہا ہے کہ زیتون سے مراد طور زیتا ہے جو کہ بیت المقدس کے مشرق کی طرف مسجد اقصیٰ کے سامنے ایک پہاڑ ہے۔

کوہِ زیتا کا بیان

اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ جب ام المومنین صفیہ زوجہ مطہرہ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بیت المقدس کی زیارت کو تشریف لائیں اور مسجد اقصیٰ میں نماز ادا کرنے سے فارغ ہوئیں تو اس مسجد سے باہر آئیں اور کوہ زیتا پر تشریف لے گئیں۔ وہاں بھی آپ نے نماز ادا فرمائی اور اس پہاڑ کے کنارے پر کھڑے ہو کر ارشاد فرمایا کہ یہیں سے قیامت کے دن لوگ جدا جدا ہوں گے۔ ایک حصہ جنت میں اور دوسرا دوزخ میں جائے گا اور یہ وہی پہاڑ ہے جہاں سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو آسمان پر لے گئے اور اس مقام کی نصاریٰ بہت تعظیم کرتے ہیں اور اس پہاڑ کی چوٹی پر ہیلانز نامی ایک فرنگی عورت نے گرجا تیار کیا تھا اور اس گرجے کے درمیان ایک گنبد بنایا جسے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے اوپر چڑھنے کا مقام کہتے

تھے۔ رفتہ رفتہ وہ گرجا گر گیا۔ اس پہاڑ میں خرنوب نبطی کا درخت ہے جس کے متصل ایک مسجد بنائی گئی ہے اور اس مسجد کے نیچے ایک صاف غار ہے۔ بے شمار لوگ اس کی زیارت کو آتے ہیں اس درخت کو خرنوبتہ البشرہ کہتے ہیں اور جب سلطان صلاح الدین رحمتہ اللہ علیہ نے بیت المقدس کو فتح کر کے فرنگیوں کے ہاتھوں سے چھڑا لیا تو طور زیتا کی ساری زمین شیخ احمد حکاری اور شیخ علی حکاری کے درمیان برابر برابر تقسیم کر کے وقف کر دی اور یہ واقعہ ۱۷ ذوالحجہ ۵۸۴ھ میں رونما ہوا اور زمین ابھی تک مذکورہ بالا دونوں بزرگوں کی اولاد کے قبضے میں ہے۔

پس اس صورت میں پہلی قسم اس جگہ کی اٹھائی گئی جو کہ اصحابِ کہف کی ولادت کے انوار کا مقام ہے۔ اور وہ لوگ اولیاء اللہ کا پہلا گروہ ہے جنہوں نے فنا کی راہ طے کی ہے۔ اس کے بعد نبوت عیسوی علیٰ صاحبہا الصلوٰۃ والسلام کے انوار کی جگہ کی قسم فرمائی گئی۔ ازاں بعد حضرت موسیٰ علیہ السلام کے انوار کی جگہ کی قسم فرمائی گئی اس کے بعد فرمایا جا رہا ہے:

وَهٰذَا الْبَلَدِ الْاَمِیْنِ اور اس امانت والے یا امن والے شہر کی قسم ہے اور اس شہر سے مکہ معظمہ کا شہر مراد ہے جو کہ جامعیت میں انتہا تک پہنچ چکا اس لیے کہ ہر شہر لوگوں کی مختلف اقسام سپاہی، تاجر، پیشہ ور، غنی، فقیر، مردوں، عورتوں اور دوسری قسموں کا جامع ہوتا ہے جیسے بادشاہ اور حاکم اور وہاں متبرک مقامات جیسے شہداء کے مشاہد، اولیاء اللہ اور انبیاء علیہ السلام کے مزارات، بزرگوں کی عبادت گاہیں اور مساجد بھی ہوتی ہیں اور قسم قسم کے سبزے، جانوروں کی مختلف اقسام جیسے پرندے اور چارپائے وہاں پرورش پاتے ہیں۔ لیکن کسی شہر میں خانۂ خدا نہیں ہے۔ جو کہ دائم و قائم تجلی کا مہبط اور مخلوقات کی عبادت کا قبلہ ہو مگر مکہ معظّمہ کے اس شہر کو یہ سعادت بھی نصیب ہوئی ہے۔ اور اس وجہ سے اسے انتہائی کامل جامعیت میسر آئی اور اس کے ساتھ ساتھ خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت اور بعثتِ شریفہ کی جگہ ہے۔ پس وحی محمدی علیٰ صاحبہ الصلوٰت التحیات کے اسرار کا جامع ہے اور اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت اور ولایت کے انوار چمک رہے ہیں اور وہ نبوت و ولایت جامع ترین ہے۔ پس اس قسم میں تو گزشتہ قسموں کے مقابلے میں جامعیت کے

اعتبار سے عظیم ترقی واقع ہوئی۔ گویا یہ ایک ایسی جمعیت ہے جس نے سفلی جہان اور عالم بالا کے اسرار کو اپنے اندر سما رکھا ہے اور خالق و مخلوق کو ملا دیا۔

شہر مکہ کا بیان

اور مکہ معظمہ کا شہر ایک مستطیل شہر ہے جس کا طول اس کے عرض سے زیادہ ہے۔ اور پہاڑ قلعے کی طرح اس کے اردگرد واقع ہیں۔ اور پہاڑوں کے اس گھیراؤ کے باوجود اس شہر کی حفاظت کے لیے تین طرف دیوار بنائی گئی ہے۔ جو دیوار مشرق کی طرف ہے' وہ بابِ معلات کی دیوار کے نام سے مشہور ہے۔ جو کہ اس شہر کا مبارک قبرستان ہے۔ اور جو دیوار مغرب کی طرف اور کچھ شمال کی طرف نبی پاک علیہ السلام کے مدینہ پاک کے مقابل ہے' اسے باب الشبیکہ کی دیوار کہتے ہیں اور جو دیوار یمن کی طرف ہے' اسے باب الیمن کی دیوار کہتے ہیں اور باب الماجن کی دیوار بھی کہتے ہیں اور ان تینوں دیواروں کی تعمیر وہاں کے شریف کے حکم کے مطابق جن کا نام سید حسن بن عجلان تھا ۸۱۶ھ میں واقع ہوئی۔

مکہ معظمہ اور حرم شریف کی حدود کا بیان

اور اس شہر کا طول و عرض یہ ہے کہ بابِ معلات سے لے کر بابِ ماجن تک چار ہزار چار سو بہتر (۴۴۷۲) گز ہے اور بابِ معلات سے باب الشبیکہ تک بھی دو سو بیس (۲۲۰) گز کی زیادتی کے ساتھ یہی مقدار ہے اور جو دو پہاڑ اس شہر کو گھیرے میں لیے ہوئے ہیں' ایک کو ابوقبیس کہتے ہیں اور دوسرے کو جس کا پتھر سرخ اور ابوقبیس کے بالمقابل ہے' قعیقعان کہتے ہیں اور دونوں کو اخشبین مکہ کہتے ہیں۔ ابوقبیس کو اخشب شرقی اور قعیقعان کو اخشب غربی کہتے ہیں اور مکہ معظمہ میں بے شمار عمارات، جاری چشمے، اُبلتے کنویں، وقف شدہ حوض اور حمام بھی بہت ہیں اور اس جگہ کے مؤرخ فاکہی کے زمانے میں سولہ (۱۶) حمام گرم ہوتے تھے۔

اور اس شہر کو دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ معلات یعنی بالائی اور مسفلہ یعنی نشیبی۔ کوہِ صفا کے نزدیک دار الخیزران جو کہ مکہ معظمہ کی دائیں سمت ہے' معلات کی حد ہے اور دار العجلہ جو کہ مکہ شریف کی بائیں سمت مسفلہ کی حد کی علامت ہے اور یہ باعظمت و کرامت شہر حجاز کی حکومت میں ہے جو کہ شام، عراق، مصر اور یمن کی ریاستوں کے درمیان واقع ہے

اور وہ ریاست یعنی حجاز مقدس چند شہروں پر مشتمل ہے جن میں سے ایک شہر یہ ہے اور ان میں سے ایک مدینہ منورہ ہے اور ایک شہر یمامہ ہے اور بہت سی تحصیلیں ہیں جو کہ ان تینوں شہروں کے ساتھ متعلق ہیں اور مکہ معظمہ کی عمل داری بعض سمتوں میں دس (۱۰) دن کے فاصلے تک ہے خصوصاً یمن کی طرف جو سرحد واقع ہے اسے ضنکان کہتے ہیں اور وہ مکہ شریف سے دس (۱۰) دن کے فاصلے پر ہے اور بعض دوسری طرفوں سے اس سے کم ہے۔ جیسا کہ مدینہ عالیہ کی راہ کی طرف سے اس مبارک خطہ کی حد ایک جگہ ہے جس کا نام اخبادہ بن صیقی ہے اور وہ عسفان اور مرکہ کے درمیان ایک بستی ہے۔ ڈیڑھ دن کے فاصلے پر ہے اور عراق کی طرف سے عمیر نامی ایک مقام ہے اور اس کا فاصلہ بھی اسی قدر ہے۔

اور مکہ معظمہ کے اردگرد حرم کی حد ہے جہاں شکار کرنا اور درخت کاٹنا درست نہیں ہے اور اگر اس مقام میں کبھی کوئی شکار کر لے یا درخت کاٹے تو اس پر کفارہ لازم آتا ہے اور حرم کی حد مسجد حرام کے دروازے جسے بابِ بنی شیبہ کہتے ہیں' کی دیوار سے ان دو میناروں تک جو کہ عرفات کی طرف حرم کی حد پر نصب کیے گئے ہیں سینتیس ہزار دو سو دس (۳۷۲۱۰) گز ہے اور باب المعلات سے لے کر انہیں دو میناروں تک پینتیس ہزار تراسی (۳۵۰۸۳) گز ہے۔ اور عراق کی سمت میں ان دو میناروں تک جو کہ وادیٔ نخلہ کے لیے بنائے گئے ہیں ستائیس ہزار ایک سو باون (۲۷۱۵۲) گز ہے۔ اور باب المعلات سے لے کر مذکورہ دو میناروں تک پچیس ہزار پچیس (۲۵۰۲۵) گز ہے۔ اور تنعیم کی جانب سے جو کہ مدینہ منورہ کی سمت میں واقع ہے' حرم کی حد بارہ ہزار چار سو بیس (۱۲۴۲۰) گز ہے۔ اور یمن کی طرف سے بابِ ابراہیم کی دیوار سے لے کر حرم کی حد کی علامت تک چوبیس ہزار پانچ سو نو (۲۴۵۰۹) گز ہے اور باب الماجن کی دیوار سے اس طرف کی حد حرم کی علامت تک جو کہ سمت یمن بھی ہے' بائیس ہزار آٹھ سو چھہتر (۲۲۸۷۶) گز ہے۔ اور کوسوں کے حساب سے حرم کا دور سینتیس (۳۷) کوس لکھا ہے۔ واللہ اعلم

خصوصیاتِ حرم

اور خصوصیاتِ حرم سے وہ ہیں جو کہ ذکر کی گئیں۔ یعنی وہاں شکاری جانوروں کا شکار

درست ہے نہ انہیں سائے اور پانی سے بھگانہ۔ اور وہاں کے درختوں اور سبزوں کو کاٹنا، اُکھاڑنا اور پتے جھاڑنا جائز نہیں۔ سوائے اذخر اور سنا کے کہ دوا کی ضرورتوں میں اسے جائز قرار دیا گیا ہے۔ نیز اس حلقے میں آدمی کو گناہ کے قصد پر مواخذہ ہوتا ہے بخلاف دوسرے مکانات کے۔

اور وہاں نیکیوں اور عبادتوں کا اجر کئی گنا زیادہ ہوتا ہے۔ چنانچہ حضرت امام حسن بصری رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ مکہ شریف میں ایک دن کا روزہ ایک لاکھ روزے کے برابر ہے اور اللہ تعالیٰ کے نام پر وہاں کسی کو ایک درہم دینا ایک لاکھ درہم کے برابر ہے۔

اور مستدرک حاکم میں حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہ سے نقل کیا گیا کہ حسنة الحرم کل حسنة بمائة الف حسنة یعنی حرم میں کی گئی ہر نیکی ایک لاکھ نیکی کے برابر ہے۔ نیز جو شخص مکہ معظمہ میں مرے اسے ایک شرف اور بزرگی حاصل ہوتی ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں واقع ہے کہ من مات بمکه بعثه الله فی الآمنین یوم القیامة یعنی جو شخص مکہ شریف میں مر جائے اللہ تعالیٰ اسے قیامت کے دن امن والوں میں اُٹھائے گا۔ نیز حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہما کی حدیث شریف میں واقع ہے کہ من مات بمكة فكانما مات في السماء الدنيا یعنی جو شخص مکہ شریف میں مرا گویا کہ وہ پہلے آسمان میں مرا۔

نیز اس مبارک خطے میں جو عظیم نشانیاں محسوس ہوتی ہیں اور مشاہدے میں آتی ہیں ان میں سے یہ ہے کہ اگر کوئی درندہ بھیڑیا اور چیتا کسی جانور کے پیچھے بھاگے اور وہ جانور حرم کی حد میں داخل ہو جائے تو درندہ واپس ہو جاتا ہے اور حرم میں بالکل داخل نہیں ہوتا۔ نیز لوگوں نے حرم کی حد کے درمیان ہرنوں اور درندوں کو باہم ملے جلے اور مانوس دیکھا ہے۔ نیز جب پرندے اڑتے ہوئے خانہ کعبہ کے مقابل آتے ہیں تو دائیں بائیں پھر جاتے ہیں اور اس مقدس گھر کے اوپر سے نہیں گذرتے اور یہ نشانی ہمیشہ لوگوں کی آنکھوں کے سامنے ہے۔ نیز چشمۂ زمزم کا پانی شب برات میں اس قدر اُبلتا ہے کہ چشمے کے کناروں تک پہنچ جاتا ہے۔ نیز آب زمزم کی یہ خصوصیت ہے کہ لوگوں کو سیر کر دیتا ہے اور کھانے کے قائم مقام ہو جاتا

ہے۔

خلاصۃ الکلام یہ ہے کہ کمال جامعیت کی وجہ سے یہ مبارک شہر نہایت اُونچے مقام تک پہنچا ہوا ہے اِسی لیے اس سورۃ میں قسم کو اس شہر پر ختم فرما کر مقصد بیان فرمایا جارہا ہے۔ کہ لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِیْٓ اَحْسَنِ تَقْوِیْمٍ یعنی ان چاروں چیزوں کی قسم اس مقصد کے لیے ہے کہ تحقیق ہم نے انسان کو ایک بہترین صورت اور ترکیب میں پیدا فرمایا ہے کیونکہ اگر اس کی ظاہری صورت کو دیکھیں تو کمال حسن و جمال کے ساتھ موصوف ہے' قد کے بالکل سیدھا ہونے کے اعتبار سے بھی اور اجزاء کے خوب اور تناسب ہونے کے اعتبار سے بھی اس کی گردن اونٹ کی گردن کی طرح دراز نہیں اور نہ ہی کچھوے کی طرح بالکل چھوٹی اور اس کی ناک ہاتھی کی سونڈ کی طرح دراز نہیں اور نہ ہی دوسرے چارپایہ جانوروں کی طرح بالکل نہ معلوم سی۔ علیٰ ہذا القیاس تمام اعضاء میں غور وفکر کرنا چاہیے اور اس کے حسن و خوبی کو قیاس کرنا چاہیے۔

انسانی تخلیق کے حسن وخوبی کا بیان

اس لیے حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے زمانے میں ایک شخص نے اپنی بیوی سے کہا کہ اگر تو چاند سے زیادہ حسین نہیں تو تجھے طلاق ہے۔ علمائے وقت حیران رہ گئے اور انہوں نے طلاق واقع ہونے کا فیصلہ دے دیا اور جب یہ سوال حضرت امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کے حضور پیش ہوا تو آپ نے فرمایا کہ طلاق واقع نہیں ہوئی اس لیے کہ اس کی بیوی انسانی جنس سے ہے جبکہ انسان کے بارے میں اللہ تبارک وتعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے کہ میں نے اسے سب سے اچھی صورت میں پیدا فرمایا ہے اگر چاند کی صورت اس سے بہتر ہوتی تو اسے احسن تقویم کی وصف کے ساتھ بیان نہ فرمایا جاتا اور کیا اچھا کہا گیا ہے کہ جب تو نے اسے سورج اور چاند کے تشبیہ دی تو اس کی تعریف نہیں بلکہ ہجو کی ہے۔ سورج میں وہ تل جو کہ اس کے رخسار پر ہے اور اس کے منہ میں وہ موتیوں کی لڑی کا ہنسنا کہاں ہے اور چودھویں کی رات کے لیے وہ سرمگیں پلکیں کہاں جو کہ نور کے تڑکے کھل کر اس کے کناروں میں چلتی ہیں۔

اور ظاہر ہے کہ چاند میں روشنی اور چمک کے علاوہ اور کوئی چیز نہیں ہے جبکہ اس نسخہ جامعہ میں صورتیں اور شکلیں بنانے کی باریکیاں درج اور پوشیدہ ہیں۔ چنانچہ کہتے ہیں من ماہ ندیدہ ام کلہ دار، من سرو ندیدہ ام قباپوش یعنی میں نے کسی چاند کو کلاہ پہنے اور کسی سرو کو قبا پہنے نہیں دیکھا ہے۔

اور اس جہت سے بھی کہ دنیا میں آدمی کی شکل کی طرح کوئی شکل عبادات کثیرہ کے لائق نہیں ہے اس سے قیام، رکوع اور سجود ہو سکتے ہیں اور اگر اس کے حسن کو تفصیل کے ساتھ بیان کیا جائے تو علم تشریح کی مجلدات کو نقل کرنا چاہیے۔ لہٰذا اس طرف سے قلم کی لگام کو پھیرنا ہی بہتر ہے۔

اور اگر اس کے باطنی معنوں میں غور و فکر کریں تو اس نسخہ جامعہ میں چار جہان لپٹے ہوئے اور پیچیدہ ہیں۔ عالمِ شہوت، عالمِ غضب، عالمِ وہم اور عالمِ خیال اور چاروں جہانوں میں سے ہر جہان کو ایک غیبی حاکم جو کہ عقل ہے' کے حکم کے نیچے مسخر کیا گیا ہے اور اس حاکم کو شرع شریف کی نورانی مشعل کی بینائی کا نور عطا فرمایا گیا تا کہ اس نور کے ساتھ نیک و بد خیر و شر کو دریافت کرے۔ اور جب بھی اس حاکم کا حکم ان چار جہانوں پر غالب ہوتا ہے' کمال و جامعیت کے اعلیٰ درجات تک پہنچتا ہے۔ اور مختلف جہانوں سے جس چیز کے حصول کی توقع نہ تھی اس نسخہ جامعہ سے ہوتی ہے جیسے کہ معجون مرکب کی خاصیت ہے کہ ہر مفرد سے اس کے حصول کی توقع نہیں ہوتی لیکن اس حاکم کا غلبہ صرف تائید غیبی اور توفیق آسمانی کے ساتھ ہے۔ اسی لیے ہر کسی کو میسر نہیں۔

ثُمَّ رَدَدْنٰهُ پھر ہم نے اسے لوٹایا۔ یعنی اس قسم کی عجیب مخلوق کو جسے ہم نے اس قدر نوازا' عقل اور اسکی دوسری رعایا شہوت، غضب وہم اور خیال کے کاروبار کے انتظام میں اس کی کوتاہی کی وجہ سے اَسْفَلَ سٰفِلِیْنَ نیچوں سے نیچا کر دیا کہ چار پایوں کے درجے سے بھی گزر جاتا ہے اور شہوت و غضب کے جال اور وہم و خیال کے کمند میں اس قدر گرفتار اور مقید ہو جاتا ہے کہ اس کا مرتبہ تمام مخلوقات سے ذلیل اور کم تر ہو جاتا ہے کیونکہ دوسری مخلوقات میں اگرچہ کمالات حاصل کرنے کی صلاحیت نہیں ہے لیکن مواخذہ اور سزا بھی نہیں ہے جبکہ

اس مخلوق کو کمالات حاصل کرنے کی استعداد کے باوجود محروم رہنے کی صورت میں ابدی مواخذہ اور دائمی عذاب درپیش ہے۔

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مگر جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے اپنی عقل کو اپنے خیالات اور اوہام پر غالب کر دیا۔ وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور انہوں نے اعمال صالحہ کیے اور اپنی عقل کو شہوت اور غضب پر غالب کر دیا اور عظیم مجاہدہ کیا۔ فَلَهُمْ اَجْرٌ غَيْرُ مَمْنُوْنٍ پس ان کے لیے ایک نہ ختم ہونے والا اجر ہے۔ اگرچہ بیماری، بڑھاپے اور موت کی وجہ سے ان کا مجاہدہ ختم ہو جائے لیکن مضبوط استقامت کی وجہ سے ان کی روح میں جو کیفیت پیدا ہوئی ہے' روز بروز ترقی پر ہے اور وہ اس ترقی کے بدلے ہر لحہ عظیم ثواب پائیں گے۔ چنانچہ حدیث شریف میں وارد ہے کہ جب بندۂ مومن دین سے متعلق اچھے طریقے پر گامزن ہو اور بڑھاپے، مسافری اور بیماری کی وجہ سے اس سے وہ طریقہ فوت ہو جائے' اللہ تعالیٰ نیکیاں لکھنے والے فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس شخص کے اعمال نامے میں ان عبادتوں اور نیکیوں کا ثواب لکھ دو جو کہ یہ ہمیشہ کرتا تھا اور اس کے ثواب کو اس سے مت روکو۔ بلکہ بعض روایات میں یہاں تک وارد ہے کہ اس کے فوت ہونے کے بعد بھی فرشتوں کو حکم دیتا ہے کہ اس کی قبر کے پاس تسبیح، تکبیر اور تحمید میں مصروف رہو اور وہ سب کچھ اس بندے کے نام لکھو تا کہ قیامت کے دن اُٹھے اور اس وافر خزانے کو کام میں لائے (اقول و باللہ التوفیق اس روایت سے معلوم ہوا کہ قبر کے پاس بیٹھ کر قرآن پاک پڑھنے اور اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے سے میت کو فائدہ پہنچتا ہے اور ایسا کرنا جائز ہے۔ فرشتوں کا دستور بلکہ حکمِ خداوندی ہے۔ قبروں پر جانے سے مطلقاً روکنے والے ذرا عبرت کی نگاہ حاصل کریں۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اور بعض مفسرین نے ثُمَّ رَدَدْنٰهُ اَسْفَلَ سٰفِلِيْنَ کو بڑھاپے اور اس کی وجہ سے عقل کے خلل میں پڑنے کی حالات پر محمول کیا ہے کہ اس حالت میں انسان کی صورت بدل جاتی ہے اور قویٰ مضمحل ہو جاتے ہیں اس کی پشت کمان کی طرح جھک جاتی ہے اور قد کا سیدھا ہونا خلل میں پڑ جاتا ہے اس کے سر اور جسم کے بال سفید ہونے کی وجہ سے برص وہ معلوم ہوتا ہے۔ اس کے چہرے میں جو بل پڑ جاتے ہیں' بہت بُرے لگتے ہیں۔ دانت گرنے کی

وجہ سے منہ کی بناوٹ بہت بُری معلوم ہوتی ہے۔ لیکن اس توجیہہ پر اِلَّاالَّذِیْنَ آمَنُوْا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ کی استثناء مناسب نہیں مگر اس وقت جبکہ استثناء کو منقطع قرار دیں اور اس میں تکلف ہے۔

اور جب ان آیات سے معلوم ہوا کہ دین کی حقیقت عقل کو تمام قوتوں شہوت، غضب، وہم اور خیال پر غالب کرنا اور عقل کو نورِ شرع سے منور کرنا ہے۔ پس دین کی تکذیب کی کوئی وجہ نہ رہی کیونکہ انسان کی معنوی صورت کا حسن عین دینِ اسلام ہے اور وہ حسن ہر کسی کو مطلوب اور مرغوب ہے۔ لہٰذا اس تکذیب کے رد کے مقام میں فرمایا جارہا ہے کہ:

فَمَا یُکَذِّبُکَ بَعْدُ بِالدِّیْنِ پس اے انسان! ان مقدمات کے واضح ہونے کے بعد تیرے لیے دین کی تکذیب کا باعث کیا ہے؟

حاصلِ کلام یہ ہے کہ جب تو نے اپنی معنوی صورت کی حقیقت کو پالیا اور تجھے معلوم ہو گیا کہ اس صورت کا حسن اسی پر موقوف ہے کہ پہلے تو عقل کو نورِ شرع سے روشن کرے اس کے بعد اسے اپنی قوتوں پر حاکم بنائے تو دین کو جھٹلانے کی کوئی وجہ باقی نہ رہی اس لیے کہ نورِ شرع، دین کا نور ہے اور اس نور کے ساتھ عقل کو ہدایت ملتی ہے۔ کیونکہ عقل آنکھ کے مرتبے میں ہے، جبکہ دین کا نور سورج کی شعاعوں کے مشابہ ہے۔ اگر سورج کی شعاع درمیان میں نہ ہو' آدمی کی آنکھ سے کچھ نہیں کھلتا تو دین کا نور انسان کی صورت معنوی کے کمال کی ضروریات میں سے ہے۔ اور جس طرح کہ انسان حسی صورت کے خلل میں پڑنے کی وجہ سے انسانیت سے نکل جاتا ہے۔ اور جانوروں کی صورت میں مسخ ہو جاتا ہے۔ اسی طرح معنوی صورت کے خلل میں پڑنے کی وجہ سے حد سے نکل جاتا ہے اور معنوی مسخ میں مبتلا ہو جاتا ہے اور کون ہے جو کہ انسانیت سے اپنے نکلنے اور حیوانیت میں داخل ہونے کا روادار ہو اور اگر مزاج کی خرابی کی بناء پر کوئی چاہے کہ حیوانی صورت کی طرف رغبت کرے تو اسے اس مقدمے کے ساتھ سمجھایا جاسکتا ہے کہ:

اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحٰکِمِیْنَ کیا خداتعالیٰ تمام حاکموں سے بڑا حاکم نہیں ہے؟
اور جب دوسرے حاکم اپنی رعایا سے یہ پسند نہیں کرتے کہ ایک فرقے سے دوسرے فرقے

کی طرف منتقل ہوں تو یہ لوگ اونچے مرتبے سے نہایت پستی میں اُتر آئیں، حق تعالیٰ اس حرکت کو کیوں پسند فرمائے گا جو کہ خلاف حکمت ہے۔

اور اس احتمال کی گنجائش ہے کہ ہم دین کو جزا کے معنوں میں لیں۔ اس صورت میں ان آیات کا اور سابقہ آیات کا رابطہ اس طرح سمجھا جاسکتا ہے کہ انسان کی تخلیق کی ابتدا سے جو نطفہ تھا یہاں تک کہ پیدائش میں پورے اعتدال اور حسن صورت تک پہنچا اور اسے عقل دے کر اور اسے نورِ شرع سے منور کر کے حسن معنوی عطا فرمایا گیا۔ پھر اس کے بعض افراد کو اس قدر کھلم کھلا تنزلی دی گئی کہ تمام نیچوں سے نیچا ہو گیا، حالات کے اس بدلنے پر اللہ تعالیٰ کا قادر ہونا جب آدمی پر ظاہر ہو گیا تو قیامت کے دن جزا دینا، مردوں کو زندہ کرنا اور حالات کو بدلنا کہ دنیا سے سرکشوں کو پست اور یہاں کے عاجزوں کو اونچے مرتبے تک پہنچانا کیا بعید ہو گا۔

اور یہ جتنا بیان ہوا کہ اللہ تعالیٰ کی قدرت کے پیش نظر جزا کے واقع ہونے کو جائز قرار دینے میں کافی ہے اور اگر اس کی حکمت اور عدل پر نظر کریں اور جانیں کہ نیک و بد کی جزا دینا اور اچھے بُرے میں فرق کرنا حکمت اور عدل کی دنیا کے واجبات میں سے ہے۔ تو جزا کا واجب ہونا ثابت ہو جاتا ہے۔ چنانچہ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ اس مقدمے کا اشارہ ہے۔ پس جزا کے معاملے کا واقع ہونا قدرت پر نظر کرتے ہوئے ممکن اور حکمت و عدل کے پیش نظر واجب ہے۔

اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو بھی سورۂ التین پڑھے اور اس آیت تک پہنچے کہ اَلَیْسَ اللّٰہُ بِاَحْکَمِ الْحَاکِمِیْنَ تو چاہیے کہ کہے بلی وانا علی ذالك من الشاهدين یعنی کیوں نہیں۔ تو سب حاکموں سے بڑا حاکم ہے میں اور اس پر گواہی دینے والوں سے ہوں۔ اور حدیث شریف میں ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نمازِ عشا میں بارہا اس سورۃ کی تلاوت فرماتے اور حضرت امیر المومنین عمر بن الخطاب رضی اللہ عنہ بھی یہ سورۃ کعبۃ اللہ کے سامنے فرض نماز میں پڑھتے تا کہ حرم محترم کی بزرگی کا اشارہ ہو جس کی اس سورۃ میں قسم یاد فرمائی گئی ہے۔ واللہ اعلم بالصواب۔

سورۃ اقرء

مکی ہے۔ اس میں انیس (۱۹) آیات۔ بہتر (۷۲) کلمات۔ اور ایک سو اسی (۱۸۰) حروف ہیں اور اسے سورۃ علق بھی کہتے ہیں۔ اس لیے کہ اس سورۃ میں مذکور ہے کہ آدمی کو علق یعنی منجمد خون سے پیدا کیا گیا ہے اور یہ ذکر کرنا دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ اپنی رحمت سے ذلیل کو عزت والا کر دیتا ہے جیسا کہ اس نے جمے ہوئے خون کو جو کہ انتہائی ذلت کے درجے میں واقع ہے' انسانی صورت دے کر اور اس میں انسانی روح پھونک کر کمال عزت عطا فرمائی۔ اسی طرح آدمی کو انتہائی احتیاج کے باوجود قرآن پاک اُتار کر اور وحی کی تعلیم دے کر عزت سے نوازا ہے۔ اور اس امر میں کفار کو جو محال ہونا کھٹکتا ہے' خلقت انسانی کی ابتدا خون سے ملاحظہ کرنے کے ساتھ دُور ہو جاتا ہے۔

اور اکثر مفسرین نے اس سورۃ کو اَوَّلُ مَانَزَلَ مِنَ الْقُرْآنِ کہا ہے یعنی قرآن پاک میں سے سب سے پہلے نازل ہونے والی سورت یہ ہے۔ جبکہ حضرت امیر المومنین مرتضیٰ علی کرم اللہ وجہہ سے منقول ہے کہ سب سے پہلے فاتحۃ الکتاب اُتری ہے۔ اور حضرت جابر بن عبداللہ رضی اللہ عنہ سے مروی ہے کہ سب سے پہلے سورۃ مدثر نازل ہوئی۔ یہ اقوال بظاہر ایک دوسرے کے خلاف معلوم ہوتے ہیں لیکن ان تینوں اقوال کی باہم مطابقت اس طرح ہے کہ اول حقیقی اس سورۃ کی پانچ آیات ہیں۔ اس کے بعد تعلیم نماز کے لیے سورۃ فاتحہ اُتری اور وحی کے عارضی انقطاع کے بعد پہلی سورۃ جو نازل ہوئی مدثر ہے اور اس کے بعد قرآن پاک کا نزول تواتر کے ساتھ واقع ہوا تو جس نے سورۃ مدثر کو اوّل اُترنے والی سورت کہا ہے گویا اس نے پہلی متصل اور متواتر اُترنے والی سورت مراد لی ہے۔ اور اس سورۃ کا نزول باقی قرآن پاک کے نزول کی تمہید قرار دیا ہے۔ اور سورۂ فاتحہ کا نزول مناجات کی تعلیم کے لیے قرار دیا۔ اور تبلیغ کا آغاز سورۂ مدثر سے کیا۔

اور جس نے سورۂ فاتحہ کو سب سے پہلے اُترنے والی سورۃ کہا ہے گویا پہلی چیز جس کے ساتھ قرب خداوندی حاصل کرنا اور اس کی تلاوت بطور عبادت کرنا واقع ہوا' یہی سورت تھی۔ سورۃ اقرء تو صرف قرأت کے طریقے کی تعلیم دینے اور تلاوت کا معمول سکھانے کے لیے

نازل ہوئی تھی۔

سورۃ اقرء کے نزول کی کیفیت

اس سورت کے نزول کی کیفیت یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے وحی کی علامات میں سے سب سے پہلے جو چیز ظاہر ہوئی' سچے خواب تھے کہ آپ رات کو خواب میں جو کچھ دیکھتے' دن کو بعینہٖ اسی طرح واقع ہوتا۔ اس کے بعد آپ کے بابرکت دل میں تنہائی اور گوشہ نشینی کی محبت غالب آئی۔ آپ نے مکہ معظمہ سے متصل کوہِ حرا شریف میں جا کر اپنی خلوت کے لیے ایک غار مقرر فرمائی اور اس غار میں چند دن کی تھوڑی سی خوراک ساتھ لے کر اکیلے تشریف فرما ہوتے۔ اور اللہ تعالیٰ کی حمد و ثناء اور تسبیح وتہلیل میں مصروف رہتے حتیٰ کہ خوراک پوری ہو جاتی۔ پھر دولت خانہ کو مراجعت فرماتے اور ایک دو دن ٹھہرتے۔ اہل و عیال کے حقوق ادا کر کے کچھ اور خوراک لے کر اسی غار میں پھر جلوہ افروز ہوتے۔ اور اس غار میں آپ کے ٹھہرنے کی مدت غالب طور پر ایک ماہ سے کم ہوتی۔ اور کبھی نادر طور پر آپ نے وہاں ایک مہینہ بھی گزارا ہے۔

خلوت کے ایام میں آپ ایک دن اس غار سے باہر تشریف لائے اور جسم مبارک اور ہاتھ پاؤں دھونے کے لیے ایک چشمے کے کنارے کھڑے تھے کہ اچانک حضرت جبرئیل علیہ السلام نے فضا میں سے آواز دی۔ یا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اوپر کی سمت دیکھا' کوئی آدمی نظر نہ آیا۔ دوسری اور تیسری مرتبہ بھی اسی طرح آواز آئی۔ آپ حیران ہو کر دائیں بائیں دیکھ رہے تھے کہ ایک دم ایک نورانی شخص سورج کی طرح روشن نور کا تاج سر پہ رکھے ہوئے' سبز براق حلہ پہنے ہوئے آدمی کی شکل میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نزدیک پہنچ گیا اور آپ سے کہنے لگا کہ پڑھیئے۔

اور بعض روایات میں آیا کہ اس بزرگ کے ہاتھ میں سبز ریشم کا ایک ٹکڑا تھا جس پر کچھ لکھا ہوا تھا اس نے وہ ٹکڑا حضور علیہ السلام کے سامنے کیا اور کہا کہ پڑھیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ میں صورت حرف کو نہیں پہچانتا اور پڑھنے والا نہیں ہوں۔ اس بزرگ نے پھر کہا کہ پڑھیں اور آپ کو بغل میں لے کر پوری قوت کے ساتھ بھینچا حتیٰ کہ

آپ کو اس بھینچنے سے بہت مشقت لاحق ہوئی۔ تین دفعہ ایسا ہی کیا۔

(ایک قول یہ بھی ہے کہ کرمانی شارح بخاری نے بیان فرمایا ہے وعلی النصب معناہ بلغ الملك منی الجهد یعنی وہ عظیم فرشتہ مجھے بھینچتے بھینچتے تھک گیا۔ بہر حال حضور علیہ السلام کا جسم پاک متاثر ہوا یا جبرئیل علیہ السلام تھک گئے دونوں صورتوں میں جسد مبارک کی عظمت اور قوت ظاہر ہے۔ پہلی صورت میں اسی طرح کہ جبرئیل علیہ السلام جیسا طاقت ور فرشتہ تین مرتبہ پوری طاقت سے دبائے مگر جسم شریف ثابت اور قائم ہے اور دوسری صورت میں بالکل ظاہر ہے۔ خدا و مصطفیٰ کی رمز سے ادراک عاجز ہے' خدا کو مصطفیٰ جانے محمد کو خدا جانے۔ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

پھر اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ الَّذِیْ خَلَقَ پانچ آیات تک تلاوت کیں۔ یہ آیات حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذہن شریف میں راسخ ہو گئیں اور آپ نے یاد کر لیں۔

اور بعض روایات میں آیا کہ ان آیات کی تعلیم کے بعد اسی بزرگ نے اپنا پاؤں زمین پر مارا' جاری پانی کا ایک چشمہ پیدا ہوا۔ حضور علیہ السلام کو طہارت، وضو اور استنجاء کا طریقہ تلقین کیا اور دو رکعت نماز کی تلقین کی۔ سورۂ فاتحہ بھی سکھائی تا کہ نماز میں پڑھتے رہیں۔

اور اس واقعہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس سے متاثر ہو کر کانپتے ہوئے گھر واپس تشریف لائے۔ ام المومنین خدیجہ رضی اللہ عنہا سے فرمایا کہ مجھ پر لحاف ڈال دو تا کہ لرزہ دُور ہو جائے۔ لرزہ دُور ہونے کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا نے کیفیت حال پوچھی تو آپ نے ان کے سامنے سارا ماجرا بیان کر کے ارشاد فرمایا کہ مجھے اپنی جان پر خوف ہے کہ کہیں اس سخت صدمے سے چل بسوں (اقول وباللہ التوفیق۔ صوفیاء ارشاد فرماتے ہیں کہ وحی خداوندی کا نزول تو باعثِ رحمت اور ذریعہ حصولِ برکت ہے' موجب ہلاکت نہیں۔ ان الفاظ سے مراد حضرت کے قلب مقدس پر اس ذمہ داری کے احساس کا اثر اور اس کے ردعمل کا وزن ہے جو کہ عالمگیر نبوت و رسالت کی شکل میں آپ پر ڈالی گئی۔ روحانی کیفیتوں کے حصول کو تو اولیاء اللہ ہلاکت سے تعبیر نہیں کرتے۔ سید الخلق علی الاطلاق اور حبیب الحق بالاتفاق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اس کا تصور کیسے ممکن ہو سکتا

ہے۔ فاعتبروا یا اولی الابصار۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہم نے عرض کی کہ آپ بالکل پریشان نہ ہوں اس لیے کہ حق تعالیٰ نے آپ میں اپنی رحمت کی صفات وافر طور پر ظاہر فرمائی ہیں۔ آپ ضعیفوں پر رحم فرماتے ہیں' اپنے رشتے داروں کے ساتھ اچھا سلوک کرتے ہیں' مہمان نوازی فرماتے ہیں اور محتاجوں کے کاموں میں دستگیری فرماتے ہیں جو ذات اللہ تعالیٰ کی مخلوق پر اس قدر رحم فرمائے وہ تو رحمتِ الٰہی کی مستحق ہے نہ کہ کسی پریشانی کی۔ اس کے بعد حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو لے کر اپنے چچازاد ورقہ بن نوفل کے پاس گئیں جو کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین پر تھے اور عبرانی کی کتابوں اور تورات اور انجیل سے پوری طرح واقف تھے اور ان کا ترجمہ عربی زبان میں لکھتے تھے۔

آپ نے فرمایا بھائی جان! ذرا اپنے برادرزادے کی بات سنیں کہ کیا فرماتے ہیں۔ ورقہ نے سارا واقعہ سُن کر کہا کہ آپ کے پاس یہ آنے والا شخص ناموس اکبر ہے یعنی جبرئیل علیہ السلام جنہیں اہلِ کتاب کی اصطلاح میں ناموس اکبر کہتے ہیں اور کہ یہ وہی ناموس اکبر ہے جو کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے انبیاء علیہم السلام پر وحی لاتا ہے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام پر بھی نازل ہوتا رہا۔ تو آپ خوش رہیں۔ اور کسی قسم کا خوف محسوس نہ فرمائیں۔ لیکن آپ کی قوم اس نعمت کی قدر شناسی نہیں کرے گی اور یہ آپ کو ستائیں گے یہاں تک کہ آپ کو اس شہر سے نکلنا پڑے گا۔ اے کاش میں اس وقت زندہ ہوتا تو آپ کی مدد کرتا اور دونوں جہانوں کی سعادت حاصل کرتا۔ اس کے چند دنوں بعد ورقہ بن نوفل فوت ہو گئے۔

انہیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے خواب میں سفید لباس پہنے ہوئے دیکھا اور یہ تعبیر فرمائی کہ یہ شخص جنتی تھا۔ (اقول وباللہ التوفیق حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا کی حقیقت شناسی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قرب کی سعادت پانے کی وجہ سے ہے۔ جس کا انہوں نے آپ کے خصائل شریفہ کا ذکر کر کے اظہار فرمایا۔ جن کے قرب کی بدولت اس خاتون کو معرفت کا یہ مقام حاصل ہوا وہ خود بے خبر کیونکر ہو سکتے ہیں۔ نیز آپ کا ورقہ بن نوفل کے تشریف لے جانا بظاہر حقیقت حال کا پتہ کرنے کے لیے تھا لیکن حقیقت میں آپ ورقہ بن نوفل کو زیارت کرانے اور اپنی نبوت و رسالت سے روشناس کرانے اور انہیں اعتراف و تسلیم

کے مرتبہ پر فائز کرنے کے لیے وہاں تشریف لے گئے اگر نہ جاتے تو حضرت ورقہ بن نوفل کو آپ کی زیارت سے آپ کی نبوت و رسالت کو تسلیم کرنے کا موقعہ ہی نہ ملتا اور وہ اس نعمتِ عظمٰی سے محروم رہتے۔ چنانچہ حکیم الامت مولانا مفتی احمد یار خان گجراتی اپنی تفسیر نورالعرفان میں فرماتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پہلے سے ہی جبرئیل امین کو جانتے پہچانتے تھے کہ اس وقت حضور علیہ السلام نہ ان سے ڈرے نہ پوچھا کہ تم کون ہو؟ اگر آپ جبرئیل کو نہ پہچانتے تو آپ کو ان آیات کا کلامِ الٰہی ہونا مشکوک ہوتا اور یہ شانِ نبوت تو کیا شانِ ایمان کے بھی خلاف ہے۔ انتہی)

چند نکات کا بیان

اس واقعہ میں چند نکات معلوم ہونے چاہئیں۔ پہلا نکتہ یہ ہے کہ بنی آدم میں تربیت کی عادت درجہ بدرجہ ہونے کا تقاضا کرتی ہے۔ پس اگر پہلی دفعہ ہی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو قرآن پاک کی وحی سے مشرف فرمایا جاتا تو برداشت نہ ہوتی۔ اس لیے پہلے خواب میں جو کہ اس جہان سے بے توجہی کی حالت ہے، جزوی علوم کا القاء شروع فرمایا گیا تاکہ اس طرح جہانِ غیب سے علوم حاصل کرنے کی عادت پیدا ہو جائے اور آپ آہستہ آہستہ اس تعلیم کے خوگر ہو جائیں۔ اس کے بعد چاہا کہ بیداری اور ہوشیاری کی حالت میں آپ اہل و عیال اور گھر سے منقطع ہو جائیں تاکہ پورے جہان غیب کی طرف متوجہ ہوں۔ اس وقت آپ کو تنہائی اور علیحدگی کی محبت دل میں جاگزیں ہوئی اور آپ کو ایک ایسی جگہ کا پتہ دیا گیا جہاں جنس بشر میں سے کوئی بھی نہ ہو۔ تاکہ نزولِ وحی کے وقت کسی کے دل میں شاگردی اور تعلیم کا گمان تک نہ گزرے پھر نزولِ وحی کے وقت آپ کے دل میں شدید صدمہ، لرزہ اور خوف ڈال دیا گیا تاکہ کسی کو جعل سازی اور بناوٹ کا وہم بھی پیدا نہ ہو۔

دوسرا نکتہ یہ ہے کہ جبرئیل علیہ السلام کے دبانے اور بغل میں لینے کے ذریعے خدائی تاثیر کو آپ کی روح میں مکمل طور پر مضبوط اور راسخ کر دیا گیا۔

توجہ دینے کی اقسام کا بیان

اس لیے کہ اہلِ طریقت کے عرف میں اپنے غیر میں کاملین کی تاثیر جسے توجہ کہتے ہیں،

کی چار قسمیں ہیں۔ پہلی تاثیر انعکاسی جیسے کوئی شخص اچھا سا عطر لگا کر محفل میں آئے اور عطر کی مہک محفل میں بیٹھنے والوں کے مشام میں اثر کرے اور وہ اس سے لذت حاصل کریں۔ اور یہ تاثیر کی اقسام میں سے سب سے زیادہ ضعیف قسم ہے اس لیے کہ اس کا اثر صرف پاس بیٹھنے کی مدت تک باقی ہے' ازاں بعد کچھ نہیں رہتا۔

دوسری تاثیر القائی جیسے کوئی شخص پیالی میں بتی اور تیل ڈال کر لائے اور دوسرا شخص جس کے پاس آگ ہے اس بتی کو روشن کر دے۔ پس چراغ درست ہو جائے۔ اس تاثیر میں قدرے قوت ہے کہ صحبت کے بعد بھی افادہ واستفادہ کی صورت میں اس کا اثر باقی رہتا ہے لیکن اگر کوئی مضبوط رکاوٹ آڑے آ جائے جیسے تیز ہوا اور بارش وغیرہ تو اس کا اثر زائل ہو جائے۔ نیز اس قسم کی تاثیر میں تہذیب نفس اور اس کے لطائف اثر قبول نہیں کرتے جس طرح کہ تیل، بتی اور پیالی کے ناکارہ ہونے کی صرف آگ کا شعلہ اصلاح نہیں کر سکتا۔

تیسری تاثیر اصلاحی جیسے پانی کو دریا یا کنوئیں سے لے کر ٹینکی میں جمع کریں اور حوض کے فوارے تک اس ٹینکی کا راستہ خس وخاشاک سے پاک کر دیں اور پانی کو پوری قوت کے ساتھ اس راستے میں جاری کر دیں تاکہ فوارہ جوش مارے۔ اور اس کا اثر دوگزشتہ تاثیروں کے اثر سے زیادہ قوی ہے کہ اس میں نفس کی اصلاح اور لطائف کی آرائش بھی ہوتی ہے لیکن یہ فیضان ٹینکی کی استعداد اور راستے کے فاصلے کے اندازے پر ہوتا ہے نہ کہ کنوئیں اور دریا کے مطابق اور اس کے باوجود اگر ٹینکی میں کوئی آفت اثر کرے تو اس سے نقصان ہوتا ہے۔

چوتھی تاثیر اتحادی کہ شیخ اپنی روح کو جو کہ کمالات کی حامل ہے' استفادہ کرنے والے کی روح کے ساتھ پوری قوت کے ساتھ متحد کر دے تاکہ روح شیخ کا کمال مستفید کی روح میں منتقل ہو جائے اور یہ تاثیر کی انواع میں سے سب سے زیادہ قوی مرتبہ ہے کیونکہ ظاہر ہے کہ دونوں روحوں کے اتحاد کے حکم کے مطابق جو کچھ روح میں ہے' مستفید میں پہنچ جاتا ہے اور بار بار استفادہ کی ضرورت نہیں رہتی اور اولیاء اللہ میں اس قسم کی تاثیر نادراً واقع ہوتی ہے۔

حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ کا واقعہ

حضرت خواجہ باقی باللہ رحمۃ اللہ علیہ سے منقول ہے کہ ایک دن آپ کے ہاں چند

مہمان آ گئے' ان کی تواضع کے لیے کچھ موجود نہ تھا۔ حضرت خواجہ کو مہمانوں کی ضیافت کے سلسلے میں تشویش ہوئی۔ اتفاقاً آپ کے در دولت کے ساتھ ہی ایک نانبائی کی دُکان تھی اس نے آپ کی تشویش پر مطلع ہو کر ایک روٹی اور پُر تکلف اور مرغن گوشت کا سالن آپ کی خدمت میں حاضر کیا۔ آپ اس کے اس سلوک سے بہت خوش ہوئے۔ فرمایا مانگو کیا مانگتے ہو؟ اس نے عرض کی مجھے اپنی سرح کا بنا دیں۔ فرمایا تو اس حالت کو برداشت نہیں کر سکے گا کچھ اور مانگ لے۔ وہ اسی سوال پر اصرار کرتا رہا۔ حضرت خواجہ توجہ نہیں فرماتے تھے حتیٰ کہ اس کا مطالبہ بڑھ گیا۔ ناچار اسے حجرے میں لے گئے اس پر تاثیر اتحادی فرمائی جب حجرے سے باہر تشریف لائے تو خواجہ اور نانبائی کی صورت اور شکل میں کوئی فرق نہیں رہا تھا' لوگوں کو امتیاز کرنا مشکل ہو گیا۔ صرف اس قدر تھا کہ حضرت خواجہ ہشیار تھے اور وہ نانبائی مدہوش اور بے خود تھا۔ آخر تین دن کے بعد اسی سکر اور بیہوشی کی حالت میں واصل بحق ہو گیا۔ رحمۃ اللہ تعالیٰ علیہ۔ خلاصۃ الکلام یہ اس دبانے میں حضرت جبرئیل علیہ السلام کی تاثیر اتحادی تاثیر تھی کہ انہوں نے اپنی روح لطیف کو مساموں کی راہ سے سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جسم اقدس میں داخل کر کے روح مبارک کے ساتھ متحد کر دیا اور دونوں شیر و شکر ہو گئیں اور بشریت اور ملکیت کے درمیان ایک عجیب حالت پیدا ہو گئی جو کہ بیان میں نہیں آ سکتی۔

تیسرا نکتہ:

ورقہ بن نوفل کو جنہوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو تسلی دی تھی' وحی کے نزول کی گواہی دی اور جبرئیل علیہ السلام کو پہچان کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت اور مدد پر کمر ہمت باندھی تھی اس جہان سے اُٹھا لیا گیا تاکہ کسی کو گمان نہ ہو کہ یہ تمام گزشتہ واقعات اور دوسرے امور شرائع حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس نے سکھائے یا عطا کیے ہوں۔ اور اس واقعہ کے بعد اس کے ساتھ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی صحبت جاری نہ رہی۔ اور اس احتمال کی گنجائش مطلقاً ختم ہو گئی۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی اس دین کے بارے میں امداد اہلِ کتاب اور گزشتہ ادیان سے فیض پانے والوں پر موقوف نہ رہے۔ جو کچھ ہو' انہیں سے ظاہر ہو۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

اِقْرَاْ بِاسْمِ رَبِّكَ اپنے پروردگار کے نام سے مدد لے کر اپنے پروردگار کا کلام پڑھیں اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کے قدیم کلام کو آدمی خود بخود نہیں پڑھ سکتا اور لفظ رب کو خاص کرنے میں اس بات کا اشارہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کا آپ کی پرورش کرنا ظاہر اور روشن ہے۔ اور تربیت میں آپ ساری مخلوقات، سے ممتاز اور مستثنٰی ہیں۔ اور آپ کلام قدیم کی تلاوت میں اللہ تعالیٰ کے انہیں ناموں سے مدد حاصل کریں جو آپ کی تربیت میں مصروف ہیں۔ اور اگر آپ کے دل میں یہ خیال گزرے کہ کلام قدیم کو کیسے پڑھا جا سکتا ہے اس لیے کہ ہمارا پڑھنا حادث اور نو پید ہے جبکہ وہ قدیم اور ازلی ہے تو اپنے پروردگار کی ایک اور صفت کو ملاحظہ کریں کہ

الَّذِیْ خَلَقَ یعنی پروردگار وہ ذات ہے جس نے اشیاء کو اور اپنے اسماء کی صورتوں کو پیدا کیا ہے۔ تو اس سے کیا بعید ہے کہ کلام قدیم کو حروف کی شکلوں میں ڈھال کر پہلے آپ کے خیال میں ڈالے پھر آپ کی زبان مبارک پر جاری فرمائے۔ اس لیے کہ سب اشیاء کی تخلیق اسی دستور کے ساتھ ہے کہ اسمائے قدیمہ کو حادث شکلوں میں جلوہ گر کیا گیا ہے۔ اور اگر پھر خیال گزرے کہ کلام الٰہی بے انتہاء عزیز ہے جبکہ آدمی انتہائی عاجز ہے اس طرح کی عزیز شے کو مقام عجز میں اتارنا بعید معلوم ہوتا ہے تو اپنے پروردگار کی صفات میں سے ایک اور صفت ملاحظہ کریں۔

خَلَقَ الْاِنْسَانَ اس نے انسان کو پیدا فرمایا ہے۔ اور اسے اسرارِ الٰہیہ کی حامل وحی کے ساتھ کمال عزت عطا فرمائی ہے۔ اور اسے مختلف اعضاء کے ساتھ نوازا ہے۔ جن سے افعالِ الٰہی کا ظہور ہوتا ہے اور اس کی روح لطیف کو اس کے جسم کثیف کے ساتھ اس طرح وابستہ فرمایا ہے کہ لطائف روح اپنے مقام پر ہیں اور جسم کی کثافت اپنی جگہ پر۔ جسم کی کثافت سے روح متغیر ہوتی ہے نہ لطافت روح کی وجہ سے جسم پاش پاش ہوتا ہے اور یہ سب کچھ ایک مادے سے ہے جو کہ نجس اور از کار رفتہ ہے۔ چنانچہ فرمایا ہے:

مِنْ عَلَقٍ منجمد خون سے جو کہ شرعاً نجس اور حقیر ہے تو کیا عجب ہے کہ قدیم قدسی کلام کو قدیم الفاظ کے ساتھ جمع کر کے اور ترتیب دے کر خیالی قوتوں اور بولنے کے آلات

میں القاء فرما دیں اور وہ کلام قدسی بغیر کسی تغیر کے اپنے اصل تقدس پر قائم رہے۔

یہاں جاننا چاہیے کہ آدمی کا جمے ہوئے خون سے پیدا ہونا ولادت کی صورت میں ظاہر ہے کہ جب نطفہ ماں کے شکم میں قرار پکڑتا ہے تو اس میں رکھی گئی کشش کی قوت سے ماں کے بدن سے بہت سا خون اپنی طرف کھینچ لیتا ہے اور جوڑنے والی قوت پنیر کی طرح اس خون کو منجمد کر دیتی ہے۔ یہاں تک کہ وقت گزرنے کے ساتھ ہڈیوں اور گوشت کی صورت بن جاتی ہے لیکن حضرت آدم علیہ السلام کے پیدا ہونے کی صورت میں جمے ہوئے خون سے پیدا ہونا اس طرح ہے کہ انسان کے تمام اعضاء تحلیل شدہ مادے کے بدلے غذا سے لیے جاتے ہیں اور غذا نظام ہضم کے سارے مرتبوں سے گزر کر جما ہوا خون ہو کر اعضاء میں بدل جاتی ہے۔ بلکہ ولادت کی صورت میں بھی بچے کے ماں کے پیٹ سے جدا ہونے کے بعد خلقت انسانی اسی طرح واقع ہوتی ہے۔ اسی لیے انسانی تخلیق کے مواد میں سے یہاں علق کا ذکر فرمایا گیا ہے کیونکہ یہ مادہ ہر وقت اسی صورت میں درکار ہے بخلاف مٹی اور نطفہ وغیرہ کے کہ ابتدا میں درکار ہیں اور بقاء میں ان کی ضرورت نہیں ہے۔

اب غور کرنا چاہیے کہ ایک مادہ جو کہ جما ہوا خون ہے' روح کی صورت بھی حاصل کرتا ہے اور ادراک اور تحریک والی قوتوں کا حامل ہوتا ہے اور ہڈیوں کی شکل بھی اختیار کرتا ہے۔ اور ہڈی، مغز، گوشت اور چمڑا ہو جاتا ہے۔ اور روح مجرد کو ان اعضاء کے ساتھ جو کہ اس جنس کثیف سے پیدا ہوئے ہیں' اتحاد اور یگانگت میسر آتی ہے۔ یہاں سے ذات و صفات کے معانی کا خیال کی گذرگاہوں اور نطق کے آلات میں نازل ہونے کا سراغ لگایا جا سکتا ہے۔

نیز جاننا چاہیے کہ لفظ اقرء سے جو کہ اس کلام کی ابتدا میں واقع ہے' لوگوں کو شبہ ہوتا ہے اور وہ یہ خیال کرتے ہیں کہ یہ لفظ چاہیے کہ قرآن میں داخل نہ ہو کیونکہ یہ لفظ قرأت قرآن کا حکم دینے کے لیے ہے اسے عین قرآن میں کیوں لکھا جائے بلکہ لفظ قل میں جو کہ پانچ سورتوں کی ابتدا میں واقع ہے۔ قُلْ اُوْحِیَ اِلَیَّ، قُلْ یَآ اَیُّهَا الْکٰفِرُوْنَ، قُلْ هُوَ اللّٰهُ اَحَدٌ، قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ اور قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ بھی یہ شبہ وارد کرتے ہیں اسی لیے بعض صحابہ کرام نے معوذتین سے قل کا لفظ موقوف کر دیا تھا۔ لیکن اس شبہ میں غلطی

کی وجہ یہ ہوئی ہے کہ اقراء اور اسی طرح لفظ قل چونکہ کلامِ الٰہی میں داخل ہے جس کے ساتھ پیغمبر علیہ السلام کو خطاب فرمایا گیا ہے اور دوسرے اوامر ونواہی کی طرح وارد ہوا ہے' یہ قرآن میں کیوں داخل نہ ہوگا۔ پس اس لفظ کو اسی قبیلے سے سمجھیں جو کہ خطوط کی ابتدا میں لکھتے ہیں ''جاننا چاہیے'' اور فرمان شاہی میں ''جانیں اور پہچانیں'' بھی اسی طرح ہے اور اگر کوئی چاہے کہ پورا حکم دوسرے کو سنائے اور پہنچائے یا کسی کو پورے خط کا نشان دے' اسے ان الفاظ کے پڑھنے سے چارہ نہیں۔

ایک خدشے کا جواب

ہم یہاں پہنچے کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اُمی تھے' آپ کو حکم دینا کہ پڑھو تکلیف مالایطاق ہے یعنی ایسی چیز کی تکلیف دینا ہے جو ہو نہیں سکتی اور تکلیف مالایطاق واقع نہیں ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: لَایُکَلِّفُ اللّٰهُ نَفْسًا اِلَّا وُسْعَهَا۔

اس خدشے کا جواب یہ ہے کہ یہ حکم امر تکلیفی نہیں ہے بلکہ امر یقینی ہے جیسا کہ بچے کو جب پہلے پہل مدرسہ میں لے جاتے ہیں تو استاذ صاحب فرماتے ہیں' پڑھو اگرچہ بچہ اس وقت پڑھنا نہیں جانتا لیکن استاذ صاحب کا مقصد یہ ہے کہ میں پڑھوں گا تو میرے پڑھے ہوئے کو یاد کر اور پڑھنے کے لیے مستعد اور تیار ہو جاؤ اور چونکہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اُمی ہونے کا احساس فرماتے تھے' تاکید کے لیے دوسری مرتبہ فرمایا گیا کہ اِقْرَءْ یعنی پڑھیں۔

اور بعض مفسرین نے فرمایا ہے کہ پہلی مرتبہ اِقْرَءْ فرمایا گیا اس سے مراد یہ ہے کہ اپنے ثواب کے لیے قرآن پاک کی قرأت کریں اور دوسری مرتبہ اِقْرَءْ فرمایا گیا جس سے مراد یہ ہے کہ دوسرے لوگوں کو قرآن پاک کی تبلیغ فرمائیں اور جس طرح قرآن پاک پڑھنا ثواب کی خاطر اُمت کے لیے ضروری ہے' نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام کے لیے تبلیغ کی خاطر بھی ضروری ہے اس لیے کہ اگر وہ تبلیغ نہ فرمائیں تو اُمت کو قرآن پاک کی تلاوت کس طرح میسر آئے اور بعض نے فرمایا ہے کہ پہلا اِقْرَءْ نماز میں ہے اور دوسرا اقراء نماز سے باہر ہے اور بعض نے کہا ہے کہ پہلا پڑھنے کے لیے اور دوسرا پڑھانے کے لیے ہے اور بعض فرماتے ہیں کہ پہلے سے مراد یہ ہے کہ قاری بن جائیں بغیر اس کے کہ کسی چیز کو معین کیا جائے اور

دوسرا بِاسْمِ رَبِّكَ کے ساتھ متعلق ہے جو کہ اس سے پہلے گزر چکا ہے یعنی اپنے پروردگار کا نام پڑھیں۔

اب اُمّی ہونے کی رکاوٹ دُور کرنے کے لیے جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دل مبارک میں بار بار کھٹکتی تھی اور آپ خیال فرماتے تھے' اُمّی کے لیے علم حاصل کرنے کا طریقہ خصوصاً وہ علم جو کہ صفاتِ الٰہی' اس کا مقدس کلام اور اس کے ہر روز کے احکام کے ساتھ متعلق ہو' کس طرح حاصل ہو سکتا ہے۔ ایک اور مقدمہ ارشاد فرمایا جا رہا ہے جس سے علم غیب حاصل ہونے کا طریقہ لوگوں پر واضح ہو جاتا ہے۔

وَرَبُّكَ الْاَكْرَمُ اور آپ کا پروردگار بہت کریم ہے' اُمّی کو علم عطا کرنا اس کے نزدیک ایک آسان کام ہے۔ اس لیے کہ اگر اُمّی کے لیے کوئی مانع ہے تو یہ ہے کہ علم حاصل کرنے کے اسباب نہیں رکھتا اور اس قسم کا مانع تمام افراد انسانی کے بارے میں بعض علوم کی نسبت موجود ہے اور اس کے باوجود اللہ تعالیٰ بعض مخلوقات کے واسطے سے وہ علوم ان تک پہنچا دیتا ہے۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے۔

الَّذِیْ عَلَّمَ بِالْقَلَمِ وہ پروردگار جس نے آدمیوں کو قلم کے واسطے ان چیزوں کی تعلیم دی ہے جنہیں حواس، عقل اور خبر کے ساتھ معلوم نہیں کیا جا سکتا' زمانہ طویل ہونے کی وجہ سے جیسے سابقہ اُمتوں، گزشتہ صدیوں، گزرے ہوئے بادشاہوں اور پرانے زمانے کے انبیاء علیہم السلام اور اولیاء کے حالات یا مقامات کی دُوری کی وجہ سے جیسے انتہائی دُور واقع ممالک' ریاستوں اور شہروں کے حالات بلکہ بادشاہوں کی عادت اسی طرح جاری ہے کہ اپنے نوکروں اور رعایا کو قلم کے ذریعے اپنے مافی الضمیر کی اطلاع دیتے ہیں اور آمنے سامنے کسی کے ساتھ گفتگو نہیں کرتے اور چونکہ بادشاہی کا کارخانہ، کارخانہ الوہیت کا ظل ہے اس کارخانے سے اس کارخانے کا سراغ لگانا چاہیے۔

قلم کی اہمیت کا بیان

مثلاً محل کے اندر کی اسامیوں کی تعداد خواجہ سرا کے قلم سے معلوم کی جا سکتی ہے۔
مکانات، عمارات، باغات اور قلعوں کی تعداد ہوم ڈیپارٹمنٹ کے قلم سے معلوم ہو سکتی ہے۔

نوکروں اور ملازموں ان کے عہدوں سمیت سپہ سالار کے قلم سے جانا جاسکتا ہے۔ مستحقوں، خیرات کے طریقوں اوران ارادوں کو جوان کے بارے میں کیے گئے ہیں' کا پتہ صدارت کی قلم سے لگ سکتا ہے۔ زیرنگین ممالک کا طول وعرض، جریبوں، آباد اور غیر آباد دیہات، دریاؤں اور تالابوں کی تعداد جوان ممالک میں واقع ہیں' دفتر تقسیم کی قلم سے معلوم ہوسکتی ہے۔ جاگیروں اور بادشاہی زمینوں کی تعداد کو دفتر وزارت سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔ قیدیوں اور واجب القتل والتعزیر مجرموں کی تعداد ان کی سزا سمیت قیدیوں کو چھوڑنے والے دفتر سے جو کہ جیل اور کوتوالی کے ساتھ متعلق ہے' معلوم کیا جاسکتا ہے اور خزانوں اور کارخانوں کی تعداد میر سامانی کے دفتر سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ علیٰ ہذاالقیاس

اور چونکہ لوگوں کو ان کی استعداد کے مطابق کارخانہ الوہیت پر مطلع کرنا منظور تھا' انہیں قلم کے ساتھ لکھنا سکھایا گیا۔ اوران میں سے ہر فرقے کو اپنے لامتناہی کارخانوں میں سے ایک کارخانے پر مطلع ہونے کا شوق دل میں ڈال دیا گیا تا کہ وہ قلم کے ساتھ اس کام کو محفوظ کریں تا کہ دوسرے فرقے ان سے اخذ کریں۔ اوراسی طرح دوسرے فرقے کو کسی اور کارخانے پر مطلع ہونے کا خیال پیدا کردیا گیا حتیٰ کہ انہوں نے اس کام کو قلم کے ساتھ ضبط کرلیا۔ اور دوسروں کو ان کے قلم کے ذریعے اس کارخانے پر اطلاع حاصل ہوگئی۔ اوراس عجیب تدبیر کے ساتھ افراد انسانی کو اس اطلاع سے بہرہ ور فرمایا گیا۔ اور جس طرح روزی کے سلسلے میں ایک دوسرے کے ساتھ تعاون اور امداد کرنا انسان کا خاصہ ہے' جاننے اور پہچاننے کے معاملے میں بھی باہمی تعاون اور امداد اس کا خاصہ ہے۔ اور یہ باہمی تعاون اور امداد قلم کی وساطت کے بغیر ممکن نہیں اس لیے کہ بعض افراد ایک زمانے میں واقع ہوئے ہیں جبکہ بعض دوسرے افراد اس زمانے سے صدیوں بعد پیدا ہوئے۔ بعد والوں کے لیے پہلو ں کے علوم کی اطلاع قلم کے واسطے سے ہے اور بس۔ اسی طرح بعض لوگ ایک جگہ اور ایک ملک میں سکونت پذیر ہوئے جبکہ دوسرے لوگ دوسری اطراف اور ممالک میں جاگزیں ہوئے اب ان دُور رہنے والوں کے لیے ان کے علوم اور تحقیقات پر اطلاع قلم کی وساطت کے بغیر ممکن نہ تھی۔

اسی لیے حضرت سلیمان علیہ السلام نے جب جنات سے بات کی فضیلت کے متعلق سوال فرمایا تو انہوں نے عرض کہ یا حضرت! بات ایک ہوا ہے جو منہ سے نکلی اور فنا ہوگئی پھر حضرت سلیمان علیہ السلام نے پوچھا کہ کلام کو باقی رکھنے کی تدبیر کیا ہے؟ انہوں نے عرض کی اس کی تدبیر لکھنا ہے۔ پس قلم ہے کہ علوم کا شکاری اور بولی اور سمجھی گئی چیز کو لکھنے والا ہے۔ ایک نعمت ہے جو کہ نہایت عظیم اور بے پناہ بزرگ ہے۔ چنانچہ قتادہ فرماتے ہیں کہ لولاالقلم لماقام الدین ولاصلح العیش یعنی اگر قلم نہ ہوتا تو دین قائم رہتا نہ زندگی درست ہوتی۔ دین کی کتابیں قلم کے ساتھ لکھتے ہیں جبکہ قرضوں کی دستاویزات، حقوق کی اسناد اور علوم اور اموال کی حفاظت قلم کے ساتھ وابستہ ہے۔

اور اگر نظر کو کچھ وسیع کریں تو معلوم کر سکتے ہیں کہ حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کی بادشاہی کے بے شمار ممالک ہیں اور ان میں سے ایک ملک جو نسبتاً چھوٹا اور مختصر ہے' عالم شہادت ہے اور اس ملک کے بے شمار کارخانے ہیں۔ ان میں سے عمارات اور باغات کا کارخانہ ہے اور اسے چند کلموں سے پہچانا جاسکتا ہے۔ پہلا علم ہیئت ہے جس میں افلاک کی گنتی' ان کی ہیئت اور ان کی ترتیب بیان کی جاتی ہے۔ دوسرا علم جغرافیہ ہے جس میں زمین کی ہیئت' ملکوں کی صورتیں اور اس میں پائے جانے والے دریاؤں اور پہاڑوں کا ذکر ہوتا ہے۔ تیسرا مسالک اور ممالک کا علم ہے جس میں سڑکوں، شہروں، دیہات' پہاڑوں اور نہروں کی تفصیلات بیان کی جاتی ہیں۔ چوتھا ابعاد اور اجرام کا علم جس میں آسمانی اور زمینی ممالک کا طول وعرض دلیل کے ساتھ ثابت کیا ہے۔

اور ان میں مشعل خانہ کی روشنی کا کارخانہ ہے اور اسے ستاروں کی صورتوں کے علم سے دریافت کیا جاتا ہے اور شعاعوں کا علم بھی اسی میں داخل ہے۔

اور ان میں توشہ خانہ، اصطبل، کبوتر خانہ اور بازدار خانہ ہے جس کی تفصیلات علوم حیوانات سے دریافت کی جاسکتی ہیں جن میں کتاب حیوۃ الحیوان جمع کی گئی ہے۔

اور ان میں دوائی خانہ ہے جس کی تفصیلات مفردات ابن بیطار، جامع بغدادی اور بڑی بڑی قرابادینیات سے معلوم ہوسکتی ہیں۔ اور ان میں سے جواہر خانہ ہے اور اس کی

تفصیلات معدنیات اور پتھروں کے علم سے معلوم کی جاسکتی ہیں جس میں بے شمار کتابیں لکھی گئی ہیں۔

اور ان میں سے ٹکسال اور خزانۂ عامرہ ہے اور اسے علم الاجساد اور علم صنعت سے حاصل کیا جاسکتا ہے۔

اور ان میں سے روزینہ داروں، جاگیرداروں اور مما لک والوں کا کارخانہ ہے اور اسے سات ریاستوں کے بادشاہوں کے مجموعی دفاتر سے معلوم کیا جاسکتا ہے۔ بہر حال جو کچھ ذکر کیا گیا ہے' یہ قلم کے علم کی وسعت کے لیے ایک چھوٹا سا نمونہ ہے یہاں سے قلم کی وساطت سے حاصل ہونے والے علوم کے کمال کا سراغ لگایا جاسکتا ہے۔

راویوں اور مفتیوں کا قلم معاملات اور عبادات میں اللہ تعالیٰ کے احکام کی دریافت کا سبب ہے۔

اہلِ فرائض کا قلم ہر میت کے ورثاء میں سے ہر ایک وارث کے حصے معلوم کرنے کا ذریعہ ہے۔ اور مؤرخین کا قلم گویا تمام گزشتہ زمانوں کے حالات کو پیش کرنا ہے۔ اور اس دربارِ عالی کے ریکارڈ کے طور پر ہے۔

اور اگر قلم تقدیر کو بھی دیکھیں اور ان علوم کا فیض دینے کو بھی نظر میں لائیں جو کہ اس کی وجہ سے آسمان والوں اور زمین والوں کو ملا ہے تو عقل خیرہ اور وہم حیران رہ جاتا ہے۔

اور چونکہ قلم کے ساتھ تعلیم دینے کی صورت یہ ہے کہ پہلے تو ذہن میں معانی مقرر ہوتے ہیں اس کے بعد خیال میں مناسب الفاظ کا لباس پہنتے ہیں اس کے بعد قلم کی وساطت سے وہ الفاظ خط کے نقوش کی صورت میں ظاہر ہوتے ہیں اس کے بعد اس خط کو پڑھنے والے کے ادراک کا ہاتھ ان تک پہنچتا ہے۔ اور یہ صورتِ حال وحی اور قرآن کو نازل کرنے کے ساتھ پوری مشابہت رکھتی ہے اس لیے کہ کلام قدسی نے پہلے لوح میں الفاظ کی صورت اختیار کی اس کے بعد جبرئیل علیہ السلام کی وساطت سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خیال کی لوح پر منقش ہوئی اور حضرت سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان حق ترجمان کے ساتھ ہر خاص و عام تک پہنچی۔ اس لیے وحی کے امکان کو ثابت کرنے کے لیے اس نعمت کو لانا

نہایت مناسب ہوا جس طرح قلم کے ذریعے ان چیزوں کو حاصل کرتے ہیں، قوتِ بشری بالکل حاصل نہیں کر سکتی اسی طرح وحی کے ذریعے وہ معلومات حاصل ہوتی ہیں جنہیں حاصل کرنا ناممکن ہے۔ چنانچہ فرمایا جارہا ہے:

عَلَّمَ الْاِنْسَانَ مَالَمْ يَعْلَمْ انسان کو وہ تعلیم دی ہے جسے وہ نہیں جانتا تھا۔

تین اسباب علم کا بیان

اس لیے کہ آدمی میں علم کے اسباب تین چیزیں ہیں۔ پہلی چیز ظاہری اور باطنی حواس سلیمہ جن کی وجہ سے اپنے اندر مسلسل گردش کرنے والی چیزوں کا ادراک کرتا ہے جیسے بھوک پیاس، رضا، ناراضگی، خوف، امن، رنگ، بو، مزہ، آواز، گرمی اور سردی وغیرہ۔

دوسری چیز عقل: جسکی وجہ سے حواس ظاہری اور باطنی سے غائب اشیاء کا ادراک کرتا ہے۔ اور ادراک عقلی تین قسموں سے باہر نہیں ہے اس لیے کہ جس کا ادراک منظور ہے یا تو اس کے سبب کو حواس کے ساتھ دریافت کیا ہے۔ پس برہان لمی کی ترکیب رونما ہوگی۔ مثلاً چاہتا ہے کہ گھر میں دُھواں ہونے کو معلوم کرے اور اس نے اس گھر میں آگ جلنے کو معلوم کرلیا ہو وہاں سراغ لگالے گا کہ گھر میں دُھواں ہوگا اس لیے کہ آگ دھوئیں کا سبب ہے اور سبب مسبب کے بغیر نہیں رہتا۔

یا اس کے سبب کو دریافت کر کے اس کے پائے جانے کا حکم دیتا ہے۔ اور دلیل انی کی ترکیب کرتا ہے مثلاً دُور سے دُھواں معلوم کیا' سراغ لگالیا کہ وہاں آگ بھی ہوگی اس لیے کہ دُھوئیں کا وجود آگ کے بغیر محال ہے۔

یا ایک مسبب سے دوسرے مسبب کی طرف منتقل ہوگا اور اس دلیل کولم اور ان کا مرکب درست کردے گا اس لیے کہ مسبب کا وجود سبب کے بغیر محال ہے اور سبب کا وجود دوسرے مسبب کے وجود کی علت ہے۔ مثلاً کسی جگہ دُھواں دریافت کیا اور آگ کی گرمی سے جو کہ وہاں موجود ہے' سراغ لگا کر یقین کرلیا کہ وہ مکان گرم ہوگا اس لیے کہ دُھواں بغیر آگ کے نہیں ہوتا اور جب وہاں آگ موجود ہوئی' گرمی بھی موجود ہوگی لیکن ان دو اسباب میں ایک کمی ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ ہر شخص کے حواس ہر چیز تک نہیں پہنچتے اور عقل بھی مختلف

اور جدا جدا ہے اور اس کے باوجود اسباب اور مسببات میں سے جو چیز عقل کی نظر سے پوشیدہ ہو اس کے ساتھ دلیل پکڑنے کا طریقہ ممکن نہیں ہے اس لیے علم حاصل کرنے کے لیے ایک اور سبب عطا فرمایا گیا ہے۔

اور وہ تیسرا سبب سچی خبر ہے جس کا اپنے ہم جنسوں سے ان کی محسوس کی ہوئی اور سمجھی ہوئی چیزوں کو سن کر یقین کرے اور مقاصد حاصل کرنے میں کام میں لائے اور چونکہ خبر دینے والا انسان بھی اس شخص کی طرح حواس اور عقل کے دام میں گرفتار ہے' وہ چیزیں جو انسانی حواس اور عقل کی حد سے بالاتر ہیں' انسانی احاطے سے باہر رہ گئیں' ان کی تعلیم وحی نازل کر کے دی گئی کہ علم الٰہی کی وحی عظیم فرشتوں کے واسطے سے انسان تک پہنچے اور کام آئے اور کشف، الہام، ہاتف غیبی اور امورِ غیبیہ کا سامنے آنا جو کہ اہلِ معرفت اور اولیاء اللہ کو انبیاء علیہم السلام کی ارواح کے وسیلے سے اور ان کی پیروی کے طفیل حاصل ہوتا ہے' سب کچھ وحی کے تابع ہے۔

اور چونکہ مَا لَمْ یَعْلَمْ کا معنی یہ ہے کہ قوتِ بشری میں اس کے علم کو حاصل کرنا ممکن نہ ہو تو مَا لَمْ یَعْلَمْ کے ذکر میں لغوی شبہ زائل ہو گیا ورنہ بظاہر مشکل معلوم ہوتا ہے کہ اس لیے کہ تعلیم ہوتی ہی اس چیز کی ہے جو کہ معلوم نہ ہو پس مَا لَمْ یَعْلَمْ کا ذکر کی کیا ضرورت ہے۔

کَلَّا جاننا چاہیے کہ حرف کلا ڈانٹ ڈپٹ کرنے کے لیے لغت عرب میں استعمال کیا جاتا ہے پس اس سے پہلے ایسا کلام چاہیے جس کی طرف یہ ڈانٹ ڈپٹ متوجہ ہو جبکہ یہاں کوئی ایسا کلام جو رد اور باطل کرنے کے لائق ہو' بظاہر مذکور نہیں ہے اسی لیے بعض علماء نے کہا ہے کہ اس جگہ کلا بمعنی حقا ہے اس لیے کہ ڈانٹنے کی صورت میں بھی اس کے خلاف کو تاکید اور پختگی کے ساتھ اس کے ساتھ ثابت کیا جاتا ہے تو اس کلمے کا مفہوم ماسبق کو باطل اور حق کو ثابت کرنے سے مرکب ہے اور مجرد ہونے کی بناء پر اگر صرف تحقیق کے لیے استعمال کریں' جائز ہے لیکن حق یہ ہے کہ اس سے پہلے ایک کلام پوشیدہ ہے جس کی طرف ہر شخص کا ذہن جاتا ہے اور یہاں لفظ کلا لانے سے اس کا رد اور باطل کرنا مقصود ہے۔

اس ابہام کی وضاحت یہ ہے کہ جب بندوں کی نسبت سے حق تعالیٰ کی اکرمیت کو

بیان فرمایا گیا اور ارشاد فرمایا گیا کہ اس کا بے پناہ کرم ہر طرح سے پرورش اور تکمیل کی طرف متوجہ ہے حتیٰ کہ جو چیز ان کی وسعت سے باہر تھی' انہیں اس کی تعلیم قلم کے واسطے دی گئی اور انہیں اس تدبیر کے ساتھ کارخانہ ہائے الوہیت سے آگاہ کیا گیا تا کہ وہ خلافتِ کبریٰ کے حکم کے ساتھ افعالِ ربوبیت کی پیروی کریں اور مخلوقات میں تصرف کریں اور ان میں ظلِ الٰہی اور تصرف ثابت ہو جائے۔ یہاں گنجائش تھی کہ اس کلام کے سننے والے کے دل میں شبہ گزرے اور وہ کہے کہ جب انسان دربارِ خداوندی میں اس قدر معزز اور مکرم ہے تو اسے ضرورت اور محتاجی کے بھنور میں کیوں گرفتار کیا گیا ہے اور اسے ہر مخلوق کے سامنے التجا کرنے والا بنایا گیا اور اسے ضرورت کی وجوہ اس قدر دی گئی ہیں اور دوسرے حیوانات اور مخلوقات کو ان کا سواں حصہ بھی نہیں دیا گیا۔

چنانچہ وہ کھانے میں آگ، چکی اور دوسرے آلات کا محتاج ہے۔ اپنی مرض میں دوا، طبیب، پنساری، جراح، فصد کھولنے والے اور ماہر امراض چشم کا محتاج ہے۔ علیٰ ہذا القیاس پہننے، رہنے اور راہ میں اسے جو ضرورت ہے' بالکل ظاہر ہے۔ جبکہ دوسرے حیوانات کو اس قسم کی ضروریات بالکل نہیں ہیں اور اکرمیت اس معاملے کا تقاضا ہرگز نہیں کرتی اگر اس مخلوق پر انتہائی کرم پیش نظر تھا تو پہلے تو چاہیے تھا کہ اسے مقرب فرشتوں کی طرح محتاجی سے دُور رکھا جاتا اور اگر اسباب خلافت کے حصول اور مخلوقات میں تصرف کی بناء پر اسے محتاج کیا گیا تھا تو چاہیے تھا کہ اسے وافر مال اور بے انتہا خزانے دیئے جاتے تا کہ محتاج نہ رہتا اور ذلیل نہ ہوتا اس شبہ اور اس اعتراض کے رد کے لیے لفظ کلا لایا گیا ہے۔

قرآن مجید میں لفظ کلا والی ہر آیت مکی اور یہ لفظ نصف اوّل میں نہیں ہے

اور اس لفظ کی قرآن مجید میں دو خاصیتیں ہیں: ایک یہ کہ جہاں بھی یہ لفظ وارد ہوا' یقین کے ساتھ جان لینا چاہیے کہ وہ آیت مکی ہے اور یہ لفظ مدینہ منورہ میں بالکل نازل نہیں ہوا ہے۔ اور اس میں راز یہ ہے کہ یہ لفظ انتہائی سختی اور غضب پر دلالت کرتا ہے جبکہ مدینہ منورہ میں مخاطبین ایمان والے صحیح الاعتقاد لوگ تھے اگر کبھی ان سے کوئی فروگزاشت ہو جاتی تو ارشاد و نصیحت کے مقام میں پوری رحمت اور مہربانی کے ساتھ اس خطا کا تدارک فرمایا جاتا'

سختی اور غضب کا کوئی تصور نہ تھا۔ بخلاف مکہ شریف کے مخاطبین کے جو کہ عنادی کافر اور سرکش مخالف تھے' انہیں خطاب کرنے میں سختی اور غضب درکار تھا۔

دوسری خاصیت یہ کہ قرآن پاک کے نصف اوّل میں اس کلمے کا کوئی وجود نہیں جبکہ نصف آخر خصوصاً آخری پاروں میں یہ لفظ بہت زیادہ واقع ہوا ہے اور اس میں راز یہ ہے کہ ابتدا میں سمجھانا اور ہدایت دینا مراد ہے جس کا دارومدار نرمی پر ہے۔ اور جب ایک شخص نصف قرآن پاک تک پڑھتا چلا گیا اور ارشاد و فہمائش سے بالکل درست نہ ہوا تو سختی کے لائق ہوگیا خصوصاً جب قرآن پاک کے آخر تک پہنچ گیا اور اس کے مواعظ اور نصیحتوں سے بالکل بہرہ ور نہ ہوا تو مزید زجر و توبیخ کا مستحق ہوگیا۔ تو کلام پاک کے آخر میں یہ لفظ ضروری ہوگیا اسی لیے جب بے ادبی کا مرتکب کوئی شخص پند و نصیحت کے ساتھ راستے پر نہیں آتا تو تعزیر اور رسوائی کا مستحق قرار پاتا ہے اور ان دو خصوصیتوں کو بیان کرنے کے لیے اہل تفسیر نے ایک بیت کہا ہے جو یہ ہے

وما نزلت کلا بیثرب فاعلمن، ولاجاء فی نصفه الاعلٰی

یعنی مدینہ عالیہ میں کلا کا لفظ نازل نہیں ہوا تو اسے یاد رکھو اور نہ ہی قرآن پاک کے پہلے نصف میں آیا ہے۔

اور جب یہ تمہید معلوم ہوگئی اب آیات کی تفسیر شروع کی جاتی ہے' فرمایا جا رہا ہے:

کَلَّآ مقدمہ یوں نہیں ہے کہ آدمی کی غربت اور احتیاج اللہ تعالیٰ کے کرم کی کمی کی وجہ سے ہے بلکہ اس کا ایک اور سبب ہے اس لیے کہ

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰى تحقیق آدمی خدا اور بندوں پر سرکشی کرتا ہے' اَنْ رَّاٰهُ اسْتَغْنٰى جبکہ اپنے آپ کو مال، مرتبے، صحت، قوت اور لاپرواہی کے دوسرے اسباب کے ساتھ غنی دیکھتا ہے۔ پس اگر اسے بہت سی وجوہ کے ساتھ محتاجی نہ ہو تو اس کی سرکشی اور زیادہ بڑھ جائے اور اس کی اصلاح کی کوئی صورت باقی نہ رہے۔ پس یہ کرم کے کمال کا تقاضا ہے کہ اسے کئی طرفوں کی احتیاج کے ساتھ سرکشی سے باز رکھا گیا ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا گیا ہے وَلَوْ بَسَطَ اللّٰهُ الرِّزْقَ لِعِبَادِهٖ لَبَغَوْا فِی الْاَرْضِ یعنی اگر اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے

لیے رزق کے اسباب کشادہ کردے تو حد سے گزر جائیں اور زمین میں سرکشی کریں حالانکہ آدمی کا یہ عقیدہ بالکل غلط اور بیہودہ ہے' اسے کسی صورت میں بھی اپنے پروردگار سے لاپرواہی کا تصور نہیں ہو سکتا بلکہ

اِنَّ اِلٰی رَبِّكَ الرُّجْعٰی تحقیق تمام حالات میں تیرے پروردگار کی طرف ہی لوٹنا ہے۔ اور ہم اسے ایک مثال دے کر واضح کرتے ہیں۔ مثلاً ایک شخص کو اگر اچھا کھانا میسر آیا اور اس نے معلوم کیا کہ آج مجھے بھوک کی حاجت سے بے پروائی حاصل ہو گئی۔ اس سے پوچھنا چاہیے کہ تجھے کھانے اور چبانے کی قوت کون دے گا؟ اس کے بعد کون ہے جو تجھے قے وغیرہ سے محفوظ رکھے گا؟ اس کے بعد ہاضمے کی قوت، غذا دینا، روکنا، اس غذا کے فضلوں کو بول و براز کی راہ سے دُور کرنا، غذا کو زہر بننے سے روکنا یا ہیضہ کا موجب ہونے سے روکنا کس کی طرف سے ہے؟ اور یہ سب احتیاج کی وجوہ ہیں جو کہ نعمت ملنے اور غنا حاصل ہونے کی حالت میں ہیں۔ اور اس کے بعد جب جسم کی بنیاد کمزور پڑ جائے اور جسم سے روح جدا ہو جائے' ایک اور رجوع آخرت میں رونما ہو۔ سرکشی کے سبب کا سوال کیا جائے اور اس کا انتقام لیں اس وقت جو احتیاج ہے اس کی انتہا نہیں ہے۔

بلکہ اگر عقل مند انصاف کرے اور اپنے دل میں سوچے تو غنا کی حالت میں اپنے آپ کو خدا تعالیٰ کا زیادہ محتاج سمجھے اس لیے کہ فقیر کو تو یہی آرزو ہے کہ اس کی جان سلامت اور جسم درست رہے اور اسے ایک دن کی روزی مل جائے جبکہ دولت مند کو جان، مال، مرتبہ اور اہل و عیال سب کی سلامتی درکار ہے اور اس کی ضرورت کی وجہیں فقیر کی وجوہ ضرورت سے زیادہ ہیں۔

یہاں اکثر لوگوں کے دل میں خیال گزرتا ہے کہ مال سرکشی کا سبب ہوتا ہے۔ بڑے بڑے صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین جو کہ کثیر المال تھے جیسے حضرت عبدالرحمٰن بن عوف، حضرت امیر المومنین عثمان النورین رضی اللہ عنہما اس وجہ سے سرکشی میں کیوں ملوث نہ ہوئے بلکہ حضرت سلیمان علیٰ نبینا وعلیہ الصلوٰۃ والسلام کو دنیوی مال میں اس قدر وسعت اور تونگری کیوں عطا کی گئی کہ آپ نے بیت المقدس کے در و دیوار کو سونے اور جواہرات کے ساتھ

جڑاؤ کیا اور زینت دی اور انہیں بے شمار اسباب اور آلات سے بھی نوازا گیا۔

اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ اس آیت میں مال کو مطلقاً سرکشی کا سبب قرار نہیں دیا گیا بلکہ خود کو مال کے ساتھ غنی سمجھنا اور دربارِ خداوندی میں بندے کو جو محتاجی ہر آن اور ہر حال لاحق ہے اس سے غافل ہونا، مال کے حصول کو اپنی کوشش و کاوش کی طرف منسوب کرنا اور اللہ تعالیٰ کے فضل و عنایت سے نہ سمجھنا سرکشی کا سبب ہے۔ جبکہ حضرت سلیمان علیہ السلام اور صحابہ کبار علیہم رضوان کے پاس اگرچہ مال کی کثرت تو تھی مگر ایسا عقیدہ نہیں تھا بلکہ جو شخص ان بزرگوں کی سیرت کا مطالعہ کرے' یقین کے ساتھ جان لے کہ فقیروں کے ساتھ مل بیٹھنا اور ان کے ساتھ ایثار سے پیش آنا جتنا ان سے صادر ہوتا تھا' دوسروں سے نہیں ہوتا تھا۔ گویا انہوں نے اس معاملے کو مال کی زہر کا تریاق قرار دے کر زیادہ اپنایا ہے۔ اسی لیے حدیث پاک میں وارد ہے کہ نعم المال الصالح للرجل الصالح اچھا مال اچھے آدمی کے پاس کیا ہی بہتر ہے۔

اور جب ثابت ہو گیا کہ آدمی کی محتاجی زیادہ ہونے کی وجہ بھی ہے کہ بے احتیاجی کی صورت میں سرکشی کرتا ہے' اپنے منعم حقیقی سے غافل ہو کر نعمتیں دیکھنے میں غرق ہو جاتا ہے اس گمان کی گنجائش پیدا ہو گئی کہ کوئی لاپرواہی کرنے والوں میں سے کسی کا ایک حال بطور مثال پوچھے کہ اس کی استغناء کس طرح سرکشی کا موجب ہوئی ہے؟ مثال بیان کرنے کے لیے فرمایا جا رہا ہے کہ:

اَرَءَيْتَ الَّذِيْ يَنْهٰى کیا تو نے اس شخص کو دیکھا ہے جو کہ منع کرتا اور روکتا ہے عَبْدًا اِذَا صَلّٰى بندے کو جب نماز ادا کرنا چاہیے حالانکہ بندہ وہ ہے جو کہ دل و زبان' ہاتھ اور پاؤں کے ساتھ اپنے پروردگار کی عبادت کرے اور اس قسم کی جامع عبادت نماز کے سوا اور کوئی نہیں اور خدا تعالیٰ کا حق یہ ہے کہ ہر عبادت کے ساتھ اس کی عبادت کی جائے۔ پس اس شخص نے بندے کا حق بھی ضائع کر دیا اور خدا تعالیٰ کا بھی۔ پس اس کی سرکشی خدا تعالیٰ پر ثابت ہو گئی۔

یہ شخص ابوجہل لعین تھا جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو مسجد حرام میں نماز سے بار بار

روکتا تھا اور کہتا کہ اگر میں نے تمہیں زمین پر پیشانی رکھتے دیکھ لیا تو معاذ اللہ گردن اُڑا دوں گا۔ اور اگرچہ یہ آیت اس لعین کے بارے میں اُتری ہے لیکن جو شخص اللہ تعالیٰ کی اطاعت سے منع کرتا اور روکتا ہے اس وعید اور مذمت میں شامل ہے۔

ایک سوال اور اس کا جواب

اور وہ جو فقہاء نے لکھا ہے کہ غصب کی ہوئی جگہ میں نماز پڑھنے سے روکا جائے اور پانچ مکروہ اوقات میں، طلوع آفتاب کے وقت، غروب آفتاب کے وقت، بالکل زوال کے وقت نماز عصر پڑھنے کے بعد مغرب تک اور طلوع فجر کے بعد طلوع آفتاب تک بھی روکنا چاہیے اور اگر مالک اپنے غلام اور لونڈی کو نمازِ تہجد سے اس لیے روکے کہ شب بیداری کی وجہ سے خدمت میں کوتاہی کریں گے تو اسے حق پہنچتا ہے۔ (اقول وباللہ التوفیق۔ یاد رہے کہ یہ زرخرید غلام اور لونڈی کی بات ہے جو کہ آج ہمارے ہاں بالکل نہیں پائے جاتے اس لیے کوئی زمیندار، سرمایادار وغیرہ ملازموں کو نہیں روک سکتا کیونکہ یہ لوگ ان کے مالک نہیں ہیں۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ) اور اسی طرح خدمت کے وقت نفل نماز سے منع کر سکتا ہے اور خاوند اپنی بیوی کو اعتکاف سے روک سکتا ہے اور نفلی روزے سے بھی اس لیے روزہ کی حالت میں اس سے مباشرت اور دیگر چیزوں کا استفادہ نہیں ہو سکتا۔

تو سب کچھ اس بناء پر ہے کہ یہ روکنا چونکہ دوسری مصلحتوں کے لیے ہے اور اللہ تعالیٰ کی اجازت سے ہے۔ درحقیقت یہ عبادت سے روکنا نہیں ہے بلکہ ایک عبادت سے دوسری عبادت کی طرف منتقل ہونا ہے۔ جبکہ بعض اکابرین ادب کی رعایت کرتے ہوئے اس روکنے سے بھی پرہیز کرتے ہیں اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ حضرت امیر المومنین علی کرم اللہ وجہہ عیدگاہ میں تشریف لائے۔ آپ نے دیکھا کہ کچھ لوگ نمازِ عید سے پہلے نفل پڑھ رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا کہ انہیں یہ بات پہنچادو کہ میں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو یہاں نوافل ادا فرماتے ہوئے نہیں دیکھا ہے۔ وہ لوگ اس اشارے سے اپنے کام سے نہ رُکے۔ لوگوں نے عرض کی یا امیر المومنین انہیں ڈانٹ کر روکنا چاہیے۔ فرمایا میں اس آیت سے ڈرتا ہوں کہ اَرَءَیْتَ الَّذِیْ یَنْهٰی عَبْدًا اِذَا صَلّٰی لیکن اس ادب کی رعایت بھی اسی

طرح کے مقامات میں کرنا چاہیے کہ جہاں صریح نہی وارد نہ ہوئی ہو۔ ورنہ الامر فوق الادب

اور جب استغناء حاصل ہونے کی وجہ سے ہر شخص کے سرکش ہونے کی مثال بیان فرما دی گئی تو اس مرض کے علاج کا طریقہ بھی بیان فرمایا جا رہا ہے کہ:

اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَانَ عَلَی الۡهُدٰۤی اَوۡ اَمَرَ بِالتَّقۡوٰی کیا تو نے اس سرکش کو دیکھا کہ اگر ہدایت پر ہوتا یا لوگوں کو تقوے کا حکم دیتا یعنی اپنی سرکشی کا علاج کرتا اور روحانی صحت حاصل کرتا یا اس سے بھی ترقی کر کے تکمیل وارشاد کے مرتبے کو پہنچ جاتا اور نماز سے روکنے کے بجائے لوگوں کو تقویٰ اور درستی کا حکم دیتا۔

اَرَءَیۡتَ اِنۡ کَذَّبَ وَتَوَلّٰی کیا تو نے اسی سرکش کو دیکھا کہ اس نے دین پیغمبر علیہ الصلوٰۃ والسلام کی تکذیب کی اور راہِ حق پر چلنے سے روگردانی کی' دونوں حالتوں میں جزا پائے گا۔ پہلی حالت میں اچھی جزا اور دوسری حالت میں سزا۔ اور جزا کا لحاظ کرنا سرکشی کا علاج ہے اور اگر اسے جزا واقع ہونے کے متعلق کوئی شک ہو تو اسے سمجھانے کے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ

اَلَمۡ یَعۡلَمۡ بِاَنَّ اللّٰهَ یَرٰی کیا وہ جانتا نہیں کہ حق تعالیٰ اسے دیکھ رہا ہے اور اس کا دیکھنا جو کہ جزا پر قادر ہو اور اس کی حکمت جہان کے ذرات میں سے ہر ذرے میں سورج سے بھی زیادہ ظاہر اور واضح ہے' جزا کا عقیدہ رکھنے کے لیے کافی ہے اس لیے کہ قادر ہونا جزا کے جواز کو چاہتا ہے جبکہ حکمت اور عدل اس کے واجب ہونے کا تقاضا کرتے ہیں اور ہر اچھے بُرے عمل کو دیکھنا نیکوکار اور بدکار کے امتیاز کے لیے کافی ہے پس جو قادر ہونے کے باوجود دیدہ دانستہ نیک اور بد میں فرق نہ کرے اور ہر کسی کو اس کی سزا نہ پہنچائے' وہ ایک گھر کی سرداری کے قابل نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ خدا ہو۔ اور اللہ تعالیٰ کی قدرت اور حکمت ہر کسی پر بالکل ظاہر ہے اور جو پوشیدہ ہے' وہ اس کا بنی آدم کے اچھے بُرے اعمال پر مطلع ہونا ہے کہ آدمی کی بصیرت کی نگاہ پر شہوت اور غضب اور جہل مرکب کی جہیں جما کر اسے اس اطلاع سے غافل کر دیا جاتا ہے۔ ناچار اسی اطلاع کے ذکر پر کفایت کی گئی۔

كَلَّا مقدمہ یوں نہیں ہے کہ اسے بے مقصد چھوڑ دیا جائے اور اس کی دنیوی عزت اور مرتبہ کا لحاظ کرتے ہوئے درگذر کی جائے۔ لَئِنْ لَّمْ يَنْتَهِ اگر اس ڈانٹ ڈپٹ کے ساتھ سرکشی سے باز نہ آئے۔

لَنَسْفَعًا بِالنَّاصِيَةِ تحقیق ہم اسے اس کی پیشانی کے بالوں سے ضرور کھینچیں گے جو کہ انتہائی ذلیل وخوار کرنا ہے کیونکہ انسانی جسم کے اعضاء میں سب سے زیادہ معزز ہے۔ اسی لیے تعظیم کے موقع پر بادشاہوں اور دولت مندوں کے سر کی قسم کا رواج اور معمول ہے۔ اور جب اسے اس قدر ذلیل کریں تو انتہائی ذلت ہوگی اور پیشانی کو خاص کرنے میں ایک اور نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ آدمی میں سرکشی کا سبب اسی عضو کے حوالے کیا گیا ہے۔ اس لیے کہ ظاہری حواس خمسہ۔ وہم اور خیال جو کہ تکبر اور سرکشی کا سرمایہ ہے اسی عضو میں اور اس کے پڑوس میں رکھے گئے ہیں۔ نیز سرکشی کا لفظ بھی اس عضو کی شرارت کا پتہ دیتا ہے۔ پس اسے اس عضو کے ساتھ سزا دی جارہی ہے جیسا کہ چور کے لیے ہاتھ کاٹنے کی سزا مقرر کی گئی ہے اس لیے کہ چوری کا آلہ وہی ہے۔

نَاصِيَةٍ كَاذِبَةٍ خَاطِئَةٍ وہ پیشانی جو کہ جھوٹی اور خطا کار ہے۔ یعنی سرکشی کی حالت میں اس پیشانی کے بعض اجزاء اور ان قوتوں کے ساتھ جو کہ اس پیشانی میں سپرد کی گئی ہیں، جھوٹی لافیں مارتا اور بے دریغ گناہ کرتا تھا۔ کبھی مسکینوں اور عاجزوں کو حقارت کی نظر سے دیکھتا، کبھی اس حرکت پر پیشانی پر بل ڈال کر بیٹھتا جو اس کی مرضی کے خلاف ہوتی۔ اور کبھی حقیر سمجھنے اور مذاق کرنے کے موقع پر سر ہلاتا تو یہ پیشانی اسی لائق ہے کہ اسے اس قدر ذلیل کیا جائے اور پیشانی کے جن بالوں کو بڑی آب وتاب کے ساتھ رکھتا، کنگھی کرتا اور خوشبودار تیل لگاتا تھا، انہیں پکڑ کر خاک میں ملا کر کھینچا جائے۔

اور مفسرین نے لکھا ہے کہ خاطی، مخطی سے بدتر ہے اس لیے کہ لغتِ عرب میں خاطی اسے کہتے ہیں جو جان بوجھ کر گناہ کرے جبکہ مخطی وہ ہے جو عمداً نافرمانی نہ کرے اسی لیے خاطی کے لیے قرآن مجید میں انتہائی شدید عذاب کا وعدہ کیا گیا ہے۔

اور وہ غسلین کھانا ہے' غسلین جہنمیوں کی پیپ ہے جو کہ گرمی کی وجہ سے ان کا گوشت اور چربی جلنے کی بناء پر نکلے گی۔ اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا مِنْ غِسْلِيْنَ لَا يَاْكُلُهٗٓ اِلَّا الْخَاطِئُوْنَ جبکہ مخطی کے لیے عفو و درگزر کا وعدہ ہے رَبَّنَا لَا تُؤَاخِذْنَآ اِنْ نَّسِيْنَآ اَوْ اَخْطَاْنَا

اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ جب یہ آیات نازل ہوئیں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے لوگوں کے سامنے ان کی تلاوت فرمائی۔ ہوتے ہوتے بات ابوجہل لعین تک جا پہنچی۔ اس نے غصے میں آ کر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ سختی کرنا شروع کر دی اور کہنے لگا کہ کچھ پتہ ہے کس کو ڈرا رہے ہو؟ اگر میں چاہوں تو یہ سارا صحرا سواروں اور پیادوں سے بھر دوں۔ لیکن تمہارے لیے اور تمہاری قوم کے لیے تو وہی لوگ کافی ہیں جو کہ ہر روز صبح و شام میرے دربار میں حاضری دیتے ہیں اگر میں انہیں بلا لوں تو تم پر اس کی حقیقت کھل جائے۔ اس ملعون کے جواب میں میں ایک اور آیت آئی کہ

فَلْيَدْعُ نَادِيَهٗ پس چاہیے کہ وہ اپنی محفل والوں کو بلا لے یعنی جو لوگ صبح شام اس کی محفل میں حاضر آتے ہیں' موت کو روکنے' روحیں قبض کرنے والے کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی فوج اور لشکر سے مدد حاصل کرے اس لیے کہ ہم بھی اس کے مقابلے کے لیے اپنے حقیر بندوں کو بھیج دیں گے۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے:

سَنَدْعُ الزَّبَانِيَةَ ہم جلد ہی زبانیہ کو بلا لیں گے۔ اور اصل لغتِ عرب میں زبانیہ جیل کے ان سپاہیوں کو کہتے ہیں جو کہ لوگوں کے کندھے باندھ کر انہیں جیل میں ڈالتے ہیں اور یہاں وہ فرشتے مراد ہیں جو کہ دوزخ پر مقرر ہیں اور وہ لوگوں کے ہاتھ پاؤں باندھ کر دوزخ میں ڈالیں گے۔ اس جیل میں ابوجہل لعین کے لیے اس وعید کے مطابق ہی اتفاق ہوا کہ بدر کے دن مارا گیا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حکم پر مسلمانوں نے اسے پیشانی کے بالوں سے کھینچ کر ناپاک گڑھے میں ڈال دیا۔ اس کے کان میں سوراخ کر کے اس میں رسی ڈال کر اس کی قتل گاہ سے گڑھے تک کھینچ کر لے گئے اس کے مرتے ہی اس کی روح کو دوزخ پر مقرر فرشتوں نے کھینچ کر جہنم رسید کر دیا

اس کے ساتھیوں اور ہم مجلسوں میں سے کوئی بھی اس مشکل وقت میں اس کے کام نہ آیا۔

اور زبانیہ کی تعداد کے متعلق قرآن پاک میں دوسرے مقام پر جو کچھ آیا ہے یہ ہے کہ کفار میں سے ہر ایک کے لیے انیس (۱۹) افراد مقرر ہیں جو کہ اسے پکڑ کر دوزخ میں ڈالتے ہیں۔ انیس (۱۹) کی تخصیص کی وجہ سورۂ مدثر کی تفسیر میں مذکور ہے۔

جہنم کے موکلوں کے اوصاف کا بیان

اور بعض روایات میں وارد ہوا کہ ان کا جسم اس قدر کھلا اور وسیع ہے کہ ان کے پاؤں زمین میں اور سر آسمان تک پہنچتے ہیں' ان کے سردار کا نام مالک ہے' اٹھارا (۱۸) اور ہیں جن کی آنکھیں بجلی کی طرح چمکتی ہیں' ان کے دانت بارہ سنگے کے سینگوں کی طرح پیچ در پیچ' ان کے جسم کے بال اس حد تک لمبے ہیں کہ زمین پر کھنچتے چلے جاتے ہیں' ان کے منہ سے آگ کے شعلے نکلتے ہیں' ان کے دونوں کندھوں کے درمیان ایک سال کا فاصلہ ہے' ان میں ہر ایک کے ہاتھ کی ہتھیلی میں ستر (۷۰) ہزار افراد کی گنجائش ہے۔

اور لفظ زبانیہ کی تحقیق میں اختلاف ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ یہ جمع کا صیغہ ہے جس کا مفرد نہیں ہے۔ بعض کہتے کہ اس کا مفرد زبنیت ہے جیسا کہ عفریت یہ زبن سے مشتق ہے جس کا معنی دفع کرنا ہے اور زبنیت ہر سرکش کو کہتے ہیں' انسانوں سے ہو یا جنات سے۔

اور جب اس سرکش کے حال اور انجام کے بیان سے فراغت ہوئی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اس لعین کی مخالفت کا حوصلہ دِلایا گیا اور فرمایا گیا کہ کَلَّا اس سے مت ڈریں اور اس کے ڈرانے کو کسی گنتی میں نہ لائیں۔

لَاتُطِعْهُ اس کی اطاعت نہ کریں۔ وَاسْجُدْ وَاقْتَرِبْ اللہ تعالیٰ کے حضور سجدہ کریں اور سجدے کی عبادت سے اس کے دربار میں قرب حاصل کریں۔ اور اگرچہ وہ لعین ساری نماز سے ہی روکتا تھا لیکن وہ سجدہ کرنے پر زیادہ سختی کرتا تھا اس لیے کہ ارکان نماز میں سے سجدہ تکبر اور سرکشی کے بہت زیادہ منافی ہے۔ اس کے مزاج پر اس خلق بد کا بہت غلبہ تھا اس لیے یہ حرکت اس کی طبیعت کے بالمقابل مطابق نہ تھی۔ خود سجدہ کرنے کا

کیا امکان دوسرں سے دیکھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اس بناء پر اس کی مخالفت کے مقام میں سجدے کا حکم دیا گیا تا کہ اس کی ناک خاک آلود ہو۔

نیز جب اس ملعون کو تکبر اور سرکشی کی جزا میں پیشانی کے بالوں سے کھینچنے سے ڈرایا گیا' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو شکریہ کے طور پر اس بات کی دلالت کی گئی کہ آپ عاجزی کے ساتھ اپنی پیشانی کو ہمارے حضور خاک پر رکھیں کہ ہم نے آپ کے دشمن کی پیشانی کو آپ کے انتقام کے لیے مٹی میں ملا دیا۔

نیز جب سجدہ قربِ خداوندی کے حصول کا باعث ہے' حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو اس کا حکم دیا گیا اور ارشاد ہوا کہ آپ سجدہ میں مشغول ہوں تا کہ بارگاہِ خداوندی میں آپ کو پورا قرب حاصل ہو اور آپ کا کمال سر بلند ہو اور آپ کا دشمن خود بخود مغلوب اور ذلیل ہو اس لیے کہ بارگاہِ خداوندی میں آپ کا قرب جس قدر بڑھے گا' آپ کے دشمن اسی قدر مغلوب ہوں گے۔

حالت سجدہ میں قرب کی زیادتی کی وجہ

اور سجدہ کی حالت میں قرب کی زیادتی کی وجہ یہ ہے کہ اس حالت میں آدمی اپنی اصل کی طرف متوجہ ہوتا ہے جو کہ خاک ہے۔ اپنی اصل کی طرف توجہ جتنی زیادہ ہو گی قربِ خداوندی اتنا ہی زیادہ حاصل ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اس دربار سے وجود کا فیض اسی راہ سے پہنچا ہے۔ خود کو پھر اسی دروازے پر جہاں سے آیا تھا' پہنچاتا ہے اور رجوع الی اللہ کا دروازہ کھٹکھٹاتا ہے اسی لیے حدیث شریف میں وارد ہے کہ اقرب مایکون العبد من ربه وهوساجد فاكثروا فيه من الدعآء یعنی سجدے کی حالت میں بندے کو اپنے پروردگار کے حضور انتہائی نزدیکی اور قرب حاصل ہوتا ہے کہ پس اس حالت میں دعا بہت زیادہ دعا کرنا چاہیے تا کہ قبول ہو۔

اور یہ آیت سجدہ تلاوت کی آیات میں سے ہے' اسے پڑھنے سے پڑھنے والے اور سننے والے پر سجدہ واجب ہو جاتا ہے اور صحیح حدیث پاک میں وارد ہے کہ ابوجہل نے لوگوں سے کہہ رکھا تھا کہ جب بھی محمد (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کعبہ کے

سامنے آئیں اور سجدہ کریں، مجھے خبر دینا تا کہ (معاذ اللہ) میں گردن پر پاؤں رکھوں اور اسے قتل کر دوں۔ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم خانہ کعبہ کے سامنے نماز میں کھڑے تھے کہ اس بد بخت کو کسی نے خبر دے دی، وہ وعدے کے مطابق آیا جب حضور علیہ الصلوٰۃ و السلام کے قریب پہنچا تو پچھلے پاؤں لوٹا اور اپنے دونوں ہاتھوں کو ڈھال بنا کر گویا کسی چیز سے بچ رہا ہے۔ یہاں تک کہ دو تین بار ایسا ہی واقعہ پیش آیا اور وہ واپس چلا گیا۔ جو لوگ یہ واقعہ دیکھنے کے لیے جمع ہوئے تھے، انہوں نے اس سے پوچھا کہ تجھے کیا ہو گیا کہ تو واپس لوٹ آیا؟ اس نے کہا کہ میرے اور محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے درمیان ایک آتشیں خندق پیدا ہو گئی تھی۔ اس خندق کے کنارے فرشتوں کے پر نظر آ رہے تھے، مجھے شدید خوف محسوس ہو رہا تھا اور ایک بہت بڑا اژدہا میری طرف قصد کر رہا تھا اگر میں واپس نہ ہوتا تو جل جاتا اور اژدہا مجھے ہلاک کر دیتا، ناچار مجھے لوٹنا پڑا۔ لوگوں نے پوچھا کہ یہ کیا حالت تھی؟ بولا کہ یہ شخص ایک زبردست جادوگر ہے، میں اس پر غالب نہیں آ سکتا۔

نیز حدیث شریف میں وارد ہے کہ اس واقعہ کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ اگر یہ لعین میرے نزدیک آتا تو فرشتے اس کے پرخچے اُڑا دیتے اور وہ باقی نہ رہتا۔

سورۃ اقرء کے فوائد و نکات کا بیان

اور اس سورۃ سے متعلق فوائد اور نکات میں سے ایک یہ ہے کہ اس سورۃ کی پانچ آیات نزولِ قرآن کی ابتدا میں اُتریں جبکہ باقی آیات کافی عرصے کے بعد ابو جہل کے بارے میں نازل ہوئیں لیکن رب العزت کے حکم سے ان آیات کو گزشتہ آیات کے ساتھ ایک جگہ کر دیا گیا اور مناسبت کی وجہ دوران تفسیر بیان کی جا چکی ہے۔

نیز اس سورۃ میں اُن سَبْعِیْ عُلُوْمْ کو ثابت کرنے کی طرف اشارہ ہے جو کہ نقل اور کتابت پر موقوف ہیں۔

نیز اس سورۃ میں ایک عجیب نکتہ ہے اس لیے کہ اس سورۃ کا پہلا حصہ فضیلت

علم پر دلالت کرتا ہے جبکہ باقی حصہ مال کی مذمت پر مبنی ہے تو یہاں سے اس بات کا سراغ لگانا چاہیے کہ علم ایک چیز ہے جو کہ مرغوب ہے جبکہ دنیا کا مال نفرت اور بے رغبتی کے قابل ہے۔

نیز اس سورۃ میں جہاں علم اور لکھنے کی تعلیم کی نعمت کا ذکر کیا گیا ہے وہاں ذاتِ حق کو صفتِ اکرم کے ساتھ موصوف کیا گیا ہے کہ وربك الاکرم جبکہ سورۃ الانفطار میں جہاں تخلیق اور ظاہری باطنی اعضاء کو معتدل کرنے کا ذکر فرمایا گیا ہے' کریم کی صفت لائی گئی ہے کہ مَا غَرَّكَ بِرَبِّكَ الْكَرِيْمِ الَّذِيْ خَلَقَكَ فَسَوّٰكَ فَعَدَلَكَ فِيْٓ اَيِّ صُوْرَةٍ مَّا شَآءَ رَكَّبَكَ ظاہر ہے کہ اکرم بہت زیادہ کریم کو کہتے ہیں جبکہ کریم صرف کرم پر دلالت کرتا ہے۔ یہاں سے معلوم ہوا کہ نعمت علم صحت' حسن اور جمال کی نعمت سے بہت زیادہ ہے۔

نیز اس سورۃ میں اس اُمت کے فرعون ابوجہل کے بارے میں لَيَطْغٰى فرمایا گیا جو کہ لام تاکید سے موکد ہے اس کا صیغہ استمرار تجددی کا صیغہ ہے جبکہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے فرعون کے بارے میں اس کی سلطنت' عزت اور مرتبہ کے کمال کے باوجود دوسرے مقام پر تاکید استمرار کے بغیر لفظ طغیٰ فرمایا گیا ہے جو کہ اس بات کا اشارہ ہے کہ فرعون اس قدر کمال اقتدار کے باوجود حضرت موسیٰ علیہ السلام کو صرف باتوں اور ظاہری کلام کے ساتھ ہی ستاتا تھا جبکہ اس لعین نے اپنے مرتبے کی کمی کے باوجود بارہا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے قتل کا قصد کر کے معاذ اللہ ختم کرنا چاہا۔

نیز فرعون نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ساتھ ان کی ابتدائی عمر میں اچھا سلوک کیا تھا اور آخر میں اس کی زبان سے یہ کلمہ نکلا لَآ اِلٰهَ اِلَّا الَّذِيْٓ اٰمَنَتْ بِهٖ بَنُوْٓا اِسْرَآءِيْلَ اس کے تکبر میں قدرے کمی ہوئی۔ بخلاف ابوجہل لعین کے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بچپنے سے ہی آپ کے ساتھ حسد کرتا تھا آخری لمحات میں بھی تکبر کے الفاظ کہہ کر واصل جہنم ہوا کہ لو غيرك قتلني یعنی میرا مرتبہ یہ نہ تھا کہ میں مدینہ کے مزارعین کے ہاتھوں مارا جاؤں۔

نیز جب حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ اس کا سر کاٹنے کے لیے اس کے سینے پر بیٹھے تو اس نے متکبرانہ لہجے میں کہا کہ یاداعی انعنم لقدارتقیت مرتقی صعبا اے بکریوں کے چرواہے! تو بہت اونچے مقام پر بیٹھا ہے۔ نیز اس نے کہا کہ ھل اعمدمن رجل قتلتموہ یعنی جسے تم نے قتل کیا ہے اس سے کوئی اور اونچا آدمی جہان میں ہے؟ پس ان وجوہ کی بناء پر اس کی سرکشی اور تکبر فرعون کے تکبر سے زیادہ ہوا اور تاکید کے اس لفظ کا مستحق ہوا۔ واللہ تعالیٰ اعلم

سورۂ قدر

مشہور ہے کہ مکی ہے لیکن اس کے نزول کے سبب میں جو واقعات مفسرین بیان کرتے ہیں' وہ دلالت کرتے ہیں کہ مدنی ہوگی اس لیے بنی اسرائیل کے واقعات مدینہ شریف میں ذکر کیے جاتے تھے اور منبر بھی اس شہر کریم میں بنایا گیا۔ اس سورۃ میں پانچ (۵) آیات' تیس (۳۰) کلمات اور ایک سو بارہ (۱۱۲) حروف ہیں۔

سبب نزول

اس کے نزول کا سبب چند چیزیں ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم صحابہ کرام کے پاس بنی اسرائیل کے حالات بیان فرما رہے تھے۔ اسی دوران آپ نے شمعون یا سمنون نامی ایک زاہد کا ذکر فرمایا جو کہ بنی اسرائیل میں ہو گزرا ہے اور عبادت کی کثرت میں اس کی مثال بیان کی جاتی ہے کہ وہ ہزار ماہ تک عبادت میں مصروف رہا' ہر روز روزہ رکھتا اور کفار کے ساتھ جہاد کرتا اور رات کو نماز ادا کرتا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہما نے عرض کی کہ یارسول اللہ ہم اس قسم کے آدمی کے ثواب تک کیسے پہنچ سکتے ہیں کہ ہماری سب کی عمریں ساٹھ (۶۰) سے ستر (۷۰) سال تک ہوتی ہیں۔ اس عمر کا ایک حصہ جو اس کا ایک تہائی ہوگا' ہم سو کر گزارتے ہیں۔ ایک حصہ اپنی روزی کے اسباب کھانے پینے اور دوسری ضرورتوں میں صرف کرتے ہیں' ایک حصہ بیماریوں' سستی اور کاہلی میں ضائع ہو جاتا ہے' عبادت اور طاعت کے لیے کیا کچھ بچتا ہے۔ سرکار علیہ

الصلوٰۃ والسلام بھی باتیں سُن کر ایک گونہ متفکر ہوئے۔ حق تعالیٰ نے یہ سورت بھیجی۔ یعنی گرچہ تمہاری عمریں چھوٹی ہیں لیکن ہم نے تمہیں ایک ایسی رات عطا فرمائی ہے جس کی عبادت ہزار مہینوں کی عبادت سے بہتر ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ ایک دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو آپ کی اُمت کی عمریں دِکھائی گئیں جو کہ زیادہ تر ساٹھ (۶۰) اور ستر (۷۰) کے درمیان تھیں' حضور علیہ السلام نے غم ناک ہو کر فرمایا کہ اتنی عمر میں میری اُمت کیا کر سکے گی' کہیں ایسا نہ ہو کہ قیامت کے دن پہلی اُمتیں طویل عمروں کی عبادتوں کا ثواب پائیں اور میری اُمت اپنی قلیل عبادات کی وجہ سے شرمندہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب مقدس کی تسلی کے لیے یہ سورت بھیجی۔

تیسری چیز یہ ہے کہ حضرت امام حسن علیہ السلام نے فرمایا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دکھایا گیا کہ بنی اُمیہ کے ظالم لوگ آپ کے منبر پر یکے بعد دیگرے بندروں کی طرح کود کر بیٹھ جائیں گے اور رعایا پر ظلم و ستم کریں گے' آپ پر یہ امر بہت شاق ہوا۔ آپ کی تسلی کے لیے یہ سورۃ نازل ہوئی۔ ہزار ماہ سے مراد بنی اُمیہ کی سلطنت کی مدت ہے کہ ان کی بادشاہی کا زمانہ اسی قدر تھا۔ (۴۰ھ سے ۱۳۲ھ تک بنو اُمیہ کی حکومت رہی جسکی مجموعی مدت بانوے (۹۲) برس ہوتی ہے۔ جبکہ ہزار ماہ کے کچھ اوپر تراسی (۸۳) سال بنتے ہیں۔ نیز اس روایت کی صحت میں اختلاف ہے۔ فتدبر)۔

وجہ تسمیہ

اور اس سورۃ کو سورۃ القدر اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں لیلۃ القدر کا ذکر ہے۔

لیلۃ القدر کی وجہ تسمیہ

اور لیلۃ القدر کو اس نام سے منسوب کرنے کی دو وجہیں ہیں: پہلی وجہ یہ ہے کہ قدر بمعنی مقدار اور رُتبہ کے ہے۔ اس رات میں بنی آدم کے صلحاء اور عبادت گزاروں میں سے ہر ایک کا رُتبہ ظاہر ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے حضور ان کے کمائے ہوئے درجات قرب ثابت ہو جاتے ہیں۔ گویا پورے سال کی عبادت کا نتیجہ ظاہر ہوتا ہے۔ فرشتے اور ارواح

ہر کسی کے مقام اور منصب کو معلوم کر لیتے ہیں اور اطلاع پاتے ہیں۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ قدر بمعنی بزرگی ہے جیسا کہ کہتے ہیں کہ فلاں قدر والہ یعنی بزرگی والا ہے۔

شب قدر کی بزرگی کی چند وجوہ

اور یہ رات چند وجوہ کی بناء پر دوسری راتوں پر شرف اور مرتبہ رکھتی ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس رات میں شام سے صبح تک تجلی الٰہی کی توجہ بندوں کی طرف ہوتی ہے' انہیں دربارِ خداوندی میں قرب معنوی حاصل ہوتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ فرشتے اور ارواح نیکوں اور عبادت گزاروں کی ملاقات کے لیے آسمان سے زمین پر آتے ہیں' ان کی حاضری اور اجتماع کی وجہ سے عبادات کی کیفیت اور نیکیوں کی لذت دوسری راتوں کی عبادات کی کیفیت سے ہزاروں مرتبہ زیادہ ہو جاتی ہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک کا نزول اسی رات میں واقع ہوا اور یہ ایسا شرف ہے جس کی انتہا نہیں ہے۔

چوتھی وجہ یہ ہے کہ فرشتوں کی تخلیق بھی اسی رات میں ہے۔ پانچویں وجہ یہ ہے کہ بہشت کے باغ میں پودے اسی رات میں لگائے جاتے ہیں۔ چھٹی وجہ یہ ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی پیدائش کا مادہ جمع فرمانا بھی اسی رات میں ہے۔

اور صحیح روایت میں آیا ہے کہ حضرت عثمان بن العاص رضی اللہ عنہ کا ایک غلام تھا جس نے کئی سال جہازوں کی ملاحی میں گزارے تھے۔ ایک دن آپ سے کہنے لگا کہ میں سمندر کے عجائبات میں ایک چیز کا تجربہ رکھتا ہوں جس میں میری عقل حیران ہے۔ سال کی ایک رات سمندر کا پانی میٹھا ہو جاتا ہے۔ حضرت عثمان بن العاص رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جب وہ رات آئے تو مجھے مطلع کرنا تاکہ میں دیکھوں کہ وہ کون سی رات ہے اس میں کیا بزرگی ہے۔ اس غلام نے رمضان پاک کی ستائیسویں رات کو آپ سے کہا کہ یہ وہی رات ہے۔

حاصلِ کلام یہ کہ اس سورۃ کے مضمون سے معلوم ہوتا ہے کہ نیک اوقات' متبرک مقامات اور نیکوں کی حاضری اور اجتماع کی وجہ سے عبادات اور طاعات کے لیے اجر وثواب اور برکات وانوار عطا کرنے میں عظیم برتری حاصل ہوتی ہے۔ نیز معلوم ہوتا ہے کہ ہماری عبادات اور نیکیوں کا اجر مشقت اور تکلیف کے اندازے پر رکھنا اس صورت میں ہے جب اس فضیلت کے اعتبار سے برابر ہوں۔ چنانچہ فرمایا گیا ہے کہ اجرك علی قدر نصبك یعنی تیرا اجر تیری تکلیف کے مطابق ہے لیکن چونکہ ان فضیلتوں کے ساتھ درجات میں فرق پڑ جاتا ہے پس نیکیوں کا ثواب، رنج ومشقت کے اندازے پر نہیں ہے۔ فضیلت والے وقت' متبرک مقامات اور نورانی اجتماع میں چند لحوں کا ثواب بے شمار نیکیوں سے بہتر اور زیادہ روشن ہو جاتا ہے۔

لیلۃ القدر کو مخفی رکھنے کی حکمت

نیز جاننا چاہیے کہ اس عظمت اور بزرگی کے باوجود لیلۃ القدر کو لوگوں کی دانست سے مخفی رکھا گیا ہے جیسا کہ جمعہ کے دن میں دعا کی قبولیت کی گھڑی' پانچ نمازوں کے درمیان نماز وسطیٰ' اسمائے الٰہی کے درمیان اسم اعظم' نیکیوں کے درمیان مقبول نیکیاں اور لوگوں کے درمیان ولی اللہ کو مخفی رکھا گیا تاکہ جستجو میں رہیں اور ساری راتوں' ساری نیکیوں' ساری نمازوں' تمام اسمائے حسنیٰ اور تمام نیکوں کی قدر کریں۔

نیز اس متبرک رات کو چھپانے کی حکمت موت کا وقت اور قیامت کا دن مخفی رکھنے کی حکمت کی مانند ہے تاکہ مسلمان کدو کاوش میں کوتاہی نہ کریں' اعتماد نہ کریں اور غفلت اور سستی کو جائز قرار نہ دیں۔

نیز مفسرین نے فرمایا ہے کہ اگر شب قدر عام لوگوں پر ظاہر ہوتی تو اس رات کا کچھ حصہ طاعت میں گزارتے اور ہزار مہینوں کا ثواب حاصل کرتے اور کچھ وقت شہوت کی وجہ سے نافرمانی میں بسر کرتے اور ہزار مہینوں کا عذاب حاصل کرتے۔ اللہ تعالیٰ کی رحمت نے تقاضا فرمایا کہ لوگ معین طور پر اس رات کو نہ جانیں تاکہ اس نافرمانی کی وجہ سے جو کہ اس رات میں دیدہ و دانستہ کریں اس کئی گنا عذاب سے بچے رہیں اور اگرچہ

اس رات میں بعض لوگوں کو ثواب عظیم نصیب ہوتا لیکن نقصان دور کرنا نفع حاصل کرنے سے زیادہ بہتر ہے۔(اقول وباللہ التوفیق- یہاں سے معلوم ہوا کہ خواص اس رات کو جانتے اور پہچانتے ہیں تو پھر اخص الخواص کا کیا کہنا پھر سید الخلق علی الاطلاق صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا علم شریف تو بہت وسعتیں رکھتا ہے۔ چنانچہ شیخ عبدالرحمٰن الصفوری فرماتے ہیں کہ میں نے اپنے والد محترم رحمتہ اللہ کے قلم سے شیخ ابوالحسن رحمتہ اللہ کا قول لکھا دیکھا' آپ فرماتے ہیں منذ بلغت مافاتتني رؤية ليلة القدر جب سے میں بالغ ہوا ہوں' مجھ سے لیلتہ القدر کا مشاہدہ فوت نہیں ہوا)

شب قدر اور شب برأت کا فرق

نیز جاننا چاہیے کہ بعض مفسرین نے قدر کو تقدیر کے معنوں میں لیا ہے' انہوں نے کہا ہے کہ اس رات میں رزق' عمروں' مصیبتوں' بیماریوں' اعمال اور عالم کون وفساد کے دوسرے حادثوں کو مقدر فرمایا جاتا ہے۔ لوحِ محفوظ سے فرشتوں کو ان سے متعلقہ امور کے نسخے نقل کر کے حوالے کیے جاتے ہیں تا کہ اس کے مطابق پورا سال عمل کریں۔ لیکن زیادہ صحیح یہ ہے کہ یہ تقدیر شعبان کی پندرہویں رات میں ہے جسے شب برأت کہتے ہیں۔ اگرچہ بعض تابعین نے یوں فرمایا ہے کہ نسخوں کی نقل اس رات میں شروع ہوتی ہے اور اس رات میں اہل کاروں کے سپرد کرتے ہیں تو تقدیر کی ابتدا شب برأت میں ہے اور اس کی انتہا اس رات یعنی شب قدر میں تحقیق وہی ہے جو کہ ذکر کی گئی۔

شب قدر کے تعین میں اختلاف اور ستائیسویں (۲۷) شب کی ترجیح

اور شب قدر کے تعین میں بہت سا اختلاف ہے جو کچھ قرآن مجید سے معلوم ہوتا ہے اسی قدر ہے کہ وہ بابرکت رات رمضان شریف میں ہے اس لیے کہ یہاں قرآن پاک کا نزول اس رات میں فرمایا گیا ہے اس رات میں عبادات' طاعات کی قدر اور اللہ تعالیٰ کے حضور ہر قرب حاصل کرنے والے کا منصب اور مرتبہ عالم ملائکہ اور ارواح پر ظاہر ہوتا ہے۔ اسی لیے اسے لیلتہ القدر کہتے ہیں۔ جبکہ سورۂ بقرہ' دوسرے پارے میں ارشاد فرمایا گیا ہے کہ قرآن پاک کا نزول ماہ رمضان میں ہوا تو ان دونوں ارشادات کے

مجموعے سے جو ثابت ہوتا ہے اسی قدر ہے۔

اور یہ احتمال کہ شب قدر سارے سال میں گردش کرتی ہے اور نزولِ قرآن کے سال اتفاقاً ماہِ رمضان میں واقع ہوئی ہو' حقیقت سے بہت دُور ہے۔

لیکن احادیث صحیحہ شہورہ کے رو سے ثابت ہوتا ہے کہ وہ رات ماہِ رمضان کے آخری عشرہ کی طاق راتوں میں ہے۔ پس پورے سال پانچ راتیں اس کا احتمال رکھتی ہیں کہ شب قدر ہوں۔ اکیسویں' (۲۱) تیئسویں (۲۳) ' پچیسویں (۲۵)' ستائیسویں (۲۷) اور انتیسویں (۲۹) شب اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ کسی تعین کے بغیر ان راتوں میں سے ایک رات شبِ قدر ہوتی ہے۔ پس کسی سال میں اکیسویں (۲۱) دوسرے میں تیئسویں ۲۳) علیٰ ہذا القیاس

اور وہ جو مشہور ہے کہ ستائیسویں (۲۷) شب ہے تو اس بناء پر ہے کہ اس کا اکثر وقوع ستائیسویں (۲۷) رات کو ہوتا ہے۔ اسی لیے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ لیلۃ القدر کے نو (۹) حروف ہیں اور یہ لفظ اس سورۃ میں تین بار ذکر کیا گیا ہے اور جب تین کو نو میں ضرب دیں تو ستائیس (۲۷) ہوتے ہیں۔ نیز بعض علماء نے فرمایا ہے کہ اس سورۃ کے تیس (۳۰) کلمات ہیں اور ان میں سے ستائیسواں کلمہ لفظ ہی ہے جو کہ شب قدر کی طرف لوٹتا ہے یہ ستائیس (۲۷) کے عدد کی طرف اشارہ ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَنْزَلْنٰهُ فِيْ لَيْلَةِ الْقَدْرِ تحقیق ہم نے قرآن پاک لوحِ محفوظ سے آسمان دنیا پر شب قدر میں نازل فرمایا یعنی وہ رات جس میں عبادت کرنے والوں کی قدر اور مرتبے کا ظہور ہوتا ہے' ان کی ولایتوں کے درجات عالمِ ملکوت اور عالمِ ارواح کے نزدیک واضح ہوتے ہیں اس رات میں قطبیت' غوثیت' ابدالیت اور امامت کے عہدے ان کے مستحقوں کے لیے مقرر کیے جاتے ہیں۔

(اقول و باللہ التوفیق- اس سے نجدی عبرت حاصل کریں جو کہ قطبیت و غوثیت کا نام بھی معاذ اللہ ناجائز قرار دیتے ہیں۔ حضرت شاہ صاحب قدس سرہ کی مندرجہ وضاحت کے مطابق شب قدر میں یہ عہدے بندوں میں تقسیم ہوتے ہیں بلکہ یہ عرفانِ

خداوندی کا تقاضا ہے۔ دیکھئے حضرت مفسر علام قدس سرہ کی بھی تفسیر زیر آیت اِیَّاکَ نَسْتَعِیْنُ۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اور اس واقعہ کو رات کے ساتھ اس لیے مخصوص فرمایا گیا کہ دن ظہور کا وقت ہے پس وہ عالمِ شہادت کے مشابہ ہے جبکہ رات پوشیدہ ہونے اور چھپنے کا وقت ہے پس جہانِ غیب کے ساتھ پوری مشابہت رکھتا ہے۔ جیسا کہ بعض عارفین سے معلوم ہوا ہے اس کے مطابق اس رات کا راز یہ ہے کہ یہ رات وصل کی رات ہے اس رات میں وصل کی صورت میں اس رنگ میں جلوہ گر ہوتی ہے کہ جمالِ الٰہی کی تجلی اپنے مشتاق بندوں کے حال پر متوجہ ہوتی ہے اور ان کے احساسات اور ذہنوں میں ایک فراخی پیدا ہو جاتی ہے اور قوتِ خیالیہ ادراک کی قوت کی خدمت کرتی ہے' وہ تجلی ملائکہ اور ارواح کے ایک جہان کو جو کہ مقام قدس میں جاگزیں ہیں' اپنے ہمراہ لاتی ہے۔ عالمِ غیب کی عالمِ شہادت سے ملاقات' ملاء اعلیٰ کی مخلوق کے کمالات کا زمین والوں کے کمالات میں آمیزش' دونوں فریقوں کے انوار کا ہجوم اور ان دونوں جہانوں میں سے ہر ایک کا دوسرے کی شعاعوں اور جلووں سے فیض حاصل کرنا رونما ہوتا ہے اور عالمِ روحانیت میں ایک ایسی کیفیت پیدا ہوتی ہے جس کی وضاحت بہت دشوار ہے۔

مگر ایک ناقص سی مثال دیتے ہوئے اتنا کہا جا سکتا ہے کہ یہ موسم بہار آنے کی مانند ہے کہ آسمان سے بارش برسنے اور قربِ آفتاب کی زمین کی نشوونما کی قوتوں اور صور نوعیہ کے بے جان آثار میں اثر کرنے کی وجہ سے جو کہ ہر بیج اور ہر دانہ میں مخفی ہیں' رنگا رنگ پھول اور خوشنما سبزے ظاہر ہوتے ہیں اور دنیا میں ایک رونق' حسن اور کمال فراخی رونما ہوتی ہے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

یہاں ایک شبہ رہ گیا اور وہ یہ ہے کہ قرآن پاک کا نزول تیئیس (۲۳) سال کی مدت میں ہے اس کے نزول کی ابتدا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عمر مبارک کے چالیسویں سال کے شروع میں ماہِ ربیع الاوّل شریف میں ہوئی اور قرآن مجید میں نزول

قرآن کی تاریخ میں تین اوقات بیان کیے گئے ہیں۔ ماہِ رمضان، شب قدر، شبِ مبارک جو کہ اکثر علماء کے نزدیک شب برأت سے عبارت ہے اور وہ شعبان المعظم کی پندرہویں رات ہے۔ پس اس امر واقعی میں اور مختلف تعبیروں میں مطابقت کیونکر درست ہوگی۔

اور چھان پھٹک کے بعد جو کچھ پتہ چلا ہے، یہ ہے کہ قرآن پاک کا نزول لوحِ محفوظ سے بیت العزت کے مقام میں جو کہ آسمان، دنیا کا ایک مکان ہے جسے ذی قدر فرشتے گھیرے میں لیے ہوئے ہیں، شب قدر میں ہے جو کہ رمضان المبارک میں واقع ہے اور اس کے نزول کا فیصلہ کرنا اور لوحِ محفوظ کے محافظوں کو حکم فرمانا کہ اس کے نسخے کو منتقل کر کے آسمان دنیا میں پہنچائیں اسی سال کی شب برأت میں تھا۔ پس تینوں تعبیریں درست ہوگئیں کہ نزول حقیقی رمضان پاک کی شب قدر میں واقع ہوا اور نزول تقدیری اس سے پہلے شب برأت میں جبکہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان پر نزولِ قرآن کا آغاز چالیسویں سال کے شروع میں ماہِ ربیع الاوّل میں ہے باقی ماندہ عمر میں قرآن پاک کا نزول پورا کیا گیا۔ پس آپس میں کوئی اختلاف نہ رہا۔

وَمَآ اَدْرٰكَ مَا لَيْلَةُ الْقَدْرِ اور تو کیا جانے کہ شب قدر کی بزرگی کیا ہے۔ یعنی اگرچہ عارف کی معرفت وسیع اور مرتبہ بلند ہو لیکن اس تجلی الٰہی کی حقیقت جس کے ہمراہ کئی قسم کے علوم ہیں اور اثر قبول کرنے کی صلاحیتوں کے مطابق رنگ برنگی تاثیریں ظاہر ہوتی ہیں، کماحقہٗ نہیں جان سکتا اس لیے کہ اسے جاننے کی شرط ان تمام جہانوں اور ان تمام صلاحیتوں کا احاطہ کرنا ہے، یہ مسئلہ تفصیلی طور پر آدمی کی وسعت سے باہر ہے تو اس رات کی عظمت کا اظہار جس قدر ممکن ہے بیان فرمایا جا رہا ہے کہ

لَيْلَةُ الْقَدْرِ خَيْرٌ مِّنْ اَلْفِ شَهْرٍ شب قدر ان ہزار مہینوں سے بہتر ہے جن میں شب قدر نہ ہو۔ مقصد یہ ہے کہ ہر مہینہ دنوں اور راتوں پر مشتمل ہے اور ہر دن اور ہر رات ان للہ في ايام دهركم نفحات الافتعر ضوالها کہ حکم کے مطابق تجلیاتِ غیبیہ اور شہودیہ کو ضمن میں لیے ہوئے ہے لیکن وہ تجلی جو کہ اس رات میں واقع ہوتی ہے، عام اور وسیع ہونے کی وجہ سے اور اسماء الٰہیہ کی بلندی کی وجہ سے جو کہ اس تجلی کا مادہ ہیں۔

ان تجلیات کے ساتھ وہی نسبت رکھتی ہے جو کہ دریا کو قطرے کے ساتھ ہے۔

ہزار کے عدد کی تخصیص کی وجہ

اور ہزار کے عدد کو اس جہت سے خاص کیا گیا ہے کہ لغتِ عرب میں اسمائے عدد کسی مرتبے تک پہنچتے ہیں' ہزار کے بعد ان کی لغت میں کوئی نام نہیں ہے۔ پس عدد کے ختم ہونے کے مقام کا پتہ دیا گیا ہے۔

اور مہینے کو اس لیے خاص فرمایا گیا ہے کہ اگرچہ سال زیادہ دنوں اور راتوں پر مشتمل ہے لیکن عربی سال جو کہ چاند کی گردش سے بنتا ہے' مہینوں کا تکرار ہے جبکہ شمسی سال ایک پوشیدہ اور دن کے ساتھ مخصوص امر ہے بخلاف چاند کے جو کہ رات کے ساتھ مخصوص ہے اس کے ساتھ ساتھ چاند کو اس مقام کے ساتھ ایک زائد مناسبت محقق ہے اس لیے کہ چاند کا طلوع ہلال کے مرتبے سے لے کر بدر ہونے تک رات کے وقت واقع ہے۔ پس یہ ظلمت کدۂ دنیا میں نورِ تجلی کے ظاہر ہونے کی طرح ہے۔

اور اس وجہ سے کہ رات میں تجلی الٰہی اس عظمت اور بزرگی کے ساتھ واقع ہوتی ہے اس رات کی عبادت کا ثواب ہزار مہینوں کی عبادت کے ثواب سے بہتر ہوگا۔ نیز اس کی عظمت کے متعلق بیان فرمایا جا رہا ہے کہ

تَنَزَّلُ الْمَلٰٓئِكَةُ وَالرُّوْحُ فِيْهَا اس رات میں فرشتے آسمانوں سے اور ارواح مقام علیین سے کاملین کی ملاقات کرنے' بنی آدم کے اعمال کے انوار سے روشنی لینے اور ان کیفیات کے ادراک سے لذت حاصل کرنے کے لیے جو کہ زمین والوں کے نفوس میں اپنے محبوب اور معبود کی نسبت سے حاصل ہوئیں' اُترتے ہیں۔ اور ان کا یہ اُترنا زمین والوں کے نور و حضور میں زیادتی کے لیے بھی ہے۔ اور اس لیے بھی کہ آسمان والوں کو زمین والوں کی کیفیات بطورِ عکس حاصل ہوں۔ پس آسمانی کمالات اور زمینی کمالات دونوں فریقوں میں ایک دوسرے کے عکس کے طور پر جلوہ گر ہوں' کمال کی دونوں قسموں کی ایک مرکب صورت معرضِ وجود میں آئے اور افراد میں سے ہر فرد میں جو کمالات راسخ اور داخل تھے' سب جمع ہونے کی وجہ سے ایک صورت اختیار کر کے دوسرا رنگ دکھائیں

جیسا کہ مختلف کیفیات والے اجزاء سے ترکیب یافتہ معجون کا مزاج کہ ہر ہر فرد کی تاثیر کے علاوہ ایک اور تاثیر پیدا کرتا ہے۔

نماز باجماعت کی فضیلت کی حکمت

اور یہ اللہ تعالیٰ کی عجیب وغریب حکمتوں میں سے ایک عجیب حکمت ہے کہ اس طریقے سے ناقص کو کامل کی گنتی میں لایا جاتا ہے اور اسی حکمت کی بناء پر نماز باجماعت کو تنہا نماز پڑھنے سے بہتر قرار دیا گیا ہے اور جماعت میں جس قدر حاضری کثرت سے ہو گی اسی قدر دل روشن کرنے اور عنداللہ مقبول ہونے میں زیادہ اثر کرے گی۔

اور چونکہ فرشتوں اور ارواح کا نزول کبھی فرشتوں سے وابستہ امور جاری رکھنے اور بعض کاملین کو عالمِ بالا کی ارواح کے ساتھ ایک مناسبت حاصل ہونے کی وجہ سے بھی ہوتا ہے۔ لہٰذا ایک اور کلمہ ارشاد فرمایا گیا ہے۔ یہ نزول ایسا نہیں ہے بلکہ یہ اُترنا بِاِذْنِ رَبِّهِمْ ان کے پروردگار کے حکم سے ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ایک تجلی تمام فرشتوں اور ارواح کو اپنے پیچھے لے کر مختلف مقدار کے کمالات کی ایک ہی صورت حصول کے لیے انہیں نیچے لے آئی تو بلاشبہ اس وقت فرشتوں اور ارواح کا نزول اس کی مانند ہے کہ بادشاہ کے دفتری اور رئیس اپنے تعارف کی بناء پر کسی کے گھر کسی تقریب کے سلسلے میں آئیں اور ملائکہ اور ارواح کا اس وقت نزول بلاتشبیہ بمنزلہ اس کے ہے کہ بادشاہ کے حکم سے یا اس کے ہمراہ اس کے گھر میں جمع ہوں۔ ظاہر ہے کہ ان دونوں حالتوں کا فرق بالکل روشن ہے۔

مِنْ كُلِّ اَمْرٍ یہ ملائکہ اور ارواح کا بیان ہے یعنی ہر امر کے فرشتے ہر امر کی ارواح جو کہ قرب وکمال کے ساتھ تعلق رکھتا ہے نازل ہوتے ہیں۔ اگرچہ جن اشخاص پر ان کا نزول ہوتا ہے وہ سب کے سب اس قرب وکمال استعداد نہ رکھتے ہوں اس لیے کہ مقصد مختلف کمالات کی ایک صورت بنانا اور ناقصوں کے نقصان کو پورا کرنا ہے اور جب اس مبارک رات کی عظمت کے بیان سے فراغت ہوئی اس رات کے خواص میں سے ایک اور خاصہ بیان فرمایا جارہا ہے کہ

سَلٰمٌ ھِیَ حَتّٰی مَطْلَعِ الْفَجْرِ اس رات میں نفس و شیطان کے شر سے سلامتی ہے۔ کیونکہ ان کے شرور کا نیکیوں میں مل جانا زیادہ تر نیکیوں کے رد ہونے کا موجب ہو جاتا ہے تو اس رات میں نور تجلّی کے چمکنے اور ملائکہ وارواح کے حاضر ہونے کی وجہ سے نفسانی حوادث اور شیطانی خطرات کا اثر بالکل زائل ہو جاتا ہے اور سورج کے غروب ہونے کے وقت سے لے کر صبح صادق کے طلوع ہونے تک برابر ان آفات سے امن اور اطمینان رہتا ہے۔ بخلاف دوسری راتوں کے کہ ان کی پہلی تہائی میں شیطانوں کا انتشار اور ان کے وسوسوں کا ہجوم عبادت گزاروں اور نیکوکاروں کے دل مکدر کر دیتا ہے اسی لیے اس تہائی میں نماز فرض مقرر کی گئی ہے' دوسری تہائی میں نیند کی غفلت' بُرے خیالات' عادت سے زیادہ پریشان کن خوابیں اور نفسانی وسوسے اچانک آدھمکتے ہیں اور حاضری اور مناجات کی لذت پانے سے غافل کر دیتے ہیں۔ جبکہ تیسری تہائی جو کہ ان دونوں علتوں سے محفوظ ہے' تہجد' دعا دربارِ خداوندی میں التجاء اور اللہ تعالیٰ کے حضور مناجات کی حلاوت پانے کے لیے مقرر ہے۔

یہاں جاننا چاہیے کہ اس امر میں علماء کا اختلاف ہے کہ ملائکہ اور ارواح سے تمام ملائکہ اور ارواح مراد ہیں جیسا کہ قرآن پاک کے ظاہری الفاظ اس پر دلالت کرتے ہیں یا وہ ملائکہ اور ارواح مراد ہیں جن کا مقام اور مسکن سدرۃ المنتہیٰ ہے۔ جیسا کہ بعض احادیث میں مذکور ہے۔ بہرحال حضرت جبرئیل علیہ السلام کے نزول پر جن کا مقام سدرۃ المنتہیٰ کا وسط ہے' سب کا اتفاق ہے اور جبرئیل علیہ السلام کے ہمراہ تمام ملائکہ اور ارواح کا نزول ہوتا ہے اور ہر عبادت کرنے والے کے ساتھ حضرت جبرئیل علیہ السلام مصافحہ کرتے ہیں اور جبرئیل علیہ السلام کے مصافحہ کی علامت یہ ہے کہ عبادت میں مصروفیت کی حالت میں رونگٹے کھڑے ہو جائیں' دل میں ایک رقت پیدا ہو' آنکھوں سے آنسو گریں اور اس عبادت میں انتہائی لذت حاصل ہو۔

شبِ قدر کے خواص

اس رات کے خواص میں سے یہ ہے کہ اس میں دعا قبول ہوتی ہے۔ پس

چاہیے کہ اس وقت جامع دعا اختیار کی جائے اور صحیح حدیث میں آیا کہ حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا نے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا کہ اگر میں شب قدر پالوں تو کیا دعا کروں؟ فرمایا یہ دعا کرو اَللّٰھُمَّ اِنَّکَ عَفُوٌّ تُحِبُّ الْعَفْوَ فَاعْفُ عَنِّیْ نیز حدیث شریف میں وارد ہے کہ من اقام لیلۃ القدر ایمانا واحتسابا غفرلہ ماتقدم یعنی جو شخص ایمان اور طلب اجر کے لیے شب قدر کو نماز اور عبادت کے ساتھ زندہ رکھے اس کے گزشتہ گناہ معاف کر دیئے جاتے ہیں۔

اور بعض علماء نے فرمایا ہے کہ سَلَامٌ هِيَ حَتّٰى مَطْلَعِ الْفَجْرِ کا معنی یہ ہے کہ اس رات میں ملائکہ اور ارواح تمام ایمان والوں کو سلام کہتے ہیں اور کاملین کے ساتھ مصافحہ کرتے ہیں۔ پس یہ آیت ان کے نزول کے بعد ان کی ملاقات کی کیفیت کا بیان ہے۔

سورة البينه

مکی ہے' اس کی آٹھ (۸) آیات' چورانوے (۹۴) کلمات اور تین سو چھیانوے (۳۹۶) حروف ہیں اور لغت میں بینہ روشن اور ظاہر چیز کو کہتے ہیں جسے دیکھنے کے بعد کام کی حقیقت واضح ہو جائے اور اس میں کوئی شک وشبہ نہ رہے جیسے کسی دعویٰ میں دو معتبر گواہ۔

وجہ تسمیہ

اور اس سورۃ کو بینہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اس بات پر دلالت کرتی ہے کہ ہمارے رسول پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کا وجود اپنی ذات میں اپنی نبوت پر اس حد تک روشن نشانی ہے کہ کسی دوسری دلیل کی ضرورت ہی نہیں اور جو بھی آپ کی ذاتِ مقدس صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اطوار' احوال' افعال' اقوال اور اخلاق سے باخبر ہو' یقین کے ساتھ جان لیتا ہے کہ اس قسم کی ذات پاک بلاشبہ پیغمبری کی صلاحیت رکھتی ہے وہاں جھوٹ اور بہتان کی کوئی گنجائش نہیں۔

اجمال کی تفصیل

اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ یتیمی کے باوجود کہ آپ کے والد اور دادا آپ کی چھوٹی عمر میں گزر گئے۔ اور بھائی بند سب کے سب جہل مرکب میں گرفتار۔ اور اچھی عادات اور پسندیدہ اطوار سے بہت دُور تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم حسنِ اخلاق کے کمال اور انتہائی اچھی عادات میں پیدا ہوئے۔ اور اُمی ہونے اور کسی مکتب میں نہ بیٹھنے کے باوجود باریک علوم کو واضح طور پر بیان فرماتے۔ اور پوری وضاحت کے ساتھ معجزانہ گفتگو فرماتے تھے۔ اور آپ سے عقل اور مروت کے خلاف کبھی بھی کوئی چیز رونما نہ ہوئی۔ ملکی تدبیرات اور جنگ و صلح کی مہمات میں آپ کے تمام امور حکمت کے قواعد کے مطابق جاری رہے تو پڑھنے پڑھانے سے بالکل مبرا ہونے کے باوجود کمالات کے اس مرتبے تک پہنچنا غیبی امداد اور تعلیم الٰہی کے بغیر ممکن نہیں ہے اور پیغمبری کا معنی یہی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

لَمْ يَكُنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِيْنَ مُنْفَكِّيْنَ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ الْبَيِّنَةُ کفار اہلِ کتاب اور مشرکین جدا ہونے والے اور اپنی عادات اور آئین سے گزرنے والے نہ تھے یہاں تک کہ ان کے پاس روشن نشانی آ جائے۔

اس آیت کا خلاصہ یہ ہے کہ ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت سے پہلے بلاد عرب میں دو قسم کے لوگ تھے: پہلی قسم مشرکین جن میں سے بعض ستاروں کی روحانیات اور آگ کی پوجا کرتے تھے جیسے صابی اور مجوسی اور بعض اپنے بڑوں کی مورتیاں پوجتے تھے۔ قریش اور دوسرے جاہل عرب انہیں بارگاہِ خداوندی میں انتہائی مقرب سمجھتے ہوئے دنیا و آخرت میں وسیلہ گمان کرتے تھے۔

دوسری قسم اہل کتاب جو کہ خود کو کتابِ الٰہی کا پیروکار جانتے تھے، بعض تورات اور زبور کو اپنا پیشوا قرار دیتے تھے اور بعض انجیل کو قصداً مانتے تھے اور یہ سب فرقے قبیح بدعات، بُری رسموں اور غلط عقائد میں اس قدر منہمک ہو چکے تھے کہ وعظ و نصیحت اور عقلی دلائل قائم کرنے اور مناسبتیں اور نشانیاں سمجھانے سے بھی اصلاح قبول نہیں کرتے تھے

اور سب کہتے تھے کہ ہم اپنے قدیم عادات واطوار اور موروثی دینوں کو نہیں چھوڑیں گے۔ جب تک کہ کوئی واضح دلیل اور غالب معجزہ نہ دیکھ لیں اور آخر الزمان رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جن کی نعت آسمانی کتابوں سے ہم نے تواتر کے ساتھ معلوم کی ہے اور سابقہ انبیاء علیہم السلام سے سُنی ہے' مبعوث نہ ہو جائیں۔ اور ہمیں ہمارے کام کی حقیقت سے آگاہی نہ بخشیں' ہم اپنی روش اور آئین سے نہیں ہٹیں گے۔

اور ان کی یہ حالت ہمارے رسولِ کریم علیہ السلام کی اُمت کے مختلف فرقوں کی حالت جیسی ہے۔ ایک گروہ خود کو صوفی قرار دے کر بدعات میں مصروف ہو گیا ہے' ملحدوں اور رندوں نے خود کو تارکِ دنیا قرار دے کر حدودِ انسانیت کو خیر باد کہہ دیا ہے۔ ایک جماعت خود شیعیان اہلِ بیت کہہ کر عقائد باطلہ میں گرفتار ہے اور بعض خود کو علماء کے زمرے میں سمجھتے ہوئے مکروفریب کے ساتھ شرعی حیلے نکالتے ہیں اور طمع دنیا کے لیے اصول کے خلاف نادر اور عجیب روایات لوگوں کے سامنے بیان کرتے ہیں اور ان تمام گروہوں کو عقلی اور نقلی دلائل کے ساتھ جتنا بھی سمجھایا جائے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سیدھی راہ پر قائم ہوں اور اپنی موروثی بدعات چھوڑ دیں' بالکل ممکن نہیں ہے۔ تمام وعظ ونصیحت کے مقابلے میں ان گمراہ فرقوں کا جواب بھی ایک حرف ہے کہ ہم اپنی اس پرانی روش اور آئین کو روشن دلیل دیکھے اور مہدی علیہ السلام کے ظہور اور ان کے تسلی بخش بیان کے بغیر نہیں چھوڑیں گے۔

پس حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت شریفہ سے پہلے جہان میں اسی قسم کی حالت تھی۔ حکمتِ الٰہی نے تقاضا فرمایا کہ ایک رسول علیہ السلام آئیں جو کہ خود بھی روشن دلیل ہوں اور ان کا تسلی بخش بیان جہالت کی بیماری سے سب کو نجات بخشے۔ چنانچہ ان کے متعلق بیان فرمایا جارہا ہے:

رَسُوْلٌ مِّنَ اللّٰهِ يَتْلُوْ صُحُفًا مُّطَهَّرَةً فِيْهَا كُتُبٌ قَيِّمَةٌ یعنی وہ رسول تشریف لائے جو پاک صحائف کی تلاوت فرمائے جن میں مضبوط کتابیں درج ہوں۔

اجمال کی تفصیل

اور اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ ارشاد ونصیحت میں تین چیزوں کا مرتبہ نہایت

اونچا ہے۔ پہلی چیز ایسی شخصیت جسے خدا تعالیٰ نے بھیجا ہو اور معجزات اور کمالات کے اجتماع کی رو سے اس کی رسالت اللہ تعالیٰ کی طرف سے یقینی ہو۔ اور یہ معنی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں بوجہ اتم پایا جاتا تھا اس لیے کہ آپ میں رسالت کی شرائط اور اُمی ہونے کے باوجود انسانی کمالات کے انتہائی درجات تک پہنچنا محسوس کیا اور دیکھا جاتا تھا۔

دوسری چیز غیب سے اُتاری گئی کتاب جس پر اعجاز کے انوار چمکتے ہوں' صاف ذہن رکھنے والوں کو اس کی تلاوت میں برکات اور انوار محسوس ہوں اور بے ہودگی' جھوٹ اور تناقض سے جو کہ کلام میں عیب ہیں' پاک اور مبرا ہو۔ اور یہ معنی قرآن مجید کے دربار میں جس کی اُمی ہونے کے باوجود ہمارے رسول کریم علیہ السلام تلاوت فرماتے تھے' ظاہر اور روشن تھا۔

تیسری چیز وہ کتاب جس میں پہلی کتابیں درج ہوں' ان کے مضامین اس کتاب کی مختصر عبارات میں لپٹے ہوئے ہوں اور اس معنی اور مضامین کو جن کا سچا ہونا معلوم ہے' واضح بیانات کے ساتھ ذہن نشین عبارت میں ادا کیا جائے اور یہ بات بھی قرآن پاک میں پورے طور پر موجود ہے بلکہ اس میں اگلوں پچھلوں کے تمام علوم کا نچوڑ صراحتاً یا اشارتاً موجود ہے۔ اسی لیے اس کلام پاک کے نزول کے آغاز سے لے کر اس وقت تک باراں سو (۱۲۰۰) سال سے زیادہ کا عرصہ گزر چکا ہے (جب کہ اس وقت پندرہویں صدی شروع ہے) مختلف فنون کے ماہر علمائے کرام اس کی عبارات کے معنوں میں پوری کوشش سے لگے ہوئے ہیں اور اپنے حوصلہ اور استعداد کے مطابق اس میں سے پوشیدہ اسرار نکال رہے ہیں اور کیا ہی خوب کہا گیا ہے کہ وکل العلم فی القرآن لکن' تقاصر عنه انهام الرجال ہر علم قرآن پاک میں ہے لیکن ان کے ادراک سے لوگوں کے فہم قاصر ہیں۔

اور جب یہ تینوں چیزیں ایک جگہ جمع ہو جائیں تو ارشاد و ہدایت کا اعلیٰ مرتبہ حاصل ہو جاتا ہے۔ اور چاہیے تھا کہ تمام مختلف گروہ ایسے رسول علیہ السلام کی بعثت اور ایسی بابرکت کلام کے نزول کے بعد اپنی روش اور آئین چھوڑ کر پوری یک جہتی کے ساتھ

اس دین کی پیروی اختیار کرتے اور کسی وجہ سے بھی اختلاف اور جدا جدا ہونے کے روادار نہ ہوتے لیکن نفس اور شیطان کے غلبے کی وجہ سے پھر فرقہ بندی اور اختلاف کے اسی مرض میں گرفتار ہو گئے ہیں۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے:

وَمَا تَفَرَّقَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْكِتٰبَ اِلَّا مِنْۢ بَعْدِ مَا جَآءَتْهُمُ الْبَيِّنَةُ اور جنہیں کتاب دی گئی تھی یعنی یہود و نصاریٰ متفرق نہ ہوئے مگر اس کے بعد کہ ان کے پاس روشن نشانی آئی یعنی حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دور میں بھی یہودی قبیح بدعات' بُرے اعتقادات' جھوٹے اقوال اور بے سروپا خبریں تحریف کے طور پر گھڑ کر ان میں گرفتار تھے۔ حضرت سبحانہ وتعالیٰ نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ان کی رہنمائی کے لیے مردے زندہ کرنے' مادر زاد اندھوں کو بینا کرنے اور برص زدہ لوگوں کو شفا دینے جیسے روشن معجزات دے کر ان کے پاس بھیجا۔ انہوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے تشریف لانے کے بعد شدید اختلاف پیدا کر دیا۔ پس ایک گروہ والے خود کو حضرت موسیٰ علیہ السلام کے پیروکار قرار دے کر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی مخالفت میں کھڑے ہو گئے۔ جبکہ دوسروں نے خود کو نصاریٰ کا لقب دے کر اپنے گمان میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے دین کی مدد شروع کر دی اور آپس میں کھینچا تانی' لوٹ مار اور طعن و تشنیع شروع ہو گئی اور صدیاں لڑائی اور فساد میں گزر گئیں۔

اور اس آیت کا مقصد یہ ہے پیغمبر علیہ السلام کی تشریف آوری اور کتابِ الٰہی کا نزول اللہ تعالیٰ کے ارادے اور ہدایت کے اسباب کی توفیق کے بغیر اصلاح و ارشاد میں کافی نہیں۔ چاہیے یہ تھا کہ اس راستے کو ہدایت کے مستقل اسباب سے گمان نہ کرتے۔ اسی لیے محققین نے فرمایا ہے کہ قرآن پاک اور رسول علیہ السلام ایک اچھی غذا کی طرح ہیں جو کہ صحت مند بدن میں قوت کے کمال اور طبعی' حیوانی اور نفسانی افعال کے عمدہ ہونے کا موجب ہوتی ہے جبکہ بیمار جسم میں وہی غذا بالکل اسی طرح مرض کے سبب اور عوارض کی شدت کے زیادہ ہونے کا باعث ہوتی ہے۔ پس پہلے روح کے مزاج کو درست کرنے کی کوشش کرنا چاہیے اور تعصب کی اخلاط فاسدہ' جہالت کی رسموں اور خیالات کی

پابندیوں سے تنقیہ کرنا چاہیے اس کے بعد اس اچھی غذا کے ساتھ قوت دینا چاہیے۔ (اقول وباللہ التوفیق۔ تعبیر مقصد میں ابہام ہے اس لیے کہ ان الفاظ سے تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ کفار پہلے اپنی روح کے مزاج کو درست کرنے کی کوشش کریں۔ اخلاط فاسدہ جہالت کی رسموں اور اس کے خیالات کی پابندیوں سے تنقیہ کریں پھر رسول علیہ السلام اور کتاب سے انہیں ہدایت ملے گی۔ سوال یہ ہے کہ جب کفار خود بخود اپنی تشخیص اور اصلاح کر لیں تو پھر کسی علاج کی ضرورت ہی کیا رہ گئی۔ اصل بات یہ ہے کہ رسولِ کریم علیہ السلام اور کتابِ الٰہی کی بدولت ہی ان کی اصلاح اور تنقیہ ہوگا اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے بھی یہی اسباب ہدایت ہیں۔ یہ دونوں نعمتیں صرف غذائے صالح ہی نہیں ہیں بلکہ ان کی بدولت ہی کفر کی بیماری کی جڑ کٹتی ہے پھر ان کی تعلیمات پر عمل پیرا ہونے سے روح کو تقویت اور بالیدگی نصیب ہوتی ہے قَالَ اللّٰہُ تَعَالٰی قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَکّٰی نیز فرمایا وَیُزَکِّیْھِمْ یعنی جو پاک ہوا کامیاب ہوا اور پاک وہی ہوگا جسے رسول علیہ السلام پاک فرمائیں گے اگر بیماری یعنی کفر کی جڑ نہیں کاٹ سکیں گے، اصلاح نہیں کریں گے تو تزکیہ کیسے منعقد ہوگا۔ فافھم وتدبر۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اور اس احتمال کی بھی گنجائش ہے کہ اس آیت میں اس فرقہ اور اختلاف کو بیان کرنا مقصود ہو جو ہمارے رسولِ کریم علیہ السلام کی بعثت کے بعد رونما ہوا۔ یہود و نصاریٰ ایک گروہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے انکار اور آپ کی پیروی کرنے والوں کے ساتھ لڑنے اور جنگ کرنے کے لیے اُٹھ کھڑا ہوا جبکہ دوسرے گروہ نے پیروی کی راہ اختیار کی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دین کی امداد اپنا امتیازی نشان قرار دیا۔

اور اس سورۃ میں اہلِ کتاب کے تفرقہ پر اکتفاء کرنا اور مشرکین کے اختلاف سے سکوت اختیار کرنا اس بناء پر ہے کہ یہ کام اہلِ کتاب سے بہت بعید اور عجیب معلوم ہوتا ہے جو کہ خود کو عالم اور دانا کہتے تھے اور انبیاء علیہم السلام کی عادات واطوار اور کتب الٰہی کی شان سے خوب واقف اور آشنا تھے۔ بخلاف مشرکین کے وہ ان چیزوں سے آگاہ نہیں تھے، اختلاف کریں تو دُور نہیں۔

اور جب یہ ماجرا تفصیل کے ساتھ بیان ہو چکا یہاں ایک شبہ کے گمان کی گنجائش تھی' اسے بھی دُور فرما دیا گیا۔ اس شبہ کا بیان یہ ہے کہ اگرچہ واضح معجزات اور روشن علامت کسی شخصیت کی حقانیت پر گواہی دیں لیکن جب وہ گزشتہ شریعتوں کے خلاف امرونہی کرے جن پر انبیاء علیہم السلام کا اجماع ہو چکا ہے اور ان شریعتوں کو دگرگوں کر دے تو اس کا قول قبول کرنا جائز نہ ہوگا' ان تمام معجزات اور علامات کو دنیوی خوش نصیبی یا ایک اتفاق یا ایک خلاف عادت چیز پر معمول کرنا چاہیے اور اس کو اس آیت میں دُور فرمایا گیا ہے کہ

وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ حُنَفَآءَ وَيُقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَيُؤْتُوا الزَّكٰوةَ وَذٰلِكَ دِيْنُ الْقَيِّمَةِ اور اس رسول علیہ السلام کی شریعت میں انہیں حکم نہیں دیا گیا ہے مگر اللہ تعالیٰ کے لیے دین کو خالص کرتے ہوئے اس کی عبادت کرنے کا تو وہ ہر خصوصیت اور کیفیت جو کہ رسول علیہ السلام عبادات میں بیان فرماتے ہیں اگرچہ سابقہ شریعتوں میں وہ خصوصیت اور کیفیت نہ ہو' سب اللہ سبحانہ وتعالیٰ تک پہنچنے کے مقصد کی تمہید ہے اور اخلاص کی تاکید اور ذاتِ حق سے پردہ اُٹھانا ہے۔ نیز تاکہ حنفاء ہوں' حنیف وہ شخص ہے تو غیر خدا کی طرف سے توجہ ہٹا کر اور ہر چیز سے کٹ کر خدا تعالیٰ کی طرف مائل ہو۔ نیز وہ نماز قائم کریں اور زکوٰۃ دیں اگرچہ نماز اور زکوٰۃ کی کیفیت مختلف ہو یہی دین قیم ہے جس کی شرح اور وضاحت کرتے ہوئے حضرت آدم علیہ السلام کے وقت سے لے کر آج تک سابقہ انبیاء علیہم السلام اور پہلے حکماء اور علماء تشریف لے گئے۔

اور اس شبہ کے رد کا خلاصہ یہ ہے کہ اس شریعت کے بنیادی مقاصد پہلی شریعتوں کے ساتھ پوری مطابقت رکھتے ہیں۔ اگرچہ وقت اور حال کے تقاضے کی وجہ سے خصوصیات اور کیفیات میں کچھ فرق ہو گیا ہو۔ اور بنیادی مقاصد کا ایک دوسرے کے مطابق ہونا کافی ہے۔ چنانچہ ہر فن اور ہر صنعت میں اسی طرح واقع ہے۔ مثلاً طب یونانی بقراط اور جالینوس کے زمانے سے لے کر بوعلی سینا اور محمد بن زکریا اور مسیح کے دور تک ایک

نہج پر ہے اس طرح کہ یونانی طبیبوں کے اصول مقصودہ ہر زمانے میں محفوظ ہیں اور ان میں کوئی تبدیلی نہیں ہے۔ چنانچہ سب کہتے ہیں کہ خلط کے پکنے کے بعد مسہل دینا چاہیے' بحران کے دن تحریک نہیں کرنا چاہیے۔ بیماری کو اس کی ضد کے ساتھ دُور کرنا چاہیے اور صحت کی اس کی مثل کے ساتھ حفاظت کرنا چاہیے۔ وغیرہ ذالك تو جو شخص پچھلے طبیبوں کی کتابیں ملاحظہ کرے اور ان کے اصول مقاصد کو متقدمین کے اصول کے مطابق جانے تو یقین کے ساتھ ان کی طبابت کا سراغ لگا لے کہ وہ زائد خصوصیات اور کیفیات جو کہ متقدمین سے کسی قدر مختلف ہیں' ان کی کتابوں میں معلوم کر لے بلکہ صحیح غور و فکر سے کام لے اور حکمت کی باریکیوں کی رعایت جو ان خصوصیتوں میں واقع ہوئی' ملاحظہ کرے تو متا خرین کی فضیلت کا قائل ہو جائے اور اس حقیقت کا یقین کر لے کہ الصناعات تتکامل بتلاحق الانکار یعنی غور و فکر کے ساتھ ہنر کامل ہوتے ہیں۔

اور جب اہلِ کتاب کے اختلاف کرنے والوں کا حال بیان کیا جا چکا اب اللہ تعالیٰ کے دربار میں مرتبے کے اعتبار سے جو کہ ثواب اور عذاب کا مستحق ہے' دونوں گروہوں کی تفصیل بیان فرمائی جا رہی ہے۔

اِنَّ الَّذِیْنَ كَفَرُوْا مِنْ اَهْلِ الْكِتٰبِ وَالْمُشْرِكِیْنَ تحقیق وہ لوگ جو کہ اہلِ کتاب میں سے کافر ہو گئے اور مشرکین آخرت کے حکم میں شریک ہیں اور اہلِ کتاب کی فضیلت' بزرگی اور ان کی دانائی یہاں کسی کام نہیں آتی اس لیے کہ سب کے سب

فِیْ نَارِ جَهَنَّمَ خٰلِدِیْنَ فِیْهَا جہنم کی آگ میں ہیں دراں حال کہ اس میں ہمیشہ رہنے والے ہیں۔ اگر یہ لوگ کہیں کہ آخر ہم انسانوں کے گروہ میں سے ہیں اور انسان بہترین مخلوق ہے۔ دوسری مخلوقات کو دنیا و آخرت میں دائمی عذاب نہیں ہے تو ہمیں کیوں ہوگا؟ جواب میں فرمایا جا رہا ہے:

اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِیَّةِ وہ لوگ بدترین مخلوق ہیں۔ اس لیے کہ جب انہوں نے حکم الٰہی کا انکار کیا اور اس کے انبیاء علیہم السلام کے منکر ہو گئے تو انہوں نے اپنے نفس کی خواہش کو حکم الٰہی پر ترجیح دی اور یہ قباحت دوسری مخلوقات میں نہیں ہے اسی لیے سورۂ

فرقان میں فرمایا گیا ہے کہ اُولٰٓئِكَ كَالْاَنْعَامِ بَلْ هُمْ اَضَلُّ سَبِيْلًا

اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ تحقیق وہ لوگ جو تمام انبیاء سمیت اپنے وقت کے نبی پر ایمان لائے۔ اور انہوں نے اچھے اعمال کیے۔ اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ وہ لوگ بہترین مخلوق ہیں اس لیے کہ انہوں نے فرشتوں سے بھی ترقی کر لی اور ہر دور میں خدائی حکمتوں کو سمجھا' خواہش نفس کی کھینچا تانی کے باوجود حکم الٰہی کو اس پر ترجیح دی اور وہم کی مخالفت کے باوجود اس پر عقل کو غالب کیا۔ تاکہ درمیان میں شکوک و شبہات حائل نہ ہوں اور یہ معنی فرشتوں میں نہیں ہے۔ وہ جزوی احکام کو معلوم کرتے ہیں' وہم اور نفس نہیں رکھتے تاکہ ان کے عقائد اور اعمال میں مزاحمت واقع ہو لیکن یہ مسئلہ عام فرشتوں کی نسبت سے ہے۔ رہے خواص ملائکہ جیسے حضرت جبرئیل اور حضرت میکائیل علیہم السلام تو ان کا مرتبہ انتہائی بلند ہے' انہیں حکمتِ الٰہی کے اسرار کے ساتھ لاتمناہی عوالم میں کمال اختیار کرنا حاصل ہے۔ کامل عرفان رکھتے ہیں اور ان میں وہم اور نفس کا نہ ہونا اگرچہ بظاہر ان کے ثواب میں کمی کا باعث معلوم ہوتا ہے لیکن چونکہ عمل کرنے والے بنی آدم کا ثواب ان کے فیوض کا ایک شعبہ ہے اس مرتبے کے برابر نہیں ہو سکتا۔ مولانا حافظ عمادالدین نسفی رحمۃ اللہ علیہ کے عقائد میں واقع ہے کہ بنی آدم کے خواص جو کہ انبیاء علیہم السلام ہیں' تمام فرشتوں سے افضل ہے اور بنی آدم کے عوام جو کہ اولیاء اور زاہد لوگ ہیں' عوام ملائکہ سے افضل ہیں خواص ملائکہ بنی آدم کے عوام سے افضل ہیں۔ وہ جو حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ المؤمن اکرم علی اللہ من بعض الملائکہ الذین عندہ یعنی مومن اللہ تعالیٰ کے دربار میں اس کے حضور موجود بعض فرشتوں سے زیادہ معزز ہے تو خواص ملائکہ کے علاوہ پر محمول ہے۔

جَزَآؤُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ ان کی جزا ان کے پروردگار کے نزدیک ہمیشہ رہنے کے باغات ہیں۔ اس لیے انہوں نے مختلف اطوار اور مختلف شریعتوں میں حق سبحانہ وتعالیٰ کے حکم اور اس کی حکمت کا لحاظ کرنے پر ہمیشہ قائم رہنا اختیار کیا۔

تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ ان باغات کے نیچے سے نہریں جاری ہوں گی

اس لیے کہ انہوں نے اپنے معارف اور حقائق سے اپنے اعضاء میں اعمال کی نہریں جاری کیں اور ان اعمال کے انوار ان کے سلسلوں اور ان کی اولادوں اور پیروی کرنے والوں میں جاری رہے۔

خَالِدِيْنَ فِيْهَا اَبَدًا ان بہشتوں میں ابدالآباد تک ہمیشہ رہیں گے۔ اس لیے کہ حق پر ابدالآباد تک قائم رہنے کی نیت ان کے دِلوں میں گھر کیے ہوئے تھی گو انہوں نے تھوڑی سی عمر پائی۔

رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ ان سے اللہ تعالیٰ راضی ہو گیا اس لیے کہ انہوں نے کسی طور اور کسی شان میں بھی اس کا انکار نہ کیا۔ وَرَضُوْا عَنْهُ اور وہ بھی اس سے راضی ہو گئے اس لیے کہ انہوں نے مختلف شریعتوں پر ایمان لانے کی وجہ سے ان سب کا ثواب پایا اور انہیں وہ لذت نصیب ہوئی جو کہ ہر شریعت کے انوار میں تھی اور ان کی طبیعت کا پیمانہ پُر ہو گیا اور طلب کی گنجائش نہ رہی۔

ذَالِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ یہ واضح بیان اس کے لیے ہے جو کہ اپنے پروردگار سے ڈرے اور کسی طور میں بھی اس کی حکمت اور شان کا انکار نہ کرے اور اللہ تعالیٰ کے حکم کو خوف کی وجہ سے نفس کی خواہش اور رسم کی پابندی پر اوّلیت دے۔

اور اس میں کفار کا حال بیان کرتے وقت ان کی جزا کو پہلے بیان فرمایا۔ بعدازاں فرمایا اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ یہاں ایمان والوں کو جزا پر اکتفاء فرمایا گیا۔ اور کفار کی جزا کو اس وجہ سے بیان نہیں فرمایا کہ عقل مند کے لیے شرالبریہ کے لفظ سے ان کے حال کا انجام واضح ہو جاتا ہے۔ نیز ضد ہونے کی وجہ سے ایمان والوں کی جزا کے بیان سے ان کی جزا کی تفصیل کا سراغ ملتا ہے۔ اور عقل مند کے لیے اشارہ کافی ہے اور اس کے بعد فرمایا گیا اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ اور ایمان والوں کا حال بیان کرنے میں پہلے اُولٰٓئِكَ هُمْ خَيْرُ الْبَرِيَّةِ فرمایا گیا ہے اس کے بعد جزا کا ذکر کیا گیا اور اس انداز کو بدلنے میں نکتہ یہ ہے کہ کفار کو ان کی جزائے بد ملنے کے بعد شرالبریہ کا منصب حاصل ہوا ورنہ وہ دنیا میں انہوں نے بیشتر مخلوقات سے زیادہ خوش گوار زندگی بسر کی ہے جبکہ ایمان

والوں نے معرفت کا دروازہ کھلنے اور اچھے اعمال کے ساتھ نفس آراستہ کرنے کے ساتھ ہی خیریت کا مرتبہ حاصل کیا ہے اور انہیں مذکورہ جزا کا ملنا خیریت کے شعبوں میں سے ایک شعبہ ہے۔

نیز یہاں شبہ وارد ہوتا ہے کہ اسم تفضیل کی اضافت تقاضا کرتی ہے کہ مضاف الیہ میں اصل صفت کا کوئی حصہ ہوتا ہے۔ گو اسم تفضیل کے ساتھ موصوف اس سے زائد ہوتا ہے یہاں ایمان والوں کو مخلوقات سے بہتر فرمایا گیا ہے۔ چاہیے کہ تمام مخلوقات میں کچھ نہ کچھ بہتری ہو۔ حالانکہ کفار اور شیاطین نے بہتری کا منہ بالکل نہیں دیکھا ہے۔ اس شبہ کا جواب یہ ہے کہ یہ تقاضا اس وقت ہوتا ہے جب اسم تفضیل کی اضافت مضاف الیہ پر زیادتی کے لیے ہو جبکہ یہاں مطلق زیادتی مراد ہے' اضافت صرف وضاحت کرنے کے لیے ہے جیسا کہ یوسف احسن اخواتہ میں قرار دیا گیا ہے اس سورۃ میں مضاف الیہ میں اصل صفت کا پایا جانا درکار نہیں ہے۔ واللہ علم

سورۂ زلزلت

مکی ہے اس کی آٹھ (۸) آیات' ترپن (۵۳) کلمات اور ایک سو انچاس (۱۴۹) حروف ہیں اس سورۃ کا نزول منکرین قیامت کے جواب میں ہے جو کہ پوچھتے تھے کہ قیامت کب ہو گی؟ تفاسیر میں مذکور ہے کہ پہر رات گزر چکی تھی کہ یہ سورۃ اُتری' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے صبح نہ ہونے دی اسی وقت باہر تشریف لائے اور لوگوں کو تبلیغ فرمائی۔

اور اس سورۃ میں ایک آیت ہے گویا تمام قرآن پاک کا خلاصہ اور تمام احکام شریعت کی جامع ہے وہ اس سورۃ کی آخری آیت ہے جو کہ ہر اچھے بُرے عمل کی جزا پر دلالت کرتی ہے۔ حدیث صحیح میں ہے کہ یہ سورۃ قرآن پاک کی چوتھائی کے برابر ہے۔

وجہ تسمیہ اور قیامت کے زلزلہ کے اسباب

اور اس سورۃ کو سورۂ زلزلت اس لیے کہتے ہیں کہ قیامت کے دن ایک بہت

بڑے زلزلے کے رونما ہونے پر دلالت کرتی ہے۔ اس زلزلے کا سبب تین چیزیں ہیں۔
پہلی چیز تجلی الٰہی کی عظمت جو کہ زمین پر واقع ہوگی اور اس پر اللہ تعالیٰ کے نور کا چمکنا ہے۔ اور اس تجلی کی وجہ سے زمین کے اجزاء دگرگوں ہو جائیں گے۔ جس طرح کہ اس کا نمونہ کوہِ طور پر واقع ہوا۔ قَالَ اللّٰهُ تَعَالٰى وَاَشْرَقَتِ الْاَرْضُ بِنُوْرِ رَبِّهَا نیز فرمایا فَلَمَّا تَجَلّٰى رَبُّهٗ لِلْجَبَلِ جَعَلَهٗ دَكًّا

دوسری چیز مردوں کو اُٹھانے کی صورت میں نافرمانوں پر غضب الٰہی کا جوش مارنا اور شان انتقام کا ظہور فرمانا' یہ مقصد زمین کو جنبش دینے اور اسے اُلٹ پلٹ کرنے کے بغیر پورا نہیں ہوتا تا کہ ہر مردے کے اجزاء جدا جدا معلوم ہوں۔

تیسری چیز دوسری مرتبہ صور پھونکنے کی سخت آواز جو کہ ہوا میں شدید لہریں پیدا ہونے' اس ہوا کے پوری شدت کے ساتھ زمین کے مسام اور سوراخوں میں داخل ہونے اور اس کی وجہ سے زلزلہ پیدا ہونے کا موجب ہو۔ چونکہ یہ زلزلہ حشر کے دن کے واقعات میں سے ایک عظیم واقعہ ہے۔ جزا کے کاروبار کا ابتدائیہ ہے۔ اس لیے اس سورۃ کو اسی نام سے یاد کیا گیا ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِذَا زُلْزِلَتِ الْاَرْضُ زِلْزَالَهَا جبکہ زمین کو ہلایا جائے ایسا ہلانا جو کہ اس زمین کے لیے ممکن ہے یعنی زمین کو جنبش دینے میں پورا مبالغہ ہو۔ زمین کی طاقت جتنا برداشت کرے' اسے ہلایا جائے اور زمین پر کوئی عمارت اور کوئی پہاڑ باقی نہ رہے' بلندیاں اور پستیاں برابر ہو جائیں' زمین کی شکل بدل جائے۔ یہ واقعہ دوسری دفعہ صور پھونکنے کے وقت ہوگا۔

وَاَخْرَجَتِ الْاَرْضُ اَثْقَالَهَا اور زمین اپنے بھاری بوجھ نکال دے۔ یعنی زمین کے اندر مردے' خزانے' غلے' بیج اور کانیں جو کچھ ہے' سب باہر پھینک دے' مردوں کے باہر آنے کی وجہ سے ارواح کو زمین کے باطن کے ساتھ جو تعلق تھا جو کہ ان ارواح کے جسموں کی قرارگاہ تھا منقطع ہو جائے۔

وَقَالَ الْاِنْسَانُ اور آدمی کہے' یعنی آدمیوں کی روحیں کہیں یا اس زلزلے کے نشانات دیکھ کر آدمی کہے مَالَهَا اس زمین کو کیا ہو گیا ہے۔

یَوْمَئِذٍ تُحَدِّثُ اَخْبَارَهَا اس دن زلزلے کی شدت' کمال بیتابی اور بے قراری کے باوجود زمین اپنی خبریں بتائے۔ یعنی بنی آدم کے اعمال کو ظاہر کرے اور کہے کہ فلاں نے مجھ پر نماز گزاری' روزہ رکھا' نیک کام کیے اور فلاں نے ناحق قتل کیا' بدکاری کی اور چوری کی اور زمین کا باتیں کرنا دو حکمتوں کے لیے ہے۔

پہلی حکمت یہ کہ لوگوں پر گواہ ہوتا کہ انہیں انکار کی گنجائش نہ رہے اسی لیے اس دن آسمان' دن' رات' ستارے' اور لوگوں کے ہاتھ' پاؤں گواہی دیں گے' اچھے برے کاموں کو ظاہر کریں گے۔

دوسری حکمت یہ کہ بدکار لوگ زمین کے بولنے کی وجہ سے ذلیل و رسوا ہوں اور نیک لوگوں کی صفت و تعریف ثابت ہو۔

جمادات کی گواہی کے متعلق شبہ اور اس کا جواب

اور یہاں بعض لوگوں کے دل میں شبہ گزرتا ہے کہ زمین بے جان' غیر ذی عقل ہے' گواہی کیسے دے گی اور باتیں کیسے کرے گی؟ اس شبہ کا تحقیقی جواب یہ ہے کہ مخلوقات میں سے ہر چیز ایک روح رکھتی ہے لیکن حیوانات کی ارواح اپنے جسموں میں تدبیر اور تصرف کرنے کا تعلق بھی رکھتی ہیں۔ اور خوراک دینے' نشوونما کرنے اور احساس اور حرکت دینے میں ہمیشہ مشغول ہیں۔ جبکہ دوسری مخلوقات کی روحیں تدبیر اور تصرف کا تعلق نہیں رکھتیں اور ان میں احساس اور حرکت اختیاری دائمی نہیں ہے۔ اس وجہ سے ان ارواح کا تعلق عوام کی نظروں سے اوجھل رہتا ہے۔ اس کے باوجود خرق عادات کے طور پر کبھی کبھی اس کا ظہور ہوتا ہے۔ چنانچہ احادیث صحیح میں یہ معنی تواتر کے ساتھ ثابت ہے۔ پتھروں اور درختوں کا باتیں کرنا' ستون حنانہ کا نعرہ مارنا اور ایک پہاڑ کا دوسرے کو آواز دینا کہ هل مر بك احد بذكر الله یعنی کیا آج تجھ پر اللہ تعالیٰ کا ذکر کرنے والا کوئی گزرا؟ اس قسم سے ہے۔

قرآن مجید میں تمام مخلوقات کے لیے ارواح کا ہونا سورۂ یٰسں کے آخر میں مذکور ہوا فَسُبْحَانَ الَّذِیْ بِیَدِہٖ مَلَکُوْتُ کُلِّ شَیْءٍ نیز سورۂ اسریٰ میں مذکور ہے کہ وَاِنْ مِّنْ شَیْءٍ اِلَّا یُسَبِّحُ بِحَمْدِہٖ وَلٰکِنْ لَّا تَفْقَھُوْنَ تَسْبِیْحَھُمْ مسلمانوں کے فوت ہونے پر زمین اور نماز کی جگہ کا رونا بھی حدیث شریف سے ثابت ہے۔ اور زمین' پتھر اور درخت کا ان مؤذنوں کے لیے گواہی دینا جو کہ نماز کی اذان کے لیے آواز بلند کرتے ہیں' بھی ثابت ہے۔ مثنوی مولوی قدس سرہ میں لکھا ہے:

ہستی کوہ است مخفی از خرد
ہستی بیچوں خرد کے پے برد

یعنی پہاڑ کا وجود عقل سے پوشیدہ ہے تو بے کیف ذاتِ حق کا سراغ عقل کیسے لگا سکتی ہے۔

. بادرا بے چشم اگر بنیش نہ داد
فرق چوں می کرد اندر قوم عاد

اگر آنکھ کے بغیر ہوا کو بینائی نہ دی گئی ہوتی تو قوم عاد کے درمیان فرق کیسے کرتی؟

آتش نمرود را گر چشم نیست
با خلیلش چوں ترحم کردایست

اگر نمرود کی آگ کی آنکھیں نہیں ہیں تو اس کے خلیل علیہ السلام پر اس نے کیسے رحم کیا۔

گر نبودے نیل را آں نور ید
از چہ کافر از مومن برگزید

اگر دریائے نیل کو بینائی کا نور حاصل نہ تھا تو اس نے کافر کو مومن سے کیسے جدا کر لیا۔

گر نہ کوہ وسنگ بادیدار شد
پس چرا داؤد را اویار شد

اگر پہاڑ اور پتھروں میں دیکھنے کی طاقت نہ تھی تو وہ حضرت داؤد علیہ السلام کے دوست کیسے بن گئے۔

این زمیں را گر نبودے چشم جاں
از چہ قاروں را فرو خورد آنچناں

اگر زمین کی باطنی نگاہ نہ ہوتی تو قارون کو اس طرح کیسے نگل جاتی۔

گر نبودے چشم دل حنانہ را
چوں بدیدی ہجر آں فرزانہ را

اگر ستونِ حنانہ کی قلبی نگاہ نہ ہوتی تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی جدائی کا پتہ کیسے چلتا۔

در قیامت ایں زمیں در نیک و بد
کہ زماں دیدہ گواہی ہا دہد

قیامت کے دن یہ زمین اچھے بُرے اعمال دیکھنے کے اوقات کی گواہی دے گی۔

اور جب یہ بیان فرمایا گیا کہ اس دن زمین لوگوں کے اعمال ظاہر کرے گی اور ان کے اچھے بُرے کردار پر گواہی دے گی' ہر اظہار اور گواہی میں جھوٹ کا احتمال بھی ہوتا ہے اس احتمال کی نفی کے لیے ایک اور بات بیان کی جارہی ہے۔

بِاَنَّ رَبَّكَ اَوْحٰى لَهَا یہ بات کرنا اس وجہ سے ہے کہ تیرے پروردگار نے اس زمین کو وحی فرمائی ہے یعنی یہ اظہار کسی عداوت کے لیے نہیں ہے جو اسے بنی آدم کے ساتھ ہے یا اس میں جھوٹ کی کوئی گنجائش ہو۔ اس لیے کہ بنی آدم سب کے سب زمین کے فرزند ہیں اور فرزندوں کے ساتھ دشمنی ممکن نہیں ہے نہ ہی یہ نفس کی خواہش کی وجہ سے ہے کیونکہ زمین نفس نہیں رکھتی۔ پس یہ صرف اللہ تعالیٰ کے حکم کے ساتھ ہی ہے جو کچھ مالک کے حکم کے ساتھ ہو اس میں جھوٹ کی گنجائش نہیں ہوتی۔

اور جب اس قدر واضح ہو چکا کہ قیامت کے دن بنی آدم کے اعمال جنہیں انہوں نے ایک دوسرے سے چھپائے رکھا اور زمین کے ظاہر کرنے سے سب پر ظاہر ہو جائیں

گے تو نیک لوگ سرخ رو اور بدکار رسوا ہوں گے اب بیان فرمایا جا رہا ہے کہ اتنی بات پر ہی اکتفاء نہ ہوگا بلکہ

يَوْمَئِذٍ يَصْدُرُ النَّاسُ اَشْتَاتًا اس روز لوگ اپنی قبروں سے میدانِ حشر میں گروہ در گروہ متفرق ہو کر نکلیں گے۔ شرابیوں' زانیوں' ظالموں اور چوروں کے گروہ وغیرہ۔

لِيُرَوْا اَعْمَالَهُمْ تاکہ انہیں ان کے اعمال دِکھائے جائیں یعنی محشر میں بدکاروں کو ایک اور رسوائی اور نیکوں کو ایک اور سرخ روئی حاصل ہو یہاں تک کہ ان کے اعمال نامے کھولے جائیں' ترازو نصب کریں اور ان کے ہر اچھے بُرے عمل کو کھلے عام پڑھیں اور تولیں۔ پس ان کے اعمال ہر طرح ظاہر ہو کر سامنے آجائیں۔ چنانچہ اس کی تفصیل ان دو آیات میں ہے:

فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ تو جو ذرّہ برابر بھی نیکی کرے' اسے دیکھے۔ یعنی اعمال نامہ اور ترازو میں دیکھے۔ ذرّہ کے دو معنی ہیں: چھوٹی سی چیونٹی' غبار کا دانہ جو کہ سورج کی شعاع میں تاریک مکان میں ظاہر ہوتا ہے۔

وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ اور جو ذرہ برابر بُرائی کرے' اسے دیکھے۔

ایک شبہ اور اس کا جواب

اور یہاں شبہ گزرتا ہے کہ کافر کی نیکی جزا کا سبب نہ ہوگی تو اسے دیکھنے کا کیا فائدہ جبکہ مومن کی بُرائی بھی معافی کے قابل ہے تو اسے دیکھنا بھی' معافی کے خلاف ہے۔

اس کا جواب یہ ہے کہ کافر کی نیکی اگرچہ ابدی عذاب سے خلاصی کا موجب نہیں ہے لیکن اس کا اثر عذاب کی تخفیف ہے۔ تو اس کے دیکھنے کا فائدہ ہے۔ اسی طرح مومن کی بُرائی سے گرچہ معافی مل گئی ہو' ایک تاثیر سے خالی نہیں ہے اگرچہ رُتبے کی کمی ہو ہاں وہ بُرائی جس سے اس نے سچی توبہ اور ندامت کی ہے اس کے اعمال نامہ سے دُور ہوتی ہے اور لکھنے والوں اور گواہوں کو فراموش ہو جاتی ہے۔ پس مَنْ يَّعْمَلْ کا لفظ اس کے علاوہ کے ساتھ مخصوص ہو یا یوں کہیں کہ جب اس بُرائی پر توبہ اور ندامت واقع ہوئی اور توبہ اور ندامت عمدہ نیکیوں میں سے ایک نیکی ہے پس اس بُرائی کو دیکھنا یا اس بُرائی سے

توبہ وندامت کو دیکھنا کسی قسم کے نقصان کا باعث نہ ہوگا۔ اسی لیے توبہ کرنے والوں کے بارے میں فرمایا گیا ہے فَاُولٰٓئِکَ یُبَدِّلُ اللّٰہُ سَیِّاٰتِھِمْ حَسَنٰتٍ یعنی توبہ کرنے والوں کی برائیاں ان کی توبہ کے ضمن میں انہیں دکھائی جاتی ہیں۔ پس وہ برائیاں نیکیوں کی شکل اختیار کر لیتی ہیں۔ واللہ اعلم

اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ ایک آدمی نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کی یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے قرآن پاک سکھائیں۔ آپ نے امیرالمومنین علی المرتضیٰ کرم اللہ وجہہ کو حکم دیا کہ اسے قرآن پاک پڑھائیں۔ حضرت امیرالمومنین نے اسے سورۂ اذا زلزلت پڑھائی جب وہ اس آیت پر پہنچا تو کہنے لگا حسبی لاابالی ان لااسمع غیرھا یعنی مجھے یہی آیت کافی ہے مجھے اس کی پرواہ نہیں کہ کچھ اور سیکھوں۔ حضرت امیرالمومنین کرم اللہ وجہہ نے یہ واقعہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ آپ نے فرمایا دعه فقد فقه الرجل یعنی اسے چھوڑ دو اس لیے کہ وہ فقیہ اور دانا آدمی ہے۔

نیز حدیث شریف میں آیا ہے کہ اس آیت سے اہلِ مدینہ میں سے دو آدمیوں نے عبرت پکڑی۔ ان میں سے ایک وہ شخص تھا جو صدقہ نہ دیتا اور کہتا کہ میں زیادہ کی طاقت نہیں رکھتا اور اللہ تعالیٰ کے لیے تھوڑی سی چیز دینا بے ادبی سمجھتا ہوں اور دوسرا وہ شخص تھا جو کہ اپنے گناہوں کو خاطر میں نہ لاتا جیسے بے مقصد گفتگو اور بے محل دیکھنا گمان کرتا کہ اتنی سی چیزوں پر کیا گرفت ہوگی' ان دونوں کے گمان کے رد کے لیے یہ آیت کافی ہوئی۔

سورۂ عادیات

مکی ہے' اس کی گیارہ (۱۱) آیات' چالیس (۴۰) کلمات اور ایک سو تریسٹھ (۱۶۳) حروف ہیں اور عادیات لغتِ عرب میں دوڑنے والے گھوڑوں کو کہتے ہیں' عدو سے مشتق ہے جس کا معنی دوڑنا ہے۔

وجہ تسمیہ

اور اس سورۃ کا نام سورۂ عادیات اس لیے رکھا گیا ہے کہ غازیوں کے گھوڑے

ناشکر کفار پر غضب الٰہی کی تیزی کی شکل ہیں۔ اور دنیا میں نافرمانوں پر اللہ تعالیٰ کے انتقام کا ظہور دوڑنے والے گھوڑوں کی صورت میں ہوتا ہے۔ پس یہ گویا حشر ونشر کا نمونہ ہے اس لیے مخالف فوج کے آنے اور موافق گروہ کے شکست کھانے کی وجہ سے شہر اور ملک میں ایک انقلاب واقع ہوتا ہے' عزت والے ذلیل ہو جاتے ہیں' پردہ نشین بے پردہ ہو جاتے ہیں اور جو مال و متاع مدتوں میں جمع ہوتے ہیں' سب کے سب ایک لمحے میں برباد ہو جاتے ہیں اور قیامت کا نمونہ ہوتا ہے اور چونکہ یہ حالت قیامت کی یاد دلانے والی ہے اس لیے اس کی قسم اُٹھائی گئی اور سورۃ کا نام بھی یہی رکھ دیا گیا۔

سبب نزول

اور مفسرین کے ارشاد کے مطابق اس سورۃ کے نزول کا سبب یہ ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت منذر بن عمر انصاری رضی اللہ عنہ کو گھوڑ سواروں کی ایک جماعت کے ہمراہ بنو کنانہ کے ایک قبیلہ پر جو کہ کفر میں بہت شدید تھا' مقرر فرمایا اور حکم دیا کہ چاہیے کہ تم فلاں دن صبح کے وقت ان کے پاس پہنچو اور حملہ کرو اور فلاں دن واپس آ جاؤ۔ انہیں راستے میں ایک سیلاب کا سامنا ہوا جس سے گزرنا مشکل تھا۔ ایک دن وہاں ٹھہرنے کا اتفاق ہوا یہاں تک کہ اس سیلاب کا پانی کم ہوا اور وہاں سے گذر گئے اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے فرمانِ عالی کے مطابق عمل کیا۔ جب واپسی کے وعدے کا دن پہنچا اور یہ حضرات اس رکاوٹ کی وجہ سے جو کہ راستے میں پیش آئی تھی' واپس نہ لوٹے۔ منافقوں نے بُری افواہیں پھیلانا شروع کر دیں اور کہنے لگے کہ وہ لشکر سارے کے سارا ضائع ہو گیا اس جھوٹی خبر سے مسلمانوں کو بہت صدمہ ہوا۔ حق تعالیٰ نے یہ سورۃ بھیجی اور اس میں ان کے گھوڑوں کا ذکر اور ان کا دشمنوں کی جماعت میں آنا بیان فرمایا تا کہ مسلمانوں کو تسلی حاصل ہو۔

لیکن اس سبب نزول میں ایک خدشہ ہے اس لیے کہ یہ سورۃ مکی ہے جبکہ یہ لشکر بھیجنے کا واقعہ مدینہ شریف میں تھا۔ پس یہ اس سورۃ کے نزول کا سبب نہیں ہو سکتا اور زیادہ صحیح یہ ہے کہ چونکہ ذاتِ حق کا ارادہ تھا کہ اس دین میں جہاد کی رسم کو مقرر فرمائے تو اس سورۃ

میں اس رسم کا اشارہ کرنا منظور ہوا تا کہ ایمان والوں کو اس امر کی بشارت ہو کہ اللہ تعالیٰ انہیں جہاد کی طاقت' گھوڑے' فوج اور سپاہی عطا فرمائے گا تا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے دشمنوں سے معقول بدلہ لیں اور ان کا شیرازہ منتشر کر دیں اور ان کے ملک اور مال کو اپنے تصرف میں لائیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعَادِيَاتِ ضَبْحًا ان دوڑنے والے گھوڑں کی قسم جو کہ بھاگتے وقت شکم سے آواز نکالتے ہیں۔ اور جانوروں کا قاعدہ یہ ہے کہ نہایت تیز دوڑنے کے وقت ان کے شکم سے آواز نکلتی ہے جسے ہندی زبان میں ہانپ کہتے ہیں۔

فَالْمُوْرِيَاتِ قَدْحًا پس ان گھوڑوں کی قسم ہے جو کہ چقماق مار کر آگ نکالتے ہیں۔ یعنی پہاڑوں اور پتھریلی زمینوں میں گھوڑے کے آہنی سم پتھر پر پڑتے ہیں جن سے شعلے نکلتے ہیں۔ جس طرح کہ چقمان مارنے سے رات کے وقت آگ ظاہر ہوتی ہے۔ اور دن میں اس کی روشنی محسوس نہیں ہوتی اس قسم میں اس بات کا اشارہ ہے کہ غازیوں کے گھوڑے رات کے وقت دوڑتے ہوئے جائیں گے۔

فَالْمُغِيْرَاتِ صُبْحًا پس ان گھوڑوں کی قسم ہے جو کہ صبح کے وقت دھاوا بولتے ہیں۔ یعنی پچھلی رات سفر کر کے صبح کے وقت جو کہ غفلت کا وقت ہے' دشمن تک پہنچ جاتے ہیں اور مال اور ملک لوٹ لیتے ہیں۔

فَاَثَرْنَ بِهٖ نَقْعًا پس ان گھوڑوں نے صبح کے وقت غبار اُڑا دیا' یہ اس فعل پر معطوف ہے جو کہ مغیرات سے سمجھا جاتا ہے یعنی اغرن صبحا یعنی انہوں نے بوقت صبح لوٹ مار کی اور اس اسم سے فعل کی طرف مڑنے کی وجہ یہ ہے کہ غبار اُڑانا دشمنوں کے مقام کے قریب پہنچنے کے وقت ہے پس وہ ایک ساعت رہا اور گزر گیا۔ بخلاف اغارہ اور ایراء اور عدو کے جو کہ جاری ہے۔

اور صبح کے وقت غبار اُڑانے کی پابندی اس لیے ہے تا کہ ان گھوڑوں کے سموں کی طاقت اور زیادہ واضح ہو جائے اس لیے کہ صبح کے وقت پچھلی رات کی سردی اور شبنم کی

رطوبت کی وجہ سے زمین موٹی اور سخت ہو جاتی ہے تو اس وقت غبار اُڑانا سخت قوی حرکت کو چاہتا ہے۔ بخلاف دن کے پچھلے پہر کے کہ سورج کی حرارت اور اس کی شعاعوں کے پیوست ہونے کی وجہ سے زمین کے اجزاء کھوکھلے ہو جاتے ہیں اور معمولی سی حرکت کی وجہ سے غبار اُٹھ جاتا ہے اسی لیے آندھیاں آنے کا وقت دن کا پچھلا پہر ہے۔

فَوَسَطْنَ بِهٖ جَمْعًا پس وہ گھوڑے اس وقت دشمن کی صفوں میں گھس گئے اور انہیں منتشر کر دیا۔ یہاں جاننا چاہیے کہ گناہوں کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کے قہر کی صورت ان گھوڑوں کی حرکت کے ساتھ پوری مشابہت رکھتی ہے۔ اس لیے کہ اس کا مبدا غضب کا متوجہ ہونا ہے۔ کہ جس کا نمونہ یہاں گھوڑوں کا شدید ہانپتے ہوئے دوڑنا ہے جو کہ غضب کے وقت ہوتا ہے اور سم سے آگ نکالنا جہنم کے شعلے کا نمونہ ہے کہ جہنم کی آگ مجرموں کے لیے بھڑکائی جاتی ہے۔ دھاوا بولنا جہنم کے فرشتوں کی ضرب' سانپوں اور بچھوؤں کے کاٹنے اور جسم کی کھال' گوشت اور چربی کو جلانے کا نمونہ ہے اور غبار اُڑانا ناشکروں کی آنکھوں پر حجاب ڈالنے کا نمونہ ہے جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کی رحمت چھپ جاتی ہے اور دشمنوں کی صفوں میں گھس جانا اللہ تعالیٰ کے غضب کی آگ کا دلوں میں سرایت کر جانے اور جسم کے نظام کو دگرگوں کرنے کا نمونہ ہے۔ پس اللہ تعالیٰ کے قہر کے اس نمونے کی قسم اس بات پر اُٹھائی گئی کہ

اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ تحقیق انسان اپنے پروردگار کا ناشکر ہے یعنی اس کی نعمتوں کی ناشکری کرتا ہے۔ اور نعمتوں کی یہ ناشکری چند طرح سے ہوتی ہے۔ ایک یہ کہ نعمت اس کی طرف سے نہ سمجھے کسی اور کی طرف منسوب کرے۔ دوسری یہ اس نعمت سے فائدہ حاصل نہ کرے بلکہ اس کی ضد کی طرف گھوم جائے۔ تیسری یہ کہ منعم کی بجائے نعمت میں مشغول ہو جائے اور اس کے دل پر نعمت کی محبت اور اس قدر غلبہ کرے کہ اس میں ڈوب جائے اور منعم کو فراموش کر دے۔

وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ اور بیشک آدمی اپنی ناشکری پر گواہ ہے یعنی خود اقرار کرتا ہے کہ میں ناشکر ہوں اور دنیا میں یہ اقرار اس طرح واقع ہوتا ہے کہ ایک شخص دوسرے

سے کہتا ہے کہ فلاں آدمی اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتا حالانکہ خود بھی اس نعمت کا شکر ادا نہیں کرتا تو دوسرں پر طعن کرتا گویا اس امر کا اقرار ہے کہ میں بھی مطعون ہوں۔

وَإِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ اور بیشک وہ مال کی محبت میں بہت سخت اور مضبوط ہے یعنی نعمت کی محبت اس کے دل میں اس قدر اُتر چکی ہے کہ اس میں منعم کی محبت کے لیے کوئی گنجائش نہیں رہی ہے اگر کوئی کہے کہ میں ناشکر نہیں ہوں اور مجھے مال سے کوئی محبت نہیں تو یہ انکار خدا تعالیٰ کے حضور نہیں چلتا۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے کہ

أَفَلَا يَعْلَمُ إِذَا بُعْثِرَ مَا فِي الْقُبُورِ کیا وہ جانتا نہیں کہ جب قبروں میں جو کچھ ہے اُٹھایا جائے یعنی مردے زندہ ہوں اور جو کچھ زمین کے اندر ہے اس کے اوپر آ جائے اور باطن کا ظاہر کی طرف متوجہ ہونے کا آغاز ہو جائے یہاں تک کہ اخلاق' نیات اور مخفی عقائد کے ظاہر ہونے تک بات جا پہنچے۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے:

وَحُصِّلَ مَا فِي الصُّدُورِ اور جو کچھ سینوں میں ہے' ظاہر کر دیا جائے۔ پس اخلاق اور اعمال کو صورت میں ڈھال کر ظاہر کر دیا جائے اور اسے سامنے پیش کیا جائے تاکہ تمام مخلوقات کو ایک دوسرے کے دل میں چھپی باتوں کا علم حاصل ہو جائے اور اس وقت ہر کسی کو پتہ چل جائے کہ:

إِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ بیشک ان کا پروردگار اس روز ان کے متعلق ضرور خبردار ہے۔ اور اس کے دربار میں انکار نہیں چلتا۔ اور علمِ الٰہی اگرچہ ہر وقت بندے کے ظاہر و باطن کو محیط ہے لیکن اس روز اس کا علم ہر کسی پر ظاہر ہو جائے گا اور انکار کی گنجائش نہ رہے گی اور یہ جملہ یعنی إِنَّ رَبَّهُمْ بِهِمْ يَوْمَئِذٍ لَّخَبِيرٌ آیتہ أَفَلَا يَعْلَمُ الخ کے مفعول کے مقام میں واقع ہوا لیکن لام کے واسطے سے جو کہ خبر میں لایا گیا ہے اس نے لفظ میں عمل نہیں کیا مگر یہ کہ ان کو ہمزہ کی زبر سے پڑھے اور نحوی اسے تعلیق بلام کہتے ہیں اور یہ افعال قلوب کے خصائص میں سے ہو اور حدیث پاک میں آیا ہے کہ لوگوں نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے لَكَنُودٌ کے متعلق پوچھا۔ فرمایا کنود وہ ہے جو تنہا کھائے اور غلام کو مارے اپنے کنبے کو بھوکا رکھے اور کسی کو کچھ نہ دے اور قبیلے کی رسموں اور ضرورتوں کی

رعایت نہ کرے۔

سورۃ القارعہ

مکی ہے۔ اس کی آٹھ (۸) آیات' چھتیس (۳۶) کلمات اور ایک سو پچاس (۱۵۰) حروف ہیں۔

وجہ تسمیہ

اور اسے سورۂ قارعہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ ایک سخت حادثے پر دلالت کرتی ہے جو کہ قیامت کے دن ہوگا۔ اور دلوں کو سخت کوفت پہنچائے گا۔ اور اس حادثے کی تاثیر سے ثقیل اجسام ہلکے ہو جائیں گے اور سخت اجسام ریزہ ریزہ ہو جائیں گے۔ اور ان کے اجزاء کے درمیان باہمی رابطہ اور سنبھالا دینا دور ہو جائے گا۔ پس کسی چیز میں ثقل باقی نہیں رہے گا جو کہ کسی چیز کی اپنی جگہ پر حفاظت کا سبب ہوتا ہے اور نہ ہی مضبوطی رہے گی جو کہ اجزاء کے جمع ہونے کا موجب ہے۔ اور جب بوجھل ہونا اور ہلکا ہونا نیز جمع ہونا اور جدا جدا ہونا جو کہ دنیا کے دستور کے مطابق تھا' دگرگوں ہو گیا تو اس جہان میں ایک اور بوجھ اور خفت نیز ایک اور جمع ہونا اور جدا جدا ہونا ظہور کرے گا۔ پس بوجھ جنت کے درجات میں بلند ہونے کا موجب ہوگا جبکہ خفت جہنم کی گہرائی میں گرنے کا باعث ہوگی۔ بخلاف اس دستور کے جو کہ دنیا ہے کہ ثقل پستی کا موجب اور خفت بلندی کا باعث ہوتی ہے اور اس قسم کے عظیم انقلاب سے ڈرانا قرآن مجید کے مقاصد میں سے ایک اہم مقصد ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْقَارِعَةُ مَا الْقَارِعَةُ صدمہ پہنچانے والا حادثہ۔ کیا ہے وہ صدمہ پہنچانے والا حادثہ؟ یعنی قیامت جو کہ دلوں کو سخت کوفت پہنچائے' اونچے کو نیچا اور نیچے کو اونچا کر دے اس کی حقیقت کیا ہے اور اس میں یہ انقلاب کس وجہ سے ہوگا۔

وَمَا اَدْرٰىكَ مَا الْقَارِعَةُ اور تو کیا جانے کہ اس کوفت اور صدمہ پہنچانے والے حادثے کی حقیقت کیا ہے؟ اور چونکہ ہر چیز کو جاننا اس کے اسباب کو سمجھنے کی وجہ سے ہے

اور قیامت قائم ہونے کے اسباب جن میں سے ایک بڑا سبب سارے جہان پر قہر الٰہی کی تجلی ہے' کسی کو کما حقہ معلوم نہیں لہٰذا اسے بیان کرنے کے مقام میں صرف اس کی بعض تاثیرات پر اکتفاء فرمایا گیا ہے۔

يَوْمَ يَكُوْنُ النَّاسُ كَالْفَرَاشِ الْمَبْثُوْثِ وہ حادثہ اس روز ہوگا جس دن لوگ بکھرے ہوئے پروانوں کی طرح ہوں گے۔ ہر ایک ایک سمت کو جا رہا ہے۔ یہ تشبیہ چار وجوہ سے مرکب ہے۔ ذلت' حرکت کی کمزوری' حرکت کی بے انتظامی کہ کبھی جلد اور کبھی کچھ دیر سے ہو اور حرکت کی سمت کا متعین نہ ہونا کہ کبھی آگے کبھی پیچھے کبھی دائیں اور کبھی بائیں ہو۔

یہاں جاننا چاہیے کہ جسم میں بوجھ کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم جو کہ اعلیٰ اور بہتر ہے' وہ بوجھ ہے جو کہ وقار' مرتبے اور استواری کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور یہ معنی ان جسموں کے ساتھ مخصوص ہے جن کے ساتھ روح کامل کا تعلق ہوا ہے۔ اسی لیے جنات اور انسانوں کو ثقلین کہتے ہیں اور وہ حادثہ جو کہ روح میں بہت زیادہ اثر کرے اور اسے محو حیرت کر دے اس ثقل کو زائل کر دیتا ہے اسی لیے وقار اور مرتبے والے سے بے چینی اور گھبراہٹ کے وقت بے اختیار خلاف وقار حرکتیں سرزد ہوتی ہیں۔ اس لیے کہ اس کی روح حادثے کی دہشت کی وجہ سے جسم کی حفاظت سے عاجز آ جاتی ہے اور کسی قسم کے محرکات اور ارادے اس کی حرکتوں کے بے ربط ہونے کا موجب ہوتے ہیں اور یہاں اس ثقل کے انقلاب کا بیان ہے۔

اور دوسری قسم جو کہ عوام کے نزدیک زیادہ واضح ہے' طبعی ثقل ہے جو کہ سخت جسموں میں ان کے اجزاء کے اجتماع اور کثافت کی وجہ سے حاصل ہوتا ہے اس قسم کے بوجھ میں پہاڑوں کی مثال دی جاتی ہے اس قسم کے انقلاب کو دوسری آیت میں بیان فرمایا گیا ہے۔

وَتَكُوْنُ الْجِبَالُ كَالْعِهْنِ الْمَنْفُوْشِ اور پہاڑ مختلف رنگوں کی اون کی طرح ہوں گے جسے روئی دھنکنے والے نے اپنے کمال کے ساتھ چوٹ لگا کر ریزہ ریزہ کر کے

ہوا میں اُڑا دیا ہو۔

خلاصہ یہ کہ اس حادثے کی تاثیر جسموں میں سب سے زیادہ سخت جسم میں جو کہ پہاڑ ہے یہاں تک پہنچ گئی ہے کہ اس کے تمام اجزاء منتشر ہو گئے ہیں۔ اور اپنی جگہ سے حرکت کر کے ہوا میں بکھر گئے اور رنگین اون کا اعتبار اس لیے فرمایا گیا ہے کہ رنگین اون بے رنگ اون سے زیادہ ڈھیلی اور کمزور ہوتی ہے اور رنگوں کا اختلاف تشبیہ میں اس لیے ذکر فرمایا گیا کہ پہاڑوں کے رنگ مختلف ہوتے ہیں۔ بعض سنگِ مرمر کے طرح سفید' بعض سرخ اور وہ بھی سرخی کے مرتبوں میں مختلف ہیں جیسے سنگِ سرخ اور سنگِ بانسی۔ بعض سیاہ اور وہ بھی سیاہی کے مرتبوں میں مختلف ہیں جیسے سنگِ موسیٰ اور سنگِ خارا۔ بعض سبزی مائل جب سب پتھر کے اجزاء مختلف ہو جائیں۔ ایک کا رنگ دوسرے میں مل کر ہوا میں ایک عجیب چیز نمودار ہو چونکہ اس حادثے کی تاثیر کو اجمالی طور پر بیان فرمایا گیا اب اس اجمال کی تفصیل بیان فرمائی جارہی ہے۔

فَاَمَّا مَنْ ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ تو جس کے اعمال کا وزن بھاری ہو گیا اور یہ گرانی پوشیدہ بوجھ کی وجہ سے ہے جو کہ ان اعمال میں پوشیدہ تھا اور دنیا میں ظاہر نہ تھا اس دن ظاہر ہو گا' حقیقت میں وہ بوجھ اللہ تعالیٰ کے حضور ان اعمال کی فضیلت ہے۔ اور اسی بوجھ کی وجہ سے بندے کی اعمال نامہ میں ان اعمال کو محفوظ کرنے کی صورت بنتی ہے۔ نیز ہر اچھا عمل دنیا میں آدمی کے نفس پر دشوار اور بوجھل ہوتا ہے اور آدمی حکمِ الٰہی میں اس کی مشقت اور بوجھ برداشت کرتا ہے اور یہ بوجھ بھی اس روز ظاہر ہو گا اور اس کی وجہ سے آدمی کو ترقی حاصل ہو گی۔ چنانچہ بیان فرمایا جارہا ہے:

فَهُوَ فِيْ عِيْشَةٍ رَّاضِيَةٍ پس وہ شخص ایک پسندیدہ اور لذت والی زندگی میں ہو گا۔

وَاَمَّا مَنْ خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ اور جس کے اعمال کا وزن ہلکا ہو گیا' یہ ہلکا ہونا اس وجہ سے ہے کہ اس کے اعمال کی خدا تعالیٰ کے حضور کوئی وقعت نہیں۔ نیز چونکہ خواہش نفس کے مطابق تھے اس لیے نفس پر دشوار اور گراں نہ ہوئے۔ پس قیامت کے دن یہ ہلکا پن اس بات کا موجب ہوا کہ وہ اعمال محفوظ نہ رہے اور بکھر گئے اس شخص کے لیے انتہائی

تنزلی اور تاریکیوں میں گرائے جانے کا باعث ہو گئے۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے کہ:

فَاُمُّهٗ هَاوِيَةٌ تو اس شخص کی ماں جہنم کا نچلا طبقہ ہے۔ ماں اس لیے فرمایا کہ بچے کو بے تکلفی کی حالت اور امر طبعی کی ضرورت کے وقت ماں کی طرف لوٹنا ہوتا ہے۔ چونکہ اس دن وہ تکلف اور بناوٹ جو کہ لاپرواہ لوگ دنیا میں کرتے تھے' بالکل ختم ہو جائے گی تو بے اختیار جہنم کے اسی طبقے کی طرف رجوع کریں گے گویا اس کی طرف طبعاً مائل ہیں اور وہ طبقہ جہنم انہیں ماں کی طرح اپنی طرف کھینچتا اور جگہ دیتا ہے۔

وَمَاۤ اَدْرٰىكَ مَا هِيَهْ اور تو کیا جانتا ہے کہ وہ ہاویہ کیا ہے؟ یعنی جو عذاب اس طبقہ جہنم میں ہے' کسی انسان کو معلوم نہیں ہو سکتا۔ ماهیه میں سکتہ کی ہا توقف کے لیے ہے اور لغتِ عرب میں اسے ہائے سکتہ کہتے ہیں ورنہ اصل کلمہ ہا کے بغیر ماھی ہے۔

نَارٌ حَامِيَةٌ ایک نہائت گرم آگ ہے۔ یعنی جہنم کے جس طبقے کا نام ہاویہ ہے اسے بیان کرنے میں اس قدر سے زیادہ ممکن نہیں ہے کہ بہت گرم آگ ہے۔ اس حد تک کہ اس کے مقابلے میں اور آگ کو گرم نہیں کہا جا سکتا اور جہنم کے دوسرے طبقوں کو اس کے سامنے گرم شمار نہیں کیا جا سکتا۔ اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے اور ہر قسم کے عذاب سے پناہ دے۔

سورۂ تکاثر

مکی ہے' اس کی آٹھ (۸) آیات اٹھائیس (۲۸) کلمات اور ایک سو بیس (۱۲۰) حروف ہیں۔

سببِ نزول

اس سورۃ کے نزول کا سبب یہ تھا کہ ایک دن قریش کے دو گروہوں نے ایک دوسرے پر فخر کیا۔ بنو عبد مناف نے جن میں سے ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ہیں اور بنو سہم نے جن کا سردار عاص بن وائل تھا' ہر ایک نے دعویٰ کیا کہ ہم مال' عمدہ کاموں' شادیوں' ضیافتوں' شہرت اور مرتبے کے اعتبار سے تم سے زیادہ ہیں اور یہ باہم فخر

کا اظہار رفتہ رفتہ افراد کی کثرت تک جا پہنچا۔ جب بنو عبد مناف نے اپنی مردم شماری کی تو زیادہ نکلے۔ بنو سہم نے کہا کہ ہمارے افراد لڑائیوں میں بہت مارے گئے ہیں۔ چاہیے کہ زندوں اور مردوں کو ملا کر گنتی کریں جب ایسا کیا گیا تو بنو سہم زیادہ ہو گئے اس دوران مردوں کی تحقیق کے لیے قبرستانوں میں گئے اور گورستانوں میں گھومے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی جہالت اور جو کچھ انہیں ضروری تھا اس سے ان کی پوری غفلت کے بیان میں یہ سورۃ نازل فرمائی۔

وجہ تسمیہ

اور اس سورۃ کو سورۂ تکاثر اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں تکاثر یعنی کثرت مال پر فخر کرنے کی مذمت بیان کی گئی ہے اور اس کا بیان یہ ہے کہ تکاثر سے اس طرح ڈرنا چاہیے جس طرح کہ قیامت سے اس لیے کہ تکاثر بندے اور اس کے مطلوب کے درمیان ایک سخت حجاب ہے اور ہر حجاب اپنے پیچھے عذاب کو چاہتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلْهٰكُمُ التَّكَاثُرُ تمہیں تکاثر نے غافل کر دیا تکاثر کا معنی زیادتی طلب کرنا ہے اور آدمی آخری عمر میں احوال' اولاد' پیروکاروں اور اقارب کی کثرت کا خواہاں ہوتا ہے تاکہ ان کی مدد کی وجہ سے اس کا مرتبہ اور شہرت ختم نہ ہو۔ اور یہ بات انہیں معرفتِ الٰہی' اس کے اسماء' صفات اور افعال میں غور و فکر' حقوق اللہ اور حقوق العباد کے واجبات اور آخرت میں اپنے نفس کے حقوق سے غافل کر دیتی ہے۔ اور وہ اس غفلت کی وجہ سے نعمتوں کو اس چیز کے لیے خرچ کرنے سے محروم رہتا ہے جس کے لیے وہ نعمتیں مقرر ہیں۔ تو تکاثر آدمی کو گویا آدمیت سے نکال دیتا ہے اور حیوانات کے درجے میں داخل کر دیتا ہے۔ اور اگر یہ غفلت کسی مرشد کی ہدایت اور کسی بزرگ کی تنبیہ سے جلد زائل ہو جائے تو پھر آدمیت کی حد تک پہنچ گیا اور راہِ حق کے سلوک کی صلاحیت حاصل کر لی۔ اور اگر اسی غفلت میں رہا اور ہوش میں نہ آیا اور اسی حالت میں مر گیا تو انتہائی خسارے میں رہا اور اس شخص کے مشابہ ہو گیا جسے سرمایہ دے کر بازار بھیجا گیا کہ تجارت کرے اور نفع

حاصل کرے اور یہ شخص بازار میں چلا گیا' شراب پی اور بیہوش ہو کر سارا سرمایہ داؤ پر لگا دیا حتیٰ کہ شام کے وقت اسے اُٹھا کر اس کے گھر پہنچایا گیا۔ سرمایہ رہا نہ نفع پایا۔ ایسی صورتِ حال سے اللہ تعالیٰ کی پناہ اور اس کلمہ میں اسی حالت کی طرف اشارہ ہے۔

حَتّٰی زُرْتُمُ الْمَقَابِرَ حتیٰ کہ تم نے قبروں کی زیارت کی یعنی تم اسی شغل میں تھے اور بالکل ہوش نہ کی یہاں تک کہ گورستان میں پہنچ گئے۔

کَلَّا مقدمہ یوں نہیں ہے جیسا کہ تم نے سمجھا ہے یعنی تم گمان کرتے ہو کہ موت کے بعد جو کمال ہے بس یہی ہے کہ بے پناہ دولت صاحبِ اقبال اولاد' اور جان نثار رشتے دار بعد میں تمہیں قائم رکھیں حالانکہ موت کے بعد ایک اور چیز پیش آئے گی جس کے مقابلے میں یہ چیزیں بالکل ہیچ ہوں گی۔

بیت

حاصل دنیا کہن تا بنو

چو گذرندہ است نیرزد بجو

یعنی نئی اور پرانی دنیا جب گزرنے والی ہے تو اس کا فائدہ جو کے برابر بھی نہیں۔

اور اگر کسی گہری سوچ کے بغیر ہی ہر عقل مند کو معلوم ہے کہ مال' اولاد' مرتبے اور رشتے داریاں سب فانی ہیں جو چیز فانی ہے باہم فخر کرنے کے لائق نہیں ہے۔

سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ آخر تمہیں معلوم ہو جائے گا یعنی موت کے بعد تمہیں پتہ چل جائے گا کہ تم نے جس مصروفیت میں اپنی عمر گزاری تمہارے لیے سب نقصان دہ اور باعثِ خرابی تھی۔ کیونکہ ابدی نعمتیں ضائع ہونے اور قہرِ الٰہی کی طرف قریب ہونے کا باعث ہوئی۔

ثُمَّ کَلَّا ہم پھر کہتے ہیں کہ معاملہ اس طرح نہیں ہے جس طرح کہ تمہارا عقیدہ ہے۔ سَوْفَ تَعْلَمُوْنَ آخر تمہیں قبروں سے اُٹھنے' حشر و نشر' جہنم اور اس کی شدید ہولناکیوں کو دیکھنے کے بعد پتہ چل جائے گا کہ تم نے جو کچھ کیا' سب نقصان اور خرابی پر مبنی تھا۔ پس پہلا جاننا برزخ میں ہے جبکہ دوسرا جاننا قیامت کے دن ہے۔

كَلَّا لَوْ تَعْلَمُوْنَ عِلْمَ الْيَقِيْنِ باہم فخر مت کرو' معاملہ یوں نہیں ہے اگر تم اس طرح جانتے کہ جس میں کوئی شک وشبہ نہ ہو اور تم سے ظلمتوں کے بعض حجاب کھل جائیں اور لازماً جان لو کہ

لَتَرَوُنَّ الْجَحِيْمَ موت کے بعد برزخ میں گرم ہوا چلنے' عذاب کی صورت دیکھنے اور آتشیں گرزوں کے ساتھ مارنے کے ساتھ تم جہنم ضرور دیکھو گے۔ ثُمَّ لَتَرَوُنَّهَا عَيْنَ الْيَقِيْنِ پھر تم اس جہنم کو یقینی معائنے کے ساتھ ضرور دیکھو گے جس میں شبہ' خیال کے غلبے اور جس کی غلطی کا احتمال نہیں ہوگا اور یہ دیکھنا قیامت کے دن ہوگا جبکہ جہنمیوں کو اس کے کنارے کھڑا کریں اور اس کی ہولناکیوں اور شدتوں کو ان پر نمایاں کریں۔

ثُمَّ لَتُسْئَلُنَّ يَوْمَئِذٍ عَنِ النَّعِيْمِ پھر تم سے اس دن ان نعمتوں کے متعلق ضرور پوچھا جائے گا جو کہ تمہیں دنیا میں عطا کی گئیں تھیں اور ان سب نعمتوں نے تمہیں کسب خیر سے غفلت میں ڈال دیا۔

اور نعمتوں کے متعلق تین وجوہ سے سوال ہوگا۔ پہلی وجہ یہ کہ تم نے اس نعمت کو کس طرح حاصل کیا؟ حلال طریقے سے یا حرام طریقے سے؟ دوسری وجہ یہ کہ اس نعمت کو تم نے کہاں خرچ کیا؟ اللہ تعالیٰ کی رضا کے مطابق یا خلاف رضائے خداوندی؟ تیسری وجہ یہ کہ اس نعمت کے شکریہ میں تم نے کیا کیا؟

یہاں جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ نے بندے کو جو کچھ اس کی ضرورت سے زیادہ عطا فرمایا ہے جس پر اس کی روزی اور زندگی موقوف نہیں ہے اور سب کا سب اس قبیلے سے ہے جس کے متعلق سوال ہوگا۔ بندوں میں سے کوئی بھی اس سے خالی نہیں ہوگا۔ گو فقیر اور گدا ہو اسی لیے کہتے ہیں کہ ٹھنڈا پانی' گرم روٹی' ٹھنڈا سایہ' نیند کی لذت' خلقت انسانی کا اعتدال' اسلام' قرآن پاک' ہمارے رسول کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود مسعود اور اس شریعت کا آسان ہونا ایسی نعمتیں ہیں جن میں امیر غریب سب مسلمان شریک ہیں اور ان کی قدر نہیں پہچانتے۔

اور بعض نے کہا ہے کہ جن نعمتوں کے متعلق پوچھا جائے گا' تین چیزیں ہیں: صحت'

جوانی اور امن اور کوئی شخص بھی اپنی عمر میں ان تین چیزوں سے خالی نہیں رہتا اگرچہ ان سے ہمیشہ فائدہ حاصل نہ کرے اور حدیث شریف میں وارد ہے کہ ایک فقیر بارگاہِ سید عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم میں حاضر ہوا اور عرض کرنے لگا کہ یارسول اللہ! (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے دنیا میں کیا نعمت حاصل ہے جس کے متعلق مجھ سے سوال کیا جائے گا؟ آپ نے فرمایا ٹھنڈا پانی اور سایہ۔ نیز صحیح حدیث شریف میں وارد ہے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم، امیرالمومنین حضرت ابوبکر صدیق، حضرت عمر بن الخطاب اور چند اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم حضرت ابوالہیثم کے گھر مہمان ہوئے اور گرم روٹی کھجور کے ساتھ کھائی اور ٹھنڈا پانی پیا۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا کہ یہ وہ نعمتیں ہیں جن کے متعلق تم سے سوال ہوگا۔

سورۂ والعصر

مکی ہے، اس کی تین (۳) آیات، چودہ (۱۴) کلمات اور اڑسٹھ (۶۸) حروف ہیں۔

سببِ نزول

اس سورت کے نزول کا سبب یہ ہے کہ کلدہ بن اسید جسے ابوالاسد بھی کہتے ہیں، ایک کافر تھا جو کہ جاہلیت کے دور میں امیرالمومنین حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا ساتھی تھا۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے اسلام لانے کے بعد ایک دن آپ سے ملا اور کہنے لگا کہ اے ابوبکر تو تجارت اور سوداگری میں عقل مندی اور ہوشیاری کی وجہ سے ہمیشہ نفع حاصل کرتا تھا اب تجھے کیا ہوگیا کہ ایک دم تو نے اتنا نقصان اُٹھایا کہ اپنے باپ کا دین چھوڑ دیا اور لات و عزیٰ کی پوجا سے محروم ہوگیا اور ان کی شفاعت سے ناامید ہوگیا۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے اس بے وقوف کے جواب میں فرمایا کہ جو حق کو قبول کرے اور اچھے کام کرے، نقصان نہیں اٹھاتا۔ اللہ تعالیٰ نے اس مذاکرہ کے بیان اور حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کی گفتگو کو درست قرار دینے کے لیے یہ سورۃ نازل فرمائی۔

وجہ تسمیہ

اور اس سورۃ کو سورۂ عصر اس وجہ سے کہتے ہیں کہ اس کی ابتداء میں عصر کی قسم فرمائی گئی ہے۔ عصر کے دو معنے ہیں: ایک معنی زمانہ ہے کہ اس میں سے انسان کی عمر بھی ہے اور انسان کی عمر ایک انتہائی نفیس چیز اور ایک قیمتی دولت ہے جس کی وجہ سے انسان سے دینی اور دنیوی کمالات کا کسب ممکن ہوا۔ یہ اس کے سرمایہ اور راس المال کے قائم مقام ہے۔ لیکن اس میں عیب یہ ہے کہ خود بخود گم ہو کر چلی جاتی ہے اور اگر یہ صحیح عقائد' اچھے اعمال اور روشن احوال حاصل کرنے میں صرف نہ ہو تو بڑا نقصان اور خسارہ حاصل ہوتا ہے۔ اگر ان چیزوں میں صرف ہوئی تو اس کی وجہ سے ایک طویل ابدی عمر اور ایک لذیذ دائمی زندگی کسب کی جاتی ہے۔ پس انسان کو اس جہان میں بھیجا گیا ہے اور سرمائے اور راس المال کے بجائے اسے ایک عمر دی گئی ہے۔ اس کی مثال برف فروش کی ہے کہ اس کی تجارت کا سرمایہ خود بخود نقصان اور پگھلنے کے در پے ہے۔ اگر اس کے بدلے اس نے کوئی قیمتی چیز حاصل کر لی تو درست ہو۔ ورنہ خسارہ اور نقصان موجود ہے اور یہ تجارت اور سودا انتہائی عجیب ہے جس کی قسم اُٹھائی گئی۔

دوسرا معنی دن کا آخری حصہ جو کہ نمازِ عصر کا وقت ہے اور وہ وقت نفع اور نقصان ظاہر ہونے کا وقت ہے۔ اس لیے کہ روزی کا ہر طالب صبح سے مال کی کثرت حاصل کرنے اور روزی تلاش کرنے میں قسم قسم کی گردشیں' حیلے اور تدبیریں کرتا ہے۔ جب دن کا آخری حصہ آیا' وہ سب تدبیریں اور حیلے ختم ہو گئے۔ اس وقت ہر شخص اپنے کام سے فارغ ہو جاتا ہے' تاجر اپنی دُکان بڑھا کر گھر کی راہ لیتا ہے۔ اگر اس نے کوئی چیز حاصل کر لی تو فبہا ورنہ خسارے میں رہا۔ چونکہ یہ وقت نقصان ظاہر ہونے کا وقت ہے اس وقت کی قسم اُٹھائی گئی بلکہ اگر کوئی غور کرے تو دینی نفع اور نقصان کے ظہور کا وقت بھی وہی ہے۔ اس لیے کہ دن اور اس کی رات کے اعمال پورے ہوئے جو حالات کسب کرنے کے تھے' کسب کر لیے گئے اب روزنامچہ دیکھنے کا وقت ہے کہ کیا گیا اور کیا رہا؟ پس یہ وقت طالبانِ دنیا میں بھی اور طالبانِ آخرت میں بھی ایک عظمت رکھتا ہے اس لائق ہے

کہ اس کی قسم اُٹھائی جائے۔

اور صحیح حدیث میں آیا ہے کہ جس کی نمازِ عصر فوت ہو گئی' وہ ایسا ہے گویا اس کا گھر بار برباد ہو گیا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ عصر سے مراد حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا عہد مبارک ہے کہ آپ کی بعثت کی وجہ سے نفع ونقصان کا بازار گرم ہوا جس نے آپ کی غلامی کی ایسا نفع پایا کہ ابدالآباد تک باقی ہے۔ اور جس نے نافرمانی کی اسے ایسا نقصان ہوا جس کی حد ہی نہیں۔ پس وہ زمانہ انوارِ الٰہی کی کثرت' لامتناہی علوم کے فیضان' دُور پڑے ہوؤں کو قریب کرنے اور گناہ گاروں کو بخشنے کی وجہ سے ایسی عظمت رکھتا ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام کی ابتداء سے لے کر اس وقت تک کسی زمانے میں اس کا سواں حصہ بھی وقوع پذیر ہوا نہ ہوگا اور کیا ہی اچھا کہا گیا:

خوشا عہدے کہ مردم آدم بے سایہ راو یدند
غریب است ایں زماں گر سائیہ آدم شود پیدا

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَالْعَصْرِ زمانے کی قسم کہ جس میں سے انسان کی عمر ہے جو کہ صحیح عقائد' اعمال صالحہ اور پاکیزہ حالات حاصل کرنے میں اس کے سرمائے کے قائم مقام ہے یا نمازِ عصر کے وقت کی قسم ہے جو کہ دن اور رات کے اعمال میں نفع اور نقصان کے ظہور کا وقت ہے یا ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے زمانے کی قسم ہے جو کہ نورِ نبوت کے ظہور کا زمانہ اور ولایات کے پھیلنے کا وقت ہے اس وقت جو بھی اس نور سے منور ہوا اس نے دائمی نفع حاصل کر لیا جو اس نور سے محروم رہا' اسے کلی خسارا اور ہمیشہ کا نقصان نصیب ہوا۔

اِنَّ الْاِنْسَانَ لَفِيْ خُسْرٍ بیشک ہر آدمی ایک قسم کے خسارے میں ہے اس لیے کہ اس کا راس المال جو کہ اس کی عمر ہے' لمحہ بہ لمحہ گھٹ رہی ہے جس کی وجہ سے قربِ الٰہی' اس کی رضا اور اس کا ثواب حاصل کرنے کا موقع ملتا ہے اس کے ہاتھ سے نکل رہی ہے۔
اور اگر وہ عمر گناہوں اور فانی خواہشات کے شغل میں گزاری جو کہ دربارِ خداوندی سے

دُوری اور اس کے غضب اور عذاب کا باعث ہیں تو خسارے پر خسارہ بڑھ گیا۔

اِلَّا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا مگر جو لوگ ایمان لائے یعنی انہوں نے اپنی عمر سے فائدہ اُٹھایا اس لیے کہ ایمان معرفت کی ایک قسم ہے اور وہ ابدی سعادت کا ذریعہ اور قربِ الٰہی اور فرشتوں کی درستی کا موجب ہے۔

وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ اور انہوں نے اچھے اعمال کیے۔ اس لیے کہ نیک اعمال کی وجہ سے انہیں پسندیدہ اخلاق حاصل ہوئے اور دنیا میں بابرکت حالات اور اونچے مرتبے اور آخرت میں بلند درجات نصیب ہوئے۔ پس انہیں نفع حاصل ہوا اور یہ سب کامل ہونے کے مرتبے ہیں اگر انہوں نے ان کے ساتھ ساتھ کامل کرنے کا رُتبہ اور ہدایت و تعلیم دینے کا مقام بھی حاصل کر لیا تو دوگنا نفع کمایا۔ چنانچہ اس آیت میں کامل کرنے کے مرتبے کی طرف اشارہ فرمایا جارہا ہے۔

وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ اور انہوں نے ایک دوسرے کو صحیح عقائد' نیک اعمال اور اچھے اخلاق کی وصیت کی۔

وَتَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ اور ایک دوسرے کو صبر کی تلقین کی۔ یعنی نفس کو خواہشات سے روکنے' نفس کو نیکیوں کی مشقت پر پابند کرنے اور مصائب اور سختیوں کے ہجوم کے وقت نفس کو رضا و تسلیم پر کاربند کرنے کی نصیحت کی تمام نیکیاں صبر کی ان تینوں قسموں کے گھیرے میں ہیں اور یہ تمام گناہوں اور خواہشوں سے دُور رکھنے والی ہیں۔

حق اور صبر کی وصیت کی حکمت

اور ان دونوں الفاظ یعنی حق اور صبر کو یہاں لانے میں اس بات کا اشارہ ہے کہ ارشاد تکمیل کا مرتبہ بمنزلہ طب روحانی کے ہے اور طب میں دو چیزوں کے سوا چارہ نہیں: ایک تو دوا تجویز کرنا' دوسرا پرہیز کا حکم دینا۔ پس وَتَوَاصَوْا بِالْحَقِّ بمنزلہ دوا کے ہے اور تَوَاصَوْا بِالصَّبْرِ پرہیز بیان کرنے کا کنایہ ہے۔ ان دو عظیم امور کے بغیر روحانی صحت کا حصول محال ہے جب یہ دونوں کام سرانجام پائے تو روحانی طب کا کام درست ہو گیا اور ارشاد و تکمیل کا پروگرام منظم ہوا اور اس پروگرام میں جو نفع اور فائدہ حاصل ہوتا ہے'

حساب کی حد سے زیادہ اور قیاس کے گھیرے سے باہر ہے۔

صحابہ کبار' ائمہ مجتہدین اور مشائخ طریقت کی عظمت

اسی لیے صحابہ کبار علیہم الرضوان جن کے ارشاد و تکمیل کی بدولت تمام اُمت صراطِ مستقیم پر گامزن ہے۔ اسی طرح ائمہ مجتہدین جن کے مذاہب کی روزِ قیامت تک پیروی ہورہی ہے۔ اور طریقت کے خاندانوں کے مشائخ جن کی وصیتوں کے مطابق طالبین اور مریدین انتہائے دنیا تک عمل کرتے چلے جا رہے ہیں اور درجات قرب تک رسائی حاصل کر رہے ہیں' کے ثواب کے برابر کوئی ثواب نہیں اور یہ نفع کا مرتبہ کمال ہے کہ تھوڑی سی عمر میں طویل صدیوں اور زمانوں کا ثواب کسب کرلیا گیا۔

اور وصیت کا لفظ اگرچہ عرف میں ایسی چیز کے ساتھ مخصوص ہے جس کا موت کے بعد حکم دیا جاتا ہے لیکن قرآن پاک کے عرف میں تاکیدی امر کو جگہ جگہ وصیت کا نام دیا گیا ہے۔ قال اللّٰہُ تعالیٰ وَوَصَّیْنَا الْاِنْسَانَ بِوَالِدَیْہِ اِحْسَانًا اس لفظ کو اس مقام میں وارد کرنے میں ایک باریک نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ ارشاد و تکمیل کے مرتبے کا حصول لطیفہ نفس اور دوسرے لطائف کی فنا کے بعد ہے اور فانی میت کے حکم میں ہے۔ پس وہ جو حکم دے گویا وصیت ہے جو کہ اس نے مرنے کے بعد فرمائی ہے۔

سورۂ ھمزہ

سورۂ ہمزہ مکی ہے' اس کی نو (۹) آیات' تیئس (۲۳) کلمات اور چھیانوے (۹۶) حروف ہیں۔

سبب نزول

اور اس سورۃ کے نزول کا سبب یہ ہے کہ کفار میں سے تین بدبخت یعنی عاص بن وائل سہمی' ولید بن مغیرہ اور اخنس بن شریق ثقفی ہر مجلس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اور اہل ایمان کی بدگوئی کرتے اور ان کے بارے میں زبان طعن دراز کرتے اور ان میں سے اخنس بن شریق تو حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے روبرو بکواس کرتا اور بے حیائی کا مرتکب

ہوتا۔ ان کے متعلق یہ سورۃ نازل ہوئی۔

وجہ تسمیہ

اور اسے سورۂ ہمزہ اس لیے کہتے ہیں کہ یہ اس امر پر دلالت کرتی ہے کہ جو شخص کسی کی آبروریزی کرے اور لوگوں کے عیب تلاش کرے' ہلاکت اور عذاب کا مستحق ہے تو جو اللہ تعالیٰ اور اللہ تعالیٰ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عظمت کے خلاف بکے' قرآن مجید کی تکذیب اور اس کے احکام کے ساتھ عناد رکھے اس کا حال کیا ہوگا۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَيْلٌ لِّكُلِّ هُمَزَةٍ لُّمَزَةٍ ہر عیب نکالنے والے بدگوئی کرنے والے پر ہلاکت ہو۔ ان دونوں لفظوں کی چند وجوہ کے ساتھ تفسیر کی گئی ہے: پہلی وجہ یہ کہ دونوں لفظوں کا معنی ایک ہی ہے پس تکرار تاکید کے لیے ہے اور یہ اشارہ کرنے کے لیے کہ اس شخص کو اس فعل شنیع کی عادت ہے اور یہ فعل اس سے تکرار کے ساتھ صادر ہوتا ہے۔ چنانچہ فعلۃ کا صیغہ اس پر دلالت کرتا ہے۔

دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمزہ اسے کہتے ہیں جو روبرو بدگوئی کرے جبکہ لمزہ اسے کہتے ہیں جو پس پشت کہے۔

تیسری وجہ یہ ہے کہ ہمزہ وہ ہے جو آنکھ کے ساتھ اور سر' ہاتھ اور ابرو کے اشارے سے لوگوں کی حقارت کرے۔ جبکہ لمزہ وہ ہے جو زبان کے ساتھ اس فعل شنیع کا مرتکب ہو۔

بہر حال دونوں الفاظ معنوں میں ایک دوسرے کے قریب ہیں۔ اور تکرار کا قصد لوگوں کی ہتک عزت سے بچنے کی تاکید ہے او غالب طور پر یہ فعل شنیع نسب میں یا افعال میں طعن کرنے کی صورت میں ظاہر ہوتا ہے۔ چونکہ اس قسم کے افراد مخلوقِ خدا کی نظر میں لوگوں کو برا قرار دینے اور انہیں ستانے میں مبالغہ کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بھی ان کی جزا میں ہمیشگی کو لازم کرتے ہوئے ایک عذاب کا وعدہ فرمایا ہے جس کا پتہ ویل سے چلتا ہے اس لیے کہ لغت عرب میں ویل کا معنی شدید اور جدا نہ ہونے والی مصیبت ہے۔

اور جاننا چاہیے کہ اس بُری عادت کی بنیاد لوگوں پر فخر چاہنا ہے۔ اور غالب طور پر اس کا منشا مال کی کثرت ہے۔ اس لیے کہ اکثر لوگوں کا مال ان کی لیاقت کے بغیر ہی ان کے ہاتھ آتا ہے۔ اور وہ چاہتے ہیں کہ اس مال کے ساتھ دوسرں پر بڑائی اور برتری کا اظہار کریں۔ اور چونکہ بڑائی اور برتری جتلانا مال ہی میں منحصر نہیں ہے بلکہ عمدہ نسب' طبعی حسن' اعمال صالحہ اور اچھے اخلاق بھی اس کے اسباب میں سے ہیں۔ ناچار ان وجوہ میں سے مال داروں کی ان کے برابر والوں کے مقابلہ میں مذمت شروع کی جاتی ہے تاکہ وہ اپنے فخر جتلانے کی وجہ درست کریں اسی مقصد کے لیے ہمزہ اور لمزہ کو اس صفت کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ:

اَلَّذِیْ جَمَعَ مَالًا وَّعَدَّدَہٗ وہ جس نے بے پناہ مال جمع کر لیا ہے اور اسے گن گن کر رکھا ہے' گننے کا ذکر کرنے میں اس امر کا اشارہ ہے کہ وہ تقسیم کرنے اور خرچ کرنے کے لیے مال جمع نہیں کرتا بلکہ بخل کرتا ہے۔ اور اسے بار بار شمار کرتا ہے۔ تاکہ اس میں سے کچھ کم نہ ہو جائے۔ تو اس میں حرص اور بخل دونوں چیزیں اکٹھی ہو گئیں اس قسم کے لوگوں سے اگر بخل کی وجہ پوچھی جائے تو کہتے ہیں کہ ہم زمانے کے حادثوں اور دن رات کی گردشوں کے لیے اموال سنبھال کر رکھتے ہیں اسی لیے اس کے بارے میں یہ ارشاد ہو رہا ہے کہ:

یَحْسَبُ اَنَّ مَالَہٗ اَخْلَدَہٗ وہ گمان کرتا ہے کہ اس کا مال اسے دنیا میں ہمیشہ رکھے گا یعنی اس سے موت کے اسباب دُور کر دے گا۔ کَلَّا ایسا نہیں جیسا کہ وہ عقیدہ رکھتا ہے اس لیے کہ دنیا کے پیدا ہونے کے آغاز سے ہی ہمیشہ مال دار ہوئے ہیں اور کوئی شخص بھی اپنی ذات سے موت کے اسباب کو دُور نہیں کر سکا۔ بلکہ بخل کے ہوتے ہوئے مال کی کثرت قیامت کے عذاب کی شدت کا باعث ہے۔ چنانچہ فرمایا جا رہا ہے لَیُنْۢبَذَنَّ یہ شخص ضرور پھینکا جائے گا جس میں بدخلقی' بدزبانی' حرص اور بخل جمع ہیں۔

فِی الْحُطَمَۃِ توڑنے والی آگ میں۔ اس کی عادت توڑنا ہے جبکہ یہ آگ اس شخص کے شیرازہ کو توڑنے اور بکھیرنے والی ہے۔ اس لیے کہ آگ کا پہلا قبضہ صورت پر

ہے جو کہ جلنے کے بعد انتہائی قبیح ہو جاتی ہے۔ اس کے بعد گوشت اور کھال تک نوبت پہنچتی ہے اس کے بعد ہڈیاں توڑنے تک معاملہ پہنچتا ہے۔ پس اس کی ذات قائم رہے گی نہ اس کا حسن و جمال' جس مال کا نتیجہ یہ ہوا سے ہمیشہ رہنے کے اسباب میں سے خیال کرنا انتہائی حماقت ہے چونکہ آگ کا اس قدر اثر جو کہ لفظ حطمہ میں ذکر کیا گیا' عناصر کی آگ' ستاروں کی آگ اور مزاج کی آگ میں جو کہ تپ محرقہ میں ہوتا ہے' مشترک ہوتا ہے جبکہ حطمہ کی آگ ان سب سے بڑی ہے اس لیے اس آگ کی حالت کی صورت بیان کرنے اور اس کے عمل کا کچھ جلوہ ذکر کرنے کے لیے سوال و جواب کے طریقے سے ایک اور ارشاد ہو رہا ہے۔

وَمَا اَدْرٰكَ مَا الْحُطَمَةُ اور تو کیا جانتا ہے کہ وہ توڑنے والی کیا ہے۔ یعنی وہ آگ عقل والوں اور حکمت والوں کی پہچان سے بالاتر ہے اس لیے کہ ان کے نزدیک حرارت تین قسموں سے باہر نہیں ہے۔ یا عنصری ہے جیسے آگ کی گرمی۔ یا ستاروں کی ہے جیسے سورج کی گرمی یا مزاج کی ہے جیسے بخار اور حرکت کی گرمی۔ جبکہ یہ آگ اسباب کی وجہ سے نہیں تا کہ کسی کے قیاس میں آئے۔

نَارُ اللّٰهِ یہ خدائی آگ ہے یعنی اس کے غضب اور قہر کی آگ ہے الْمُوْقَدَةُ جو کہ بندوں کے گناہوں' بے اعتدالیوں اور بے ادبیوں کے ساتھ جلائی گئی ہے۔

الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ وہ آگ جو کہ دلوں پر چڑھتی ہے۔ اس کلام کی حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں جو بھی آگ ہے اس کا اثر پہلے جسم پر ہوتا ہے۔ اس کے بعد اس پر جو کہ جسم کے اندر ہے جیسے اخلاط' ارواح اور اجزائے اصلیہ تک پہنچتا ہے۔ اور قہر الٰہی کی یہ آگ پہلے نفس ناطقہ کو صدمہ پہنچاتی ہے۔ اور وہاں سے قلب تک پہنچتی ہے جو کہ اعضاء میں سب سے زیادہ دکھ محسوس کرتا ہے۔ اور تھوڑی سی تکلیف سے خلل میں پڑ جاتا ہے۔ تو جب اس آگ کا ہجوم پہلے دل پر ہوا تو دکھ اور درد پہنچانے میں نقطہ انتہاء پر ہوگی۔ اور دنیا میں جو آگ اس سے مشابہت رکھتی ہے' بخار کی آگ ہے کہ اگرچہ اس کی گرمی اخلاط' ارواح اور اعضائے اصلیہ پر پہلی نشست کرتی ہے لیکن اس کی تکلیف سب سے پہلے دل

تک پہنچتی ہے۔ وہاں سے باقی اعضاء تک جاتی ہے۔

اس لیے حدیث شریف میں وارد ہے کہ الحمی من فیح جھنم یعنی بخار جہنم کی سانس سے ہے۔ نیز وارد ہوا ہے کہ الحمی حظ المومن من النار یعنی بخار آخرت کی آگ سے مومن کا حصہ ہے۔ لیکن اس وعدہ شدہ آگ سے دو وجہ سے ہلکا ہے: ایک وجہ یہ کہ نفس ناطقہ مجردات میں سے ہے' اتنا متاثر نہیں ہوتا۔ دوسری وجہ یہ کہ اس آگ کے بخارات اور اس گرمی کا دھواں جسم کے مساموں سے باہر آ جاتا ہے اور پسینہ آتا ہے اور یوں تخفیف کا موجب ہوتا ہے۔ بخلاف اس موعود آگ کے کہ اس کا حال یہ ہے کہ:

اِنَّهَا عَلَيْهِمْ مُّؤْصَدَةٌ تحقیق وہ آگ ان پر سرپوش کی گئی ہے یعنی ان کے اعضاء کے اندر بند کر دی گئی۔ کہ گرم سانس اندر سے باہر نہیں آتا اور ٹھنڈا سانس باہر سے اندر نہیں آتا تا کہ کسی قدر تخفیف حاصل ہو۔ چونکہ بعض اوقات ہاتھ پاؤں مارنے اور جسم کو دیوار اور زمین پر پٹخنے سے کسی قدر مسام کھل جاتے ہیں اور تخفیف حاصل ہوتی ہے' ان سے اتنی طاقت بھی سلب کر لی گئی ہے اور فرمایا جا رہا ہے:

فِيْ عَمَدٍ مُّمَدَّدَةٍ یہ سب کے سب لمبے ستونوں میں لٹکائے ہوئے ہوں گے اور انہیں رسیوں میں باندھ کر مضبوطی کے ساتھ جکڑا جائے گا تا کہ ہاتھ پاؤں نہ ماریں اور ان کی اندرونی گرمی کسی طرح بھی کم نہ ہو۔ بعض مفسرین نے یوں نقل کیا ہے کہ جہنم کی آگ کو اوپر سے ڈھانک کر اس سرپوش کے اوپر لمبے ستون ڈال دیں گے تا کہ کسی طرح بھی اس میں ہوا کا آنا ممکن نہ ہو۔ واللہ اعلم

سورۂ فیل

مکی ہے' اس کی پانچ (۵) آیات' تئیس (۲۳) کلمات اور ننانوے (۹۹) حروف ہیں۔

وجہ تسمیہ

اور اسے سورۂ فیل اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں اصحاب فیل کا واقعہ مذکور ہے' وہ واقعہ

اللہ تعالیٰ کی قدرتِ کاملہ کی علامات میں سے ایک ہے۔ اس بات پر دلالت کرتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے قہر کے سب سے ادنیٰ سبب کو حیوانات میں سے سب سے بڑا جانور ہاتھی بھی برداشت نہیں کر سکا ہے۔ تو اس کے قہر کے اعلیٰ اسباب کو کب برداشت کیا جا سکتا ہے۔ نیز یہ واقعہ اس امر پر بھی دلالت کرتا ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کے گھر کی بے حرمتی اس قدر قہر کا موجب ہوئی تو اس کے دین اور اس کے رسول پاک علیہ السلام کی بے ادبی کا نتیجہ کیا ہوگا؟ اور یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت کے نزدیک واقع ہوا تو گویا یہ واقعہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نبوت کی علامات سے تھا۔ اس سورۃ میں یہ واقعہ یاد دِلایا گیا ہے تاکہ لوگ اس سے عبرت پکڑیں اور اس رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بے ادبی کی جرأت نہ کریں جن کی برکت سے اللہ تعالیٰ کی یہ غیبی امداد ان تک پہنچی۔

(اقول و باللہ التوفیق۔ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی برکات آپ کی ولادت باسعادت سے پہلے بھی جاری تھیں۔ یہی نہیں بلکہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر تا ایں دَم بلکہ قیامِ قیامت اور بعد قیامت آپ کی برکات کا فیضان جاری و ساری ہے۔ چنانچہ قاضی مظہری رحمتہ اللہ علیہ زیر آیت یعنی قل الحمد للّٰہ وسلام علی عبادہ الذین اصطفٰی رقم طراز ہیں لان ماوصل بالانبیاء والامم من الکرامات و دفع البلیات کان ببرکۃ نورہ صلی اللّٰہ علیہ وآلہٖ وسلم۔ یعنی انبیاء علیہم السلام اور اُمتوں کو جو عظمتیں عطا ہوئیں اور ان کی جو مشکلات دُور ہوئیں سب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے نور کی برکت ہے۔ کیا خوب فرمایا اعلیٰ حضرت امام احمد رضا بریلوی رحمتہ اللہ علیہ نے۔

لا وربّ العرش جس کو ملا ان سے ملا ۔۔۔ بٹتی ہے کونین میں نعمت رسول اللہ کی
وہ جہنم میں گیا جو ان سے مستغنی ہوا ۔۔۔ ہے خلیل اللہ کو حاجت رسول اللہ کی

سبحان اللہ۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

واقعہ اصحابِ فیل کا سبب

اور اس واقعہ کا سبب یہ تھا کہ بادشاہ نجاشی کی طرف سے ابرہہ نام کا ایک حبشی یمن کا

والی بن کر آیا۔ اور اس نے یمن کے لوگوں کو دیکھا کہ موسمِ حج میں اطراف و اکناف سے نذرانے اور ہدیے لے کر شہر مکہ کی طرف متوجہ ہوتے ہیں۔ اس نے پوچھا کہ یہ کیا قصد رکھتے ہیں اور کہاں جاتے ہیں؟ جب لوگوں نے بیان کیا تو اس میں کفر کا غرور حرکت میں آیا اس نے حکم دیا کہ اس خانہ کعبہ کے مقابلے میں اسی ملک میں ایک گھر بنائیں۔ پس ملک یمن کے پایہ تخت صنعاء کے شہر میں رنگین سنگِ مرمر سے ایک گرجا تعمیر کیا گیا اور اسے قلیس کا نام دیا گیا۔ اور اس کے در و دیوار کو سونے اور جواہرات کے ساتھ مرصع اور مزین کیا گیا۔ اس گھر کے گوشوں میں بتوں کو لباسِ فاخرہ اور قیمتی جواہرات کے ساتھ آراستہ کر کے نصب کر دیا گیا' خوشبودار لکڑی کی انگیٹھیاں سلگنے لگیں اس کی دیواروں پر عطر و گلاب چھڑکا گیا اور اس کے اردگرد بھی انتہائی خوبصورت مکانات بنائے گئے اور اپنی مملکت کے لوگوں کو اس گھر کے طواف کی ذمہ داری سونپی گئی۔

اور یہ صورتِ حال قریش اور مکہ معظمہ کے باسیوں کو بہت ناگوار گزری۔ اسی اثنا میں بنوکنانہ کے ایک آدمی نے یمن جا کر بادشاہ کے ہاں ملازمت اختیار کی۔ اور اس گھر میں جھاڑو دینے اور فرش بچھانے پر متعین ہو گیا۔ جب اسے اس گھر میں بے تکلف آمدورفت کی اجازت مل گئی تو ایک رات وہاں قضائے حاجت کر کے بھاگ گیا' صبح کے وقت جبکہ لوگ اس نجاست آلود گھر کے طواف کے لیے آتے ہیں اور اسے نجاست سے ملوث دیکھ کر متنفر ہو کر بھاگ جاتے ہیں اور چلتے چلتے یہ خبر بادشاہ تک پہنچ گئی اس نے یہ کام کرنے والے کی تفتیش اور تحقیق کی۔ آخر ثابت ہو گیا مکہ معظمہ کے رہنے والوں میں سے ایک شخص یہ کام کر کے بھاگ گیا ہے اس کے دل میں انتہائی غصہ آیا اور اس نے چاہا کہ اس حرکت کے بدلے (معاذ اللہ) خانہ کعبہ کی بے حرمتی کرے۔

اور وہ اسی فکر میں تھا کہ ایک اور گل کھلا اور ساکنانِ حرم کے ایک قافلے نے رات بسر کرنے کے لیے اس گھر کے قریب ہی پڑاؤ ڈالا۔ صبح کے وقت جب وہ کوچ کرنے کا ارادہ کر رہے تھے انہوں نے آگ جلا رکھی تھی۔ تیز ہوا چلی جس نے آگ اس گھر تک پہنچا دی جس سے اس گھر کے لباس اور زیورات جل گئے اور دھوئیں سے اس کے رنگین

نقش و نگار سیاہ ہو گئے' قافلے والے اس حادثے سے ڈرتے ہوئے فرار ہو گئے۔ بادشاہ نے حکم دیا کہ اس واقعہ کی تحقیق کی جائے کہ کس سے سرزد ہوا ہے۔ تحقیق کے بعد پتہ چلا کہ یہ حرکت بھی مکہ معظمہ کے رہنے والوں ہی سے وقوع پذیر ہوئی ہے۔ بادشاہ انتہائی غضب ناک ہو کر بے شمار فوج اور بارہ (۱۲) ہاتھیوں کے ساتھ جن میں ایک کا نام محمود تھا جو کہ ہاتھیوں کے آگے آگے چلتا تھا اور سب ہاتھیوں سے طاقتور اور بڑا تھا (نصیب دشمناں) خانہ کعبہ کو مسمار کرنے کی طرف متوجہ ہوا اور راستے میں جس شہر اور جس قبیلہ پر اس کا گزر ہوتا اس شہر اور اس قبیلے کے لوگ عاجزی اور زاری کرتے کہ اس گھر کے درپے نہ ہونا۔ اس جرم کے عوض تو جو چاہے' ہم سے لے لے۔ وہ بالکل نہ مانا یہاں تک مکہ معظمہ کے قریب پہنچ گیا۔

مکہ معظمہ کے رہنے والے اس ظالم کے ڈر سے فرار ہو گئے اور اپنے اموال اور عزت کے ساتھ پہاڑوں میں چھپ گئے مگر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دادا عبدالمطلب مکہ شریف میں تنہا تھے۔ جب آپ نے ایسے حالات دیکھے تو آپ بھی حیران اور خوف زدہ ہو کر غیبی امداد کا انتظار کرنے لگے۔ کہ اچانک جدہ کی طرف سے جو کہ سمندر کی بندرگاہ اور مکہ معظمہ سے مغرب کی طرف واقع ہے' سبز رنگ کے جانور غول کے غول ہجوم کر کے آ گئے اور ابرہہ کے لشکر کی طرف متوجہ ہوئے۔ ان پرندوں میں سے ہر پرندے کے ہمراہ مسور سے بڑی اور چنے سے چھوٹے تین تین کنکریاں تھیں۔ ایک کنکری چونچ میں اور دو کنکریاں پنجوں میں۔ جب اس لشکر کے عین اوپر پہنچ گئے تو وہ کنکریاں چھوڑ دیں اور ان سنگ ریزوں کی خاصیت یہ تھی کہ جس کے سر پر لگے اس کے نیچے سے نکل گئے اور درمیان میں سب کچھ جلا دیا اور یہ حادثہ وادی محسر میں پیش آیا جو کہ مکہ معظمہ سے چھ (۶) کوس کے فاصلے پر ہے۔

اسی حالت میں وہ لشکر اس وادی میں تھا اور ان کا محمود نامی بڑا ہاتھی اس وادی میں زانو کے بل بیٹھا رکا ہوا تھا' آگے قدم بالکل نہیں بڑھاتا تھا اور دوسرے ہاتھی بھی رکے ہوئے تھے جب بھی ان ہاتھیوں کو یمن کی طرف متوجہ کرتے تو پوری کے ساتھ دوڑنے

لگتے اور جب خانہ کعبہ کی طرف لاتے تو رُک جاتے اور زانو کے بل بیٹھ جاتے۔ بادشاہ فیل بانوں کو ڈانٹ ڈپٹ کر رہا تھا کہ یہ سب تمہاری شرارت ہے تا کہ تم مجھے اس گھر کی عظمت کا معتقد بناؤ' میں ان حیلوں سے دھوکا نہیں کھاتا۔ اسی شوروغوغا میں تھے کہ جانور پہنچ گئے اور انہوں نے ہاتھیوں اور رئیسوں سمیت پورے لشکر کو غضبِ الٰہی سے تہس نہس کر دیا جو مال ومتاع ہمراہ لائے تھے' سب کا سب اس جنگل میں پڑا رہ گیا۔

مکہ معظمہ کے لوگوں نے جو کہ پہاڑوں پر کھڑے اس لشکر کا بھاگنا اور اس کی تباہی کا منظر دیکھ رہے تھے' ایک دم نیچے اُتر کر لوٹنا شروع کر دیا۔ اور کافی مال اکٹھا کر لیا۔ قریشیوں کو جو دولت ملی تھی اسی وجہ سے تھی۔ اور مذکورہ سنگ ریزے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت شریفہ کے وقت تک بلکہ اس کے بعد بھی لوگوں کے گھروں میں تعجب اور عبرت کے لیے موجود تھے۔ چنانچہ صحابہ کرام علیہم الرضوان میں سے کثیر تعداد نے وہ سنگ ریزے دیکھے تھے اس واقعہ کے ایک ماہ پچیس (۲۵) دن بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ولادت باسعادت ہوئی اس سورۃ میں یہ واقعہ بیان فرمایا جا رہا ہے اور قریشیوں کو نصیحت کی جا رہی ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اَلَمْ تَرَ كَيْفَ فَعَلَ رَبُّكَ بِاَصْحٰبِ الْفِيْلِ کیا آپ نے نہیں دیکھا یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کہ آپ کے پروردگار نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ یعنی اس لشکر کے ساتھ جو کہ ہاتھی کو آگے کر کے خانہ کعبہ کو مسمار کرنے کے لیے آئے تھے۔ اور دیکھنے کے لفظ میں اس بات کا اشارہ ہے کہ جو چیز تواتر کے ساتھ ثابت ہو وہ دیکھنے کے حکم میں ہے۔ اس میں شک وشبہ بالکل نہیں ہوتا اور ربک کے لفظ میں اس امر کا اشارہ ہے کہ یہ عظیم واقعہ آپ کی نبوت کی بنیاد ہے اور اسے ظاہر کرنے کا مقصد آپ کی رسالت کی پائیداری ہے۔ گویا ربوبیتِ الٰہی نے جو کہ آپ کی طرف متوجہ ہے' آسمان کی طرف یہ غیبی امداد اُتاری لہٰذا جب آپ کو فتح مکہ معظمہ کے لیے لشکر کشی کا اتفاق ہوا تو غیب سے کوئی ممانعت اور رکاوٹ پیش نہ آئی۔

اَلَمْ يَجْعَلْ كَيْدَهُمْ فِيْ تَضْلِيْلٍ کیا اس نے ان کی بداندیشی کو گمراہی اور بے حاصلی میں نہ لوٹا دیا یعنی خانہ کعبہ کے مقابلے میں دوسرا گھر بنانا اور رعایا کو اس کے طواف کا حکم دینا اس خانہ کعبہ کی عزت و حرمت کو ضائع کرنے کی ایک انتہائی قوی سازش تھی لیکن سب رائیگاں گئی بلکہ انہیں سبکی پر سبکی ہوئی۔ اگرچہ عقل مندوں کو طویل کوشش کے ضائع ہونے سے کافی عبرت حاصل ہوتی ہے لیکن ان لوگوں کے ساتھ اسی سلوک پر اکتفاء نہ کیا گیا بلکہ انہیں آسمان کی طرف سے سخت عذاب نصیب ہوا۔ چنانچہ فرمایا جارہا ہے:

وَّاَرْسَلَ عَلَيْهِمْ اور ان پر بھیجے طَيْرًا اَبَابِيْلَ اُڑنے والے جانور جو کہ غول کے غول آرہے تھے اور اصل لغت میں لفظ ابابیل غولَ کے غول کے معنوں میں ہے اور اس کا واحد مستعمل نہیں ہے۔ قیاس کے ساتھ پتہ چلتا ہے کہ اس کا واحد ابیل یا ابول یا ابالہ ہے اور عرف میں یہ لفظ اس جانور پر بولتے ہیں جس کی صورت میں غیبی جانور سنگ ریزے لیے ہوئے آئے تھے۔ اور چونکہ اصحابِ فیل نے خانہ کعبہ کو مسمار کرنے کے لیے سب سے قوی جانور ہاتھی کو مقرر کیا تھا' ان کے جواب میں چھوٹے ناتواں جانوروں کو کمزور ترین اسلحہ یعنی چھوٹے چھوٹے سنگ ریزوں کے ساتھ ان پر مسلط فرما دیا تا کہ لوگوں کو پتہ چل جائے کہ کمزور ترین مخلوق تائید الٰہی کے ساتھ قوی ترین مخلوق کو زیر کر لیتی ہے اس کی تائید کے بغیر قوی ترین مخلوق کچھ نہیں کر سکتی۔

تَرْمِيْهِمْ بِحِجَارَةٍ مِّنْ سِجِّيْلٍ وہ جانور لشکریوں پر سجیل کی جنس کے سنگ ریزے پھینک رہے تھے اور سجیل سنگِ گل کا معرب ہے یعنی وہ گیلی مٹی جو کہ سخت ہو کر پتھر جیسی ہو گئی ہو۔ اور اسے لغتِ ہندی میں کنکر کہتے ہیں اور ان پرندوں کے غول در غول آنے میں حکمت تھی اس لیے کہ سنگ ریزے پھینکنے کے بعد لشکری متفرق ہو کر دائیں بائیں بھاگ جائیں گے پس ناچار جانوروں کو بھی متفرق اور منتشر کر کے لائیں تا کہ ہر طرف پورا کام کریں اور سنگ ریزوں نے ان کے جسموں میں اس حد تک اثر پیدا کیا کہ فَجَعَلَهُمْ كَعَصْفٍ مَّاْكُوْلٍ پس ان لشکریوں کو کھائی ہوئی گھاس کی طرح کر دیا

یعنی وہ گھاس جسے چار پائے کھاتے ہیں اور کچھ باقی رہ جاتی ہے اور یہ جسم کے اجزاء کا یہاں تک دگرگوں ہونے کا اشارہ ہے کہ شکل و ہیئت اور بنیاد قائم نہ رہے اور یہ تاثیر بھی خلافِ عادت ہے۔ گویا ان سنگ ریزوں میں زہریلا پن پیدا ہو چکا تھا جو کہ جسم کے ساتھ لگتے ہی جسم کے اعضاء کو جدا جدا کر دیتا تھا اور اس کی خشکی سرایت کر جاتی تھی اور باہم تعلق اور اتصال بالکل زائل ہو جاتا تھا۔

اور یہ واقعہ عذابِ الٰہی کا ایک نمونہ تھا۔ اور چند خلافِ عادت امور پر مشتمل تھا۔ ہاتھیوں کا رُک جانا' سمندر کی طرف سے اس کثرت اور ہجوم کے ساتھ پرندوں کا آنا جو کہ ظاہری طور پر پرندوں کے رہنے کی جگہ نہیں ہے۔ اور اس واقعہ کے بعد بھی ان پرندوں کو کسی نے نہ دیکھا۔ یہ سنگ ریزے کہ ان کی کان کا بھی پتہ نہیں۔ قوی تاثیر جو کہ ان انتہائی چھوٹے چھوٹے سنگ ریزوں میں رکھی گئی تھی۔

سورۂ قریش

مکی ہے' اس کی چار (۴) آیات' سترہ (۱۷) کلمات اور تہتر (۷۳) حروف ہیں اور قریش حضرت اسماعیل علیہ السلام کی اولاد سے ایک قبیلے کا نام ہے جس قبیلے میں سے ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تھے اور اکثر صحابہ کبار رضوان اللہ علیہم بھی اسی قبیلے سے ہیں۔ اور یہ قبیلہ مکہ معظمہ میں سکونت پذیر ہے۔ اور خانہ کعبہ اور چشمہ زمزم کی خدمت پرانے زمانے سے انہیں کے سپرد ہے۔ اسی لیے یمن' شام اور عرب کے دیگر شہروں کے رئیس اور وہاں رہنے والے خانہ کعبہ کی عزت کی وجہ سے اس قبیلے کی تعظیم و تکریم کرتے تھے۔ اور یہ جہاں بھی جاتے' انہیں نذر و نیاز' مہمانی اور قربانی کے طریقے سے بہت کچھ حاصل ہوتا اور ان کے ہمراہ جو بھی اموالِ تجارت ہوتے' کوئی بھی ان کا محصول نہ لیتا۔ چور اور ڈاکو بھی خانہ کعبہ کے ادب کا پاس کرتے ہوئے ان کے درپے نہ ہوتے۔ اس قبیلے کی ہمیشہ کی عادت تھی کہ یہ لوگ سردیوں میں یمن کی طرف سے چلے جاتے جو کہ گرم علاقہ ہے اور تجارت کے فوائد اور نذر و نیاز قبول کرتے اور گرمیوں میں اسی قسم کا سفر شام کی طرف کرتے اور بڑی بڑی رقمیں کما کر لاتے۔ اس لیے مکہ معظمہ میں

ان کی گزر بسر پوری فراخی سے ہوتی۔ باوجودیکہ مکہ معظمہ کا شہر پہاڑوں اور ریگستانوں کے درمیان واقع ہے۔ وہاں کی سرزمین بالکل خشک ہے' وہاں کھیتی باڑی اور درخت سرسبز نہیں ہوتے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سورۃ میں قریش کو یہ نعمتیں یاد دِلائی ہیں۔ اور فرمایا ہے کہ اگر تم کوتاہ نظری کرو اور باری تعالیٰ کی ذات پاک کے عمدہ کمالات اور اس کی بے انتہا نعمتوں کو نہ پہچانو جن سے بام ثریا سے لے کر تحت الثریٰ تک ساری کائنات معمور ہے۔ اب اس عظیم نعمت کو ضرور پہچانو جو کہ اس نے خانہ کعبہ کی برکت سے تمہیں عطا فرمائی ہے اور اس کا شکر یہ ادا کرنے میں عادت کے مطابق استقامت اختیار کرو۔

وجہ تسمیہ

اور اس لیے اس سورۃ کو سورۂ قریش کہتے ہیں کہ اس سورۃ میں خاص کر قریش پر احسان کا ذکر ہے۔ اور قریش پر احسان حقیقت میں پوری دنیا پر احسان ہے۔ اور ان سے عبادت طلب کرنا گویا تمام بنی آدم سے عبادت طلب کرنا ہے۔ مقبولیت میں ان کا مقام دوسری کتابوں کے مقابلے میں بمنزلہ قرآن کے ہے۔ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ جب ارادۂ الٰہی کائنات کی اصلاح اور ظلم' کفر اور گناہ دُور کرنے کے ساتھ متعلق ہوا تو اس کام کے لیے ہمارے رسولِ کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو چنا گیا اور آپ کے قلب مقدس پر پہلے اس خواہش' اس خواہش کے لوازمات اور اس عظیم کام سے وابستہ علوم و معارف القاء فرمائے گئے۔ لازم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم اس مہم کو جاری کرنے میں اپنے قبیلے سے مدد حاصل کریں۔ اس لیے کہ کسی بھی شخصیت کے قبیلے والے اوصاف اور اخلاق کی معرفت میں دوسروں سے آگے ہوتے ہیں۔ اور اس شخصیت کے حالات پر جو اطلاع انہیں ہوتی ہے' دوسروں کو نہیں ہوتی۔ نیز اجنبیوں کی بہ نسبت رشتے داروں میں فکری قوتیں' ذہن کی صفائی' صلاحیت کی نزدیکی اور اسباب کا اجتماع زیادہ ہوتا ہے تو گویا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا قبیلہ مشرف باسلام ہونے کے بعد ساری اُمت کی بہ نسبت وہی حکم رکھتا ہے جو کہ اُمت کی بہ نسبت پیغمبر علیہ السلام کا حکم ہوتا ہے۔

اسی لیے حدیث شریف میں فرمایا گیا ہے کہ تعلموا من قریش ولاتعلموھا یعنی

قریش سے علم حاصل کرو اور انہیں نہ پڑھاؤ۔ نیز فرمایا گیا ہے کہ الناس تبع فی هذاالشان بقریش لوگ اس شان میں قریش کے تابع ہیں۔ اسی لیے قرآن مجید ان کی لغت میں نازل ہوا تا کہ جبلی سلیقہ کے مطابق اس کی باریکیوں کو سمجھ کر دوسرے لوگوں کے سامنے بیان کریں۔ پس نبوت کا معنی تمام قریش میں بکھرا ہوا اور پھیلا ہوا ہے۔ نیز عالمِ ازل سے ہی مقدر تھا کہ ملت کی سرداری اور مملکت کی حکمرانی ہجرت کی ابتداء سے لے کر ۶۵۶ سال تک جو کہ چنگیزی ترکوں قریش کی حکومت ختم ہونے کی تاریخ ہے' انہیں کے ساتھ متعلق ہو اور بنی آدم کی جبلت ہے کہ دین و مذہب میں رئیس کے تابع ہوتے ہیں تو حکمت کا تقاضا بھی یہی تھا کہ ان کی اصلاح کی کوشش کی جائے تا کہ دوسرے لوگ چاروناچاران کی اصلاح کے ساتھ اصلاح پذیر ہوں اور اسی تقریر سے اس سورۃ کے نزول کا سبب واضح ہو جاتا ہے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

حضور علیہ السلام کا نسب اور قریش کا معنی

لِاِيْلٰفِ قُرَيْشٍ یہاں لام قسمیہ ہے جیسا کہ للّٰہ لایوخر الاجل میں ہے۔ یعنی قریش کو اُلفت دینے کی قسم ہے۔ اور قریش' نضر بن کنانہ کی اولاد کو کہتے ہیں جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تیرہویں دادا ہیں۔ اس لیے کہ سرکار علیہ السلام کا نسب مبارک یوں ہے کہ حضرت محمد رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم بن عبداللہ بن عبدالمطلب بن ہاشم بن عبدمناف بن قصی بن کلاب بن مرۃ بن کعب بن لوئی بن غالب بن فہر بن مالک بن نضر بن کنانہ اور جو بھی نضر بن کنانہ کی اولاد سے ہے' قریش میں داخل ہے اور اسے قریشی کہتے ہیں۔ اور لغت میں قریش دریائی جانوروں میں سے ایک جانور کا نام ہے جو کہ سب جانوروں کو پکڑ کر کھالیتا ہے اور سب پر غالب ہے۔

اور نضر بن کنانہ کی اولاد زمانے کے حادثوں کی وجہ سے شہر مکہ سے متفرق ہو کر مختلف اطراف میں پھیل گئے تھے۔ قصی نے جو کہ حضور علیہ السلام کے پانچویں دادا ہیں' انہیں جمع کر کے مکہ معظمہ میں آباد کیا اسی لیے قصی کو مجمع کہتے ہیں۔ اس قبیلے کو جو کہ دیگر

قبائل پر زبان کی فصاحت' شجاعت' سخاوت' بلندی' ہمت اور نسب کی صحت کی وجہ سے غالب تھا اس جانور کے نام پر قریش کہتے ہیں۔

اِيْلٰفِهِمْ رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ ان کا سردیوں اور گرمیوں میں سفر کا خوگر ہونا جس کا انہیں یمن اور شام کی طرف اتفاق ہوتا تھا اور اس امر کی قسم اُٹھانا اس بات کا اشارہ ہے کہ اس ضمن میں ان کی روزی کی فراخی کے لیے ایک عجیب تدبیر الٰہی جلوہ گر ہوئی ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت کے کمال پر دلالت کرتا ہے۔ اس لیے کہ جب کسی شہر کے باسی اس شہر کے گردونواح سے زمین کی قحط سالی' پہاڑ کی سنگلاخی اور ہوا کی خشکی کی وجہ سے اپنی روزی نہ کما سکیں تو ویران ہونا شروع ہو جاتا ہے۔ اور وہاں کے لوگ روزی کی تلاش میں ہر طرف نکل جاتے ہیں۔ پس اس شہر کی آبادی کو اس عجیب تدبیر کے ساتھ محفوظ رکھا گیا ہے کہ وہاں اپنے نام پر گھر تعمیر فرمایا گیا اور لوگوں کے دِلوں میں اس گھر کی عظمت ڈال دی گئی۔ اور اس گھر کے مجاوروں کو سردیوں اور گرمیوں کے سفر کی طرف مائل کر دیا گیا تا کہ ہر سمت اور ہر علاقے' ہر موسم میں مناسب چیزیں کما کر اس شہر میں لائیں اس بابرکت مقام میں ان کی اصلی رہائش ختم نہ ہو اور اس وجہ سے کہ ہمیشہ سفر میں ہونا دِلی طور پر پریشان ہونے کا باعث ہے خصوصاً شدید سردیوں اور موسم گرما کی گرمی کے وقت اس قبیلے کو اس مشقت سے بالکل ملال نہیں ہوتا تھا' یہ ایک خلافِ عادت معمول ہو گیا اور اس لائق ہوا کہ اس کی قسم اُٹھائی جائے۔

نیز سردیوں اور گرمیوں میں ان کا سفر کا عادی ہونا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت شریفہ کے بعد دین کی سربلندی کا موجب ہو گیا۔ کہ پہلے انہیں ہجرت میں وطن چھوڑنا ناگوار نہ ہوا اس کے بعد انہیں دُور دراز علاقوں کی طرف جہاد کے لیے نکلنا بھی آسان ہو گیا۔ اسی لیے انہوں نے مدینہ عالیہ سے کابل تک' قسطنطنیہ تک اور اندلس تک پھیل کر دین کی ترویج کی۔ نیز ان دائمی سفروں میں انہیں لوگوں کے اخلاق کا تجربہ اور عادات کا امتحان پورے طور پر حاصل ہوا۔ جب انہیں دینی اور دنیوی سرداری حاصل ہوئی تو یہ بات انہیں نہایت مفید اور کارگر ثابت ہوئی۔ لہٰذا تھوڑے سے عرصے میں ان

کے ہاتھوں دین وایمان کی اشاعت اور مختلف شہروں اور علاقوں کی فتوحات رونما ہوئیں۔ تو سفر کی یہ عادت ان کے حق میں بہت بڑی نعمت اور عظیم دولت تھی کہ اس کی وجہ سے انہوں نے دارین کی سعادت اور دین و دنیا کی سرداری حاصل کی۔ اگرچہ بظاہر پریشانی اور صحرا نوردی ہو۔ اور جب انہیں یہ عظیم نعمت یاد دِلائی گئی تو اس کے شکریہ میں عبادت کا حکم دیا گیا کہ

فَلْيَعْبُدُوْا رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ تو چاہیے کہ قریش اس کے گھر والے کی عبادت کریں۔ اس لیے کہ لوگوں کے دِلوں میں ان کی یہ سب عظمت۔ بزرگی۔ ان کی روزی کی فراخی۔ اور ان کا دشمنوں سے بے خوف ہونا سب کچھ اس گھر کی مجاوری اور اس آستانے کی دربانی کی برکت سے ہے۔ اور جب دوسرے لوگ اس سعادت مآب آستانے پر رہنے والوں کے ساتھ اس طرح تعظیم کے ساتھ پیش آئیں تو ان کے لیے لازم ہے کہ اس گھر کے مالک کو تعظیم کے انتہائی درجات کے ساتھ مخصوص کریں اسی لیے یہاں رَبَّ هٰذَا الْبَيْتِ لایا گیا۔ گویا اشارہ فرمایا جارہا ہے کہ کوتاہ نظری کے طور پر اگرچہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت تمہاری نظر سے اوجھل ہے لیکن اس گھر کی عظمت اور بزرگی تو بالکل ظاہر اور روشن ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کو اس گھر کا مالک جانتے ہوئے اس کی عبادت کرو تو بھی حق بنتا ہے۔

الَّذِیْٓ اَطْعَمَهُمْ مِّنْ جُوْعٍ جس نے انہیں بھوک میں کھانا دیا ہے یعنی ان کا وطن جو کہ ناقابل کاشت زمین اور کسی بھی سبزے سے خالی صحرا ہے اس قابل تھا کہ وہاں رہنے والے بھوکوں مرتے اگر خانہ کعبہ کی تعمیر کی خدائی تدبیر جلوہ گر نہ ہوتی تو وہاں کے لوگ روٹی کا منہ نہ دیکھتے۔

وَّاٰمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ اور انہیں کسی بھی خطرے سے بے خوف کیا ہے۔ باوجود اس کے کہ عرب کے قبائل میں لوٹ مار' قتل وغارت اس قدر پھیلی ہوئی تھی کہ جس کی کوئی حد نہیں۔ لیکن خانہ کعبہ کے اردگرد حرم کی حد تک جو کہ بعض سمتوں میں دس (۱۰) کوس ہے اور بعض دوسری طرف چھ (۶) کوس اور بعض طرف تین (۳) کوس ہے' بالکل کوئی کھٹکا اور خطرہ نہیں ہے بلکہ اگر کوئی کسی کے باپ یا بیٹے کو قتل کر کے حرم میں داخل ہو جاتا تو بھی اس کے

در پے نہ ہوتے۔ اور بعض نے کہا ہے کہ مکہ معظمہ میں امن کی قسموں میں سے ایک امن کوڑھ کی بیماری سے ہے کہ مکہ معظمہ کے رہنے والوں کو کوڑھ بالکل نہیں ہوتا جیسا کہ عرصہ ہائے دراز سے تجربہ ہوا ہے۔ واللہ اعلم

سورۂ ماعون

مکی ہے اس کی چھ (٦) آیات' پچیس (۲۵) کلمات اور ایک سو پچیس (۱۲۵) حروف ہیں۔

وجہ تسمیہ

اور اسے سورۃ الماعون اس لیے کہتے ہیں کہ ماعون نہ دینا جو کہ احسان کا ادنیٰ مرتبہ ہے جب حجاب کا موجب اور سزا کا باعث ہے تو واجب حقوق کو ترک کرنے سے خواہ خدا تعالیٰ سے متعلق ہوں یا مخلوق سے بہت ڈرنا چاہیے۔ اور ان امور سے ڈرنا قرآنی مقاصد میں سے ہے اس سورۃ کا نصف کفار کے بارے میں ہے اور دوسرا نصف منافقوں کے بارے میں

سبب نزول

اور اس کے نزول کا سبب یہ ہے کہ ابوجہل ملعون کی عادت یہ تھی کہ جب کوئی مال دار بیمار ہوتا تو اس کے سرہانے آ کر بیٹھ جاتا اور کہتا کہ اپنے یتیموں کو میرے سپرد کر دے اور اپنے مال سے ان کا حصہ میرے حوالے کر دے تاکہ میں ان کی پوری خبر گیری کروں اور ان کا ہر قسم کا خیال رکھوں اور دوسرے ورثاء ان کے بارے میں ظلم اور زیادتی نہ کر سکیں اور جب ان کے مال پر قابض ہو جاتا تو یتیموں کو اپنے دروازے سے بھگا دیتا۔ اور وہ بھوکے اور ننگے گلی کوچوں میں گریہ زاری کرتے پھرتے۔ اسی قسم کا ایک یتیم ننگے سر ذلیل و رسوا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے حضور اس ملعون کی فریاد لایا۔ آپ اس یتیم کی دل جوئی کرتے ہوئے اس ملعون کے پاس آئے اور اسے قیامت کی پوچھ گچھ سے ڈرایا۔ اس ملعون نے اس وعظ و نصیحت کے مقابلے میں روزِ جزا کی تکذیب شروع کر دی۔ حضور علیہ السلام رنجیدہ خاطر ہو کر دولت خانہ پر واپس تشریف لے آئے اور یہ سورۃ نازل ہوئی۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

اَرَءَیۡتَ الَّذِیۡ یُکَذِّبُ بِالدِّیۡنِ یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کیا آپ نے اسے معلوم کیا ہے جو کہ دین کی تکذیب کرتا ہے اور جھوٹ سمجھتا ہے۔ یعنی ملت اسلام کی یا جزا کی۔ اور دین دونوں معنوں میں آیا ہے اور یہاں دونوں معنوں کی گنجائش ہے اس لیے کہ یتیموں اور ناتوانوں پر ظلم کرنا اور فقیروں اور مسکینوں پر رحم نہ کرنا تکذیب ملت کی بھی علامت ہے کہ ملت اسلام میں جگہ جگہ اس مقصد کی تاکید کی گئی ہے اور جزا کا یقین نہ کرنے کی بھی نشانی ہے اس لیے کہ جو جزا کا عقیدہ رکھتا ہے' خدا سے ڈرتا ہے اور جو خدا سے ڈرتا ہے ایسے کام نہیں کرتا۔ اور اس انداز سے خطاب کرنے میں اس بات کا اشارہ ہے کہ اگر کوئی چاہے کہ دین کے جھٹلانے والوں کو علامت سے پہچان لے اسے چاہیے کہ ان علامات کا مشاہدہ کرے۔

فَذٰلِکَ الَّذِیۡ یَدُعُّ الۡیَتِیۡمَ پس وہ دین کو جھٹلانے والا وہ ہے جو کہ یتیم کو زور سے دھتکارتا ہے۔ یعنی سینہ زوری کے ساتھ یتیم کا حق کھاتا ہے۔ اور یتیم سب سے زیادہ کمزور ہے۔ اور جو جزا کا اعتقاد رکھتا ہو' اپنے خاص مال سے لوگوں پر احسان کرتا ہے خصوصاً کمزوروں پر پھر بالخصوص یتیموں پر کہ ان میں کمزوری کے اسباب پورے طور پر ثابت ہیں اس لیے کہ وہ کم عمر بھی ہوتے ہیں اور کسب اور روزی کی تلاش کی قوت نہیں رکھتے اور حیلہ اور تدبیر نہیں جانتے اور کوئی والی وارث بھی نہیں رکھتے جو ان کے کام سرانجام دے۔

اور اگر احسان کرنے سے گیا گزرا ہو تو کم از کم کسی کی حق تلفی تو بالکل جائز قرار نہیں دیتا بالفرض اگر کسی کا حق لے تو اس کا حق لے گا جو کہ دشمنی اور مقابلے کی طاقت رکھتا ہو۔ نہ کہ کمزور خصوصاً ناتواں یتیم کا جو کہ بارگاہِ خداوندی کے بغیر کوئی فریادرس نہیں رکھتا تو جب کوئی شخص اس قسم کے مسکین اور کمزور پر بے تحاشہ ظلم کرنے کا عادی ہو' یقیناً خدا تعالیٰ سے نہیں ڈرتا اور اعمال کی جزا کا عقیدہ نہیں رکھتا۔ اس علامت کے بعد ارشاد فرمایا کہ یتیم کو دھتکارنے کی علت اس ملعون میں بخل اور حب مال کا اس حد تک پایا جانا ہے کہ

وَلَا یَحُضُّ عَلٰی طَعَامِ الۡمِسۡکِیۡنِ اور وہ کسی کو کسی فقیر کو کھانا دینے کی تاکید نہیں

کرتا۔ یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ منگتوں کو اپنے مال سے دینا تو اس سے کیا ممکن؟ دوسروں سے منگتوں کو کھانا دینا روا نہیں رکھتا۔ تو اس شخص کا بخل بہت اونچے درجے تک پہنچا ہوا ہے۔ اور پتہ چلا کہ یتیم کو دُھتکارنا بخل اور حب مال کی وجہ سے ہے نہ کہ یتیم کی مصلحت اور اس یتیم کے مال کی ذمہ داری کے طریقے سے ہے۔

اور جب معلوم ہو گیا کہ یتیم کو دُھتکارنا اور منگتوں کو کھانا نہ دینا باوجود اس کے کہ یہ دونوں عمل دین کے اوپر کے درجے کے نہیں ہیں اور دین کی تکذیب کی علامت ہوئے تو جو لوگ دین کے اعلیٰ درجات جیسے نماز اور زکوٰۃ میں بخل کرتے ہیں اور بخل ڈالتے ہیں تو ان کی حالت زیادہ خراب اور دین کے متعلق ان کی تکذیب زیادہ واضح ہوگی۔ اسی لیے فرمایا گیا

فَوَيْلٌ لِّلْمُصَلِّيْنَ تو ان نماز ادا کرنے والوں پر افسوس ہے یعنی جو نماز کے مکلّف ہیں اور نماز اسلام اور کفر کے درمیان فرق کرنے والا ہے۔

الَّذِيْنَ هُمْ عَنْ صَلٰوتِهِمْ سَاهُوْنَ وہ نماز ادا کرنے والے جو کہ اپنی نماز کی حقیقت سے غافل ہیں، نہیں جانتے کہ نماز کس کی مناجات ہے اور نماز کا مقصد کیا ہے؟ ورنہ لوگوں کے سامنے نماز پڑھنا اور جب موجود نہ ہوں تو ترک کر دینا اور اسی طرح ضروری مصروفیات سے فراغت کے وقت نماز یاد رکھنا اور دنیوی مہمات میں مصروفیت کے وقت فراموش کر دینا یا بعض ارکان میں حضورِ قلب کے ساتھ ادا کرنا اور بعض ارکان میں وساوس وخطرات کے پیچھے پڑ جانا ان سے سرزد نہ ہوتا۔ اس لیے کہ نماز کی حقیقت دِلی تعظیم کے ساتھ حق کا مراقبہ اور تمام حواس، قوتوں اور اعضاء کو کام میں لگا دینا ہے اور اس معنی میں ان فاصلوں کی کوئی گنجائش نہیں۔

وَالَّذِيْنَ هُمْ يُرَآءُوْنَ وہ لوگ جو کہ تمام عبادتوں اور نیکیوں میں اپنا دِکھاوا کرتے ہیں۔ یعنی انہوں نے صرف اپنی نماز کو ہی برباد نہیں کیا ہے بلکہ وہ ریاء اور سمعہ کی وجہ سے اپنے تمام اعمال ضائع کرتے ہیں۔ اور ریاء شرک کا ایک مخفی شعبہ ہے، دو وجہ سے قوی ہے:
ایک یہ ریاء کرنے والا لوگوں کو خدا تعالیٰ سے زیادہ عزیز اور بزرگ قرار دیتا ہے۔ دوسری یہ کہ بڑی نیکی میں شرک کرتا ہے جو کہ توحید و اخلاص کا مقام ہے۔ نہ کہ استعانت و استمداد

میں جو کہ دنیوی امور کے ساتھ متعلق ہے۔ پس وہ حقیقت کفر کی سب سے زیادہ سخت قسم ہے' اللہ تعالیٰ ہمیں اس پناہ بخشے۔

وَيَمْنَعُوْنَ الْمَاعُوْنَ اور وہ ماعون نہیں دیتے اور ماعون کی تفسیر میں اختلاف ہے۔ اکثر صحابہ کرام علیہم رضوان اور تابعین سے مروی ہے کہ ماعون زکوٰۃ ہے اور ریاکار کے لیے لازم ہے کہ مانع زکوٰۃ بھی ہوتا ہے اس لیے کہ دوسرے واجب اخراجات جیسے بیوی' اولاد' بھائی' قریبیوں' مہمان اور منگتوں کے حقوق سب کے سب بندوں کے ساتھ متعلق ہیں کہ لوگوں کے سامنے کچہریوں میں ان کا مطالبہ کرتے ہیں' رسوائی کے ڈر سے چاروناچار ان کی ادائیگی کرتے ہیں جبکہ زکوٰۃ خالص حقِ خداوندی ہے اور جب وہ خدا تعالیٰ کو کسی شمار میں نہیں لاتا تو اسے کیا ادا کرے گا۔

اور بعض نے کہا ہے کہ ماعون سے مراد گھر کا سامان مانگنے پر دینا ہے جو کہ پڑوسیوں اور ضرورت مندوں کو دینے کا رواج ہے جیسے پتیلا' پیالہ' سوئی' دھاگہ' ڈول' کدال' کلہاڑی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے پوچھا گیا کہ ماعون کیا ہے؟ فرمایا پانی' نمک اور آگ۔ نیز حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا ہے کہ جو کسی کو آگ دے گویا اس نے اس آگ سے پکنے والی ہر چیز اسے دے دی اور نمک بھی اسی طرح ہے اور جو کسی کو ایسی جگہ پانی دے جہاں پانی کا قحط نہ ہو گویا اس نے غلام آزاد کیا ہو اور اگر ایسی جگہ پانی دے جہاں پانی قیمتی اور نایاب ہو گویا اس نے مردے کو زندہ کر دیا ہو۔

سورۂ کوثر

مکی ہے' اس کی تین (۳) آیات' باراں (۱۲) کلمات اور بیالیس (۴۲) حروف ہیں۔

سببِ نزول

اور اس کا سببِ نزول یہ تھا کہ اُم المومنین حضرت خدیجہ رضی اللہ عنہا سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دو شاہزادے حضرت قاسم اور حضرت عبداللہ تھے جن کے لقب طیب اور طاہر ہیں اور ان دونوں صاحبزادوں کا چھوٹی ہی عمر میں پے در پے انتقال ہو گیا۔ (اقول

وباللہ التوفیق۔ ابن سعد کے مطابق حضرت خدیجہ سے حضور علیہ السلام کے دو صاحبزادے ہیں قاسم، عبداللہ اور جبکہ طیب و طاہر دونوں القاب حضرت عبداللہ کے ہیں اور نور الابصار کے مطابق طیب و طاہر ایک اور صاحبزادے کا نام ہے جبکہ صاحبزادیوں کے نام یہ ہیں: حضرت سیدہ زینب، رقیہ، اُم کلثوم اور خاتونِ جنت فاطمہ الزہراء رضی اللہ عنہم۔ نیز آپ کے ایک صاحبزادے کا نام ابراہیم ہے جن کی والدہ ماریہ قبطیہ رضی اللہ عنہا ہیں)

کفار نے طعنے کے طور پر حضور علیہ السلام کی شان میں ابتر کا لفظ بولا یعنی ان کی نسل ختم ہو گئی اور ان کے بعد کوئی ایسا نہیں ہے جو کہ ان کے دین کو قائم رکھے اور قریب ہے کہ ان کا دین ختم ہو جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے قلب مبارک کی تسلی کے لیے یہ سورۃ اُتاری۔

وجہ تسمیہ

اور اسے سورۂ کوثر اس لیے کہتے ہیں کہ اس میں کوثر کا ذکر ہے اور وہ ذکر قیامت کے دن حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی انتہائی عظمت پر دلالت کرتا ہے۔ کہ تمام اولین و آخرین اور انبیاء و مرسلین علیہم السلام پیاس کی حالت میں آپ کے حوض کے محتاج ہوں گے۔

کوثر کا معنی

اور لغت میں کوثر بہت سی چیز کو کہتے ہیں، یہ کثرت سے مشتق ہے۔ پس بے شمار بیٹوں کو شامل ہے۔ جو کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کو عطا فرمائے گئے۔ اور وہ بیٹے دو قسموں پر ہیں۔ صوری بیٹے اور معنوی بیٹے اور دونوں کی کثرت اس حد تک ہے کہ انبیاء علیہم السلام میں سے کسی کو اس کا سواں حصہ بھی نہ ملا۔ نیز بے پناہ علم کو شامل ہے اور اس اُمت میں علم کی کثرت بہت نظر آ رہی ہے اور محسوس ہو رہی ہے۔

ان علوم کا بیان جن کی اس اُمت سے پہلے کسی کو خبر نہ تھی

اس لیے کے پہلوں کے علوم یعنی یونانیوں، فارسیوں اور ہندیوں کے علوم سب کے سب ان تک پہنچے۔ اور انہوں نے ان علوم کی اس طرح تحقیق و تنقیح کی ہے کہ ان علوم کے وابستگان کو بھی میسر نہ ہوئی تھی اور دیگر تازہ اور نئے علوم جیسے نحو، صرف، معانی، بیان، تفسیر،

حدیث' اصول' فقہ اور حقائق و معارف کے علوم جو انہیں عطا ہوئے' پہلوں کو ان کی خبر تک نہ تھی۔

نیز بے شمار اعمال' بے شمار خزانوں اور بے شمار بادشاہیوں کو شامل ہے جو اس اُمت کو عطا ہوئیں۔ لیکن عرف میں کوثر کا لفظ اس حوض کے ساتھ خاص ہو گیا ہے جو کہ قیامت کے دن محشر میں حضور علیہ السلام کو عطا فرمایا جائے گا۔ اور در حقیقت وہ حوض خیر کثیر اور اس با کمال وسعت کا نمونہ ہے جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ مخصوص ہے۔ اسی وجہ سے کہتے ہیں کہ قرآن کا کوثر قرآن کا سمجھنا ہے۔ نیز کہا گیا ہے پانچ (۵) وقت کی نماز ہے۔ یہ بھی کہتے ہیں کہ کلمہ طیبہ لا الہ الا اللہ محمد رسول اللہ ہے اور اس امر کی حقیقت وہی ہے جو کہ مذکور ہوئی۔

اور جو کچھ احادیث صحیحہ میں آیا ہے اس کے مطابق حوض مذکور اس نہر سے پانی لیتا ہے جو کہ جنت میں ہے اور وہ نہر بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ حوض ہے اس کا نام بھی کوثر ہے اور معراج کی رات وہ نہر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دِکھائی گئی جس کی فراخی ایک مہینے کی راہ کے برابر ہے۔ اس کے کناروں پر کھوکھلے مروارید کے خیمے کھڑے کیے گئے ہیں۔ اور اس نہر کے کنارے آسمان کے ستاروں کی تعداد کے مطابق سونے اور چاندی کے برتن چنے گئے ہیں اور اس نہر کے اردگرد درخت اُگے ہوئے ہیں جن کے تنے زریں ہیں اور شاخیں زمرد کی ہیں۔ اور اس نہر کی گزرگاہ مروارید اور یاقوت ہیں اس کی مٹی کستوری سے زیادہ خوشبودار' اس کا پانی شہد سے زیادہ میٹھا' دودھ سے زیادہ سفید اور برف سے زیادہ ٹھنڈا ہے اس میں سے جو ایک گھونٹ پی لے اس کی لذت اور حلاوت کو ابداً آباد تک نہ بھولے اور پیاس نہ لگے۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اِنَّآ اَعْطَيْنٰكَ الْكَوْثَرَ تحقیق ہم نے آپ کو کوثر عطا فرمایا۔ کلام کے آغاز میں کوثر کا دینا اپنی طرف منسوب فرمایا گیا اس لیے کہ مخاطب عالی مرتبت رسول کریم علیہ السلام تھے جن کی نظر عطا و نعمت پر نہیں پڑتی' انہیں منعم اور عطا فرمانے والے کی ذات کے سوا کچھ بھی

پیش نظر نہیں۔ اسی لیے تاکیداً لفظ اَعْطَیْنَا میں پھر منعم کا ذکر دوبارہ فرمایا گیا۔ گویا اس بات کا اشارہ ہے کہ آپ کی نگاہ بلند ہے اور ان چیزوں پر نہیں پڑتی لیکن چونکہ یہ چیزیں ہماری عطا کی گئی ہیں اس لئے واجب التعظیم ہیں۔

فَصَلِّ لِرَبِّكَ تو آپ اس نعمتِ عظمیٰ کے شکریہ کے طور پر اپنے پروردگار کے لیے نماز ادا کریں اور اگرچہ شکر کے مقام میں جو عبادت بھی ہو' مقبول ہے لیکن نماز ایک ایسی عبادت ہے کہ دنیا میں کوثر کا نمونہ ہے۔

نماز کوثر کا نمونہ ہے

اس میں پروردگار کی مناجات شہد سے زیادہ شیریں ہے۔ اس میں جو غیبی انوار چمکتے ہیں دودھ سے زیادہ سفید۔ اس میں جو یقین ملتا ہے' برف سے زیادہ ٹھنڈا۔ اور نماز پڑھنے والے پر جو لطف اور اُنس نازل ہوتا ہے' مکھن سے زیادہ نرم ہے۔ اور اس میں جو سنتیں اور مستحبات محیط ہیں' زمرد کے درختوں کی طرح معنوی زندگی کے سرسبز ہونے کے آثار ہیں۔ اور ہر رُکن میں جو اذکار اور تسبیحات مقرر کی گئی ہیں' سونے چاندی کے برتنوں کی طرح ہیں کہ محبتِ الٰہی کی شراب ان کے ذریعے ایک ایک گھونٹ باطن میں جاتی ہے اور شوق کی پیاس کو سکون بخشتی ہے۔

اور یہاں لربك فرمایا گیا ہے۔ لنا نہیں فرمایا گیا تاکہ اس بات کا اشارہ ہو کہ عظمت ذات کے مقام کے شایاں کسی سے شکر ہو ہی نہیں سکتا۔ اور ہر انسان کے شکر کی انتہا یہ ہے کہ اس شخص کی نسبت سے اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کے مقام کے مقابل ہے اور چونکہ کوثر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے شاہزادے کے بدلے عطا فرمایا گیا' لازم ہوا کہ بیٹا دینے کے شکر کی جنس سے آپ سے ایک اور شکر طلب کیا جائے۔ لہٰذا فرمایا گیا:

وَانْحَرْ اور قربانی دیں۔ جس طرح کہ دوسرے لوگ بیٹا دینے کے بعد عقیقہ قربان کرتے ہیں۔ اور نحر اور ذبح کی حقیقت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے شکر کے مقام میں مال' مرتبہ اور دیگر پسندیدہ چیزیں صرف کرنا لوگوں کا معمول ہے لیکن جان دینا معمول نہیں ہے اسی لیے اس شریعت میں جان دینے کے لیے ذبح کرنا قرار پایا تاکہ ظاہری صورت مال دینے کی

صورت ہو اور حقیقت میں جان دینا ہو۔

نیز جاننا چاہیے کہ خود کو یا اپنے بیٹے یا غلام کو ذبح کرنا شریعت میں جائز نہیں ہے اس لیے کہ انسانی جانیں خدا تعالیٰ کے سوا کسی کی مملوک نہیں ہیں۔ اسی لیے غلام اور لونڈی کو قتل کرنا جائز قرار نہیں دیا گیا۔ ایک آدمی دوسرے آدمی کی صرف منفعتوں اور کمائی ہوئی چیزوں کا مالک ہو سکتا ہے۔ تو جب آدمی سے اس کے غلام کی جان طلب کریں تو اس کی تعمیل میں ایک جانور کی جان دینے کے سوا چارہ نہیں ہے جسے اس نے یا دوسرے لوگوں نے پالا ہو اور اس کی ملک ہو۔ اور یہی راز ہے اس مسئلہ میں کہ قربانی چار جنسوں میں منحصر ہے: اونٹ' گائے' بھیڑ اور بکری کیونکہ حقیقت میں آدمی انہی چار جنسوں سے دودھ' گھی اور دہی حاصل کرنے' سوار ہونے' بوجھ لادنے' کاشت کاری کرنے اور نسل پالنے کے ساتھ نفع لیتا ہے۔ بخلاف دوسرے وحشی حیوانات اور درندوں کے کہ ان میں یہ بات متحقق نہیں ہے۔

اِنَّ شَانِئَكَ هُوَ الْاَبْتَرُ بیشک آپ کا دشمن وہی دُم بریدہ ہے۔ لغتِ عرب میں دُم بریدہ کا لفظ اصطلاحاً اس کے لیے بولتے ہیں جس کی نسل باقی نہ رہے اور اس کا ذکر جاری نہ ہو۔

حضور علیہ السلام کا ذکر تا قیامت جاری ہے

اور اس آیت میں اس بات کا اشارہ ہے کہ آپ کی ظاہری اور باطنی نسل تا قیامت باقی رہے گی اور آپ کے امتی منبروں اور میناروں پر خدا تعالیٰ کے نام کے ساتھ آپ کے نام کو یاد کریں گے۔ پانچ وقتی نماز اور دوسرے اوقات میں آپ پر درود شریف پڑھیں گے اور آپ کی محبت میں جان کی قربانیاں دیں گے۔ اور ہزاروں عشاق آپ کے نام کو علامت بنائے ہر سال آپ کے مزار پُر انوار کی زیارت کو دوڑیں گے۔ تو آپ کا ذکر خیر تو اس قدر جاری ہوگا جبکہ آپ کے دشمنوں کا کوئی نام نہیں لے گا اور لعنت اور نفرت کے بغیر ذکر نہیں کرے گا۔ پس حقیقت میں ابتر اور دُم بریدہ آپ کا دشمن ہے۔ (اقول وباللہ التوفیق۔ معلوم ہوا کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے مزارِ پُر انوار کی زیارت کی نیت سے مدینہ عالیہ کا سفر کرنا حضرت مفسر غلام قدس سرہ کے نزدیک جائز' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ذکر کی رفعت کا

خدائی انتظام ہے بلکہ دشمنانِ رسولِ کریم علیہ السلام کی ابتری کا باعث ہے۔)

سورۂ کافرون

مکی ہے' اس کی چھ (۶) آیات' چھبیس (۲۶) کلمات اور ننانوے (۹۹) حروف ہیں۔

سببِ نزول

اس سورۃ کا سببِ نزول یہ ہے کہ کفارِ قریش کے ایک گروہ ابوجہل' عاص بن وائل' ولید بن مغیرہ' اسود بن عبدیغوث۔ اسود بن عبدالمطلب نے حضرت عباس کی بمعرفت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس پیغام بھیجا کہ آپ ہمارے معبودوں کی پیروی کریں' انہیں بُرا نہ کہیں اور اللہ تعالیٰ کے دربار میں ان کی سفارش کے قائل ہو جائیں تو ہم بھی آپ کے معبود کی عبادت کریں گے اور اس کی بزرگی کے قائل ہو جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کی اس طنزیہ گفتگو کے جواب میں یہ سورۃ اُتاری۔ اور اسے سورۂ کافرون اس لیے کہتے ہیں کہ اس سورۃ کا مضمون ایمان والوں اور کافروں کے درمیان عبادت کے مسئلے میں مکمل جدائی بیان کرنا ہے جس کے لیے پیدا کیے گئے ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ يٰٓاَيُّهَا الْكٰفِرُوْنَ آپ کہہ دیں اے کافرو! اور کفار سے مراد وہ لوگ ہیں جن کی موت کفر کی حالت میں ہوئی اس لیے کہ آخر میں جو ایمان لے آئے' کافر نہیں ہیں اگرچہ ظاہر کے مطابق عوام کی نظر میں کافر معلوم ہوں۔

لَآ اَعْبُدُ مَا تَعْبُدُوْنَ میں اس چیز کی پوجا نہیں کرتا جسے تم پوجتے ہو۔ اس لیے کہ تمہارا معبود پتھر ہے یا درخت یا پانی یا آگ یا ستارہ یا شیطان یا فرشتہ یا کوئی روح اور میں ان تمام چیزوں کو عبادت کے لائق نہیں جانتا۔ اور اگر تم انہیں اس اعتقاد کے ساتھ معبود بناتے ہو کہ وہ چیزیں معبودِ حقیقی کے مشابہ ہیں یا معبودِ حقیقی نے ان چیزوں میں آ کر حلول کیا یا متحد ہو گیا تو درحقیقت تمہاری عبادت ایسی چیز کی طرف واقع ہوئی جو کہ معبود نہیں ہے۔

وَلَآ اَنْتُمْ عٰبِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ اور نہ ہی تم اس کی پرستش کرتے ہو جس کی پرستش میں

کرتا ہوں۔ یعنی اگرچہ تم اپنے معبودوں کو صفاتِ الٰہی کے مظاہر جان کر پوجتے ہو لیکن مخلوقات میں صفاتِ الٰہی کا ظہور ان کی صلاحیت کی وسعت کے مطابق ہے۔ اور کوئی مخلوق اس قابل نہیں کہ اس میں صفاتِ الٰہی کما حقہ ظہور فرمائیں ورنہ وہ مخلوق، مخلوق نہ ہوگی اور اگر تم ان مظاہر میں کمال ظہور کا عقیدہ رکھتے ہو تو یہ دراصل صفاتِ الٰہی میں نقصان کا عقیدہ رکھنا ہے۔ پس ذاتِ الٰہی کسی طرح سے بھی تمہارا معبود نہیں ہے۔

وَلَآ اَنَا عَابِدٌ مَّا عَبَدْتُّمْ اور نہ میں اس چیز کو پوجنے والا ہوں جس کی پوجا تم نے کی ہے یعنی میں اسمائے الٰہیہ کی عبادت کرتا ہوں جبکہ تم اسماء کی صورتوں کی عبادت کرتے ہو اور اعلیٰ عبادت، اور ادنیٰ کی عبادت کو لازم نہیں کرتی۔

وَلَآ اَنْتُمْ عَابِدُوْنَ مَآ اَعْبُدُ اور نہ تم اس کی پرستش کرنے والے ہو جس کی پرستش میں کرتا ہوں اس لیے کہ تمہاری عبادت صور اسماء پر بند ہے جبکہ میری عبادت حقیقت اسماء کی طرف لوٹتی ہے۔

لَكُمْ دِيْنُكُمْ تمہارے لیے تمہارا دین ہے۔ جو کہ مظہر کے ساتھ ظاہر کے دھوکے اور صورت پر حقیقت کا شک ہونے پر مبنی ہے۔

وَلِيَ دِيْنِ اور میرے لیے میرا دین۔ کہ جس میں کسی وجہ سے بھی دھوکا اور شبہ نہیں ہے۔ پس یہ دونوں دین نہ اصول میں نہ فروغ میں ایک دوسرے کے شریک ہیں نہ ہی صورت میں ایک دوسرے کی مثل ہیں۔

اور اس مضمون کو دو جگہ لانا صرف اسی لیے ہے کہ مشرکین کی دو قسمیں ہیں: پہلی قسم وہ لوگ ہیں۔ جو اپنے معبودوں کے متعلق صفاتِ الٰہی کے کمال کے مظاہر ہونے کا عقیدہ رکھتے ہیں اور ان کی عبادت کو عبادتِ خداوندی جانتے ہیں۔ دوسری قسم وہ لوگ ہیں جن کا مقصد اسمائے الٰہی کی عبادت ہے لیکن صورت کے پردے میں۔ اور دونوں قسمیں اہلِ حق کے نزدیک مردود و مسترد ہیں۔ دونوں فرقوں کی نفی کے لیے اس عبادت کو تکرار کے ساتھ لایا گیا۔

اور بعض نے حال اور مستقبل کی نفی پر محمول کیا ہے جو کہ لَآ اَعْبُدُ اور وَلَآ اَنَا عَابِدٌ کے

لفظوں سے سمجھی جاتی ہے اور ایک گروہ نے کفار کی طرف سے حال اور ماضی کی نفی پر محمول کیا ہے جو کہ مَا تَعْبُدُوْنَ اور مَا عَبَدْتُّمْ سے معلوم ہوتی ہے اور سب کی گنجائش ہے۔

اور حدیث شریف میں آیا ہے کہ جو شخص اس سورۃ کو پڑھے گویا اس نے قرآن پاک کا چوتھائی حصہ پڑھ لیا ہے۔

اور تفسیر کواشی میں لایا گیا ہے کہ اس سورۃ کو اور سورۂ اخلاص کو مُشَقْشِقَتَین کہتے ہیں۔ اور جو یہ سورۃ اور سورۂ اخلاص پڑھے' کفر اور نفاق سے بَری ہو جاتا ہے اور مسنون ہے کہ صبح کی نماز کی سنتوں کی پہلی رکعت میں یہ سورۃ پڑھے اور دوسری رکعت میں قل ھو اللّٰہ احد۔

اور مشہور یہ ہے کہ یہ سورۃ آیت قتال یعنی جہاد کی آیت کے ساتھ منسوخ ہے لیکن تحقیق یہ ہے کہ منسوخ نہیں ہے اس لیے کہ اس سورۃ کا مضمون مسلمانوں کے دین اور کافروں کے دین کے درمیان باہم انتہائی دُوری ہے نہ کہ درپے نہ ہونا۔ بلکہ مسلمانوں کے دین میں جہاد اور قتال بھی داخل ہے تو آیت قتال کے ساتھ منسوخ ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔

سورۂ نصر

مدنی ہے' اسے سورۂ فتح بھی کہتے ہیں اس کی تین (۳) آیات' انیس (۱۹) کلمات اور اناسی (۷۹) حروف ہیں اور اس سورۃ کو سورۂ تودیع بھی کہتے ہیں اس لیے کہ اس سورۃ کے مضمون میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال شریف کے قریب آنے کی خبر دی گئی ہے اور اس بات کا حکم ہے کہ اُمت کو وداع فرمائیں۔

اور اس سورۃ کا مضمون یہ ہے کہ جب انبیاء علیہم السلام سے وہ کام سرانجام ہو گیا جو کہ دنیا میں ان کے وجود سے وابستہ تھا تو ان کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹنا اور عالمِ ارواح میں داخل ہونا ضروری ہو گیا۔ اس لیے کہ یہ دارِ فانی جو کہ تکالیف اور عیوب کے ساتھ مقرر ہے اس قسم کی ارواح مقدسہ کے رہنے کی جگہ نہیں ہے' انہیں تو اس ناقص گھر میں ضروری امور کی تدبیر کے لیے اُتارا جاتا ہے۔ پس انہیں یہاں ضرورت کے مطابق رکھا جاتا ہے۔

اس دنیا میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وجود کی اہمیت

اب معلوم کرنا چاہیے کہ اس دنیا میں ہمارے آقا و مولیٰ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا وجود مسعود کس کام کے لیے ضروری تھا؟ اور وہ ضروری کام کس وقت مکمل ہوا؟ اس اجمال کی تفصیل یہ ہے کہ دینِ حق اور صراطِ مستقیم میں خلل ڈالنے والی چار چیزیں ہیں: نفس، شیطان، کفار جو کہ اقتدار و غلبے میں ہوں اور منافق اور دوغلی پالیسی کے لوگ جو کہ فتنہ انگیزی کے طور پر شبہات ڈالتے ہیں اور گزشتہ انبیاء علیہم السلام نفس اور شیطان کا شر دُور کرنے کے لیے بھیجے جاتے تھے اس لیے کہ ان دونوں کا شر تمام شرور کی جڑ ہے اور کفار اور منافق بھی ان دونوں کے تابع ہیں۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت شریفہ میں یہ طریقہ منظور ہوا کہ مستقل طور پر چاروں چیزوں کو دُور کیا جائے۔ اسی لیے آپ نے دین کی جبلت میں لشکرکشی، جہاد، ملک گیری، تحفظ ملکی، فسادیوں، باغیوں، ڈاکوؤں کو سزا دینے کا طریقہ اور جرائم کا ارتکاب کرنے والوں پر حدود اور تعزیرات قائم کرنا داخل ہوا۔ اور اس شریعت کی صورت بادشاہت کی شکل اختیار کر گئی۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بعثت کی ابتدا سے درجہ بدرجہ نبوت کو ترقی دے کر خلافتِ کبریٰ کی سرحد تک پہنچا دیا۔ جب آپ اس کام سے فارغ ہو گئے تو آپ کو دربار پاک میں بُلا لیا گیا۔ اور تیس (۳۰) سال کی مدت تک جو کہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خلافت کا زمانہ تھا، چار یاروں نے علیہم الرضوان خلافت کے ضابطے جاری کر کے پچھلوں کے لیے ایک دستور العمل چھوڑ دیا۔

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

اِذَا جَآءَ نَصۡرُ اللّٰهِ جب خداتعالیٰ کی مدد آئے یعنی کفار پر تلوار اور نیزہ استعمال کرنے، منافقوں اور بدعتیوں پر دلائل و براہین قائم کرنے، نفس پر فکر کے غلبے اور شیطان پر ملازمت تقویٰ کے ساتھ۔

وَالۡفَتۡحُ اور مکہ معظمہ اور دوسرے مقامات میقاتِ کفر کی فتح آئے، بت خانے توڑے جائیں، علوم، احوال اور مواجد مفتوح ہوں۔ اور نصرت کے بعد فتح کا ذکر اس بات کا اشارہ

ہے' ہر مرتبہ کی فتح' نصرت کی فرع اور اس کے تابع ہے۔ پس شہروں اور بت خانوں کی فتوحات کفار پر مددِ الٰہی کے تابع ہیں۔ شبہات دُور کرنے کے ساتھ علوم کی کشائش منافقوں اور بدمذہبوں پر مدد کے تابع ہے اور روشن احوال اور بلند درجات کا انکشاف نفس و شیطان پر مدد کے تابع ہے۔ پس نصرت ابتدا اور درمیان کا اشارہ ہے جبکہ فتح انتہا اور کمال کے مرتبے کا اشارہ ہے۔ گویا جو حرکت کہ نقصان سے کمال کی طرف شروع ہوئی' انتہا کو پہنچ گئی۔ اسی لیے فرمایا گیا

وَرَاَيْتَ النَّاسَ اور آپ لوگوں کو دیکھیں یعنی عربوں کو کہ حضور علیہ السلام کی بعثت پہلے انہیں کی طرف تھی اور جب وہ دین میں داخل ہو گئے تو دوسرے لوگ جہاد' دلائل کی قوت اور نفس و شیطان کے مکر دُور کرنے کے ساتھ اس دین میں داخل ہوں گے ورنہ ان کا داخل ہونا ناقص رہے گا۔

يَدْخُلُوْنَ فِيْ دِيْنِ اللّٰهِ کہ اللہ تعالیٰ کے دین میں داخل ہو رہے ہیں یعنی اس دین میں جس میں شرک' بدعت' منافقت' بے حیائی اور حق چھوڑ کر باطل کی طرف مائل ہونے کا شائبہ تک بالکل نہیں ہے۔

اَفْوَاجًا گروہ گروہ' قبیلہ قبیلہ اگرچہ بعثت کی ابتدا سے لوگ اس دین میں اِکا دُکا ہی داخل ہوتے تھے۔

نصرت' فتح اور گروہ گروہ اسلام میں داخل ہونے کی تفصیل

اور ان تینوں امور کی تفصیل اس طرح ظہور پذیر ہوئی کہ ہجرت کے ایک سال بعد جنگ اور لڑائی رونما ہوئی اور انصار جانوں کی قربانی میں مشغول ہو گئے اور یہ زمانہ ظہورِ نصرت کا زمانہ تھا۔ اور فتح مکہ کے بعد کفر کی بڑی بڑی مملکتیں اور شہر فتح ہونے لگے۔ اور نویں اور دسویں سال میں مخلوق کا رجوع اور وفدوں کا پے در پے آنا ظاہر ہوا۔ چنانچہ بنی اسد' بنی فزارۃ' بنی مرہ' بنی کنانہ' بنی ہلال' بنو تمیم' قبائل عبدالقیس' بنو طی اور یمن' شام اور عربوں کے لوگ اطراف سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمت میں پہنچ گئے اور ان میں سے بعض نفس و شیطان کے جہاد اور بعض دوسرے کفار اور منافقوں کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ

وسلم کے فیض صحبت کی برکت سے تیار ہو گئے۔

اور چار یار کبار علیہم الرضون نے جو کہ بعثت کی ابتدا سے لے کر اب تک ہم نشینی کے پابند، خدا کی راہ کے ساتھی اور ہر مسئلے میں مشیر اور معاون تھے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کی بعثت کی ابتدا سے لے کر خلافت کی انتہا تک حضور صلی اللہ علیہ وسلم مختلف احوال اور قسم قسم کے طریقے باحسن وجوہ معلوم کر لئے۔ پس اب حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم رفیق اعلیٰ کی طرف متوجہ ہوئے اور وصال مبارک کا وقت قریب آ پہنچا اور آپ کو ایک اور چیز کا حکم دیا گیا۔

فَسَبِّحْ بِحَمْدِ رَبِّكَ پس اپنے پروردگار کی تعریف کے ساتھ اس کی پاکیزگی بیان کریں۔ اور یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ سیر وسلوک کی انتہا کے بعد عارف کے لیے تنزیہہ و تحمید کی ایک اور راہ کشادہ کی جاتی ہے اور اس کی حقیقت اس کمال کے ساتھ منفرد ہونا ہے جو کہ اسے نصیب ہوا اور اس کمال کا کوئی بھی شریک نہیں۔

وَاسْتَغْفِرْهُ اور اس سے بخشش طلب کریں۔ اور یہ اس بات کا اشارہ ہے کہ جب عارف تکمیل کے مرتبے کو پہنچ گیا اور ہر قسم کے لوگ اس کے تابع ہو گئے اور ناقص و کامل ہونے میں ان کی صلاحیتیں بہت زیادہ فرق رکھتی ہیں۔ تو اسے لازماً چاہیے کہ ناقصوں کی تکمیل کے لیے معافی مانگے تا کہ صلاحیت کے وہ تمام بنیادی نقصانات اس کی پیروی کی وجہ سے بروزِ حشر اس کے کمال استقلال تک جا پہنچیں اور شفاعت کی حقیقت بھی یہی ہے۔

اِنَّهٗ كَانَ تَوَّابًا بے شک اللہ تعالیٰ ناقصوں کے بارے میں فیض کی طرف رجوع اور رحمت کی تکمیل فرماتا ہے تو اس سے بعید نہیں کہ آپ کے پیروکاروں کو آپ کے طفیل کامل سے کامل فرما دے (اقول و باللہ التوفیق۔ معلوم ہوا کہ یہ کہنا درست اور صحیح ہے کہ یا اللہ ہمیں اپنے حبیب پاک علیہ السلام کے طفیل معاف فرما، بخش دے، رحم فرما یا۔ یہ کہنا کہ ہمیں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے طفیل تمام نعمتیں نصیب ہوتی ہیں)

اور یہ سورۃ سب سے آخری ہے اس کے بعد کوئی سورۃ نازل نہیں ہوئی اس کے نزول کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی زبان مبارک پر یہ دعا ہمیشہ رہتی۔ سبحانك اللهم بحمدك اللهم اغفرلي اور منقول ہے کہ حضرت عباس رضی اللہ عنہ نے جب رسول پاک

علیہ الصلوٰۃ والسلام سے یہ سورۃ سُنی تو آپ پر گریہ طاری ہو گیا۔ لوگوں نے پوچھا کہ آپ پر گریہ کیوں طاری ہو گیا؟ فرمایا میں اس سورۃ سے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال شریف کی خبر سُن رہا ہوں۔

سورۂ تبت

مکی ہے' اس کی پانچ (۵) آیات' بیس (۲۰) کلمات اور اکاسی (۸۱) حروف ہیں۔

سبب نزول

اور اس سورۃ کے نزول کا سبب یہ تھا کہ جب آیت وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ نازل ہوئی کہ اپنے رشتہ داروں کو عذابِ خداوندی سے ڈرائیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم دولت کدہ سے باہر تشریف لائے اور کوہِ صفا پر جلوہ افروز ہوئے اور اپنے رشتے داروں میں سے ہر ایک کو آواز دی سب جمع ہو گئے۔ ازاں بعد آپ نے فرمایا کہ اگر میں تم سے ایسی بات کہوں جو تمہاری عقل سے دُور ہو تو میری بات کا یقین کرتے ہو؟ مثلاً میں کہوں کہ ایک لشکر جرار تم پر حملہ کرنے اور تمہیں لُوٹنے کے لیے اس پہاڑ کے پیچھے پہنچ چکا ہے تو اس کا یقین کرتے ہو؟ سب کہنے لگے بالکل یقین کرتے ہیں۔ فرمایا میں تمہیں عذابِ خداوندی سے ڈراتا ہوں کہ اگر تم میری اطاعت نہیں کرتے اور قرآن پاک پر ایمان نہیں لاتے تو تمہیں پہنچے گا۔

ابولہب نے جس کا نام عبدالعزیٰ تھا اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا چچا لگتا تھا' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بارے میں سخت الفاظ کہے کہ کیا تو نے ہمیں اسی لیے بلایا اور جمع کیا تھا۔ (معاذ اللہ) تو ہلاک ہو جائے۔ یہ سورۃ اس خبیث کے جواب میں اُتری۔ اور اس سورۃ میں اس خبیث کو دو وجہ سے کنیت کے ساتھ یاد کیا گیا ہے حالانکہ عربوں کے نزدیک کنیت تعظیم کا صیغہ ہے۔ پہلی وجہ یہ ہے کہ اس کا نام عبدالعزیٰ تھا اور یہ نام شرک پر مشتمل ہے اور اہلِ توحید کے نزدیک بہت مکروہ ہے۔ دوسری وجہ یہ ہے کہ وہ اس کے جہنمی ہونے پر دلالت کرتا ہے اس لیے کہ لہب آگ کے شعلے کو کہتے ہیں اگرچہ اس کے باپ نے اسے یہ

کنیت اس لیے دی تھی کہ اس کا چہرہ روشن ہونے کی وجہ سے آگ کی طرح چمکتا تھا لیکن حقیقت میں یہ اس کے جہنمی ہونے کا عنوان بن گیا۔

اور اس کی بیوی اُم جمیلہ' ابوسفیان کی بہن بھی حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عداوت میں انتہائی کوشش کرتی تھی یہاں تک کہ جھاڑیوں اور کیکر کے درخت کے کانٹوں کا گٹھا اُٹھا لاتی اور رات کے وقت حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی گزرگاہ میں بچھا دیتی تا کہ جب آپ صبح کے وقت اپنے گھر سے مسجد حرام میں تشریف لائیں تو وہ کانٹے آپ کے پاؤں مبارک میں پیوست ہوں اور آخر اس نے اسی کام میں جان دے دی۔

کہتے ہیں کہ ایک دن کانٹوں کا گٹھا سر پہ رکھے اور گٹھے کی رسی کو اپنے گلے میں مضبوطی سے باندھے ہوئے تھی کہ اچانک گٹھا اس کے سر سے ڈھلک گیا اور رسی اس کے گلے کا پھندا بن گئی اور وہ اسی حالت میں جہنم میں پہنچ گئی۔ علیٰ ہذا القیاس ابولہب بھی ساری عمر حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ستانے پر مصر رہا یہاں تک کہ اس نے بارہا آپ کو پیٹنے اور شہید کرنے کا ارادہ کیا لیکن خدائی حفاظت مانع رہی جیسا کہ سیرت اور تاریخ کی کتابوں میں مذکور ہے۔

اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی دو شاہزادیاں حضرت رقیہ اور حضرت اُم کلثوم رضی اللہ عنہما اس کے دو بیٹوں عتبہ اور عتیبہ کے ساتھ نامزد ہو چکی تھیں۔ ابولہب نے اپنے ان دونوں بیٹوں سے کہا کہ اگر تم میری رضامندی چاہتے ہو تو اس تعلق سے دست بردار ہو جاؤ ورنہ مرتے دَم تک میں تمہارا چہرہ نہ دیکھوں گا۔ بڑے بیٹے عتبہ نے خاموشی اختیار کی جبکہ دوسرے بیٹے عتیبہ نے وہاں سے اُٹھ کر انتہائی بے حیائی کے ساتھ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے پاس آ کر بے دریغ ہو کر کہا کہ میں نے آپ کی دختر کو چھوڑ دیا اور کچھ اور غیر مناسب الفاظ بکے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے عرض کی بارِ خدایا! اس پر اپنے کتوں میں سے ایک کتا مسلط فرمایا۔ آخر شام کے سفر میں اسے شیر نے پھاڑ دیا۔

اور اس سورۃ کا مضمون یہ ہے کہ ابولہب کو جو کہ نسب' دولت' مرتبہ اور سرداری کے اعتبار سے شرفاء میں سے تھا' حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی عداوت اور دینِ حق کے انکار کی وجہ سے کلی طور پر خسارہ اور ہمیشہ کی ہلاکت نصیب ہوئی۔ پس ہر شخص کو چاہیے کہ ان چیزوں

پر غرور نہ کرے اور مقربین بارگاہِ خداوندی کے راہ و رسم درست کرے اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اپنی پھوپھی حضرت صفیہ اور شاہزادی سیدہ فاطمہ رضی اللہ عنہما سے اس سورۃ کے نزول کے بعد فرمایا لَاۤ اَمْلِكُ لَكُمْ مِنَ اللّٰهِ شَيْئًا یعنی (اقول و باللہ التوفیق۔ رب العزت کی اجازت اور نفع پہنچانے کی قدرت دیئے بغیر میں تمہارے لیے کسی چیز کا مالک نہیں ہوں اور پھر خود ارشاد فرمایا کل سبب و نسب ینقطع یوم القیامۃ ماخلا سببی ونسبی یعنی میرا رشتہ اور نسبت قیامت کے دن بھی منقطع نہیں ہوگا کیونکہ رب تعالیٰ نے خود آپ کو یہ نعمت اور خصوصیت عطا فرمائی ہے۔ چنانچہ محب طبری اور دیگر اکابر علماء اُمت نے فرمایا انہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم لایملك لاحد شیئاً نفعا ولاضرًا لکن اللّٰہ عزوجل یملکہ نفع اقاربہ بل و جمیع امتہ بالشفاعتہ العامتہ والخاصہ فھو لایملك الاما یملکہ لہ مولاہ ترجمہ وہی جو اوپر بیان ہے۔ محمد محفوظ الحق غفرلہ)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

تَبَّتْ يَدَاۤ اَبِيْ لَهَبٍ ابولہب کے دونوں ہاتھ ہلاک ہو گئے۔ جاننا چاہیے کہ نفسِ انسانی کی دو قوتیں ہیں: قوتِ علمی اور قوتِ عملی۔ قوتِ علمی وہ ہے جس کے ساتھ جانتا اور پہچانتا ہے۔ اور قوتِ عملی وہ ہے جس کے ساتھ اس سے اچھے اور بُرے کام صادر ہوتے ہیں۔ اور دونوں ہاتھ ان دو قوتوں کی طرف اشارہ ہے یعنی اس کا عقیدہ اور عمل دونوں ہلاک ہو گئے۔ اور احتمال ہے کہ دو ہاتھوں سے مراد خیر اور شر پر مبنی اعمال ہیں۔ شر پر مبنی اعمال کی بربادی ظاہر ہے کہ ان کا نتیجہ بُرا ہوتا ہے اور خیر پر مبنی اعمال کی بربادی یہ ہے کہ کفر کی وجہ سے ان کا انجام اچھا نہ ہوا اور وہ ضائع ہو گئے۔ اور بعض نے اسے ظاہر اور باطن کے اعمال پر محمول کیا ہے اور بعض نے طاقت ور اور کمزور اعمال پر محمول کیا اور سب کی گنجائش ہے۔

وَّتَبَّ اور ابولہب خود بھی ہلاک ہو گیا۔ یعنی اس خبیث کے اعتقادات اور اعمال کی ہلاکت اس کی ذات کی بربادی اور اس کے نفس کے جواہر کی خرابی تک کھینچ لے گئی یہاں تک کہ کسی طریقے سے بھی اس کی اصلاح ممکن نہ رہی۔

مَاۤ اَغْنٰى عَنْهُ مَالُهٗ وَمَا كَسَبَ اسے اس کا مال اور جو کچھ اس نے کمایا ہے جیسے

شہرت' مرتبہ' اولاد' پیروکار اور یار دوست کسی کام نہ آیا اور بعض نے مال سے موروثی مال اور کسب سے کمایا ہوا مال مراد لیا ہے۔ اور اس کا بھی احتمال ہے۔ اور بعض نے بیٹے مراد لیے ہیں۔

اب اس کے مال اور کمائی ہوئی چیزوں کے نفع بخش نہ ہونے کو بیان فرمایا جا رہا ہے کہ اگر یہ چیزیں اسے دنیا میں کچھ نفع دیں' آخرت میں جہاں ضرورت زیادہ ہوگی اور ہمیشہ رہنا ہے بالکل نفع نہ دیں گی اس لیے کہ:

سَيَصْلٰى نَارًا عنقریب آگ میں داخل ہوگا یعنی اس کے مرتے ہی اسے آگ میں جھونک دیں گے اور اس کے حق میں قیامت کا انتظار بھی نہ ہوگا بخلاف دوسرے کفار کے۔

ذَاتَ لَهَبٍ جو کہ زبردست شعلوں والی ہے۔ اس لیے کہ اس کا کفر دوسروں کے کفر کے مقابلے میں زیادہ تھا نزدیکی رشتے داری۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے خصائل وشمائل پر پوری اطلاع اور آپ کی سچائی کے امتحان کی جہت سے بھی۔ اور اس کی عداوت کی زیادتی کے طریقے سے بھی اور اس کے عذاب کی زیادتی کے اسباب میں سے ایک اور سبب یہ ہے کہ اس کی محبوبہ کو اس کے سامنے جلائیں گے اسی لیے فرمایا گیا ہے

وَامْرَاَتُهٗ اور جس طرح اس عورت کی عداوت دیکھ کر اس کی عداوت زیادہ ہوگئی تھی اسی طرح اس کا عذاب اس عورت کا عذاب دیکھنے کے ساتھ زیادہ کیا جائے گا۔

حَمَّالَةَ الْحَطَبِ میں وہ عورت مراد لیتا ہوں جو کہ ایندھن اٹھاتی ہے یعنی جہنم میں اس بدعملی کے مقابلے میں۔ جو کہ دنیا میں کرتی تھی اور کانٹوں کا گٹھا اُٹھا کر لاتی تھی اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی راہ میں بکھیرتی تھی۔

فِيْ جِيْدِهَا اس کی گردن میں جو کہ موتیوں کا ہار اور سونے کا زیور باندھنے کی جگہ ہے۔

حَبْلٌ ایک رسی ہوگی' مِنْ مَّسَدٍ کھجور کی سخت چھال سے جسے مضبوطی سے بنایا گیا ہو اور اس رسی کی خاصیت یہ ہے کہ جب پسینے سے تر ہو جائے تو زیادہ کھنچ سکتی ہے اور گلا گھونٹنے کا باعث ہوتی ہے اور وہ ان حروف کے مطابق جو کہ اس کے بارے میں آئے اور

اسی طریقے سے دنیا میں مرا۔ واللہ اعلم ۔

اور اس سورۃ میں اس بات کا اشارہ ہے کہ مال جمع کرنا اور کمائی کرنا مردوں کی ذمہ داری ہے اور گھر کی خدمت حتیٰ کہ کھانا پکانے کے اسباب جیسے ایندھن مہیا کرنا عورتوں کا کام ہے۔

سورۂ اخلاص

مکی ہے' اس کی چار (۴) آیات' پندرہ (۱۵) کلمات اور سنتالیس (۴۷) حروف ہیں۔

سبب نزول

اور اس سورۃ کے نزول کا سبب یہ تھا کہ کافروں کے سرداروں کے ایک گروہ نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی خدمتِ عالیہ میں حاضر ہو کر پوچھا کہ آپ ہمارے خداؤں کی مذمت کرتے ہیں اور ان میں عاجزی' ناتوانی اور دوسرے عیب ثابت کرتے ہیں' آپ یہ تو بتائیں کہ آپ کے خدا کی صفت کیا ہے؟ کس چیز سے پیدا ہوا ہے اور اس سے کیا چیز پیدا ہوئی ہے؟ (معاذ اللہ) اس کی اصل اور فرع کیا ہے؟ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان کی غیر شائستہ گفتگو پر خاموش تھے کہ جبریل علیہ السلام یہ سورۃ لائے۔

اور بعض روایات میں یوں آیا ہے کہ کافروں کے سوال میں یہ بات بھی تھی کہ وہ کیا ہے' کیا کھاتا ہے' کیا پیتا ہے اور اس نے خدائی کی وراثت کس سے لی ہے اور اس سے وراثت کون لے گا اور کارخانہ خدائی میں اس کا مشیر اور معاون کون ہے؟

وجہ تسمیہ

اور اس سورۃ کو سورۃ اخلاص اس لیے کہتے ہیں کہ یہ حق کی معرفت اور اس کی ذات و صفات کی دریافت کے لیے مسلمانوں کے دلوں کو کھرا کرتی ہے۔ اور یہاں جاننا چاہیے کہ حقیقتِ الٰہی میں آدمی کا انتہائی مقام یہ ہے کہ اس ذات کے خواص لازمہ کا ادراک کر لے اور بس۔ اس لیے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بسیط ہے' کسی طرح بھی اجزاء اور بعضیت کو قبول نہیں کرتی اور وہ کسی علت سے معلول نہیں ہے۔

معرفتِ اشیاء کی چار وجوہ

اور دنیا میں چیزوں کی معرفت کا طریقہ چار وجوہ میں منحصر ہے: پہلی وجہ اس کا مادہ پہچاننا' دوسری وجہ اس کی صورت پہچاننا' تیسری وجہ اس کی علت پہچاننا اور چوتھی وجہ اس کی غرض کو اور اس کام کو پہچاننا جو کہ اس سے سرانجام ہو سکتا ہے۔ یہاں پہلی تین وجوہ موجود نہیں ہیں۔ اس کا بیان یہ ہے کہ اگر کوئی شخص مثلاً بیٹھنے کی چوکی کی معرفت کے متعلق پوچھے تو اس کا جواب چار طریقوں سے دیا جا سکتا ہے: پہلی یہ کہ کہیں کہ ایک ایسی چیز ہے جو کہ لکڑی اور لوہے کی میخوں کے ساتھ بنائی گئی ہے' دوسرا طریقہ صورت کی معرفت کا مثلاً یوں کہیں کہ یہ ایک ایسی چیز ہے جو کہ مربع یا مستطیل شکل کی بنی ہوئی ہے' تیسرا طریقہ معرفتِ علت کا مثلاً یہ کہیں کہ بڑھئی نے بنائی ہے اور چوتھا طریقہ معرفت مقصد کا مثلاً یوں کہیں کہ یہ ایسی چیز ہے جو کہ بیٹھنے کے لیے بنائی گئی ہے۔ پس باری تعالیٰ کے حق میں جب وہ تین طریقے ممکن نہیں ہیں' ناچار چوتھے طریقے پر اکتفاء کیا گیا۔

لیکن یہ بات ضروری تھی کہ اللہ تعالیٰ کی تنزیہات ذکر کی جائیں تاکہ پورا امتیاز حاصل ہو۔ پس لفظ اللہ ان تمام اغراض پر مشتمل ہے جو کہ اللہ تعالیٰ سے دنیا کے متعلق تصور کی جا سکتی ہیں جیسے خالقیت' رازقیت' بخشش اور وجود' معبود ہونا وغیرہ اسی لیے لفظ اللہ کو اس سورۃ کا عنوان بنایا گیا ہے۔ پس گویا یوں کہا گیا ہے کہ اس کی صفات یہ ہیں کہ معبود' خالق' صانع' رازق' زندہ کرنے والا اور موت دینے والا ہے' کائنات کی تمام ضروریات نے اسی سے وجود حاصل کیا ہے۔ یہاں تک کہ آخر بھی اسی کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور چونکہ یہ معنی عوام کے ادہام میں علیحدہ علیحدہ مشترک تھا۔ ناچار اس کے ساتھ صفاتِ سلبیہ کو ملا دیا گیا تاکہ اشتراک وہمی بھی دور ہو جائے اور توحید خالص ہو۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قُلۡ آپ کہہ دیجئے یارسول اللہ هُوَ اللّٰهُ جس کے متعلق تم سوال کرتے ہو' اللہ ہے۔
ایسی ذات جو کہ صفاتِ کمال کی جامع ہے کہ دنیا میں حیات' علم' ارادہ' قدرت' کلام' سمع' بصر اور دوسرے جواہر و اعراض میں سے جو کچھ دیکھا اور سنا جاتا ہے' سب اسی کے آثار ہیں۔

احد اور واحد میں فرق

اَحَدٌ یگانہ ہے' شریک رکھتا ہے نہ جزو' خواہ وہ جزو عقلی ہو یا خارجی' خواہ بالفعل ہو خواہ تحلیلی اور اس کی ذات کے کامل بسیط ہونے کا اشارہ کرنے کے لیے لفظ احد لایا گیا اس لیے کہ لفظ واحد اکثر شریک عددی کی نفی میں استعمال کیا جاتا ہے نہ کہ نفی اجزاء میں جیسا کہ کہتے ہیں کہ زید ایک واحد انسان ہے حالانکہ وہ ہاتھ' پاؤں' آنکھ' کان اور دیگر بہت سے اجزاء رکھتا ہے۔ اسی لیے اسے احد نہیں کہتے۔ پس احد وہ ہے جس میں تقسیم بالکل نہیں ہو سکتی اور یہ معنی حضرت حق سبحانہ وتعالیٰ کے ساتھ خاص ہے۔

اَللّٰہُ الصَّمَدُ لفظ اللہ کو پھر دوبارہ لایا گیا تا کہ اس بات کا اشارہ ہو کہ اس نری بساطت اور احدیت مجردہ کے باوجود میں اس کے لیے صفات کمال ثابت کرتا ہوں اس لیے کہ اس کی صمدیت ان صفات کا تقاضا کرتی ہے۔

صمد کا معنی

حضرت امام جعفر صادق رضی اللہ عنہ نے فرمایا ہے کہ صمد کا معنی یہ ہے کہ کسی کا محتاج نہ ہو اور سب اس کے محتاج ہوں۔ اور وجود کے سلسلے میں اس ذات کے سوا چارہ نہیں جو کہ صمد کے ساتھ موصوف ہے۔ اس لیے کائنات میں سراسر ضرورت کا مشاہدہ ہو رہا ہے۔ اور جب ہر شے محتاج ہوئی تو ایسی ذات لازماً ہونی چاہیے جس پر ضرورت ختم ہو جائے اور وہ کسی اور کی محتاج نہ ہو۔ ورنہ احتیاج کا سلسلہ ختم نہ ہو۔ پس حقیقت میں اللہ تعالیٰ کی ذات کے خواص میں سے یہاں دو چیزیں مذکور ہیں۔ احدیت اور صمدیت اور باقی صفات انہیں کی فرع ہیں۔

لَمْ یَلِدْ وہ نہیں جنتا اس لیے کہ کسی چیز کو جنم دے تو وہ چیز اس کی حقیقت میں شریک ہوگی تو وہ اس سے مستغنی ہوگی۔ پس وہ صمد نہیں ہوتا۔

وَلَمْ یُوْلَدْ اور وہ کسی سے جنا نہیں گیا اس لیے کہ اگر وہ کسی سے جنا جائے تو اس کا محتاج ہوگا اور صمد نہ ہوگا اور چونکہ وہ احد ہے۔

وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ بھی اس کی صفت ہوگی یعنی اس کا کوئی ہمسر نہیں ہوا ہے اس لیے کہ اگر اس کا کوئی ہمسر ہوتو دونوں ایک چیز میں شریک ہو جائیں اور دوسری چیز کے

ساتھ مختص ہو تو اس کی ذات یگانہ نہ ہو۔

بعض علماء نے فرمایا ہے کہ شرکت کبھی عدد میں ہوتی ہے اس کی نفی لفظ احد کے ساتھ فرمائی گئی۔ اور کبھی مرتبہ اور منصب میں ہوتی ہے اس کی نفی لفظ صمد کے ساتھ فرمائی گئی اور کبھی نسب میں ہوتی ہے اور اسے لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ کے ساتھ منفی قرار دیا گیا۔ اور کبھی کام اور تاثیر میں ہوتی ہے اس کی نفی وَلَمْ یَکُنْ لَّہٗ کُفُوًا اَحَدٌ سے فرمائی گئی اور اسی وجہ سے اسے سورۂ اخلاص کہتے ہیں۔

مذاہبِ باطلہ والوں کا رد

نیز علماء نے فرمایا ہے کہ مذاہب باطلہ والوں کے دنیا میں پانچ (۵) فرقے ہیں: ایک فرقہ دہریہ کا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ جہاں کو بنانے والا کوئی نہیں جیسے بھی اتفاق ہوا' مواد جمع ہو گیا اور صورتیں بن گئیں جب مسلمان نے اپنی زبان سے ھو کا لفظ بولا' دہریوں کے عقیدے سے جدا ہو گیا۔

دوسرا فرقہ فلاسفہ ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ کائنات کا ایک بنانے والا ہے مگر اس کی کوئی صفت نہیں یعنی کائنات میں جو تاثیریں ہیں صرف واسطوں سے ہیں نہ کہ اس ذات سے اور حقیقت میں ہندوؤں کا مذہب بھی یہی ہے۔ اور جب مردِ مومن نے لفظ اللہ کا ذکر کیا جو کہ تمام صفات کا جامع ہونے پر دلالت کرتا ہے تو ان فرقوں کی گفتگو سے چھٹکارا پایا۔

تیسرا فرقہ ثنویہ کا ہے جو کہتے ہیں کہ ایک صانع ساری کائنات کے لیے کافی نہیں ہے تو ناچار چند صانع چاہئیں۔ اور جب صاحبِ ایمان نے اللہ تعالیٰ کی صفات میں لفظ احد کا ذکر کیا تو اس شرکت سے نجات پائی۔

چوتھا فرقہ یہود و نصاریٰ کے گمراہوں کا ہے جن کا عقیدہ یہ ہے کہ کائنات کو بنانے والے کے لیے بھی دوسری مخلوقات کی طرح بیوی اور اولاد ہے۔ چنانچہ انہوں نے حضرت عزیر اور حضرت عیسیٰ علیٰ نبینا علیہ السلام کو بیٹے اور حضرت مریم کے لیے زوجیت کی نسبت مقرر کی ہے۔ جب مسلمان نے لم یلد ولم یولد کہا تو اس عقیدے سے بالکل دور ہو گیا ویسی عقیدے کی جنس سے وہ تشبیہات ہیں جو کہ یہود و نصاریٰ نے اللہ تعالیٰ کے بارے

میں گھڑی ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ کو مخلوقات کی طرح کئی چیزوں کا محتاج مانتے ہیں۔ تمام تشبیہات کے رد کے لیے احتیاج کی نفی کافی ہے جو کہ صمد سے معلوم ہوتی ہے۔

پانچواں فرقہ مجوسیوں کا ہے جو کہ کہتے ہیں کہ تاثیر اور ایجاد کی طاقت میں اہرمن' یزداں کا ہمسر ہے اور ظلمتوں کی چیزیں' ایذاء پہنچانے والی اشیاء' اور دیگر شرور اور قبائح اسی کی مخلوق ہیں اور یزداں کے لشکر اور اہرمن کے لشکر میں جھگڑا اور کھینچا تانی ہمیشہ سے جاری ہے۔ اور بعض اوقات یزداں کا حکم ہوتا ہے اور کائنات میں خیر اور نیکی آ جاتی ہے۔ اور کبھی اہرمن کا لشکر زور کر جاتا ہے اور دنیا میں بُرائی اور بُری چیزیں پھیل جاتی ہیں اور اس عقیدے کے رد میں وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ سورۃ کے آخر میں لایا گیا۔

نیز علماء فرماتے ہیں کہ آدمی لطائف نفسی' عقلی' قلبی' روحی اور سری کا مرکب ہے اور نفس کی معرفت کی انتہاء یہ ہے کہ لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُوْلَدْ وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ کو دریافت کر لے۔ اس لیے کہ ہر وہ چیز جس کی طرف نفس شہوت یا غضب کی قوت کے ساتھ مائل ہوتا ہے' ان حالات سے خالی نہیں ہے کہ یا وہ کسی چیز سے پیدا ہوتی ہے یا اس سے کوئی چیز پیدا ہوتی ہے یا اس کے برابر دنیا میں کوئی اور چیز موجود ہے۔ چونکہ وہ پروردگار کو تمام موجودات سے بالاتر سمجھتا ہے ناچار اس سے ان صفات کی نفی کرتا ہے اور یہ عقل کا بالاتر مرتبہ ہے اور اس کی معرفت کا آخری مقام الصمد ہے یعنی اللہ تعالیٰ وہ ذات ہے جہاں احتیاج کا سلسلہ ختم ہو جاتا ہے۔ وہ کسی دوسرے کا محتاج نہیں۔ اس لیے کہ عقل کو اسباب اور مسببات کا علم دیا گیا ہے۔ پس وہ ہر چیز کو کسی سبب کا محتاج سمجھتی ہے اور اس سبب کو دیگر سبب کا محتاج مانتی ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ دنیا و آخرت کی تدبیر جو کہ عقل کا کام ہے اسباب کے ساتھ وابستہ ہے۔ پس ذاتِ باری تعالیٰ کی حقیقت میں اس کی دریافت کی انتہا اسی قدر ہے کہ عالم اسباب اور مسببات سے وراء ہے۔

اور قلب جس کی شان' مشہور کیفیات محبت' خوف' رجا اور اعتماد میں سے کسی کیفیت میں استغراق ہے' اور اس کی معرفت کا آخری مقام مرتبہ احدیت ہے۔ اور روح جو کہ عالم امر سے آئی اور اسے نَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ کی خلعت پہنائی گئی۔ اس کی معرفت کی انتہا

اپنی اصل کی طرف کھینچنا۔ اور اس کے اسم ذات اللہ کے ذکر سے راحت اور اُنس حاصل کرنا ہے۔ اور سِرّ جو کہ روح سے بالاتر ہے' ہویتِ مستقلہ کے سوا کچھ نہیں جانتا اور اس کا علم وجود کی خصوصیت کے ادراک میں منحصر ہے' اور بس۔

پس اس سورۃ میں وہ معرفت ارشاد فرمائی گئی ہے جو کہ تمام لطائفِ انسانی کے ساتھ متعلق ہے تاکہ ہر لطیفہ اس معرفت سے حصہ حاصل کرے۔

نیز علماء کرام کہتے ہیں کہ ھُوَ وادی عشق ذات کے حیران پھرنے والوں کے لیے ہے جن کا ملاحظہ ذات میں پورے استغراق کی وجہ سے اس قدر سے زیادہ نصب العین رہا ہی نہیں۔ اور کلمہ 'اللہ' عارفوں کا حصہ ہے جو کہ اسے تمام اسماء و صفات میں پہچانتے ہیں اور ہر مرتبے کے احکام کو جدا جدا جانتے ہیں۔ اور لفظ احد عام اولیاء اللہ کا حصہ ہے جن کے پیش نظر ہر کثرت میں وصف وحدت سے موصوف وہی ذاتِ واحد ہے اور لَمْ یَلِدْ وَلَمْ یُوْلَدْ وَلَمْ یَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ کا معنی عام ایمان والوں کا حصہ ہے جو کہ عقلی اور نقلی دلائل کی قوت سے یہاں تک پہنچتے ہیں اور جب ان تمام معنوں کو ایک شخص جمع کر لے تو موحد خالص ہو جائے۔

یہاں جاننا چاہیے کہ اس سورۃ کو حدیث شریف میں قرآن پاک کا ایک تہائی فرمایا گیا اور یوں قرار دیا گیا ہے کہ اس سورۃ کا پڑھنا قرآن کے تہائی حصہ کی تلاوت کے برابر ہے۔

وجہ فضیلت سورۂ اخلاص

اور اس فضیلت کی وجہ یہ ہے کہ قرآن پاک کا مقصد تین چیزوں سے باہر نہیں ہے یا ذاتِ الٰہی کی معرفت ہے یا کتابوں کے نزول اور انبیاء علیہم السلام کے بھیجنے سے واصل ہونے کے راستے کی معرفت یا ہماری شریعت کا بیان یا اس حالت کا بیان جو کہ جنت اور جہنم میں داخل ہونے کے بعد ہو گی اور یہ سورۃ ایک چیز کے بیان کے لیے کافی ہے جو کہ سب سے افضل اور پہلی ہے جیسا کہ واضح ہو چکا۔ واللہ اعلم

سورۂ فلق

لغت میں فلق صبح کی سفیدی کو کہتے ہیں۔ جو کہ رات کی تاریکی کو پھاڑ کر نمودار ہوتی ہے اور رات کی تاریکی میں صبح کا نمودار ہونا عدم کے پردے سے وجود کے ظاہر ہونے کا نمونہ ہے۔ اس لیے کہ عدم کی حالت میں کوئی تمیز اور تشخیص نہیں ہے اور وہ پوشیدہ جہان ہے جب وجود کے نور نے ظہور کیا' ہر چیز معین اور مقرر ہوگئی اور اس پر ہر چیز کے اثرات اور احکام مرتب ہونے لگے اور یہ حالت بعینہٖ صبح کے نور کے ظاہر ہونے کی حالت کی مثل ہے جس کی وجہ سے چیزیں ممتاز ہو جاتی ہیں اور دنیا میں حس و حرکت پیدا ہو جاتی ہے۔ جبکہ رات کی تاریکی عدم کے پردے کی طرح ہے اور حقیقت میں دنیا میں جو بھی شر اور بُرائی موجود ہوتی ہے' عدم کے وجود کے ساتھ ملنے کی وجہ سے ہے۔ پس تمام شرور عدم کے حوالے سے ہیں اور وجود کا نور انہیں واضح کرنے والا ہے اور چونکہ یہ سورۃ شروں سے پناہ طلب کے لیے نازل ہوئی ہے ناچار اس کی ابتدا میں نور کے ظاہر ہونے کا اشارہ واقع ہوا اور اس سورۃ کا نام اس نور کی طرف منسوب کر کے سورۂ فلق رکھا گیا۔

ایک لطیف نکتہ

اور یہاں ایک لطیف نکتہ ہے اور وہ یہ ہے کہ اس سورۃ میں ایک صفتِ الٰہی جو کہ رب الفلق ہے' کے ساتھ تین (۳) چیزوں تاریکی' جادو اور حسد سے تعوذ واقع ہوا جبکہ سورۂ ناس میں ایک چیز کے شر سے جو کہ شیطان کا وسوسہ ہے' تین (۳) صفاتِ الٰہی جو کہ رب الناس' ملک الناس اور الہ الناس ہیں' کے ساتھ تعوذ واقع ہوا۔ تا کہ اس بات کا پتہ چلے کہ دین کی حفاظت جان اور جسم کی حفاظت سے مقدم اور زیادہ ضروری ہے کیونکہ شیطان کا وسوسہ دین کو برباد کرنے والا ہے اور وہ چیزیں جان اور جسم کو تکلیف دینے والی ہیں۔

اور یہ سورۃ مدنی ہے' اس کی پانچ (۵) آیات' تیئس (۲۳) کلمات اور تہتر (۷۳) حروف ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ الْفَلَقِ آپ کہہ دیں یارسول اللہ! کہ میں فلق کے پروردگار کی پناہ لیتا ہوں۔ اور لغت میں فلق صبح کے معنوں میں ہے اور حقیقت میں ایسی چیز سے عبارت ہے جسے پھاڑا جائے اور اس سے کوئی اور چیز برآمد ہو تا کہ اس چیز سے عجیب و غریب اثرات ظاہر ہوں جیسے کھیتی کا دانہ' کھجور کی گٹھلی اور ہر درخت کا بیج اور جیسے پتھر اور زمین جن سے پانی نکلتا ہے۔ اور جیسے باپ کی پشت اور ماں کا شکم۔ اور ان تمام چیزوں کو فلق کا لفظ شامل ہے اور یہاں فلق کی تخصیص اس لیے ہے کہ مخلوقات کا شر زیادہ تر ان کی اصل کی خباثت سے ہوتا ہے اور چونکہ اللہ تعالیٰ کی ربوبیت اصل اور فرع کو محیط ہے۔ پس فرع کے شر کو دور کرنے میں اصل کی پناہ لینا ضروری ہوا۔ جس طرح کہ اگر کوئی شخص کسی کے نوکر سے کسی قسم کا خوف رکھتا ہے تو لازماً اس کے مالک کی طرف رجوع کرتا ہے۔ اور اگر اس سے بھی برائی کی توقع ہو اور مالک کے مالک کی طرف رجوع کرتا ہے یہاں تک کہ مالک ہونے کا سلسلہ ختم ہو جائے اور یہ سلسلہ ختم نہیں ہوتا مگر پروردگار تک۔ پس التجا کا آغاز رب کریم سے کرنے کی تعلیم فرمائی گئی تا کہ بات مختصر ہو۔

مِنْ شَرِّ مَا خَلَقَ اس کی برائی سے جسے پیدا کیا گیا ہے۔

مخلوقات کی تین اقسام

جاننا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ کی مخلوقات کی تین قسمیں ہیں: ایک وہ مخلوق جس میں خیر غالب ہے اور شر مغلوب بلکہ معدوم جیسے ملائکہ مقربین۔ انبیاء علیہم السلام اور اولیاء اللہ' دوسری وہ مخلوق جس میں شر غالب اور خیر مغلوب یا معدوم ہے جیسے شیطان اور ایذاء دینے والی دیگر چیزیں جیسے انسان' جن' درندے' چارپائے' کیڑے مکوڑے' سانپ' بچھو اور چیونٹی وغیرہ۔ اور تیسری وہ مخلوق جس میں خیر اور شر دونوں موجود ہوں اور بعض اوقات بعض لوگوں کے اعتبار سے شر ہو جاتا ہے اور بعض اوقات بعض دوسرے لوگوں کی بہ نسبت خیر ہو جاتا ہے جیسے مال دنیا' بیوی بچے اور دوسرے ساز و سامان بلکہ اخلاق' علوم' حسب و نسب اور دیگر صفات اور نسبتوں کا یہی حال ہے۔

پس آخری دو قسموں میں شَرِّ مَا خَلَقَ سے مراد وہ برائی ہے جو کہ ان میں موجود ہے جبکہ پہلی قسم کی نسبت سے جس میں مطلقاً برائی ہے ہی نہیں بعض دوسری چیزوں کے ساتھ لگنے کے اعتبار سے ہے۔ چنانچہ عبادت کا شر ریاء اور سمعہ ہے' ایمان کا شر نفاق اور ارتداد ہے۔ انبیاء علیہم السلام کی نسبت سے شر ان کو جھٹلانا اور ان کی فرماں برداری میں کوتاہی کرنا ہے جبکہ اولیاء اللہ کی نسبت سے شر ان کی صحبت کے انوار سے محرومی اور انہیں حاصل نہ کرنا ہے۔ علیٰ ہذا القیاس اسی لیے کہتے ہیں کہ شر الخیر تاخیرہ وشر العمل الصالح تقصیرہ یعنی خیر کا شر اس کی تاخیر اور عمل صالح کا شر اس میں کوتاہی ہے۔ اور اس قسم کے شر کو نیک کے ساتھ منسوب کرنا جائز ہے جیسا کہ عرف میں مشہور ہے کہ پھول کا شر کانٹا' خزانے کا شر سانپ اور اچھے چہرے کا شر بُری عادت ہے اور مفسرین نے کہا ہے کہ شَرِّ مَا خَلَقَ سے مراد سب سے بدترین مخلوق ہے جو کہ شیطان ہے اور چونکہ تمام شرور کا منشا وہی ہے اس لیے سب سے پہلے تعوذ اسی سے واقع ہوا۔

وَمِنْ شَرِّ غَاسِقٍ اِذَا وَقَبَ اور تاریک چیز کے شر سے جب اس کی تاریکی ہجوم کرے۔ جاننا چاہیے کہ تاریکی کبھی حسی ہوتی ہے اور کبھی معنوی' حسی تاریکی رات کی تاریکی ہے جس میں بہت سے شر ظاہر ہوتے ہیں۔

تاریکی شب کے شر

ایک شر جن شیطانوں کا پھیلنا جو کہ تاریکی کی مناسبت کی وجہ سے حرکت اور خوشی میں آتے ہیں اور چمگادڑ کی طرح اپنے گھروں سے نکل کر مخلوقِ خدا کو ستاتے ہیں اسی لیے حدیث شریف میں آیا ہے کہ جب رات ہو جائے' اپنے بچوں کو باہر نہ آنے دیں کیونکہ اس وقت شیاطین منتشر ہوتے ہیں۔ دوسرا شر درندوں اور موذی کیڑوں مکوڑوں کا نکلنا جیسے سانپ اور بچھو۔ تیسرا شر لوگوں کے گھروں کو لوٹنے کے لیے چوروں کا اِدھر اُدھر پھیل جانا' چوتھا شر جادو اور طلسمات والوں کی توانائی کیونکہ سورج کے غالب و قاہر نور کی وجہ سے ان کے اعمال دن کے وقت اثر کم کرتے ہیں اور پانچواں شر فسق و فجور والوں کا گناہوں میں مصروف ہونا۔

معنوی تاریکی کی چند اقسام

اور معنوی تاریکی کی بھی چند اقسام ہیں' ان میں سے بڑی تاریکی وہم کی ہے جو کہ عقل کے نور پر غالب آ جاتی ہے۔ اور اشیاء کی حقیقتوں کو نگاہ سے اوجھل کر دیتی ہے۔ اور اس کی شاخوں میں سے کفر کی تاریکی ہے اور گناہوں' برے اخلاق اور بری صحبتوں کی تاریکیاں ہیں اس آیت میں ان تمام تاریکیوں سے تعوذ واقع ہوا۔

وَمِنْ شَرِّ النَّفّٰثٰتِ فِي الْعُقَدِ اور گرہوں میں پھونک مارنے والیوں کے شر سے یعنی ان خبیث نفسوں کے شر سے جو کہ شیاطین کے اسماء اور ان کے کلمات پڑھنے کے ساتھ توسل کر کے نفوس اور اجسام میں تاثیر کرتے ہیں اور جادو کا معنی یہی ہے۔

وَمِنْ شَرِّ حَاسِدٍ اِذَا حَسَدَ اور حاسد کے شر سے جب حسد کا اظہار کرے۔ اور اس کے تقاضے کے مطابق عمل کرے۔ اور یہ قید اس لیے ہے کہ حاسد جس وقت تک اپنے حسد کو چھپائے رکھتا ہے اس چیز کا اثر اس تک نہیں لوٹتا۔ اور یہاں سے معلوم ہوا کہ بدترین شر حسد ہے اور فی الواقع جو شر بھی پوری کائنات میں پیدا ہوتا ہے یا ارادہ و اختیار والے نفوس سے صادر ہوتا ہے جیسے قتل کرنا' لوٹنا' ظلم کرنا' تاوان لینا اور جادو وغیرہ۔ یا ارادہ و اختیار سے خالی طبائع سے صادر ہو جیسے پانی میں غرق ہونا اور آگ میں جلنا وغیرہ اور بدترین شر ارادہ و اختیار والوں کا شر ہے اور ان تمام شروں کے نکلنے کی جگہ حسد کی وصف ہے۔ اسی لیے کہتے ہیں کہ پہلا گناہ جو آسمان میں واقع ہوا ابلیس کا حضرت آدم علیہ السلام پر حسد کرنا تھا اور پہلا گناہ جو زمین پر صادر ہوا قابیل کا ہابیل پر حسد کرنا تھا۔

(یاد رہے کہ یہاں گنڈے بنانا اور ان پر گرہ لگانا آیاتِ قرآن یا اسمائے الٰہیہ دَم کرنا جائز ہے۔ جمہور صحابہ کرام رضوان اور تابعین اسی پر ہیں اور حدیث عائشہ رضی اللہ عنہا میں ہے کہ جب حضور علیہ السلام کے اہل میں سے کوئی بیمار ہوتا تو حضور (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) معوذات پڑھ کر اس پر دَم فرماتے۔ نیز تعویذ اور عمل جس میں کوئی کلمہ کفر و شرک کا نہ ہو جائز ہے۔ خاص کر وہ عمل جو آیاتِ قرآنیہ سے کیے جائیں یا احادیث میں وارد ہوئے ہوں۔ حدیث شریف میں ہے کہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے عرض کی یا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم! جعفر رضی اللہ عنہ کے بچوں کو جلد جلد نظر ہو جاتی ہے' کیا مجھے اجازت ہے کہ ان کے لیے عمل کروں؟ حضور علیہ السلام نے اجازت دے دی۔ (ترمذی) خزائن العرفان صدر الافاضل مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی۔ الناقل محمد محفوظ الحق غفرلہ)

دو سوالات اور ان کے جوابات

دو سوال باقی رہ گئے: پہلا سوال یہ ہے کہ جب پہلے مخلوقات کے تمام شرور سے پناہ لے لی گئی تو جادوگروں' حاسدوں اور تاریکیوں کے ذکر کی حاجت نہ رہی پھر ان چیزوں کو کیوں ذکر فرمایا گیا؟ اس کا جواب یہ ہے کہ دیگر مخلوقات کا شر بالکل ظاہر اور واضح ہے جبکہ ان تین گروہوں کا شر پوشیدہ اور غیر واضح ہے۔ اور پوشیدہ شر ظاہری شر سے زیادہ سخت ہوتا ہے۔ ناچار خصوصیت کے ساتھ اس سے پناہ طلب کرنا ضروری ہوا۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ غاسق اور حاسد کو نکرہ لایا گیا جبکہ نفاثات کو لام تعریف کے ساتھ معرفہ لایا گیا' ایسا کیوں ہے؟

اس کا جواب یہ ہے کہ لام تعریف استغراق کے لیے ہے اور جادوگر سب کے سب شر ہیں۔ اس لیے کہ فی نفسہ جادو کبیرہ گناہ ہے گو اس کے ساتھ دفع شر یا کسب خیر کریں۔ اسی لیے حربی کافروں کو جادو کے ساتھ قتل کرنا اور شوہر کا دل بیوی کی طرف مائل کرنا درست نہیں ہے جبکہ ہر غاسق اور حاسد شر نہیں' بہت سی راتیں خیر میں گزرتی ہیں اور ظالموں اور کافروں کے ساتھ حسد کرنا برائی نہیں رکھتا۔ پس یہ استغراق کا مقام نہ تھا' نکرہ لانا مناسب ہوا۔

سورۃ الناس

مدنی ہے اس کی چھ (۶) آیات' بیس (۲۰) کلمات اور اسی (۸۰) حروف ہیں اور اسے سورۃ الناس کا نام اس خطاب کے لیے دیا گیا ہے کہ لوگوں کے ساتھ جو حقائق الہیہ اور کونیہ تعلق رکھتے ہیں' اس میں مذکور ہیں۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

اسم جلالت' اللہ' کا ذکر اس لیے ہے کہ اللہ تعالیٰ کے اسماء' صفات اور افعال لوگوں میں جلوہ گر ہیں اور رحمٰن کا لفظ اس لیے لایا گیا کہ نور وجود کا فیض پہنچانے کے بعد لوگوں کی تکمیل کا اشارہ ہو جبکہ لفظ رحیم اس چیز کے شر سے جو کہ لوگوں میں ہے اور لوگوں سے لگتی ہے'

حفاظت کا اشارہ کرنے کے لیے ہے۔

سببِ نزول اور لبید بن عاصم کا جادو کرنا

ان دونوں سورتوں کے نزول کا سبب یہ ہے کہ لبید بن عاصم نے حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر جادو کیا۔ اور آپ اس جادو کی وجہ سے علیل ہو گئے اور بعض اوقات یوں خیال فرماتے کہ میں نے ایک کام کر لیا ہے حالانکہ کیا نہیں ہوتا تھا۔ جب یہ عارضہ چھ (۶) ماہ تک دراز ہو گیا تو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خواب میں دِکھایا گیا کہ دو فرشتے حاضر آئے۔ ایک فرشتہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سرہانے اور دوسرا قدمین شریفین کی طرف بیٹھ گیا۔ ایک دوسرے سے سوال کرنے لگے۔ ایک نے کہا کہ اس رسولِ کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام کو کیا تکلیف ہے؟ دوسرے نے کہا کہ انہیں جادو کیا گیا ہے۔ پھر پہلے فرشتے نے پوچھا کہ آپ کو کس نے جادو کیا ہے؟ دوسرے نے کہا کہ لبید بن عاصم یہودی نے آپ کے بالوں میں جو کہ اس نے آپ کی کنگھی سے لیے ہیں اور آپ کی کنگھی کے دندانوں میں گیارہ (۱۱) گرہیں لگائی ہیں اور انہیں کھجور کی چھال کے غلاف میں رکھ کر ذروان نامی کنوئیں میں پتھر کے نیچے دفن کیا ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم جب صبح کے وقت اُٹھے اس کنوئیں کی طرف گئے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں سے دو آدمی کنوئیں میں اُترے اور اس پتھر کے نیچے سے وہ چیزیں باہر نکال لائے۔ حضرت جبرئیل علیہ السلام یہ دونوں سورتیں لائے جو کہ گیارہ (۱۱) آیات ہیں اور یہ گیارہ (۱۱) آیات ان گیارہ (۱۱) گرہوں پر پڑھ کر دَم فرمایا' وہ گرہیں کھل گئیں اور حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم مکمل صحت یاب ہو گئے۔ (اقول و باللہ التوفیق۔ حضرت حکیم الامت مولانا مفتی احمد یار خان گجراتی حاشیہ القرآن مسمی بنورلعرفان میں فرماتے ہیں کہ نبی پاک علیہ الصلوٰۃ والسلام کے جسم پر جادو کا اثر ہو سکتا ہے جیسے تلوار' تیر اور نیزے کا یہ اثر نبوت کے خلاف نہیں۔ جادو کا اثر دُور کرنے کے لیے دعائیں تعویذ وغیرہ جائز ہیں۔ اللہ تعالیٰ نبی علیہ السلام کی عقل اور اعتقاد کو جادو سے محفوظ رکھتا ہے تاکہ تبلیغ دین میں رکاوٹ نہ ہو۔ الناقل محمد محفوظ الحق غفرلہ)

اور معوذتین پر قرآن پاک کے اختتام میں نکتہ یہ ہے کہ جب نعمت پوری ہو جائے اور

کمال کو پہنچے، دشمن کے حسد اور مکر کے خوف کے سوا کچھ نہیں رہتا۔ پس یہ پناہ طلب کرنے کا موقع ہے اور یہاں شیطان کے شر سے استعاذہ تین اسمائے حسنٰی کے ساتھ خاص فرمایا گیا۔ رب، ملک، الٰہ ۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آدمی کے دل میں شیطان کے داخلے کی جگہ تین جہت سے ہے: شہوت، غضب اور غلط عقیدہ۔ جسے ہوا بھی کہتے ہیں۔ اسم رب شر شہوت کو اسم ملک غضب کو اور اسم الٰہ شر ہوا کو دُور کرنے کے لیے ہے۔ گویا یوں ارشاد فرمایا کہ اگر شیطان تجھے شہوت کی راہ سے وسوسہ ڈالے تو اللہ تعالیٰ کی ربوبیت کو نگاہ میں رکھ اگر غضب کی راہ سے سامنے آئے تو اللہ تعالیٰ کی بادشاہی، عدل اور انتقام کو یاد کر اور ہوا کی راہ سے آئے تو مرتبہ الوہیت سے التجا کر۔

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

قُلْ اے کہنے والے جو کہ شیطان کے شر سے پناہ ڈھونڈتا ہے یوں کہہ نَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ میں لوگوں کے پروردگار کی پناہ لیتا ہوں۔ اللہ تعالیٰ کی پرورش اگرچہ تمام مخلوقات کو عام ہے لیکن جو تربیت لوگوں کے لیے ہے اس کی صورت کسی مخلوق میں نہیں ہے اس لیے کہ وجود انسانی پوری کائنات کا نمونہ ہے تو گویا بارگاہِ الوہیت میں ایک جامع مختصر اور کائنات کا خلاصہ ہے۔

انسان کائنات کا خلاصہ ہے

اس کی تفصیل یہ ہے کہ وجود، حیات، علم، ارادہ، قدرت، سننا، دیکھنا اور بولنا سب شان الوہیت کی صفات کا پرتو ہیں۔ جبکہ گرمی، سردی، تری اور خشکی اس کے وجود میں عناصر اربعہ کی جگہ پر ہے۔ وہ ترکیب کی وجہ سے معدن سے مشابہت رکھتا ہے، غذا اور پیدا کرنے کی وجہ سے نباتات کے مشابہ ہے۔ اور حس، قوتِ تخیل نیز لذت اور تکلیف محسوس کرنے میں حیوانات کی طرح ہے۔ اور اسے حیوانات کی ہر قسم کے ساتھ مشابہت حاصل ہے۔ پس غضب اور جرأت کے وقت درندے کی طرح ہے، شہوت اور لالچ کے وقت چرنے والے جانور کی طرح ہے۔ مکر، حیلہ، اغواء کرنے اور نیکوں کے نظام کو درہم برہم کرنے میں شیطان ہے۔ معرفت، طاقت اور عصمت میں ایک مقرب فرشتہ ہے۔ اس میں حکمتیں جمع ہونے کی

وجہ سے لوحِ محفوظ کی مانند ہے۔ اور اس وجہ سے کہ اس کی تاثیر سے شاگردوں اور ہدایت کے متلاشیوں کے دِلوں میں اشیاء کی صورتیں راسخ اور مضبوط ہوتی ہیں۔ قلم اعلیٰ کی طرح ہے۔ بہر حال وہ نقصان جو کہ آدمی نطفہ ہونے کی صورت میں رکھتا ہے اور پھر وہ کمال جو کہ مقام خاتمیت سیّد عالم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم تک پہنچنے کے بعد رونما ہوا' دونوں کو قیاس کیا جا سکتا ہے اور اس کی ربوبیت کا نظارہ کرنا چاہیے۔

مَلِكِ النَّاسِ لوگوں کا بادشاہ۔ یہ صفت اس بات کا اشارہ ہے کہ آدمیوں کو روح مدبرہ دی گئی ہے اور اسے ادراک اور حرکت دینے والی قوتوں پر تصرف عطا فرمایا گیا ہے۔ پس جسم کی کائنات میں روح بادشاہ مطلق ہے اور اس کا پورا بدن بمنزلہ آباد ملک کے ہے جبکہ ادراک اور تحریک کی قوتیں سب اس بادشاہ کا لاؤ لشکر ہیں اور یہ سب کچھ حضرت حق جل شانہ کی بادشاہت کے عجائبات میں سے ایک عجوبہ ہے۔

اِلٰهِ النَّاسِ لوگوں کا معبود۔ یہ صفت اس بات کا اشارہ ہے کہ عبادات سے اللہ تعالیٰ کی معرفت کا شوق اور اس کے حضور قرب طلب کرنا لوگوں کی اصل جبلت میں سپرد کیا گیا ہے۔ اسی جبلی شوق کی بناء پر لوگوں کے گروہوں میں سے ہر گروہ والے اس مقصد کی جستجو میں اور اس خیال کی گرفت میں ہیں اور یہ عام شوق اور پوری مخلوق کی گرفتاری اس کی معبودیت کے کرشموں میں سے ایک کرشمہ ہے۔

لفظ رب' ملک اور الٰہ کی ترتیب میں تفسیری حکمت

اور بعض مفسرین نے ان تین صفات کی تفصیل اور انہیں اس ترتیب کے ساتھ لانے میں یوں گفتگو فرمائی ہے کہ زمانۂ طفلی میں آدمی اپنے پرورش کرنے والے کے سوا کسی کو نہیں پہچانتا اور بھوک پیاس کے وقت اسی سے التجا کرتا ہے۔ اور اگر کسی چیز سے ڈرتا ہے تو اسی کی طرف بھاگتا ہے۔ اسی لیے ان حالات میں بچہ اپنے ماں باپ کو پکارتا اور ان سے فریاد کرتا ہے۔ اور جب جوانی کی حد کو پہنچتا ہے اور دیکھتا ہے کہ میرے ماں باپ جب بادشاہ اور سردار کے محتاج ہیں اور بادشاہ اور سردار سے روزی چاہتے ہیں اور دفع بلاء میں بادشاہ اور سردار کے دربار میں فریاد لے جاتے ہیں ناچار اس کے ذہن

میں یہ بات بیٹھ جاتی ہے کہ جو کچھ ہے' بادشاہ اور سردار ہے اس کا قرب حاصل کرنا کارخانۂ کائنات کے منظم ہونے کا موجب ہے۔ پس اس حالت میں اس کا سارا اعتماد بادشاہ اور سردار پر ہے۔

اور اس حالت سے بھی جب اس نے ترقی کی اور مشاہدہ کیا کہ بعض اوقات بادشاہ اور سردار بھی عاجز اور بے بس ہو جاتے ہیں۔ اور جہان غیب کی طرف التجا کرتے ہیں۔ اور وہاں سے مقاصد میں اور حاجات کے حصول میں مدد طلب کرتے ہیں۔ تو معلوم کر لیتا ہے کہ بادشاہ اور سردار بھی میری طرح عاجز اور محتاج ہیں۔ پس کائنات کا کارخانہ ایک اور ذات کے ساتھ وابستہ ہے جسے اللہ کہتے ہیں۔ پس اس صفت کو لانے میں اس بات کا اشارہ ہے کہ اگر آدمی مزاج طفلی رکھتا ہے اور پرورش کے بغیر کچھ نہیں جانتا تو میں یہ صفت بھی رکھتا ہوں۔ چاہیے کہ میری بارگاہ میں التجا کرے کہ میں رب الناس ہوں اور میری ربوبیت تمام لوگوں کو عام ہے۔ بخلاف ماں باپ کے جن کی ربوبیت اپنی اولاد کے ساتھ خاص ہے۔

اور اگر اس کی عقل بلوغ کی حد تک پہنچ گئی ہے' بادشاہ اور سردار کو مالک امر سمجھتا ہے تو یہ صفت بھی مجھ میں وجہ کمال کے ساتھ موجود ہے کہ میں تمام کائنات کا بادشاہ ہوں نہ کہ ایک یا دو ریاستوں تک محدود ہوں۔ اگر اس نے تجربہ کے ساتھ معلوم کر لیا ہے کہ بادشاہ اور سردار نیز ماں باپ سب کے سب ایک اور ذات کے محتاج ہیں جسے اللہ کہتے ہیں۔ اور صبح و شام اس کا نام ورد زباں رکھتے ہیں تو میں اس صفت کے ساتھ موصوف ہوں۔ مقصد یہ کہ ہر حال میں اس کے حضور التجا کرنا چاہیے اور اسباب اور واسطوں کو نظر انداز کر دینا چاہیے۔

مِنْ شَرِّ الْوَسْوَاسِ برے خیال کے اثر سے اور یہ اَعُوْذُ کے ساتھ متعلق ہے یعنی میں برے خیالات کی برائی سے پناہ لیتا ہوں اور برا خیال چند طریقوں سے نقصان دیتا ہے۔ ایک تو مزاج خراب کرنے میں' دوسرا تدبیر نفس میں' تیسرا معرفت میں' چوتھا عبادت میں' پانچواں قربِ خداوندی حاصل کرنے میں اور آدمی کی عمر کی ابتدا سے لے کر

انتہاء تک اسے یہی کام درپیش آتے ہیں اور جب یہ کام خلل میں پڑ گئے تو اس کی عمر برباد ہو گئی۔

اَلْخَنَّاسِ وہ جو بھاگتا ہے۔ یہ وسوسے کی صفت ہے' صاحبِ وسوسہ کے اعتبار سے اس لیے کہ شیطان' ذکرِ الٰہی' تلاوتِ قرآن پاک اور فرشتوں کی حاضری سے طبعی طور پر بھاگتا ہے اور یہ صفت لانا اس لیے ہے کہ شیطان کا کام بہت مشکل ہے اور اس کے شر سے محفوظ رہنا رب الناس کے حضور التجا کیے بغیر ہرگز ممکن نہیں ہے۔ اس لیے کہ جب کوئی دشمن مقابلے میں کھڑا ہوا سے دفع کرنا آسان ہوتا ہے۔ اور جب وہ کھڑا نہ رہے' بار بار عداوت کرے تو ہر وقت حفاظت اور احتیاط سے گزارنا چاہیے۔ اور یہ کام بہت دشوار ہے اسی لیے اربابِ حکومت وسلطنت کے لیے ان دشمنوں کو دفع کرنا جو کہ ایک دَم ہجوم کر کے جنگ شروع کر دیں' ان ڈاکوؤں اور چوروں کو دفع کرنے سے زیادہ آسان ہے جو کہ قابو پانے کے وقت اپنا کام کر کے غائب ہو جائیں اور ان کا تدارک ہر غیب ومخفی کا علم رکھنے والی ذات یعنی رب العزت جل شانہ کے سوا بہت دشوار ہوتا ہے۔

اَلَّذِیْ یُوَسْوِسُ یہ وسواس کی دوسری صفت ہے یعنی وہ بُرے خیالات لانے والا جو کہ ردی وسوسے ڈالتا ہے' فِیْ صُدُوْرِ النَّاسِ لوگوں کے سینوں میں۔ اور سینوں کو خاص کرنے کی وجہ یہ ہے کہ وہاں نفسِ ناطقہ کے اثرات حیوانیت کے ساتھ مخلوط ہو کر فساد کا رنگ جلد قبول کرتے ہیں۔ بخلاف دوسرے اعضاء کے۔ اس لیے کہ جگر میں ردی وسوسے نہیں ہیں۔ نفسِ ناطقہ اپنے نفسِ نباتی کے ساتھ کام کرتا ہے اور دماغ میں اگرچہ فساد کی توقع ہے کیونکہ قوت وہمیہ عقلی قوت کو پریشان کرتی ہے لیکن اس کا زیادہ تر فساد نفسِ حیوانی سے اثرات بلند ہونے کی وجہ سے ہوتا ہے جیسا کہ حکمت والوں پر پوشیدہ نہیں ہے۔

مِنَ الْجِنَّةِ وسواس کا بیان ہے۔ یعنی بُرے خیالات والا خواہ جنوں کی جنس سے ہو جیسے شیاطین کہ دھوئیں کے غلبے کی وجہ سے ان میں طبعی تاریکی پختہ اور راسخ ہے۔ اور انتظامات میں خلل ڈالنے' فاسد مشورے اور تدابیر طبعی طور پر ان کا خاصہ ہیں اور آگ ہونے

اور لطیف ہونے کے باہم امتزاج کی وجہ سے ان اجسام کا انسانی ارواح کے مساموں میں سرایت کرنا جلدی اور آسان ہوتا ہے۔ اور جب وہ اجسام جو کہ ان فاسد تدابیر اور باطل آراء کے حامل ہوتے ہیں' ارواح کے ساتھ مخلوط ہوتے ہیں تو ان کا اثر ارواح کو پہنچتا ہے اور ارواح ان تدابیر اور آراء کی حامل ہو جاتی ہیں اور اسی کے مطابق بدن میں حرکت اور سکون پیدا کرتی ہیں اور گناہ صادر ہوتے ہیں۔

اسی لیے فرمایا گیا ہے کہ **ان الشیطٰن یجری من الانسان مجری الدم** یعنی شیطان آدمی کے رگ و پے میں خون کی جگہ دوڑتا ہے' اللہ تعالیٰ ہمیں اس سے پناہ دے۔ (آمین)

اور شیطانی وسوسوں کی کوئی حد نہیں ہے' زیادہ تر برائی' فسق اور فجور کی طرف بُلاتا ہے۔ اگر کبھی نادر طور پر طاعت اور نیکی کی طرف دعوت دیتا ہے تو دو حال سے خالی نہیں یا تو چاہتا ہے کہ آسان نیکی میں مصروف کر کے عظیم نیکی ضائع کر دے جیسا کہ نماز کا وقت کسی بیمار کی مزاج پُرسی میں بلاوجہ گزار دیں یا چاہتا ہے کہ آسان نیکی کو بہت بڑی بُرائی کا سبب بنا دے جیسے کسی منگتے کو روٹی دینا اور پھر اس پر احسان رکھنا اور ہنسی مذاق کرنا۔

شیطان کے وساوس کی تفصیل

اب وساوس کی اقسام کا کچھ حصہ شمار کیا جاتا ہے جن میں سے زیادہ تر دِلوں کو خراب کرتے ہیں۔ ان میں سے یہ ہے کہ عام لوگوں کے دِلوں میں ذات و صفاتِ الٰہی' اسرارِ نبوت اور امورِ اخروی کی تحقیق' جبر و اختیار کے مسئلہ اور قضا و قدر کے راز کی تحقیق اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی لڑائیوں کے اختلافات میں حق کی تفتیش کا وسوسہ ڈالتا ہے تاکہ آہستہ آہستہ تحقیق کے دوران وہ ان حقائق کا انکار کر دیں اس لیے وہ ان کی سمجھ کے مرتبے سے بالاتر ہیں۔

اور بعض کو بے بنیاد شبہات کے ساتھ بزرگوں سے امید شفاعت' معمولی نیکیوں پر ثوابِ عظیم کی امید' کرمِ الٰہی کا عام ہونا اور اللہ تعالیٰ کے عذاب سے بے خوف ہونا' دل میں ڈالتا ہے اور بعض کو اس کے برعکس اللہ تعالیٰ کی رحمت اور ثواب سے ناامیدی اور محرومی کا

وسوسہ ڈالتا ہے اور بت پرستوں کو قربِ خداوندی حاصل کرنے کا فریب دیتا ہے اور دیووں' پریوں اور جنوں کی پوجا چھوڑنے میں دنیوی نقصان پہنچنے سے ڈراتا ہے جیسے بچوں کا فوت ہونا اور مال میں نقصان ہونا۔

اور نماز پڑھنے والوں کے لیے پہلے ان کی نیت میں ریاء شامل کر دیتا ہے۔ پھر رکعات کی گنتی اور ارکان کی ادائیگی میں سہو اور بھول جانے کو داخل کر دیتا ہے۔ اور بعض کو نیت اور نغمہ قرأت درست کرنے اور حروف کے مخارج کو صحیح کرنے میں گرفتار کرتا ہے۔ اور زکوٰۃ دینے میں فقر سے ڈراتا ہے۔ اور اگر کبھی زکوٰۃ دی ہو تو ریاء' سمعہ' خود بینی اور منگتوں پر احسان چڑھا کر اسے ضائع کرتا ہے۔ حرام طریقے میں خرچ کرنے کو نیک اور اچھا کر دِکھاتا ہے اور خیال میں یوں بات ڈالتا ہے کہ لذت تو صرف شہوت اور مرتبے میں ہے۔ اور غصے کے وقت دل میں یوں خیال گزارتا ہے کہ اگر تو غصے کے تقاضے کو پورا نہیں کرتا تو تجھ پر ہمیشہ عجز اور ذلت کا داغ رہے گا۔ اور اللہ تعالیٰ کی عبادت میں جہاں بھی کوئی مشکل وارد ہوا سے کئی گنا بڑھا کر دِکھاتا ہے۔ جبکہ کفار کے لیے بتوں کی پوجا میں سخت مشکلات کو برداشت کرنا انہیں بالکل آسان اور سہل دِکھاتا ہے اور اللہ تعالیٰ کی راہ میں مارے جانے کو ناجائز اور ممنوع ظاہر کرتا ہے اور جان کی حفاظت کا حکم دیتا ہے۔

اور کفار کو بتوں کی راہ میں اپنے آپ کو قتل کرنے اور بیٹے اور شوہر کی محبت میں جل جانے پر اُبھارتا ہے۔ اور جن کے ہاں حلال طور پر خوبصورت' آراستہ اور معطر عورتیں موجود ہوں' انہیں چکلہ میں بدذات' بدخلق' نجس اور ناپاک عورتوں کے ساتھ بدکاری کی دعوت دیتا ہے۔ اور سرداروں کو وافر دولت پاس ہونے کے باوجود لوگوں کے اموال میں گرفتار کرتا ہے۔ اور ان کے دِلوں میں معمولی خیال کے ساتھ جان کو ضائع کرنا آسان کر دیتا ہے۔ اور اس قدر جو بیان ہوا اس کے وسوسوں کے طلسمات کا ایک حصہ ہے اور اگر اس کی خرابیوں کی شرح کی جائے تو ایک طویل دفتر چاہیے۔

شیطانی طلسمات کا علاج

اور ان تمام طلسموں کا علاج تین (۳) چیزیں ہیں: پہلی چیز اس کے پُرفریب حیلوں کو

سمجھنا ہے کہ صرف اس امر کو دریافت کر لینے سے کہ یہ عمل شیطانی ہے' اس کا شر کم اور زور سست پڑ جاتا ہے۔ جس طرح کہ چور کو جب صاحب خانہ کا بے دار ہونا معلوم ہوتا ہے' بھاگ جاتا ہے۔ نیز اس چالاک آدمی کی طرح کہ جب وہ کسی شخص کے متعلق معلوم کر لے کہ اس کے فریبوں پر واقف ہو گیا ہے تو ناامید ہو جاتا ہے۔

دوسری چیز یہ ہے کہ اس کے وسوسے کو معمولی سمجھے اور توجہ نہ کرے کہ اس صورت میں بھی اس کا شر کم ہو جاتا ہے۔ بھونکنے والے کتے کی طرح کہ اس کی طرف جس قدر توجہ کریں' زیادہ بھونکتا ہے۔ ورنہ خود بخود خاموشی اختیار کر لیتا ہے۔

تیسری چیز یہ ہے کہ قلبی اور زبانی ذکر پر ہمیشگی کریں اور دل کو ردی صفات شہوت اور غضب سے پاک کریں اس لیے کہ شہوت اور غضب کے غلبے کی حالت میں ذکر کا اثر قلب کے کناروں کی طرف بھاگ جاتا ہے ناچار شیطان کا وسوسہ قلب کے وسط میں جاگزیں ہو جاتا ہے اور اپنا کام کرتا ہے۔

وَالنَّاس اور خواہ وہ وسوسہ ڈالنے والا لوگوں کی قوت متخیلہ ہو جو کہ غلط اعتقاد اور شہوت وغضب کے غلبے کی وجہ سے حق سے دُور خیالات کو تمام قوتوں اور ارواح میں پھیلا کر مزاج یا تدبیر نفس کو دگرگوں کرنے کا یا عبادت اور قرب خداوندی حاصل کرنے کے اسباب میں سستی یا معرفت میں غلطی کا موجب ہوتی ہے۔

جاننا چاہیے کہ اس سورۃ میں لفظ ناس پانچ (۵) مقامات میں تکرار کے ساتھ واقع ہوا۔ لیکن لباب میں کہا گیا ہے کہ درحقیقت تکرار نہیں ہے اس لیے کہ پہلے مقام میں ناس سے مراد اطفال ہیں اور تربیت بمعنے پرورش ان کے حال کے مطابق ہے۔ اور دوسرے مقام میں جوان مراد ہیں اور ملک کے لفظ کا اشارہ قہر اور سیاست کی طرف ہے جو کہ ان کے حال کے مطابق ہے کہ ان میں شہوت اور غضب کی قوت اپنے کمال کو پہنچی ہوئی ہے۔ اس لیے وہ قہر اور سزا کے محتاج ہیں۔ تیسرے مقام میں بوڑھے مراد ہیں اس لیے کہ لفظ الٰہ جو کہ طاعت اور عبادت کی خبر دیتا ہے' ان کی حالت کے مناسب ہے۔ اور چوتھے مقام میں صالحین مراد ہیں اس لیے کہ شیطان زیادہ تر نیکوں کو گمراہ کرنے پر کمربستہ ہوتا ہے اور ان کے سینوں میں

وسوسے ڈالتا ہے اور پانچویں مقام میں فسادی اور انسانی شیاطین مراد ہیں جن کا کام گمراہ کرنا اور وسوسے ڈالنا ہے۔

نیز بعض مفسرین نے کہا ہے کہ اس سورۃ میں لفظ ناس پانچ (۵) بار اس لیے لایا گیا ہے کہ پانچ (۵) کا عدد طبیعت عددی کی رو سے بھی شرافت رکھتا ہے۔ اور جسے اس عدد سے گنا جائے اس کی رو سے بھی۔ طبیعت عددی کی رو سے اس کی شرافت اس لیے ہے کہ وہ عدد دائر ہے اور دائر کا معنی یہ ہے کہ جب اسے اسی میں ضرب دیں اور اس کے حاصل کو پھر اس میں ضرب دیں جہاں تک چلتے جائیں' ہر صورت میں اس کے اصلی پانچ موجود رہتے ہیں اور انہیں عدد کے آخر میں اپنے آپ کو ظاہر کرتا ہے جیسا کہ پچیس' ایک سو پچیس۔ علیٰ ہذا القیاس

اور معدود کی رو سے اس لیے ہے کہ مراتب کلیہ میں جنہیں حضرات خمس کہتے ہیں' حضرت حق کا ظہور پانچ میں منحصر ہے۔ اور کائنات کا خلاصہ جو کہ انسان ہے اس کی بھی انتہا پانچ اعضاء کے ساتھ ہے: سر' دو ہاتھ اور دو پاؤں اور ہر ہاتھ اور ہر پاؤں پانچ انگلیوں پر ختم ہوتا ہے اور سر جو کہ بلندی کی طرف تعلق زیادہ رکھتا ہے اس کا ظاہر' ظاہری حواسِ خمسہ اور اس کا باطن پانچ دوسری حسوں پر مبنی ہوتا ہے۔

نیز بعض محققین نے لکھا ہے کہ قرآن پاک کی ابتدا لفظ با کے ساتھ ہے جبکہ اس کی انتہا لفظ سین کے ساتھ ہے۔ یہ سب اس طرف اشارہ ہے کہ کونین میں قرآن مجید کافی ہے چنانچہ حکیم سنائی نے فرمایا ہے اول و آخر قرآن زچه باآمد و سین یعنی اندر رہ دین رہبر تو قرآں بس۔ یعنی قرآن پاک کے آغاز میں با اور آخر میں سین کس لیے آیا یعنی اس لیے کہ دین کی راہ میں تیرے لیے قرآن پاک کی رہبری کافی ہے۔

(عاشر ذی العقدہ ۱۲۱۰ھ)

بِسۡمِ اللّٰهِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِيۡمِ

الحمدللّٰه الذی جعل سیدنا و مولانا محمدًا صلی اللّٰه علیه و آله

وسلم مجلاه الاعز الاکمل و محل تظوه من العالم و مظهر ذاته

من بنی آدم صلوات اللّٰہ وسلامہ علیہ وعلیٰ آلہٖ واصحابہ ھداۃ الخلق الی الحق وروا ۃ الکتاب عن حبیب الحق الی الخلق فجزاھم اللّٰہ تعالیٰ احسن ماجازی بہ عبادہ الکاملین الواصلین والعاملین العارفین . امابعد

ماضی کی ایک یادگار محفل میں علمائے اہل سنت کی معیت میں حاضری کا شرف حاصل ہوا۔ تو بعض دوستوں نے ایک خاص اور مؤثر انداز میں مجھے فرمایا کہ تفسیر عزیزی کا ترجمہ کرنا بڑا ضروری ہے کیونکہ کتاب اور صاحبِ کتاب حضرت عمدۃ المفسرین زبدۃ المحدثین حضرت شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ کی برصغیر میں مرکزیت اور اہمیت کے پیش نظر یہ کام بہت اہم ہے' تمام مسالک سے وابستہ اہلِ علم کی سند حدیث تقریباً حضرت تک ہی پہنچتی ہے۔ آج تک اہلِ سنت وجماعت کی طرف سے اس کا ترجمہ نہیں ہوا۔ ازاں بعد ایک اور موقع پر یہی تقاضا ہوا اور ساتھ ہی محب محترم مولانا الحافظ القاری شوکت علی صاحب رحمۃ اللہ علیہ خطیب حضوری جامع مسجد کی تائید وتاکید نے شوق دِلایا لیکن حیران تھا کہ اتنا بڑا کام ایسے ناتواں اور بے بضاعت شخص سے کیونکر ممکن ہوگا جو صحیح معنوں میں طلباء علم کی صف میں بیٹھنے کے بھی قابل نہیں اس لیے کچھ وقت لیت ولعل میں گزر گیا۔ ایک تو استعداد کا فقدان دوسرے تبلیغی مصروفیات کی بناء پر ممکن نہ ہوسکا۔

ہر کام کا ایک وقت ہوتا ہے' حضرت مفسر علام قدس سرہ سے قلبی عقیدت کے پیش نظر خیال ہوا کہ توکلاً علی اللّٰہ ترجمہ شروع کر دیا جائے۔ دیگر برکات کے علاوہ اس نسبت سے کم از کم بالاستیعاب تفسیر عزیزی کی زیارت کا شرف حاصل ہوگا اور استفادہ کی بہترین صورت نکل آئے گی۔ چنانچہ حضرت مفسر علام رحمۃ اللہ علیہ کے حضور فاتحہ خوانی اور آپ سے استمداد کے بعد کام شروع کر دیا کیونکہ **والقمر اذا اتسق** کی تفسیر میں حضرت نے اس استمداد اور امداد کے جواز ہی نہیں بلکہ وقوع کا ذکر فرمایا ہے اور اس مسئلہ کی صحت اور پختگی کی بین دلیل پیش نظر ترجمہ ہے جو کہ صرف اور صرف استمداد وامداد ہی کا رہین منت ہے ورنہ

مختلف فنون کی بحث میں حضرت نے جو اصطلاحات ذکر فرمائی ہیں، بہت کوشش کی گئی ہے کہ دورانِ ترجمہ سلاست اور ترجمانی کے ساتھ ساتھ ان کا اصطلاحی تشخص مجروح نہ ہونے پائے لیکن اس کے باوجود بعض مقامات پر ترجے کی انتہائی کوشش کے باوجود مسئلہ کی صحیح صورت قائم نہیں رہی تھی اس لیے اصطلاحی لفظ کو ہی قائم رکھا ہے لیکن امید ہے کہ اس کے باوصف اس مسئلہ کے سمجھنے میں چنداں دقت نہیں ہوگی۔

علاوہ ازیں طباعت کی اغلاط نے سخت پریشان کیا' الفاظ کی صوری مناسبت اور کاتبین کی اصل علم سے ناواقفیت نے خاصی اُلجھنیں پیدا کیں مثلاً بخشۂ کی بجائے بخشے' نیز ظن طعن' دربیان درمیان' نیت نیست' مکانات مکافات' خلاحت بلاغت اور اتش آتش کے مابین صوری مناسبت اور معنوی بعد کی بناء پر جو پریشانی ہوسکتی ہے اس کا آپ بخوبی اندازہ لگا سکتے ہیں۔

تفسیر عزیزی کی افادیت اور اہمیت سے واقف حضرات بجا طور پر جانتے ہیں کہ فارسی زبان میں منقولات اور معقولات کا کتنا بیش بہا خزانہ ہے لیکن صد افسوس کہ سورۃ البقرہ تقریباً سوا پارہ یا پھر انتیسویں اور تیسویں پارے کی تفسیر ملتی ہے اس کے علاوہ اس عظیم تفسیر کے باقیات کے متعلق کچھ معلوم نہیں۔ بعض ارباب علم کی تحقیق کے مطابق آپ نے قرآن پاک کی تفسیر فرمائی مگر حوادث کی وجہ سے ضائع ہوگئی۔ اگر یوں ہے تو یہ بہت بڑا المیہ ہے۔ دورانِ تفسیر کئی مقامات پر اشارے تو ملتے ہیں کہ حضرت مفسر علام قدس سرہ کا ارادہ تو تکمیل کا تھا' آگے خدا جانے مکمل ہو کر ضائع ہوگئی یا باقیات کہیں غیر مطبوعہ پڑے ہیں یا حضرت کو تکمیل کا موقع ہی نہیں ملا۔ اے کاش کہیں سے ساری تفسیر عزیزی دستیاب ہو جائے تو اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اس کے ترجے کی بھی سعادت حاصل کی جائے۔

اپنی سی اس کاوش میں جو کچھ صحیح ترجمانی ہو سکی' صرف اور صرف توفیق خداوندی' حضور سید الخلق علی الاطلاق وحبیب الحق بالاتفاق صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے الطاف کریمانہ اور حضرت مفسر علام قدسنا اللہ تعالیٰ بسرہ العزیز کی غائبانہ توجہ کی برکت ہے اور کسی قسم کی کمی اور کوتاہی ہو تو بندہ کی اپنی کمزوری اور قصورِ استعداد کا نتیجہ [illegible]

صدقے سے معاف فرمائے۔

آخر میں ان تمام اہلِ علم و دانش اور اربابِ اُلفت و محبت سے درخواست ہے کہ اس سے استفادہ کریں تو مجھ بندۂ ناچیز محمد محفوظ الحق کے لیے ایمان کی سلامتی، خاتمہ علی الایمان اور میری اولاد کے روشن مستقبل اور میرے والدین، اہلِ خانہ اور اعزہ و اقرباء کے لیے دعائے بخشش فرمائیں، انتہائی کرم ہوگا۔

بر کریماں کارہا دشوار نیست

یکے از خدام جماعتِ اہل السنۃ

محمد محفوظ الحق غفرلہ

خطیب جامع مسجد غلہ منڈی

بورے والہ ضلع وہاڑی

۱۰ ذوالقعدہ ۱۴۱۰ھ بروز پیر

